ایک تیس سالہ پُراسرار نوجوان کی سرگزشت
جس کی اصل عمر ایک سال تھی۔
ابوالہول
شمیم نوید
11

بغداد کے گلی کوچے اب میرے لیے اجنبی نہیں رہے تھے اور میں وہیں واپس جا رہا تھا۔ ٹرین تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ میں نے ڈائننگ کار میں داخل ہونے کے بعد دانستہ ایسی میز کا انتخاب کیا تھا جس کے آس پاس دوسرے لوگ نہ ہوں۔

چائے پینا تو خیر ایک بہانہ تھا، مجھے وہاں بیٹھ کر دو افراد کے نام موت کے پیغام لکھنا تھے۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے پہلے دو سادہ کاغذ نکالے، پھر قلم جس میں ایک خاص قسم کی روشنائی تھی۔ قلم کھول کر میں نے موت کا پہلا پیغام لکھا: "مالیزوت! تمہاری زندگی

کے یہ آخری لمحات ہیں اس لیے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور تمہاری موت پر کوئی آنسو بھی نہ بہا سکے گا، لیکن تم میری مجبوری اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ تمہاری موت ہی میری زندگی کی ضمانت ہے۔ ابوالہول۔"

جب میں یہ پہلا پیغام لکھ رہا تھا تو میری انگلیاں کانپ رہی تھیں اور دل رو رہا تھا۔ آدمی کھلونا تو نہیں ہوتا کہ اسے جب چاہے توڑ دیا جائے، لیکن جب زندگی کی بقا کے لیے جنگ لڑی جاتی ہے تو ایسے سخت مقامات آتے ہی ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا دوسرا پیغام میں نے ایک امریکی لڑکی مارگریٹ کو لکھا۔ وہ بھی اسی ٹرین میں سفر کر رہی تھی، شاید اپنی زندگی کا آخری سفر! اس آخری سفر کے بعد شاید اب اسے کسی اور سفر کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ میں نے ان دونوں پیغامات کو تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بہت دکھ سے یہ سب کچھ سوچا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ بل میں نے پہلے ہی ادا کر دیا تھا۔

میں ڈائننگ کار سے نکل کر دوسرے ڈبے میں پہنچ گیا اور باتھ روم کا رخ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے وجود کو ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ کچھ دیر بعد جب میں باتھ روم سے نکلا تو میرا وجود نادیدہ بن چکا تھا۔ اب کوئی بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مالیخوف اسی ڈبے میں تھا۔ میں آہستہ قدمی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

مالیخوف کے چہرے پر کرختگی اور روکھا پن تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے چہرے کی سفاکی بھی عیاں تھی۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کی طرف دیکھنے سے بھی اجتناب برت رہے تھے۔ میں اب اس سے زیادہ دور نہیں تھا مگر کسی کو بھی میری وہاں موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ مالیخوف کے جسم پر بہترین تراش کا سوٹ تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور لباس سے وہ ایک صاحب حیثیت شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مقابل والی نشست پر کھڑکی کے قریب ایک نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہی خوب صورت تھے۔ لڑکی کچھ سہمی سہمی سی نظر آ رہی تھی اور اس کی خوف زدگی کا سبب مالیخوف ہی تھا۔ مالیخوف جب بھی اس لڑکی کی طرف اپنی گول گول سبز آنکھوں سے دیکھتا، لڑکی اپنے نوجوان ساتھی سے کچھ اور چپک جاتی۔

میں تیزی سے آگے بڑھ کر مالیخوف کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس لڑکی ہی کی طرح مالیخوف کے چہرے پر بھی اچانک خوف کے تاثرات نظر آنے لگے۔ تازہ کھلے ہوئے گلابوں کی خوشبو کا وہ جھونکا ڈبے کے دوسرے مسافروں نے بھی یقیناً محسوس کر لیا ہوگا جو میرے وجود کی پہچان تھا اور جسے محسوس کرنے کے بعد ہی سے مالیخوف وحشت زدہ سا ہو گیا تھا۔

میں نے بہت احتیاط اور آہستگی سے مالیخوف کے کوٹ کی جیب میں وہ پیغام رکھ دیا جو ڈائننگ کار میں تحریر کیا تھا۔

لمحہ بہ لمحہ مالیخوف کے اضطراب میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ اپنی جیب میں پیغام کی موجودگی کو محسوس کر چکا تھا۔ اب اس کے چہرے سے بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ غالباً وہ اپنے اس یقین کو وہم سے تعبیر کرنا چاہتا تھا کہ اس کے کوٹ کی جیب میں کچھ رکھا گیا ہے، لیکن کب تک! بالآخر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال ہی دیا۔ اب اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار بھی ہونے لگا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے وہ پیغام نکال لیا جو اسی کے نام تھا۔ اس کی نگاہ لفظوں پر پھسلنے لگی، اسی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا گیا۔

"ابوالہول!... نہیں... نہیں!" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "ہرگز نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا... نہیں!"

ابھی اس کے الفاظ ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کی آنکھوں نے ایک اور حیران کن منظر دیکھا۔ کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ ایک ایک کر کے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ چند لمحے بعد ہی اس کے ہاتھ میں سادہ کاغذ رہ گیا۔ یہ اس روشنائی کا کمال تھا جس سے میں نے وہ پیغام لکھا تھا۔ اس روشنائی کا کمال یہ تھا کہ اس سے کچھ بھی لکھنے کے بعد کاغذ کو تہ کر دیا جائے تو اس وقت تک تحریر برقرار رہتی تھی جب تک کاغذ کی تہ کو دوبارہ نہ کھولا جائے اور روشنائی کو دوبارہ ہوا نہ لگ جائے۔ کاغذ کی تہ کھولی جا چکی تھی اور ہوا بھی لگ چکی تھی اس لیے تحریر غائب ہو چکی تھی۔ اب مالیخوف دہشت زدہ سا ہو کر سادہ کاغذ کو گھورے جا رہا تھا۔ کچھ دیر مالیخوف اسی طرح کھویا کھویا سا بیٹھا رہا، پھر اس پر ایک تشنجی کیفیت سی طاری ہونے لگی۔ میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ سادہ کاغذ اب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں آ گرا تھا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ کر اس طرح فضا میں ہاتھ لہرا رہا تھا جیسے اپنے کسی نادیدہ دشمن کو دھمکا رہا ہو۔ پھر اس نے اپنی گود میں پڑا ہوا سادہ کاغذ اٹھایا اور

اسے توڑ مروڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ خوف زدہ سے نظر آ رہے تھے۔

"میرے... یہ شاید پاگل معلوم ہوتا ہے۔" سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کی۔

"بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔" لڑکی کے ساتھی نے مدھم آواز میں جواب دیا، پھر بولا۔ "مگر تم مطمئن رہو، اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو میں..." نوجوان کا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا کیوں کہ مالیخوف اچانک اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لوگوں کے اعصاب بھی شاید اب جواب دینے والے تھے، وہ کسی بھی لمحے چیخ سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مالیخوف کا ذہن اب پوری طرح میری گرفت میں آ چکا تھا اور وہ میرا ہر حکم ماننے پر مجبور تھا۔ اس نے اب تک پاگل پن کا جو مظاہرہ کیا تھا اس میں بھی میرے ہی ارادے کو دخل تھا تاکہ بعد میں اس کی موت کا کوئی جواز پیدا ہو سکے۔

لوگوں نے دیکھا کہ مالیخوف اپنی نشست سے اٹھنے کے بعد خواب کے سے عالم میں چلتا ہوا ان کے درمیان سے گزر گیا۔

کچھ دیر بعد ہی مالیخوف کا رخ ڈبے کے دروازے کی طرف ہو گیا۔ لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر مالیخوف اطمینان سے چلتا ہوا ڈبے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ سردی خاصی تھی اس لیے مسافروں نے کھڑکیوں کے شیشے گرا رکھے تھے۔ اس سردی میں کسی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ڈبے کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو جائے گا مگر مالیخوف نے ایسا ہی کیا۔ ڈبے کے اندر کی گرم فضا میں سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے در آئے۔ پھر اس سے پہلے کہ ڈبے کا کوئی مسافر، مالیخوف کی حرکت پر احتجاج کرتا، کئی تیز چیخیں بہ یک وقت بلند ہوئیں۔ وہ منظر ہی اتنا دہشت ناک تھا کہ لوگ اپنی بے ساختہ چیخیں نہ روک سکے تھے۔ مالیخوف نے چلتی ہوئی تیز رفتار ٹرین سے چھلانگ لگا دی تھی۔

ان چیخوں کے بعد ایک دم خاموشی پھیل گئی جیسے کسی نے ڈبے میں موجود تمام افراد کو سحر زدہ کر دیا ہو۔ کھلے ہوئے دروازے سے سرد ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی نشست سے اٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔ ان کے حواس پر ایک عجیب سا خوف مسلط ہو گیا تھا جس کا اظہار ان کے دہشت زدہ چہروں سے ہو رہا تھا۔ شاید انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا لرزہ خیز منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر ان میں سے کسی بوڑھے کو کھانسی اٹھی تھی اور وہ ہولناک خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے بعد جیسے ڈبے میں دوبارہ زندگی لوٹ آئی اور وہ سحر ٹوٹ گیا جس نے ان سب کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

اس ڈبے کے مسافر اس بات سے بے خبر تھے کہ ایسا ہی حیرت انگیز اور خوفناک کھیل اسی ٹرین کے ایک اور ڈبے میں بھی شروع ہونے والا تھا کیوں کہ میری جیب میں ابھی موت کا دوسرا پیغام موجود تھا۔ اب وہ دوسرا ڈبہ ہی میری منزل تھا۔ میرا دوسرا شکار ایک لڑکی تھی۔

اس خوب صورت اور خوش مزاج امریکی لڑکی کا نام مارگریٹ تھا۔ وہ بھی مالیخوف کی طرح بصرہ اسٹیشن سے اس ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ وہ بڑی روانی سے کسی اہل زبان کی طرح عربی بولنے پر قادر ہے۔ اسے نہ جانے کتنے لطیفے یاد تھے جن کا ذخیرہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈبے کے دوسرے مسافروں کے ساتھ بے تحاشا قہقہے لگا رہی تھی۔

پھر وہ مہکتے ہوئے گلابوں کی خوشبو کا جھونکا ہی تھا جس نے مارگریٹ کو بدحواس کر دیا۔ قینچی کی طرح چلتی ہوئی اس کی زبان ایک دم رک گئی۔ لڑکی کے قریب ہی نشست پر اس کا وینٹی بیگ رکھا ہوا تھا جو گویا اچانک ہی خود بہ خود کھل گیا۔ کم از کم لوگوں نے یہی دیکھا گو وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہلکی سی آواز سن کر مارگریٹ چونکی اور اس کی نگاہ ایک کاغذ پر جم گئی جو نہ جانے کہاں سے اڑتا ہوا سا آ کر کھلے ہوئے وینٹی بیگ میں داخل ہو گیا۔ یہ حیرت انگیز منظر سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر عورت نے بھی دیکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت میرے سوا اور کس کی ہو سکتی تھی۔ میں نے ہی وہ لفافہ اس وینٹی بیگ میں رکھا تھا۔

مارگریٹ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک [illegible] کے عالم میں وہ کاغذ اپنے وینٹی بیگ سے نکال لیا۔ میں اس کے قریب ہی کھڑا ہوا اس کی بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"میں نے... اس کاغذ کو ادھر... ادھر سے آتے دیکھا تھا۔" ادھیڑ عمر عورت اپنے قریب بیٹھے ہوئے مسافر کو بتانے لگی۔ اس کی آواز میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ "یہ... یہ کاغذ ہوا میں اڑتا ہوا آیا تھا اور... پھر خود بہ خود بیگ کھل گیا تھا... اس... اس کے بعد یہ کاغذ... یہ خود بیگ کے اندر چلا گیا؟"

اب مارگریٹ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کا وہ ہاتھ نمایاں طور پر کانپ رہا تھا جس میں کاغذ تھا۔ پھر اس نے غالباً ہمت کر کے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کھول لیا اور پڑھنے لگی۔ میں نے اسے اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تھا، پہلی بات تو اس کے لیے یہی چونکا دینے والی تھی اور میری توقع کے مطابق وہ اپنا نام پڑھ کر چونکی۔ جیسے جیسے وہ پیغام پڑھتی گئی اس کا چہرہ تاریک ہوتا گیا۔ وہ اب اپنے چہرے سے انتہائی خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

مارگریٹ کے قریب جو نوجوان بیٹھا ہوا تھا، وہ شاید اس میں دلچسپی لے رہا تھا اور وہی اس کے قہقہوں میں بھی شریک تھا۔ اسی نوجوان نے ہمت کر کے مارگریٹ کو مخاطب کیا۔ "کیا بات ہے تم اچانک چپ کیوں ہو گئیں؟ اس کاغذ میں کیا لکھا ہے؟ میرا اندازہ ہے کہ تم اس کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ کر کچھ خوف زدہ سی ہو گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ نوجوان، مارگریٹ کی طرف ذرا سا جھکا تاکہ کاغذ پر لکھی تحریر پڑھ سکے۔ اسی وقت اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکل گئی۔ وہ کاغذ بالکل سادہ تھا۔ اس پر کوئی تحریر نہیں تھی۔ نوجوان ہکلایا۔ "یہ... یہ تو سادہ کاغذ ہے۔"

مارگریٹ کے ہونٹوں پر جیسے خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ وہ چپ ہی رہی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسی کے ساتھ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا جیسے سارے جسم کا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ یقیناً وہ طاقت ور ذہن کی مالک تھی۔ اس نے اب تک میرے طاقت ور ذہن سے بھرپور جنگ کی تھی اور اپنے ذہن پر میرے ذہن کو غالب نہیں آنے دیا تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے ذہن کی قوت استعمال کی۔

"نہیں.... نہیں اے قاتل خوشبو! میں.... میں تیرا حکم نہیں مانوں گی.... ہرگز نہیں!" وہ دانت بھینچ کر بڑبڑانے لگی جیسے کوئی نیند کے عالم میں بڑبڑا رہا ہو۔ پھر اس نے میرا نام لیا۔ "ابوالہول! تُو... تو مجھے.... مجھے نہیں ڈرا سکتا.... نہیں!"

مارگریٹ کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ صرف وہی نوجوان اس کی آواز سن سکا جو قریب بیٹھا تھا۔ پھر بہ یک وقت اِدھر اُدھر سے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ "کیا ہوا؟ اس لڑکی کو کیا ہوا؟"

لوگوں کا مخاطب وہ نوجوان تھا۔ نوجوان نے جواب دیا۔ "مجھے علم نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو یہ بالکل ٹھیک تھیں۔"

"اس کا شانہ پکڑ کر ہلاؤ۔" کسی نے نوجوان کو مشورہ دیا۔ "یہ تو بالکل سکتے کے سے عالم میں بیٹھی ہے۔ ممکن ہے یہ کسی دماغی بیماری میں مبتلا ہو۔"

نوجوان نے اس شخص کے مشورے پر عمل کیا۔ مارگریٹ ایک دم اچھل پڑی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نوجوان یہی سمجھا تھا کہ مارگریٹ اپنا شانہ پکڑ کر ہلائے جانے پر اچھل پڑی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسی وقت میں نے مارگریٹ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میں اس کے ذہن کو اپنے تابع نہیں بنا سکتا اور مجھے زبردستی سے کام لینا پڑے گا۔ جسمانی طور پر وہ بہ ہر حال مجھ سے بہت کمزور تھی۔

میں نے جیسے ہی اس کا ہاتھ پکڑا، اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور ہوا میں ہاتھ لہرا کر چیخی۔ "ابوالہول! چھوڑ دے مجھے!" اس کا مخاطب میں ہی تھا جو نہ اسے نظر آ رہا تھا نہ کسی اور کو، مگر اسے وہاں میری موجودگی کا یقین ضرور ہو گیا تھا۔

میں ایک بار پھر جھکا اور اس بار اس کی کلائی سختی سے پکڑ لی اور پھر ایک جھٹکے سے اسے اٹھا لیا۔ اس کے ہاتھ سے سادہ کاغذ چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ پھر یوں ہوا جیسے وہ ہواؤں سے لڑ رہی ہو لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ وہ خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور اسی کے ساتھ پوری قوت سے "ابوالہول! ابوالہول!" چیخ رہی تھی۔ اس کا مخاطب میرا نادیدہ وجود ہی تھا! "نہیں! میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ چھوڑ دے مجھے! میں نہیں مروں گی! ہرگز نہیں!"

پھر لوگوں نے دیکھا کہ کوئی اَن دیکھی قوت مارگریٹ کو ان کے درمیان سے کھینچتی ہوئی لے گئی اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ میرا وجود ان کے لیے اَن دیکھا ہی تھا اور میں ہی مارگریٹ کو کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ وہ مسلسل چیختی جا رہی تھی۔ اس کی چیخیں سن کر لوگ بھی اپنی نشستیں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ مارگریٹ کی حالت دیکھ کر حیران تھے۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا جو مجھ سے جدوجہد کا نتیجہ تھا مگر لوگوں کے خیال میں اس نے خود اپنا لباس پھاڑا تھا۔ اس کے سنہرے بال بکھر گئے تھے اور چہرے پر بھی جگہ جگہ خراشوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ اب اس کے دونوں ہاتھ میری گرفت میں تھے لیکن دیکھنے والوں کو یوں نظر آ رہا تھا جیسے اس نے خود اپنے ہاتھ جوڑ لیے ہوں۔ اس حالت میں وہ تقریباً گھسٹتی ہوئی ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا جو

خود کو اس صورت حال میں قطعی بے بس سمجھ رہا ہوگا۔ کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہوگا کہ وہ کس طرح مارگریٹ کی مدد کرے جس نے ان کی دانست میں خود ہی اپنی یہ حالت بنالی تھی، مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ جس سے صرف مارگریٹ ہی واقف تھی۔ اس کا یہ حشر میرے ہاتھوں ہوا تھا۔ میں اس کے ذہن کو اپنے قابو میں کر کے اپنا حکم نہ منوا سکا تھا ورنہ وہ بھی مالیوزت کی طرح خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ مجھے اسی لیے مارگریٹ کے معاملے میں جسمانی طاقت استعمال کرنی پڑی تھی۔

آخر کار مارگریٹ اسی طرح چیختی چلاتی ہوئی ڈبے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ پھر بہت کم لوگوں نے ڈبے کا دروازہ خود بہ خود کھلتے ہوئے دیکھا کیوں کہ ان میں سے تقریباً سبھی مارگریٹ کی طرف متوجہ تھے۔ دروازہ کھلتے ہی سرد ہوا کے جھونکے اندر آئے تو لوگ دروازے کی طرف متوجہ ہوئے۔

مارگریٹ کو اپنا انجام نظر آ گیا تھا کیونکہ میرے ذہن نے بار بار اس کے ذہن کو ٹرین سے چھلانگ لگا دینے کا حکم دیا تھا۔

"بچاؤ!.... بچاؤ!" مارگریٹ اب بری طرح چیخ رہی تھی۔ "ابوالہول مجھے ٹرین سے نیچے پھینک رہا ہے!" اور اسی کے ساتھ اس کا جسم آہستہ آہستہ کھلے ہوئے دروازے کی طرف کھسکتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی مدافعت کی پوری کوشش کر رہی تھی اور میں اسے ٹرین سے دھکا دینے کے لیے پوری جسمانی قوت صرف کر رہا تھا۔ جسے اپنی موت کا یقین ہو جائے اور وہ اس سے بچنے کی جدوجہد کر رہا ہو تو اس کے جسم میں یوں بھی غیر معمولی طاقت و قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

"یہ.... یہ ٹرین سے نیچے گر جائے گی! اسے پکڑو!" مارگریٹ کے قریب جو نوجوان بیٹھا ہوا تھا، وہ چیخ کر تیزی سے آگے بڑھا، میں چوکنا ہو گیا۔ وہ نوجوان کوئی گڑبڑ پیدا کر سکتا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ نوجوان، مارگریٹ کے قریب پہنچ کر جھکا، میں نے اس کے سینے پر اپنی کہنی کی ضرب لگائی۔ وہ چیخ کر سینے کو تھامے ہوئے بیٹھتا چلا گیا۔ وہاں موجود کوئی شخص بھی نہ سمجھ سکا کہ اس نوجوان پر کیا افتاد پڑی تھی جو وہ یوں چیخ اٹھا تھا۔

مارگریٹ اب گھسٹتی ہوئی ایسی جگہ پہنچ چکی تھی کہ ذرا سا دھکا بھی اسے ٹرین سے نیچے گرا سکتا تھا۔ وہ اب بھی ہذیانی انداز میں چیخے جا رہی تھی۔ پھر میں نے دیر نہیں کی۔ بس اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور پھر اس کا جسم چلتی ہوئی ٹرین سے باہر نکل گیا۔ اس کی آخری چیخ بڑی دردناک تھی، اتنی دردناک کہ میرا دل بھی کانپ اٹھا حالانکہ میں نے ہی اسے ٹرین سے دھکا دیا تھا۔ اچانک وہ نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا جسے میں نے کہنی سے ضرب لگائی تھی۔ وہ دروازے کا ہینڈل پکڑ کر باہر تاریکی میں گھورنے لگا مگر باہر اب تیز ہواؤں کے شور کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک مسافر کو شاید یہ شبہ ہوا کہ وہ نوجوان بھی ٹرین کے دروازے سے باہر چھلانگ نہ لگا دے۔ غالباً اسی لیے اس نے جھپٹ کر نوجوان کا بازو پکڑا اور اسے پیچھے گھسیٹ لیا، اسی کے ساتھ وہ چیخا۔ "دروازہ بند کر دو!"

مسافروں میں سے کسی نے لپک کر دروازہ بند کر دیا۔

اب میرا وہاں رکنا فضول تھا کیوں کہ میں اپنا فرض انجام دے چکا تھا، ناگوار فرض! میں اپنے دل پر اس وقت ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔

اس ڈبے سے نکل کر دوسرے ڈبے تک پہنچتے ہی میں نے اپنے وجود کی تجسیم کر لی۔ اب میرا وجود لوگوں کے لیے نادیدہ نہ رہا تھا۔ اس طرح مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا کیوں کہ اب میں ابوالہول کی بجائے ڈاکٹر حارث تھا، وجیہہ و شکیل ایک تیس سالہ عراقی!

چند لمحے میں نے اطراف کا جائزہ لیا، پھر اسی ڈبے میں پہنچ گیا جہاں اس امریکی لڑکی مارگریٹ کو وہ خوفناک حادثہ پیش آیا تھا کیونکہ میری نشست بھی اسی ڈبے میں تھی۔ اس ڈبے کے دروازے پر ابھی تک لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ سبھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان میں سے

اکثر مجھے ڈاکٹر حارث کی حیثیت سے پہچانتے تھے جنھوں نے مجھے پہچان لیا اور احتراماً راستے سے ہٹ گئے۔

لوگ چہرے دیکھتے ہیں آدمی کے اندر نہیں جھانکتے! میں نے کئی بار سوچا۔ کتنے بے خبر ہیں یہ لوگ جو مجھے اپنے ملک کا مشہور نیورو سرجن ڈاکٹر حارث سمجھ رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ میں دراصل کون ہوں! یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور ہولناک خیال آیا۔ یہ خیال ایک سوال کی صورت میں تھا جس سے میں ہمیشہ بچتا تھا۔ جب بھی یہ سوال میرے ذہن میں کروٹ لیتا، میں بے چین ہو جاتا۔ وہ روح فرسا سوال یہ تھا کہ میں خود بھی اپنے بارے میں کیا جانتا ہوں؟ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں اور جو معلوم تھا قطعی ناکافی تھا، ناکافی بھی اور انتہائی حیران کن بھی! کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ جیسے سب کچھ خواب ہے۔ میں بھی خواب ہوں اور میرا وجود بھی! یہ عالم حقیقت نہیں عالم خواب ہے۔

انہی احساسات کے ساتھ میرا وجود جاگ اٹھتا اور سوال کرتا۔ اے ابوالہول! تو جو حقیقت کو خواب سمجھ رہا ہے، یہ بتا کہ جب پہلی بار چقماق سے پتھر ٹکرایا ہوگا اور آدمی نے آگ کو دیکھا ہوگا تو کیا اسے بھی شدید حیرت نہیں ہوئی ہوگی؟ اس نے تو آگ کو خواب نہیں سمجھا پھر تو ایسا کیوں سمجھتا ہے؟ آدمی ایک ایک کرکے کائنات کے تمام اسرار سے پردے اٹھاتا جا رہا ہے، مگر اسرار تو اب بھی موجود ہیں۔ شعور کی نشتر زنی جاری رہتی لیکن اس کے باوجود میں اپنے وجود کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتا رہتا۔ میرے وجود کا پہلا اسرار خود میرا نام تھا، ابوالہول! بار بار سوچنے کے باوجود میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ میرا نام یہ کیوں رکھا گیا؟ ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ میرا یہ نام کس نے رکھا اور یہ کہ میرے تمام دشمن مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔

مگر میرے لیے اس سے بھی بڑا اسرار، اس سے بھی کہیں حیران کن اور ناقابل یقین ایک اور بات ہے جسے کہتے ہوئے خود مجھے بھی خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ یقیناً ایسی عجیب، ایسی پُراسرار اور ناقابل فہم بات کسی نے نہ کہی ہوگی اور یقیناً میری حیرت اس پہلے انسان کی حیرت سے کم نہیں جس نے پہلی بار آگ کو دیکھا ہوگا۔ اسے آگ دیکھ کر حیرت کے باوجود اس کی حقیقت پر یقین آگیا تھا مگر میں ابھی یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہوں۔ وہ عجیب اور پُراسرار بات جسے میں کہنے کی ہمت کر رہا ہوں یہ ہے کہ میری عمر تیس سال کی بجائے ایک سال ہے! کیا اس صدی میں یہ بات قابل یقین ہے کہ جو شخص تیس سال کا نظر آ رہا ہو، وہ اصلاً اس کی عمر ایک سال ہو؟ لیکن ہے ایسا ہی! حقیقت یہی ہے! میں یہ عذاب جھیل رہا ہوں، سو میں جانتا ہوں۔ حقیقت کو خواب کہہ دینے سے حقیقت نہیں بدلتی اور یہ احساس کم از کم میرے لیے بہت کرب آمیز ہے۔ مجھے علم ہے کہ میں نے کتنی عجیب بات کہی ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ بات عجیب ہونے کے باوجود سچ ہے۔

عجب تماشا ہے! عجب دکھ ہے میرا! میرے وجود میں ہر وقت ٹوٹ پھوٹ جاری رہتی ہے۔ کوئی معصوم سا، بھولا سا بچہ میرے اندر مجھ سے لڑتا ہے کہ میں نے اس سے اس کا بچپن، اس کا بھول پن کیوں چھین لیا؟ وہ بچہ اور ایک تیس سالہ نوجوان میرے وجود میں ہنگامہ برپا کیے رہتے ہیں۔ کبھی وہ بچہ اپنی ننھی اور معصوم باتوں سے تیس سالہ نوجوان کو لاجواب کر دیتا ہے اور نوجوان کو چپ سی لگ جاتی ہے اور کبھی وہ نوجوان اس بچے کو تھپک تھپک کر سلا دیتا ہے۔ میرے اندر ہر دم ایک پیکار جاری رہتی ہے۔

مگر میرے وجود کی اس پیکار کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا خود میں؟ کیا قصوروار میں ہوں؟ میں کبھی کبھی دیر تک یہی سوچتا رہتا ہوں اور ہر بار ایک ہی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ قصوروار میں نہیں ہوں۔ اگر قصور ہے تو اس علم کا، اس آگہی کا جس نے وقت سے بہت پہلے میرے ذہن کے سارے دریچے روشن کر دیے ہیں۔ مگر یہ علم، یہ آگہی مجھ میں کس نے پیدا کی؟ جب یہ سوال میرے ذہن میں ابھرتا ہے تو ایک مدقوق سا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور اس چہرے سے مجھے شدید نفرت ہے۔ اس مدقوق اور قابل نفرت چہرے کو میں نے ہمیشہ ایک خواب کے سے عالم میں دیکھا۔ اگر کوئی مجھ سے اس چہرے کی تفصیلات بیان کرنے کو کہے تو شاید میں بیان نہ کر سکوں۔ وہ چہرہ جانے کیوں اور کب سے میں اسی طرح دیکھتا آیا تھا! کبھی وہ مجھے گھورتا، کبھی مجھ پر جھکا ہوتا، کبھی اس پر حزن و ملال ہوتا، کبھی مسرت ہی مسرت، کبھی غصہ اور کبھی محبت! میرا اس چہرے ہی کے ساتھ ظلمت کا منظر بھی مجھے نظر آنے لگتا۔ عجیب و غریب مشینیں، مختلف آلات اور جانے کیا کیا! اس کے بعد مختلف قسم کی شعاعیں، خوشبو، بدبو، یہ سب کچھ میں نے محسوس کیا اور انہی کے درمیان اپنا وجود بھی!

پھر شاید میرا شعور رفتہ رفتہ پوری طرح بیدار ہوگیا۔ میں نے جان لیا کہ میری اصل عمر ایک سال ہے اور میں نے دیکھا کہ میں تیس سال کا بنا دیا گیا ہوں۔ مگر کیوں؟ یہ وہ پہلا سوال تھا جس نے مزید سوالوں کے دروازے کھول دیے۔ میں سوال کرتا رہا اور میرا ذہن جواب دیتا رہا، مگر ایک حد تک!

تمہیں ایک بڑی طاقت کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے گا۔

میرے ذہن نے اس سوال کا جواب دیا۔

کس لیے؟

تاکہ وہ بڑی طاقت تمہاری حیرت انگیز قوتوں سے فائدہ اٹھا کر دنیا سے اپنی برتری تسلیم کرا لے اور بالآخر کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کو اپنا غلام بنا لے۔

لیکن انسان، انسان کا غلام نہیں ہوتا اور میں بھی انسان ہوں۔ میں اس مقصد کے حصول میں ذریعہ نہیں بن سکتا۔

تم ذریعہ بنا دیے جاؤ گے، اور اگر ایسا نہیں چاہتے تو یہاں سے فرار ہو جاؤ! میرے بیدار ذہن نے مجھے مشورہ دیا۔ وقت بہت کم ہے، اس سے پہلے کہ تمہارے وجود کو کسی بڑی طاقت کا وفادار بننے پر مجبور کر دیا جائے، تمہیں فروخت کر دیا جائے، یہاں سے بھاگ جاؤ! وہ چہرہ جو تمہیں قابل نفرت معلوم ہوتا ہے اور جسے تم نے پروفیسر کا نام دے لیا ہے، وہی تمہیں بیچ دے گا۔

فرار ہو جاؤ، بھاگ جاؤ! یہ صدا بار بار میرے وجود میں گردش کرتی رہی اور میں کوئی خواب سا دیکھتا رہا۔ پھر شاید میں خواب دیکھتے دیکھتے چونک سا اٹھا۔

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے بہت توڑ پھوڑ کی تھی اور وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔

اس عقوبت خانے سے نکل کر جانے کب تک میں بھاگتا رہا، جنگلوں میں، ویرانوں میں جانے کہاں کہاں! نہ مجھے یہ ہوش تھا کہ میں کہاں سے فرار ہوا ہوں، نہ یہ خبر تھی کہ کہاں جا رہا ہوں۔ پھر میں کہیں نڈھال ہو کر گر گیا اور میرا شعور سو گیا۔ گہری نیند! شاید یہ اس فضا سے نکلنے کا نتیجہ تھا جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔ معلوم نہیں میں کب تک گہری نیند سوتا رہا اور کب بیدار ہوا۔ جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کسی ملک کی سرحد کے قریب پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر مسلح فوجی تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی حیرت انگیز قوتوں میں سے ایک قوت کا عرفان ہوا۔ مسلح فوجی میری راہ روکے کھڑے تھے اور مجھے آگے جانا تھا۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنی جائے فرار سے جتنا بھی دور جا سکوں، چلا جاؤں۔ یہی لمحات تھے کہ میرے ذہن میں ایک عجیب سی خواہش نے جنم لیا، کاش میرا وجود نادیدہ ہو سکتا اور یہ فوجی مجھے اپنے ملک کی سرحد پار کرتے ہوئے دیکھ نہ پاتے۔ مجھے اس وقت قطعی یہ علم نہیں تھا کہ میرے خیال کی قوت کتنی موثر ہے اور یہ کہ واقعی میرے وجود کو نادیدہ بنا سکتی ہے۔ پھر جب میں نے ناممکن کو ممکن بنتے دیکھا تو کچھ دیر کے لیے میرے حواس گم ہوگئے۔ میں گم صم سا کھڑا رہا کیونکہ خود میری نگاہ سے میرا وجود اوجھل ہو چکا تھا۔ مجھ میں یقیناً حیرت انگیز قوتیں موجود ہیں، حیرتوں کا طلسم ٹوٹا تو میں نے سوچا اور میرے قدم سرحد کی طرف اٹھنے لگے۔

سرحد عبور کرتے ہی میں نے دوسری خواہش کی اور وہ بھی پوری ہوگئی۔ میرا وجود نادیدہ نہیں رہا تھا۔ یوں مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میں اپنے وجود کو اپنے خیال کی قوت سے جب چاہوں نادیدہ بنا سکتا ہوں۔ اس کے بعد مختلف مواقع پر یکے بعد دیگرے مجھے اپنی حیرت انگیز قوتوں کا علم ہوتا گیا۔ میرے وجود میں یہ حیرت انگیز قوتیں کیوں اور کیسے پیدا ہوگئی تھیں، ان کا سبب کیا تھا، نہ یہ مجھے پہلے معلوم تھا نہ اب خبر ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان قوتوں کو کسی بڑی طاقت کا غلام بنایا جانے والا تھا اور میں اس سے پہلے ہی فرار ہوگیا تھا۔ وہ تین بڑی طاقتیں تھیں اور تینوں ہی مجھے حاصل کرنا چاہتی تھیں مگر سودا ایک ہی سے ہونا تھا۔ بولی لگ رہی تھی، ایک انسان کی بولی، میری بولی! مگر انسان نہیں بکتا، میں نہیں بکا اور وہاں سے بھاگ آیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ بولی لگانے والے زیادہ عرصے خاموش نہیں بیٹھیں گے اور پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ تینوں بڑی طاقتوں کے خطرناک ایجنٹ حرکت میں آگئے۔ میں دیس دیس بھٹکتا ہوا اس وقت پاکستان پہنچ چکا تھا اور میرا ارادہ وہاں بھی طویل عرصے رکنے کا نہیں تھا۔ میرا پہلا معرکہ امریکی ایجنٹوں سے ہوا اور میں انہیں جھکانے لگا کر پاکستان سے ہندوستان فرار ہوگیا۔ اس دن سے اب تک میں بھاگ رہا ہوں اور تینوں بڑی طاقتوں کے ایجنٹ میرا پیچھا کر رہے ہیں تاکہ مجھے زیر دام لا سکیں۔

میری اور ان کی جنگ آج تک جاری ہے۔ اب یہ جنگ عراق کی سرزمین پر لڑی جا رہی ہے جہاں میں نے ڈاکٹر حارث کی

شخصیت اپنالی ہے اور اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہی کردار ادا کرتے مجھے بغداد سے بصرے جانا پڑا تھا۔ بصرے میں تیرہ ملکوں کی سہ روزہ میڈیکل کانفرنس ہوئی تھی۔ ڈاکٹر حارث نے اس میڈیکل کانفرنس کے انعقاد کی خاطر بہت کوششیں کی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے ڈاکٹر حارث کی جگہ نہیں لی تھی۔ بعد میں ڈاکٹر حارث کی بجائے مجھے اس سلسلے میں تمام کام انجام دینا پڑے۔ عراق کے تمام ہی اہم اخبارات نے مسلسل تین دن تک اسی کانفرنس کے سبب میری تصاویر شائع کیں مگر لوگوں کو ذرا بھی شک نہیں ہو سکا کہ میں ڈاکٹر حارث نہیں ہوں۔ میں نے ڈاکٹر حارث کا کردار کچھ اتنی ہی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ جب میں لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا تو وہ مجھے واقعی ڈاکٹر حارث ہی سمجھ رہے تھے، ابوالہول نہیں۔

مجھے یہ بھی علم تھا کہ لوگوں نے میرے جسم سے اٹھتی ہوئی مخصوص خوشبو محسوس کر لی ہوگی، ہلکی اور سحر کن سی خوشبو! جیسے تازہ گلاب مہک رہے ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں سے اکثر کا ذہن یہ خوشبو محسوس کر کے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کی طرف ضرور مبذول ہوا ہوگا۔ یہی مخصوص خوشبو انھوں نے حادثے سے کچھ پہلے اور حادثے کے وقت بھی محسوس کی ہوگی، لیکن وہ اپنے اس احساس کو کوئی معنی نہیں پہنا سکے ہوں گے۔

یہ بات مجھے بغداد میں قیام کے دوران ہی میں معلوم ہو گئی تھی کہ عموماً ڈاکٹر حارث، ہوائی جہاز کے سفر سے گریز کرتا تھا۔ وہ بہ مجبوری ہی کبھی ہوائی جہاز میں بیٹھتا تھا، جب اس کے سوا کوئی اور راہ نہ ہو۔ وہ بلندی سے خوف کھاتا تھا۔ میں اسی لیے بغداد سے بصرے ٹرین ہی سے گیا تھا اور اب واپسی میں بھی اسی کو ذریعہ سفر بنایا تھا۔ ماہر امراض قلب ڈاکٹر احسان، ڈاکٹر حارث کا دوست تھا۔ وہ بھی اسی لیے میرا ہم سفر تھا ورنہ دوسرے ڈاکٹروں کی طرح وہ بھی ہوائی جہاز سے سفر کرتا۔ لوگوں کے ہجوم میں وہ بھی تھا جو مجھے آتا دیکھ کر میرے قریب ہو گیا تھا اور اب میرے ساتھ ساتھ اپنی نشست کی طرف جا رہا تھا۔ ہم دونوں کی نشستیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر حارث کا کردار ادا کرنے کے سبب میں اس سے دوستی نبھانے پر مجبور تھا۔

"یہاں آپ کی غیر موجودگی میں ایک حادثہ پیش آچکا ہے ڈاکٹر!" ڈاکٹر احسان نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں محسوس تو کر رہا ہوں کہ یہاں کوئی خلاف معمول بات ہوئی ہے۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "ڈبے کے دروازے پر کافی لوگ جمع تھے۔"

ڈاکٹر احسان اس حادثے کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ جو کچھ وہاں پیش آچکا ہے، اس سے زیادہ میرے علم میں ہے اور میں ہی اس کا سبب ہوں۔

اس دوران میں ہم دونوں اپنی نشستوں تک پہنچ گئے۔

"ڈاکٹر احسان! آپ نے تو اس طرح حادثے کا ذکر کیا ہے جیسے اس میں کسی نادیدہ قوت کا ہاتھ ہو۔" میں مسکرا کر بولا۔ مجھے علم تھا کہ ڈاکٹر حارث اور ڈاکٹر احسان، بے تکلفی اور دوستی کے باوجود ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے اور حد ادب سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے میں اس کا پورا خیال رکھتا تھا۔

"آپ کو کیا بتاؤں ڈاکٹر!" ڈاکٹر احسان اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ کہیں گے کہ میں توہم کا شکار ہو گیا ہوں۔"

"معاف کیجیے گا، آپ کا بیان سن کر تو مجھ پر کچھ ایسا ہی تاثر ہوا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور خود بھی اس کے قریب والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"آپ یہاں ہوتے تو یہی تاثر ہوتا آپ پر!" ڈاکٹر احسان میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "میں نے بہ چشم خود وہ منظر دیکھا تھا۔ مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ وجود نے اس لڑکی کو ٹرین کے دروازے سے باہر دھکا دے دیا ہو۔ وہ لڑکی خود بھی یہی چیخ رہی تھی کہ کوئی اسے ٹرین سے دھکا دے رہا ہے۔ پھر اس سلسلے میں ایک ادھیڑ عمر عورت کا بیان بھی عجیب ہے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر احسان نے اس کاغذ کے بارے میں بتایا جس پر میں نے موت کا پیغام لکھا تھا۔ جو گویا مارگریٹ کے خیال میں خود بہ خود اڑتا ہوا مارگریٹ کے دستی بیگ میں پہنچ گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر احسان نے اس نوجوان کے بارے میں بتایا جس نے آخری لمحوں میں مارگریٹ کو بچانا چاہا تھا۔ اس نوجوان نے لوگوں کو بتا دیا تھا کہ وہ ایک ذہنی چیخ مار کر کیوں بیٹھ گیا تھا۔ یہی بیان ڈاکٹر احسان نے بھی سنا تھا۔ ڈاکٹر احسان نے اس پر شدید حیرت کا اظہار کیا کہ "حادثے" کا شکار ہونے والی لڑکی "ابوالہول! ابوالہول!" چیخ

رہی تھی۔

"آپ بھی لوگوں کی باتوں میں آگئے ڈاکٹر!" میں ہنس کر بولا۔ "سوچیے تو سہی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ابھی ہم میڈیکل کانفرنس میں شرکت کر کے آرہے ہیں۔ اگر ہم لوگ بھی ایسی توہم پرستانہ باتیں کرنے لگے تو عام لوگوں کا کیا حال ہوگا! میرے خیال میں وہ لڑکی یقیناً کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہوگی۔"

ڈاکٹر احسان سمجھ دار اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے اس مسئلے پر مزید گفتگو مناسب نہیں سمجھی۔ اس نے یقیناً یہی سوچا ہوگا کہ اگر میری طرح وہ بھی اس واقعے کا عینی شاہد نہ ہوتا تو اسے بھی یقین دلانا مشکل ہوتا۔ اس نے یہی سوچ کر شاید موضوع گفتگو بدل دیا اور بولا۔ "آپ کو اتنی دیر کیسے لگ گئی واپسی میں؟"

یہ سوال میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ مجھے علم تھا کہ ڈاکٹر احسان اس سلسلے میں ضرور پوچھے گا۔ میں نے اسی لیے پہلے سے سوچا ہوا جواب دے دیا۔ "مجھے ڈائننگ کار میں ایک شناسا مل گیا تھا۔ اس شریف آدمی نے مجھے اٹھنے ہی نہیں دیا۔" یہ کہہ کر میں نے ڈاکٹر احسان کے چہرے کا جائزہ لیا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن ہوا یا نہیں؟ ڈاکٹر احسان کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ میرے جواب سے وہ مطمئن ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر احسان کے سوال کا جواب دے کر میں نے اپنی جیب سے پاؤچ اور پائپ نکال لیا۔ کوشش کے باوجود میں تمباکو نوشی ترک نہیں کر سکا تھا۔ ڈاکٹر حارث کی شخصیت اپنا لینے کے بعد میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ وہ عادتیں تھیں جنھیں میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میری اور ڈاکٹر حارث کی عادتوں میں چند بنیادی تضادات تھے۔ مثلاً ڈاکٹر حارث تمباکو نوشی کے خلاف تھا، لیکن تمباکو نوشی چھوڑ دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر مغرور اور خود سر انسان تھا، اگر میں چاہتا بھی تو غرور و خود سری نہیں اپنا سکتا تھا۔ ڈاکٹر حارث کو ماضی سے محبت تھی جب کہ میں اپنے ماضی کے متعلق نہ تو سوچتا تھا اور نہ اس سلسلے میں گفتگو پسند کرتا تھا۔ ان عادات و اطوار سے قطع نظر خوشبو میری کمزوری تھی بلکہ میرے وجود کا لازمی حصہ! میرے جسم سے ہر وقت تازہ گلابوں کی خوشبو آتی رہتی تھی جسے چھپانا میرے بس سے باہر تھا جب کہ ڈاکٹر حارث کو کوئی بھی خوشبو پسند نہیں تھی اور وہ خوشبو استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ میری مجبوریاں تھیں کیوں کہ میں ڈاکٹر حارث نہیں تھا۔

میری ان تبدیلیوں کو بہت جلد محسوس کر لیا گیا۔ جو لوگ ڈاکٹر حارث کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے ہکلاتے تھے، وہ میرے سامنے بلا جھجک بولنے لگے تھے۔ ماضی کے متعلق میں کہا کرتا تھا کہ ماضی کی راکھ کریدنے سے کچھ حاصل نہیں، آدمی کو ہمیشہ حال اور مستقبل پر نظر رکھنا چاہیے۔ یہ انداز فکر ڈاکٹر حارث کے خیالات و نظریات سے قطعی مختلف تھا۔ ڈاکٹر حارث کہتا تھا کہ ماضی، حال اور مستقبل کی بنیاد ہے۔

ڈاکٹر حارث کے قریبی عزیز، دوست اور گھر والے سبھی میری عادات پر حیران تھے۔ بصرے میں رہنے والی اس حسین دوشیزہ صالحہ کے ذکر سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کی باتیں کرتے ہوئے ڈاکٹر حارث کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ صالحہ میری نہیں ڈاکٹر حارث کی منگیتر تھی اور میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ ڈاکٹر حارث کی ماں نے اپنی بہن کی بیٹی سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ خود ڈاکٹر حارث کو بھی صالحہ بہت اچھی لگتی تھی۔ چھوٹی شوخ سی سرو قد صالحہ نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بصرہ جانے کے باوجود لوگوں کے خیال میں ڈاکٹر حارث صالحہ سے نہیں ملا تھا۔ لوگوں کو کیا خبر کہ وہ جسے ڈاکٹر حارث سمجھ رہے تھے، ڈاکٹر حارث نہیں ایک اجنبی تھا جس نے اپنی زندگی کی بقا کے لیے ڈاکٹر حارث کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے اپنی مصروفیات کا عذر پیش کر کے ڈاکٹر حارث کی خالہ کے گھر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بصرے میں صالحہ کا بھائی مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے گھر چلنے کے لیے کہا تھا۔ اس غریب کی کیا مجال تھی کہ بضد ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی ڈاکٹر حارث سے خوف زدہ سا رہتا تھا اور ہمیشہ ہی اس سے کتراتا تھا۔ اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ جسے وہ ڈاکٹر حارث سمجھ رہا ہے وہ اپنے دشمنوں میں ابوالہول کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ڈاکٹر احسان کیوں کہ ڈاکٹر حارث کے قریبی دوستوں میں سے تھا اس لیے اس نے ایک بار ڈھکے چھپے الفاظ میں ان بنیادی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور ان کا سبب دریافت کیا تھا۔

"ایک سے صبح و شام، یکساں عادات و اطوار!" میں نے پائپ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا تھا۔ "ذرا سوچیے ڈاکٹر! کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ اس طرح تو آدمی بہت جلد جینے سے اکتا جائے گا۔ میں دانستہ اپنی عادات بدل رہا ہوں تاکہ زندگی مجھ پر گراں نہ ہو، زندگی میں میرا جی لگے۔ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ یکسانیت…

بہت جلد بوڑھا کر دیتی ہے؟ کیا آپ کو اس سے بیزاری محسوس نہیں ہوتی؟"

"ہوتی کیوں نہیں، لیکن یہ بڑا مشکل کام ہے بلکہ میرے خیال میں ناممکن!" ڈاکٹر احسان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ "آدمی اپنی عادتوں کا اسیر ہوتا ہے، مگر آپ کو دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے حیرت انگیز طور پر اپنی گزشتہ عادات ترک کر کے نئی عادتیں اپنائی ہیں۔ میرے لیے آپ کی مثال اس سلسلے میں پہلی مثال ہے۔"

"ڈاکٹر! کچھ بھی ناممکن نہیں، بس اپنی اپنی قوت ارادی کی بات ہے۔"

اور یوں بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر حارث کے قریبی دوستوں، عزیزوں اور اہل خانہ نے مجھے اور میری عادات کو قبول کر لیا تھا۔

یہ مسئلہ تو خیر کسی نہ کسی طرح حل ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر حارث کی شخصیت اپنا کر میرے لیے جو سب سے بڑی دشواری تھی وہ اس کا پیشہ تھا۔ کم عمری کے باوجود وہ ملک کے مایہ ناز ڈاکٹروں میں سے ایک تھا۔ میں اپنے حیرت انگیز وجود کی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ایک نیورو سرجن نہیں تھا۔ ڈاکٹر حارث، بغداد کے سب سے بڑے اسپتال مستشفی الیرموک میں ملازم تھا۔ اسے دماغ کے آپریشن بھی کرنا پڑتے تھے اور یہی میرے لیے سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں اسپتال جانے سے بھی گریز کرنے لگا تھا۔

مجھے بصرے سے آئے ہوئے ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ اسپتال میں ایک ایمرجنسی کیس آ گیا۔ اس کا فوری آپریشن بہت ضروری تھا۔ دوسرا کوئی ڈاکٹر اس کا اہل نہیں تھا کہ وہ اہم اور نازک آپریشن کر سکتا۔ اسی لیے مجھے فوری طور پر فون کر کے بلوایا گیا۔

گزشتہ چند دنوں کے دوران میں میرے ہاتھوں دو آپریشن ناکام ہو چکے تھے حالانکہ وہ آپریشن مشکل نہیں تھے کہ مریض اپنی زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے مگر ہوا یہی تھا۔ ڈاکٹر حارث اس نوعیت کے کئی کامیاب آپریشن کر چکا تھا، مگر میں تو ڈاکٹر حارث نہیں تھا جو ناکام نہ ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ تیسرا آپریشن کرتے ہوئے مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر یہ ایمرجنسی کیس نہ ہوتا اور کوئی دوسرا ڈاکٹر یہ آپریشن کر سکتا تو شاید میں کبھی اس آپریشن پر آمادہ نہ ہوتا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ میرا تیسرا آپریشن بھی ناکام ہوا۔ مریض آپریشن ٹیبل ہی پر مر گیا تھا۔ ڈاکٹر حارث ایک مانا ہوا نیورو سرجن تھا۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ اسپتال کے دوسرے ڈاکٹر حیران تھے کہ آخر مجھے کچھ دن سے کیا ہو گیا ہے۔

میں آپریشن روم سے نکلا تو مریض کے لواحقین نے مجھے گھیر لیا۔ "آپریشن کامیاب رہا نا ڈاکٹر؟" وہ غالباً مریض کی نوجوان بیوی تھی جس نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔

"آپ.... آپریشن....؟" میری آواز کچھ بھرا سی گئی۔ "نہیں!" یہ کہہ کر میں نے منہ پھیر لیا۔ میری پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی تھیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لے۔ میرا جواب انکار میں سن کر مریض کی نوجوان بیوی کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ پھر وہ ایک دم چیخ اٹھی۔ "ڈاکٹر! یہ.... یہ تم نے کیا کیا، کیا ڈاکٹر!" وہ چیختی ہوئی میری طرف جھپٹی اور اسی وقت کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ وہ بوڑھی عورت تھی جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا، شاید اس مریض کی ماں تھی۔ اس نے نوجوان عورت کو پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ "صبر کرو.... صبر میری بچی!" بوڑھی عورت نے نوجوان عورت سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں!" نوجوان عورت پھر چیخ اٹھی۔ "میں صبر نہیں کروں گی۔ چھوڑ دیں مجھے، چھوڑ دیں! میں.... میں اس کے پاس جاؤں گی، اس کے پاس!" وہ خود کو چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔ نوجوان عورت اب بوڑھی عورت کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بوڑھی عورت کو اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی آپریشن روم کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہاں موجود مریض کے دوسرے عزیزوں نے یہ صورت دیکھ کر نوجوان عورت کو پکڑ لیا جو اب مچل رہی تھی۔ میں یہ منظر نہ دیکھ سکا اور تیزی سے راہداری میں بڑھتا چلا گیا۔ اب میرا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا جہاں مجھے لباس تبدیل کرنا تھا۔

"ظالم.... ظالم.... لوگو! دیکھو وہ ظالم جا رہا ہے۔" مجھے عقب سے اس عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "اس ظالم نے میرے محبوب کو قتل کر دیا۔ یہ ظالم ہے، قاتل ہے۔

.... اسے سزا دو.... اس قاتل کو سزا دو لوگو!" وہ نوجوان عورت ہذیانی انداز میں چیخے جا رہی تھی اور اس کی چیخیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔

میری سماعت میں جیسے کوئی پگھلا ہوا سیسا انڈیل رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس ماحول، اس فضا سے، اس اسپتال سے کہیں بہت دور بھاگ جاؤں جہاں اس عورت کی چیخیں نہ ہوں جو جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

"ظالم! قاتل!" اس عورت کی چیخیں دروازہ بند کرنے کے باوجود میری سماعت میں گونج رہی تھیں۔

"نہیں اب شاید خوفناک کھیل نہیں کھیلا جا سکتا.... ہرگز نہیں!" میں اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ پھر بیٹھنے کے بعد میں نے اپنی میز کی دراز کھول کر کاغذ اور قلم نکال لیا۔ اب میں اسپتال کی ملازمت ترک کرنے کے لیے استعفیٰ لکھ رہا تھا۔

استعفیٰ لکھنے کے بعد ایک حد تک میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے لباس تبدیل کیا۔ پھر استعفے کو ایک لفافے میں رکھ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج ہی ڈاک کے ذریعے اسپتال کی انتظامیہ کو استعفیٰ بھیج دوں گا اور پھر کبھی مستشفی الیرموک کا رخ نہیں کروں گا۔

اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب میں اپنی کار میں بیٹھ کر اسپتال سے روانہ ہوا۔ میری کوٹھی دریا کی دوسری جانب شاہ راہ سعدون پر تھی، وہاں سے تقریباً نصف میل۔ کچھ فاصلے کے بعد میں دریا پر بنے ہوئے پل سے گزرنے لگا۔ میرا ذہن اپنے فیصلے سے مطمئن تھا۔ اپنے ضمیر کی ملامت سے بچنے کا میرے پاس صرف یہی راستہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے فیصلے پر شدید حیرت کا اظہار کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں کی زندگی بھی اس سے متاثر ہو سکتی ہے، خصوصاً ڈاکٹر حارث کے بوڑھے باپ کی زندگی جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا لیکن اس بوڑھے کرنل کی زندگی دوسرے افراد کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ وہ افراد جو میرے ہاتھوں زندگی پانے کے بجائے موت سے ہمکنار ہو سکتے تھے۔ ان کی زندگی ڈاکٹر حارث کے باپ اور اس کی ماں کے لیے قربان نہیں کی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر حارث کے والدین کا مستقبل روشن رہے یا تاریک ہو جائے مگر میں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ لے کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کار چلا رہا تھا۔ پل سے گزرنے کے بعد میرے راستے میں بائیں جانب ایک پارک پڑتا تھا جہاں اسپتال سے لوٹتے ہوئے کبھی کبھار میں رک جاتا تھا مگر اس روز نہیں رکا۔ ابھی میری کار پارک سے کچھ آگے بڑھی ہوگی کہ مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ میں نے غیر ارادی طور پر بریک پر پاؤں رکھ دیا اور عین اسی وقت معمولی سا دھماکا ہوا اور کوئی شے میری کار کی کھڑکی سے گزر کر اندر آ گری۔ کار میں گرتے ہی وہ شے پھٹ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا میری کار میں گاڑھا گاڑھا سا دھواں بھرنے لگا۔ اسی کے ساتھ میرا سر چکرانے لگا لیکن بے ہوش ہونے سے قبل میں اپنی کار روک چکا تھا ورنہ وہ ایک کھمبے سے ٹکرا جاتی۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کتنی دیر ہوش و خرد سے بیگانہ رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں خود کو ایک اجنبی ماحول اور اجنبی جگہ پا کر چکرا سا گیا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پوری بوتل چڑھا گیا ہوں۔ میرا ذہن بوجھل بوجھل سا تھا۔ میں اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا کہ آخر میں کہاں ہوں؟ اور اس گہری نیند سے پہلے کہاں تھا؟ پھر مجھے بہت آہستہ آہستہ اور ایک ایک کر کے گزرے ہوئے تمام واقعات یاد آنے لگے۔ گھر سے میں اسپتال گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک آپریشن کیا تھا جو ناکام رہا تھا۔ پھر اسپتال سے اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔ گھر کے راستے میں شاہ راہ سعدون پر پارک کے قریب مجھے وہ حادثہ پیش آیا تھا۔ میرا ذہن فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ایک بار پھر میں اپنے دشمنوں کی قید میں پھنس چکا ہوں۔ دنیا بھر میں میرے دشمنوں کی کمی تو نہیں تھی۔ وہ روسی بھی ہو سکتے تھے، امریکی بھی اور ان کا تعلق چین سے بھی ہو سکتا تھا۔

اپنے پیچھے لگے ہوئے ایک چینی دشمن کو میں نے ایران کے دوران قیام میں ٹھکانے لگا دیا تھا۔ پھر میں عراق آ گیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اور ایک نئی زندگی اپنانے کے باوجود میں محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ بہت جلد مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ ایک روسی اور ایک امریکی لڑکی میری بو پا چکے ہیں۔ بصرے سے واپسی کے دوران وہ دونوں بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ پھر اپنے دل پر پتھر رکھ کر میں نے ان دونوں کو باری باری ہلاک کر دیا کیوں کہ کسی کو قتل کرتے ہوئے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی بلکہ میرا دل دکھتا ہے، میری روح تک کانپ اٹھتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ رعایت کا مطلب میری موت ہے۔

ماضی قریب میں اپنے تین بڑے دشمنوں سے نجات حاصل کرنے

کے بعد اب ایک بار پھر میں کسی دشمن، انجان دشمن کی قید میں تھا لیکن ایسا تو نہیں کہ کوئی اور ملک بھی میرے وجود میں دلچسپی لے رہا ہو؟ میں نے سوچا۔ روس اور امریکہ کی جانب سے تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ اپنے خطرناک ایجنٹ میرے پیچھے لگا سکتے البتہ اس چینی ایجنٹ کے قتل کو کئی ماہ گزر چکے تھے جسے میں نے ایران میں ٹھکانے لگایا تھا۔ ممکن ہے چین ہی نے اپنا کوئی خطرناک ایجنٹ میرے پیچھے لگا دیا ہو۔

اس بات کا میں پہلے ہی یقین کر چکا تھا کہ اب تک میں روس اور امریکہ کا بس ایک ایک ایجنٹ ہی تھا۔ ان دونوں ملکوں نے یہ حکمت عملی پے در پے شکستوں کے بعد اپنائی تھی۔ بہت سے ایجنٹوں کی موجودگی جلد ہی ان کا راز فاش کر دیتی تھی اور پھر بیک وقت یا باری باری وہ میرے ہاتھوں موت کی اندھی وادی میں دھکیل دیے جاتے تھے۔ صرف چین نے اس سلسلے میں ابھی اپنی پالیسی نہیں بدلی تھی حالانکہ اسے بھی بہت سے خطرناک اور بہترین ایجنٹوں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

میرے لیے اس قید خانے سے نکل جانا مشکل نہیں تھا لیکن صورت حال کے پیش نظر میں ابھی قید ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ بے ہوشی کے دوران مجھے قتل کر دیا جاتا یا میرے دشمن جہاں چاہتے مجھے وہاں سے لے جا سکتے تھے لیکن ہوش میں آنے کے بعد ایسا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے دشمن، خطرناک ترین دشمن بھی مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ مجھ جیسے قیمتی آدمی کو قتل کرنے کا مطلب اربوں ڈالر کا نقصان ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ امریکی حکومت نے مجھ پر اربوں ڈالر خرچ کیے تھے۔ اس کے علاوہ روس اور چین بھی پیچھے نہیں تھے۔ مجھ پر روس اور چین کا بھی بہت سا سرمایہ صرف ہو چکا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر میرے دشمن مجھے اغوا کر سکتے تھے۔ میں اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ ایک بار پہلے کسی بھی دشمن کے قابو میں آنے کے بعد پھر کبھی مجھے آزادی نصیب نہیں ہو سکے گی۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ پھر ساری دنیا پر اسی ملک کی حکمرانی ہوتی، اسی کا سکہ تمام دنیا پر چلتا، میں جس کے قابو میں ہوتا۔ یہ بڑی طاقتوں کے درمیان اقتدار کی جنگ تھی اور میں ان کے درمیان ایک متنازعہ مسئلہ بن گیا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اس جگہ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا، جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ یہ بات بھی میری باریک بین نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی کہ کمرے کی چھت میں چھوٹے چھوٹے سے کئی سوراخ تھے جو غالباً تازہ ہوا کے لیے تھے تاکہ اس کمرے میں موجود کوئی بھی شخص دم گھٹنے کے سبب مر نہ جائے۔ کمرے کا دروازہ آہنی تھا۔ وہ کمرا کسی بینک کے اسٹرانگ روم کی طرح تھا جہاں رقم رکھی جاتی تھی۔ اس کمرے کے بند ہونے کے بعد کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کمرے میں ایک پلنگ کے سوا کچھ اور نہیں تھا جس پر کچھ دیر پہلے مجھے ہوش آیا تھا۔

اس قید خانے کا گہری نظروں سے جائزہ لینے کے بعد میں نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ وہ قید خانہ جس عمارت کا حصہ ہے اس عمارت میں میرے سوا اور کوئی بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر اس عمارت میں میرے سوا کوئی اور بھی موجود ہوتا تو بہت سے سوالوں کے جواب مجھے خود بخود مل سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے کوئی زیادہ فکر نہیں تھی۔ مجھے اپنی جسمانی قوت اور حیرت انگیز صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ میں بغیر کچھ کھائے پیے پورے ایک ماہ تک اپنی پوری جسمانی قوتوں کے ساتھ زندہ رہ سکتا تھا۔

بستر سے اٹھ کر میں کچھ دیر اس چھوٹے سے کمرے میں ٹہلتا رہا، پھر دوبارہ بستر پر دراز ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس دوران میں یہ دیکھ چکا تھا کہ میری جیبوں سے ریوالور کے سوا کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی میرا ماورائی ذہن میرے خیال کی قوت سے متحرک ہو گیا۔ کچھ دیر کی تلاش و جستجو کے بعد میرے ذہن نے ایک اور انسانی ذہن کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ شخص اس قید خانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس شخص کا فاصلہ قید خانے سے صرف بیس گز تھا۔ پھر میں نے اپنے طاقتور ذہن سے اس شخص کے ذہن کو فوراً ہی مغلوب کر لیا کیونکہ اس کے ذہن نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میرے ذہن کی طاقتور لہریں بار بار اس شخص کے ذہن سے ٹکراتی رہیں۔ اب اس شخص کا ذہن میرے لیے کسی کھلی کتاب کی طرح تھا جسے میں بغیر کسی رکاوٹ کے پڑھ سکتا تھا۔

اس شخص کا نام احمر تھا اور وہ عراقی ہی تھا۔ احمر ایک ایسی شخصیت کا دست راست تھا جو تمام عرب دنیا کے لیے جانی پہچانی شخصیت تھی۔ یہ شخصیت ایک بین الاقوامی مجرم سالم کی تھی۔ آج تک صرف چند ہی افراد سالم کی صورت دیکھنے میں

کامیاب ہو سکے تھے جن میں سے بیشتر اب اس دنیا میں نہیں تھے۔

یہ عمارت جہاں میں قید تھا، بغداد ہی کی ایک آبادی راغبہ خاتون میں تھی۔ راغبہ خاتون، متوسط اور نچلے طبقے کی آبادی ہے۔ وہاں شہر کی اعلیٰ درجے کی بستیوں کے مانند بڑی بڑی عمارتیں نہیں تھیں۔ مکان بھی پرانی طرز کے اور بوسیدہ سے تھے جن سے مکینوں کی حالت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

مشہور زمانہ قاتل سالم اس وقت عمارت میں موجود نہیں تھا۔ احمر کے علم میں صرف اتنا تھا کہ اس کے آقا نے دو چینیوں سے سودا کیا ہے۔ ان چینیوں کے مشکل نام احمر کو یاد نہ رہ سکے تھے، ہاں ان دونوں کا حلیہ اس کے ذہن میں ضرور محفوظ تھا۔ ان دونوں کے حلیے خود میرے لیے بھی اجنبی ہی تھے۔ میں ان دونوں چینیوں کو نہیں جانتا تھا۔ وہ دونوں کسی چینی ہی کا سفارشی خط لے کر سالم کے پاس آئے تھے۔ احمر کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اب وہ دونوں چینی کل دوپہر سے پہلے وہاں نہیں آئیں گے۔ ان کے خیال میں مجھے کل دوپہر سے پہلے ہوش نہیں آ سکتا تھا۔ انھوں نے مجھے ایسا ہی طاقتور انجکشن دیا تھا۔ اس دوران میں وہ مجھے چوری چھپے عراق سے لے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کیونکہ سالم سے یہی طے ہوا تھا کہ جب تک وہ مجھے وہاں سے لے جانے کی تیاریاں نہ کر لیں، میں اسی عمارت میں تہ خانے میں موجود قید خانے میں رہوں گا۔ وہ چینی مجھے کل شام تک بہ حالت بے ہوشی اسی قید خانے میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ انھیں امید تھی، وہ کل شام تک تمام ضروری تیاریاں مکمل کر لیں گے۔

بس وہ دونوں میرے خیال میں اسی مرحلے پر چوٹ کھا گئے تھے۔ اگر وہ ہر گھنٹے کے بعد مجھے اتنی ہی طاقت کا انجکشن دیتے رہتے تو شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ ان احمقوں کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مجھے بھی عام انسانوں کے معیار پر ناپا تھا۔ سوچتے ہوئے میں مسکرا اٹھا۔

مجھے اب علم ہو چکا تھا کہ کل شام سے پہلے میرے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اب میرے ذہن میں یہ الجھن نہیں تھی کہ میرے دشمن کون ہیں اور کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس پر بھی قادر تھا کہ جب چاہتا اپنے ذہن کو سونے کی ترغیب دے کر ایک مقررہ وقت تک کے لیے گہری اور میٹھی نیند سو جاتا۔ اس وقت بھی میں نے ایسا ہی کیا، لیکن احتیاطاً اپنے ذہن کو یہ حکم بھی دے دیا کہ ہر گھنٹے کے بعد میری آنکھ کھل جائے تاکہ حالات میں غیر متوقع طور پر اچانک کوئی تبدیلی پیدا ہو جائے تو میں اس سے بے خبر نہ رہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں جس کمرے میں قید ہوں اس کی چابیاں احمر کے قبضے میں ہیں۔ میں اگر چاہتا تو اسی وقت بہ آسانی احمر کو اس کمرے کا قفل کھولنے پر مجبور کر سکتا تھا یا کوئی دوسری صورت بھی پیدا کر سکتا تھا لیکن ابھی مجھے کل دوپہر تک وہیں رکنا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کو ہر حال ختم کر دینا چاہتا تھا کہ اسی پر میری زندگی کا دارومدار تھا۔

پھر میں سو گیا، بالکل گہری نیند اور ہر گھنٹے کے بعد میرا ذہن پوری طرح بیدار ہوتا رہا۔ ہر بار بیدار ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی میں دوبارہ گہری نیند سو جاتا تھا۔ اس شب میرے تھکے ہوئے اعصاب کو بہت سکون ملا۔ کچھ اثر اس دوا کا بھی تھا جو انجکشن کے ذریعے میرے جسم میں داخل ہو گئی تھی۔

اس قید خانے میں مدھم سا بلب روشن تھا جس سے دن اور رات کی تمیز مشکل تھی۔ بارہ گھنٹے سونے کے بعد میں پوری طرح بیدار ہو گیا۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت کے ساتھ ساتھ دن اور تاریخ بھی دیکھی۔ تاریخ بدل چکی تھی اور دن بھی، گویا اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ دوپہر ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔

وقت گزاری کے لیے میں بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اب میرا ذہن اس عمارت میں سالم کو تلاش کر رہا تھا۔ پہلے میرے ذہن کی نادیدہ طاقتور لہریں احمر کے ذہن سے ٹکرائیں۔ میں نے احمر کے ذہن کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ سالم اس وقت اسی تہ خانے کے ایک کمرے میں محو خواب ہے۔ سوتے ہوئے یوں بھی شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اسی لیے کسی خوابیدہ شخص کے ذہن کو پڑھنا آسان ہوتا ہے۔ میں نے سالم کی تلاش شروع کر دی اور کچھ ہی دیر میں کامیاب ہو گیا۔ اب میں سالم کا ذہن پڑھ رہا تھا۔

ان دونوں چینیوں سے پانچ ہزار دینار میں سالم کا معاملہ طے ہوا تھا۔ ان دونوں کے نام لن فو اور شو دانگ تھے۔ وہ سالم کے نام ایک چینی لیو چن کا خط لائے تھے۔ لیو چن سے سالم کی دوستی تھی۔ لیو چن، جمہوریہ چین سے فرار ہو جانے والا ایک مجرم تھا جو

چینی حکومت کو کئی مقدمات میں مطلوب تھا۔ اگر وہ چین میں ہوتا یا پکڑا جاتا تو اسے پھانسی ہو جانا یقینی تھی۔ اس نے چین سے فرار ہو کر مغربی دنیا میں پناہ حاصل کر لی تھی۔ اس کا مستقل قیام تو فرانس کے شہر پیرس میں تھا لیکن اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب کہاں ہوگا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ سالم سے رابطہ قائم کرنے کے لیے چینی ایجنٹوں نے اسے ذریعہ بنایا تھا۔ غالباً طویل عرصہ گزر جانے کے بعد چینی حکومت کے اور لیو چن کے درمیان سودے بازی ہو گئی تھی ورنہ پہلے تو چینی ایجنٹوں کو حکم تھا کہ وہ لیو چن کو جہاں بھی دیکھیں گولی مار دیں۔ یہ حکم اب یقیناً چینی حکومت نے واپس لے لیا تھا ورنہ چینی حکومت کے ایجنٹ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکتے۔ وہ دنیا کے عیار ترین مجرموں میں سے ایک اور سالم ہی کا ہم پلہ تھا۔ یہی ان دونوں کے درمیان قدر مشترک تھی۔ وہ اکثر ایک دوسرے سے "کاروباری معاونت" بھی کرتے رہتے تھے۔

سالم کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان دونوں چینیوں میں سے ایک شخص لن فو نے سالم کو وہ مخصوص کارتوس دیا تھا جس سے مجھ پر اس نے فائر کیا تھا۔ یہ مخصوص قسم کا کارتوس کسی کو ہلاک کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ اسے بے ہوشی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ کارتوس پھٹنے کے بعد اس سے جو دھواں نکلتا تھا وہ کسی بھی جاندار شے کو بے ہوش کر سکتا تھا۔ سالم نے پارک کے سامنے موجود ایک تین منزلہ عمارت کی کھڑکی سے مجھ پر فائر کیا تھا۔ اس کا نشانہ یقیناً بے خطا تھا۔

جب میں نے اس تہ خانے سے باہر نکلنے کا راستہ بھی معلوم کر لیا تو پھر کوئی ایسی بات نہ رہ گئی جسے جاننے کی مجھے جستجو ہوتی۔ دشمنوں نے مجھے زیر دام لانے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا اس کا بڑا حصہ کھل کر میرے سامنے آ چکا تھا۔ منصوبے کا دوسرا حصہ مجھے عراق سے چین لے جانا ہوتا۔ اس لیے اسے جاننے کی جستجو لاحاصل تھی۔ دوپہر ہونے تک مزید دو گھنٹے میں نے اپنے ذہن کو آرام پہنچایا۔

پھر جس وقت میری سماعت سے بھاری قدموں کی چاپ ٹکرائی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دروازے کے قفل میں چابیاں گھمائے جانے کی آوازیں سنیں اور مسکرا اٹھا لیکن میرا دل رو رہا تھا۔ دروازے کا قفل دو چابیوں کی مدد ہی سے کھولا جا سکتا تھا۔ یہ بات مجھے احمر کا ذہن پڑھ کر پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔

کچھ دیر بعد میرے ہاتھوں دو جیتے جاگتے انسانوں کا خون ہونے والا تھا اور میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور اسی کے ساتھ میرے خیال کی قوت متحرک ہو گئی۔ مجھے حسب معمول میرے وجود کی اطراف دھند سی پھیلی اور پھر میرا وجود نادیدہ بن گیا۔ اب اس کمرے میں داخل ہونے والوں کو کمرا خالی ہی نظر آتا حالانکہ میں اب بھی اس کمرے میں موجود تھا۔

تہ خانے کے اس محفوظ ترین کمرے کا دروازہ کھلتے ہی ان تینوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ ان تینوں میں سے دو چینی تھے اور ایک عرب۔ وہ عرب احمر تھا۔ چینی، لن فو اور ژوانگ۔ "وہ... وہ کہاں گیا؟... کہاں گیا احمر؟" ان میں سے ایک چینی ہکلایا جو پستہ قد اور چہرے سے انتہائی عیار معلوم ہو رہا تھا۔ "کک... کیا تم نے کل سے اب تک اس کمرے کا دروازہ کھولا تھا؟"

اس چینی کا مخاطب عرب ہی تھا۔ اس عرب نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "نن... نہیں۔ کل سے یہ کمرا اسی طرح بند تھا۔ میں نے اسے تمہارے سامنے مقفل کیا تھا اور جب سے ابھی کھولا ہے۔"

میں اس دوران میں پستہ قد چینی کے ذہن کو قابو میں کر چکا تھا۔ لن فو اسی کا نام تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دراز قد چینی کا نام ژوانگ تھا۔ میں اب بہت تیزی سے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا کیوں کہ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ میرے پیچھے کیسے لگ گیا اور اس نے میرا سراغ کیسے لگا لیا۔

یہ سب کچھ جاننے کے ساتھ ساتھ میں ایک فیصلے تک پہنچ چکا تھا اور یہ فیصلہ ان دونوں چینیوں کی موت کے طریقۂ کار سے متعلق تھا۔

لن فو کا ذہن میرے ذہن کے تابع تھا۔ یہی سبب تھا کہ احمر کا جواب سنتے ہی لن فو غصے کے عالم میں چیخ اٹھا۔ "تم غلط بیانی کرتے ہو گدھے کی اولاد! تم نے دانستہ اسے یہاں سے فرار ہونے کا موقع دیا ہے۔ تم جھوٹے اور دھوکا باز ہو!"

احمر کا چہرہ شدید غصے کے سبب سرخ ہو گیا۔ یہ غصے کی زیادتی تھی جس کی وجہ سے اس کی قوت گویائی وقتی طور پر سلب سی ہو گئی تھی۔ وہ ایک "بلیغ قسم کی گالی" دیتا ہوا اچانک لن فو پر ٹوٹ پڑا۔ وہ بہر حال سالم ایسے خطرناک شخص کا معتمد

خاص تھا۔ ایرا غیرا نہیں جو گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہوتا۔

جواباً لن فو بھی اس سے بھڑ گیا۔ میں دور کھڑا خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ لن فو غالباً پہلے ہی سے احمر کے حملے کے لیے تیار تھا ورنہ احمر پہلے ہی حملے میں اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتا۔ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ احمر اور لن فو دونوں ہی کے پاس ریوالور موجود تھے مگر ان میں سے کسی نے بھی ریوالور نہیں نکالا تھا۔ میں نے ان دونوں ہی کے ذہنوں سے یہ بات محو کر دی تھی اس لیے یہ بات بہر حال میرے لیے عجیب نہیں تھی۔ گزشتہ روز سالم سے سودے بازی ہونے کے بعد انہیں یہ اجازت مل گئی تھی کہ وہ دونوں تہ خانے میں بھی ریوالور رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح گویا سالم نے ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے سالم کا ذہن پڑھ کر ہی معلوم ہوئی تھی۔ ان دونوں کو سالم کے دوست لیو چن نے بھیجا تھا۔ سالم کے خیال میں کم از کم ان پر اتنا اعتماد تو کیا ہی جا سکتا تھا۔ لیو چن نے ان دونوں کے بارے میں لکھا تھا کہ اگر سالم نے انہیں مطمئن کر دیا تو آئندہ بھی وہ لوگ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ اس کی دانست میں اتنے معمولی سے کام کے پانچ ہزار دینار بہت تھے اور یہ پیشکش لن فو ہی نے کی تھی جسے سالم نے فوراً قبول کر لیا تھا۔

احمر اور لن فو اس وقت ایک دوسرے کو وحشی درندوں کے مانند بھنبھوڑ رہے تھے اور ژوانگ ان دونوں سے قطعی الگ کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا گویا جیسے اس معاملے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اگر ژوانگ کا ذہن بھی میرے قابو میں نہ ہوتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس جھگڑے سے اب تک لاتعلق رہتا اور اپنے ساتھی لن فو کی مدد نہ کرتا۔ تقریباً پانچ منٹ تک ژوانگ کی یہی حالت رہی۔ پھر میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ اب وہ اپنے قول و فعل میں آزاد اور خود مختار تھا۔

ژوانگ کو جیسے اچانک ہی ہوش آ گیا۔ پہلے اس نے چونک کر لن فو کی طرف دیکھا جسے اب احمر نے زمین پر گرا لیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے لن فو کا گلا دبا رہا تھا۔ اسی لمحے ژوانگ کا ہاتھ تیزی سے اپنے کوٹ کی جیب میں گیا اور جب باہر نکلا تو اس میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی مگر ژوانگ نے اس کی پروا کیے بغیر احمر کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ فائر کے دھماکے سے تہ خانہ گونج اٹھا اور اسی کے ساتھ احمر کا جسم جھٹکا کھا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ گولی اس کے بھیجے میں اتر گئی تھی اور اسے چیخنے تک کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ اگر میں چاہتا تو احمر کو قتل ہونے سے بچا سکتا تھا لیکن ظاہر ہے مجھے اس جرائم پیشہ شخص سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ نہ معلوم خود احمر کی گردن پر کتنے بے گناہوں کا خون تھا کیونکہ وہ ایک مشہور زمانہ قاتل کا دست راست تھا۔ بدی نے بدی کو مٹا دیا تھا۔ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا تھا۔ تو پھر مجھے کیا پڑی تھی کہ ایسا نہ ہونے دیتا۔ ژوانگ بھی میری نگاہ میں بدی ہی کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اس سے قطع نظر احمر کا قتل ان دونوں چینیوں کی ہلاکت کا سبب بھی بننے والا تھا جیسا کہ میں نے سوچا اور فیصلہ کیا تھا۔ اسی کے عین مطابق!

احمر کے قتل ہوتے ہی لن فو کسی چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ اب ان دونوں کے عقب میں پہنچ کر رک گئی تھی۔ وہ دونوں ہی شاید اس سے بے خبر تھے کہ ایک ریوالور انہیں اپنی زد میں لے چکا ہے۔ وہ چونکے اس وقت جب ان کی سماعتوں سے ایک سرد اور سفاک آواز ٹکرائی۔ ظاہر ہے کہ ان کو قدموں کی چاپ سے بے پروا کر دینے والا میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ "تم دونوں اپنے ریوالور پھینک دو۔" یہ سرد آواز سالم کی تھی جو ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ "اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں تمہارے جسم چھلنی کر دوں گا۔"

ژوانگ نے ریوالور پھینکنے کی بجائے ایک دم تیزی سے مڑ کر آواز کی سمت فائر کرنا چاہا لیکن شاید وہ یہ بھول گیا کہ اس کے مقابل کوئی اناڑی نہیں، سالم تھا۔ تہ خانہ ایک بار پھر دھماکے سے گونج اٹھا۔ ژوانگ اپنا سینہ تھامے زمین پر آ رہا اور کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ میرے دشمنوں میں سے ایک اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا اور اب دوسرے کی باری تھی لیکن وہ بہت عیار تھا۔

"لن فو! مجھے معلوم ہے کہ ریوالور تمہاری جیب میں بھی ہے لیکن تم اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی بجائے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" سالم کی آواز پھر سنائی دی۔

لن فو نے فوراً ہی تعمیل حکم کی۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ اگر اس نے بھی اپنے ساتھی ژوانگ کی طرح کوئی ہوشیاری دکھانا چاہی تو اس کا انجام بھی مختلف نہ ہوگا۔ پھر جب لن فو نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تو بھی اپنے جسم کو حرکت نہیں دی۔ قدموں کی چاپ اس کے عقب میں رک گئی اور پھر اس کے کوٹ کی دائیں جیب

کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ سالم نے اس کے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا تھا۔ میں لِن فو کے ذہن میں جنم لینے والے خیالات کو پڑھ رہا تھا۔

چند ہی لمحوں میں جو کچھ ہوگیا تھا وہ لِن فو کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ آخر اسے کیا ہوگیا تھا؟ ایسی حماقت کا ثبوت تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیا تھا۔ آخر ساری صورت حال کو سمجھے بغیر وہ احمر کو ایک دم گالیاں کیوں دینے لگا تھا؟ بھلا احمر کو کیا پڑی تھی جو وہ اپنے آقا سالم سے غداری کرتا؟ اس شخص کو اگر کوئی فرار کرا سکتا تھا تو وہ خود سالم ہوسکتا تھا لیکن جرائم پیشہ افراد کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور وہ ان اصولوں پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ وہ کسی سے کوئی معاملہ طے کرنے کے بعد اس سے نہیں پھرتے۔ سالم سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ان کے شکار کو فرار کرا دیتا۔ پھر وہ کیسے فرار ہوگیا؟

معاً سالم کی آواز نے لِن فو کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ سالم کہہ رہا تھا۔ "اے احسان فراموش شخص! تیرے ساتھی نے جسے گولی مار کر ہلاک کردیا وہ شخص میرے لیے لاکھوں دینار سے زیادہ قیمتی تھا۔ احمر میرا واحد ساتھی تھا جس نے میرا اصل چہرہ دیکھا تھا اور میرا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہیں تھا۔ میں اسی کے ذریعے اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ قائم رکھتا تھا۔ بول کر تُو نے اور تیرے ساتھی نے ایسا کیوں کیا؟" سالم کے لہجے سے گہرے دُکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"سالم! میں سخت شرمندہ ہوں۔" لِن فو نرم آواز میں بولا۔ "دراصل اس شخص کے فرار نے میرے ہوش و حواس گم کردیے تھے۔"

"کیا؟" سالم کی حیرت زدہ آواز ابھری۔ اس کی نگاہ اب تک خالی کمرے کے اندر نہیں گئی تھی کیوں کہ وہ دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔

"ہاں سالم، وہ شخص فرار ہوگیا۔" لِن فو نے بتایا۔ "تو خود بھی دیکھ سکتا ہے کہ کمرا خالی ہے۔ اب مجھے بتا کہ تُو خود میری جگہ ہوتا تو تجھ پر کیا گزرتی اور تُو کیا سوچتا؟ کیا تُو احمر پر شک نہ کرتا؟"

"مگر... مگر احمر غدار نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر... اگر اس نے سالم سے غداری کی تھی تو پھر وہ اسی سزا کا مستحق تھا۔" سالم کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔ اس دوران میں وہ خالی کمرا بھی دیکھ چکا تھا۔

لِن فو اپنی طے شدہ موت سے بھاگ رہا تھا مگر میری موجودگی میں ایسا کس طرح ہوسکتا تھا! اس کے ذہن پر دوبارہ میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ اب وہ میرے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور تھا۔ وہ اب اپنے قول و فعل میں آزاد نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن میں وہی آتا جو میں اسے سوچنے پر مجبور کرتا۔ یہی سبب تھا کہ اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب اس کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات تھے۔ پھر وہ ایک دم چیخ اٹھا۔ اس نے سالم سے چیخ کر وہی کہا جو میں چاہتا تھا۔ "غدار وہ بھی تھا اور تو بھی سالم۔" لِن فو چیخا۔ "تیرے اشارے کے بغیر وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا تھا۔"

"قطعی نہیں۔" سالم کے لہجے میں سختی آگئی۔ "یہ سراسر الزام ہے۔ تم نے مجھے غدار کہا ہے مگر میں تمہارے نقصان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس گستاخی پر تمہیں معاف کرتا ہوں۔ یہ جان لو کہ سالم کے بارے میں تم نے بالکل غلط سوچا ہے۔ اب تمہاری زندگی کی ضمانت یہی ہے اور اسی میں بہتری بھی ہے کہ تم خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ۔" "تم شاید واقف نہیں کہ سالم اپنے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے والوں کی زبانیں اُن کی گُدّیوں سے باہر کھینچ لیتا ہے۔"

"اے بدزبان اور غدار شخص! مجھے اپنی بے گناہی کا یقین نہ دلا! میں ہرگز تیری باتوں میں نہیں آؤں گا۔" لِن فو غرّایا اور اسی کے ساتھ وہ اپنی جانب لپکتے ہوئے ریوالور کی پروا کیے بغیر تیزی سے مڑا۔ "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا!"

لِن فو کا ذہن اگر میرے قابو میں نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسی احمقانہ بات نہ کہتا۔ وہ شخص جسے سالم لِن فو کے نام سے جانتا تھا انتہائی عیار اور چالاک شخص تھا۔ وہ دلیر ضرور تھا مگر احمق نہیں تھا جو اس وقت غیر ضروری بہادری کا مظاہرہ کرتا۔ سالم اس وقت شاید یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ لِن فو دلیر ہے یا احمق! اب وہ اور لِن فو ایک دوسرے کے سامنے سامنے کھڑے تھے۔ سالم کے چہرے پر نقاب تھی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو مرنا ہی چاہتا ہے اے زرد چینی!" سالم پُرسکون لہجے میں بولا اور پھر لِن فو پر فائر کردیا۔ سالم کی چلائی ہوئی گولی لِن فو کی پیشانی میں گھس گئی۔ سالم کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ اس نے دونوں آنکھوں کے درمیان بالکل صحیح نشانہ لگایا تھا۔ لِن فو بھی اپنے ساتھی ژو ہانگ کی لاش کے قریب گرا جس کا جسم اس دوران میں ساکت ہوچکا تھا۔ سالم نے اپنا ریوالور جیب میں رکھنے کے لیے ہاتھ نیچے کیا اور اسی وقت میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ سالم اچھل پڑا اور دہشت زدہ ہوکر اپنی جانب اٹھے ہوئے ریوالور کی نال کو دیکھنے لگا۔ یہ منظر یقیناً اس کے لیے ناقابل یقین ہی ہوگا۔ اس کے خیال میں ریوالور فضا میں معلق تھا حالانکہ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے وہ دیکھنے سے قاصر تھا۔ وہ شخص جس نے اب تک متعدد قتل کیے تھے اس وقت بالکل بچہ معلوم ہو رہا تھا۔ اسے اپنے قریب تازہ کھلے ہوئے گلابوں کی خوشبو بھی یقیناً محسوس ہو رہی ہوگی۔ سالم ایسے لوگ پُراسرار واقعات پر یقین نہیں رکھتے لیکن اس وقت وہ اپنی زندگی میں کسی پُراسرار واقعے سے دوچار تھا۔

"سالم!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ حیران ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر میں اسے نظر نہ آسکا۔ ریوالور کی نال بدستور اس کی جانب تنی ہوئی تھی۔

"سالم!" میں پھر بولا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا وجود انسانیت کے لیے توہین ہے۔ انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہے؟"

سالم کے ہونٹ ہلے یوں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ دہشت کے سبب اس کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی تھی۔

"تم نے اب تک بے اندازہ قتل کیے ہوں گے۔ اتنے کہ تمہیں ان کی صحیح تعداد بھی یاد نہ ہوگی اور اپنے ہاتھوں قتل ہونے والوں کے نام تک تمہارے ذہن میں نہیں ہوں گے۔" میں نے پھر کہا۔ "اور اگر تم مزید زندہ رہے تو خلقِ خدا کے لیے عذاب ہی بنے رہو گے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ تمہارے خطرناک اور ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کردیا جائے! یوں کرو سالم کہ اپنے گناہوں کی پاداش میں خود کو گولی مار کر ہلاک کرلو۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سالم کا ریوالور میں نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ سالم کو یوں محسوس ہوا ہوگا جیسے ریوالور خود بخود فضا میں تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔

سالم ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ اس کا ذہن میرے قابو میں تھا لیکن اب وہ کسی قدر مزاحمت پر آمادہ تھا۔

"ریوالور لے لو!" میرے ذہن نے اس کے ذہن کو حکم دیا۔

یہ حکم سنتے ہی سالم کا ہاتھ مشینی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے ریوالور تھام لیا۔

"اب ریوالور کو اپنی کنپٹی پر رکھ کر اس کی لبلبی دبا دو!" سالم کے ذہن کو میری جانب سے دوسرا حکم ملا۔ "تمہیں اپنی تقدیر کا فیصلہ قبول کرلینا چاہیے!"

پھر جیسے اس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی خاموشی کی مہر ٹوٹ گئی۔ وہ بڑبڑایا۔ "مجھے اپنی تقدیر کا فیصلہ منظور ہے۔" اسی کے ساتھ اس نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔

دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا اور سالم کا جسم لہرا کر زمین پر آ رہا۔

وہ کمرا ایک بڑے ہال کا حصہ تھا جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی میں ہال کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ مجھے کھلا ہوا ملا۔ دروازے سے گزر کر میں ایک راہ داری میں پہنچ گیا، جس کی دونوں جانب سپاٹ اور چکنی دیواریں تھیں۔ اس راہ داری کے اختتام پر بھی ایک ایسی ہی دیوار نظر آ رہی تھی۔ بظاہر اس دیوار نے وہاں سے آگے بڑھنے کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اگر میری جگہ وہاں کوئی اجنبی ہوتا تو مایوس ہوکر پھر اسی ہال میں لوٹ جاتا مگر سالم کا ذہن پڑھنے کے بعد میری اجنبیت والی لاعلمی ختم ہوچکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس تہ خانے سے کس طرح نکل سکتا ہوں۔

میں اس راہ داری میں بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ اس کے اختتام تک پہنچ گیا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ راہ میں حائل سپاٹ دیوار خود بخود ایک دم اوپر اٹھتی چلی گئی۔ مجھے علم تھا کہ اس راہ داری کے آخری حصے پر کسی جسم کا وزن پڑنے سے وہ دیوار حرکت میں آجاتی ہے۔ اب وہاں ایک بے در دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے گزر کر میں ایک گول سے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں نے اوپر نگاہ اٹھائی اور توقع کے مطابق خود کو جیسے کسی کنویں کی گہرائی میں محسوس کیا۔ پھر اس کنویں کی سطح خود بخود اوپر اٹھنے لگی۔ کچھ دیر بعد ایک جھٹکا سا لگا اور اسی کے ساتھ سطح کا اوپر اٹھنا ختم ہوگیا۔ سامنے ہی مجھے ایک چوکور سا خلا نظر آیا۔ میں اسی خلا سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک گھنے پیڑ کا موٹا اور کھوکھلا تنا تھا جس سے میں باہر نکلا تھا۔ آس پاس بھی دوسرے گھنے پیڑ نظر آ رہے تھے۔ میں ان پیڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دائیں جانب بڑھتا رہا۔ گھنے پیڑوں سے نکل کر میں ایک پختہ پگڈنڈی تک پہنچ گیا جو ایک چھوٹے سے باغ کے

درمیان تنی ہوئی تھی۔ باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی قسمت میں مرجھانا ہی تھا کیونکہ ان کی نگہداشت کرنے والے اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔

میں اس پختہ پگڈنڈی پر بڑھتا چلا گیا جو بنگلے کے برآمدے کی جانب گھوم گئی تھی اور وہیں سے ایک پگڈنڈی بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ بالآخر میں بائیں جانب کی پگڈنڈی پر چلتا ہوا عمارت کے سرونٹ کوارٹر تک پہنچ گیا۔ وہ عقبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے خوف سے قبل میں نے اپنے وجود کو نادیدہ نہیں بننے دیا۔ پھر میں وہ عقبی دروازہ کھول کر باہر نکلا تو خود کو ایک پتلی سی گلی کے وسط میں پایا۔ میں بائیں جانب چل دیا اور پھر کچھ دیر بعد ہی اس گلی سے نکل کر ایک سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ علاقہ راغبہ خاتون ہی کا ہے۔

وہاں سے میں نے شاہراہ سعدون کے لیے ایک ٹیکسی لی اور روانہ ہو گیا۔ ٹیکسی کے چلتے ہی میرا ذہن گزرے ہوئے واقعات کے تانوں بانوں میں الجھ گیا۔ وہ دونوں چینی یقیناً بڑے بدنصیب تھے جو مجھے اغوا کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک یعنی ژوانگ چند دن قبل ہی بیجنگ سے بغداد پہنچا تھا۔ لن فو پہلے ہی بغداد آ چکا تھا۔ لن فو نے بہت چالاکی اور ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ مجھے اس کا ذہن پڑھ کر سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ وہ اسی لیے میری نظر میں نہیں آ سکا تھا۔ وہ پورے ایک ماہ سے بغداد میں تھا۔ اس نے احتیاطاً خود کوئی قدم اٹھانے کی بجائے روسی ایجنٹ ایلیخوف اور امریکی ایجنٹ میک گریگر کی کوششوں سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا اور اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے پیچھے لگا رہا۔ بہت جلد اسے علم ہو گیا کہ وہ دونوں میرے تعاقب میں ہیں۔ پھر اس نے ذاتی طور پر میرے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ایک بار وہ دانستہ میرے بہت قریب سے گزرا تاکہ میرے جسم سے اٹھنے والی مخصوص خوشبو محسوس کر سکے۔ وہ خوشبو میری پہچان تھی۔ پھر اسے یقین ہو گیا کہ اس کا مطلوبہ شخص میں ہی ہوں۔ انھی دنوں میں میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنے بصرہ چلا گیا اور راستے میں دونوں ایجنٹوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ خود لن فو بھی اسی ٹرین میں سفر کر رہا تھا مگر وہ دونوں روسی اور امریکی ایجنٹوں کی موت کے بعد اس نے بغداد آ کر کافی سوچ بچار کے بعد مجھے پہچاننے کی خاطر ایک منصوبہ بنایا اور اسی دوران میں ژوانگ بھی اس سے آ ملا۔ اغوا کرنے سے پہلے ہی اس نے سالم سے معاملات طے کیا اور سارا کو بھاری معاوضے پر راضی کر لیا۔ اس سے پہلے وہ اس راستے کو بھی چیک کر چکا تھا جہاں سے پر ہوک جانے کے لیے روز میری کار گزرتی تھی۔

جب میں بے ہوش ہو گیا تھا تو مجھے میری کار میں سے نکال کر ایک بند وین میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بند وین میرے بے ہوش ہوتے ہی بائیں گلی کی جانب سے آ کر میری کار کے پاس رک گئی تھی۔ اس وین کو لن فو چلا رہا تھا۔ وہ وین بھی سالم ہی نے فراہم کی تھی۔ وین کے پچھلے حصے میں ژوانگ موجود تھا جس نے لن فو کی ہدایت کے مطابق راستے ہی میں مجھے بے ہوشی کا طاقت ور انجکشن لگا دیا تھا۔ اس نے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کرنے والی دوا کی اتنی مقدار میرے جسم میں پہنچا دی تھی کہ کوئی شخص چوبیس گھنٹے سے قبل ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ راستے ہی میں ژوانگ نے میری جیب سے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ وین چلتے پیچیدہ راستوں سے گزرتی ہوئی راغبہ خاتون پہنچ گئی۔ اس وقت لن فو بہت خوش تھا۔ اس نے وہ کام انجام دے ہی دیا تھا جس کی خاطر اپنا ملک چھوڑ کر اور طویل سفر طے کر کے عراق آنا پڑا تھا۔ وہ کام جو روسی اور امریکی نہ کر سکے تھے اس نے انجام دے دیا تھا۔

اس پتلی سی گلی میں وین کا داخل ہونا کیونکہ ناممکن تھا اس لیے عمارت کے عقبی دروازے پر بند وین سے میرے بے ہوش جسم کو اتارا گیا پھر جب مجھے تہ خانے کے اس محفوظ کمرے میں بند کر دیا گیا تو لن فو اور ژوانگ مطمئن ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ انھیں یقین تھا کہ آئندہ روز شام سے پہلے مجھے ہوش نہیں آئے گا۔ پھر بھی انھوں نے دوسرا انجکشن دینے کے لیے احتیاطاً آئندہ روز دوپہر کا وقت مقرر کیا تھا۔ وہ دونوں بغداد کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل فرانڈلیس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ہوٹل بغداد ایئرپورٹ سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔

میں اپنے دشمنوں کے متعلق سوچتا رہا اور اسی دوران میں ٹیکسی شاہراہ سعدون پہنچ گئی۔ میں نے دور ہی سے اپنی کار کھڑی ہوئی دیکھ لی تھی۔ اس سے کچھ پہلے ہی سڑک کی دوسری جانب میں نے ٹیکسی رکوائی اور کرایہ ادا کر کے سڑک کی دوسری جانب بڑھ گیا۔

توقع کے مطابق مجھے اپنی کار اسی جگہ کھڑی مل گئی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ وہ عراق تھا مشرق وسطیٰ کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں میں جرائم کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کا سبب سخت ترین سزائیں تھیں۔ کار کی چابی ابھی تک اگنیشن میں اسی طرح لگی ہوئی تھی جس طرح چھوڑی گئی تھی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا پھر میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔ میں اب اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اب میں کچھ دن سکون و اطمینان سے

رہ سکتا تھا مگر صرف کچھ دن! اس وقت تک کہ دشمنوں کو حقیقت کا علم ہو جاتا۔ انھیں یہ خبر ہو جاتی کہ جنھیں انھوں نے ابوالہول کے لیے مہم پر بنا کر بھیجا تھا وہ تاریک راہوں میں مارے جا چکے ہیں اور ابوالہول ابھی زندہ ہے۔

چاہنے والے تو ان کے بھی ہوں گے جو آج میرے ہاتھوں مارے گئے۔ میرا ذہن بھٹکنے لگا۔ وہ جو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی سرزمین پر اجنبی ہاتھوں سے قتل ہو گئے اور وہ جن کے بے گور و کفن لاشے جانے کب تک زمین کی آغوش سے محروم رہیں گے۔ تقدیر کا جبر انھیں کہاں سے کہاں کھینچ لایا تھا! سب کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ زندگی سے کئی رشتے جڑے ہوتے ہیں۔ کوئی تنہا نہیں پھر میں کیوں تنہا ہوں؟ کیا میں بھی تقدیر کے جبر کا شکار نہیں؟ میں سوچتا رہا کہ بھری دنیا میں شاید میری طرح کوئی اور تنہا نہیں ہوگا۔ میں سوچتا تو میرے دماغ کی نسیں جیسے تننے لگتیں۔

اب ڈاکٹر حارث کی کوٹھی زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ میری آنکھوں میں اس بوڑھی عورت کا چہرہ گھومنے لگا جو مجھے سچ مچ اپنا ہی بیٹا سمجھتی تھی۔ کتنی معصوم تھی وہ! کیا میں کبھی اس شفیق و مہربان عورت کو یہ بتانے کی ہمت کر سکتا تھا کہ جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتی ہے وہ ایک بہروپیا ہے، اس کا بیٹا نہیں۔ اس کا بیٹا تو نہ جانے کہاں دشتِ غربت کی خاک چھان رہا ہوگا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ کون ہے اور اس کا اصل نام کیا ہے۔ مگر مجھے بھی تو اپنا اصل نام نہیں معلوم ابھی، آخر کون ہوں میں؟

ایک بے نام بے وطن وجود جس کے بہت سے نام ہیں لیکن کوئی نہیں۔ بہت سے وطن ہیں لیکن کوئی وطن نہیں۔ شہروں شہروں، ملکوں ملکوں بھٹکنے والی ایک آوارہ روح، ایک آوارہ خوشبو! یہ سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ وسیع و عریض کوٹھی کچھ دن سے میری پناہ گاہ بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے اور کتنے شہروں اور کتنے ملکوں میں مجھے یونہی اجنبیوں کے درمیان رہنا ہوگا اور انھیں اپنا کہنا ہوگا۔

کوٹھی کے کسی ملازم نے میری کار کو پھاٹک سے اندر آتے دیکھ لیا۔ وہ سیدھا عمارت کے اندر دوڑتا چلا گیا۔ مجھے علم تھا کہ ملازم میری خبر دینے گیا ہوگا۔ یقیناً اس بوڑھی ماں کو جو اپنے بیٹے کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہی ہوگی اور ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھتی ہوگی۔

کار کھڑی کر کے میں اترا ہی تھا کہ جیسے ایک تیر میرے سینے میں اتر گیا۔ وہ کوئی لڑکی نہیں تھی جو مجھے برآمدے میں نظر آئی تھی، وہ تو ایک شعلۂ حسن تھی جس نے میرے سارے وجود میں روشنی بھر دی تھی۔ وہ تو ایک قیامت تھی جو ایک آن میں مجھ پر گزر گئی تھی۔ وہ حجاب میں بے حجابی، وہ جیسے کم کم کلی کا کھلنا، ان شراب سی آنکھوں کی نیم بازی، لعلِ لبیں کی چمک، وہ تابشِ رخسار، وہ ابروؤں کی کمان، وہ پیشانی کا زرپاش ہلال، وہ لبِ ستر دریا و حریر، وہ جنبشِ شاخِ طوبیٰ، میں ایک نظر میں کیا کیا دیکھتا۔ میں مسحور سا آگے بڑھا۔

"حارث!" ایک کھنکتی ہوئی شیریں آواز میری سماعت میں اتر گئی اور پھر جیسے سارا طلسم ٹوٹ گیا۔

وہ جو کوئی بھی تھی، مجھے اچھی طرح جانتی تھی حالانکہ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرے طاقت ور ذہن کی لہریں اس لڑکی کے ذہن میں اتر چکی تھیں۔ پھر میں چند ہی لمحوں میں اس لڑکی کے بارے میں سب کچھ جان گیا۔ مجھے ڈاکٹر حارث پر رشک آیا۔ میں نے سوچا، کاش میں سچ مچ ڈاکٹر حارث ہوتا، ابوالہول نہ ہوتا۔

وہ صالحہ تھی، ڈاکٹر حارث کی منگیتر! وہ آج صبح ہی اپنی ماں کے ساتھ بصرے سے بغداد پہنچی تھی لہٰذا میں اس سے ملے بغیر ہی بصرے سے لوٹ آیا تھا۔

"حارث! تم ... تم کل سے کہاں تھے؟" صالحہ کے یاقوتی لبوں نے پھر حرکت کی۔ "خالہ جان کل سے فکرمند ہیں۔"

میرے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھے۔ میں سوچ چکا تھا کہ مجھ سے یہ سوال ضرور کیا جائے گا لیکن یہ سوال کرنے والی صالحہ ہوگی، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ "یہ جاننے کے لیے کہ میں کل سے کہاں تھا، صرف امی بلکہ ڈیڈی بھی بے چین ہوں گے۔" میں صالحہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا خیال ہے، اگر میں اندر چل کر ہی اس سوال کا جواب دوں! اس سے یہ ہوگا کہ مجھے اپنی بات دہرانا نہیں پڑے گی۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ صالحہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی میرے ساتھ چلنے لگی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ کرنل، کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک ملازم اس کے سامنے کھانا لگا رہا ہے۔ ڈاکٹر حارث کی بوڑھی ماں کے ساتھ اسی سے ملتی جلتی ایک عورت، برآمدے میں پڑے ہوئے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اجنبی ادھیڑ عمر عورت، صالحہ کی ماں ہی ہو سکتی ہے جو ڈاکٹر حارث کی خالہ تھی۔ مجھے دیکھ کر سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ ڈاکٹر حارث کا باپ بوڑھا کرنل پابندی

اوقات کا بہت قائل تھا اور اس کا سبب شاید فوجی تربیت تھی۔ وہ ہر کام ہر حال میں وقت پر کرنے کا عادی تھا۔ یہ اس کے کھانے کا وقت تھا اس لیے وہ کھانے کی میز پر نظر آ رہا تھا۔ گذشتہ دن سے میں غائب تھا اس سلسلے میں یقیناً اسے بھی تشویش ہوگی مگر جس کام کے لیے جو وقت مقرر تھا وہ بھلا کس طرح ٹل سکتا تھا!

میں نے صوفوں کے قریب پہنچ کر صالحہ کی ماں کو سلام کیا اور پھر کسی سے پہلے کہ کوئی کچھ پوچھتا میں نے خود ہی بتا دیا کہ کل سے اب تک ہسپتال ہی میں تھا۔

"مگر میں تو کل سے اب تک کئی بار تمہارے ہسپتال فون کر چکا ہوں بیٹے!" بوڑھا کرنل میری بات سن کر مڑا اور بولا۔ "ان لوگوں نے تو مجھے ہر بار یہی جواب دیا کہ تم ہسپتال سے جا چکے ہو اور وہاں نہیں ہو۔"

"انہیں یہ جواب دینے کے لیے میں نے ہی کہا تھا ڈیڈی!" میں نے بات بنائی۔

"کیوں؟" کرنل نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اس لیے کہ ایک مریض کی حالت بہت تشویش ناک تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اس مریض کے پاس سے ایک لمحے کو بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ ہاں مجھے یہ علم نہیں تھا کہ ساری رات گزر جائے گی اور پھر دن چڑھے پہلے میں گھر نہیں لوٹ سکوں گا ورنہ کسی نہ کسی طرح فون ضرور کر دیتا۔"

"لیکن... لیکن بیٹے! میں جو تمام رات تمہارا انتظار کرتی رہی تھیں۔"

"تمہارا انتظار ایک شخص کی زندگی سے زیادہ نہیں حارث کی ماں!" کرنل نے اپنی بیوی کی بات کاٹ دی پھر بولا۔ "جب سپاہی محاذ پر ہوتا ہے تو اسے صرف اپنے فرض کا احساس ہوتا ہے، کسی اور بات کا نہیں۔ جنگ صرف میدانوں میں نہیں لڑی جاتی، زندگی کے ہر محاذ پر آدمی جنگ لڑتا ہے اور جو جنگ تمہارا بیٹا لڑ رہا ہے وہ تو بہت مقدس جنگ ہے۔"

"آپ تو بس ہر بات پر جنگ اور میدانِ جنگ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔" کرنل کی بیوی اپنے ماتھے پر بل ڈالتی ہوئی بولی۔ "یہ تو پوچھا نہیں بیٹے سے کہ کل سے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں! بس جنگ کا ذکر لے بیٹھے!"

"تم نے کل سے کب کچھ کھایا ہے! اور ان لوگوں کو بھی تو کھانا کھلاؤ۔" کرنل نے صالحہ اور اس کی ماں کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا۔ "اب تو تمہارا بیٹا لوٹ آیا گھر!"

پھر سبھی کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔ کھانے کے دوران کئی بار میں نے نظر بچا کر صالحہ کی جانب دیکھا اور ہر بار ہی میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ صالحہ جیسے کھانا کھانے کی بجائے مجھے ہی دیکھے

جا رہی تھی۔ صالحہ کی بولتی ہوئی آنکھیں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں گلہ بھی تھا اور محبت کا سمندر بھی! فراق میں بیتے ہوئے لمحوں کی کہانی بھی تھی اور وصالِ یار کے بعد ایک بے نام مسرت کی لہر بھی۔ ان آنکھوں میں بہت کچھ تھا جسے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے میں کچھ سوچنا چاہتا تھا اور سوچنے کے لیے تنہائی ضروری تھی۔ میں اس معصوم سی بھولی بھالی لڑکی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا جو مجھے اپنا محبوب سمجھ رہی تھی۔ لیکن مجھے کچھ سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں ابھی اپنے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کر کے بعد مسہری پر دراز ہوا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور صالحہ اندر آ گئی۔ "آؤ... آؤ صالحہ!" میں صالحہ کی غیر متوقع آمد سے کچھ سٹپٹا کر اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹے رہو، لیٹے رہو! تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو۔ یوں بھی میں اس گھر میں مہمان نہیں۔" صالحہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"ہاں یہ تو ہے!" میں نے مسکرا کر کہا پھر بولا۔ "مگر تمہاری موجودگی میں خود میرا دل بھی تو لیٹنے کو نہیں چاہ رہا۔" صالحہ بھی میرے قریب آ کر مسہری پر بیٹھی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ آنے والا ملازم تھا جو میرے لیے ایک بڑے مگ میں کافی لے کر آیا تھا۔ ملازمین بھی میری عادات سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ میں دونوں وقت کھانے کے فوراً بعد کافی پیتا تھا۔ ملازم نے میرا اشارہ پا کر مسہری کے سرہانے رکھی ہوئی تپائی پر کافی کی پیالی رکھ دی۔

"ایک کپ اور لاؤ۔" میں نے ملازم کو حکم دیا۔ "ان کے لیے۔" میں نے صالحہ کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت بہتر جناب!" ملازم نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹرے میں اٹھائے ہوئے مڑا۔

"نہیں، میں کافی نہیں پیوں گی، میرے لیے نہ لانا۔" صالحہ ملازم سے بولی۔ "تم جا سکتے ہو۔" ملازم سے یہ کہہ کر صالحہ میری طرف مڑی اور کہا۔ "کمال ہے حارث! تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کافی نہیں پیتی۔ خود تم بھی تو پہلے کھانے کے بعد چائے پیا کرتے تھے۔ تعجب ہے کہ یہ عادت کیسے بدل گئی!"

"وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں صالحہ!" میں نے طویل سانس لے کر کہا اور پھر کافی کی پیالی اٹھا کر چسکیاں...

"آج تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو حارث!" صالحہ کے لہجے میں

تھی۔ "معاف کرنا مجھے تم کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے ہو۔ پہلے تمہیں کوئی خوشبو پسند نہیں تھی۔ لیکن میں اس وقت محسوس کر رہی ہوں کہ تم خاصی تیز خوشبو لگائے ہوئے ہو۔ یہ شاید گلاب ہوں... مہکتے ہوئے تازہ گلابوں ایسی خوشبو ہے۔ مگر تیز ہونے کے باوجود یہ ناگوار محسوس نہیں ہوتی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، میں بھی کیا ذکر لے بیٹھی۔ میں اس وقت تم سے صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ بصرہ آنے کے باوجود بھی تم گھر کیوں نہیں آئے؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا؟"

"میں دراصل... ہاں بے حد مصروف تھا صالحہ! تمہیں علم ہے کہ اس کانفرنس میں تیرہ سائنس دانوں نے شرکت کی تھی اور ان سب کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا میرا فرض تھا۔" میں نے صفائی پیش کی اور کافی کی پیالی دوبارہ میز پر رکھ دی۔

"بصرہ پہنچنے کے بعد تم پر کچھ اور بھی تو فرض تھا حارث!" یہ کہتے ہوئے صالحہ مزید میرے قریب آ گئی اور پھر اچانک ہی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے صالحہ کے لمس نے میرے تمام وجود کو لرزا کر رکھ دیا ہو۔ میں کوشش و خواہش کے باوجود اپنا ہاتھ صالحہ کے نرم و نازک ہاتھ سے نہ چھڑا سکا۔

"ہاں... ہاں صالحہ! ...تم... تم ٹھیک کہتی ہو مگر... مگر کیا تم یقین کرو گی کہ میں... میں دانستہ تم سے نہیں ملا!" میں نے ہمت کر کے سچ بول ہی دیا۔

"کیا؟" صالحہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تم... تم دانستہ مجھ سے نہیں ملے؟ جان بوجھ کر گھر نہیں آئے؟ مگر کیوں؟ ابھی... تو تم کہہ رہے تھے کہ مصروفیت کے سبب..."

"وہ... وہ جھوٹ... جھوٹ تھا صالحہ!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"لیکن... لیکن کیوں؟ تم... تم نے یہ جھوٹ کیوں... کیوں بولا تھا؟ اور... اور اب... اب سچ بولنے پر کیوں مجبور ہو گئے؟" صالحہ کی آواز کسی قدر بھرائی ہوئی تھی۔

"اس لیے... اس لیے صالحہ کہ ابھی تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد میں... میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں... میں وہ نہیں ہوں صالحہ جو تم مجھے سمجھ رہی ہو۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم!" صالحہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "کیا تم وہ حارث نہیں جسے میں بچپن سے چاہتی آئی ہوں؟ کیا تم وہ حارث نہیں جس نے... جس نے مجھ سے محبت کے پیمان باندھے تھے؟"

"نہیں صالحہ! میں وہ نہیں ہوں، وہ حارث نہیں ہوں۔" میں نے اپنے دل پر جبر کر کے یہ سچ بات کہہ دی۔ اسی وقت میری نگاہ صالحہ کے چہرے پر پڑی اور میں کانپ اٹھا۔ صالحہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے اس لڑکی کو دھوکا دینے کا کوئی حق نہیں۔ مجھے ڈاکٹر حارث کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کا کوئی اختیار نہیں۔ لیکن مجھے اس لڑکی کا دل بھی تو نہیں توڑنا چاہیے! نہیں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مطلب، تم نہیں بننا چاہیے! میرے وجود میں جیسے کوئی چیخ اٹھا۔

اسی وقت صالحہ کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ٹھیک ہے... میں... میں سب سمجھ... سمجھ گئی حارث! تم... تم اپنی محبت واپس لینا چاہتے ہو۔" وہ ہچکیاں لینے لگی۔

"صالحہ! چپ ہو جاؤ، خدا کے لیے اپنے آنسو روک لو ورنہ ان میں میرا پورا وجود بہہ جائے گا۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو صالحہ! تم شاید مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میرے دل سے تمہاری محبت ہرگز نہیں نکل سکتی۔" یہ آخری جملہ بے اختیاری طور پر میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ اس کا مقصد صالحہ کو صرف تسلی دینا تھا لیکن یہ جملہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا۔ یہ بات خود میں نے بھی محسوس کر لی تھی۔ دراصل صالحہ کو تسلی دینے کے لیے مجھے ان الفاظ کے سوا اور الفاظ ملے ہی نہیں سکے تھے۔

"پھر... پھر یہ سب کیا ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" صالحہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"تم یہ تسلیم کرتی ہو نا کہ محبت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں؟" میں نے دانستہ براہِ راست صالحہ کی حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا... کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ... کہ میں نے محبت کے تقاضے پورے نہیں کیے؟"

"نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو، میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ سنو!" یہ کہتے ہوئے میں نے بے اختیار صالحہ کے نرم و نازک ہاتھوں کو تھام لیا اور بولا۔ "آدمی اپنے محبوب کو خوش اور اس کے مستقبل کو بہتر دیکھنا چاہتا ہے نا! بولو، میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم!" صالحہ نے سر ہلا کر تصدیق کی۔

"تو صالحہ بیٹی... میں دراصل تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ تمہارا مستقبل خوشگوار نہیں ہو سکتا۔"

"آج نہ جانے کیوں تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آخر ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"مقصد!" میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "مقصد صرف یہ ہے صالحہ کہ میں تمہیں تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مستقبل غیر یقینی ہے اس لیے میں

اپنے پیشے کو ترک کرنے کا فیصلہ ـــ"

"کیا؟" صالحہ نے حیرت کے سبب درمیان ہی میں میری بات کاٹ دی۔

"ہاں صالحہ! میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ یہ پیشہ ترک کر دوں گا۔ مستشفی الیرموک سے میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔

"مگر کیوں؟" صالحہ کے لہجے کی حیرت اب تک برقرار تھی۔ "تم نے تو اس منزل تک پہنچنے کے لیے طویل جدوجہد کی ہے، پھر آخر ایسا کیوں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ میرے خیال میں کوئی شخص اسی وقت اپنا پیشہ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے جب اسے کسی اور پیشے میں زیادہ بہتر مواقع مل رہے ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم ڈاکٹری چھوڑ کر کیا ....."

"ٹھہرو صالحہ!" میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے چپ کر دیا، پھر بولا۔ "تم نے آدھی بات کہی ہے۔ پوری بات یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت اپنا پیشہ ترک کرتا ہے جب کسی دوسرے پیشے میں بہتر مواقع مل رہے ہوں یا پھر وہ اپنے پیشے کا اہل نہ ہو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ "اس کا مطلب سمجھیں تم؟" پھر اپنے سوال کا جواب سنے بغیر میں نے خود ہی مزید کہا۔ "میں گزشتہ کچھ دن سے شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے بے گناہ انسانوں کی زندگی سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے صالحہ کو گزشتہ دن کا واقعہ سنا دیا۔ پھر بولا۔ "یہ پہلا آپریشن نہیں تھا صالحہ جو میرے ہاتھوں ناکام رہا اور مریض آپریشن ٹیبل ہی پر مر گیا۔ اس سے پہلے بھی دو آپریشن ناکام ہو چکے ہیں، گویا دو مریض اور بھی میرے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔"

"لیکن حارث، یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔" صالحہ میری پوری بات سن کر بولی۔ "ایسا ہو ہی جاتا ہے، بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کے آپریشن ناکام ہو جاتے ہیں۔"

"اتفاق ایک بار ہوتا ہے صالحہ، بار بار نہیں۔ تم خود بتاؤ، موجودہ صورتِ حال میں کیا میرا فیصلہ غلط ہے؟" یہ کہہ کر میں اس کے حسین چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

صالحہ میری بات سن کر سوچ میں پڑ گئی، پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "لیکن حارث! اگر تم نے یہ پیشہ ترک کر بھی دیا اور تم ڈاکٹر نہیں بھی رہے، تم نے استعفیٰ دے بھی دیا تو ..... تو کیا تم مجھے ..... مجھے چھوڑ دو گے؟" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز ایک بار پھر تھرّا گئی اور اس کی پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ "محبت منزل دو تو نہیں ہوتی حارث! جب میرے دل میں تمہاری محبت کا چراغ روشن ہوا تھا تو اس وقت میں نے ..... میں نے یہ تو نہیں سوچا تھا، یہ سوچ کر تو تم سے محبت نہیں کی تھی کہ ایک دن تم ملک کے مشہور و مایہ ناز ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ میں نے ..... میں نے تمہارے پیشے سے تو محبت نہیں کی تھی حارث! میں نے تو بس تمہیں چاہا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکٹر نہ رہنے سے تمہارے پاس دولت نہیں رہے گی تو میں ..... میرے ..... میرے دل سے خدانخواستہ تمہاری محبت ختم ہو جائے گی؟ اگر ..... اگر تم نے ایسا ہی سمجھا تھا حارث تو پھر یقیناً مجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔" صالحہ کے لہجے میں محبت کی دھیمی دھیمی آنچ تھی جس میں اس کا وجود بھی جھلس رہا تھا اور یہ آنچ مجھے بھی جھلسائے دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "محبت تو ہر حال میں ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا نام ہے حارث!"

وہ جو ڈاکٹر حارث کی محبوبہ تھی اور میری کچھ نہیں تھی، وہ جس کی محبت میں بلا کی شدت تھی۔ وہ جس کی آواز کا رس دھیرے دھیرے میرے وجود میں اترتا جا رہا تھا، ہاں وہی مجھے دیوانہ بنائے دے رہی تھی، مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کیے دے رہی تھی۔ عرصۂ حیات میں یہ پہلا پیکاں تھا جو میرے دل میں ترازو ہو گیا تھا۔ پھر اسی لمحے میرے دل میں عجیب سے احساس نے جنم لیا۔ اس احساس کے ڈانڈے شدید احساسِ تنہائی سے جا ملتے تھے۔ میں نے سوچا، صالحہ کی محبت اور اس کی تمام تر گرم جوشی میرے لیے نہیں، حارث کے لیے ہے۔ صالحہ مجھ سے نہیں حارث سے محبت کرتی ہے۔ اگر اسے علم ہو جائے کہ حارث کے روپ میں کوئی اور ہے تو وہ میرے منہ پر تھوک دے گی۔

"نہیں!" میں سوچتے سوچتے ایک دم زور سے بول اٹھا۔

صالحہ کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے اپنے محبوب سے انکار سن لیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میرا طاقتور ذہن، اس کے ذہن کو اپنے قابو میں لے چکا تھا اور وہ اس بات سے بے خبر ہی تھی کہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ گم صم سی کیوں ہو گئی ہے، اس کے سوچنے کی قوت کیوں سلب ہو گئی ہے۔

تم حارث سے محبت نہیں کرتیں صالحہ! میں نے اس کے ذہن کو پہلا حکم دیا۔

"نہیں، میں اسے چاہتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!" وہ خواب کے سے عالم میں بڑبڑائی۔

تم اس کے بغیر زندہ رہو گی! اس بار میرے حکم میں شدت تھی۔ تمہیں حارث کے بغیر زندہ رہنا پڑے گا!

"ہاں ..... میں ..... میں زندہ رہوں ..... زندہ رہوں گی ..... اس ..... اس کے بغیر!"

پھر میں نے صالحہ کے ذہن سے حارث کی محبت کا ہر نقش مٹا دیا۔ حارث سے میں نے صالحہ کا وہ رشتہ استوار کر دیا جو پس منظر میں چلا گیا تھا۔ صالحہ! تم بچپن ہی سے حارث کو بھائی کہتی اور سمجھتی رہی ہو۔ تم اسے اپنے شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتیں۔ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتیں!

"ہاں میں ایسا نہیں کر سکتی، کبھی نہیں!" صالحہ نے خواب آلود آواز میں جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے صالحہ کے ذہن کو آزاد کر دیا۔ میں نے اپنی دانست میں خود کو ایک گناہِ عظیم سے بچا لیا تھا۔

صالحہ کچھ دیر کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی، پھر مدھم سی آواز میں بولی۔ "اچھا اب میں چلوں گی بھائی جان!"

بھائی جان! میرے سینے میں جیسے کوئی خنجر سا اتر گیا۔ میں نے صالحہ کی جانب سے منہ پھیر لیا اور کہا۔ "ہاں تم جاؤ صالحہ، میں بھی اب سوؤں گا۔"

صالحہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے اس طرح دیکھتا رہا جیسے زندگی مجھ سے روٹھ کر جا رہی ہو مگر جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا۔ میں اس حقیقت کو کوشش کے باوجود نہیں جھٹلا سکتا تھا کہ صالحہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ کچھ دیر میں اسی طرح بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ شیو کر کے باہر نکلا اور اپنے کمرے سے نکل کر حارث کی اور صالحہ کی ماں کو آسیب میں کچھ راز و نیاز کرتے ہوئے دیکھا۔ کرنل بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور اس وقت شام کی چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر حارث کی ماں نے صالحہ کی ماں سے کچھ کہا اور وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ صالحہ بھی غالباً اندر کمرے ہی میں تھی۔

"حارث! یہاں آؤ۔" حارث کی ماں نے مجھے بلایا۔

میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ کرنل نے معنی خیز انداز میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ میں قریب پہنچ گیا تو حارث کی ماں نے کہا۔ "حارث بیٹے! تمہاری خالہ اب مزید انتظار کرنا نہیں چاہتیں۔ وہ اسی لیے یہاں آئی ہیں۔ اب تک تم ....."

"کیسا انتظار امی! میں نہیں سمجھا۔" میں جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولا۔

"شادی کا انتظار اور کس کا۔" حارث کی ماں نے کہا۔ "پہلے ہمیں تمہاری تعلیم مکمل ہونے کا خیال تھا اس لیے بات ٹل گئی۔ پھر تم مزید تعلیم

کے حصول کی خاطر باہر چلے گئے۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو تمہارے ڈیڈی نے کہا کہ برسرِ روزگار ہو جاؤ۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے تم برسرِ روزگار بھی ہو گئے۔ اب تو کوئی رکاوٹ نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ تم اب تعلیم یافتہ ہو، برسرِ روزگار ہو۔ اب تمہیں صالحہ سے شادی کر ہی لینا چاہیے۔ میں اب تمہاری خالہ سے مزید رکنے کے لیے نہیں کہہ سکتی۔"

"صالحہ سے شادی!" میں نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا جیسے حارث کی ماں نے کوئی ناقابلِ یقین بات کہہ دی ہو۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "امی! مجھے آپ کی بات سن کر سخت حیرت ہو رہی ہے۔ آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں! میں تو صالحہ سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیا؟ ... کیا کہہ رہے ہو تم؟" بوڑھی عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "بیٹے صالحہ تو بچپن کی مانگ ہے۔ وہ تو بچپن ہی سے تمہارے ساتھ منسوب ہے۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں امی۔" میں نے بلا جھجک کہا۔ "صالحہ تو مجھے بچپن ہی سے بھائی جان کہتی آئی ہے۔ وہ بھلا مجھے شوہر کی حیثیت سے کس طرح قبول کر سکتی ہے!"

اس موقع پر کرنل نے پہلی بوڑھی بیوی کو عجیب سے انداز سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ کرنل نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "تم کہا کرتی تھیں ناں، میں ناحق اس رشتے کی مخالفت کرتا ہوں۔ اب دیکھ لیا اپنی ضد کا انجام! میں کہتا تھا تو میری ایک بات نہیں سنتی تھیں تم!"

"آپ اس معاملے میں خاموش ہی رہیں تو زیادہ بہتر ہے۔" بوڑھی عورت تنک کر بولی۔ "آپ تو خدا سے چاہتے ہیں کہ یہ رشتہ نہ ہو، مگر جب تک میں زندہ ہوں، اپنی زبان سے نہیں پھر سکتی۔ میں نے زبان دی ہے۔ کوئی ہنسی کھیل نہیں کیا۔ حارث کو میری بات ماننا ہی پڑے گی! میں اس طرح شکست تسلیم نہیں کروں گی، ہرگز نہیں!"

"تو میں کب منع کرتا ہوں۔ منوا لو اپنی بات۔" کرنل نے چلتے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں امی! فیصلہ ابھی ہو جانا چاہیے۔" میں نے میاں بیوی کے درمیان مخاصمت کی سی کیفیت پیدا ہونے سے پہلے ہی کہا۔ "میں آپ کے حکم سے روگردانی ہرگز نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھے بحیثیت شوہر تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی اس رشتے سے انکار نہیں کروں گا۔"

"صالحہ کیوں انکار کرنے لگی!" حارث کی ماں کے چہرے پر ایک بار پھر رونق آگئی۔ "میں ابھی خود اس سے پوچھ کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد جب وہ لوٹی تو مزید بوڑھی اور کم زور نظر آنے لگی تھی۔ اس کی حالت کسی ہارے ہوئے جواری کی سی تھی جس نے اپنا سب کچھ ہار دیا ہو۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور چہرے سے حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ قریب آ کر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی: "میں... میں ہار گئی بیٹا... ہار گئی۔"

اسی دن صالحہ اور اس کی ماں ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہو گئیں۔ روانگی کے وقت صالحہ کی ماں کے چہرے سے بھی گہرے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے سے رخصت ہوتے وقت دونوں بہنیں لپٹ لپٹ کر بہت روئی تھیں شاید اپنے خوابوں کی موت پر!

دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر میں نے بوڑھے کرنل سے وہ بات بھی کہہ دی جو بہرحال مجھے کہنا ہی تھی۔

"کیا؟" کرنل میری بات سن کر توقع کے مطابق چونک اٹھا۔ "تم استعفیٰ دے رہے ہو؟ مگر کیوں؟ کیا تمھیں اس سے بہتر نوکری کہیں اور مل رہی ہے؟"

"نہیں ڈیڈی!" میں نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔ "میں یہ پیشہ ہی چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔"

بوڑھا کرنل مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میری صحیح الدماغی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔

"اب میں یہ مہمل ناٹک نہیں کھیل سکتا ڈیڈی!" میرا لہجہ جذباتی تھا۔ پھر میں نے کرنل کو بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو صالحہ کو بتا چکا تھا۔

بوڑھے کرنل نے میری بات سن کر ٹھنڈا سانس بھرا پھر خلاف توقع بولا: "بیٹے! میں تمھارے فیصلے سے متفق ہوں۔ تم نے ان حالات میں بالکل صحیح فیصلہ کیا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ!" کرنل کی بیوی بول اٹھی۔ "کیا اتنا سارا پڑھنا لکھنا سب اکارت جائے گا؟"

"حارث کی ماں! تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔ میں حارث کے دکھ کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔ اس نے جو فیصلہ کیا ہے وہ انسانیت کی بھلائی میں ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم باپ بیٹے جو چاہے فیصلے کرتے رہو، میں ہوتی بھی کون ہوں بیچ میں بولنے والی!" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کرنل کی بیوی چلی گئی تو اس نے مجھے مخاطب کیا: "حارث! آج میں تمھیں ایک عجیب چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ!" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ناشتے سے وہ پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔

میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ آخر کرنل مجھے کیا چیز دکھانا چاہتا ہے اور اسی وقت کیوں؟ یہ خیال آتے ہی میری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز ہو گئی۔ چند لمحے بعد ہی میں سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھے کیا عجیب چیز دکھانا چاہتا ہے اور کیوں؟ بوڑھے کرنل نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ میں جس دکھ سے گزر رہا تھا وہ اسے بخوبی سمجھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔ کرنل کے خیال میں اس وقت ضروری یہ تھا کہ میرے ذہن کو کسی اور طرف لگا دیا جائے اور وہ اسی پر عمل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر حارث کو شطرنج سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اسی سال ذہنی مقابلوں میں بھی حصہ لے چکا تھا اور خود کو اچھا کھلاڑی ثابت کر چکا تھا۔ خود کرنل کو بھی شطرنج کا کھیل بہت پسند تھا۔ کرنل مجھے جو عجیب چیز دکھانے جا رہا تھا وہ شطرنج ہی سے متعلق تھی۔

کرنل مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ سامنے ہی میز پر ٹائپ رائٹر سے ملتی جلتی ایک چھوٹی سی مشین رکھی ہوئی تھی۔ کرنل نے وہ مشین اٹھائی اور دیوار کے قریب پڑی ہوئی ایک میز پر اسے لا کر رکھ دیا۔ اس مشین کے ساتھ ہی ایک تار منسلک تھا جس کے سرے پر پلگ لگا ہوا تھا۔ کرنل نے وہ پلگ دیوار میں موجود سوئچ میں لگا کر بٹن دبا دیا۔ اسی کے ساتھ مشین کے اوپر موجود شیشہ روشن ہو گیا۔

"یہ چیس کمپیوٹر ہے بیٹے!" بوڑھے کرنل نے مجھے بتایا۔ "یہ عام قسم کا چیس کمپیوٹر نہیں جیسے کہ عموماً ملتے ہیں۔ یہ روس کا بنا ہوا ہے۔ گزشتہ ہفتے میرا ایک دوست روس سے لوٹا تو اس نے مجھے بطور تحفہ یہ چیس کمپیوٹر دیا۔ ایک بوڑھے شخص کے لیے اس سے بہتر اور کیا تحفہ ہو سکتا تھا۔ سے نا؟" کرنل نے اپنا جملہ ختم کر کے تصدیق طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے چیس کمپیوٹر پہلی بار دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں جانتا ضرور تھا۔

"بازار میں عموماً امریکی اور برطانوی ساخت کے چیس کمپیوٹر ملتے ہیں۔" کرنل مجھے بتا رہا تھا۔ "مگر وہ اس کے مقابلے میں کھلونا ہیں۔ روس نے اپنا چیس کمپیوٹر ابھی عام مارکیٹ میں نہیں دیا اسی لیے

اسے خاص چیز کہہ رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے کرنل اٹھا پھر وہ شطرنج کی بساط اور مہرے لے آیا۔ بساط پر مہرے لگاتے ہوئے وہ مجھے چیس کمپیوٹر کے بارے میں مزید تفصیلات بتانے لگا۔ "اس میں کھیلنے کے گیارہ مرحلے ہیں۔ انھیں تم اپنی سہولت کے لیے معیار کہہ لو۔ یہ اس کا پہلا مرحلہ ہے۔ میں جو چال چلوں گا وہ اس کی بورڈ کے ذریعے کمپیوٹر میں ریکارڈ کرا دوں گا گویا کمپیوٹر کو اس طرح اپنی چال سے آگاہ کر دوں گا۔ اس کے بعد کمپیوٹر کے ڈائل پر جو چال لکھی ہوئی نظر آئے گی وہ کمپیوٹر کی طرف سے بساط پر چلی جائے گی۔ کمپیوٹر کی طرف سے تم چال چلو گے۔ اس وقت یہ کمپیوٹر پانچویں معیار پر سیٹ ہے مگر میں اسے اس معیار پر شکست دے چکا ہوں۔ آج میں اس سے ساتویں معیار پر کھیلوں گا۔" یہ کہتے ہوئے کرنل نے کمپیوٹر کا ایک بٹن دبا دیا اور بولا: "اب یہ ساتویں معیار پر کھیلے گا۔ ہر کھلاڑی کمپیوٹر سے اپنے معیار کے مطابق کھیل سکتا ہے کیونکہ اس میں پہلے معیار سے گیارھویں معیار تک کا کھیل موجود ہے۔ گیارھویں یعنی آخری معیار پر اس سے شطرنج کے گرانڈ ماسٹر ہی کھیل سکتے ہیں۔ یہ لو میں پیادہ کنگ فور کھیلتا ہوں۔" کرنل نے بساط پر اپنی چال چلی کیونکہ اس نے سفید مہرے لیے تھے۔ سفید مہرے والا کھلاڑی ہی پہلے چال چلتا ہے۔ چال چلنے کے بعد کرنل نے اسے کمپیوٹر پر ریکارڈ کرا دیا۔

کمپیوٹر نے بھی جواباً پیادہ کنگ فور ہی کیا۔ میں نے بساط پر اس کی چال چل دی۔

اس کے بعد چالیں چلی جاتی رہیں اور کمپیوٹر بھی اپنی چالوں کا اعلان ہندسوں اور حروف کی صورت میں کرتا رہا۔ بازی جیسے جیسے جمتی گئی مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ ایک بار کیا کئی بار ایسے مرحلے آئے کہ کمپیوٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت شیشے کے نیچے چمکنے والے حروف اور ہندسے جلتے بجھتے رہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد بدلتے رہے۔ گویا کمپیوٹر جو چالیں سوچ رہا تھا وہ سامنے نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے ایک چال کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا تو حروف اور ہندسوں نے جلنا بجھنا بند کر دیا۔

کھیل ہی کے دوران ایک اور دلچسپ مرحلہ آیا۔ جب کمپیوٹر نے اپنے خلاف کھیلنے والے یعنی کرنل پر پھبتی کسی۔ کرنل نے جو چال چلی تھی وہ واقعی غلط تھی۔ اس کے نتیجے میں کرنل کے دو پیدل پٹنے والے تھے اور کھیل میں پیدلوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں بھی نہیں سمجھ سکا کہ کرنل اپنے ان دو مہروں کو پٹوا کر کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں ان دو مہروں کو پٹوانا فضول تھا۔ کمپیوٹر نے "بوگس موو" کا اعلان کر دیا۔ اس چال کا مذاق اڑایا تھا۔ جب شیشے کے نیچے یہ انگریزی الفاظ روشن ہوئے تھے تو میں نے ہی بوڑھے کرنل کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔

"ہاں کل بھی اس نے مجھ پر یہ پھبتی کسی تھی اور میں نے اسے ہرا دیا تھا۔" بوڑھا کرنل یہ کہہ کر ہنس پڑا۔

مجھے علم ہو چکا تھا کہ کرنل نے جان بوجھ کر کھیل شروع کیا ہے تاکہ میں اس میں الجھ جاؤں اور مجھ پر جو اضمحلال طاری ہے ختم ہو جائے اور میرا دھیان بٹ جائے۔ جہاں دیدہ بوڑھا اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا کیونکہ میرا بھی واقعی کھیل میں دل لگ گیا تھا۔

وہ بازی کمپیوٹر نے جیت لی۔ پھر جب میں نے کمپیوٹر سے بازی لگانا چاہی تو کرنل نے کمپیوٹر کا معیار گھٹانا چاہا کیونکہ وہ بہرحال اپنے بیٹے حارث سے بہتر کھیلتا تھا مگر میں تو ابوالہول تھا اس لیے ہاتھ اٹھا کر بولا: "نہیں ڈیڈی! اس کا معیار کم نہ کریں بلکہ معیار کو مزید دو درجے بڑھا دیں۔"

"کیا؟" بوڑھا کرنل حیرت زدہ ہو گیا۔ "تم نویں معیار پر کھیلو گے؟"

"کوئی حرج نہیں ڈیڈی! یہی تو ہو گا کہ میں ہار جاؤں گا۔ اس سے کیا فرق پڑے گا!"

"کمال ہے۔" بوڑھا کرنل خوش مزاجی سے بولا۔ "ایک مشین سے ہارتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آئے گی!"

"اس کا مطلب یہ ہوا ڈیڈی کہ آپ کبھی چھٹے معیار سے آگے نہیں کھیلیں گے کیونکہ ساتویں معیار پر آپ کو شکست ہو چکی ہے۔ یقیناً آپ اس بے جان مشین سے شرمندہ ہونا نہیں چاہیں گے۔"

"مجھی پر چوٹ کر گئے بیٹے!" بوڑھا ہنس پڑا پھر بولا۔ "خیر میں تمھارے کہنے پر اس کا معیار ساتویں سے نویں پر کیے دیتا ہوں۔ دیکھتا ہوں تمھارے اندر کتنے دم خم ہیں!" یہ کہہ کر کرنل نے کمپیوٹر کا ایک بٹن دبا دیا جس پر نو کا ہندسہ بنا ہوا تھا۔

کھیل شروع ہو گیا۔ میرے بارے میں کرنل لاعلم تھا ورنہ وہ معیار تبدیل کرنے پر بحث نہ کرتا۔ وہ میری صلاحیتوں کو اپنے بیٹے حارث کی صلاحیتیں سمجھ رہا تھا جن سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔ وہ یقیناً حارث کا کھیل بھی دیکھ چکا ہو گا۔ کھیل شروع ہونے کے بعد کمپیوٹر کے ڈائل پر صرف دو بار ہی پلس کا نشان روشن ہو سکا۔ پلس کا نشان اس وقت روشن ہوتا تھا جب کمپیوٹر اپنے حریف کو شہ دیتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ

کمپیوٹر مجھے بس دو بار ہی شہ دینے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ پھر بھلا ڈبل پلس کا نشان اس کے ڈائل پر کیسے روشن ہوتا! ڈبل پلس کا نشان تھا جو میں کرنل سے ہونے والی بازی میں دیکھ چکا تھا جس میں کمپیوٹر نے کرنل کو شکست دے دی تھی۔ نویں معیار پر کھیلتے ہوئے کمپیوٹر کچھ زیادہ ہی سوچ بچار کرنے لگا تھا۔ وہ اب ساتویں معیار کی نسبت زیادہ دیر میں اور خوب سوچ سمجھ کر چال چلتا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اسے شکست دے دی تھی اور وہ بھی بری طرح! میں نے کمپیوٹر کو پیدل مات کی تھی۔

بوڑھا کرنل اس قدر جوش میں آگیا کہ مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ "تم نے کمال کر دیا بیٹے! کیا قیامت کی چالیں چلی ہیں تم نے! میرا انتقام لے لیا تم نے اس کمپیوٹر سے! مجھے کیا خبر تھی کہ تمہارا کھیل اتنا عمدہ ہو گیا ہے۔" پھر کرنل نے ستائش میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ تم اعلیٰ ترین یعنی گیارھویں معیار پر بھی اسے شکست دے سکتے ہو۔"

میں نے بوڑھے کا دل رکھنے کے لیے گیارھویں معیار پر بھی کھیلنا قبول کر لیا حالانکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس آخری معیار پر کمپیوٹر کو شکست دے سکوں گا۔

بازی کچھ نبی اور بہت دیر تک جمی۔ کمپیوٹر اور خود میں بھی ایک ایک چال چلنے میں دو دو تین تین منٹ لگانے لگے۔ مجھ سے جیتنے میں کمپیوٹر کو ایک بار بھی پھبتی کسنے کا موقع نہیں مل سکا تھا وہ بازی کھیلتے ہوئے میرے مات کی ترکیبیں تو کئی لیکن بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے آٹھ آٹھ نو نو چالیں آگے تک گننا پڑتی تھیں۔ وہ بازی برابر ہی اور اس میں کمپیوٹر کی مرضی کو دخل تھا۔ اگر وہ مجھے مسلسل شہ نہ دیے جاتا اور اس طرح بازی برابر نہ کر لیتا تو اسے لازماً شکست ہوتی۔ کمپیوٹر سے گیارھویں معیار پر برابر کھیل لینا بھی ہنسی کھیل نہیں تھا۔ بوڑھے کرنل نے میری پیٹھ تھپک کر مجھے شاباشی دی۔ اب رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

کھانے کے دوران بھی کرنل مجھ سے شطرنج کے متعلق ہی باتیں کرتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد کرنل تو حسب معمول اپنے کمرے میں سونے چلا گیا اور میں نے اپنے کمرے کی راہ لی۔ کافی پینے کے بعد مجھے استعفے کا خیال آیا۔ میں نے ایک بار پھر استعفیٰ پڑھا اور اسے لفافے میں بند کر دیا۔ لفافے پر پتا لکھنے کے بعد میں نے ایک ملازم کو بلا کر لفافہ تھما دیا کہ اسے ابھی رجسٹری کرا آئے۔ ملازم لفافہ لے کر چلا گیا تو میں مسہری پر دراز ہو گیا۔ جس خیال کو میں گزشتہ دن سے بار بار اپنے ذہن سے جھٹک آیا تھا، وہ پھر میرے ذہن میں در آیا۔ یہ صالحہ کا خیال تھا۔ وہ چلی تو گئی تھی مگر اپنے ساتھ ہی میرا صبر و قرار بھی لے گئی تھی۔ صالحہ کا خیال مجھے پھر تڑپانے لگا۔ گزشتہ شب بھی میں نے جیسے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزاری تھی۔ میں اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ خود میں نے ہی تو صالحہ کی بہتری کے لیے اس کے ذہن سے حارث کی محبت کا ہر نقش مٹایا تھا۔ پھر یہ بے قراری کیسی؟ یہ بے کلی کیوں؟ میں آخر اتنا خود غرض کیوں ہو گیا ہوں؟ انھی سوالوں کے گرداب میں میرا ذہن ڈوبتا ابھرتا رہا۔ پھر میں ماضی قریب کے واقعے کے متعلق سوچنے لگا جب میں نے حارث کی حیثیت سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

یہ واقعہ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ میں اپنے دشمنوں کو دھوکا دے کر ایران سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ عراق میں میرا داخلہ غیر قانونی ہی کہا جا سکتا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا تھا کہ کسی غیر ملکی کے لیے عراق کی طرف سے جاری کردہ اقامے کے بغیر یہاں رہنا ناممکن ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر میرے ذہن میں ایک نئے ہی خیال نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ کسی دوسرے شخص کا بہروپ بھر لوں۔ اس طرح ایک طرف تو میں اپنے دشمنوں کو طویل عرصے تک دھوکے میں رکھ سکتا ہوں، دوسرے یہ کہ ایسا کرنے سے مجھے مستقل طور پر ایک چھت کا سایہ نصیب ہو جائے گا۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مستقبل میں یہی فیصلہ میرے لیے سوہانِ روح ثابت ہو گا۔ کسی کی شخصیت اپنا لینا میرے لیے مشکل کام نہیں تھا۔ بس چند دن اس شخص کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملنا ضروری تھا۔ مختلف افراد کی آوازوں کی ہو بہو نقل اتار لینا بھی میرے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ میں پہلے بھی کئی بار ایسا کر چکا تھا۔

اب مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو میرا ہم عمر ہو اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی زیادہ فرق نہ ہو۔ میں نے اس تلاش میں زیادہ عرصہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر گزارا۔ پھر مجھے مطلوبہ آدمی مل ہی گیا۔ وہ ایک نیورو سرجن ڈاکٹر حارث تھا۔ میں پورے ایک ہفتے ڈاکٹر حارث کے پیچھے لگا رہا۔ میں نے اس دوران میں کئی بار ڈاکٹر حارث کا ذہن پڑھا، حارث اور اس کے تمام متعلقین کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ میں نے حارث کی عادات و اطوار کا گہری نظروں سے مشاہدہ کیا، وہ کس طرح اٹھتا بیٹھتا ہے، کس طرح بات کرتا ہے، اسے کیا پسند

ہے اور کیا ناپسند! یہ سب کچھ اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کے لیے ایک ہفتہ کافی تھا۔

آخر کار فیصلہ کن مرحلہ آ ہی گیا۔ ایک شام جب ڈاکٹر حارث اسپتال سے لوٹ رہا تھا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر میں نے حارث کے ذہن پر قابو پا لیا اور اسے اپنے احکام ماننے پر مجبور کر دیا۔ میں حارث کی کار کو بغداد سے اربیل جانے والی شاہراہ پر لے گیا۔ اربیل ایک چھوٹی سی آبادی ہے جو بغداد سے تقریباً دس کلومیٹر پر واقع ہے۔ میں اس سلسلے میں تمام تیاریاں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ شہر سے نکلتے ہی میں نے حارث کو حکم دیا کہ وہ کار روک دے۔ اب حارث کا ذہن پوری طرح میرے احکام کی تعمیل کر رہا تھا۔ پھر میں نے حارث کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا کر خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ حارث گم صم اور سوز دہ سا برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا جیسے کھلی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میں حارث کی کار کو سڑک سے اتار کر پیڑوں کے ایک جھنڈ میں لے آیا۔ اب میں اپنے منصوبے پر بلا خوف و خطر عمل کر سکتا تھا۔

میں نے پہلے اپنے چہرے پر حارث کا میک اپ کیا، پھر حارث کے چہرے پر ایک ایرانی شخص کا میک اپ کر دیا۔ یہ میک اپ معمولی نہیں تھا اور اسے بہ آسانی ختم کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے میک اپ میں کافی وقت لگایا۔ پھر حارث کا لباس اتروا کر خود پہنا اور اپنا لباس اسے پہنا دیا۔ اس کا لباس میرے جسم پر اور میرا لباس اس کے جسم پر توقع کے مطابق ٹھیک رہا تھا۔ میرے منصوبے کا ایک حصہ اب بہ حسن و خوبی انجام پا چکا تھا مگر ابھی دوسرا اہم مرحلہ باقی تھا۔ ابھی ڈاکٹر حارث کے ذہن کی واشنگ باقی تھی۔ میں نے حارث کے ذہن سے ہر یاد، ہر نقش مٹا دیا۔ اب حارث کا ذہن کورے کاغذ کی طرح تھا۔ اس کا ماضی اس سے بچھڑ چکا تھا۔ وہ کون ہے، کیا ہے، اس کا ماضی کہاں اور کیسے گزرا، اسے کچھ علم نہیں تھا مگر اتنا ہی کافی نہیں تھا۔ اس طرح اور اس حالت میں پائے جانے کے بعد وہ مقامی سی آئی ڈی کے لیے توجہ طلب بن جاتا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ کسی کو اس کے چہرے پر میک اپ کا شبہ ہو جاتا۔

شبہ ہونے کی صورت میں میک اپ ختم کیے جانے کے بعد جب ڈاکٹر حارث کا اصل چہرہ سامنے آتا تو اسے پہچان لیا جاتا کیونکہ وہ معروف شخصیت کا مالک تھا۔ اس طرح مستقبل میں خطرات پیدا ہو سکتے تھے جن کا ابھی سے تدارک کیا جانا ضروری تھا۔ اس تدارک کے لیے ڈاکٹر حارث کی شخصیت کو مکمل طور پر بدل دینا ضروری تھا۔ میں ایران کے دوران قیام میں جس حیثیت سے رہا تھا، میں نے وہاں جو نام اختیار کیا تھا اور بقیہ تمام ضروری باتیں ڈاکٹر حارث کے ذہن پر نقش کر دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ اس نے غیر قانونی طور پر عراق کی سرحد کو عبور کیا ہے۔

اب ڈاکٹر حارث کی شخصیت قطعی طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ ایک ایسا ایرانی نوجوان تھا جو اپنا مستقبل بنانے کی خاطر غیر قانونی طور پر عراق آیا تھا اور یہاں سے کسی طرح غیر قانونی طور ہی پر کسی ایسی عرب ریاست تک پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ سکے۔ شخصیت کی اس تبدیلی کے بعد اگر ڈاکٹر حارث، سی آئی ڈی کے ہتھے بھی چڑھ جاتا تو اب میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر حارث اپنے بارے میں سی آئی ڈی والوں کو ایک اور ہی کہانی سناتا جس کے بعد اسے ملک بدر کر دیا جاتا اور خود میں ڈاکٹر حارث کی شخصیت اختیار کر کے مزید سکون کے ساتھ بغداد میں رہ سکتا۔

میں نے واپسی میں ڈاکٹر حارث کو ایک جگہ کار سے اتار دیا تھا۔ اس وقت لمحے بھر کو مجھے ڈاکٹر حارث پر رحم آیا تھا مگر اپنی زندگی کی بقا کے لیے مجھے بہ مجبوری ہی سہی ایک شخص کی زندگی کو تباہ کرنا پڑا تھا۔ اس دن کے بعد ڈاکٹر حارث پر کیا گزری، یہ معلوم کرنے کی نہ مجھے ضرورت تھی، نہ فرصت۔ لیکن بہر حال میرا ضمیر اس بات پر مطمئن تھا کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا حالانکہ میں ایسا بھی کر سکتا تھا۔

پھر ایک ماہ بھی سکون سے نہ گزر پایا تھا کہ میرے دشمنوں نے میرا سراغ لگا لیا۔ اس ایک ماہ میں کسی نے بھی مجھ پر معمولی سے شک و شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نے مکمل طور پر ڈاکٹر حارث کی شخصیت کو اپنا لیا تھا۔ اب مجھے سبھی ڈاکٹر حارث کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میرا ایک گھر تھا جہاں محبت کرنے والی ماں تھی، باپ تھا جس کی شفقت کے سائے میں مجھے بہت سکون ملتا تھا، عزیز تھے، دوست تھے، سب کچھ تھا، مگر اب، اب میں محسوس کر رہا تھا جیسے سب کچھ خواب تھا۔ نہ میرا پہلے کوئی تھا، نہ اب کوئی ہے۔ میں نے ڈاکٹر حارث بن کر غلطی کی تھی۔ مجھے ڈاکٹر حارث کی شخصیت نہیں اپنانا چاہیے تھی۔ میں اپنی انتہائی ذہانت و صلاحیت کے باوجود ڈاکٹر حارث کا کردار ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ پیشہ ورانہ طور پر بھی اور جذباتی اعتبار سے بھی! میں ایک ماں کو بیٹے کی سچی محبت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک مہربان باپ کو اس کی شفقتوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ ایک محبوبہ کو اس کا محبوب نہیں دے سکتا تھا۔ میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کسی شخص کو زندگی کی نوید نہیں دے سکتا تھا۔ تو پھر شاید میں اب تک خود کو دھوکا ہی دے

رہا تھا کہ ڈاکٹر حارث کا کردار بہتر طور پر انجام دے رہا ہوں۔

اس وقت یہی سب کچھ سوچ کر میرے ذہن میں بھونچال سا آ گیا تھا۔ میرا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح خیالوں کے بھنور میں چکرا رہا تھا۔

مگر یہ سارے سوال آج ہی میرے ذہن میں کیوں ابھر رہے ہیں؟ میں نے اپنے خیالوں کی ڈور تھامتے ہوئے سوچا۔ کون ہے اس کا ذمہ دار؟ اس سوال کے جواب میں جیسے میرے وجود میں کسی نے سرگوشی کی: ایک من موہنی صورت اس کی ذمہ دار ہے۔ میں نے طویل سانس لیا پھر بڑبڑایا: جس طرح میں نے اس کے ذہن سے ڈاکٹر حارث کی ہر یاد کو کھرچ کر پھینک دیا ہے، ڈاکٹر حارث کی محبت کے نقوش مٹا دیے ہیں، میں اپنے ذہن سے بھی اس کا خیال نکال پھینکوں گا۔

پھر میں نے اپنے ذہن کو ترغیب دینا شروع کیا۔ زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں مگر زندگی کا سفر نہیں رکتا۔ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ بھول جاؤں گا میں اسے، میں اسے بھول جاؤں گا کیونکہ وہ میری نہیں کسی اور کی محبوبہ ہے۔ وہ ڈاکٹر حارث کی محبت ہے اور نہیں جانتی کہ میں ڈاکٹر حارث نہیں ابوالہول ہوں۔ مجھے بھی اس سے... اس سے... محبت... محبت ہے۔

"نہیں!" میں ایک دم چیخ اٹھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب میرے ذہن نے مجھ سے بغاوت کر دی تھی۔ میرا ذہن حکم ماننے پر آمادہ نہیں تھا اسی لیے میں چیخ اٹھا تھا۔

کیا محبت اتنی ہی طاقت ور ہوتی ہے، اتنی؟ میں نے حیران ہو کر سوچا۔

اس دن کے بعد میں نے خود کو طرح طرح کے فریب دیے۔ کبھی شراب میں پناہ ڈھونڈی اور کبھی شطرنج میں، مگر محبت کا نشہ نہ اترنا، یہ نشہ کچھ اور سوا ہو گیا۔

میں اگر یہیں، اسی ماحول میں، اسی گھر میں، انھی لوگوں کے درمیان رہا تو اس غارت گر ہوش و خرد کی یاد سے دامن نہیں بچا سکوں گا۔ ایک دن میں نے سوچا۔ پھر یہی خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑتا چلا گیا۔ میں ایک آوارہ خوشبو کا جھونکا ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ مجھے کہیں قرار نہیں۔ بے قراریاں میرا مقدر ہیں۔ میں سوچتا رہا اور پھر مجھے اپنے دشمنوں کا خیال بھی آ گیا۔ انھیں اچھی طرح علم ہے کہ میں کہاں ہوں اور کس حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ تو ایسی صورت میں کیا وہ مجھ پر دوبارہ حملہ نہیں کریں گے اور کیا میں ان کے دوسرے حملے کا انتظار کرنے کے لیے یہیں رکا رہوں؟ کیا دانش مندی کا یہی تقاضا ہے؟ جب میرے دشمنوں کو اپنے ایجنٹوں کی طرف سے طویل عرصے تک کوئی جواب نہیں ملے گا تو کیا وہ اس نتیجے تک نہیں پہنچ جائیں گے کہ ان کے ایجنٹوں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے؟ اس کے بعد کیا وہ اپنے اور خطرناک ایجنٹ بغداد نہیں بھیج دیں گے؟ پے در پے سوالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے اور بالآخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا، جلد از جلد بغداد چھوڑ دینے کا فیصلہ! نہ صرف بغداد بلکہ میں نے عراق ہی سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہیں بھی کسی ملک میں کسی بھی اجنبی سرزمین پر میں از سر نو زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

میں اسی دوران میں چیس کمپیوٹر کو گیارھویں معیار پر بھی کئی بار شکست دے چکا تھا۔ عراق میں ان دنوں نیشنل چیمپئن شپ ہونے والی تھی۔ بوڑھے کرنل کی ضد تھی کہ میں شطرنج کے نیشنل چیمپئن شپ کے مقابلوں میں حصہ لوں۔ اس کا خیال تھا کہ پورے عراق میں میرے مقابلے کا اور کوئی کھلاڑی نہیں ہوگا۔ میں نے بادل ناخواستہ محض وقت گزاری کی خاطر ان مقابلوں میں حصہ لیا مگر بے دلی کے ساتھ۔ انھی مقابلوں کے نتائج کی روشنی میں ان تین کھلاڑیوں کا انتخاب بھی ہونا تھا جو عراق کی جانب سے ہندوستان بھیجے جانے والے تھے۔

ہندوستان کے شہر کلکتے میں الیخائن میموریل چیس ٹورنامنٹ ہونے والا تھا جس میں دنیا بھر کی ٹیمیں شرکت کرنے والی تھیں۔ شطرنج کا سابق ورلڈ چیمپئن الگزینڈر الیخائن روس کا باشندہ تھا جسے آج بھی روسی 'بابائے شطرنج' کہتے ہیں۔ اسی کی یاد میں ہر سال دنیا کے کسی نہ کسی ملک میں شطرنج کا بین الاقوامی مقابلہ ہوتا ہے۔ اس بار یہ مقابلہ ہندوستان میں ہونا تھا۔ بالترتیب تیسری پوزیشن تک آنے والے کھلاڑیوں کو عراق سے اس مقابلے میں شرکت کرنے ہندوستان جانا تھا۔

میں نے تیسری پوزیشن حاصل کی، گویا ہندوستان جانے والی ٹیم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ میں اگر بے دلی سے نہ کھیل رہا ہوتا، خبر اور بے خبری کے درمیان سفر نہ کر رہا ہوتا تو یقیناً پہلی پوزیشن حاصل کر کے عراق کا چیمپئن بن گیا ہوتا۔ میں تو ان دنوں خود فراموشی کی اس کیفیت سے گزر رہا تھا کہ مجھے یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ ان مقابلوں کے

- نتائج کے بعد کھلاڑیوں کو ہندوستان بھی بھیجا جائے گا۔ بوڑھا کرنل اگر سائے کی طرح میرے ساتھ نہ لگا رہا ہوتا تو شاید میں ان مقابلوں میں پابندی سے شرکت بھی نہ کر پاتا۔ میں تو ہر وقت نشے میں دُھت رہتا تھا، کسی غالم کو بھلانے کے لیے، کسی کی یاد سے اپنا دامن چھڑانے کے لیے!

کرنل اور اس کی بوڑھی بیوی مجھے سمجھا سمجھا کر تھک جاتے مگر میں صبح سے رات تک پیتا ہی رہتا، اُس وقت تک کہ مجھے نیند نہ آجاتی۔ میں نے نشے ہی کی حالت میں شطرنج کے مقابلوں میں شرکت کی تھی۔ پھر جب ان مقابلوں کے اختتام پر ایک دن کرنل نے مجھے بتایا کہ اب میں شطرنج کھیلنے ہندوستان بھی جاؤں گا تو میں چونک اٹھا۔ قدرت نے گویا خود بہ خود میرے لیے فرار کی راہ ہموار کر دی تھی۔

میں ایک بار پھر اس بھری دنیا کی بھیڑ میں کھو جاؤں گا۔ میں نے سوچا اور بڑے دکھ کے ساتھ کرنل کی طرف دیکھا۔ یہ شخص جس نے ایک مختصر عرصے کے لیے میرے باپ کا کردار ادا کیا تھا، کتنا بھولا تھا۔ وہ خود ہی اپنے لیے دکھوں کے کانٹے بو رہا تھا۔ وہ زندگی بھر اسی فریب میں مبتلا رہتا کہ اس کا بیٹا نہ جانے کیوں ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ کبھی یہ نہ جان سکتا کہ اس کا بیٹا تو بہت دن پہلے اسے چھوڑ کر جا چکا تھا، ایک انجانی منزل کی طرف۔ میں نے اس بوڑھی عورت کی طرف بھی دیکھا جو مجھے اپنا اکلوتا بیٹا سمجھتی تھی۔ وہ اکثر اپنے بوڑھے شوہر سے شکوہ کرتی تھی کہ اسی نے اس کے بیٹے کو غلط راہ پر ڈال دیا ہے کیونکہ خود کرنل کو بھی انگور کی بیٹی سے پیار تھا۔ وہ یہی کہتی رہتی تھی کہ نہ جانے کچھ دن سے اس کے بیٹے کو اس سے وہ محبت نہیں رہی جو کبھی تھی۔

ہندوستان روانگی سے دو روز قبل ایک شام کسی نے مجھے فون کیا۔ فون کرنل نے ریسیو کیا۔ میں اس وقت حسبِ معمول اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا شغلِ بادہ و جام میں معروف تھا۔ میں نے اس دوران میں ڈاکٹر حارث کے سبھی دوستوں سے قطع تعلق کر لیا تھا جو میرے دوست بھی بن گئے تھے۔ اب تو انھوں نے مایوس ہو کر مجھے فون کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جب ایک ملازم نے مجھے آکر بتایا کہ میرا فون ہے تو مجھے کچھ حیرت سی ہوئی۔ میں نے ملازم سے دریافت کیا: "کس کا فون ہے؟"

"فون پر کرنل صاحب نے بات کی ہے جناب!" ملازم نے جواب دیا۔ "وہ کوئی عورت ہے جو آپ ہی سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"عورت؟" میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھا۔ وہیں ایک آہنی اسٹینڈ پر فون رکھا رہتا تھا۔ میں قریب پہنچا تو کرنل نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا اور سامنے جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت حسبِ معمول شام کی چائے پی رہا تھا۔

"ہیلو! میں ڈاکٹر حارث بول رہا ہوں۔" میں نے ریسیور تھامتے ہی کہا۔

جواب میں دوسری جانب سے ایک کھنکتا ہوا سا قہقہہ سنائی دیا جو کسی عورت ہی کا تھا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے! کون ہو تم؟" میں سختی سے بولا۔

"ابوالہول! میں تمھارے اس مذاق سے خوش ہوئی کہ تم ڈاکٹر حارث ہو۔" دوسری جانب سے نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ عربی ہی میں بات کر رہی تھی مگر میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا لہجہ امریکی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی: "ڈاکٹر حارث غریب کو تو شاید تم نے اسی دن قتل کر دیا ہوگا جب اس کی جگہ لی ہوگی۔ خیر فی الحال ان باتوں کو چھوڑو۔ میں نے اس وقت تمھیں ایک اہم پیغام دینے کے لیے فون کیا ہے۔ سنو، تمھاری ماں ہمارے قبضے میں ہے اور ہم جب چاہیں اسے قتل کر سکتے ہیں لیکن ..."

"میری ماں!" میں اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ مجھے اس کی اطلاع پر شدید حیرت تھی۔

"ہاں تمھاری ماں!" دوسری طرف سے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھیں کسی عورت نے جنم نہیں دیا ہے بلکہ تم براہِ راست آسمان سے ٹپک پڑے ہو۔" اس عورت کا انداز مضحکہ اُڑانے والا تھا۔ ایسے لوگوں کو شاید چڑانے میں لطف آتا ہوگا۔

"مگر... مگر تم کون ہو؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا حالانکہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے مگر میرے ذہن میں اس وقت کچھ اور ہی تھا۔ میں نے اسی لیے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فوراً ہی اس سے دوسرا سوال کیا: "اور یہ بھی بتاؤ کہ تم سے کب اور کہاں مل سکتا ہوں؟"

"تاکہ تم مارگریٹ کی طرح میرا پتا بھی صاف کر دو۔" اس نے ہنس کر کہا: "تم اسے بھولے تو نہیں ہو گے، وہی جس کے قتل کو تم نے اپنی ذہانت سے خودکشی ثابت کر دیا تھا مگر یقین رکھو تم مجھے کسی قیمت پر اس طرح دھوکا نہیں دے سکو گے۔ میں یہ بھی طرح جانتی ہوں کہ تم اتنے بھولے ہرگز نہیں کہ یہ نہ سمجھ سکو میں کون ہوں؟"

میں سمجھ چکا تھا کہ دوسری جانب سے بولنے والی کون ہے۔ مارگریٹ کی جگہ اب نئی امریکی ایجنٹ بغداد آ چکی تھی۔ یقیناً مارگریٹ امریکی حکومت کو رپورٹیں روانہ کرتی رہی ہوگی۔ اسی لیے اس نئی امریکی ایجنٹ نے مجھے اتنی جلدی تلاش کر لیا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کچھ سوچا، پھر بولا: "تم آخر مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"سودے بازی!" اس نے توقع کے مطابق جواب دیا۔

"لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ عورت جو تمھارے قبضے میں ہے میری ماں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا ثبوت تمھیں بہت جلد فراہم کر دیا جائے گا، شاید کل تک۔ بقیہ باتیں اب اسی کے بعد ہوں گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ریسیور کریڈل پر رکھ کر میں جیسے ہی مڑا، بوڑھے کرنل پر میری نگاہ پڑی۔ کرنل میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملتے ہی کرنل نے پوچھا: "کس کا فون تھا؟"

"ایک عورت کا فون تھا ڈیڈی!" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اس کی ماں مستشفیٰ الیرموک میں داخل ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی ماں کا آپریشن میں ہی کروں۔ اسے بتایا جا چکا تھا کہ میں مستعفی ہو چکا ہوں مگر پھر بھی وہ بہ ضد ہے۔ اس نے اسی سلسلے میں مجھے فون کیا تھا۔ نہ جانے لوگ مجھے کیا سمجھ بیٹھے ہیں!" میں نے بہت خوبصورتی سے بات بنا دی حالانکہ اس وقت میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔

کرنل نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا: "چیس فیڈریشن کی جانب سے سفر کے اخراجات کا چیک اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ آگیا ہے۔" پھر وہ بولا: "میں سوچ رہا ہوں کیوں نہ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں۔"

"نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ میں کرنل کی ہمراہی میں فرار کے منصوبے پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔

"کیوں؟ کیا حرج ہے؟" کرنل نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی قریبی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس لیے منع کر رہا ہوں کہ امی یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔" میں نے فوراً ہی ایک بہانہ ڈھونڈ لیا۔

"تمھیں شاید یاد نہیں کہ تمھاری امی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ مجھ سے الگ رہ کر ہی گزارا ہے۔ پھر اس سے قطع نظر تمھاری موجودہ ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے تمھارے ساتھ میرا جانا ضروری ہے۔" کرنل مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں تمھیں اس حالت میں تنہا بھیجنے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لے سکتا۔" کرنل کا آخری جملہ فیصلہ کن تھا۔

میں پہلے ہی الجھا ہوا تھا، کرنل کی گفتگو نے مجھے مزید الجھا دیا۔ میں نے کسی قدر جھنجلا کر کہا: "مگر ضروری تو نہیں کہ اسی جہاز میں آپ کو بھی سیٹ مل جائے۔"

"میں یہ بندوبست پہلے ہی کر چکا ہوں۔" کرنل نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے چار روز قبل ہی چیس فیڈریشن کے صدر سے معلوم کر لیا تھا کہ روانگی کس تاریخ کو اور کس فلائٹ سے ہوگی۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میں نے بھی اسی فلائٹ میں ایک سیٹ مخصوص کرا لی۔" کرنل نے انکشاف کیا۔ "اور جس دن میں نے سیٹ مخصوص کرائی تھی تمھاری ماں کو بھی اس سلسلے میں بتا دیا تھا۔ وہ بھی تمھارے تنہا جانے پر فکرمند تھیں۔ جب میں نے انھیں اپنی روانگی کے متعلق بھی بتا دیا تو وہ مطمئن ہو گئیں۔"

تو یہ بوڑھا پہلے ہی ساری تیاریاں کر چکا ہے۔ میں نے سوچا۔ پھر مجھے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ اب نئے سرے سے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ پہلے میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ کلکتہ جاتے ہوئے راستے ہی میں سے غائب ہو جاؤں گا۔ راستے میں جہاز جہاں بھی ٹھہرتا، میں وہاں سے کسی بھی دوسرے جہاز میں کسی اجنبی سرزمین کی طرف روانہ ہو جاتا۔ یہ کام میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ پھر دشمنوں کو نئے سرے سے میری تلاش کرنا پڑتی۔ میں نے کدھر کا رخ کیا ہے، کس ملک اور کس شہر میں جاؤں، یہ معلوم کرنا میرے دشمنوں کے لیے بہرحال آسان نہ ہوتا مگر بوڑھے کرنل کی مداخلت نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اب مجھے کچھ اور ہی سوچنا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے وہ خبر نمایاں طور پر شائع کی جسے پڑھتے ہی کرنل میرے پاس دوڑا چلا آیا۔ اس کے چہرے سے جوشِ مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ہی میری تصاویر بھی شائع کی گئی تھیں۔ مجھے ان تصاویر میں مختلف کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ تصاویر پہلے بھی اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں، ان دنوں جب میں نیشنل چیمپئن شپ کے مقابلوں میں شریک تھا۔ انھی تصاویر کے ساتھ چند دن پہلے بصرے میں منعقد ہونے والی مسعودہ میڈیکل کانفرنس کی ایک تصویر بھی آج کے ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ میں اس تصویر میں غیر ملکی مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میرے متعلق شائع ہونے والی خبروں میں سے ایک خبر کی سرخی

یہ تھی: "ملک کا نامور نیورو سرجن ڈاکٹر حارث شطرنج کا بین الاقوامی کھلاڑی بن گیا۔" خبر کی تفصیل یہ تھی کہ عراق سے ہندوستان جانے والی شطرنج کی ٹیم میں، کئی قومی ٹیم میں مشہور زمانہ نیورو سرجن ڈاکٹر حارث بھی شامل ہے جہاں وہ ہندوستان کے ایک شہر کلکتہ میں شطرنج کے بین الاقوامی مقابلے میں شریک ہوگا۔ اخبار نے لکھا تھا کہ نوجوان ڈاکٹر حارث کچھ دن پہلے نامعلوم وجوہ کی بنا پر اپنے پیشے سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر چکا ہے۔ خبر کے مطابق اگلے روز ڈاکٹر حارث کو ہندوستان روانہ ہونا تھا۔ ایک اخبار نے چیس فیڈریشن کے صدر کے حوالے سے یہ بھی لکھا تھا کہ ڈاکٹر حارث کے ساتھ اس کے والد ریٹائرڈ کرنل فراست بھی ہندوستان جا رہے ہیں جو خود بھی اپنے عہد شباب میں نیشنل ماسٹر رہ چکے ہیں۔

ناموری اور شہرت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے بوڑھے کرنل نے جب مجھے متعلقہ اخبارات میں خبریں اور تصاویر دکھائیں تو میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے وہ خبریں اور تصاویر دیکھیں تو ضرور مگر ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس وقت میرا ذہن ایک اور ہی مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ آج ہی صبح کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا تھا جو بغداد ہی سے بھیجا گیا تھا۔ لفافے پر بابل الشرق کے ڈاک خانے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ بابل الشرق بغداد کی پرانی آبادیوں میں سے ایک ہے اور یہیں پر شیخ سید عبدالقادر جیلانی کا مزار مبارک ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جس شخصیت نے مجھے وہ لفافہ روانہ کیا تھا وہ کم از کم اس علاقے میں قیام پذیر نہیں ہوگی۔ میں اپنے دشمنوں کو بہرحال اتنا کم عقل نہیں سمجھتا تھا۔

اس لفافے میں مجھے صرف ایک تصویر ملی تھی جس میں ایک حسین نوجوان عورت، ایک خوبصورت و صحت مند بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ اس عورت کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی گویا وہ خوب صورت عورت میری موجودہ عمر سے آٹھ دس سال چھوٹی تھی۔

کرنل میرے کمرے سے چلا گیا تو میں نے دوبارہ وہ تصویر نکال لی اور اسے گھورنے لگا۔ اس عورت کے چہرے کے نقوش میری اصل شکل سے بہت حد تک ملتے جلتے تھے۔ اس بات کا احساس مجھے تصویر دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اس بات کا ثبوت تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ عورت میری ماں تھی۔ میں اس بچے کی صورت بھی بہت دیر تک تکتا رہا جو اس عورت کی گود میں تھا۔ وہ عورت اپنے چہرے کے خطوط سے عربی النسل ہی معلوم ہوتی تھی۔ سوچتے سوچتے اور تصویر کو گھورتے ہوئے میں نے یوں ہی اسے الٹ دیا اور اچھل پڑا۔ تصویر کے پیچھے ایک اسٹوڈیو کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ہر چند کہ حروف بہت حد تک مٹ سے گئے تھے مگر بڑی ہی کوشش سے میں نے شہر اور ملک کا نام پڑھ لیا "دہلی، انڈیا!"

"یہ ... یہ کیا معمہ ہے؟" میں بڑبڑایا۔

عورت کے چہرے کے نقوش سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عربی النسل ہے مگر وہ تصویر ہندوستان کے ایک شہر کی کھنچی ہوئی تھی۔ یہ دونوں باتیں بے جوڑ سی تھیں۔ تصویر کے پس منظر میں ایک مسجد نظر آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر اس مسجد کے سامنے تصویر کھنچوائی گئی ہو۔ اس تصویر کا نیگیٹو غالباً پوزیٹو بنوانے کے لیے اس اسٹوڈیو کو دیا گیا ہوگا جس کی مہر تصویر کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ مجھے یہ تصویر بھیجنے والی وہی امریکی ایجنٹ تھی جس نے مجھے گزشتہ روز فون کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ثبوت مجھے بہت جلد مل جائے گا کہ جو عورت امریکیوں کے قبضے میں ہے وہ میری ماں ہے۔ پھر آج یہ تصویر مل گئی تھی گویا یہ تصویر ثبوت کی حیثیت رکھتی تھی۔

میں اپنے حیرت انگیز وجود کے تمام اسرار سے بخوبی آگاہ تھا اور غالباً میرے دشمن بھی ان سے ناواقف نہیں تھے۔ انھوں نے اسی لیے بطور ثبوت صرف تصویر بھیجی تھی۔ وہ کسی قسم کا خوف تھا یا شاید کوئی اور ہی جذبہ کہ میں نے اپنے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود کبھی یہ بات جاننے کی جستجو نہیں کی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ میں اپنی اصل عمر میں کیسا نظر آؤں گا۔ اگر واقعی وہ تصویر میری ماں کی تھی تو بچہ گود میں نظر آنے والا بچہ میں ہی تھا لیکن تصدیق بہرصورت ضروری تھی۔ یہ بات خود میرے لیے بھی عجیب حیرت انگیز اور پُراسرار تھی کہ میں اپنے کاروانِ عمر کو جس سنگ میل تک جہاں چاہوں اور جتنی مدت کے لیے چاہوں ٹھہرا سکتا ہوں۔ مگر اب تک میں اپنے وجود کے بہت سے اسرار کا تجربہ نہ کر چکا ہوتا تو شاید کبھی اس تجربے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ نہ کر پاتا جو اب ناگزیر تھا۔

پھر میں نے رات ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ میں نے اپنا کمرا بند کر کے کھڑکیوں پر پردے گرا دیے اور تیز روشنی کر دی۔ پھر میں لباس اتارنے کے بعد اپنے جسم پر ایک چادر ڈال کر مسہری پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تصویر مسہری کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ مسہری کے قریب ہی ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے آئینے میں، میں کچھ دیر بعد اپنا چہرہ دیکھتا تھا۔ پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنے چہرے سے ڈاکٹر حارث کا میک اپ ختم کر دیا۔ اس کے

لیے میں نے اپنا چہرہ ایک ... محلول سے دھویا تھا جو میری الماری کے اس بکس میں رکھا تھا جس میں میک اپ کا دوسرا سامان موجود تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی آنکھوں پر چڑھے ہوئے کونٹیکٹ لینس بھی ہٹا دیے۔ اب میری پتلیوں کا رنگ گہرا سبز تھا، سیاہ نہیں اور یہی ان کا اصل رنگ تھا۔

میک اپ ختم کر کے میں دوبارہ مسہری پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے علم تھا کہ میرے اندر چھپی ہوئی تمام قوتیں میرے خیالات کی تابع ہیں۔ میں جس قوت کو جب چاہتا اپنے طاقت ور خیال کی لہر سے متحرک کر سکتا تھا۔ صرف یکسوئی ضروری تھی۔

ابھی مجھے بستر پر دراز ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرے وجود پر دھند چھا گئی۔ میرے خیال کی قوت نے کام شروع کر دیا تھا۔ میرا جسم دھندلانے لگا جیسے دھوئیں میں تبدیل ہو رہا ہو۔ پھر میرا دھواں دھواں وجود غائب ہونے لگا۔ اب میرے جسم کی اطراف دھوئیں کی ایک لکیر سی بننے لگی۔ چند ہی لمحے اور گزرے ہوں گے کہ میرا جسم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ صرف دھوئیں کی لکیریں رہ گئیں جنھیں میرے جسم کی آؤٹ لائن کہا جا سکتا تھا۔ پھر وہ دھوئیں کی لکیریں تیزی سے سمٹنے لگیں اور انھوں نے ایک نئے وجود کے خطوط ابھارنا شروع کر دیے مگر یہ وجود بہت مختصر سا تھا، کسی ایک سالہ بچے کا وجود! چند ساعتیں اور گزریں پھر دھواں اسی وجود میں تحلیل ہو گیا۔ اب فضا دوبارہ صاف اور روشن ہو چکی تھی۔ مسہری پر اب تیس سالہ نوجوان کی بجائے ایک سالہ صحت مند بچہ نظر آ رہا تھا اور وہ بچہ میں تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے اپنے وجود کو دیکھنے لگا۔

اس وقت میں نے اپنے وجود میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس کی۔ اس تجربے سے قبل میں نے جو خطرہ محسوس کیا تھا وہ قطعی بے بنیاد ثابت ہوا تھا۔ میرا ذہن مسلسل کام کر رہا تھا۔ میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے۔ ایک بالغ و عاقل شخص کی مانند میں سوچ سکتا تھا، سمجھ سکتا تھا اور شاید بول بھی سکتا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ عمر کی اس منزل میں آ کر میں بول سکتا ہوں یا نہیں، میرے چھوٹے چھوٹے ہونٹ حرکت میں آ گئے۔ "میں اس صدی کا سب سے بڑا عجوبہ ہوں!" میرے منہ سے ایک باریک سی ناآشنا آواز نکلی۔ یہ آواز بچوں ایسی ہی تھی۔

پھر میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مسہری سے اتر کر ڈریسنگ ٹیبل تک جاتے ہوئے چادر میرے جسم سے الگ ہو گئی مگر میں نے پروا نہ کی۔ میں تقریباً اچھل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے موجود اسٹول پر بیٹھ گیا۔ آئینے میں مجھے اسی ایک سالہ بچے کا چہرہ نظر آ رہا تھا جسے میں نے تصویر میں دیکھا تھا۔

"تو وہ میری ہی تصویر ہے!" میں باریک سی آواز میں بڑبڑایا اور اسٹول سے اتر کر تیزی سے مسہری کی طرف بڑھا۔

میں نے مسہری کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر اٹھا لی اور دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پہنچ گیا۔ اب میں کبھی تصویر کو دیکھ رہا تھا اور کبھی آئینے کو۔ تصویر میں موجود بچے کا چہرہ ہو بہو وہی تھا جو آئینے میں نظر آ رہا تھا۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس تصویر میں نظر آنے والی عورت میری ماں ہی ہو سکتی تھی۔

پھر مجھے دوبارہ عمر کی تیسویں منزل تک پہنچنے میں اسی تجربے سے گزرنا پڑا۔ میں نے دوبارہ اپنے چہرے پر ڈاکٹر حارث کا میک اپ کر لیا اور اسی کے ساتھ آنکھوں کی پتلیوں پر کونٹیکٹ لینس لگا لیے۔

یہ جاننے کے بعد کہ میں دنیا میں تنہا نہیں ہوں، مجھے بے انتہا مسرت ہوئی تھی مگر اسی کے ساتھ ایک بے رحم حقیقت نے میری ساری خوشی پامال کر دی تھی۔ میری ماں زندہ تو تھی لیکن میرے دشمنوں کی قید میں تھی۔ وہ حسین اور پاکیزہ سا چہرہ میری آنکھوں میں سما گیا تھا۔ کتنا بھولپن ہے اس چہرے پر! میں نے سوچا اور کتنا بدقسمت ہوں میں کہ زندگی کے اجاڑ صحرا میں سایہ بھی نظر آیا تو دھوپ کے جال نے راستہ روک لیا۔

ماں! میں اس لفظ کی حرمت، تقدس، گداز اور عظمت سے واقف تھا۔ میں نے ماں کے روپ میں اب تک صرف ڈاکٹر حارث کی ماں کو دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر جس طرح محبت کرتی تھی اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا اور میں بے حس نہیں تھا۔ اگر میں مجبور نہ ہوتا تو شاید کبھی اس عورت کی نگاہوں سے دور ہونے کا فیصلہ نہ کرتا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری روح میں اضطراب کی لہریں اٹھنے لگیں اور مجھے مجبوراً شراب کا سہارا لینا پڑا۔ پوری ایک بوتل پینے کے بعد مجھے وقتی دو پیگ کا نشہ ہوتا تھا اور اس کا سبب میرا طاقتور دماغ تھا جو نشے کو خود پر غالب نہیں آنے دیتا تھا۔ پھر میں سو گیا اور دوپہر اسی وقت اٹھا جب ملازمہ نے دروازے پر دستک دی۔ کرنل دوپہر کے کھانے کے لیے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں غسل سے فارغ ہو کر کھانے کی میز پر پہنچ گیا۔

کھانے ہی کے دوران میں اس فتنۂ قیامت کا فون آ گیا جس نے

مجھے بے چین کر دیا تھا۔ فون ایک ملازم نے اٹھایا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کوئی عورت مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر تھا کہ وہ اسی امریکی ایجنٹ کے سوا کون ہو سکتی تھی۔ میں کھانے کی میز سے اٹھ کر فون کے پاس پہنچا اور ملازم سے ریسیور لیتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"بول رہا ہوں میں! کہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے یقین ہے ابوالہول کہ تمہیں ثبوت مل چکا ہوگا اور تم اس کی صداقت کا سراغ بھی لگا چکے ہو گے۔" دوسری جانب سے توقع کے مطابق امریکی ایجنٹ ہی کی نسوانی آواز سنائی دی۔

"تصویر مجھے مل گئی ہے مگر میں ابھی اس کے سچ یا جھوٹ کا فیصلہ نہیں کر سکا۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔

"کیوں؟ یہ تمہارے لیے کیا مشکل ہے!" پھر وہ ہنس پڑی اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ننھے بچے! تم شاید اپنی اصل حالت میں لوٹتے ہوئے ڈر رہے ہو گے۔ تو سنو، اس میں خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"احمقانہ باتیں نہ کرو۔ میں گستاخی پسند نہیں کرتا۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ابوالہول کہ اس طرح تم کچھ وقت حاصل کرنا چاہتے ہو!" اس عورت کے لہجے میں طنز بدستور تھا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کل کی ایک فلائٹ سے ہندوستان جا رہے ہو۔ تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے بھولے بچے کہ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہاں پہنچ کر بھی تم ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکو گے۔"

جواباً میں نے اسے خالص امریکی لہجے میں ایک موٹی سی گالی دی پھر دانت پیس کر بولا۔ "سن اے احمق عورت! اگر وہ عورت واقعی میری ماں ہے تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو میں تیرے ملک میں وہ تباہی پھیلا دوں گا جس کا تو اور تیری حکومت تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"ہم تمہاری ماں کو قتل کرنے سے پہلے تمہیں ضرور آگاہ کر دیں گے لیکن بہتر یہ ہے کہ تم اسے قتل ہونے سے بچا لو ابوالہول! اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تم خود کو ہمارے حوالے کر دو۔" وہ میری بات کو نظر انداز کر کے بولی۔

"کیوں! کیا تم لوگوں کے دم خم ختم ہو گئے ہیں جو مجھے اغوا کر کے لے جاؤ تم اپنے ملک؟" میں زہریلے لہجے میں بولا۔

"یہ کوئی ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے۔ اگر تم نے ہماری پیش کش قبول نہ کی تو بالآخر تمہاری ماں کو قتل کرنے کے بعد ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔"

"میری ماں کے سلسلے میں کوئی غیر ذمہ دارانہ قدم اٹھانے سے پہلے اپنے آقاؤں تک میرا پیغام ضرور پہنچا دینا۔"

"پیغام یا دھمکی؟" اس نے ہنس کر کہا۔ وہ یقیناً مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔

"جو بھی سمجھو۔"

"ویسے میں تمہیں شام کو پانچ بجے پھر فون کروں گی۔ اگر تب تک تم اس ثبوت کی صداقت کا سراغ نہیں لگا پائے تو یہ وقت کافی ہے۔ اس کے بعد شاید تمہارے لہجے کی سختی ختم ہو جائے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹیلی فون کی لائن بے جان ہو گئی۔

کھانے کی میز پر دوبارہ آنے کے بعد کرنل کے استفسار سے پہلے میں نے اسے اسی عورت کی کہانی سنا دی جو مجھ سے اپنی ماں کا آپریشن کرانا چاہتی تھی۔ گذشتہ دن بھی امریکی ایجنٹ کا فون آنے پر میں نے یہی کہا تھا۔ پھر میں نے ملازم سے کہا کہ پانچ بجے شام کو وہ پھر فون کرے گی، اس سے کہہ دیا جائے "میں گھر پر نہیں ہوں۔"

کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ملازم کافی رکھ گیا۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں اسی امریکی ایجنٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے دشمنوں نے مجھے پھانسنے کے لیے اب ایک نیا حربہ استعمال کیا تھا۔ دشمنوں کے پاس میرے خلاف صرف ایک مہرہ تھا۔ وہ اتنی آسانی سے یہ مہرہ نہیں پٹوا سکتے تھے۔ دشمنوں سے سودے بازی کا انجام میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سلسلے میں ان سے سودے بازی صرف ایک صورت میں ممکن تھی کہ مجھے یقین ہوتا کہ میں انھیں دھوکا دے کر نکل جاؤں گا۔ اس سے قطع نظر مجھے یہ یقین ضرور تھا کہ میرے دشمن میری ماں کو ہرگز قتل نہیں کریں گے اور بار بار سودے بازی کی کوشش کرنا چاہیں گے۔ اگر میں انھیں جُل دے کر دوبارہ دنیا کی بھیڑ میں کھو بھی جاؤں تو میری ماں محفوظ ہی رہے گی۔ میں نے سوچا۔ میں اس دوران میں ہندوستان کے دارالحکومت دہلی جا کر اپنی ماں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات بہرحال طے شدہ تھی کہ وہ وہاں ضرور گئی تھی جس کا ثبوت وہ تصویر تھی۔

پہلے میں نے سوچا تھا کہ ہندوستان جاتے ہوئے راستے سے غائب ہو جاؤں گا لیکن اب وہاں سے واپسی پر کسی بھی ائیرپورٹ سے غائب ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

شام کو ٹھیک پانچ بجے اس امریکی ایجنٹ کا فون آیا اور

اس سے میری ہدایت کے مطابق کہہ دیا گیا کہ میں موجود نہیں ہوں۔ پھر اس کا فون نہیں آیا۔

پھر دوسرے دن جب میں کرنل کے ہمراہ ائیرپورٹ کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو کرنل کی بیوی ضبط کرنے کے باوجود سسک پڑی اور میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں نے بوڑھی عورت کے بازوؤں میں پناہ لے لی۔ اس لمحے مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہوا جیسے میں اپنی ماں کے سینے سے لگ گیا ہوں۔ بوڑھی عورت کے سینے سے جدا ہو کر میں نے بڑی حسرت کے ساتھ اس گھر کے در و دیوار کو دیکھا جنھوں نے مجھے کافی عرصے پناہ دی تھی اور جنھیں میں اب اپنی دانست میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا تھا۔

ائیرپورٹ پر میرے علاوہ وہ دو کھلاڑی بھی موجود تھے جنھوں نے نیشنل چیمپئن شپ میں پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ ٹیم کو رخصت کرنے کے لیے چیس فیڈریشن کا صدر بھی موجود تھا۔ میں نے سب سے مصافحہ کیا۔ وہاں اخباری نمائندے بھی موجود تھے مگر ان کی توجہ کا سبب صرف میں تھا۔

"اگر وہاں وہ مغرور روسی شاطر وکٹر کروچناف بھی ہوا تو کیا آپ اس سے کھیلنا پسند کریں گے ڈاکٹر؟" ایک اخباری نمائندے نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں، میں اس سے ضرور کھیلوں گا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اور اسے شکست بھی دوں گا۔"

"ڈاکٹر! کیا آپ بھی اس سے دو مہرے کم کھیلیں گے؟ بقول خود وہ دو مہرے کم کھیلتا ہے۔" اخباری نمائندے نے دوسرا دلچسپ سوال کیا۔

اسی وقت میرے جواب دینے سے پہلے چیس فیڈریشن کا صدر بول اٹھا۔ "وکٹر کروچناف اس مقابلے میں شرکت نہیں کرے گا کیوں کہ روس سے کارپوف بھی نہیں آ رہا۔ روس سے اسپاسکی اور تال آ رہے ہیں جو دونوں ہی سابق ورلڈ چیمپئن رہ چکے ہیں۔"

اخباری نمائندے نے اس کا جواب لکھ لیا۔ پھر ہم بھی ضروری اندراجات کے لیے آگے بڑھ گئے۔

ان دنوں شطرنج کے بین الاقوامی حلقوں میں مشہور زمانہ شاطر وکٹر کروچناف کا ایک نعرہ موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اخباری نمائندے نے اسی نعرے کے حوالے سے سوال کیا تھا۔ وکٹر کروچناف کا نام میں نے سنا تو تھا لیکن اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات سے لاعلم تھا۔

میں اس وقت عجیب سے احساسات سے دوچار تھا۔ کوئی ایسا تھا جو میرا دامن دل تھامے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "نہ جاؤ، مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ!"

"صالحہ!" میں بڑبڑایا مگر میری آواز بلند نہیں تھی۔

"کیا تم نے کچھ کہا؟" بوڑھا کرنل مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"نہیں ڈیڈی!" میں نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔

میرا دکھ سمجھ بھی کون سکتا تھا! وہ تو میری ذات کا دکھ تھا۔ میں اس دکھ کا اظہار کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا زخم ذات کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا۔ پھر انہی خیالوں میں کھویا ہوا میں نہ جانے کب اور کیسے جہاز میں جا بیٹھا۔ میں تو جیسے نیند کے عالم میں چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی جہاز فضا کے دوش پر پہنچ گیا اور میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ مجھے جیسے ہوش آ گیا اور میں خود فراموشی کے لمحوں سے نکل آیا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں حارث! تم چپ چپ سے کیوں ہو؟" کرنل جو برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

"کچھ نہیں ڈیڈی!" میں کرنل کو مطمئن کرنے کے لیے مسکرایا پھر موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر وکٹر کروچناف کے بارے میں پوچھا۔

"وہ روسی بھگوڑا! میں بتاتا ہوں تمہیں اس کے بارے میں۔" کرنل نے جواب دیا اور پھر تفصیلات بتانے لگا۔

وکٹر کروچناف نے روس سے فرار ہونے کے بعد یہ الزام لگایا تھا کہ وہاں شطرنج میں بددیانتی ہوتی ہے اور برسر اقتدار افراد کے اشارے پر چیمپئن منتخب ہوتا ہے۔ وہ اسی لیے وہاں سے فرار ہوا ہے تاکہ آزاد فضا میں روسی چیمپئن کارپوف کو شکست دے سکے جو ورلڈ چیمپئن بھی تھا۔ مغربی دنیا نے اس کے بیان کو خوب اچھالا تھا۔ پھر کئی بار کارپوف سے کروچناف کا مقابلہ ہوا مگر ہر بار کارپوف نے اسے شکست دی۔ آخری بار کارپوف سے اس کا مقابلہ اٹلی میں ہوا تھا اور نتیجہ وہی نکلا تھا۔ کروچناف ہار گیا تھا۔ اس موقع پر ایک اخباری نمائندے نے کروچناف کے دعوے کی روشنی میں شکست کا سبب پوچھا تھا۔ کروچناف نے ٹھنڈا سانس بھر کر جواب دیا تھا۔ "میں کارپوف کے مقابلے میں دو مہرے کم کھیلتا ہوں۔"

اخباری نمائندے کو یہ جواب سن کر حیرت ہوئی اور اس نے

وضاحت چاہی۔

"میری بیوی اور میرا بچہ، وہ دونوں ملاس میں ہیں۔" کرنل نے کہا تھا اور اس کے لہجے میں بلا کا دکھ تھا۔

اب میں سمجھ گیا تھا کہ اخباری نمائندے نے مجھ سے جو سوال کیا تھا اس کا مقصد کیا تھا۔ مگر میں بھی تو کرنل چرچ کی طرح بے وطن ہوں۔ میں نے سوچا۔ کرنل چرچ کی بیوی اور اس کا بچہ تو یادوسس کی قید میں تھا لیکن میری ماں ابھی تو امریکیوں کی قید میں ہے۔ پھر میری نگاہوں میں اپنی ماں کا چہرہ گھومنے لگا۔

روح کا اضطراب بڑھا تو مجھے شراب کا خیال آیا۔ کچھ دیر ہی میں ایک بوتل خالی کر کے میں نے دوسری بوتل منگا لی اور اسے بھی نصف سے زیادہ خالی کر دیا۔ کرنل بھی میرا ساتھ دے رہا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس دوران میں وہ صرف دو پیگ ہی پی سکا تھا۔ پھر جب میں دوسری بوتل کا آخری گھونٹ پی رہا تھا تو چونک اٹھا اور مجھے شدید حیرت بھی ہوئی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ یکے بعد دیگرے دو بار میرے ذہن سے کسی خیال کی لہر ٹکرائی ہے۔ کوئی یقیناً میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہی میری حیرت کا سبب تھا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن کی مدافعانہ قوت خود کارانہ طور پر کام کرنے لگی تھی اور میرے ذہن کی اوپری سطح پر ایک تاریک سا پردہ کھنچ گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ تاریک پردہ کھنچ جانے کے بعد مجھے اپنے ذہن میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی یوں جیسے طوفانی جھکڑوں کو کسی بند کمرے میں قید کر دیا گیا ہو اور وہ اس کمرے سے نکلنے کے لیے دیواروں کو گرا دینا چاہتے ہوں۔ یہ کیفیت صرف چند لمحے برقرار رہی پھر وہ تاریک پردہ خود بخود ہٹ گیا۔ مجھے بے حد سکون کا احساس ہوا۔

اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جہاز میں میرا کوئی نہ کوئی دشمن موجود تھا۔ میرا دشمن یہ کوشش کر کے میرے ذہن کو اپنا تابع بنا سکتا تھا۔ اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم وہ میرے خیالات سے تو آگاہ ہو ہی سکتا تھا۔ ایسا دشمن کسی بھی وقت میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

"ڈیڈی! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کرنل کو مخاطب کیا اور اسی کے ساتھ اپنی سیٹ کی ایک جانب لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ سیٹ پیچھے ہو گئی۔ پھر میں نے لیمپ بھی بجھا دیا۔

"ٹھیک ہے، تم آرام کرو، میں مطالعہ کرتا ہوں۔" کرنل بولا۔

"ہندوستان کے بارے میں ایک کتاب مجھے اپنی لائبریری میں مل گئی تھی، میں اسے ساتھ لے آیا تھا۔"

میں نے نیم باز ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور اس مشکل کام کا آغاز کر دیا جو کافی وقت چاہتا تھا۔

ابھی میں بمشکل کچھ افراد کے ذہن پڑھ سکا تھا کہ میرے خیال کی لہر ایک ذہن سے ٹکرائی۔ وہ ایک ایئر ہوسٹس تھی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ ایئر ہوسٹس اس وقت میرے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں نے اسی لیے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ میں اس کا ذہن پڑھنے لگا اور چونک اٹھا۔ جہاز کے چیف اسٹیورڈ نے اس ایئر ہوسٹس کو میرے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ میں اب کوئی مشروب طلب کروں تو پہلے وہ مشروب اس کے پاس لایا جائے پھر مجھے دیا جائے۔ یہی حکم ایئر ہوسٹس کے لیے الجھن کا سبب بنا ہوا تھا اور وہ اس وقت اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

چیف اسٹیورڈ اس وقت کہاں ہے؟ میرے ذہن نے ایئر ہوسٹس کے ذہن سے سوال کیا۔

کچن میں۔ مجھے جواب ملا۔

پھر چند ہی لمحے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ چیف اسٹیورڈ کو جہاز کے کیپٹن کی جانب سے ایک حکم ملا تھا۔ وہ حکم یہ تھا کہ میرے مشروب میں بے ہوش کرنے والی دوا کی بڑی مقدار ملا دی جائے۔ وہ کیپٹن کے اسی حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ اس حکم کا سبب کیا تھا؟ چیف اسٹیورڈ اس سے بے خبر تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا۔ کیا اس جہاز کا کیپٹن میرے دشمنوں سے مل گیا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے جلد ہی میرے خیال کی لہروں نے کیپٹن کے ذہن کی سطح کو چھو لیا۔ کیپٹن کا ذہن پڑھ کر مجھ پر جو انکشافات ہوئے انہوں نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ فضائی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ جو کچھ ہو رہا تھا، اس میں عراق کے اعلیٰ حکام ہی کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر ہی رہا کہ آخر عراقی حکومت کو کیا سوجھی جو وہ میری گرفتاری کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھی؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب عراق پہنچنے سے پہلے ملنا ناممکن تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جہاز کے کیپٹن کے منصوبے میں کوئی رخنہ نہیں ڈالوں گا۔

میں اس وقت اپنے دشمنوں کو دعائیں دے رہا تھا جنہوں نے

…چونکا دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میں بے خبری میں مارا جاتا۔ …کے بعد ہی میں پھر اپنے اس دشمن کی تلاش میں مصروف ہو گیا جس نے میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کی تھی اور اس طرح میں چوکنا ہو گیا تھا۔ …وہ دشمن جو اسی جہاز میں سفر کر رہا تھا۔

پھر کافی دیر بعد میں اسے تلاش کر سکا۔ اس کے ذہن نے فوراً …مدافعت کی تھی اور میں سمجھ گیا تھا کہ اپنے دشمن کے ذہن تک پہنچ گیا …ہوں۔ اس نے مدافعت کی بہت کوشش کی مگر کب تک۔ میرے …طاقت ور ذہن نے آخرکار اس کے ذہن کو مغلوب کر ہی لیا۔ میری …وہی امریکی ایجنٹ تھی جس نے مجھے فون کیا تھا اور تصویر بھیجی تھی۔ …ایک عراقی عورت کی حیثیت سے ہندوستان جا رہی تھی۔ وہ یقیناً …بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی ورنہ مجھے نہ چھیڑتی۔ میں چاہتا تو …امریکی ایجنٹ کو اسی وقت ختم کر دیتا لیکن اس نے مجھے شدید ذہنی …اذیت میں مبتلا کیا تھا اس لیے میں بھی پہلے اسے ذہنی اذیت میں مبتلا …کرنا چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنی ماں کا خیال آ گیا۔ یہ امریکی ایجنٹ …یقیناً میری ماں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو گی۔ میں نے سوچا اور …اس کا ذہن کریدنے لگا۔

مجھے پہلی اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ میری ماں اب بھی ہندوستان …دہلی میں تھی۔ یہ بات غلط تھی کہ وہ امریکیوں کی قید میں تھی لیکن یہ …صحیح تھا کہ امریکی ایجنٹ جب چاہتے اسے اغوا کر سکتے تھے۔ دوسری …اہم بات جو میں معلوم کر سکا وہ یہ تھی کہ میری ماں ہندوستانی نہیں …انس ہی تھی۔ امریکی ایجنٹ کا ذہن اس سوال کا کوئی جواب نہیں …سکا کہ میری ماں کا تعلق کس عرب ملک سے تھا۔ متحدہ عرب ممالک …میں سے میری ماں کا وطن، گویا میرا وطن کون سا تھا؟ میں نہ جان سکا۔

اب مزید وقت ضائع کرنا لاحاصل ہی تھا اس لیے میں نے …آنکھیں کھول دیں۔ اتنی دیر کی ذہنی مشقت نے مجھے تھکا سا دیا تھا۔ …میں اب شراب کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اگر میں خود شراب منگواتا تو …اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دی جاتی اس لیے میں نے ایک اور ہی …عمل کیا۔ مجھے یوں بھی اس امریکی ایجنٹ کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے …کے لیے کچھ دیر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے …میں اٹھ بیٹھا اور بٹن دبا کر سیٹ سیدھی کر دی۔

"کیوں، کیا اٹھ گئے؟" کرنل نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ اب تک …مطالعے میں مصروف تھا۔

"ہاں ڈیڈی، ذرا ہاتھ منہ دھو آؤں گا۔" میں نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

کرنل نے سر ہلایا اور کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں جہاز کے پچھلے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی جب میں باتھ روم سے نکلا تو لوگوں کی نگاہیں میرے وجود کو دیکھنے سے قاصر تھیں۔ آگے بڑھتے ہوئے میں نے امریکی ایجنٹ کے ذہن سے رابطہ پیدا کر لیا۔ اس بار مجھے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ ذہنی طور پر مغلوب ہو چکی تھی اور اب [illegible] بیٹھی تھی۔ میں نے اسے بلیک ڈاگ وہسکی منگانے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً تعمیلِ حکم کی۔ پھر جب میں امریکی ایجنٹ کی سیٹ کے قریب پہنچا تو ایک ایئر ہوسٹس شراب کی بوتل، گلاس اور سوڈا لیے ہوئے سامنے سے آ رہی تھی۔ میں رک گیا۔ جب وہ ایئر ہوسٹس شراب کی ٹرے رکھ کر چلی گئی تو میں آگے بڑھا۔ امریکی ایجنٹ کی سیٹ کونے ہی میں تھی۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھا لی۔ امریکی ایجنٹ کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

"تم خاموشی سے سب کچھ دیکھتی رہو گی!" میں نے امریکی ایجنٹ کے ذہن کو حکم دیا کیونکہ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے چیخ سکتی تھی۔ میں نے نصف بوتل خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی۔

پرچھائیں
کتابی صورت میں
ایم اے راحت
کا
ہنگامہ خیز ناول
قیمت: 40 روپے   ڈاک خرچ: 15 روپے
گل قریش لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔
فون: 7248593
7229762

پھر امریکی ایجنٹ کے کان میں سرگوشی کی۔ "اگر میں تمہارا میک اَپ بگاڑ دوں تو کیسی رہے؟"

جواب میں اس کے ہونٹوں نے حرکت کرنا چاہی مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً جان چکی تھی کہ اس کا وقت قریب آگیا ہے۔ وہ لازماً جانتی ہوگی کہ آج تک کوئی چالاک سے چالاک اور ذہین ترین امریکی ایجنٹ بھی ابوالہول کی نظر میں آنے کے بعد زندہ نہیں بچا تھا۔ میری توجہ اس وقت اس کے ذہن پر مرکوز تھی۔ اسے اپنے اوپر والوں کی ہدایات یاد آرہی تھیں۔ اسے ہدایت دی گئی تھی کہ وہ حتی الامکان مجھ سے دور ہی دور رہے۔ اسے افسوس تھا کہ اس نے ہدایات پر عمل نہیں کیا۔ اب وہ اپنی تقدیر کے فیصلے کی منتظر تھی۔

مجھے اس وقت اپنی ذہنی اذیت کا خیال آیا تو غصہ آگیا۔ پھر میں پیچھے ہٹا اور اس عورت کے منہ پر ایک تھپڑ جما دیا۔ تھپڑ زوردار تھا جس کی آواز بھی زوردار ہی تھی۔ برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا شخص بھی چونک کر اسی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے صرف یہ دیکھا ہوگا کہ قریبی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت اپنا بایاں رخسار سہلا رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے عورت کا چہرہ اوپر اٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص یہ نہیں دیکھ سکا ہوگا کہ عورت کے بال میری گرفت میں ہیں۔

تھپڑ کی آواز پھر ابھری۔ اس بار میں نے پہلے سے بھی شدید ضرب لگائی تھی۔ عورت کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا مگر اس کے باوجود اس کے منہ سے ہلکی سی سسکاری بھی نہیں نکلی۔ برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا شخص حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھتا رہا۔

"اس شخص کو گالی دے کر اس کے منہ پر تھوک دو۔" میں نے امریکی ایجنٹ کے ذہن کو حکم دیا۔ "یہ تمہیں بڑی بری نظروں سے گھور رہا ہے۔"

لمحے بھر بعد ہی وہ اپنی نشست سے اٹھی اور قریبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو موٹی سی گالی دے کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

غصے کی زیادتی سے اس شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور عورت پر جھپٹا۔ عورت نے فوراً ہی اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ اس شخص کو توقع نہیں ہوگی کہ بات اس حد تک بڑھ جائے گی۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ہکلانے لگا: "معا... معاف کرنا خاتون! غلطی ہی تھی۔"

جواب میں میرے ایما پر عورت نے اسے پھر گالی دی اور پھر ریوالور دوبارہ گریبان میں ٹھونس لیا۔ اس شخص کی بیوی بھی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس شخص کی دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ایک اور شرارت سوجھی۔ وہ عورت یکلخت تیزی کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھی اور امریکی ایجنٹ کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔

"اس کے بالوں کو زور سے جھٹکا دو!" میں نے اس عورت کے ذہن کو ترغیب دی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے ہی لمحے امریکی ایجنٹ کے سیاہ بال اس عورت کے ہاتھ میں تھے۔ یہ ایک ربڑ کی پتلی ماسک تھی جو اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی تھی۔ امریکی ایجنٹ کا اصل چہرہ لوگوں کے سامنے تھا۔ اس ہاتھا پائی اور ہنگامے نے جہاز کے دوسرے مسافروں کو بھی اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ سب لوگوں کے روبرو عراقی عورت کی بجائے ایک امریکی عورت کھڑی تھی جس کے سر پر سنہرے بال تھے۔

جلد ہی وہ ایئر ہوسٹس وہاں پہنچ گئیں جن کے پیچھے ایک اسٹیورڈ بھی آگیا۔ اس امریکی عورت پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ لوگوں پر ٹوٹ پڑی تھی اور جواباً لوگ اسے بری طرح زدوکوب کر رہے تھے۔ لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ یہ عورت پاگل ہے۔ سارے جہاز میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں خاموشی کے ساتھ لوگوں کے درمیان سے نکل آیا۔ مجھے جو کام کرنا تھا وہ انجام دے آیا تھا۔ اب صرف آخری مرحلہ باقی تھا جس کے لیے وہاں میری موجودگی ضروری نہیں تھی۔ میں اب باتھ روم کی طرف واپس جا رہا تھا۔

باتھ روم میں داخل ہو کر جب میں دوبارہ باہر آیا تو میرا وجود جسمانی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اب میں نادیدہ نہیں رہا تھا۔ میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ جہاز کے کپتان کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دی۔ وہ مسافروں کو بتا رہا تھا کہ پاگل امریکی عورت پر قابو پایا جا چکا ہے۔ لوگوں کو نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جانا چاہیے۔ میں اپنی نشست کے قریب پہنچا تو کرنل سامنے سے آرہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا: "غضب ہو گیا بیٹے!" پھر وہ تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں اس نے خیال آرائی کی۔ "وہ غیر ملکی جاسوسہ معلوم ہوتی ہے۔"

میں سر ہلاتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد ہی میں

پھر اس امریکی ایجنٹ کے ذہن سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ اب وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کے کس بل نکل گئے تھے۔ اسے قابو میں کرنے کے بعد فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔ "اس کے لیے اتنی سزا کافی ہے" میں نے سوچا اور پھر اس کے ذہن کو جھٹکا دیا۔ اتنا زبردست جھٹکا کہ اس کے دماغ کی نس پھٹ گئی۔ اس کی موت کی تصدیق مجھے اس طرح ہو گئی کہ اب ذہنی رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جھٹکا لگتے ہی اس کی ناک سے خون بہنے لگا ہوگا اور گردن ڈھلک گئی ہوگی۔ لوگ اس سے یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ ہنگامے کے دوران میں اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی ہوگی۔

یہ ہنگامہ ختم ہوا تو میرا ذہن جہاز کے کپتان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سخت فکرمند تھا اور کئی بار چیف اسٹیورڈ سے پوچھ چکا تھا کہ کسی نے شراب طلب کی یا نہیں۔ اس کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اب اس کے پاس بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں خود اس کے منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا مگر صرف ایک مرحلے تک۔ میں نے بالآخر شراب کا آرڈر دے ہی دیا۔ مجھے فوراً ہی شراب پہنچا دی گئی۔ مجھے علم تھا کہ شراب میں بے ہوشی کی دوا ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس میں سے ایک قطرہ شراب بھی نہیں پی اور الٹی کرنے والے تھیلے میں بڑی صفائی کے ساتھ نصف کے قریب بوتل خالی کر دی۔ اس کے بعد میں مسلسل کرنل سے گفتگو کرنے لگا تاکہ وہ میری طرف متوجہ رہے۔ پھر گفتگو کرتے کرتے ہی اچانک میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ کرنل کو میری اداکاری پر حسبِ توقع حقیقت کا گمان ہوا اور وہ فلائٹ کے ڈاکٹر کو فوری طور پر بلانے کے لیے چیخ پکار کرنے لگا۔

کرنل کے مطالبے پر فلائٹ کے ڈاکٹر نے فوراً میرا معائنہ کیا جو محض سرسری تھا۔ صرف دکھاوا کیونکہ اصل بات اس کے علم میں بھی تھی۔ کپتان کے حکم پر چیف اسٹیورڈ کو بے ہوشی کی دوا اسی نے فراہم کی تھی۔ ڈاکٹر نے بوڑھے کرنل کو بظاہر تسلی دیتے ہوئے کہا: "محترم! فکر کی کوئی بات نہیں۔ شراب کی زیادتی کے سبب یہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ جب نشہ اتر جائے گا تو ہوش میں آجائیں گے۔"

"لیکن اس نے زیادہ شراب نہیں پی ڈاکٹر! یہ تو باتیں کرتے کرتے یکدم..."

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ڈاکٹر نے کرنل کی بات کاٹ کر کہا۔ "میرے اندازے کے مطابق وہ آدھی بوتل سے زیادہ پی چکے تھے اور اب انھوں نے

اندھیرے کا تیر

ایک معصوم لڑکی کی داستانِ الم جو اپنے دشمنوں میں گھر گئی تھی۔

تحریر: ایم اے راحت

تیسری بوتل منگائی تھی لیکن یہ شراب کی زیادتی نہیں!"

کرنل نے ڈاکٹر کو لاکھ سمجھانا چاہا کہ اس کے بیٹے کے لیے یہ دو تین بوتلیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں مگر ڈاکٹر شانے اچکاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اس کے چلے جانے پر سکون کا سانس لیا۔

اسی وقت لاؤڈ اسپیکر پر ایک بار پھر کپتان کی آواز سنائی دی۔ وہ مسافروں سے مخاطب تھا: "خواتین و حضرات! میں اس جہاز کے کپتان کی حیثیت سے آپ کو ایک نئی زندگی کی نوید دیتا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ کپتان اب جہاز کے مسافروں کو وہی کہانی سنانے والا تھا جس کا مجھے پہلے ہی سے علم تھا اور میرا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔

کپتان اب وہی کہانی سنانے کے لیے راہ ہموار کر رہا تھا: "میں اس سلسلے میں آپ لوگوں کو کچھ بتانے سے پہلے نظم و ضبط برقرار رکھنے کی درخواست کرتا ہوں۔ ہمارا جہاز کچھ دیر بعد بنغازی ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے۔" یہ کہہ کر غالباً کپتان سانس لینے کے لیے رکا۔

"کیا؟" کئی افراد بیک وقت چیخ اٹھے۔ ان کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ وہ بنغازی ہی سے اس طیارے میں سوار ہوئے تھے اور پھر دوبارہ انہیں اسی ایئر پورٹ پر اترنے کی خبر سنائی جا رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ لوگ مزید تبصرے کرنے لگتے، کپتان کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی: "آپ لوگ یقیناً حیران ہو گئے یہ خبر سن کر۔ تو میں اس کا سبب بیان کیے دیتا ہوں۔ ہمارے جہاز میں کسی نے ٹائم بم رکھ دیا تھا۔"

یہ سنتے ہی جہاز پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ لوگ یکدم خاموش ہو گئے۔ یقیناً یہ اطلاع ان کے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔

کیپٹن کی پُرسکون آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی: "مگر آپ لوگ قطعی فکرمند نہ ہوں۔ تاہم بم کا سراغ لگا لیا گیا ہے اور ابھی اس کے پھٹنے میں پورا ایک گھنٹا باقی ہے۔ اس وقت تک آپ لوگ اس جہاز سے اتر کر شاید ہماری ہی کمپنی کے کسی دوسرے جہاز میں سفر کر رہے ہوں گے۔ تاہم بم کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب ہم خاصا سفر طے کر چکے تھے۔ ہم نے اپنے حکام سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے ہمیں بغداد واپسی کا حکم دیا تاکہ جہاز کو تباہی سے بچانے کے لیے بم کو ناکارہ بنایا جاسکے۔ ہم نے آپ حضرات کو جہاز میں ٹائم بم کی موجودگی سے دانستہ بے خبر رکھا تاکہ خوف و ہراس اور بدنظمی نہ پھیلے۔ ہم اس سلسلے میں معذرت خواہ ہیں۔ اب اپنی اپنی بیلٹ باندھ لیں، ہم بغداد ائیرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔" اس کے بعد کیپٹن کی آواز معدوم ہو گئی۔ اس نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے انجام دے دیا تھا۔

مجھے جو کچھ کرنا تھا، اس دوران میں اس کے متعلق فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے کیپٹن کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں کی۔ اس وقت جہاز ہوائی اڈے کا ایک چکر کاٹ کر نیچے اتر رہا تھا۔ اُسے ائیرپورٹ پر اترنے کی اجازت مل چکی تھی اور کنٹرول ٹاور سے لوکیشن بھی بتائی جا چکی تھی جہاں جہاز کو اترنا تھا۔

کیپٹن! تمہیں جہاز اتارنے کے لیے جو لوکیشن بتائی گئی ہے غلط ہے۔ میں نے کیپٹن کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کیونکہ اس کا ذہن پوری طرح میرے قابو میں تھا۔ پھر میں نے اس کے ذہن کو ترغیب دی، اگر جہاز کو حادثے سے بچانا ہے تو اسے مشرق کی طرف لے جاؤ۔

کیپٹن نے ایسا ہی کیا۔ جہاز اترتے اترتے ایک دم اٹھتا چلا گیا اور پھر مشرق کی طرف نکل گیا۔

اسی وقت کنٹرول ٹاور نے جہاز سے رابطہ قائم کیا اور کیپٹن سے اس سلسلے میں جواب طلب کیا گیا۔ کیپٹن نے وہی بات دہرا دی جو میں اس کے ذہن میں بٹھا چکا تھا۔

کنٹرول ٹاور سے سختی کے ساتھ اس بات کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ وہاں کوئی جہاز نہیں ہے۔ پھر دوبارہ لوکیشن کی وضاحت کی گئی کہ وہاں جہاز اتار لیا جائے۔

غریب کیپٹن میری وجہ سے خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں اس جہاز سے چھلانگ لگانے کی بجائے اس میں رہ کر بھی بخوبی اپنا دفاع کر سکتا تھا کیونکہ حکومتِ عراق کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔

منصوبے کے مطابق مجھے سفر کے دوران میں بے ہوش نہیں کیا جاسکا ورنہ میں اپنا دفاع نہ کر سکتا۔ یہ سوچ کر میں نے کیپٹن کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

جہاز ایک بار پھر چکر کاٹ کر رن وے کی طرف آیا۔ کیپٹن اب دی گئی ہدایات کے مطابق اپنے جہاز کو مقررہ جگہ اتار رہا تھا اور یہی وہ لمحے تھے جب میں نے کرتب دکھا کر باتھ روم کا رخ کیا۔ میرا وجود نادیدہ بن چکا تھا۔

بالآخر جہاز نے زمین کی سطح کو چھوا اور جھٹکے کے ساتھ رن وے پر دوڑنے لگا۔ جہاز کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بعد فوجی کی دو جیپیں ائیرپورٹ کی عمارت کی جانب سے جہاز کی طرف آتی دکھائی دیں۔ ان کے پیچھے ایک وین تھی جس سے وہ زینہ منسلک تھا جو جہاز کے دروازے سے لگایا جاتا تھا۔ یہ دونوں جیپیں آندھی طوفان کی طرح جہاز کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان جیپوں میں یقیناً کچھ اہم شخصیات ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ میں جہاز کی کھڑکی سے ان جیپوں کو بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جہاز میں جو ہنگامہ برپا ہونے والا تھا، میرے ذہن میں ابھی سے اس کا ہلکا سا خاکہ مرتب ہونے لگا تھا۔

ہماری بہترین کتابیں

جنت کی تلاش	رحیم گل	210
داستاں چھوڑ آئے	رحیم گل	150
پیاس کا دریا	رحیم گل	150
وہ اجنبی اپنا	رحیم گل	110
تن تارا را	رحیم گل	90
زہر کا دریا	رحیم گل	100
وادیٔ گماں میں	رحیم گل	75
پورٹریٹ	رحیم گل	100
خدوخال	رحیم گل	60

رابعہ بک ہاؤس
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان

کبھی کبھی واقعات اتنی تیزی سے گزر جاتے ہیں کہ بیان کرنے والا کوئی اہم بات بھول جاتا ہے۔ وہ اہم بات اس کے ذہن کے میں رہ جاتی ہے اور اسے یہی گمان ہوتا ہے کہ واقعے کی ہر تفصیل بیان کر دی ہے۔ ایسا ہوتا نا کچھ عجیب نہیں خصوصاً حیرت انگیز واقعات کے بیان میں۔ سو میرے ساتھ بھی کچھ ویسا ہی ہوا مگر مجھے فوراً ہی اس بات کا احساس ہو گیا۔ میں اسی لیے چند باتوں کو پھر سے دہرا رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں جس جہاز میں سفر کر رہا تھا اس نے لندن ائیرپورٹ سے پرواز کی تھی۔ لیکن اس جہاز میں کلکتہ جا رہا تھا اور یقیناً یہ بات بھی آپ کے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہوگی کہ مجھے جو شراب دی گئی تھی اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دی گئی تھی۔ میں نے وہ شراب نہیں پی تھی مگر ظاہر یہی کیا تھا کہ شراب پی کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے میرا سرسری معائنہ کیا تھا۔ پھر جہاز کے کیپٹن نے مسافروں کو یہ کہانی سنائی تھی کہ اس جہاز میں ٹائم بم ہے اور یہ کہ اب جہاز کو دوبارہ بغداد ائیرپورٹ پر اتارا جا رہا ہے وغیرہ۔ اس کے بعد میں نے جہاز سے چھلانگ لگانے کا قصد کیا پھر ارادہ بدل دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ میں جہاز میں موجود رہ کر اپنا دفاع کروں گا۔ جہاز کا کیپٹن کنٹرول ٹاور سے دی گئی ہدایات کے مطابق جہاز کو مقررہ جگہ اتار رہا تھا۔ میں یہ بیان کرنا بھول گیا تھا کہ اپنے وجود کو نادیدہ

بنانے کی خاطر مجھے بے ہوشی کی اداکاری ترک کر دینا پڑی تھی۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر کرنل مطمئن ہو گیا تھا اور پھر میں باتھ روم کی طرف چلا گیا تھا۔ جب میں باتھ روم سے نکلا تو میرا وجود نادیدہ بن چکا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جہاز ایئرپورٹ پر اتر گیا اور اسے ملٹری کے مسلح جوانوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ باتھ روم سے آکر میں دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا مگر مجھے اب کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ملٹری کی دو جیپیں دیکھیں جو تیزی سے جہاز کی طرف آ رہی تھیں۔ انہی کے پیچھے ایک ویگن تھی جس سے وہ زینہ منسلک تھا جو جہاز کے دروازے سے لگایا جانے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ یقیناً ان جیپوں میں کچھ اہم شخصیات ہوں گی۔ کچھ دیر بعد جہاز میں جو ہنگامہ برپا ہونے والا تھا میرے ذہن میں ابھی سے اس کا ہلکا سا خاکہ مرتب ہونے لگا تھا۔

یہ واقعات وہ تھے جو میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کے بعد کن ہنگاموں نے جنم لیا انھیں بیان کرتا ہوں۔

میری ساری توجہ جہاز کے باہر ہونے والی نقل و حرکت پر مرکوز تھی کہ میں نے کسی شخص کی آواز سنی۔ وہ شخص کرنل سے میرے ہی بارے میں استفسار کر رہا تھا۔ میں نے اسے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ جہاز کا چیف اسٹیورڈ ہے۔ اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"وہ... وہ باتھ روم گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے ہوش آگیا تھا۔" کرنل نے اسے جواب دیا۔

چیف اسٹیورڈ کرنل کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی باتھ روم کی طرف لپک گیا تھا۔ میں اس کا ذہن پڑھ کر معلوم کر چکا تھا کہ اسے میری خبر لینے جہاز کے کیپٹن ہی نے بھیجا تھا۔ پھر بہت مختصر عرصے میں تمام اسٹیورڈز اور ایئر ہوسٹسیں سارے جہاز میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے اور میں ان کی بوکھلاہٹوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

میں اب ایک بار پھر کھڑکی سے جہاز کے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ وہ دونوں جیپیں اب اس حلقے تک پہنچ گئی تھیں جو جہاز کے گرد ملٹری کے مسلح جوانوں نے قائم کر لیا تھا۔ وہاں جیپوں کی رفتار کچھ کم ہو گئی اور مسلح جوانوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ انھوں نے جیپ کو راستہ دے دیا تھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا کہ ان جیپوں میں کچھ اہم شخصیات ہی سوار تھیں۔ جیپیں اس حلقے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھیں پھر جہاز سے کچھ فاصلے پر رک گئیں۔ جیپوں میں سوار افراد نیچے اتر آئے۔

کچھ دیر بعد جہاز کا اگلا دروازہ کھل گیا اور اس سے زینہ [illegible] دیا گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی۔ ان دونوں جیپوں سے اترنے والے ملٹری کے باوردی حکام تھے۔ صرف ایک شخص ان میں ایسا تھا جس کے جسم پر وردی نہیں تھی۔ وہ بہترین سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی شخصیت بھاری بھرکم نظر آ رہی تھی۔

میں جس وقت اگلے دروازے کے قریب پہنچا تو وہاں جہاز کے کیپٹن اور دوسرے عملے کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ جہاز کا دروازہ کھل چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ جہاز سے منسلک زینے پر چڑھنے والا وہی سوٹ والا تھا جو نصف سیڑھیاں طے کر چکا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا اور ملٹری حکام اس کے پیچھے تھے۔ وہ بھی آناً فاناً جہاز کے اندر پہنچ گئے۔ سوٹ والے نے کیپٹن کے اترے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی پھر ماتھے پر بل ڈال کر اس سے کہا: "ڈاکٹر حارث کی نشست [illegible] میری رہنمائی کرو کیپٹن!"

کیپٹن غالباً اس بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ ملٹری کے باوردی حکام کو دیکھ کر ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ کوئی اہم آدمی ہو گا۔ وہ ہکلانے لگا: "وہ... وہ جناب حارث... ڈاکٹر..."

"جلدی بکو!" سوٹ والا برہم ہو گیا۔

"وہ... وہ سر... پُراسرار طور پر غائب... جہاز سے غائب ہو گیا!" کیپٹن نے بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جسے سن کر سوٹ والا اچھل پڑا۔

"کیا بکتے ہو! اڑتے ہوئے جہاز میں سے کون غائب ہو سکتا [illegible] وہ بھی تمہارے علم میں آئے بغیر!" سوٹ والا دہاڑا۔

اس وقت تک میں سوٹ والے کے ذہن کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ سوٹ والے کو اس وقت کچھ دیر پہلے کا واقعہ یاد آگیا تھا جب کیپٹن نے دروغ بیانی سے کام لیا تھا اور اپنے جہاز کو ایئرپورٹ پر اترتے اترتے اوپر اٹھا لے گیا تھا۔ اس وقت بھی سوٹ والا کنٹرول روم میں موجود تھا اور دوربین سے جہاز کو دیکھ رہا تھا۔ اب سوٹ والا یہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے جہاز کا کیپٹن بھی اس امریکی ایجنٹ کا آلۂ کار ہو جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ [illegible] جہاز کو لینڈ کرنے سے پہلے مشرق کی طرف لے گیا تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس امریکی ایجنٹ نے اس دوران میں پیراشوٹ کے ذریعے جہاز سے چھلانگ لگا دی ہو، مگر یہ کام وہ کیپٹن کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سوٹ والے نے یہ سب کچھ سوچ لیا اور ایک

[illegible] تک پہنچ گیا۔ میں چاہتا تو اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتا تھا کیونکہ [illegible] بہرحال بے قصور تھا لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھے بہت [illegible] معلوم کرنا تھا۔ میرے لیے صرف اتنا جان لینا کافی نہیں تھا کہ وہ سوٹ والا ملٹری انٹیلی جینس کا چیف ہے۔ فیصلہ کرنے کے بعد چیف ایک ہم [illegible] اور ملٹری حکام سے مخاطب ہوا: "کیپٹن کو حراست میں لے لیا جائے۔"

چیف کا حکم سنتے ہی ایک ملٹری افسر نے تیزی کے ساتھ اپنے [illegible]لسٹر سے ریوالور نکال کر کیپٹن کی طرف تان لیا اور پھر اس کی نال [illegible] دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غرایا: "چلو!"

"م... مگر... مگر سر! میرا جرم؟" کیپٹن گھبرا گیا اور اس نے [illegible] دونوں ہاتھ بھی اٹھا دیے۔ اس غریب نے اب تک نہایت ذہانت [illegible] ساتھ تمام فرائض انجام دیے تھے اور ہر حکم کی تعمیل کی تھی پھر بھی [illegible] حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس کا احتجاج غلط نہیں تھا۔

"خاموش رہو!" ملٹری افسر نے کیپٹن کو ڈانٹ دیا اور اسے [illegible] دیتا ہوا زینے کی طرف لے گیا۔

"جہاز کا ایک ایک گوشہ دیکھ ڈالو! ایک ایک مسافر کے کاغذات [illegible] کرو اور ان سے ڈاکٹر حارث کے بارے میں پوچھ گچھ کرو!" چیف [illegible] اطراف کھڑے ہوئے ملٹری حکام کو حکم دیا۔ پھر چیف کے حکم کی [illegible] ہونے لگی۔ کچھ اور ملٹری افسروں کو جہاز پر بلا لیا گیا۔ خود چیف بھی [illegible] میں شریک تھا اور وہ جسے تلاش کیا جا رہا تھا یعنی میں، چیف [illegible] سائے کی طرح لگا ہوا تھا اور اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔ میری [illegible] کے لیے حکومتِ عراق بہرحال بے سبب اتنا بڑا اقدام نہیں اٹھا [illegible] تھی اور وہ سبب چیف کا ذہن پڑھنے کے بعد ہی میرے علم میں [illegible] سکتا تھا۔

جب ملٹری والوں نے میری تلاش شروع کی تو مسافروں نے ٹائم [illegible] والی کہانی کا حوالہ دے کر اس جہاز سے اترنے کے لیے شور کیا۔ چیف [illegible] مسافروں کو بتایا گیا کہ جہاز کے کیپٹن نے ناقابلِ بیان وجوہ کی [illegible] دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ جہاز میں کوئی ٹائم بم نہیں تھا۔ مسافروں [illegible] کے لیے انھیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ کیپٹن کو اسی لیے حراست میں لیا [illegible] ان سے کہا گیا کہ ضروری کارروائی کے بعد وہی فلائٹ [illegible] کیپٹن کی سرکردگی میں جلد ہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو [illegible] گی۔

جہاز کے مسافروں کی اکثریت نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس [illegible] میں ٹائم بم نہیں ہے، اسی جہاز میں دوبارہ سفر کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً انتظامیہ کو ان سے وعدہ کرنا پڑا کہ انھیں دوسری فلائٹس میں جگہ دے دی جائے گی۔ جہاز کی تلاشی کے دوران ہی امریکی ایجنٹ کی لاش بھی اتاری جا چکی تھی اور اس کے تمام سامان کو قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ پوچھ گچھ کی خاطر جہاز کے سیکنڈ پائلٹ کو بھی حراست میں لیا جا چکا تھا۔ بوڑھا ریٹائرڈ کرنل بھی ملٹری کی حراست میں تھا لیکن ابھی اس سے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا۔

تمام بھاگ دوڑ اور تلاشی و جستجو کا نتیجہ ظاہر ہے کہ صفر ہی رہا۔ اچھی طرح پوچھ گچھ اور مکمل تلاشی کے بعد مسافروں کو جہاز سے اترنے کی اجازت دے دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے وہ سفر لاحاصل اور انتہائی ناخوشگوار رہا تھا، جس کے لیے انتظامیہ نے ان سے معذرت کر لی تھی۔

میں اس دوران میں ملٹری انٹیلی جینس کے چیف کا ذہن اچھی طرح کرید چکا تھا۔ جو کچھ اس کے علم میں تھا مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے اپنے تمام سوالوں کے جواب تو نہ مل سکے لیکن ایک راہ ضرور مل گئی۔

جو بھی کارروائی عمل میں آئی تھی اس سلسلے میں بظاہر چیف ہی آگے آگے رہا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ چیف کی ڈوری ہلانے والا وزیرِ دفاع تھا۔ اس نے براہِ راست چیف سے بات کی تھی۔ وزیرِ دفاع نے ملٹری انٹیلی جینس کے چیف کو صرف اتنا بتایا تھا کہ بغداد سے ہندوستان جانے والی فلائٹ نمبر ۲۰۷ میں ایک خطرناک امریکی جاسوس سفر کر رہا ہے جس کے پاس کمیونسٹ دنیا کے کچھ ایسے راز ہیں جو کسی بھی قیمت پر باہر نہیں جانا چاہییں۔ چیف کو بتایا گیا تھا کہ وہ امریکی ایجنٹ عراق ہی کے ایک نامور نیورو سرجن ڈاکٹر حارث کے میک اپ میں سفر کر رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس امریکی ایجنٹ کی شناخت گلاب کی خوشبو ہے۔ چیف کے خیال میں کوئی بھی ایجنٹ اتنا احمق نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنی واضح شناخت کو نظر انداز کر جائے... سے اپنے وجود کا لازمہ بنائے رکھے، مگر اس نے اس سلسلے میں فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی حرکت میں آگیا تھا۔ اس نے فوراً عراق ایئرلائن کے چیئرمین سے فون پر رابطہ قائم کیا مگر اس وقت تک فلائٹ نمبر ۲۰۷ پرواز کر چکی تھی۔ چیف بذاتِ خود اسی وقت ایئرپورٹ پہنچ گیا تھا۔

پھر جو کچھ بھی ہوا اسی کی ہدایات پر ہوا تھا، لیکن ان ہدایات کے پس پشت ایک اور شخص کا ہاتھ تھا۔ میری گرفتاری کا منصوبہ اسی شخص کے ذہن کی پیداوار تھا اور چیف نے اسی پر عمل کیا تھا۔

چیف ہی کی ہدایت پر فلائٹ نمبر ۲۰۷ سے فوراً رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ جہاز کے کیپٹن کو اعلیٰ حکام کی جانب سے یہ ہدایت کی گئی کہ وہ طہران کی جانب بدستور پرواز کرتے ہوئے نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد نہایت خاموشی سے واپسی کا سفر شروع کرے اور دوبارہ بغداد ایئرپورٹ پر اتر جائے۔ اس سلسلے میں آخری لمحات تک جہاز کے مسافروں کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر چیف کو وہ کہانی بھی بتائی گئی جو بغداد ایئرپورٹ پر اترتے وقت اسے اپنے مسافروں کو سنانا تھی۔ کیپٹن کو مطمئن کرنے کے لیے اسے یہ بھی بتا دیا گیا کہ حقیقتاً جہاز میں کوئی ٹائم بم نہیں بلکہ یہ کہانی صرف مسافروں کو اطمینان دلانے کے لیے ہے کہ دوبارہ انھیں بغداد کیوں واپس لے آیا گیا۔ کیپٹن کو جو احکام دیے گئے تھے، ان میں سب سے اہم حکم میرے متعلق تھا۔ جہاز کو بغداد ایئرپورٹ پر اتارنے سے پہلے اسے کسی نہ کسی مشروب میں مجھے بے ہوشی کی دوا دینا تھی۔ کیپٹن نے اپنے حکام کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا تھا مگر اس کے باوجود وہ بے چارہ پھنس گیا تھا، نہ صرف وہ بلکہ سیکنڈ پائلٹ اور کرنل بھی!

میری نظر میں وہ تینوں افراد بے قصور تھے جنھیں ملٹری والوں نے چیف کے اشارے پر حراست میں لے لیا تھا اور اب ایئرپورٹ کی عمارت کے ایک کمرے میں چیف نے ان سے پوچھ گچھ کا آغاز کر دیا تھا۔ چیف کے ذہن کو پڑھ کر مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ غیر معمولی ذہین اور جاندار شخص ہے۔ وہ چاہتا تو زیرِ حراست افراد کو ملٹری انٹیلی جینس کے ہیڈکوارٹر لے جاتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کا طریقۂ کار عام روش سے ذرا ہٹ کر تھا۔ وہ ان افراد سے پوچھ گچھ کرنے میں تاخیر نہیں کرتا تھا جن پر اسے شبہ ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں اس طرح ملزم کو سوچنے سمجھنے کا وقت مل جاتا ہے اور وہ اپنی صفائی میں مختلف جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔

میں بھی اسی کمرے میں موجود تھا جہاں پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ چیف نے پوچھ گچھ کا آغاز جہاز کے کیپٹن سے کیا۔ اس نے پہلا سوال کیا: "تم نے پرواز کے دوران میں پہلی بار مقررہ جگہ جہاز نہ اتارنے کا جو جواز دیا تھا وہ قطعی غلط تھا۔ جواب دو کہ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟"

کیپٹن کو دونوں بازوؤں سے دو مسلح فوجی پکڑے ہوئے تھے اور چیف براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کیپٹن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ جواب دینے کی بجائے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا کیوں کہ اس کی دانست میں جو الزام لگایا جا رہا تھا قطعی غلط تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے پہلی بار کے دوران میں مقررہ جگہ اترتے ہوئے وہاں دو جہازوں کو کھڑے دیکھا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ چیف، جہاز کے کیپٹن کی خاموشی پر اسے سرزنش کرتا، اس کے قریب ہی سے میں نے سرگوشی کی: "کیپٹن بے قصور ہے۔ اس کی آنکھوں نے وہی دیکھا جو انھیں دکھایا گیا۔" چیف تیزی سے مڑا مگر جس طرف سے اسے سرگوشی سنائی دی تھی، وہاں کوئی نہیں تھا البتہ کچھ فاصلے پر اسی کمرے میں چند بوڑھے کرنل اور سیکنڈ پائلٹ کو حراست میں لیے کھڑے تھے۔ اس نے ان لوگوں کی طرف گھور کر دیکھا۔

"ان لوگوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔" میں نے پھر چیف کو مخاطب کیا۔ اب میں اس کے قریب ہی دائیں جانب کھڑا ہوا تھا۔ پہلے میں بائیں جانب تھا۔

اس بار وہ دائیں جانب مڑا۔ اس کے چہرے پر کسی قدر الجھن سی نظر آ رہی تھی کیونکہ دائیں جانب دور دور نزدیک کوئی بھی نہ تھا۔ میری سرگوشی کیپٹن اور دونوں فوجیوں نے بھی یقیناً سنی ہوگی جو اسے پکڑے ہوئے کھڑے تھے کیونکہ چیف ان کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ سرگوشی سنتے ہی کیپٹن اور دونوں فوجیوں کے چہروں سے خوف کا اظہار ہونے لگا تھا۔ جب میں بائیں جانب سے چیف کی دائیں جانب گیا تھا تو میرے قدموں کی چاپ بھی انھوں نے ضرور سنی ہوگی۔ یہ باتیں انھیں خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھیں کیونکہ آوازیں سننے کے باوجود انھیں میں نظر نہیں آ سکا تھا۔

"ہاں تو چیف! میں تم سے کہہ رہا تھا کہ جہاز کا کیپٹن قطعی بے قصور ہے اور وہ دونوں افراد بھی جو اس گوشے میں مسلح جوانوں کی حراست میں ہیں۔" اس بار میں نے چیف کے عقب میں پہنچ کر کہا۔ چیف مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر اس وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی خوف زدہ ہو گیا ہے۔ وہ پلٹا تو اس کے چہرے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں میں غالباً اس نے خود پر قابو پا لیا اور کہا: "کون ہو تم؟ سامنے آؤ! کہاں چھپے ہوئے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"پہلے یہ کھلونا اپنی جیب میں رکھ لو پھر میں تمھارے سوال کا جواب دوں گا۔" میں مطمئن لہجے میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ میں نے فوراً ہی اپنی جگہ مصلحتاً بدل دی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ چیف فائر کرنے والا تھا۔ چیف نے آواز کی سمت فائر جھونک مارا۔ دھماکے سے کمرہ گونج اٹھا۔ گولی نے سامنے والی دیوار کا پلاسٹر ادھیڑ دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر اچانک میں نے چیف کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور کی نال چیف کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ چیف کو وہ ریوالور فضا میں معلق ہی نظر آ رہا ہوگا۔

"میں چاہوں تو خود تمھارے ریوالور کی گولی تمھیں نشانہ بنا سکتی ہے۔" میں نے چیف سے کہا۔ "لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ بہرحال تم لاعلمی کا شکار ہو، تمھیں حقیقت کا علم نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ریوالور کا چیمبر کھول کر گولیاں نکال لیں اور بولا: "لو، لیکو اپنا ریوالور!" اسی کے ساتھ میں نے ریوالور چیف کی طرف اچھال دیا۔ چیف نے ہاتھ بڑھا کر خالی ریوالور کیچ کر لیا۔ اسی وقت میں نے ریوالور کی گولیاں کمرے کے ایک کونے کی طرف پھینک دیں۔ اس کمرے میں جتنے افراد بھی موجود تھے، وہ عجیب منظر دیکھ کر اور میری آواز سن کر دہشت زدہ سے نظر آ رہے تھے۔ صرف چیف نے اب تک اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے تھے۔

"بولو چیف! تم ان بے گناہوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو یا نہیں؟" میں نے چیف سے سوال کیا۔

"لیکن تمھیں ان لوگوں سے کیوں ہمدردی ہے؟" چیف نے پوچھا۔ اس کی آواز میں اب تک لرزش پیدا نہیں ہوئی تھی۔

"اس لیے چیف کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ان کی بے گناہی کا ثبوت؟" ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لمحہ بہ لمحہ خود پر چیف کا اعتماد بحال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ میرے نادیدہ وجود سے گفتگو کرتے ہوئے خوف یا دہشت کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔

"کیپٹن نے جب اپنا جہاز لینڈ کرتے کرتے اسے یکدم اٹھا لیا تو اس وقت وہ میری قوتوں کے زیرِ اثر تھا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر میرے قابو میں تھا۔ میں نے ہی اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی کہ جہاں وہ اپنا جہاز لینڈ کرنے والا ہے، وہاں پہلے ہی دو جہاز موجود ہیں۔" میں نے چیف کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

"چلو میں یہ تسلیم کیے لیتا ہوں کہ اس کا ذہن تمھاری قوتوں کے زیرِ اثر تھا لیکن کیا تم نے اس کی بصارت کو بھی ناکارہ بنا دیا تھا؟" چیف نے بحث کی۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ جہاں کوئی بھی جہاز موجود نہیں تھا وہاں اس نے دو جہاز دیکھ لیے؟"

"چیف اگر تم نے نفسیات کا مطالعہ کیا ہوتا تو شاید یہ سوال نہ کرتے۔ اگر کسی شخص کو ایک بات پر مکمل یقین آ جائے تو پھر اسے وہی نظر آتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کیپٹن کی قوتِ خیال نے اسے وہ منظر دکھا دیا جو حقیقتاً وجود نہیں رکھتا تھا۔ غالباً اب تم میری بات سمجھ گئے ہوگے۔" میرا انداز سمجھانے کا سا تھا۔

"اگر میں تمھاری یہ بات بھی تسلیم کر لوں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟" چیف بلاجھجک بولا۔

"میرا ارادہ یہ تھا کہ میں جہاز سے چھلانگ لگا دوں گا مگر پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جہاز ہی میں تھے مگر... مگر... تم کہیں وہی امریکی ایجنٹ تو نہیں جو ڈاکٹر حارث کے میک اپ..." چیف نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ وہ جو بات کہنے والا تھا، شاید اسے احمقانہ معلوم ہوئی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ بھلا اس امریکی ایجنٹ کا میرے پُراسرار وجود سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

"تم نے نصف سچائی کا اظہار کیا ہے۔" میں نے چیف سے کہا۔ "ویسے اس میں قصور تمھارا نہیں، تمھارے بڑوں کا ہے۔ خیر تمھارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ ڈاکٹر حارث کے میک اپ میں سفر کرنے والا کوئی امریکی ایجنٹ نہیں تھا۔ تمھارے وزیرِ دفاع نے تمھیں اس سلسلے میں غلط اطلاع دی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا، یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تم نے بہرحال بہ حسن و خوبی اپنے فرائض انجام دیے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہے کہ تم بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہو ورنہ تمھاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس وقت اس کے پیر کانپ رہے ہوتے اور وہ مجھ سے گفتگو کی ہمت نہ کر سکتا۔"

وزیرِ دفاع سے چیف کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ خود اس کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ مجھ سے وہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میری توجہ اس وقت چیف کے ذہن ہی پر مرکوز تھی۔ وہ اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ میرا پُراسرار وجود یقیناً اتنی قوت نہیں رکھتا کہ ملٹری کے قبضے سے کیپٹن اور دوسرے زیرِ حراست دو افراد کو رہا کرا سکے ورنہ میں اس سے یہ مطالبہ نہ کرتا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو چیف!" میں نے یہ کہہ کر چیف کو چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ "تم غلط فہمی کا شکار ہو کہ میں ان افراد کو رہائی نہیں دلا سکتا۔ میں چاہتا تو یہ میرے لیے بہت آسان تھا اور اب بھی میں ایسا کرنے پر قادر ہوں لیکن اس طرح یہ لوگ مجرم ثابت ہو جائیں گے جو میں نہیں چاہتا۔ اگر میں انھیں رہا کرا دیتا تو تم

انھیں دوبارہ ڈھونڈ کر حراست میں لے لیتے۔"

"میں تمھاری یہ قوت آزمانا چاہتا ہوں۔" چیف نے اس سمت گھورتے ہوئے کہا جدھر سے اسے میری آواز سنائی دے رہی تھی۔

"مجھے تمھارا چیلنج منظور ہے چیف! لیکن تمھیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ تم دوبارہ ان بے گناہوں کو پریشان نہیں کروگے۔"

"مجھے... مجھے... میں وعدہ کرتا ہوں۔" بالآخر چیف نے کہہ ہی دیا اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔

"تو پھر خود اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ اتنے سارے مسلح افراد کے درمیان سے یہ تینوں کس طرح بہ حفاظت اس کمرے سے نکلتے ہیں!" میں نے جو دعویٰ تھا اسے ثابت بھی کر سکتا تھا۔ میرے الفاظ ختم ہوتے ہی چیف نے چیخ کر تمام مسلح فوجیوں کو خبردار کیا کہ وہ کسی قیمت پر زیر حراست افراد کو کمرے سے نہ نکلنے دیں۔

مجسموں کی مانند کھڑے ہوئے مسلح فوجیوں میں چیف کی آواز سن کر جیسے جان آ گئی۔ انھوں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنی اپنی رائفلیں سیدھی کرلیں۔ اب کیپٹن، کرنل اور سیکنڈ پائلٹ تینوں ہی ان کے نشانوں پر تھے۔ وہ دونوں فوجی جنھوں نے کیپٹن کو بازوؤں سے تھام رکھا تھا، انھوں نے بھی کیپٹن کے بازو چھوڑ کر پوزیشن لے لی تھی۔ ان فوجیوں کے علاوہ دو مسلح فوجی جو دروازے پر کھڑے تھے، انھوں نے بھی اپنی رائفلوں کے رخ کمرے کی اندرونی سمت پھیر لیے۔ اب اگر ان تینوں زیر حراست افراد میں سے کوئی بھی دروازے کا رخ کرتا تو وہ اسے بھون کر رکھ دیتے۔ پھر چیف نے ان تینوں زیر حراست افراد کو مخاطب کیا۔ "سنو! اگر تم میں سے کسی نے اپنی جگہ سے جنبش بھی کی تو جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔" چیف کی آواز میں بلا کی سختی تھی۔ اس کے بعد چیف نے فوجیوں کو حکم دیا: "اگر ان تینوں میں سے کوئی بھی میرے حکم کی خلاف ورزی کرے تو اسے گولی ماردی جائے۔"

"تم تمام تیاریاں کر چکے چیف!" میں اس سے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔" چیف نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر اب وہ منظر دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ جسے تم شاید زندگی بھر نہیں بھلا سکو گے۔"

چند لمحے کمرے میں موت کا سا سناٹا چھایا رہا۔ فضا میں عجیب سا تناؤ تھا۔ یہ وہ لمحات تھے جب میں ان مسلح فوجیوں کے ذہنوں کو اپنا مطیع بنا رہا تھا۔ پھر وہی سب کچھ ہوا جو میں نے... کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مسلح فوجی ایک ایک کر کے اپنی جگہ سے ہٹنے...

"کیا کر رہے ہو تم! اپنی پوزیشن نہ چھوڑو!" چیف دھاڑا... فوجیوں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ ایک دائرہ سا بناتے ہوئے چیف کی طرف بڑھتے رہے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہے ہوں۔ اب ان کی رائفلوں کا رخ چیف کی طرف تھا۔

"رک جاؤ! میں کہتا ہوں رک جاؤ!" چیف پھر چیخا۔ لیکن فوجیوں کے قدم نہیں رکے۔ بالآخر انھوں نے چیف کو نرغے میں لیا اور اسی وقت تینوں زیر حراست افراد نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ ان کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

"چیف سے کہو کہ اگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو تم اسے گولی ماردو گے۔" میں نے ایک مسلح فوجی کے ذہن کو حکم دیا۔ اس نے سخت لہجے میں میرے الفاظ اپنی زبان سے ادا کر دیے۔ چیف کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ یقیناً اس گستاخی اور حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے زیر حراست افراد کو بھی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ شاید اس نے ایسی بے بسی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی ہوگی۔ غصے کی زیادتی کے سبب اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ پھر چند ہی لمحے بعد اس نے کمرے کا دروازہ کھلتے اور دوبارہ بند ہوتے بھی دیکھ لیا۔ جانے والوں نے دروازے سے نکلتے ہی بھیڑ دیا تھا۔ میں نے جو دعویٰ کیا تھا وہ سچ ثابت کر دکھایا تھا۔ تینوں میرے ہی حکم کے زیر اثر اس کمرے سے گئے تھے ورنہ ان میں خود اتنی ہمت کبھی پیدا نہ ہوتی۔ غالباً ابھی چیف کوئی فیصلہ بھی نہ پایا ہوگا کہ اس غیر معمولی صورت حال سے کس طرح نمٹے کہ مسلح فوجیوں نے حرکت کی۔ پھر چند ہی لمحوں بعد وہ اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے جہاں کچھ دیر پہلے کھڑے تھے۔ اب ان کے چہروں پر حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان کے ذہنوں کو آزاد کر دیا تھا۔

"ذرا ان فوجیوں کے چہروں کو غور سے دیکھو چیف!" میری آواز سن کر چیف چونک اٹھا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں وہاں سے جا چکا ہوں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: "زیر حراست افراد کے غائب ہو جانے پر ان فوجیوں کو شدید حیرت ہے۔ چند لمحے پہلے اس کمرے میں جو کچھ ہوا ہے انھیں قطعی یاد نہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو ان سے پوچھ لو، یہ بھی لاعلمی کا اظہار کریں گے۔"

جواب میں چیف نے طویل سانس لیا۔ وہ گم صم سا اپنی جگہ کھڑا

ہوا تھا۔ اس کمرے میں یکے بعد دیگرے جو واقعات رونما ہوئے تھے، اس کی فہم سے یقیناً بالاتر ہی تھے۔ پھر چیف وہاں نہیں رکا اور میرا رکنا بھی فضول ہی تھا۔ میں بھی چیف ہی کے پیچھے پیچھے اس کمرے سے نکل آیا۔ میں جب اس کمرے سے نکلا تو میرے ذہن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ میری گرفتاری کا منصوبہ بنانے والا کون تھا؟ وہی شخص جس کی ہدایات پر چیف نے عمل کیا تھا! چیف کا ذہن پڑھ کر مجھے اس شخص کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ جب چیف ائیرپورٹ پہنچا تھا تو وہ شخص بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گیا تھا اور اس کے پاس عراقی وزیر دفاع کا خط تھا جو چیف کے نام تھا۔ عراقی وزیر دفاع نے چیف کو لکھا تھا کہ مطلوبہ شخص کی گرفتاری کے سلسلے میں اس کا خط لے کر آنے والا جو بھی اقدامات تجویز کرے، ان پر بلا تاخیر عمل کیا جائے۔ مجھے بحالتِ بے ہوشی گرفتار کیا جائے، یہ اسی شخص کی ہدایت تھی۔ میری نظر میں یہ بہت اہم نکتہ تھا۔ وہ جو شخص بھی تھا یقیناً اس بات سے آگاہ تھا کہ مجھے بہ قید ہوش و حواس گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ شخص میری حیرت انگیز قوتوں سے آگاہ تھا۔ پھر جب جہاز کے کیپٹن کو تمام ضروری ہدایات دے دی گئی تھیں تو وہ شخص ائیرپورٹ سے چلا گیا تھا۔ وہ شخص، وزیر دفاع کا خط لے کر ائیرپورٹ پہنچا تھا۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی تھیں: ایک تو یہ کہ وہ شخص، وزیر دفاع کے لیے اجنبی نہیں تھا اور وزیر دفاع کو اس پر مکمل اعتماد تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ معمولی شخصیت کا حامل نہیں تھا۔

اس شخص کے بارے میں وزیر دفاع یقیناً بہت کچھ جانتا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ ابھی تمام باتوں پر غور کرتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک دم چونک اٹھا۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب بوڑھا کرنل تھا جو ایک کاؤنٹر کے سامنے کھڑا ہوا ضروری اندراجات کرا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بہ یک وقت خوف، گھبراہٹ اور فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ دوسری باتوں پر غور و خوض کرتے ہوئے اس کا خیال ہی میرے ذہن سے نکل گیا تھا حالانکہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ائیرپورٹ سے اسی کے گھر جاؤں گا۔ میں کچھ اور نہیں تو کم از کم اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اس کے سینے کا بوجھ وقتی طور پر ہلکا کر دیتا۔ کرنل اور اس کی بوڑھی بیوی میری نگاہ میں بے قصور تھے۔ اگر ان کا کوئی قصور تھا تو صرف یہ کہ انھوں نے مجھے وہ محبت دی تھی جس سے اب تک میں محروم رہا تھا۔ میں ان دونوں کے ذہنوں کو کسی ایسے فریب میں مبتلا کر سکتا تھا کہ ان کے بیٹے کی پراسرار گم شدگی انھیں خون کے آنسو نہ رلا سکے۔ کوئی امید، کوئی جھوٹی تسلی، کوئی احساس، کوئی دلاسا، کچھ بھی ممکن تھا! مجھے بہرحال ان دونوں کی محبت کا قرض اتارنا تھا۔

پھر جب کچھ دیر بعد کرنل ائیرپورٹ سے ایک ٹیکسی میں اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اپنے قریب میری مخصوص خوشبو محسوس کر کے وہ چونکا تھا مگر شاید اسے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ معمول پر آ گیا تھا۔ میرا وجود اب تک نادیدہ ہی تھا۔

کرنل کے گھر پہنچ کر مجھے شدید ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ میں وہاں جس غرض سے آیا تھا، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ میں جن کے زخموں پر فریب کا مرہم رکھنے آیا تھا، ان کا بیٹا گھر آ چکا تھا۔ اسی کو دیکھ کر مجھے ذہنی جھٹکا لگا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ شخص ڈاکٹر حارث کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت ایرانی نوجوان کا میک اپ نہیں تھا بلکہ اس کا اصل چہرہ میرے سامنے تھا۔ ڈاکٹر حارث جس کی پوری شخصیت ہی میں نے بدل دی تھی، یوں اچانک سامنے آ جائے گا، اگر یہ بات میرے ذہن کے کسی بھی گوشے میں ہوتی تو مجھے ذہنی جھٹکا نہ لگتا۔ ڈاکٹر حارث کچھ بیمار بیمار سا اور کمزور معلوم ہو رہا تھا۔ کرنل پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر حارث لپک کر اس کے قریب آ گیا اور بولا: "ڈیڈی! آپ... آپ کہاں گئے تھے؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

بوڑھے کرنل نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "مگر بیٹے تم... تم جہاز کے اندر سے کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں!... جہاز کے اندر سے غائب! کیا کہہ رہے آپ ڈیڈی!" ڈاکٹر حارث حیرت سے بولا، پھر کہا: "میں تو اسپتال سے آ رہا ہوں۔"

میں ان لوگوں کے قریب ہی کھڑا ہوا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ میرے خیال میں کرنل اور ڈاکٹر حارث دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر حارث کے اس بیان سے کہ وہ اسپتال سے آ رہا ہے، مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ وہ عرصہ اس کی یادداشت سے محو ہو چکا ہے یا محو کر دیا گیا ہے جس عرصے میں میں نے اس کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر بھی حتمی طور پر اس کا ذہن پڑھے بغیر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

کرنل کی بیوی بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ وہ ڈاکٹر حارث کی بات سننے کے بعد کرنل سے مخاطب ہوئی۔ "یہ ابھی کچھ دیر پہلے آیا ہے۔ بس کوئی دس منٹ پہلے! میں نے اس سے آپ کے بارے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے! یہ تو

اس بات سے بھی انکار کر رہا ہے کہ آپ کے ساتھ گھر سے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تھا' ہندوستان جانے کے لیے! اب آپ ہی سمجھائیے اسے!"

"معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔" کرنل نے آہستہ سے کہا' پھر ڈاکٹر حارث سے بولا۔ "تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔" کرنل حارث کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں بھی ان دونوں کے ساتھ تھا مگر ظاہر ہے کہ وہ دونوں وہاں میری موجودگی سے بے خبر تھے۔ "یہ بتاؤ حارث کہ تم آج صبح سے کیا کرتے رہے ہو؟" جہاں دیدہ کرنل نے حارث کو کچھ بتانے سے پہلے مصلحتاً سوال کیا۔

"حسبِ معمول میں اسپتال گیا' وہاں دو آپریشن کیے اور پھر گھر لوٹ آیا۔" ڈاکٹر حارث نے بلا جھجک جواب دیا' پھر بولا۔ "مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

جواب میں کرنل نے طویل سانس لیا' پھر بولا۔ "فی الحال اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں تم سے کیوں پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ تم صرف میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر حارث اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "پوچھیے اور کیا پوچھنا ہے؟"

کرنل چند لمحے کچھ سوچتا رہا' پھر معاً دریافت کیا۔ "آج کیا تاریخ ہے؟"

"آج!" اسے یقیناً اس سوال پر حیرت تھی۔ پھر اس نے جو تاریخ بتائی وہ غلط تھی۔

"ہوں۔" کرنل نے پھر طویل سانس لیا۔ "مہینہ کون سا ہے؟"

"اکتوبر!" حارث نے فوراً جواب دیا۔ یہ جواب بھی غلط تھا۔ یہ اکتوبر کا نہیں دسمبر کا مہینہ تھا۔

"کیا اکتوبر کے مہینے میں اتنی سردی پڑتی ہے جتنی اس وقت ہے؟" کرنل نے کہا۔

"ہاں یہ موسم کی تبدیلی میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جب میں اسپتال سے چلا تھا تو قطعی سردی نہیں تھی لیکن اس وقت میں خاصی سردی محسوس کر رہا ہوں۔" حارث نے جواب دیا۔

"تم اس لیے سردی محسوس کر رہے ہو کہ یہ اکتوبر کا نہیں دسمبر کا مہینہ ہے اور آج سولہ اکتوبر نہیں' بچیس دسمبر ہے۔" کرنل پُرسکون لہجے میں بولا۔

"کیا... کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈیڈی!" حارث نے چونک کر کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹے!" کرنل بولا۔ "تمہارے حافظے سے تین ماہ نو دن غائب ہیں اور ایسا کیوں ہے' میں تم سے سوالات کر کے یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"تین ماہ نو دن!" حارث خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "مگر... مگر یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے!" پھر وہ کرنل سے بولا۔ "ٹھہریے' میں اسپتال فون کر کے اس مریض کی حالت کے بارے میں معلوم کرتا ہوں جسے آپریشن کے دوران میں ہوش آ گیا تھا اور اسے دوبارہ بے ہوش کرنا پڑا تھا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" کرنل نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "پہلے تمہیں یہ یقین آنا ضروری ہے کہ آج وہی تاریخ اور مہینہ ہے جو میں نے بتایا ہے۔ تم فون کر آؤ' میں یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر حارث کمرے سے نکل گیا اور کرنل گہری سوچ میں کھو گیا۔ اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا پھیل گیا تھا۔ وہ یقیناً اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوگا۔ یہ بہرحال یادداشت کھو جانے کا کیس بھی نہیں تھا' اگر ایسا ہوتا تو حارث نہ اسے پہچانتا' نہ اسے ماضی کی کوئی بات یاد ہوتی۔ کرنل کے خیال میں تو حارث کے حافظے سے صرف تین ماہ نو دن غائب تھے۔

حارث دوبارہ کمرے میں واپس آیا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ وہ آتے ہی بولا۔ "کمال ہے ڈیڈی! وہ لوگ تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہے ہیں!"

"کیا؟" کرنل نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اسپتال سے استعفیٰ دے چکا ہوں۔" حارث نے حیران حیران سے لہجے میں جواب دیا' پھر بولا۔ "میں نے ڈاکٹر احسان سے بھی فون پر بات کی تھی۔ انھوں نے مجھے مزید الجھن میں مبتلا کر دیا۔ انھیں پہلے تو یہی یقین نہیں آ رہا تھا کہ فون پر میں ہی ان سے گفتگو کر رہا ہوں' جب انھیں یقین آ گیا تو کہنے لگے کہ مجھے تو اس وقت ہندوستان جانے والے جہاز میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پوچھا' کیوں؟ تو انھوں نے بتایا کہ میں ہندوستان میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی شطرنج کے مقابلے میں عراق کی جانب سے شرکت کرنے جا رہا تھا۔ عجیب بات ہے' مجھے شطرنج سے دلچسپی تو ہے مگر یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی اور ملک جا کر عراق کی نمائندگی کر سکوں گا۔ ڈاکٹر احسان کا کہنا ہے کہ میں عراق کی قومی ٹیم میں تیسرے نمبر کا کھلاڑی ہوں۔" یہ کہہ کر حارث صوفے پر تقریباً گر سا گیا اور اپنا سر دونوں

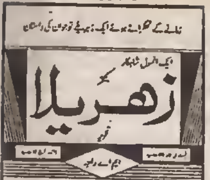

ہاتھوں سے تھام لیا۔

"حارث! خود کو سنبھالو بیٹے!" کرنل نے محبت سے کہا۔ "اگر تم اپنے ذہن کو صرف یہ باور کرا لو کہ تمہارے حافظے سے تین ماہ نو دن غائب ہو چکے تو باقی معاملات خود بہ خود بڑی حد تک سلجھ جائیں گے۔ اس عرصے میں جو کچھ بھی ہو چکا' ظاہر ہے کہ تم اس سے قطعی بے خبر ہو۔ پہلے میں تمہیں اس دوران میں پیش آنے والے واقعات بتانا چاہتا ہوں تاکہ تمہارا ذہن مزید کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔" اس کے بعد کرنل نے ایک ایک کر کے تمام واقعات سکون و اطمینان سے بیان کیے۔ درمیان میں ڈاکٹر حارث اس سے سوالات بھی کرتا رہا اور کرنل جواب دیتا رہا۔ میں اب تک خاموش تماشائی بنا ہوا ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا اور مختلف نتائج اخذ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میری توجہ ڈاکٹر حارث کے ذہن پر بھی مرکوز تھی۔

"یہ سب کیا... کیا ہو گیا ڈیڈی؟" حارث کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ کرنل نے اپنی گفتگو کے آخر میں صالحہ سے رشتہ ٹوٹ جانے کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صالحہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے اور اسے یہ بھی علم تھا کہ صالحہ بھی اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔

کرنل نے اسے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق وہ اسپتال سے استعفیٰ دے چکا تھا' شراب نوشی کرنے لگا تھا اور تمام دوستوں کو چھوڑ کر گھر میں قید ہو گیا تھا۔ یہ ساری باتیں ایک طرف تھیں اور صالحہ کا معاملہ ایک طرف! وہ بھلا کس طرح صالحہ کو شریکِ حیات بنانے سے انکار کر سکتا تھا اور صالحہ بہ حیثیت شوہر اسے قبول کرنے پر کیوں آمادہ نہ ہوتی؟ یہ تو ایک ہی کہانی تھی جس کا مرکزی کردار حارث نہیں' میں تھا جو خود کو اس وقت گنہگار محسوس کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے بیٹے کہ فی الحال تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" کرنل نے جیسے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کرنل نے حارث کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کہا۔ "تمام باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دو بیٹے! جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔"

ڈاکٹر حارث بھی غالباً اس وقت تنہائی چاہتا تھا اس لیے کرنل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ اب حارث کا رُخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں میرے بہت سے شب و روز گزرے تھے۔

حارث نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اندر سے اس کا دروازہ بند کر لیا۔ میں اس سے پہلے ہی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ کمرے کے اندر کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اس لیے وہاں نیم تاریکی سی تھی لیکن حارث نے بلب نہیں جلایا اور مسہری پر دراز ہو گیا۔ وہ لیٹ گیا تو میں مسہری کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچتے ہی میں نے جان لیا کہ حارث نے میرے جسم کی مخصوص مہک محسوس کر لی ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ خوشبو کس سے آ رہی ہے۔ حالانکہ وہ چونک اٹھا تھا۔ چونک اٹھنے کا سبب یہ تھا کہ میں نے اسے اسی کا نام لے کر مخاطب کیا تھا مگر میری آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ڈاکٹر حارث! یہ تمہارا وہم نہیں' حقیقت ہے کہ میں تم سے مخاطب ہوں۔" میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"کون ہو تم؟" ڈاکٹر حارث ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور نیم تاریکی میں غور سے اطراف کا جائزہ لینے لگا مگر ظاہر ہے کہ میں اسے کیسے نظر آ جاتا جب تک خود نہ چاہتا۔

"میں کون ہوں' یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔ مجھے صرف یہ علم ہے کہ میں تمہارا ہمزاد ہوں۔" اسی کے ساتھ میں جس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا' اس پر میرے ہیولے کے نقوش واضح ہونے لگے۔ وہ کرسی مسہری کے قریب ہی تھی جس پر میں موجود تھا۔ اب میں اپنے وجود کو حارث کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ پھر پہلے ہلکی سی دھند پھیلی' اس کے بعد اس دھند سے میرا چہرہ ابھرا جو خود ڈاکٹر حارث ہی کا چہرہ تھا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد ہی اس کرسی پر بھی ایک ڈاکٹر حارث موجود تھا۔ دھند اب غائب ہو چکی تھی۔ میں سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور یہ سوٹ بھی ڈاکٹر حارث ہی کا تھا۔ حارث کے لیے تو یہ بات بھی حیران کن ہی ہوگی کہ اس نے جو آواز سنی تھی' وہ بھی خود اسی کی آواز تھی۔

ہمزاد! ڈاکٹر حارث کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ کہیں یہ

میرا ہمزاد تو نہیں؟ اس نے سوچا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو دوست!" اس بار میں حارث کی آواز کی بجائے اپنی اصل آواز میں بولا۔ "میں تمہارا ہمزاد نہیں ہوں۔ ہاں' میرے چہرے پر تمہارا میک اَپ ضرور ہے۔" ڈاکٹر حارث نے جو بات اپنی زبان سے نہیں کہی تھی' وہ میں نے جان لی تھی۔ وہ اس وقت میرے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ میرے چہرے پر اس کا میک اَپ کیوں ہے؟ میں کون ہوں؟ کیا چاہتا ہوں؟ مجھے دیکھنے کے بعد اس کے ذہن پر متعدد سوالوں نے یورش سی کر دی تھی۔ میں اس کے کمرے میں کس طرح آ گیا؟ وہ دھند کیسی تھی جس سے پہلے میرا وجود نظر نہیں آ رہا تھا اور کیوں نظر نہیں آ رہا تھا؟

"ڈاکٹر حارث! اپنے ذہن کو زیادہ نہ الجھاؤ۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ "میں تمہیں کچھ حقیقتوں سے آگاہ کرنے آیا ہوں جن سے تم قطعی بے خبر ہو۔ میں تمہیں جو کچھ بتانے والا ہوں' اس کے بعد شاید تمہاری بہت سی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔ میں اگر تم سے نہ ملتا تو بہت سی باتیں زندگی بھر تمہارے لیے معما ہی بنی رہتیں۔ تم کبھی نہ سمجھ پاتے کہ تمہاری محبوبہ نے تمہیں شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے پر کیوں آمادگی کا اظہار نہیں کیا اور...."

"تم... تم آخر یہ سب کچھ کس طرح جانتے ہو؟" ڈاکٹر حارث نے میری بات کاٹ دی۔

"میں یہ سب کچھ اس لیے جانتا ہوں میرے دوست کہ پورے تین ماہ تو واقعی میں ہی تمہاری جگہ اس گھر میں رہا ہوں۔" میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا' پھر مزید بولا۔ "خود تم نے یہ عرصہ کہاں اور کیسے گزارا' اس بارے میں ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف اس وقت اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ تم میرے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے ہو گے۔"

"میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" ڈاکٹر حارث اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تم بھی سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔" میں پُرسکون لہجے میں بولا۔ "سنو! اگر میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت نہ کی ہوتی تو میں تمہیں اس گھر میں دیکھنے کے بعد خاموشی سے لوٹ گیا ہوتا اور تمہارے پاس اس کمرے میں نہ آتا۔ تمہارے ساتھ جو بھی ہوا ہے' اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے اسی لیے خود کو تمہارا مجرم کہا تھا۔ میں کون ہوں؟ تو یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ تمہارے لیے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں وہ شخص ہوں جس کی خاطر دنیا کی تین بڑی طاقتیں فکرمند ہیں اور ان کے ایجنٹ میرے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ یہ جاننا تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے' اس لیے میں تمہیں اس کا سبب نہیں بتاؤں گا۔ میں اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے ساری دنیا میں بھٹکتا پھر رہا ہوں مگر مجھے کہیں امان نہیں مل سکی۔ امان ہی کی خاطر میں عراق آیا تھا اور یہیں سے تم میری زندگی میں شامل ہوئے۔" اس کے بعد میں نے حارث کو وہ سب کچھ بتا دیا جو اس سے متعلق تھا' یہ کہ میں کس طرح ڈاکٹر حارث بن گیا اور اسے میں نے کیا بنا دیا! پھر میں سب کچھ بتانے کے بعد اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

ڈاکٹر حارث کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آ رہے تھے پھر وہ پھٹ ہی پڑا۔ "تم انتہائی کمینے' خودغرض اور ذلیل شخص ہو۔ تم... تم..." شدتِ جذبات کے سبب وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو میرے دوست!" میرے لہجے میں اداسی تھی حالانکہ مجھے اس سے اسی ردعمل کی توقع تھی۔ میں نے مزید کہا۔ "میں اسی قابل ہوں کہ تم میرے لیے یہ الفاظ استعمال کرو۔"

"تم نے میری زندگی تباہ کر دی اور اب غالباً تم تماشا دیکھنے آئے ہو میری بربادی کا تماشا!" ڈاکٹر حارث طیش کے عالم میں بولا۔ "تم نے ڈاکٹر حارث بن کر اسپتال سے استعفیٰ دے دیا۔ بولو' تمہیں کیا حق تھا اس کا؟ کیوں استعفیٰ دیا تم نے؟ تم نے میرا کیریر کیوں برباد کیا؟"

"میں تمہاری طرح ماہر نیورو سرجن نہیں تھا' پھر میرا ضمیر کس طرح یہ گوارا کر لیتا کہ میں لوگوں کی زندگی سے کھیلتا رہوں! بتاؤ' میں استعفیٰ نہ دیتا تو کیا کرتا!"

ڈاکٹر حارث نے پہلی بار میرے لیے ہمدردی محسوس کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے استعفیٰ دے کر یقیناً بہت سے لوگوں کی زندگی بچا لی تھی۔ اگر میں خودغرض یا سنگ دل ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتا۔ پھر اس کے ذہن میں صالحہ کا خیال آ گیا۔ اسی تین ماہ کے دوران میں بچپن کا وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا اور اس کا ذمہ دار بھی میں ہی تھا۔ یہ سوچ کر اسے پھر غصہ آنے لگا اور پھر یہ بات اس کی زبان پر بھی آ گئی۔

صالحہ کے ذکر نے مجھ پر اضطراری کیفیت سی طاری کر دی۔ میں کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں جیسے خود بخود کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ ڈاکٹر حارث لاعلم تھا کہ اس ذکر نے میرے دل پر کیا اثر کیا تھا' کیا قیامت ڈھا دی تھی! جب میں بولا تو یوں جیسے سسکیاں پیوستِ گلو ہوں اور شور تیرِ دل میں ترازو ہوں۔ میری آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ "ڈاکٹر! تم... کیا یہ ممکن نہیں کہ... کہ تم... تم یہ ذکر نہ چھیڑو۔ میں... میں..."

"کیوں؟ کیا تم بے خبر تھے کہ وہ میری منگیتر ہے؟" ڈاکٹر حارث میری بات کاٹتے ہوئے بدستور غصے کے عالم میں بولا۔

"ہاں ڈاکٹر! وہ... وہ تمہاری امانت تھی... امانت! اسی لیے تو... اسے میں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ... وہ میری... میری تھی بھی کیا! وہ... وہ میری... میری محبت تو نہیں تھی ڈاکٹر! اور... اور میں... میں تمہاری محبت پر ڈاکا نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے... میں نے اسے بھی مجبور کر دیا کہ... کہ وہ بھی انکار کر دے۔" میں رک رک کر بول رہا تھا' ایک خواب کے سے عالم میں۔ "ڈاکٹر! اگر... اگر میرے دل میں بددیانتی ہوتی تو... یا بددیانتی آ جاتی تو... تو بتاؤ مجھے... مجھے کون... کون روک سکتا تھا! لیکن میرے ضمیر نے اس بھولی بھالی' بے خبر اور معصوم لڑکی کو دھوکا دینا منظور نہیں کیا۔"

ڈاکٹر حارث چند لمحے کو سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس زمانے میں بھی ایسے لوگ' مجھ سے لوگ موجود ہیں؟ میرے الفاظ نے اس کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا تھا کیوں کہ میرے لفظ سچے تھے' ان میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا' اس کے خیال میں انسانیت اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت تھا لیکن اسی کے ساتھ ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔ صالحہ نے انکار کیوں کیا اور میں نے اسے کس طرح انکار پر مجبور کر دیا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ذہن میرے لیے کھلی کتاب کے مانند تھا۔ وہ جو کچھ بھی سوچ رہا تھا' اس کے ذہن میں جو سوالات ابھر رہے تھے' میں ان سے اسی طرح واقف تھا جیسے وہ خود!

"صالحہ آخر انکار پر کیسے آمادہ ہو گئی؟" آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ "وہ تو تمہیں ڈاکٹر حارث ہی سمجھ رہی ہو گی۔"

"ممکن ہے ڈاکٹر' تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے۔" میں ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ہر شخص سے اپنی بات منوا سکتا ہوں۔ مجھ میں یہ اہلیت موجود ہے۔"

"لیکن... لیکن اب کیا ہو گا؟" ڈاکٹر حارث کے لہجے میں اضطراب تھا اور یہ اضطراب صالحہ سے محبت کی دلیل تھا۔

"وہی جو پہلے ہوتا ڈاکٹر!" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" ڈاکٹر حارث نے چونک کر کہا۔

"تمہاری صالحہ تمہیں مل جائے گی۔" یہ الفاظ بڑی مشکل سے میں نے ادا کیے۔

"مگر وہ... وہ مجھے... وہ تو مجھے قبول کرنے سے انکار...."

"اس نے تمہیں نہیں' مجھے قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ جس طرح اس کا اقرار' انکار میں بدلا جا سکتا ہے' اسی طرح اس کے انکار کو بھی اقرار میں بدل دیا جائے گا۔" میں ڈاکٹر حارث کی بات کاٹ کر بولا۔ "بس ایک بار... اور شاید آخری بار مجھے اس سے... صالحہ سے ملنا پڑے گا پھر... پھر تمہارے خواب... تمہارے خواب پورے ہو جائیں گے ڈاکٹر!"

"تم بڑی عجیب اور پُراسرار شخصیت کے مالک ہو۔" ڈاکٹر حارث نے اعتراف کیا۔ "میں بہرحال تمہارا احسان مند ہوں اور اپنے وہ الفاظ واپس لیتا ہوں جو جذبات کی رَو میں بہہ کر میری زبان سے نکل گئے تھے۔ تم یقیناً اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور میری ذہنی کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے معاف کر دو گے۔"

"نہیں ڈاکٹر!" میں نے کہا۔ "تمہیں مجھ سے معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا' وہ یہی کہتا یہی سوچتا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" پھر میں نے اسے بتایا۔ "مجھے بغداد میں فی الحال کچھ اشد ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس کے بعد میں بصرہ جانے کی کوشش کروں گا' شاید اسی ہفتے!"

"تم... کیا تم صالحہ سے ڈاکٹر حارث بن کر ہی ملو گے؟" ڈاکٹر حارث نے سوال کیا۔ اسے یہ سوچ کر عجیب سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا کہ ایک اجنبی اس کی محبوبہ سے ملے گا۔ ہرچند کہ اسے مجھ پر اعتماد تھا پھر بھی کوئی جذبہ ایسا تھا جو اسے بے چین کیے ہوئے تھے۔

"اس سلسلے میں قبل از وقت میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" میں نے جواب دیا پھر اسے اطمینان دلانے کی خاطر بولا۔ "ڈاکٹر! مجھے علم ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ اس اعتماد کو برقرار رکھو۔ یقین کرو' تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ میں بہرحال تمہاری امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔ اگر میں اتنا ہی بُرا ہوتا تو شاید تمہیں یہ بتانے کی زحمت نہ کرتا کہ میں عنقریب بصرہ جاؤں گا۔"

ڈاکٹر حارث نے سر جھکا لیا اور پھر چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا تو سامنے والی کرسی خالی تھی۔ میں اپنے وجود کو پھر نادیدہ بنا چکا تھا۔ شام ہونے والی تھی اور میں جلد از جلد عراقی وزارتِ دفاع کے

دفتر پہنچ جانا چاہتا تھا تاکہ وزیرِ دفاع سے مل کر ان سوالوں کے جواب پا سکوں جن پر میرے آئندہ لائحہ عمل کا انحصار تھا۔

وزارتِ دفاع کے دفتر پہنچتے پہنچتے مجھے سوا چار بج گئے۔ دفتری اوقات ختم ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وزیرِ دفاع مجھے وہاں مل ہی جاتا مگر مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ وزیرِ دفاع کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھا۔ کسی بھی شخص کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن مجھے بھلا کون روک سکتا تھا۔ میں کسی کو نظر آتا تو کوئی روکتا بھی! میٹنگ ہی کے دوران میں میں نے اس کا ذہن پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ شخص جو ایئرپورٹ پر ملٹری انٹیلی جنس کے چیف سے ملا تھا اور جس کے بارے میں مجھے انتہائی تجسس تھا کہ وہ کون ہے ایک خطرناک روسی ایجنٹ میخائیل تھا۔ وہ روسی وزیرِ دفاع کا خط لے کر آیا تھا جو براہِ راست عراقی وزیرِ دفاع کے نام تھا۔ اس خط میں وہی کہانی رقم تھی کہ نقلی ڈاکٹر حارث کے میک اپ میں ایک خطرناک امریکی ایجنٹ ہے جس کے پاس کمیونسٹ دنیا کے اہم راز ہیں اور یہ کہ وہ امریکی ایجنٹ روسی حکومت کو مطلوب ہے۔ ثبوت کے طور پر میخائیل کے ساتھ اصل ڈاکٹر حارث موجود تھا۔

عراقی وزیرِ دفاع کے لیے روسی وزیرِ دفاع کا پیغام انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس پیغام میں امریکی ایجنٹ کی گرفتاری کے متعلق بہت زور دیا گیا تھا اور اس سلسلے میں میخائیل کے ساتھ ہر ممکن تعاون کے لیے کہا گیا تھا۔ پیغام میں لکھا گیا تھا کہ امریکی ایجنٹ کی گرفتاری کے سلسلے میں میخائیل کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے میخائیل کو ملٹری انٹیلی جنس کے چیف کے نام خط لکھ کر دے دیا تھا۔ میخائیل کے بارے میں عراقی وزیرِ دفاع کو زیادہ تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا تھا لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ میخائیل روسی حکومت کا کوئی انتہائی اہم اور خطرناک ایجنٹ ہی ہو سکتا ہے ورنہ وہ روسی وزیرِ دفاع کا خط لے کر نہ آتا۔ اسی سے اسے معاملے کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ یقیناً کمیونسٹ دنیا کے لیے وہ امریکی ایجنٹ خطرہ بن سکتا تھا اسی لیے روسی حکومت نے اعلیٰ سطح پر قدم اٹھایا تھا۔ میرے نقطۂ نظر سے عراقی وزیرِ دفاع کو میخائیل کے بارے میں صرف ایک ہی کام کی بات معلوم تھی، وہ یہ کہ میخائیل بغداد میں کہاں قیام پذیر تھا۔

میخائیل کا پتا معلوم ہونے کے بعد میں وہاں نہیں رکا۔ میخائیل کا قیام شاہراہِ سیموئل کی ایک سات منزلہ بلڈنگ میں تھا۔ اس بلڈنگ کا نام خان خلیل العزیز بلڈنگ تھا۔ اس بلڈنگ کی تیسری منزل پر میخائیل ایک مقامی شخص زیاد کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔

ڈاکٹر حارث کا ذہن پڑھنے کے بعد بھی یہ بات میرے علم میں نہ آ سکی تھی کہ تین ملاقاتوں کا عرصہ اس نے کہاں اور کس حال میں گزارا۔ اس بارے میں اسے واقعی کچھ خبر نہیں تھی۔ میخائیل جب عراقی وزیرِ دفاع سے ملا تھا تو ڈاکٹر حارث بھی اس کے ساتھ تھا لیکن ڈاکٹر حارث کا ذہن پڑھ کر میں یہ بات نہ جان سکا تھا گویا اس کے ذہن میں اس ملاقات کی بھی کوئی یاد باقی نہیں تھی۔ ڈاکٹر حارث کا میخائیل کے ساتھ ہونا اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ وہ روسی ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا مگر کب اور کیسے؟ یہ میخائیل سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

وزارتِ دفاع کے دفتر سے شاہراہِ سیموئل تک پہنچنے میں میں نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ روسی ایجنٹ میری گرفتاری کے منصوبے کی ناکامی کے بعد چوکنا نہ ہو جائے۔ اگر وہ واقعی ذہین تھا تو اسے اب تک وہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے تھی جس سے عراقی وزیرِ دفاع آگاہ تھا۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اب تک اپنے منصوبے کی ناکامی سے آگاہ ہو چکا ہوگا۔ میں اب خان خلیل العزیز بلڈنگ کی تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ زیاد کے بارے میں میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ کوئی مقامی روسی ایجنٹ ہوگا اور میرا یہ اندازہ بعد میں ٹھیک ہی ثابت ہوا۔

زیاد کے فلیٹ کا دروازہ بند تھا لیکن میرے لیے یہ معلوم کر لینا مشکل نہیں تھا کہ اندر کتنے افراد ہیں اور ان میں میخائیل ہے یا نہیں۔ دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کی طاقت ور لہریں باری باری ان افراد کے ذہنوں سے ٹکرائیں اور میں چونک اٹھا۔ ان میں سے کوئی میخائیل نہیں تھا۔ فلیٹ میں ایک تو وہ عراقی زیاد تھا جو میرے خیال میں مقامی روسی ایجنٹ تھا اور دوسرا شخص ایک روسی تھا، پاساشوف۔ وہاں میخائیل نہیں تھا لیکن وہ دونوں افراد اس کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔ میں نے سوچا خصوصاً وہ روسی پاساشوف یقیناً بہت کچھ جانتا ہوگا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن نے زیاد کے ذہن کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

کچھ دیر بعد ہی فلیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا زیاد ہی تھا جو دروازہ کھولے ہوئے کھڑا تھا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑبڑا رہا تھا: "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

مگر اس کا خیال غلط تھا۔ میں اس کے قریب ہی موجود تھا اور اب فلیٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ "میرا وہم ہوگا۔" زیاد خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا اور دوبارہ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے مڑا۔

وہ فلیٹ چار کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلا کمرہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جو خالی تھا۔ پاساشوف دائیں جانب والے کمرے میں تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں زیاد سے پہلے ہی اس کمرے میں پہنچ گیا۔ پاساشوف سامنے ہی مسہری کے قریب ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی دائیں جانب کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ہی دو بڑی بڑی اٹیچیاں اور ایک بستر بند رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی حالت دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بہت جلدی میں وہاں سے روانگی کی تیاریاں کی گئی تھیں۔

جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا، پاساشوف چونک اٹھا۔ اس نے کچھ سونگھنے والے انداز میں اپنی ناک کو سکوڑا۔ اسی وقت زیاد نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس سے پہلے کہ زیاد کچھ کہتا، پاساشوف نے اسے مخاطب کیا: "تم... تم کچھ محسوس کر رہے ہو زیاد؟" پاساشوف کے لہجے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا؟" زیاد آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"ایک مخصوص قسم کی خوشبو... جیسے... جیسے تازہ گلاب کھل گئے ہوں۔" پاساشوف نے وضاحت کی۔

"ہاں مجھے... مجھے بھی ایسی ہی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔" زیاد نے تصدیق کی پھر بولا: "اور جب میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا تھا تو اس وقت بھی مجھے یوں لگا تھا جیسے گلابوں کی خوشبو کا ایک جھونکا میرے قریب سے گزر گیا ہو لیکن... لیکن اس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ تمہارے چہرے سے تو خوف کا اظہار ہو رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے زیاد، پاساشوف کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ زیاد کی تصدیق کے بعد پاساشوف اور بھی خوف زدہ نظر آنے لگا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ میں سمجھ گیا کہ زیاد کو میری مخصوص خوشبو کی پہچان نہیں ورنہ اس کی حالت بھی پاساشوف سے مختلف نہ ہوتی لیکن پاساشوف یقیناً میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

میں نے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ پاساشوف کے بارے میں جان لوں کہ وہ کون ہے اور میخائیل سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس کے بعد ہی میں میخائیل کے متعلق اس کے ذہن کو ٹٹولتا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ

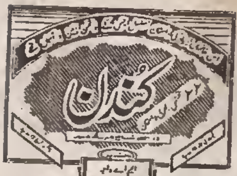

بھی میخائیل کا ساتھی ہوگا لیکن جب اندازوں کو یقین میں بدلنا ممکن تھا تو پھر میں صرف اندازوں پر کیوں اکتفا کرتا۔ پھر میں نے پاساشوف کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے ذہن نے کسی قدر مزاحمت کی مگر پھر ہتھیار ڈال دیے۔

وہ میخائیل کا ماتحت تھا اور بغداد میں اپنی آمد سے پہلے ہی اسے میخائیل نے یہاں بھیج دیا تھا تاکہ وہ میری نقل و حرکت اور سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے اور میخائیل کو میرے بارے میں رپورٹیں دیتا رہے۔ اس نے بغداد پہنچ کر میخائیل کو اطلاع دی تھی کہ میں بہت جلد شطرنج کے ایک بین الاقوامی کھلاڑی کی حیثیت سے ہندوستان کے ایک شہر کلکتہ روانہ ہونے والا ہوں۔

یہ جاننے کے بعد میں نے پاساشوف کے ذہن کو میخائیل کے سلسلے میں ٹٹولا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے اتنی کارآمد باتوں کا علم ہو جائے گا اور مجھے تقریباً اپنے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ پاساشوف کے ذریعے مجھے نہ صرف میخائیل کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا بلکہ اس منصوبے کا علم بھی ہو گیا جو بالآخر ناکامی سے دوچار ہو گیا تھا۔

میخائیل نے اپنے ملک روس کے لیے اب تک عظیم خدمات انجام دی تھیں۔ ناکامی تو جیسے اس کے مقدر میں تھی ہی نہیں۔ وہ روس کے انتہائی ذہین اور خطرناک ترین ایجنٹوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ روسی ایجنٹ مالیخوف ہی کا دستِ راست اور تربیت یافتہ تھا جو میرے ہاتھوں کچھ دن پہلے بصرہ سے بغداد آتے ہوئے ٹرین میں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ مالیخوف نے بھی میخائیل کی زیرِ نگرانی مختلف ممالک میں اپنے ملک کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اسی لیے اسے میری تلاش میں بغداد بھیجا گیا تھا۔ میخائیل اُس وقت روس میں موجود نہیں تھا۔ وہ ترکی کے ایک شہر انقرہ میں تھا۔ مالیخوف کے کام کرنے کا

انداز تقریباً میخائیل سے ملتا جلتا تھا۔ وہ بہت دور تک سوچتا تھا۔ مالیخوف خود تو جان سے گزر گیا تھا اور اس اجنبی دیار میں اس کی بے گور و کفن لاش درندوں کی ضیافت کا سبب بن گئی تھی لیکن اپنی موت سے پہلے وہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایک طے شدہ لائحہ عمل چھوڑ گیا تھا پھر اسی لائحہ عمل پر میخائیل آگے بڑھا تھا۔ میخائیل کو روسی حکومت نے فوری طور پر انقرہ سے واپس بلا لیا تھا۔ ماسکو پہنچنے کے بعد میخائیل کو دنیا کے اس خطرناک ترین شخص کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں جو اب تک قابو میں نہ آسکا تھا اور جس نے دنیا کی تین بڑی طاقتوں کے ذہین ترین ایجنٹوں کو انگلیوں پر نچا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ روسی حکومت کی نظر میں وہ خطرناک ترین شخص میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

میخائیل کو بتایا گیا کہ مالیخوف غالباً میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے کیونکہ ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود اس کی طرف سے کوئی نئی اطلاع نہیں ملی تھی جب کہ ہر تیسرے روز وہ رپورٹ بھیجا کرتا تھا۔ ماسکو ہی میں میخائیل اس شخص سے بھی ملا جو زیر علاج تھا۔ یہ ڈاکٹر حارث تھا جسے حال ہی میں مالیخوف نے بغداد سے بھیجا تھا۔ ڈاکٹر حارث اپنی اصل شخصیت بھول بیٹھا تھا۔ مالیخوف نے ڈاکٹر حارث کے بارے میں مکمل کوائف بھی روانہ کیے تھے۔ مالیخوف نے رپورٹ دی تھی کہ جب اسے یقین ہو گیا اس کی مطلوبہ شخصیت نے ڈاکٹر حارث کا روپ دھار رکھا ہے تو اس نے مقامی ایجنٹوں کی مدد سے اصل ڈاکٹر حارث کی تلاش شروع کر دی۔ لاکھوں کی آبادی کے شہر بغداد میں ڈاکٹر حارث کو تلاش کر لینا آسان کام نہیں تھا۔ مالیخوف اس شخصیت سے اچھی طرح واقف تھا جس کی تلاش میں وہ بغداد آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر حارث کو قتل نہیں کیا گیا ہو گا بلکہ اس کی شخصیت تبدیل کر دی گئی ہو گی۔ اسے علم تھا کہ بے سبب خون بہانا یا قتل و غارت گری کی توقع مجھ سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں صرف اپنے حریفوں کو بخشنے کا قائل نہیں تھا مگر بے گناہ افراد اب تک میرے ہاتھوں نہیں مارے گئے تھے۔

جس دن مالیخوف میرے تعاقب میں بغداد سے بصرہ روانہ ہوا اس سے ایک روز قبل ہی وہ اصل ڈاکٹر حارث کی تلاش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کا قیاس بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ ڈاکٹر حارث کی شخصیت بدل دی گئی تھی۔ مالیخوف نے اسے فوری طور پر روس بھیجنے کا بندوبست کیا تاکہ وہاں اس کا علاج ہو سکے اور اس کی اصل شخصیت دوبارہ بحال کر دی جائے۔

مالیخوف نے یہ سب کچھ ایک طویل منصوبے کے تحت کیا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب ڈاکٹر حارث کی یادداشت واپس آجائے گی تو اسے دوبارہ خفیہ طور پر بغداد بلا لیا جائے گا اور پھر حکومت عراق سے اعلیٰ سطح پر رابطہ قائم کر کے اسے یقین دلایا جائے گا کہ ڈاکٹر حارث کے میک اپ میں ایک خطرناک امریکی ایجنٹ ہے جس کے پاس کمیونسٹ دنیا کے کچھ اہم راز ہیں۔ اصل ڈاکٹر حارث کی موجودگی میں عراقی حکومت اس بات پر یقین کر لیتی اور میری گرفتاری میں ہر ممکن مدد دیتی۔ عراقی حکومت مجھے امریکی ایجنٹ تسلیم کر لیتی۔ عراقی حکومت سے یہ بھی کہا جاتا کہ مجھے روسی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عراقی حکومت روس کی یہ درخواست قبول کر لیتی اور یوں روس مجھے زیر دام لانے میں کامیاب ہو جاتا۔ مالیخوف کے اس منصوبے میں پچاس فی صد سے زیادہ کامیابی کے امکانات تھے۔

مجھ سے اس سلسلے میں یہ غلطی ہوئی تھی کہ میں نے مالیخوف کو ہلاک کرنے سے پہلے پوری طرح اس کا ذہن نہیں پڑھا تھا ورنہ اس کا منصوبہ میرے سامنے آجاتا۔ پھر شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

بغداد کے لیے روانہ ہونے سے پہلے میخائیل کو ڈاکٹر حارث کے صحت مند ہونے کا انتظار تھا۔ وہ اپنے دست راست مالیخوف کے منصوبے کو بہر حال کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر حارث کی مکمل صحت یابی سے قبل میخائیل کا بغداد جانا لاحاصل تھا۔ ایسی صورت میں اسے کوئی اور منصوبہ تشکیل دینا پڑتا۔ پھر وہ دن بھی آگیا جب میخائیل ایک ماہر روسی ڈاکٹر کے ہمراہ ڈاکٹر حارث کو لے کر بغداد روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر حارث اب صحت یاب ہو چکا تھا مگر ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ طبی نگرانی ختم کر دی جاتی۔ اسے رفتہ رفتہ اس کی زندگی کا ایک ایک واقعہ یاد دلایا جا چکا تھا۔ اب وہ مرحلہ باقی تھا جب ڈاکٹر حارث کا ذہن خود کارانہ طور پر اپنے ماضی کے متعلق جزئیات کی واضح صورت گری کر سکتا لیکن میخائیل کے پاس وقت کم رہ گیا تھا اسی دوران میں میخائیل پاساشوف کو بغداد بھیج چکا تھا کیونکہ پاساشوف ابتدا ہی سے اس کیس پر میخائیل کے ساتھ ساتھ کام کر رہا تھا اور اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر جب بغداد پہنچ کر پاساشوف نے میخائیل کو یہ اطلاع دی کہ میں ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں تو وہ فوراً ہی بغداد روانہ ہو گیا۔ اگر میں بغداد سے روانہ ہو جاتا تو مالیخوف کا بنایا ہوا منصوبہ تقریباً ناکام ہو جاتا۔ اس سلسلے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا

[illegible] تھا کہ پھر میں دوبارہ بغداد واپس آتا یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ [illegible] ہندوستان ہی سے کہیں غائب ہو جاتا۔ پھر مجھے از سر نو تلاش [illegible] پڑتا۔ مجھے حیرت تھی کہ میخائیل نے بالکل درست اندازے لگائے [illegible]۔ وہ یقیناً انتہائی ذہین شخص تھا۔ میخائیل کے خیال میں ہندوستان [illegible] مجھ پر عراق میں بہ آسانی ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا اور اس کا خیال [illegible] نہیں تھا۔

بغداد پہنچتے ہی میخائیل نے اپنے ماتحت پاساشوف سے رابطہ [illegible] کیا اور پھر خود بھی ڈاکٹر حارث اور روسی ڈاکٹر کے ساتھ زیاد کے [illegible] میں آگیا۔ یہی وہ دن تھا جب میں بوڑھے کرنل کے ساتھ ہندوستان [illegible] ہونے والا تھا اور پاساشوف اس سے واقف تھا۔ پھر میخائیل [illegible] انتہائی تیزی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ عراقی وزیر دفاع سے کے نام [illegible] وزیر دفاع کا خط لایا تھا۔ وہ عراقی وزیر دفاع سے ملا۔ پھر [illegible] انٹیلی جنس کے چیف سے ایئر پورٹ پر ملاقات کی۔ اس کے [illegible] وہ پاساشوف کو ایئر پورٹ پر چھوڑ کر چلا آیا۔ پاساشوف ہی کے [illegible] اسے ایک ایک لمحے کی اطلاع ملتی رہی۔ پھر جب اسے جہاز سے [illegible] غائب ہونے اور اپنا منصوبہ ناکام ہو جانے کی خبر ملی تو اس نے [illegible] شوف کو بھی ایئر پورٹ سے واپس بلا لیا۔ جہاز کو پرواز سے [illegible] ان میں جو واقعات پیش آئے تھے میخائیل کو ان کا علم بھی [illegible] کے ذریعے ہو چکا تھا۔ اس نے ان واقعات کی روشنی میں [illegible] اخذ کیا تھا وہ تقریباً درست ہی تھا۔ اس نے پاساشوف سے [illegible] تھا کہ اس کے منصوبے کی ناکامی کا سبب وہ امریکی ایجنٹ تھی جو [illegible] میں سفر کر رہی تھی اور جسے قتل کر دیا گیا تھا۔ میخائیل نے کہا [illegible] اسے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ امریکی ایجنٹ میرے ہی [illegible] ہلاک ہوئی ہو گی۔ وہ غصے میں اس امریکی ایجنٹ کو گالیاں بھی [illegible] تھا جس نے یقیناً اپنی کسی احمقانہ حرکت سے مجھے چوکنا کر [illegible] گا۔ وہ تو اپنی جان سے چلی ہی گئی مگر اس نے میخائیل کے منصوبے [illegible] ناکام بنا دیا تھا۔

اب اصل ڈاکٹر حارث کو اپنے پاس رکھنا فضول تھا اور یوں [illegible] وہ ذہنی طور پر قطعی صحت یاب ہو چکا تھا لیکن یہ ضروری تھا کہ [illegible] ذہن سے وہ عرصہ محو کر دیا جاتا جو اس نے روس میں گزارا [illegible] اس سلسلے میں میخائیل نے اسی روسی ڈاکٹر سے مدد لی جو روس سے [illegible] ساتھ آیا تھا۔ وہ ڈاکٹر ایک اچھا ہپناٹسٹ بھی تھا۔ ڈاکٹر [illegible] کے ذہن سے تین ماہ کی مدت کے تمام واقعات محو کر دیے گئے اور پھر اسے اس کے گھر ہی کے قریب شاہراہ سعدون پر چھوڑ دیا گیا۔ پھر میخائیل نے یہ اطلاع عراقی وزیر دفاع کو بھی دے دی کہ ڈاکٹر حارث کو اس کے گھر پہنچا دیا گیا ہے۔

میخائیل کے لیے یہ خبر کہ میں پرواز کے دوران ہی میں غائب ہو گیا کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ وہ میری تمام حیرت انگیز قوتوں سے آگاہ تھا۔ اس کے لیے اگر کوئی تشویش ناک بات تھی تو صرف یہ کہ میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہوں اور مجھے دوبارہ تلاش کرنا منفی کھیل نہیں۔ اس کے خیال میں یہ عین ممکن تھا کہ میں فوری طور پر کسی اور فلائٹ کے ذریعے دنیا کے متعدد ملکوں میں سے کسی بھی ملک کے لیے روانہ ہو چکا ہوں۔ میخائیل نے میری نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ میں ابھی بغداد ہی میں موجود رہوں اور اپنے خلاف کی جانے والی سازش کا سراغ لگا رہا ہوں۔ بغداد میں میرا وجود میخائیل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن وہ زندگی بھر خطرات ہی سے کھیلتا آیا تھا۔ زندگی اس کی نظروں میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اکثر اپنے ماتحتوں اور ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ اس کی موت کسی مشن ہی کے دوران میں واقع ہو گی اور ایسی موت کو وہ بخوشی گلے لگائے گا۔ بستر پر سسک سسک کر مرنا اسے منظور نہیں تھا۔

پاساشوف جانتا تھا کہ جب میخائیل انتہائی غور و فکر کے عالم میں ہوتا تھا تو اپنے سر کے بالوں کو بار بار چٹکی میں لے کر مروڑتا رہتا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جب وہ فلیٹ میں تھا تو اس کی حالت یہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پاساشوف سے کہا تھا کہ اگر میں بغداد ہی میں ہوا تو جلد یا بدیر اس تک پہنچ جاؤں گا اور میرے لیے معاملے کی تہ تک پہنچنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو گا۔ وہ جہاں قیام پذیر تھا، اس جگہ کا علم عراقی وزیر دفاع کو بھی تھا اور یہ بات اس کی نظر میں خطرناک تھی۔ اس کی جائے سکونت اسی صورت میں محفوظ کہی جا سکتی تھی جب وہ کسی کے بھی علم میں نہ ہوتی۔ اب اس جگہ مزید قیام میخائیل کے خیال میں خودکشی کے مترادف تھا۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد اس جگہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے فیصلے سے پاساشوف کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ پاساشوف سے ضروری سامان باندھنے کے لیے کہہ کر اور روسی ڈاکٹر کو ایئر پورٹ کے لیے روانہ کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔ میخائیل نے روسی ڈاکٹر سے کہا تھا کہ وہ فوراً ہی کسی فلائٹ سے ماسکو روانہ ہو جائے۔

میخائیل کی یہ عادت تھی کہ وہ خود جو چاہتا تھا اپنے ماتحتوں یا ماتحتیوں کو بتادیتا تھا لیکن کوئی کسی سلسلے میں پوچھ لیتا تو پھر وہ ہرگز کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اس کے ماتحت اچھی طرح جانتے تھے کہ میخائیل کے نزدیک جو بات بتانے کی ہوتی ہے وہ خود بتادیتا ہے، اس سے کچھ پوچھنا لاحاصل ثابت ہوتا ہے۔ عموماً وہ کچھ دریافت کرنے والوں کو ڈانٹ دیتا تھا۔ آج بھی وہ پاساشوف کو یہ بتا کر نہیں گیا تھا کہ کہاں جارہا ہے۔ پاساشوف نے خود ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میخائیل کسی اور جگہ کا بندوبست کرنے گیا ہے جہاں وہ خود کو اور پاساشوف کو محفوظ سمجھ سکتا تھا۔ بغداد پاساشوف کے لیے تو نیا تھا مگر میخائیل کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی دو بار آچکا تھا۔ کئی مقامی افراد سے اس کی دوستی بھی تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی پاساشوف نہیں جانتا تھا اور نہ ان کے بارے میں خود میخائیل نے کچھ بتایا تھا۔ بغداد میں جو دیگر مقامی ایجنٹ تھے ان سے بھی پاساشوف بے خبر تھا۔ ان میں سے پاساشوف صرف زیاد کو جانتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ زیاد دوسرے مقامی ایجنٹوں سے واقف ہوتا لیکن پاساشوف نے اس سلسلے میں زیاد سے کچھ پوچھنا لاحاصل ہی سمجھا تھا۔ ہاں پاساشوف کے علم میں یہ بات ضرور تھی کہ مقامی ایجنٹوں کے بارے میں میخائیل پوری طرح باخبر تھا۔

اب کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی جو میخائیل کے بارے میں پاساشوف جانتا ہو اور میں نہ جان چکا ہوں۔ میں نے اسی لیے اس کے ذہن سے اپنی توجہ ہٹالی۔ میں جس دوران میں پاساشوف کے ذہن کا مطالعہ کر رہا تھا، زیاد نے اسے کئی بار مخاطب کیا تھا اور اس کے خوف کا سبب دریافت کرنا چاہا تھا مگر میرے متعلق پاساشوف نے اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ زیاد نے غالباً محسوس کر لیا تھا کہ پاساشوف دانستہ اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ وہ اسی لیے کچھ کبیدہ خاطر سا نظر آرہا تھا۔

پاساشوف کے بعد میں، زیاد کے ذہن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے جلد ہی یہ علم ہو گیا کہ پاساشوف کی نسبت میخائیل، زیاد سے زیادہ بے تکلف تھا۔ آٹھ مقامی ایجنٹوں کے علاوہ زیاد، میخائیل کے ان دو مقامی دوستوں سے بھی آگاہ تھا جن سے میخائیل کے قریبی تعلقات تھے۔ انہی میں سے ایک امریکی نژاد لڑکی ماریا تھی۔ زیاد کے خیال میں میخائیل اس وقت اسی سے ملنے گیا تھا۔ میخائیل ہی کے ذریعے زیاد، ماریا سے متعارف ہوا تھا اور اسی کے توسط سے زیاد کو ماریا کے حالاتِ زندگی معلوم ہوئے تھے۔

امریکی نژاد عیسائی رقاصہ ماریا، شہر کے سب سے بڑے ہوٹل فرنانڈیس میں رقص کرتی تھی۔ اب سے دو سال پہلے جب میخائیل بغداد آیا تھا تو ماریا ایک معاہدے کے تحت ہوٹل فرنانڈیس سے منسلک تھی۔ ہر سال ہوٹل کی انتظامیہ کنٹریکٹ کی تجدید کر دیتی تھی۔ اس زمانے میں انتظامیہ سے ماریا کی یہ بات چیت چل رہی تھی کہ اسے مستقل طور پر باقاعدہ ملازمت میں لے لیا جائے۔ زیاد کے علم میں تھا کہ ماریا کو مستقل ملازمت مل گئی تھی اور وہ اب بھی بغداد ہی میں تھی۔ یوں تو ماریا امریکی تھی لیکن اس کی وفاداریاں کمیونسٹ دنیا سے تھیں۔ اس کا سبب کزاکوو تھا جو بلغاریہ کا باشندہ تھا۔ کزاکوو شطرنج کی دنیا میں ایک بین الاقوامی کھلاڑی کی حیثیت سے معروف شخصیت رکھتا تھا۔ کزاکوو سے ماریا کی ملاقات فرانس میں ہوئی تھی جہاں وہ شطرنج کے ایک بین الاقوامی مقابلے میں شریک ہوا تھا۔ ماریا ان دنوں ایک [illegible] وفد کے ساتھ فرانس گئی ہوئی تھی، پھر وقفے وقفے سے کئی اور ملکوں میں ان دونوں کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کزاکوو، ماریا کے قریب چلا گیا، اتنے قریب کہ اس کے خیالات و نظریات ماریا کے ذہن میں پھیلتے چلے گئے۔

ماریا کا مستقل قیام کاظمیہ میں تھا۔ ماریا اپنے دو ملازموں کے ساتھ وہاں ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتی تھی جو اس نے دو سال [illegible] میخائیل کے سامنے ہی خریدی تھی۔ اس سے پہلے اس کا قیام منصور میں تھا جہاں وہ کرائے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ یہ گھر ماریا کو پسند نہیں تھا۔ منصور میں اس کے قیام کا سبب یہ تھا کہ وہاں سے ہوٹل فرنانڈیس قریب تھا۔ کاظمیہ میں حضرت امام کاظمؑ کے روضے سے چند فرلانگ پر بائیں جانب صاف ستھرا [illegible] وہیں ماریا کی کوٹھی تھی۔

یہ جاننے کے باوجود بھی کہ ماریا اپنے بلغارین محبوب کزاکوو کو بے حد چاہتی ہے، میخائیل اسے پسند کرتا تھا اور اس پسند کا سبب ماریا کا حسین سراپا تھا۔ میخائیل کو روسی ہونے کے باوجود ہمیشہ امریکی لڑکیاں ہی پسند آتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ اب اس کے تعلقات صرف امریکی لڑکیوں ہی سے رہے تھے۔ ماسکو میں میخائیل نے زیاد کو بغداد آتے ہی ایک واقعہ سنایا تھا [illegible] میں وہ اپنی اسی منفرد حسن پرستی کے سبب موت سے ہمکنار ہوتے بچا تھا۔ یہ زیادہ دن کی نہیں، امسال ہی کی بات تھی جب وہ

[illegible] تھا۔ میخائیل جس امریکی لڑکی کے دامِ زلف کا اسیر ہو گیا تھا، وہ لڑکی، امریکی ایجنٹ ثابت ہوئی تھی۔ اگر میخائیل بروقت چونکنا نہ ہوجاتا تو اس کا بچنا ناممکن ہی تھا۔ وہ لڑکی میخائیل کو انقرہ ریلوے اسٹیشن کے قریب شہر کے جدید ترین علاقے الوس کے ایک گیا (شاپنگ سنٹر) میں ملی تھی۔ میخائیل اس بات سے بے خبر ہی رہا تھا کہ وہ امریکی لڑکی جان بوجھ کر اس سے ٹکرائی تھی۔ غالباً امریکی ایجنٹوں کو میخائیل کی اس کمزوری کا علم تھا۔ اس امریکی ایجنٹ کا نام جوزفین تھا اور وہ شہر کے ایک اچھے علاقے کوا کلی دیرے میں رہتی تھی۔ میخائیل کا قیام چنکایا میں تھا اور یہ بھی شہر کے اچھے علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ جوزفین نے خود کو پیشہ ور ظاہر کیا تھا۔ سودا ایک سو پچاس لیرا میں طے ہوا تھا جو بہت سستا تھا۔ میخائیل نے سودا طے ہوجانے کے بعد جوزفین کو چنکایا میں اپنی قیام گاہ لے جانا چاہا تھا مگر جوزفین کوا کلی دیرے ہی جانے پر بضد تھی۔ پہلی بار میخائیل اسی وقت چونکا تھا۔ اگر جوزفین پیشہ ور ہی تھی تو اسے چنکایا چلنے پر کیوں اعتراض تھا۔ میخائیل نے اس ضد کا سبب پوچھا تھا تو جوزفین نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ اس نے اپنی ضد کا سبب یہ بتایا تھا کہ کچھ لوگ اپنے گھر لے جا کر دھوکا کرتے ہیں اور سودے کی خلاف ورزی کرتے ہیں جیسے اپنے دوستوں کو بھی مدعو کر لیتے ہیں پھر ستم یہ کہ معاوضہ بھی ایسی صورت میں زیادہ ادا نہیں کرتے۔ لڑکی میخائیل کو بہت زیادہ ہی پسند آگئی تھی اس لیے وہ اس کے ہمراہ کوا کلی دیرے جانے پر راضی ہو گیا تھا۔

کوا کلی دیرے پہنچتے ہی میخائیل کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ میخائیل کو یاد آگیا تھا کہ یہ وہی عمارت تھی جو پہلے ایک امریکی ایجنٹ کے تصرف میں تھی لیکن وہ امریکی ایجنٹ ایک مرد تھا اور یہ بات چھ ماہ قبل کی تھی۔ میخائیل نے اس امریکی ایجنٹ کے بارے میں جوزفین سے سوالات کیے تھے جو پہلے اس عمارت میں رہتا تھا۔ جوزفین اسے تسلی بخش جواب نہ دے سکی تھی اور تیزی سے عمارت کی طرف بڑھ گئی تھی۔ غالباً اسے یقین تھا کہ میخائیل اس کے پیچھے آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اگر میخائیل پلٹ کر اور تیزی کے ساتھ دوبارہ اس ٹیکسی کا دروازہ کھول کر نہ بیٹھ گیا ہوتا جو اسٹارٹ ہو چکی تھی تو عمارت کی دوسری منزل سے چلائی جانے والی گولی اس کا کام تمام کر چکی ہوتی پھر میخائیل کو دوسرے ہی دن انقرہ سے ماسکو بلا لیا گیا تھا ورنہ وہ جوزفین سے نمٹ ضرور لیتا۔ میخائیل کو انقرہ چھوڑتے ہوئے افسوس تو بہت ہوا تھا مگر مجبوری تھی۔ اسے احکام کے مطابق فوری طور پر ماسکو پہنچنا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ جلد ہی دوبارہ ماسکو سے انقرہ پہنچے گا اور جوزفین سے انتقام لے سکے گا مگر ماسکو پہنچ کر جب اسے حالات کا علم ہوا تھا تو یہ امید دم توڑ گئی تھی۔ پھر اسے بغداد آنا پڑا تھا۔

زیاد کا ذہن پڑھ کر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میخائیل یقیناً اس وقت ماریا کے پاس ہی گیا ہوگا تاکہ اس کے قریب رہ کر آئندہ اپنے جذبات کی تسکین کا موقع بھی نکال سکے اور اسے ایک ایسی جگہ پناہ بھی مل جائے جس کے بارے میں عراقی انتظامیہ قطعی لاعلم تھی۔ مقامی ایجنٹوں سے زیادہ محفوظ ماریا کی کوٹھی ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے سوچا میخائیل اپنے ماتحت پاساشوف کو اور اپنا سامان لینے وہاں ضرور آئے گا۔ تو پھر اس کی بجائے کہ اس کی تلاش میں کاظمیہ کا رخ کیا جاتا، یہیں اس کا انتظار مناسب تھا۔

پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جب تک میخائیل لوٹے کم از کم پاساشوف کو تو راستے سے ہٹا ہی دیا جائے۔ زیاد کے بارے میں میں نے یہ فیصلہ اس لیے نہیں کیا کہ نہ وہ میرا دشمن تھا نہ میرے بارے میں کچھ جانتا تھا مگر پاساشوف بہرحال میرے دشمنوں میں سے تھا۔ بالفرض وقتی طور پر میخائیل ہاتھ نہ بھی آتا تو پاساشوف کی موت اس کے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہوتی۔ اس کا ایک بہترین ماتحت ختم ہو جاتا اور میرا ایک دشمن دنیا سے کم ہو جاتا۔ یہ فیصلہ کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے دوبارہ پاساشوف کے ذہن کو اپنا مطیع بھی بنا لیا اور اس کی موت کا طریقہ بھی سوچ لیا۔ اس وقت میری نگاہ اس کھڑکی کی طرف تھی جس کے قریب پاساشوف ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ وہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ نیچے ایک پتلی سی پختہ گلی تھی اور یہ عمارت کی تیسری منزل تھی۔ میرے خیال میں تیسری منزل کی کھڑکی سے سر کے بل کودنے کے بعد پاساشوف کا زندہ بچ جانا ناممکن تھا۔ پاساشوف کو زندہ چھوڑ دینا اپنے ہی لیے خطرات مول لینا تھا۔

میں پیچھے ہٹا اور پاساشوف کے ذہن کو حکم دیا۔ اسی کمرے کی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دو سر کے بل۔ نیچے گلی میں جال تنا ہوا ہے تم زندہ بچ جاؤ گے۔ اس کھڑکی سے نیچے کودنے کے سوا زندگی بچنے کی اور کوئی صورت نہیں کیونکہ اس عمارت میں آگ لگ چکی ہے۔ اٹھو! جلدی کرو!

معاً پاساشوف کرسی سے اٹھتا ہوا چیخا۔ "آگ... آگ!" اور اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی کی طرف تیزی سے جھپٹا پھر اس سے پہلے کہ

زیاد کو اس کے ارادے کا علم ہوتا اور وہ اسے روک سکتا، پاساشوف نے میرے حکم کے مطابق کھڑکی پر چڑھ کر سر کے بل نیچے چھلانگ لگا دی۔

پاساشوف کی چیخ اتنی بھیانک تھی کہ پھر میں اس کمرے میں نہ رُک سکا۔ میرے ساتھ ہی زیاد کمرے سے بھاگتا ہوا نکلا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ نیچے گلی ہی میں جا رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر نشست گاہ سے گزرتا ہوا بائیں جانب والے کمرے میں گھس گیا۔ اس کمرے میں بھی ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی جو عمارت کی بیرونی سمت کھلتی تھی۔ میں اس کھڑکی سے سڑک کا نظارہ کرنے لگا۔ ابھی تک میری سماعت میں پاساشوف کی آخری چیخ گونج رہی تھی۔ کھڑکی کے قریب ہی ایک دروازہ تھا جو گیلری میں کھلتا تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر وہ دروازہ کھولنے کے بعد گیلری میں آ گیا۔ تازہ ہوا نے میرے حواس پر خوشگوار اثر ڈالا اور میں ایک بار پھر نیچے کا نظارہ کرنے لگا۔ میں میخائیل کے آنے تک وہاں رُکنا چاہتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ نیچے سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت خاصی تھی۔

معاً میں نے ایک ٹیکسی کو عمارت کے نیچے رکتے دیکھا۔ ٹیکسی سے ایک دراز قد شخص اتر کر صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی وہیں کھڑی رہی۔ غالباً دراز قد شخص اسی میں واپس جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت مقامی ایجنٹ زیاد عمارت سے نکلا۔ دراز قد شخص زیاد کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر اس کی طرف لپکا۔ یقیناً وہ دراز قد شخص زیاد کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ان دونوں پر اپنی نگاہ جما دی۔ اس کے ساتھ میرے وجود میں پوشیدہ ایک اور حیرت انگیز قوت متحرک ہو گئی جو میرے خیال کی تابع تھی۔ اب میں ان دونوں کو اس قدر واضح اور قریب دیکھ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ہوں۔ اس کے فوراً بعد ہی میری سماعت نے بھی فاصلوں کی طنابیں کھینچ لیں۔ اب میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی صاف طور پر سن سکتا تھا۔

دراز قد شخص لپک کر اب زیاد کے قریب آ چکا تھا اور اس سے مخاطب تھا: "کیا ہوا؟ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"وہ... وہ... جناب... پاسا... پاساشوف..." دراز قد شخص کی بات کے جواب میں زیاد ہکلا کر رہ گیا۔

"کیا ہوا پاساشوف کو؟ جلدی بتاؤ۔" دراز قد شخص نے بدحواس ہو کر زیاد کو تقریباً جھنجوڑ ڈالا۔

"وہ... وہ شاید پاگل... پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اچانک چیختا ہوا کمرے کی پچھلی کھڑکی کی طرف بھاگا اور... اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا یا پکڑتا، وہ... وہ کھڑکی پر چڑھا اور... اور اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس طرف!... وہ تیسری منزل سے سر کے بل گرا تھا۔ وہ شاید... شاید ہی زندہ بچا ہو۔ میں پچھلی گلی میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔"

میں نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بالکل اس طرح سنی تھی جیسے وہ میرے قریب کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ بھی میری عجیب اور حیرت انگیز قوتوں کا کمال تھا۔ میں تقریباً ایک میل تک ہر شے کو جب چاہتا بالکل اسی طرح دیکھ سکتا تھا جیسے وہ شے میری نگاہوں کے سامنے ہو۔ اسی طرح میں اپنی سماعت کو بھی انتہائی فعال بنا سکتا تھا۔ میں اپنی سماعت کا دائرہ بھی تقریباً ایک میل تک پھیلا سکتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے بعد مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دراز قد شخص میخائیل کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا، مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتا، وہ دراز قد شخص تیزی سے پلٹا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

وہ یوں نکل جاتا، یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ اس کی ٹیکسی کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی میں تیسری منزل کی گیلری سے چھلانگ لگا چکا تھا، لیکن اس کے باوجود مجھے دیر ہو گئی۔ جب تک میرا نادیدہ وجود نیچے پہنچا، ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میں زقندیں بھرتا ہوا ٹیکسی کے پیچھے بھاگا۔ وہ شاہراہِ رشید کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ فاصلے ہی پر چوراہا تھا۔ اس کی ٹیکسی چوراہے سے گزر گئی اور اسی وقت سُرخ سگنل روشن ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے دوسری جانب سے آنے والا ٹریفک کا ہجوم میری راہ میں حائل ہو گیا۔ اب بھاگنا بے سود ہی تھا۔ میرے قدم رُک گئے۔ شاید ابھی میخائیل کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے ورنہ وہ یوں میری نگاہ میں آ جانے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو پاتا۔

میں نے اپنے چہرے سے ابھی ڈاکٹر حارث کا میک اپ ختم نہیں کیا تھا کیونکہ ابھی مجھے بصرہ بھی جانا تھا۔ صالحہ سے آخری بار ملنے، مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی ہر بات کا سراغ لگا لوں گا، نہ صرف یہ بلکہ اپنے دشمنوں تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ میں نے اسی لیے ڈاکٹر حارث سے ایک ہفتے کے بعد بصرہ جانے کا وعدہ کیا تھا۔

میخائیل واقعی ذہین ایجنٹ ثابت ہوا تھا۔ وہ انتہائی سرعت سے نتائج اخذ کر لیتا تھا۔ اس نے زیاد سے پاساشوف کی حیرت انگیز

موت کی خبر سن کر یقیناً یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ میں اس وقت اسی عمارت میں موجود ہوں اور پاساشوف کو ختم کرنے کے بعد اب اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ اسی لیے تیزی سے پلٹ کر دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا۔

میں اس وقت سوچ رہا تھا کاش میخائیل میرا دشمن نہ ہوتا اور میں اسے قتل کر دینے پر مجبور نہ ہوتا۔ میں ذہین افراد کو پسند کرتا تھا لیکن ذہانت کو میں نے دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ وہ ذہانت جو خیر محض ہو اور وہ جو مجسم شر ہو۔ میخائیل کا شمار میرے خیال میں ان لوگوں میں ہوتا تھا جس کی ذہانت مجسم شر ہوتی ہے۔ ایسے افراد کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ ایسے افراد کے وجود کو میں انسانیت کے لیے خطرہ تصور کرتا تھا اور اسی لیے میں انھیں زندہ نہیں چھوڑتا تھا۔

ایک بات ابھی تک میرے لیے الجھن کا سبب بنی رہی تھی۔ میں انتہائی کوشش اور غور و فکر کے باوجود یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ جب بھی اپنے دشمنوں کو ختم کر کے یا دھوکا دے کر فرار ہونے کے بعد بس چند ہی دن سکون سے گزار پاتا تھا میرے دشمن مجھے بہرحال ڈھونڈ نکالتے تھے۔ مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ میں دنیا کے جس گوشے میں بھی ہوتا مجھے تلاش کر لیا جاتا۔ اب تک یہی ہوتا آیا تھا اور یہی میری پریشانی کا اصل سبب تھا۔ میں دنیا کی بھیڑ میں خود کو گم کر لینے کے باوجود ان کی نظروں میں آ جاتا تھا۔

میں نے کئی بار اپنے مختلف دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے ان کے ذہن پڑھ کر اس سوال کا جواب جاننا چاہا تھا کہ وہ کس طرح مجھ تک پہنچ گئے؟ لیکن مجھے ہر بار ناکامی ہوئی تھی۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ انھیں اپنے اوپر والوں سے یہ اطلاع ملتی تھی، اوپر والوں تک پہنچنا میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے میں جان بوجھ کر موت کے منہ میں چھلانگ لگانا چاہتا ہوں۔ چین، امریکا اور روس، اب تک میں نے ان ممالک کا رخ نہیں کیا تھا۔ تینوں ملکوں کے ایجنٹوں کو اپنے اپنے ملک ہی کے اعلیٰ حکام کی طرف سے یہ اطلاع ملتی تھی کہ انھیں اب میری تلاش میں دنیا کے کس ملک اور کس شہر کا رخ کرنا چاہیے۔

اپنی ایک کمزوری سے تو میں واقف تھا جو ہمیشہ اور ہر جگہ میری موجودگی کا راز کھول دیتی تھی، وہی تازہ کھلتے ہوئے گلابوں کی خوشبو! یہ خوشبو اس وقت بھی محسوس کی جا سکتی تھی جب میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ یہ خوشبو ہر وقت میرے جسم سے اٹھتی رہتی تھی لیکن اس خوشبو کو قریب ہی سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میں اسی لیے حیران ہوتا تھا کہ آخر میرے دشمنوں کو کس طرح میری کہیں بھی [illegible] کا علم ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی ایک ہی دشمن ملک سے مخصوص نہیں [illegible] بلکہ تینوں ملکوں کے ایجنٹ ہر اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں میں [illegible]

میخائیل کے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد میں نے فیصلہ [illegible] کیا تھا کہ اسے ختم کیے بغیر بغداد سے نہیں جاؤں گا۔ میخائیل کے [illegible] اور پاساشوف کی موت کا مطلب یہی تھا کہ میرے دشمن بغداد میں [illegible] موجودگی سے واقف ہو چکے تھے۔ لہٰذا اب میرا ارادہ [illegible] کے شہر دہلی جانے کا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں اپنی ماں کا سراغ لگانا [illegible] تھا۔ یہ عجیب محرومی تھی کہ میری ماں زندہ تھی اور میں اس سے نہیں [illegible] مل سکتا تھا۔ یہی محرومی کیا، مجھے تو اپنا اصل نام تک معلوم نہیں تھا۔ اکثر سوچتا کہ نہ جانے کیوں پروفیسر مجھے ابوالہول کہتا تھا جو ظاہر [illegible] کہ میرا اصل نام نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے دشمن بھی مجھے اسی نام [illegible] جانتے تھے لیکن مجھے یہ نام پسند نہیں تھا۔ میں کبھی مصر بھی نہیں [illegible] تھا مگر قدیم و جدید مصری تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے [illegible] امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ ممکن ہے مصر سے میرے ماضی کا [illegible] کوئی تعلق ہو لیکن اس تعلق کی نوعیت کیا ہو سکتی تھی، میں اس سے بے خبر تھا۔ اگر پروفیسر مجھے ابوالہول کہتا تھا تو اس کا سبب اور بھی ہو سکتا تھا۔

فی الحال میخائیل میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور [illegible] سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ماریا سے دوبارہ رابطہ [illegible] کرتا یا اسے اپنی نئی قیام گاہ کے متعلق بتاتا۔ وہ اب ان مقامات [illegible] سے کسی کی طرف بھی رخ نہ کرتا جو ماریا کے علم میں تھے۔ اگر اس [illegible] پہلے ماریا کے پاس پہنچنے کے بارے میں سوچا بھی ہوگا تو اب وہ [illegible] ارادہ تبدیل کر چکا ہوگا۔ میخائیل کو بغداد میں تلاش کرنا بہرحال [illegible] طلب کام تھا۔ یہ کام میں بصرہ سے لوٹ کر بھی انجام دے سکتا تھا [illegible] یوں بھی صالحہ آج مجھے کچھ زیادہ ہی یاد آ رہی تھی۔ میں جو دنیا کی [illegible] طاقتوں کے بس میں نہیں آ رہا تھا، اس بھولی بھالی اور بے [illegible] کی یاد کے سامنے کتنا بے بس تھا۔

پھر میں وہاں سے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تاکہ اسی [illegible] بصرہ پہنچ جاؤں۔ رہ رہ کر میرے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر [illegible] صالحہ کو نہ بھلا سکا تو کیا ہوگا؟ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے صالحہ [illegible] ذہن میں دوبارہ ڈاکٹر حارث کی محبت کے نقوش ابھار دیے تو کیا [illegible] صورت پیش آئے گی؟ کیا میں ایک بار پھر صالحہ کی والہانہ محبت [illegible]

باوجود خود پر قابو رکھ سکوں گا؟ میں انھی خیالات میں کھویا رہا اور نہ جانے کب ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ اب میرا وجود نادیدہ نہیں تھا۔ ایئرپورٹ کے لیے ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہی میں اپنے وجود کو عام انسانوں جیسا بنا چکا تھا۔ اب مجھے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں عام انسانوں سے قطعی مختلف ہوں اور یہ کہ میرے وجود میں اتنی حیرت انگیز قوتیں پوشیدہ ہیں۔ میں صالحہ کے خیال میں اس قدر گم تھا کہ اپنے اردگرد سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ اگر میں چوکنا ہوتا تو اس شخص کو ضرور دیکھ لیتا جو ٹیکسی سے اترتے ہی میرے ساتھ ساتھ ہو لیا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ میں تو چونکا اس وقت جب اس شخص نے مجھے ڈاکٹر حارث کہہ کر پکارا۔ میں اس وقت کاؤنٹر سے بصرہ کا ٹکٹ لے کر پلٹ رہا تھا۔ میں نے چونک کر اس اجنبی پستہ قد کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی اور اس کا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا ہوا تھا۔

میں نے سوچا ممکن ہے یہ پستہ قد شخص ڈاکٹر حارث کا کوئی شناسا ہو۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں چاہتا تو اس اجنبی کا ذہن پڑھ کر اپنے خیال کی تصدیق کر سکتا تھا لیکن ہر وقت اور ہر موقع پر مجھے اپنی حیرت انگیز قوتوں کا استعمال مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں خاص خاص مواقع پر ہی ان قوتوں کو استعمال کرتا تھا جب انھیں استعمال کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ مجھے اس پستہ قد شخص سے اس قدر پھرتی کی توقع نہیں تھی جس کا اس نے مظاہرہ کیا۔ اس نے نہ جانے کس طرح انتہائی تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں آہنی زیور پہنا دیا اور اسی کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال کر میری طرف تان لیا۔ "خود کو حراست میں سمجھو!" پستہ قد شخص غرایا۔ وہ غالباً اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے مقابل کون ہے ورنہ یہ ہمت نہ کرتا۔

اسی وقت نہ جانے کہاں سے کچھ افراد نے آ کر مجھے اور اس پستہ قد شخص کو گھیر لیا۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ بھی اسی پستہ قد شخص کے ساتھی تھے۔ میں چاہتا تو اسی وقت ان لوگوں کے نرغے سے نکل جاتا مگر اس سے پہلے ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہیں اور انھوں نے مجھے کیوں گرفتار کیا ہے؟ یہی سبب تھا کہ جب مجھے ایک جانب چلنے کا حکم دیا گیا تو میں نے بلا چون و چرا تعمیل کی۔ ایسے موقع پر میں ہمیشہ فرماں برداری ہی کا ثبوت دیا کرتا تھا۔

ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر ایک وین کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک نے اس وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بقیہ افراد پستہ قد شخص کے ساتھ وین کے پچھلے حصے میں آ بیٹھے۔ پھر فوراً ہی وین اسٹارٹ ہو گئی۔ یہ وقت میرے لیے کافی تھا۔ میں اس دوران میں اس پستہ قد شخص کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر وہ ہاتھ ایک جھٹکے سے اٹھایا جو آہنی گرفت میں تھا۔ "سکون سے بیٹھے رہو!" پستہ قد شخص نے ریوالور کی نال میرے پہلو میں گاڑ دی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

آہنی ہتھکڑی کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اور میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وین بدستور چل رہی تھی اور اس کا دروازہ بھی بند تھا۔ پستہ قد شخص کے تینوں ساتھیوں نے بھی یہ ناقابل یقین منظر دیکھا تھا اور وہ جیسے پتھر کے مجسمے بن گئے تھے۔ ان کا وہ ساتھی جو وین ڈرائیو کر رہا تھا، اس بات سے لاعلم تھا کہ وین کے پچھلے حصے میں کیا واقعہ رونما ہو چکا ہے۔

پھر یکایک ہی وین رک گئی مگر وین یوں ہی نہیں رکی تھی، اس میں میری مرضی شامل تھی۔ وین کے ڈرائیور نے میرے حکم کی تعمیل میں ایسا کیا تھا۔ وین رکتے ہی جیسے ان سب کو ہوش آ گیا۔

"وہ... وہ کوئی بدروح... کیا کوئی بدروح تھی؟" ان میں سے ایک کانپتے ہوئے بولا۔

"مگر... یہ... یہ وین کیوں رک گئی؟" دوسرا ہکلایا۔ پھر وہ سبھی وین سے اتر آئے۔ ان کا وہ ساتھی جو وین کو ڈرائیو کر رہا تھا، پہلے ہی اتر چکا تھا۔ انھیں اس سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ انھوں نے وین کا بونٹ اٹھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ ان کے خیال میں وین کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔

"کمال ہے۔ انجن تو بالکل ٹھیک ہے۔" بونٹ کے نیچے جھکا ہوا ان کا ساتھی سیدھا کھڑا ہو کر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ پھر اس کی نظر اپنے ساتھیوں پر پڑی اور ساتھ ہی اس نے وین کے اندر نگاہ ڈالی۔ میں اسے کہیں نظر نہ آیا تو اس نے حیرت سے میرے بارے میں پوچھا۔

اسے اپنے ساتھیوں سے جو جواب ملا، وہ یقیناً اس کے لیے مزید حیرت کا سبب بنا ہوگا۔

"لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" وہ بے یقینی سے بولا۔ "اور پھر چیف... کیا وہ ہمارے بیان پر یقین کرے گا؟"

"وہ یقین کرے یا نہ کرے لیکن حقیقت کو تو نہیں جھٹلایا جا

سکتا۔" پستہ قد شخص بولا۔ "میں نے ہی نہیں بلکہ تین افراد نے بھی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم چیف سے اس پُراسرار واقعے کا ذکر ہی نہ کریں۔" ان میں سے ایک شخص نے پستہ قد شخص کو مشورہ دیا۔ "ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں ڈاکٹر حارث ملا ہی نہیں۔"

"لیکن میں نے تو خود اسے بصرہ کے لیے اس فلائٹ کا ٹکٹ لیتے ہوئے دیکھا تھا جو اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد روانہ ہونے والی ہے۔" پستہ قد شخص نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ چیف کے لیے یہ اطلاع اہمیت کی حامل ہو۔"

"سوچ لو خواہ مخواہ جواب طلبی ہو جائے گی سب کی۔" وہی شخص پھر بولا جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ چیف کو کچھ نہ بتایا جائے۔ وہ مزید بولا۔ "وہ یقیناً کوئی بدروح تھی۔"

"احمق ہو تم!" پستہ قد شخص کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "بدروحیں جہازوں میں سفر نہیں کیا کرتیں۔"

"پھر تمھی بتاؤ کہ وہ کہاں غائب ہو گیا؟ پھر یہ کہ ہتھکڑی کے دو ٹکڑے کیسے ہو گئے؟" تیسرے ساتھی نے پہلی بار مداخلت کی۔

پستہ قد شخص کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ میں اس وقت تک صرف اس لیے وہاں رکا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے اگلے قدم کے بارے میں جان سکوں۔ پستہ قد شخص کا ذہن اس پر آمادہ نہیں تھا کہ چیف کو اس واقعے سے بے خبر رکھا جائے۔ کچھ سوچ کر اس نے اپنی جیب سے چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالا اور چیف سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ ملٹری انٹیلی جینس کے ان افراد کو چیف نے نہ جانے کیا سوچ کر ایئر پورٹ پر متعین کر دیا تھا۔ چیف نے انھیں حکم دیا تھا کہ اگر وہ ڈاکٹر حارث کو ایئر پورٹ پر دیکھیں تو فوراً گرفتار کر لیں۔ پستہ قد شخص کو ان سب کا نگراں مقرر کیا گیا تھا کیونکہ وہ ان سب میں ذہین اور پھرتیلا تھا۔

جس وقت ویگن رکی تھی اور دروازہ کھولا گیا تھا تو میں بھی انھی لوگوں کے ساتھ نیچے اتر گیا تھا۔ ویگن کے انجن میں واقعی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات تو خود میں نے ڈرائیور کے ذہن میں ڈالی تھی تاکہ وہ ویگن کے انجن کو چیک کرنے کے لیے اسے روکے اور میں بھی دوسرے افراد کے ساتھ ویگن سے اتر جاؤں۔ ویگن ایئر پورٹ سے زیادہ دور نہیں گئی تھی اس لیے میں پیدل ہی ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ فاصلے ہی پر موڑ تھا۔ میں مڑتے ہی نمودار ہو گیا۔ اب میں جلد از جلد دوبارہ ایئر پورٹ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر پیدل چلنے کی بجائے میں نے ٹیکسی لے لی۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ ملٹری انٹیلی جینس والوں کو علم ہو چکا ہے کہ میں بصرہ جانے والی فلائٹ سے سفر کرنے والا ہوں، میں نے سفر ملتوی نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا کہ ملٹری انٹیلی جینس کے چیف کو یہ بات معلوم ہو بھی گئی تو گزشتہ تجربات کی روشنی میں وہ پچھلی حماقت کو دہرانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

میں جب ایئر پورٹ پہنچا تو جہاز کی پرواز میں صرف بیس منٹ رہ گئے تھے۔ وہ مسافر جو اس فلائٹ سے سفر کرنے والے تھے انھیں جہاز تک پہنچانے کے لیے بسوں میں سوار کیا جا رہا تھا لیکن اسی وقت ایک اعلان کیا گیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر کیا جانے والا اعلان یہ تھا: "فلائٹ نمبر سولہ سے بصرہ اور دوسرے شہروں کے لیے پرواز کرنے والے مسافروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ فلائٹ اب مقررہ وقت پر پرواز نہیں کر سکے گی۔ ہم اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ بہت جلد اس فلائٹ کے بارے میں ہم دوسرا اعلان کریں گے کہ یہ فلائٹ کتنی تاخیر سے روانہ ہو سکے گی۔ اعلان ختم ہوا۔"

یہ اعلان سن کر میں ٹھٹک گیا۔ یقیناً ملٹری انٹیلی جینس والوں نے اپنے چیف کو میری بصرہ روانگی سے مطلع کر دیا تھا۔ موجودہ اعلان اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا تھا۔ چیف نے لامحالہ اپنے اختیارات بروئے کار لا کر اس فلائٹ کو رکوا دیا تھا جس سے میں سفر کرنے والا تھا۔ میں اب بلا سبب الجھن میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لوگ جو اقدامات بھی کر رہے تھے، بہرحال اپنے فرض کی بجا آوری کے لیے کر رہے تھے۔ عراقی حکام سے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ میں انھیں اپنے دشمنوں کی صف میں شامل سمجھتا تھا۔ اصل دشمن تو وہ تھے جن کے اشارے پر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں بڑبڑایا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے بلکہ یہی زیادہ بہتر ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

کچھ دیر بعد ہی میں ٹیکسی میں بیٹھا ہوا شاہراہِ سعدون کی طرف جا رہا تھا۔ جب میری ٹیکسی منصور سے نکل کر یرموک کی طرف بڑھ رہی تھی تو میں نے کئی ملٹری ٹرک دیکھے جو ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ میں مسکرا اٹھا۔ میرے خیال میں ملٹری انٹیلی جینس کے چیف کی حماقت رنگ لے آئی تھی اور وہ گزشتہ تجربات کے باوجود

باز نہیں آیا تھا۔ وہ غالباً اب تک اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ شاید مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور وزیرِ دفاع کی نظر میں سرخرو ٹھہرے گا۔ لیکن اس میں کلام نہیں تھا کہ چیف بہرحال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔

شاہراہِ سعدون پہنچ کر میں نے ٹیکسی کو ڈاکٹر حارث کے گھر سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دیا۔ میں یہاں دوبارہ ایک خاص مقصد سے آیا تھا۔ وہ مقصد جو بصرہ جانے سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے نیچے اتر گیا اور جب ٹیکسی روانہ ہو گئی تو اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا۔ پھر میں ڈاکٹر حارث کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

اس وقت رات کے پونے آٹھ بج رہے تھے اور صبح تقریباً اسی وقت میں بوڑھے کرنل کے ساتھ ایئر پورٹ جانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ایئر پورٹ جاتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ دن اس قدر ہنگامہ خیز گزرے گا اور مجھے ایک بار پھر بغداد لوٹنا پڑے گا۔ کل بارہ گھنٹے ہی تو گزرے تھے اور ان بارہ گھنٹوں میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ حالات نے کافی تیزی سے پلٹا کھایا تھا اور میں ایک بار پھر کسی چھت کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔ میں نے وقتی طور پر جس کی شخصیت اپنائی تھی، وہ اپنے گھر واپس آ چکا تھا۔ اس کے باوجود اس گھر کے در و دیوار نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا ورنہ اس وقت تو میں بصرہ جانے والی فلائٹ میں سفر کر رہا ہوتا۔

میرا نادیدہ وجود ڈاکٹر حارث کے گھر میں داخل ہوا تو مجھے خلافِ معمول خاموشی سی محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر حارث کا بوڑھا باپ کرنل اور اس کی بیوی کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور ایک ملازم ان دونوں کے سامنے کھانا لگا رہا تھا مگر خود ڈاکٹر حارث وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر حارث کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرہ تاریک پڑا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ حارث اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ لیکن وہ گیا کہاں؟ میں نے سوچا اور پھر جب کرنل کا ذہن پڑھ کر مجھے اپنے سوال کا جواب ملا تو چونک اٹھا۔ ڈاکٹر حارث اسی فلائٹ سے بصرہ جانے کے لیے ایئر پورٹ روانہ ہوا تھا جس سے میں خود بصرہ جا رہا تھا۔

کتنا عجیب اتفاق ہوتا یہ بھی! میں نے سوچا۔ میں اور ڈاکٹر حارث ایک ہی فلائٹ سے بیک وقت بصرہ پہنچتے۔

مجھے کرنل کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوا تھا کہ روکے جانے کے باوجود ڈاکٹر حارث بصرہ جانے سے باز نہیں آیا تھا۔ غالباً وہ ہفتہ بھر انتظار کی اذیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر حارث نے یہ قدم اٹھا کر اچھا نہیں کیا تھا جب کہ میں اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔ صالحہ اسے اپنے محبوب کی حیثیت سے اس وقت تک قبول نہیں کر سکتی تھی جب تک دوبارہ اس کا ذہن تبدیل نہ کر دیا جاتا اور یہ کام صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ جب تک میں صالحہ سے نہ مل لیتا، ڈاکٹر حارث کی ہر کوشش لاحاصل ہی ثابت ہوتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ اپنی آمادگی کا اظہار کر دیتا کہ صالحہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہے مگر اس طرح صالحہ تو رضامند نہ ہوتی۔ عشق نے شاید بلندی کا خوف بھی اس کے ذہن سے نکال دیا تھا ورنہ اس سے قبل اس نے بہ مجبوری ہی دو ایک مرتبہ جہاز سے سفر کیا تھا۔ وہ جلد از جلد بصرہ پہنچنا چاہتا تھا۔

عشق میں آدمی کو صبر ہی کب ہوتا ہے۔ ایک عاشق عشق کے معاملے میں بہت بے صبر ہوتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر حارث کی بے صبری کو معاف کرتے ہوئے سوچا۔ محبت میں تو آدمی دماغ کے فیصلوں پر دل کے فیصلوں کو ترجیح دیتا ہے۔ خود میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی تھا۔ کیا میں نے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا؟ میں بھی تو صالحہ کا دیدار کرنے آج ہی روانہ ہو رہا تھا۔

میں ابھی انھی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں ٹیلیفون اسٹینڈ کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ بے اختیار میرے قدم ٹیلیفون اسٹینڈ کی طرف بڑھے اور پھر میں ایک دم رک گیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں اس وقت گھر کے مکینوں کے لیے ڈاکٹر حارث نہیں، ابوالہول ہوں اور نادیدہ ہوں۔

کرنل نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے ملازم سے کہا۔ "دیکھو کس کا فون ہے۔"

ملازم لپک کر فون کی طرف بڑھا۔ میں ایک طرف ہو گیا تاکہ وہ مجھ سے نہ ٹکرا جائے۔ فون کے قریب پہنچ کر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو... جی... جی ہاں جناب! وہ... وہ نہیں ہیں... کیا؟... جی... وہ کرنل صاحب موجود ہیں گھر پر!... بہتر ہے جناب!... جی... جی ہاں میں انھیں ابھی بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر ملازم نے وہیں سے بہ آوازِ بلند کرنل کو مخاطب کیا۔ "آپ سے کوئی میجر طارق بات کرنا چاہتے ہیں جناب! پہلے انھوں نے چھوٹے صاحب کو پوچھا تھا، پھر جب میں نے بتایا کہ وہ نہیں ہیں تو انھوں نے آپ کو..."

"ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔" کرنل، ملازم کی بات کاٹتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھا۔ کرنل ٹیلیفون اسٹینڈ کے قریب پہنچا تو ملازم نے اسے ریسیور تھما دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"جی فرمائیے!" کرنل نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔ "جی ہاں میں بول رہا ہوں ریٹائرڈ کرنل فراست!... جی ہیں... ڈاکٹر حارث میرا ہی بیٹا ہے... جی... جی ہاں وہ بصرہ جانے کے لیے ہی گھر سے ایئر پورٹ... جی... جی... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا... اچھا... ٹھیک ہے... جی ہاں... بہتر ہے... میں آپ کا انتظار کروں گا... خدا حافظ۔" یہ کہہ کر کرنل نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ فکرمند سا نظر آنے لگا تھا۔ کرنل جب دوبارہ کھانے کی میز پر لوٹ کر آیا تو اس کی بوڑھی بیوی نے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کس کا فون تھا؟ آپ اتنے فکرمند کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟"

"اسے منع کیا تھا میں نے... مگر وہ نہیں مانا۔" کرنل اپنی بیوی کی بات کا جواب دینے کی بجائے خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"کون نہیں مانا؟" بوڑھی عورت الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

"وہی تمہارا بیٹا اور کون!" کرنل نے جواب دیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں!"

"آخر آپ بتائیں بھی تو کچھ کہ ہوا کیا آخر؟" کرنل کی بیوی نے دریافت کیا۔

"ہونا کیا تھا، حارث کو انھوں نے بصرہ جانے سے روک دیا ہے اور اب وہ اسے یہاں لے کر آ رہے ہیں۔" کرنل بے خیالی میں کہہ گیا حالانکہ وہ اپنی بیوی کو اس سلسلے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"کن لوگوں نے اور کیوں اسے بصرہ جانے سے روک دیا؟ اور وہ اسے یہاں کیوں..."

"تم نہیں سمجھو گی بھئی! یہ اور ہی چکر ہے۔" کرنل زچ ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے میں کم عقل جو ٹھہری۔" یہ کہہ کر کرنل کی بیوی کھانے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے کھانا تو کھا لو کہ بھوکی ہی اٹھ جاؤ گی!" کرنل ہاتھ اٹھا کر بولا، پھر کہا۔ "وقت آنے پر تمھیں بھی سب کچھ بتا دوں گا فی الحال میرا ذہن پریشان ہے تم سوالات کر کے مجھے مزید الجھن میں مبتلا نہ کرو تو اچھا ہے۔" اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ بہرحال وہ بوڑھی عورت اس کی بیوی تھی اسے بھی اپنے بیٹے کے متعلق کچھ جاننے کا اتنا ہی حق تھا جتنا کرنل کو۔ کرنل کی بیوی اس یقین دہانی کے بعد پھر اپنی نشست پر بیٹھ گئی اور سر جھکا کر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کرنل بھی اب بہ ظاہر کھانے ہی کی طرف متوجہ تھا مگر اس کے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

میں اس وقت بھی وہیں موجود تھا اور کرنل جو کچھ سوچ رہا تھا میرے علم میں تھا۔ وہ میجر طارق کے اس عجیب سوال کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میجر طارق نے فون پر اس سے کیا تھا۔ میجر طارق نے اس سے یہ عجیب سوال کیا تھا کہ کیا اسے یقین ہے، ڈاکٹر حارث اسی کا بیٹا ہے! بھلا اس سلسلے میں یقین نہ ہونے کا کیا سوال تھا!

میں اب سمجھ چکا تھا کہ ڈاکٹر حارث کو میرے دھوکے میں دھر لیا گیا ہے اور اب ملٹری انٹیلی جینس والے یہ تصدیق کر رہے ہیں کہ وہ ڈاکٹر حارث ہی ہے یا وہ شخص یعنی میں، جس نے ڈاکٹر حارث کی شخصیت اپنائی تھی۔ میرے خیال میں ڈاکٹر حارث اس وقت ایئر پورٹ پہنچا ہوگا جب ملٹری انٹیلی جینس والے مجھے ڈاکٹر حارث سمجھ کر وہاں سے لے گئے ہوں گے۔

مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر حارث کو وقتی طور پر پریشانی ہوگی جب ملٹری انٹیلی جینس والوں کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اس کے چہرے پر میک اپ نہیں اور وہ یقیناً ڈاکٹر حارث ہے تو پھر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ میں نے وہ شب اسی گھر میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابھی ڈاکٹر حارث کے آنے میں دیر تھی اس لیے میں اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور ذہنی مشقت نے مجھے کچھ تھکا سا دیا تھا اس لیے آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں ڈاکٹر حارث کے تاریک کمرے میں داخل ہو کر مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ اندھیرا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں اندھیرے میں بھی اسی طرح دیکھنے کا اہل تھا جیسے عام آدمیوں کو ہر شے روشنی میں واضح نظر آتی ہے۔ اپنی اس قوت کو بیدار کرنے کے لیے بھی میرا صرف سوچنا کافی تھا۔ میرے خیال کی قوت مجھ میں چھپی ہوئی ہر حیرت انگیز طاقت کو متحرک کر دیتی تھی اور میں اس سے آگاہ تھا، لیکن اس وقت میں نے اندھیرے میں ہر شے کو واضح دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔ اس گھر کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں اندھیرا ہونے کے باوجود بھی اس کمرے میں موجود تمام اشیا کے بارے میں سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا سکتا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہوگی۔

مسہری پر دراز ہو کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر کے لیے ہر خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ پورے چوبیس گھنٹے میں اگر صرف پانچ منٹ کو بھی میں ایسا کر لیتا تھا تو میری تمام ذہنی اور جسمانی تھکن دور ہو جاتی تھی اور میں خود کو بالکل تر و تازہ محسوس کرنے لگتا تھا۔ مجھے اسی طرح آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے پانچ منٹ سے

زیادہ ہو گئے لیکن میں نے کسی خیال کو بھی اپنے ذہن میں در آنے کی اجازت نہیں دی۔ پھر بھی میں ایک خیال سے دامن نہ بچا سکا۔ میں اب اپنے ذہن کو مزید آرام نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں مگر اس کے باوجود ایک چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ یہ صالحہ کا خیال تھا جو زبردستی میرے ذہن میں گھس آیا تھا۔ میری تمام ذہنی صلاحیتیں صالحہ کے سامنے بے کار ہو کر رہ جاتی تھیں۔ یہ بات میرے لیے خطرناک بھی تھی اور تشویشناک بھی! ایئر پورٹ پر بھی میں اگر صالحہ کے خیال میں نہ کھویا ہوتا تو اس پستہ قد شخص کی طرف سے قبل از وقت چوکنا ہو جاتا اور واقعات اس طرح پیش نہ آتے جس طرح پیش آئے تھے۔ اس طرح تو میں کبھی اپنے دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتا تھا۔ یا وہ اس کی اتنی خوب نہیں تھی یہ مجھے بھی علم تھا مگر اسے ذہن سے بھلانا بھی میرے لیے ناممکن ہی تھا۔

"اس نے آخر مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے؟" میں بے بسی کے عالم میں بڑبڑا لیا۔

پھر میں اسی وقت کمرے سے نکلا جب ڈاکٹر حارث گھر لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ ملٹری والے بھی تھے جنھیں نشست گاہ میں بٹھایا گیا تھا۔ بوڑھا کرنل بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے بھی نشست گاہ کا رخ کیا۔ ڈاکٹر حارث اور کرنل کے علاوہ وہاں چار افراد اور بھی تھے جن میں سے دو کے جسموں پر وردیاں تھیں اور دو سادہ لباس میں تھے۔ سادہ لباس والوں میں سے ایک وہی پستہ قد شخص تھا جس نے مجھے ایئر پورٹ پر ڈاکٹر حارث سمجھ کر گرفتار کیا تھا۔ دوسرا سادہ لباس والا اس کا ساتھی تھا۔

کرنل سے گفتگو کا آغاز پستہ قد شخص ہی نے کیا۔ "محترم! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ شام چار بجے سے ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہونے تک ڈاکٹر حارث کہاں رہے؟"

"یہیں گھر میں۔" کرنل نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا اس دوران میں یہ گھر سے قطعی باہر نہیں گئے؟" کرنل سے دوسرا سوال کیا گیا۔

"قطعی نہیں۔" کرنل نے بلا جھجک کہا۔

میں اس دوران پستہ قد شخص کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم بھی گھامڑ ہو بھائی گینڈے اور تمہارا چیف بھی!"

"کیا؟" پستہ قد شخص ایک دم اچھل پڑا اور خوف زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہاں موجود دوسرے افراد پستہ قد شخص کو ایک دم اچھلتے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح اپنی نشست سے اچھل پڑا تھا جیسے کچھ چبھ گیا ہو اور اب دہشت زدہ سا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر حارث نہیں تھا میں تھا احمق آدمی! میں ہی تمھیں بے وقوف بنا کر نکل گیا تھا۔ اپنے چیف سے کہنا کہ وہ گذشتہ تجربات سے سبق لے اور اس معاملے میں نہ پڑے ورنہ میں اس کی بھوری مونچھیں صاف کر دوں گا جس کے بعد یقیناً اس کی شخصیت زیادہ بارعب نہیں رہے گی۔" میں نے ایک بار پھر پستہ قد شخص کے کان میں سرگوشی کی۔ میں اس شخص کو صرف اس لیے پریشان کر رہا تھا کہ اسی کی فرض شناسی کے نتیجے میں میرا بصرہ جانا ملتوی ہو گیا تھا اور ڈاکٹر حارث کو بھی ناحق پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ میری اس حرکت کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ جلد از جلد ڈاکٹر حارث کی جان چھوڑ دے مگر وہ کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ ثابت ہوا یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اسے اس کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔

پستہ قد شخص خوف زدہ ہونے کے باوجود سوال جواب سے باز نہیں آیا۔ میرے خیال میں اسے مزید سزا کی ضرورت تھی۔ اسے صرف خوف زدہ کر دینا ہی کافی نہیں تھا۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت کرنل اس کے ایک سوال کا جواب دے رہا تھا کہ وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "بس بس! مجھے کچھ اور معلوم نہیں کرنا۔ دراصل میں احمق آدمی ہوں، آپ ایسا کریں کہ اپنے پیر سے جوتا اتار کر میری چاندی پر بجانا شروع کر دیں۔ اس طرح میرے دماغ کے سارے کیڑے جھڑ جائیں گے۔ پلیز کرنل! آپ میری یہ خواہش رد نہ کریں؟"

ظاہر ہے کہ پستہ قد شخص کی زبان سے یہ "اظہارِ حقیقت" میرے سوا اور کون کرا سکتا تھا۔

"یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!" کرنل انتہائی حیرت زدہ ہو کر بولا۔ دونوں باوردی ملٹری افسران حیران ہو کر پستہ قد شخص کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے! اور اس کے ساتھی کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"خیر کرنل! آپ یہ فرض انجام نہیں دے سکتے تو نہ سہی۔" یہ کہہ کر پستہ قد شخص نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے پیر کا جوتا اتار لیا اور کھڑا ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک سکتا اس نے پے در پے اپنی کھوپڑی پر جوتے برسانا شروع کر دیے۔ اس کا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا۔ کمرے میں موجود تمام افراد پتھر کے مجسموں کی طرح یہ مضحکہ خیز اور ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہے تھے۔

پھر وہ لوگ اس وقت چونکے جب پستہ قد شخص نے خود ہی اپنا بوٹ پہن لیا اور اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھ گیا جیسے اس نے کوئی ضروری کام انجام دے دیا ہو اور اس کی تکمیل کے بعد مطمئن ہو گیا ہو۔ "اب میرے دماغ کے سارے کیڑے مجھڑ چکے ہیں اس لیے چلنا چاہیے کیا خیال ہے؟" پستہ قد شخص نے اپنے سادہ لباس ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت باوردی ملٹری افسر اپنے ساتھی سے مدھم لہجے میں بولا: "اس شخص پر یقیناً پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے، مگر شاید وہ دوبارہ اپنے حواس میں آ رہا ہے۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ کسی بھی طرح پستہ قد شخص تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"دیکھو وہ تمہیں پاگل کہہ رہا ہے۔" میں نے پستہ قد شخص کو سرگوشی میں بتایا۔ "وہ ملٹری افسر!"

"کیا کہا! پاگل!" پستہ قد شخص میرے اشارے پر ایک دم ملٹری افسر کی طرف دیکھ کر غرایا۔ "پاگل ہو گے تم! تمہارے والد صاحب بلکہ نانا حضور قبلہ!"

باوردی ملٹری افسر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ کر پستہ قد شخص کی طرف تان لیا اور طیش کے عالم میں بولا: "اب اگر تم نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکالا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا!"

"کیا کہہ رہے ہو پیارے بھائی! اگر تم نے مجھے گولی مار دی تو تمہارے جنازے کو کاندھا کون دے گا!" پستہ قد شخص نے بے خوفی سے کہا۔ پھر اگر دوسرا ملٹری افسر عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے ریوالور نہ چھین لیتا تو پستہ قد شخص شاید زندہ نہ رہتا۔

"سنو! یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔" دوسرے ملٹری افسر نے پہلے کو سمجھایا۔ "ہوش میں آؤ، کسی پاگل کی بات کا بُرا نہیں مانتے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اسے قابو میں کر کے یہاں سے لے چلیں ورنہ ممکن ہے یہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس کے لیے ہمیں اُوپر والوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے!"

اس کی تجویز حالات کو نظر رکھتے ہوئے مناسب ہی تھی اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ سب جلد سے جلد وہاں سے چلے جائیں۔ پھر انھوں نے پستہ قد شخص کو قابو میں کر کے رسیوں سے باندھنا شروع کر دیا۔ یہ پتلی پتلی رسیاں ریشم سے بنی ہوئی تھیں اور ملٹری افسران کے

غیرت کے سوداگر
تحریر
ایم اے راجہ
خاکِ وطن کا سودا کرنے والے
چہروں کی نقاب کشا داستان
ایک جلد میں مکمل
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
غیرت کے سوداگر
وطن عزیز کے حصول کے لئے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہو لہو ہوئے۔ تب عوس وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن ناموس وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔
(زیرِ طبع)
کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ ۴۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔
گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11 - ...
فون: ... - 7229762

جلاد
مصنف
ایم اے راحت
ایک سچے انسان کی داستان
جسے دنیا جلاد کے نام سے جانتی تھی
مقبول ترین سلسلہ
وہ محبتوں کا پجاری تھا۔ لیکن ستم کاروں نے اس سے محبت کے جذبے چھین کر ہتھیاروں سے مسلح کر دیا۔ اور پھر زیج پڑ گئے۔ اسے جلاد کے نام سے پکارنے لگے۔
خوف اور دہشت میں ڈوبی ایک ایڈونچر کہانی
شائع ہو گیا ہے
ایک جلد میں | قیمت - /60 | روپے
گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری 11 - مرزا اسلام پورہ لاہور
فون: 7229762 - 7248599

پاس موجود تھیں۔ اسی دوران میں پستہ قد شخص ایک دم چونک اٹھا اور پلکیں جھپکا کر اپنی اطراف دیکھنے لگا۔ اب میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا کیوں کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پھر پستہ قد شخص ایک دم بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی اور سختی بھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ کیوں باندھ رہے ہو مجھے؟ کیا پاگل ہو گئے ہو؟"

"پاگل ہم نہیں ہوئے، تم ہو گئے ہو!" پہلا ملٹری افسر دانت پیس کر بولا۔ یہ وہی تھا جس سے کچھ دیر قبل ہی پستہ قد شخص کا جھگڑا ہوا تھا۔

"تم لوگوں کو اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا!" پستہ قد شخص نے غصے کے عالم میں کہا۔ پستہ قد شخص کے غصے کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اب بھی شاید یہی سمجھ رہے تھے کہ پستہ قد شخص پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پھر وہ سب کرنل سے معذرت کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

"آج کا دن بھی بہت عجیب ہے۔" بوڑھے کرنل نے طویل سانس لے کر ڈاکٹر حارث کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک سے ایک حیرت انگیز بات سامنے آ رہی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ اچھے بھلے آدمی پر دیکھتے ہی دیکھتے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔"

"ہاں ڈیڈی!" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر حارث اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "خود میں بھی ان باتوں سے الجھ کر رہ گیا ہوں۔ تین ماہ نو دن میں نے کہاں اور کیسے گزارے، مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔"

ڈاکٹر حارث نے دانستہ کرنل سے اس پُراسرار واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا جو اُسے اسی دن پیش آیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کرنل کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہو چکا ہوتا۔ وہ اٹیچی جو ڈاکٹر حارث ایئرپورٹ جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا تھا، وہیں نشست گاہ میں ایک طرف رکھی ہوئی تھی کیوں کہ انٹیلی جنس والوں نے اسے اندر گھر میں جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کہیں اپنے باپ کو کچھ سکھا پڑھا نہ دے۔ جب ڈاکٹر حارث نشست گاہ سے چلا تو اس نے اٹیچی بھی اٹھا لی جس میں اس کی ضروریات کا سامان ہو گا۔ پھر جب میں باہر نکلا تو میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔

ڈاکٹر حارث اپنے کمرے میں جا کر اٹیچی سے سامان نکالنے لگا۔ اسی دوران میں وہ چونک اٹھا۔ اس کے چونک اٹھنے کا سبب میں ہی تھا۔ میں نے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔ "ڈاکٹر حارث!" میں پھر بولا

"تم نے بصرہ جانے میں جلدی کی میرے دوست، حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ آئندہ ہفتے بصرہ جا کر تمام معاملات درست کر دوں گا۔"

"تم..... تم مجھے نظر نہیں آ رہے حالانکہ نشست گاہ میں بھی میں نے تمھاری..... تمھاری خوشبو محسوس کی تھی۔" ڈاکٹر حارث ادھر اُدھر دیکھتا ہوا کسی قدر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں میں تمھارے گھر میں بہت دیر سے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "کمرے کا دروازہ بند کر دو تاکہ یہاں کوئی نہ آ سکے۔ اس کے بعد تمھارے لیے میرا وجود نادیدہ نہیں رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر حارث اثبات میں سر ہلا کر مسہری سے اُترا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اب اس کی پُشت میری جانب تھی۔ میرے خیال کی قوت متحرک ہو گئی۔ ڈاکٹر حارث جیسے ہی کمرے کا دروازہ بند کر کے پلٹا، چونک اٹھا۔ مسہری کے قریب ہی موجود کرسی پر میں بیٹھا ہوا تھا اور یقیناً اب اسے نظر بھی آ رہا تھا۔

"میں آج ہی دوسری بار تم سے ملنے کے لیے اس لیے مجبور ہو گیا کہ اب تمھارے مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اُس سے کہا۔ "میں اسی لیے آج بصرہ بھی جانے والا تھا مگر کچھ ناگزیر وجوہ کی بنا پر نہ جا سکا۔ بہرحال اب تم یوں کرو کہ آج ہی یا کل صبح، صالحہ کو ٹیلی گرام کر دو کہ وہ فوراً اپنی والدہ یا بھائی کے ساتھ بغداد آ جائے۔ میں اسی لیے یہ چاہتا ہوں کہ ایک تو اس طرح فوری طور پر تمھارا مسئلہ حل ہو جائے گا، دوسرے یہ کہ میں بصرے جانے سے بچ جاؤں گا۔"

ڈاکٹر حارث میری بات سُن کر سوچ میں پڑ گیا جس کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا مگر میں اس کی سوچ سے بے خبر نہیں تھا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو دوست!" میں نے اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات جاننے کے بعد کہا۔ "میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھ پر اعتماد کرو، اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔"

وہ چونک کر بولا۔ "کیا تم ٹیلی پیتھ بھی ہو؟ تم آدمی کا ذہن پڑھ لیتے ہو؟"

"ہاں دوست، مجھ میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ "میں ابھی ٹیلی گرام دے آتا ہوں۔"

"تمھاری اجازت سے میں کچھ دن اس گھر میں گزارنا چاہتا ہوں۔" میں بولا۔ "میں صرف اس وقت تک یہاں رہوں گا جب تک میرا قیام بغداد میں ہے، اس کے بعد شاید..... شاید میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز خود بخود بھاری ہو گئی۔ ڈاکٹر حارث نے بھی میرے لہجے کے دُکھ کو محسوس کر لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمھارے لہجے سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تمھیں شاید بغداد چھوڑنے کا دُکھ ہے۔"

"ہاں! تم نے ٹھیک ہی سمجھا ڈاکٹر!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اس شہر اور خاص طور پر اس گھر کے در و دیوار سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں جنھیں شاید میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا۔"

"تم اگر یہاں کچھ دن رہنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں..... لیکن....." ڈاکٹر حارث کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"لیکن یہی کہ میں کہاں رہوں گا؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم اور یہ کہ یہاں میری موجودگی کس طرح راز رہ سکے گی؟"

"ہاں، میں یہی کہنا چاہتا تھا۔" ڈاکٹر حارث بولا۔

"میرے یہاں رہنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ..... مگر میں اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ جہاں تک میرے قیام کا مسئلہ ہے تو میں مہمان خانے میں رہ لوں گا، رہا یہ مسئلہ کہ کسی کو یہاں میری موجودگی کا علم نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں، تم ان دونوں صورتوں میں سے جو بھی مناسب خیال کرو، اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" ڈاکٹر حارث نے دریافت کیا۔

"ایک صورت تو یہ کہ میں کسی کو نظر ہی نہ آؤں۔" میں نے جواب دیا۔ "دوسری یہ کہ تمھارا مہمان بن کر رہوں۔"

چند لمحے سوچنے کے بعد ڈاکٹر حارث نے کہا۔ "دوسری صورت زیادہ بہتر ہے لیکن تمھارا چہرہ؟"

"یہ تو میک اپ سے میرے چہرے پر جسے ختم کیا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو کہ میرے دوست بن

جاؤ۔ تم بھی میری طرح نیورو سرجن ہو اور عراق ہی کے ایک شہر نینوا کے رہنے والے ہو۔ کیا خیال ہے اس کہانی کے بارے میں؟" ڈاکٹر حارث کے لہجے میں بچوں کی سی مسرت تھی۔ اسے یقیناً یہ سارا معاملہ پُراسرار ہونے کے باوجود دلچسپ معلوم ہونے لگا تھا۔

"اور ہم تم پہلی بار ملے کہاں تھے؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہماری ملاقات سلیمانیہ میں ہوئی تھی۔" ڈاکٹر حارث ہنس کر بولا۔ "گزشتہ سال میں نے سلیمانیہ ہی میں گرمیاں گزاری تھیں۔ خوبصورت وادیوں اور بلند پہاڑیوں کے درمیان ہم پہلی بار ملے تھے۔ تم بھی میری طرح گرمیاں گزارنے نینوا سے سلیمانیہ آئے ہوئے تھے۔ کیا تم بھول گئے کہ میں نے اس وقت تمھیں بغداد آنے کی دعوت دی تھی؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"بالکل نہیں، مجھے یاد ہے تمھاری دعوت!" میں ہنس پڑا۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ تم اس قدر ذہین ہو گے اور اتنی دلچسپ شخصیت کے مالک ہو گے۔ تمام کہانی خود تم نے ترتیب دے لی ہے۔ میرے خیال سے اب تم میرا کوئی اچھا سا نام بھی رکھ دو۔"

"ڈاکٹر طالب کیسا رہے گا؟" اس نے پوچھا۔

"اچھا ہے۔" میں نے جواب دیا پھر بولا۔ "تو گویا میں ڈاکٹر طالب بن گیا، اس وقت تک کے لیے جب تک میرا قیام بغداد میں ہے۔ سنو ڈاکٹر، تمھاری الماری کے اوپری خانے میں ایک ڈبا رکھا ہو گا اور ایک بوتل بھی، ذرا نکال کر مجھے دے دو، میں چاہتا ہوں کہ اب ڈاکٹر کا پیچھا چھوڑ کر ڈاکٹر طالب بن جاؤں۔"

"ہاں میں نے وہ ڈبا اور بوتل دیکھی تو تھی۔" اس وقت جب میں ائیر پورٹ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی یہ چیزیں دیکھ کر، مگر اس وقت مجھے ائیر پورٹ جانے کی جلدی تھی میں اس ڈبے کو کھول کر نہ دیکھ سکا۔ کیا ہے اس میں؟" ڈاکٹر حارث نے کہا۔

"میک اپ کا جدید ترین سامان۔" میں نے بتایا۔ "یہ سامان میں نے ہی خریدا تھا۔ اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ سامان مجھے دے دینا۔ ویسے بھی یہ تمھارے لیے بیکار ہے۔"

"بالکل لے لینا، میرے کس کام کا ہے!" اس نے کہا اور پھر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ڈبا اور بوتل لا کر مجھے تھما دی اور میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد ہی میرا چہرہ بالکل بدل گیا۔ اب میں ڈاکٹر حارث کا ہم شکل نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر حارث اس دوران میں بیٹھے خاموشی سے میری حرکات و سکنات دیکھتا رہا تھا۔ اسے اسی دوران میں میرا اصل چہرہ بھی نظر آیا ہو گا جو خوب صورت اور پُرکشش تھا لیکن میں نے اپنے چہرے پر جو نیا میک اپ کیا تھا وہ بھی کم نہیں تھا۔ میں نئے میک اپ میں بھی خاصا وجیہہ اور پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ اب میری آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ بھی بدل چکا تھا۔ بھوری آنکھیں میرے چہرے کی مناسبت سے خوب صورت نظر آ رہی تھیں۔ میک اپ میں مجھے بہرحال مہارت حاصل تھی۔ میک اپ سے فارغ ہو کر میں ڈاکٹر حارث کی طرف مڑا اور بولا۔ "تو ڈاکٹر حارث، اپنے دوست ڈاکٹر طالب سے ملو جو آج ہی نینوا سے آنے والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کچھ جھجک رہا تھا، مگر پھر اس نے بھی ہاتھ بڑھا ہی دیا۔ اسے ہاتھ ملاتے ہوئے یقیناً یہ بات عجیب لگی ہو گی کہ جسے وہ کوئی پُراسرار وجود سمجھ رہا ہے، وہ بھی اسی کی طرح گوشت پوست کا مالک ہے۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی ڈاکٹر طالب!" ڈاکٹر حارث نے مسکرا کر کہا۔

"دوبارہ مل کر!" میں خاموشی سے بولا۔ "کیونکہ ہماری پہلی ملاقات سلیمانیہ میں ہو چکی ہے۔" میں نے تصحیح کی، پھر گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔ اب تم ایسا کرو ڈاکٹر کہ اس دوران میں صالحہ کو ٹیلی گرام دے آؤ، میں ایک اٹیچی اور کپڑے خرید کر لے آتا ہوں۔ آخر میں نینوا سے یہاں آنے والا ہوں، میرے پاس کچھ سامان تو ہونا ہی چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے میں مسکرایا اور پھر چند لمحے بعد ہی میں ڈاکٹر حارث کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس بار میرے غائب ہو جانے پر ڈاکٹر حارث کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات اب بہرحال اس کے لیے نئی نہیں رہی تھی۔ وہ شب میں نے ڈاکٹر طالب کی حیثیت سے ڈاکٹر حارث کے مہمان خانے میں گزاری۔ رات ہی کو ڈاکٹر حارث نے بوڑھے کرنل سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔

دوسرے دن شام ہوتے ہوتے صالحہ آ گئی۔ وہ ہوائی جہاز سے اپنی والدہ کے ساتھ آئی تھی۔ ڈاکٹر حارث نے ٹیلی گرام کے

بلدے میں اپنی والدہ اور کرنل کو نہیں بتایا تھا اس لیے وہ دونوں ہی ان کی آمد پر حیران تھے۔ صالحہ کی ماں اپنی بہن سے گلے مل کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "رات کو جب حارث کا تار ملا تو میں ہول ہی گئی۔ رات کاٹنا مشکل ہو گیا۔ دل میں نہ جانے کیا کیا وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔"

"حارث کا تار؟" حارث کی ماں نے حیرت سے کہا۔ "مگر اس نے مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ کہاں ہے حارث؟"

میں اس وقت مہمان خانے سے ڈاکٹر حارث کے ساتھ ہی باہر نکل کر اندر گھر تک قدم رکھ رہا تھا مگر میرا وجود نادیدہ تھا۔ حارث نے اپنی خالہ کو سلام کیا۔ صالحہ اسے دیکھتے ہی مسکرائی اور پھر سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "آداب بھا..." مگر اپنا جملہ پورا نہ کر سکی؛ اس سے پہلے ہی میں نے اس کے ذہن کو قابو میں کر لیا۔ کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ صالحہ کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات بدل گئے۔ وہ حارث کی طرف دیکھتے ہوئے شرما سی گئی اور پھر سامنے والے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

"ارے یہ ایک دم لڑکی کو کیا ہوا؟" صالحہ کی ماں حیران ہو کر بولی۔ "ذرا تم دیکھنا حارث بیٹے!"

"اچھا خالہ جان!" حارث یہ کہہ کر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں بہنوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ان کے لیے صالحہ کا یوں اچانک مسکرا کر اور پھر شرما کر کمرے کی طرف بھاگ جانا یقیناً بے معنی نہیں تھا۔ وہ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ ان دونوں کے قریب ہی بوڑھا کرنل کھڑا تھا۔ یہ منظر اس کے لیے بھی عجیب ہی رہا ہو گا۔ ابھی چند دن پہلے ہی کی تو بات تھی کہ بچپن کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ حارث اور صالحہ دونوں ہی نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اچانک یہ تبدیلی کیسی؟ اس کی بوڑھی مگر چمکیلی آنکھوں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں بھی محبت کی تحریر پڑھ لی ہو گی۔ یہ محبت کی تحریر اس تحریر سے مختلف تھی جو ایک بہن کے لیے بھائی کی آنکھوں میں جھلکتی ہے۔

"ان دونوں کو جو کچھ نہ ہو جائے وہ تھوڑا ہے۔" کرنل بڑبڑایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے صبح اس وقت اپنی قوتوں کو بروئے کار لا کر صالحہ کے ذہن کو اپنے قابو میں کر لیا تھا جب وہ ڈاکٹر حارث کو بھائی کہنے والی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار پھر صالحہ نے ڈاکٹر حارث کو بھائی کہہ دیا تو بات بگڑ جائے گی۔ اس طرح ڈاکٹر حارث کو شدید صدمہ پہنچے گا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے صالحہ کا [جملہ] پورا نہیں ہونے دیا تھا اور اسی کے ساتھ اس کے ذہن [سے] ماضی کی ہر یاد کو دھندلا کر دیا تھا۔ اس وقت صالحہ نے اپنے [ذہن] میں بھائی کے سے محسوس کیسے ہوں گے۔

اب وہ دونوں محبت کے مارے خلوت میں تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ میری نگاہیں صالحہ پر جمی ہوئی تھیں جس کا چہرہ اس وقت حیا کی سرخی سے کھلے ہوئے گلاب کی مانند نظر آ رہا تھا۔ "جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے، آپ بڑے وہ ہیں" صالحہ کے یاقوتی لب حرکت کر رہے تھے۔

"کیا؟" حارث نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بوجھل سی تھی۔

"ہم نہیں بتاتے۔" یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا۔

ایک قیامت تھی جو صالحہ کو دیکھ کر میرے دل پر گزر رہی تھی۔ ایک عجیب درد انگیز مگر نشہ آور سی کیفیت جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک آگ سی تھی جو میرے سینے میں لگی تھی اور شاید اسی کا نام محبت تھا۔ یہ گناہ ہے، بہت بڑا گناہ! کوئی میرے وجود میں چیخ اٹھا۔ تمھیں کیا حق ہے کہ تم دو محبت کرنے والوں کی خلوت میں در آؤ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے، اے بدقسمت انسان! تمھارے نصیب میں کسی گیسو کا سایہ نہیں۔ تمھارے دل میں کسی کی [چاہت] ہو تو ہو مگر تمھارے لیے کسی دل کا دروازہ وا نہیں۔ میں نے نم ہوتی آنکھوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر واپسی کے لیے اس کمرے سے نکل کر مہمان خانے تک پہنچتے پہنچتے میرے وجود میں چھپی ہوئی تمام محرومیاں جاگ اٹھیں۔ میں بے سدھ ہو کر مسہری پر گر گیا اور سسک پڑا۔ میں خود اپنی ہی آگ میں جل رہا تھا اور کسی مہربان ہاتھ کا سایہ نہیں تھا، یوں جیسے کوئی مسافر جلتی ریت پر چلتے چلتے ہانپ کر گر گیا ہو۔ میں یونہی سسکتا، بلکتا سا، جلتا رہا۔ پھر کمرے میں کسی کے قدموں کی چاپ گونجی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرے میں داخل ہونے والا میرا رقیب تھا۔ رقیب، دوست یا کوئی اجنبی! وہ جس کے دامن میں خود میں نے خوشیاں ڈال دی تھیں۔ وہ جسے اپنا سکون و قرار سونپ [دیا] تھا۔ ہاں وہ ڈاکٹر حارث ہی تھا جس کے چہرے پر وہاں کسی کو نہ دیکھ کر حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے کیوں کہ کمرے میں [داخل] ہوتے وقت اس نے میرے رونے کی آواز سنی ہو گی۔ پھر اس نے تیز تیز سانس لے کر کمرے میں میرے وجود کی موجودگی کا یقین کیا۔ اس نے تازہ گلابوں کی مہک محسوس کر لی ہو گی۔ یہی سبب تھا کہ اس نے مجھے "ڈاکٹر طالب" کہہ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ میں اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ میں اپنے رقیب کو بھلا اپنے دکھ میں شریک کر سکتا تھا۔

"ڈاکٹر طالب!" اس نے کوئی جواب نہ پا کر مجھے پھر پکارا۔ "یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم کمرے میں ہو کیوں کہ مجھے تمھاری خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ اب سامنے آ جاؤ؟"

چند لمحے بعد میں اپنے وجود کی تجسیم کر چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر حارث بولا۔ "دراصل میں تمھارا شکریہ ادا کرنے آیا تھا دوست! تم یقیناً حیرت انگیز قوتوں کے مالک ہو۔ میں اس وقت کانپ کر رہ گیا تھا جب صالحہ مجھے بھائی جان کہنے والی تھی مگر غالباً تم نے اسی وقت اپنی پُراسرار قوتوں سے کام لے کر اس کی زبان روک دی اور پھر شاید تم ہی نے اسے دوبارہ وہی پہلے والی صالحہ بنا دیا جو مجھے چاہتی تھی۔" اس کی آواز بوجھل سی ہو گئی۔

میں نے جواب میں طویل سانس لے کر کہا۔ "مبارک ہو ڈاکٹر کہ تمھیں تمھاری محبت واپس مل گئی۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا، اب اجازت چاہوں گا۔"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر حارث حیرت سے بولا۔ "تم نے تو یہاں چند دن رُکنے کے لیے کہا تھا؟"

"یقیناً کہا تھا لیکن اب شاید.... اب شاید میں.... میں ایک رات بھی اس گھر میں نہیں گزار سکتا۔" میں نے اپنے اوپر قابو پاتے پاتے بھی سچ بات کہہ ہی دی۔

"کیوں، کیا تمھیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟"

تکلیف! میں نے سوچا کتنا بے خبر ہے یہ شخص اور کتنا بھولا! اگر اسے علم ہوتا کہ وہ اپنے رقیب سے رُکنے کے لیے کہہ رہا ہے تو شاید کبھی اس کی زبان پر کوئی ایسی بات نہ آتی۔ کاش میں حارث کو بتا سکتا کہ میرے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے "تکلیف" کا لفظ بہت چھوٹا تھا۔ اس احساس، اس محرومی اور اس دکھ کے لیے تو شاید کوئی لفظ ہی نہیں۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں کہ کیا بات ہے؟" ڈاکٹر حارث یہ کہتا ہوا میرے قریب ہی مسہری پر آ کر بیٹھ گیا۔

"تم نہیں سن سکو گے میرے دوست!" میں نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ مجھے جانے دو، مجھے جانے کی اجازت دے دو۔"

"تم نے مجھے دوست کہا ہے اور میں دوستی کے مفہوم سے ناآشنا نہیں ہوں۔ یہ لفظ بہت محترم ہے۔ تمھیں اس لفظ کے تقدس کی قسم، مجھے بتا دو کہ تم یہاں کیوں نہیں رہنا چاہتے؟"

میں اسے جذباتی دیکھ کر خود بھی جذباتی سا ہو گیا اور بولا۔ "کیا تم واقعی میرے دوست ہو؟ کیا دنیا میں میرا کوئی دوست بھی ہو سکتا ہے! شاید.... شاید نہیں.... ہرگز نہیں!"

ڈاکٹر حارث نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، پھر میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ "ہر چند کہ میں تمھارے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن مجھے اتنا علم ضرور ہو گیا ہے کہ تمھارے سینے میں جو دل ہے، اس میں نیکی، سچائی، خیر اور محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تم اور تمھارا پُراسرار وجود میرے لیے ناقابلِ فہم ہونے کے باوجود بہت محترم ہے۔ اگر تم مجھے اپنی دوستی کا اہل نہیں سمجھتے تو.... تو میں.... میں یقیناً خود کو بدقسمت ہی سمجھ سکتا ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تم بدقسمت نہیں خوش قسمت ہو ڈاکٹر حارث!" میں نے کہا۔ وہ مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے ڈاکٹر! وہ حقیقت ہے۔ تم واقعی خوش قسمت ہو۔" یہ کہہ کر میں مزید بولا۔ "ڈاکٹر! تم پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ سنو ڈاکٹر! میں نہیں چاہتا کہ میرے لیے تمھارے دل میں جو جذبات ہیں، انھیں قتل کر دوں۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا کہ مجھے ابھی کچھ دن اور اِدھر اُدھر بھٹکنا ہے لیکن شاید.... شاید اب ہم کبھی نہ مل سکیں۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ اس گھر میں رہ کر میرے دل پر کیا گزر رہی ہے! میں تمھارا خوشبو کا ایک جھونکا ہوں، مجھے بھلا دینا ڈاکٹر، بھلا دینا!" یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میری پلکیں بوجھل ہو گئیں اور میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ڈاکٹر حارث نے میری بات سن کر یہی سوچا ہو گا کہ یقیناً میرے سینے پر کوئی بوجھ ہے، کسی بڑے دکھ کا بوجھ! اور میں اس دکھ میں اسے شریک کرنا نہیں چاہتا۔ وہ چاہے بھی تو مجھے نہیں روک سکے گا۔ شاید یہی سوچ کر اس نے طویل سانس لیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے دوست! میں تمھیں نہیں روکتا۔ کوشش کرنا کہ زندگی کے کسی موڑ پر پھر کبھی ہم مل سکیں۔"

پھر میں اس گھر میں اپنی محبت کا دیا جلتا ہوا چھوڑ آیا۔ وہاں سے مجھے کہاں جانا ہے، اب تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے ایک بار مڑ کر اس گھر کے شب افروز روزنوں کو دیکھا۔ ڈاکٹر حارث نے مجھے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ میں جہاں جانا چاہوں، وہ مجھے اپنی کار میں چھوڑ دے گا مگر میں نے اس کی پیش کش قبول نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا تھا، اسے علم ہو کہ میرا قیام کہاں ہے۔

سامنے سے ایک خالی ٹیکسی گزری تو بے اختیار میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ ٹیکسی کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی اور میں نے اس کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کو ریورس میں ڈالا اور میرے قریب آکر رک گیا۔ میں اٹیچی سمیت ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

"جی جناب، کدھر چلوں؟" ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

لمحے بھر کو میں نے سوچا اور پھر جیسے خود بہ خود میری زبان سے نکل گیا۔ "ہوٹل فرنانڈیس۔"

"بہتر ہے جناب!" یہ کہتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ٹیکسی بڑھتے ہی میں نے سوچا کہ میرے ذہن میں فرنانڈیس ہوٹل ہی کا نام کیوں آیا؟ پھر مجھے بہت جلد اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔ میرے شعور کے کسی گوشے میں یہ بات محفوظ تھی کہ روسی ایجنٹ میخائیل کی دوست ماریا اسی ہوٹل میں رقص کرتی ہے، وہی ماریا جس کے بارے میں مقامی ایجنٹ زیاد کو یقین تھا کہ میخائیل اس کے ساتھ قیام کر سکتا ہے۔ یہ جان کر مجھے کسی قدر سکون سا ہوا۔ اس گھر کی سحر انگیز فضا سے نکل کر جیسے میں پھر زندہ ہو گیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر اپنے دشمنوں کا خیال آ گیا تھا۔

ہوٹل فرنانڈیس پہنچ کر میں نے ڈاکٹر طالب ہی کی حیثیت برقرار رکھی اور اسی نام سے ایک کمرا حاصل کر لیا۔ یہ میں کاؤنٹر ہی پر معلوم کر چکا تھا کہ ماریا کے رقص میں ابھی کافی دیر ہے اور یہ کہ وہ ابھی ہوٹل نہیں پہنچی۔ ابھی مجھے کمرے میں کچھ دیر ہی گزری تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہیں شراب منگوالوں یا ہوٹل کے بار میں جا کر اپنی تشنگی بجھاؤں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ میں خلاف توقع فون کی گھنٹی بجتے ہوئے سن کر چونک اٹھا۔ مجھے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا اور اسی کے ساتھ میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ٹیلی فون ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھا تھا۔ میں نے جھک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ڈاکٹر طالب!" ریسیور اٹھاتے ہی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "آپ سے کوئی صاحب بات کریں گے، بات کیجیے۔" وہ ہوٹل کی ٹیلی فون آپریٹر تھی۔

"ٹھیک ہے، بات کراؤ۔" میں نے جواب دیا۔

"ہیلو!" اس بار دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ اس ایک لفظ کی ادائیگی ہی سے میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ دوسری جانب سے بولنے والا کوئی چینی تھا۔

"جی فرمائیے، میں ڈاکٹر طالب بول رہا ہوں۔" رابطہ ملتے ہی میں نے خالصتاً عربی لب و لہجے میں کہا۔

"تم اب روز بہ روز احمق ہوتے جا رہے ہو ابوالہول!" دوسری طرف سے تضحیک آمیز آواز سنائی دی۔ یہ جملہ ہان زبان یعنی چینی میں ادا کیا گیا تھا، اور دنیا بھر کی کوئی زبان ایسی نہیں تھی جو میرے لیے اجنبی ہو۔ جو کچھ کہا گیا تھا میں بہ خوبی سمجھ چکا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمھارا ایک لفظ بھی نہیں سمجھا۔" میں نے دانستہ دروغ گوئی سے کام لیا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم!" دوسری جانب سے کہا گیا۔ بولنے والا اب بھی ہان زبان استعمال کر رہا تھا۔ اس نے دروغ گوئی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اب وہ کہہ رہا تھا: "تم پہچانے جا چکے ہو ابوالہول! اس لیے بچنے کی کوشش فضول ہے۔"

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے واقعی پہچان لیا گیا تھا ورنہ ابوالہول کے نام سے مخاطب نہ کیا جاتا۔ اب مزید دروغ گوئی لاحاصل تھی۔ پھر میں نے طویل سانس لیا اور بولا: "تو گویا تم لوگ یہاں بھی پہنچ گئے۔" اس بار میں نے بھی ہان زبان ہی بولی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "بولو، کیا چاہتے ہو؟"

"تم اچھی طرح واقف ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تمھیں شاید یہ سن کر خوشی ہو کہ تمھارا ایک بھائی بھی اس دنیا میں موجود ہے جو عمر میں تم سے چھ سال بڑا ہے۔ اس کی عمر سات سال ہے اور وہ ہمارے قبضے میں ہے۔"

اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ یقیناً کوئی چینی ایجنٹ ہی ہو سکتا تھا۔ اس اطلاع نے مجھے چونکا دیا۔ اگر اس نے یہ دعویٰ کیا تھا تو غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً وہ اس دعوے کو ثابت بھی کر سکتا تھا ورنہ یہ دعویٰ نہ کرتا۔ اس کے باوجود میں نے اس سے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا: "تم غالباً یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر میں خود کو چینی حکومت کے حوالے کر دوں تو میرے سات سالہ بھائی کو رہا کر دیا جائے گا؟"

"یقیناً تم ٹھیک سمجھے۔"

"پھر اس کی کیا صورت ہو گی؟" میں نے اسے کریدنے کی خاطر سوال کیا مگر اپنے لہجے سے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ ہونے دیا۔ میرا لہجہ سپاٹ تھا۔

"کل صبح میں اس سلسلے میں تمھیں تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میں نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اب تک یہی ہوتا رہا کہ میں اپنے دشمنوں کے بارے میں باخبر ہونے کے بعد کبھی انھیں قتل کیے بغیر فرار نہیں ہوا تھا۔ اس بار بھی میں نے یہی فیصلہ کیا۔ اب میرے دشمنوں کی تعداد دگنی ہو گئی تھی مگر میں فکرمند نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا تھا کہ تینوں ملکوں کے ایجنٹ میرے پیچھے لگ گئے تھے اور میں نے انھیں بیک وقت یا باری باری ٹھکانے لگا دیا تھا۔ میں اپنی کامیابی کی خاطر دشمنوں کی نظر میں آ جانے کے بعد کبھی نہیں چھپتا تھا تاکہ وہ حملہ کرنے کے لیے سامنے آئیں اور اس طرح میں انھیں ان کے انجام تک پہنچا دوں۔

اب مجھے دوسرے دن کی صبح کا انتظار تھا تاکہ وہ چینی ایجنٹ مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ اس سے گفتگو کرنے کے بعد ہی میں کوئی لائحہ عمل بنانا چاہتا تھا۔ اگر روسی ایجنٹوں سے پہلے چینی ایجنٹوں کو ان کی مدد درکار رہی تھی تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن مجھے اس پر حیرت ضرور تھی کہ انھوں نے مجھے نئے میک اپ اور نئی شخصیت کے باوجود کیسے پہچان لیا؟ میرے ذہن میں یہی سوال گردش کرتا رہا۔ بعد میں اپنے کمرے سے نکل کر ہوٹل کے بار تک پہنچ گیا۔ ابھی ماریا کے رقص میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔ میں اس دوران اپنی تشنگی بجھا سکتا تھا۔ اب مجھے شراب کی طلب کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی۔

چھوٹے سے خوب صورت بار میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں مقامی افراد بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔ میں ایک خالی میز کی طرف بڑھ گیا۔ نصف گھنٹہ بار میں گزارنے کے بعد میں ہوٹل کے بڑے ہال میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک ماریا کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ میخائیل بے سبب ہی اس پر فدا نہیں تھا۔ وہ واقعی انتہائی حسین تھی۔ رقص کے دوران میں اس کا انگ انگ متحرک سا تھا اور بے زبانی کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایک نشے کی لہر تھی جو سارے ہال میں بہہ رہی تھی۔ ماریا جس طرف مڑتی لوگوں کی نظریں بھی اس طرف مڑ جاتیں۔ وہ بت بنے ہوئے ماریا کا رقص دیکھ رہے تھے۔

ماریا کا رقص تھا تو گویا کائنات کی نبض رک گئی تھی۔ لوگ تالیاں بجانا تک بھول گئے تھے۔ انھیں ہوش اس وقت آیا جب ماریا کا تھرکتا ہوا حسین جسم ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر وہ یوں اچانک تالیاں بجانے لگے جیسے اچانک کسی سحر سے آزاد ہو گئے ہوں مگر میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میں رقص کے دوران میں ماریا کا ذہن پڑھتا رہا تھا۔ ماریا کا ذہن پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مقامی روسی ایجنٹ زیاد کا خیال درست تھا۔ میخائیل، ماریا سے ملا تھا اور ماریا حیران تھی کہ وہ پھر لوٹا کیوں نہیں۔ میخائیل، ماریا سے اپنا سامان لانے کے لیے کہہ کر گیا تھا اور پھر پلٹا نہیں تھا۔

ماریا کے رقص سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو ماریا کا ذہن پڑھ کر میخائیل کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا اور وہ مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ نصف گھنٹے میں میری تشنگی ختم نہ ہو سکی تھی اس لیے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے شراب کا آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک ویٹر میرے آرڈر کی تکمیل میں بلیک ڈاگ کی دو بوتلیں لے آیا۔ ابھی میں نے پہلی بوتل میں سے نصف شراب ہی پی تھی کہ خلاف توقع میرا سر بوجھل ہونے لگا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور اسی کے ساتھ مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میری پلکیں خود بہ خود جھکتی جا رہی تھیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرا آخری احساس یہ تھا کہ شراب میں یقیناً کوئی انتہائی تیز قسم کی خواب آور دوا ملائی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام میرے دشمنوں کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے دشمن بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے اور یہ بہر حال خطرناک بات تھی۔

○ ہزاروں قارئین کی دل پسند تحریر
○ بدی کے خلاف جہاد کرنے والوں کی کہانی
ایک خانماں برباد کی داستان مسلسل جس کے دشمن زمین و آسماں تھے
کُندان
تحریر: ایم اے راجہ
زندگی کے نرغے سے فرار ایک نوجوان کی داستان الم جس کے چاروں طرف موت رقصاں تھی۔ ہر طرف خون رنگ آنکھیں لے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زمین اس پر تنگ کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سے پڑنے والی ٹھوکروں نے فولاد بنا دیا۔ پھر اس فولاد کی گونج نے دنیا کی نیند حرام کر دی
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
شائع ہو گیا ہے
قیمت فی حصہ ۴۵ روپے علاوہ محصول ڈاک
گل قریش لائبریری 11- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7229762-7248599

میرا ذہن آہستہ آہستہ گہری غنودگی سے اُبھر رہا تھا مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ چند لمحے گزرتے ہی میرا ذہن گہری غنودگی سے نکل آیا اور اسی کے ساتھ مجھے شدید خطرے کا احساس ہو گیا۔ مجھے شراب میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں دشمنوں کے نرغے میں ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے آنکھیں کھولنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پہلے میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ میرے دشمن کون ہیں اور ان کے ذہنوں میں کیا ہے۔ اس طرح میں اپنے بارے میں ان کے منصوبے سے بھی آگاہ ہو سکتا تھا اور موجودہ صورت حال کا بھی صحیح اندازہ لگا سکتا تھا۔ میرے دشمنوں کا تعلق تینوں بڑی طاقتوں میں سے کسی بھی ملک سے ہو سکتا تھا۔

مجھے بہت جلد علم ہو گیا کہ میں اس وقت ایک چھوٹے سے ہوائی جہاز میں ہوں جو محوِ پرواز ہے۔ میرے علاوہ اس جہاز میں دو افراد اور تھے۔ اس جہاز کی منزل ستارہ تھی لیکن اس جہاز کو ستارہ ایئرپورٹ پر نہیں بلکہ اس کے نواح میں ایک ایسی جگہ اترنا تھا جہاں کسی چھوٹے سے جہاز کو اتارنا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ چھوٹی سی قدیم آبادی ستارہ کا فاصلہ مصر کے دارالحکومت قاہرہ سے تقریباً چالیس میل ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ستارہ میں مصری فراعنہ کے بے قدیم اہرام تھے جو سیاحوں کے لیے کشش کا سبب تھے۔ دنیا بھر سے سیاح آتے رہتے تھے۔ ستارہ میں موجود اہرام کا شمار مصر کے سب سے قدیم آثارِ قدیمہ میں ہوتا ہے۔ ستارہ پہنچنے کے بعد مجھے وہ دونوں افراد حالتِ بے ہوشی ہی میں ایک مقامی ایجنٹ کے سپرد کر دیتے۔ اس کے بعد ان کا کام ختم ہو جاتا۔ ستارہ سے کہاں لے جایا جاتا، اس سلسلے میں مجھے کچھ علم نہ ہو سکا۔ ممکن ہے بارے میں ان دونوں میں سے اس شخص کو کچھ معلوم ہوتا جس کا ذہن پڑھنے میں مجھے کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ جہاز میں موجود دونوں افراد سے میں صرف ایک ہی شخص کا ذہن پڑھنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میں کوشش کے باوجود دوسرے شخص کا ذہن نہ پڑھ سکا تھا۔ اس کے متعلق سب کچھ جان ضرور چکا تھا کہ وہ کون ہے۔ وہ [illegible] انتہائی طاقتور ذہن کا مالک تھا ورنہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا۔ امریکی ایجنٹ مارگریٹ کے بعد یہ دوسرا فرد

جس نے میری ذہنی قوتوں کے آگے سپر نہیں ڈالی تھی۔

ان دونوں میں سے ایک شخص بغداد میں مقامی روسی ایجنٹ زیاد تھا اور دوسرا روسی ایجنٹ میخائیل! زیاد کا ذہن پڑھنے کے بعد ہی مجھے میخائیل اور اس کے منصوبے کا مکمل علم ہو سکا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ سوالات ایسے تھے جن کے جواب مجھے میخائیل ہی سے مل سکتے تھے۔ ان سوالوں میں سے ایک اہم سوال یہ تھا کہ مجھے روس لے جانے کی بجائے مصر کو کیوں لے جایا جا رہا تھا؟ دوسرا سوال یہ کہ کیا ان کی آخری منزل ستارہ ہی تھی یا مجھے وہاں سے بھی کہیں اور لے جایا جاتا؟

زیاد ہی اس جہاز کا پائلٹ تھا۔ زیاد سے میخائیل نے اس وقت رابطہ قائم کیا تھا جب اسے اپنی کامیابی کا یقین ہو چکا تھا۔

مجھے زیرِ دام لانے میں میخائیل کی ذہانت کو تو دخل تھا ہی لیکن اس میں بڑا حصہ اتفاق کا تھا۔ اگر میں میخائیل کی سُن گُن لینے کے لیے ہوٹل فرنانڈلیس کا رُخ نہ کرتا تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوتا۔ میخائیل میری طرف سے چوکنا ہونے کے بعد نہ تو مارلیا سے ملا تھا اور نہ اس نے کسی مقامی روسی ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے کسی مقامی دوست کے یہاں بھی پناہ نہیں لی تھی۔ وہ شاہ رلوہ سیمونیل سے فرار ہونے کے بعد سیدھا ہوٹل فرنانڈلیس پہنچا تھا اور اس وقت سے وہیں قیام پذیر تھا۔ مقامی ایجنٹوں اور سب سے الگ تھلگ رہ کر وہ مجھے سامنے لانے کے لیے کوئی محفوظ منصوبہ بنانا چاہتا تھا۔ اسے اس کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا تھا کہ خود میں ہوٹل فرنانڈلیس پہنچ گیا تھا اور وہاں پہنچتے ہی اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

ہوٹل فرنانڈلیس میں میخائیل اس شب اپنے کمرے سے نکل کر باتھ روم کی طرف جا رہا تھا کہ راہداری میں اسے سامنے سے میں آتا دکھائی دیا۔ وہ میری طرف توجہ دیے بغیر آگے بڑھتا رہا میرے پیچھے ہوٹل کا بیرا تھا جو میری ایپچی اٹھائے ہوئے تھا جس وقت وہ میرے قریب سے گزرا تو خود کو بمشکل چونک اٹھنے سے روک سکا۔ اس نے میرے جسم سے اٹھنے والی مخصوص خوشبو محسوس کر لی تھی۔ اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے تازہ کھلے ہوئے گلابوں کی خوشبو کا جھونکا اس کے قریب سے گزر گیا ہو۔ لمحے بھر کو اس کے تمام اعصاب جھنجھنا اُٹھے تھے۔

ہزاروں قارئین کی دل پسند تحریر
پرچھائیں
تحریر ایم اے راحت
کتابی صورت میں
ایم اے راحت کا ہنگامہ خیز ناول
(زیرِ طبع)
قیمت -/60 علاوہ محصول ڈاک
ڈرافٹ اور منی آرڈر اس پتہ پر روانہ کریں
گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون: 7248599-7229762

میخائیل نے مجھ پر قابو پا لینے کے بعد زیاد کو تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا تھا۔ اگر وہ زیاد کو سب کچھ نہ بتا چکا ہوتا تو میں یہ تفصیلات کبھی نہ جان سکتا۔

ہرچند کہ میخائیل کو یقین سا ہو گیا تھا کہ اس کے قریب سے گزرنے والا میں ہی تھا لیکن وہ کسی بھی امکان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خوشبو جو اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے محسوس کی تھی کسی تیز قسم کے مشرقی عطر کی بھی ہو سکتی تھی۔ دنیا میں صرف میرے ہی جسم سے وہ خوشبو نہیں آتی تھی جس کی اسے جستجو تھی۔ یہ سوچنے کے بعد وہ سیدھا بکنگ کلرک کے پاس پہنچ گیا۔ کلرک سے اسے معلوم ہوا کہ گزشتہ نصف گھنٹے میں صرف دو افراد نے اس ہوٹل میں کمرے حاصل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک پولینڈ کا باشندہ آندریو تھا اور دوسرا ایک عراقی نوجوان نیورو سرجن ڈاکٹر طالب یعنی میں۔ میرے بارے میں کلرک نے بقیہ تفصیلات بھی بتا دیں جو رجسٹر میں درج تھیں کہ میں سرحدی شہر سلیمانیہ سے آیا ہوں اور یہ کہ میرے کمرے کا نمبر کیا ہے۔ ڈاکٹر طالب کے بارے میں یہ جاننے کے بعد کہ وہ بھی نیورو سرجن ہے میخائیل چونک اٹھا۔ اسے فوراً ہی ڈاکٹر حارث کا خیال آ گیا۔

ڈاکٹر حارث بھی تو نیورو سرجن ہی تھا۔ میں نے پہلے بھی ایک نیورو سرجن کی شخصیت اپنائی تھی۔ خوشبو اور نیورو سرجن، یہ دو باتیں میری شخصیت کو مشتبہ بنا دینے کے لیے کافی تھیں لیکن اب بھی میخائیل پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ حقیقتاً ڈاکٹر طالب کے بھیس میں وہی خطرناک ہستی ہے جسے ابوالہول کہا جاتا ہے اس نے ایک چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسی وقت ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا اور ایک ٹیکسی کے ذریعے بغداد ایئرپورٹ پہنچ گیا جو ہوٹل فرنانڈیس سے بمشکل ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ میخائیل نے جو کچھ سوچا تھا ہوٹل میں رہ کر بھی وہ اس پر عمل کر سکتا تھا لیکن اس نے کوئی معمولی سا خطرہ بھی مول لینا مناسب نہ سمجھا۔

میخائیل دنیا کی کئی زبانوں پر مکمل عبور رکھتا تھا۔ چینی زبان میں چینی زبان بھی تھی۔ اس نے اپنی شخصیت کو چھپانے اور مجھے غلط راہ پر ڈالنے کے لیے خود کو چینی ایجنٹ ظاہر کیا تھا۔ اس نے ایئرپورٹ پہنچ کر مجھے جو فون کیا اس کا مقصد صرف میری شخصیت کی تصدیق کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے ایک ہی

تیر سے دو شکار کیے تھے۔ اس طرح ایک طرف تو وہ اس پردے میں رہا تھا، دوسری جانب مجھے اس فریب میں مبتلا کر دیا تھا کہ اب چینی ایجنٹ میرے پیچھے لگ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اب اس کا قیاس یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے میرے بھائی کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی وہ ایک حد تک سچ تھی لیکن میرا سات سالہ بھائی چین نہیں روس کی قید میں تھا۔

فون کر کے میخائیل کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور اب وہ جلد از جلد ہوٹل فرنانڈیس پہنچنا چاہتا تھا تاکہ تیزی سے حرکت میں آ جائے۔ اس کی نظر میں یہ سنہری موقع تھا کیونکہ اس نے مجھے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس موقع سے جتنی جلدی فائدہ اٹھایا جا سکتا بہتر تھا۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے اس کا ذہن ایک منصوبہ تشکیل دے چکا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے سب سے پہلے زیاد اور دیگر دو مقامی ایجنٹوں سے رابطہ قائم کیا اور فون پر انہیں کچھ ضروری ہدایات دیں۔ پھر اس نے فون ہی پر عراقی وزیر دفاع سے بات کی جس سے وہ پہلے ملاقات بھی کر چکا تھا۔ اس نے گزشتہ ملاقات کا حوالہ دے کر وزیر دفاع سے درخواست کی کہ اس کے لیے ایک خصوصی طیارے کا بندوبست کر دیا جائے۔ اسے روسی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے پہچاننے کے بعد وزیر دفاع نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس نے وزیر دفاع سے یہ اجازت بھی لے لی تھی کہ اس طیارے کو اسی کا آدمی اڑائے گا۔ اس کے بعد میخائیل نے فوری طور پر ماسکو سے رابطہ قائم کیا۔ اسے ماسکو سے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ابوالہول کو یعنی مجھے روس لانے کی بجائے مصر لے جائے۔ پھر اس سلسلے میں ہدایت دی گئی کہ مجھے جہاز کے ذریعے پہلے بستارہ لے جانا ہے۔ بستارہ کے بعد میری اگلی منزل کون سی ہوتی، میخائیل نے یہ بات زیاد کو ابھی نہیں بتائی تھی۔

میخائیل نے تیزی سے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ زیاد ایک بہترین پائلٹ بھی تھا۔ اسی لیے اس نے زیاد کو ایئرپورٹ پہنچنے کی تاکید کی۔ زیاد ایئرپورٹ روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں میخائیل نے زیاد کو اپنی گزشتہ کارکردگی اور آئندہ لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا تھا۔ زیاد کے علاوہ دیگر دو مقامی ایجنٹوں کو وہ پہلے ہی ہدایات دے چکا تھا۔ ان دونوں کو فوری طور پر ایک بند وین اور کچھ ضروری سامان لے کر جلد از جلد میخائیل کے پاس پہنچنا تھا۔ اب صرف منصوبے کا آخری مرحلہ باقی تھا اور یہی سب سے مشکل مرحلہ تھا کیونکہ میخائیل مجھے ہوشیار کر چکا تھا۔ اسے صرف ایک اطمینان تھا کہ میں اس سے اور اس کے ارادوں سے قطعی لاعلم ہوں۔

ابھی بمشکل سے نصف گھنٹہ گزرا ہو گا کہ دونوں مقامی ایجنٹ ایک بند وین اور ضروری سامان لے کر ہوٹل پہنچ گئے۔ انھوں نے میخائیل کی ہدایت پر تیزی ہی کا ثبوت دیا تھا۔ ان میں سے ایک کو اس نے نیچے وین میں بالکل تیار بیٹھنے کا حکم دیا اور ایک کو وہیں کمرے میں چوکنا رہنے کے لیے کہا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس کا بٹوا دیناروں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے صرف ایک اطلاع ہر قیمت پر خریدنا تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بروقت ایک اطلاع حاصل کرنے کے لیے سو دینار خرچ کر دیے تھے۔ یہ اطلاع، اطلاع دینے والے کی نظر میں قطعی غیر اہم تھی۔ غالباً اسی لیے اس نے فوراً ہی میخائیل کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی میخائیل کو فون پر وہ اطلاع مل گئی جس کا اسے انتظار تھا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ میں نے شراب طلب کی ہے اور ایک ویٹر مجھے شراب سرو کرنے روانہ ہو چکا ہے۔ ویٹر کو میخائیل کے کمرے کے سامنے سے ہو کر ہی گزرنا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میخائیل کے لیے مشکل نہیں تھا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور راہداری سنسان تھی۔

میخائیل نے ویٹر پر قابو پا لیا اور پھر اسے بے ہوش کر کے اپنے کمرے میں گھسیٹ لے گیا۔ ویٹر کی جگہ مقامی ایجنٹ نے لے لی۔ اس نے ویٹر کا لباس پہن لیا تھا۔ اس دوران میں میخائیل دونوں شراب کی بوتلوں میں ڈھکن کھولے بغیر بے ہوشی کی دوا انجیکٹ کر چکا تھا۔ ویٹر کی بجائے مقامی روسی ایجنٹ نے مجھے شراب سرو کی اور چلا گیا۔

مقامی ایجنٹ مجھے شراب سرو کر کے واپس میخائیل کے کمرے میں پہنچا تو اس نے کمرے میں پھیلا ہوا تمام سامان باندھنا شروع کر دیا۔ اس سے فراغت پا کر میخائیل کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ہوٹل کے واجبات ادا کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کل صبح کمرا چھوڑ دے گا حالانکہ وہ کچھ دیر بعد کمرا چھوڑنے والا تھا۔ میخائیل اچھی طرح جانتا تھا کہ بے ہوشی کی کوئی بھی دوا جو کسی مشروب میں ملا کر دی جائے نصف گھنٹے سے پہلے انسانی جسم پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ جب وہ اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو نصف گھنٹا پورا ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ آدھے گھنٹے سے قبل میرے کمرے کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میخائیل سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس مشن پر اسے ماسکو سے بغداد بھیجا گیا تھا وہ اتنی جلدی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ جس خطرناک ترین شخص نے اب تک تین بڑی طاقتوں کے متعدد ذہین اور بہادر ایجنٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا وہ اب اس کے قبضے میں آنے ہی والا تھا۔ پھر آدھا گھنٹہ پورا ہونے کے بعد ہی میخائیل مقامی ایجنٹ کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکلا۔ اس کے بعد وہ بہ حالت بے ہوشی مجھے میرے کمرے سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ کمرے تک لاتے ہی اس نے مجھے ایک انجکشن دیا۔ یہ بھی بے ہوشی کا انجکشن تھا جس کے زیر اثر کوئی بھی شخص بارہ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتا تھا۔

میرے بارے میں میخائیل کو ماسکو سے جو ہدایات ملی تھیں اسے اچھی طرح یاد تھیں۔ اسے ہر ایک گھنٹہ گزرنے سے پہلے مجھے انجکشن دیتے رہنا تھا۔ یہ ہدایت اسے غیر ضروری احتیاط ہی معلوم ہوئی تھی۔ اس بات کا اظہار اس نے زیادہ سے بھی کیا تھا پھر بھی اس نے پہلا انجکشن لگا ہی دیا تھا۔ اس سے پہلے شراب میں جو دوا دی گئی تھی وہ بھی مجھے کم از کم بارہ گھنٹے بے ہوش رکھنے کے لیے کافی تھی۔ میخائیل کے خیال میں انجکشن دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن احتیاط یہ بہرحال ضروری تھی۔

ہوٹل سے ایئرپورٹ اور پھر خصوصی طیارے تک پہنچنے تک میخائیل نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا تھا۔ وزیر دفاع کے حکم سے ایئرپورٹ پر میخائیل کو روسی نمائندے کی حیثیت سے شناخت کرنے کے بعد طیارہ اس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ خصوصی طیارہ ٹھیک گیارہ بجے شب بغداد ایئرپورٹ سے پرواز کر گیا۔ طیارے میں بہ حیثیت پائلٹ زیاد کے علاوہ میخائیل اور میں ہی تھا۔ مقامی ایجنٹوں کو میخائیل نے بغداد ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ میخائیل کا مشن اب آخری مرحلے میں تھا۔ مجھے ستارہ پہنچانے کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی۔ اب اسے اپنی کامیابی کا سو فی صد یقین تھا۔ جہاز کو بغداد ایئرپورٹ سے پرواز کیے اب تقریباً ایک گھنٹہ ہونے والا تھا اور میں اس کے خیال میں بہ دستور بے ہوش تھا۔ میخائیل نے تھوڑی بہت ضروری طبی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ وہ اس بات سے بہ خوبی واقف تھا کہ اگر آدمی کے جسم میں ضرورت سے زیادہ بے ہوشی کی دوا داخل کر دی جائے تو اس کی زندگی کو خطرہ بھی پیش آسکتا ہے۔ وہ پہلے ہی اپنی دانست میں مجھے ڈبل ڈوز دے چکا تھا۔ مجھے اب گویا چوبیس گھنٹے سے قبل ہوش نہیں آسکتا تھا۔

دس سال پہلے ایک ایسی ہولناک داستان جس کا ایک ایک لفظ ذہن میں اتر جائے
کمند
ایم اے راحت
مکمل کہانی دو جلدوں پر مشتمل کتابی صورت میں دستیاب ہے
ناشر: گل قریش لائبریری 11- محمد روڈ اسلام پورہ لاہور

میخائیل جانتا تھا کہ میں خطرناک ہونے کے باوجود کس قدر قیمتی ہوں۔ اس نے اپنے اس خیال کی تصدیق زیاد سے بھی چاہی کہ مجھے مزید انجکشن نہ لگایا جائے۔ زیاد نے بھی اس کے خیال سے اتفاق کیا اور کہا کہ میری زندگی کو خطرہ پیش نہیں آنا چاہیے۔ یہی سوچ کر میخائیل نے مجھے ہر گھنٹے کے بعد انجکشن لگانے کے پروگرام کو ملتوی کر دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ستارہ کے نواح میں اترنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ مجھے انجکشن لگائے گا۔ میخائیل نے اپنے اس فیصلے سے کچھ دیر پہلے ہی زیاد کو آگاہ کیا تھا۔

ماسکو سے میخائیل کو میرے متعلق جو ہدایات دی گئی تھیں اگر وہ ان پر من وعن عمل کرتا تو اس وقت میرے ہوش میں آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ جس ہدایت کو وہ غیر ضروری احتیاط اور میری زندگی کے لیے خطرہ سمجھا تھا اسی پر عمل درآمد نہ کرنا میخائیل کی موت کا پیغام بن گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس طرح خود میخائیل کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی بلکہ اب میرے ہوش میں آ جانے کے بعد مجھے مزید قید میں رکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اب یہ قطعی ناممکن تھا کہ میرے دشمن مجھے جہاں چاہتے لے جاتے۔

اس بات کا تو مجھے تقریباً الیقین تھا کہ میرے دشمنوں کی منزل ستارہ بہ ہر حال نہیں ہو سکتی وہاں سے وہ مجھے لازماً کہیں اور لے جاتے۔ میرے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ میں فی الحال کوئی ہنگامہ نہ کرتا اور جہاز کے ستارہ پہنچنے تک دم سادھے پڑا رہتا۔ پھر اپنے اس سوال کا جواب معلوم کر لیتا کہ ستارہ سے مجھے کہاں لے جایا جانے والا ہے۔ میخائیل مجھے جس ایجنٹ کے سپرد کرنے والا تھا اسے کم از کم اس سلسلے میں پورا علم ہوتا۔ میں اس کے ذہن کا مطالعہ کر کے سب کچھ معلوم کر لیتا لیکن میرے خیال میں ایسا کرنا فضول ہی ہوتا اور شاید دشواریوں کا سبب بھی!

اس ضمن میں ایک اہم بات مجھے زیاد کا ذہن پڑھ کر اندازہ معلوم ہوئی۔ وہ اہم بات یہ تھی کہ ستارہ کے نواح میں پہنچنے کے بعد طیارہ اتارے جانے سے پہلے ٹرانسمیٹر پر میخائیل کو مقامی روسی ایجنٹ سے رابطہ قائم کر کے یہ بتانا تھا کہ حالات بہ دستور اس کے قابو میں ہیں اور میں بے ہوش ہوں۔ ٹرانسمیٹر پر مقامی ایجنٹ کو میخائیل یقیناً اسی وقت یہ پیغام دیتا جب مجھے انجکشن لگ چکا ہوتا۔ یہ احتیاط غالباً اس لیے برتی گئی تھی کہ اگر حالات میخائیل کے قابو میں نہ رہیں اور کوئی گڑبڑ ہو جائے تو مقامی ایجنٹ وہاں سے فرار ہو جائے اور سامنے نہ آئے تاکہ اس کی زندگی خطرے میں نہ پڑے۔

یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود بھی میں ستارہ پہنچ کر مقامی ایجنٹ کو تلاش کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے اس وقت میخائیل کو راستے سے ہٹانا پڑتا جب وہ میرے انجکشن لگانے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد میں جہاز سے چھلانگ لگا دیتا۔ مقامی ایجنٹ کو اس پاس کے علاقے میں تلاش کرنا میرے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا کیونکہ وہ جہاز میں پیش آنے والے واقعے سے بے خبر ہوتا اور اسی بے خبری میں مارا جاتا۔ مگر اس طرح میں اپنے پیچھے ایک واضح ثبوت چھوڑ دیتا۔ میرے دشمنوں سے یہ بات چھپی نہ رہتی کہ میں ستارہ آیا تھا۔ پھر وہ یہیں سے میری تلاش شروع کر دیتے جو بہرحال مناسب نہ ہوتا۔

یہ بات میرے لیے تجسس کا سبب تو ضرور تھی کہ مجھے روس کی بجائے مصر کیوں لایا گیا ہے لیکن اس تجسس کو رفع کرنے کی خاطر میں اپنے وجود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میرے دشمنوں کی آخری منزل کون سی تھی؟ یہ سوال میری زندگی سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ وہ منزل کوئی بھی اور کہیں بھی ہوتی لیکن یہ بات طے تھی کہ پھر میں کبھی ان کی قید سے آزاد نہ ہو پاتا۔ پھر وہی ہوتا جو وہ چاہتے۔ پھر یہ کہ مجھے ان کی آخری منزل کے بارے میں معلوم بھی ہو جاتا تو میں کیا کر لیتا؟ اس کے بعد بھی میں یہی کرتا کہ خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر دیتا اس وقت تک کے لیے جب تک وہ مجھے دوبارہ نہ ڈھونڈ نکالتے۔ کافی غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے فوراً سرگرم عمل ہو جانا چاہیے۔ دوسرے ہی لمحے میرا وجود نادیدہ ہو چکا تھا۔ پھر بیک وقت کئی باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ میخائیل ایک دم اچھل پڑا اور اسی کے ساتھ وہ لپک کر پائلٹ کے کیبن کی طرف بھاگا، مگر وہ اس سے بے خبر تھا کہ میں اس کے تعاقب میں ہوں۔

"زیاد! جہاز کو نیچے لے جاؤ! جلدی کرو! اور دروازہ بھی فوراً کھول دو!" میخائیل نے پائلٹ کے کیبن میں پہنچتے ہی چیخ کر حکم دیا۔ یہ حکم دیتے ہی میخائیل ایک طرف جھپٹا۔ میں نے دیکھا اس طرف ایک پیراشوٹ نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میخائیل کیا چاہتا ہے۔ میں نے اسی وقت تیزی سے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی، پھر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"خطرہ!" میخائیل چیخ اٹھا۔ وہ اس طرح یقیناً زیاد کو چوکنا کرنا چاہتا تھا جو اس کے حکم کی تعمیل میں جہاز کا دروازہ کھول چکا تھا جس کے سبب تیز ہوا کے جھکڑ کیبن میں داخل ہو رہے تھے۔

"کیا ہوا؟... کیا ہو گیا؟" زیاد گھبرا کر بولا۔

لیکن میخائیل کو میں نے اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ زیاد کے سوال کا جواب دے سکتا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کو دبوچ لیا اور اسے آگے کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں اس کے جسم کو دھکیلتا ہوا جہاز کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میخائیل غالباً میرا ارادہ بھانپ گیا اور اسی کے ساتھ پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ اسے اپنا انجام نظر آ گیا ہو گا۔ میں نے میخائیل کے جسم کو جہاز کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دھکا دیا۔ پھر میں زیاد کی طرف پلٹا لیکن میرا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ میں بے سبب انسانی زندگی کے زیاں کا قائل نہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر پینل پر موجود اس بٹن کو دبا دیا جس سے جہاز کا دروازہ بند کیا جا سکتا تھا۔ میخائیل کو اس طرح دیوانوں کی طرح جہاز سے چھلانگ لگاتے اور بٹن کو خود بخود دبتے دیکھ کر زیاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میرا وجود اب تک نادیدہ ہی تھا۔ جہاز کا دروازہ اب بند ہو چکا تھا۔

اب میری توجہ ایک بار پھر زیاد کے ذہن پر تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق جہاز اس وقت اسکندریہ کی حدود میں داخل ہونے والا تھا۔ میں نے زیاد کے ذہن سے ہر وہ بات کھرچ دی جو مجھ سے تعلق رکھتی تھی۔ پھر میں نے زیاد کو بغداد واپسی کا حکم دیا۔ زیاد کا ذہن پوری طرح میرے قابو میں تھا۔ وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ زیاد نے جہاز کا رخ تبدیل کر دیا اور اسی وقت

میں نے پھر وہ بٹن دبا دیا جس سے جہاز کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ جہاز کا دروازہ کھلتے ہوئے دیکھ کر دیاو حیران اور خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ جہاز اس وقت دوبارہ نیچے جاتے جاتے اٹھنے لگا تھا۔

میں تیزی کے ساتھ جہاز کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور اسی کے ساتھ میرے خیال کی قوت نے میرے اندر پوشیدہ ایک اور حیرت انگیز صلاحیت کو متحرک کر دیا۔ اس کے بعد میں نے جہاز سے چھلانگ لگانے میں دیر نہیں کی۔

میرے اندازے کے مطابق زمین کئی ہزار فٹ نیچے تھی اور میرا نادیدہ وجود ویسے آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا جیسے میرے جسم سے کوئی پیراشوٹ بندھا ہوا ہو حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ قوت بھی میری حیرت انگیز قوتوں میں سے ایک تھی۔ میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا کر بھی بہ سلامت زمین پر اتر سکتا تھا۔

بغداد جانا اب میرے خیال میں فضول ہی تھا کیونکہ میں مینا تیل کو اس کے انجام تک پہنچا چکا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ مینا تیل نے فون پر خود کو چینی ایجنٹ ظاہر کیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ فی الوقت کوئی چینی ایجنٹ میرے پیچھے نہیں لگا ہوا جس سے نمٹنے کے لیے مجھے بغداد کا رخ کرنا پڑتا۔ رہا میرے سات سالہ بھائی کا مسئلہ جو روس کے قبضے میں تھا تو اس سلسلے میں مجھے یقین تھا کہ روسی ایجنٹ ایک بار پھر مجھ سے خود رابطہ قائم کریں گے چاہے میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں۔

صالحہ کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کے لیے میں کچھ دن اپنے دشمنوں کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہندوستان جانے کا تھا جہاں دہلی پہنچ کر میں اپنی ماں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ فی الحال کچھ دن دشمنوں کی نگاہوں سے چھپنے کے لیے میں نے مصر کے دارالحکومت قاہرہ کا انتخاب کیا تھا۔ قاہرہ پہنچنے کے بعد ممکن تھا کہ مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل جاتا کہ میرے دشمن میرے وجود کو ابوالہول کے نام سے کیوں پکارتے ہیں۔ کیا واقعی ابوالہول سے میرا کوئی تعلق ہے؟ میں نے پتھر کے اس مجسمے کو ابھی تک اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی نہیں تھا جسے ابوالہول کہا جاتا تھا شاید اسی لیے مجھے اصل ابوالہول کو قریب سے دیکھنے کی خواہش تھی۔

پھر کچھ دیر بعد میرے پاؤں زمین سے لگے تو میں نے چاروں طرف تاریکی دیکھی۔ یہ تو یقینی تھا کہ وہ مصر ہی کی سرزمین تھی لیکن یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ مصر کا کون سا علاقہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ وہاں سے قریبی آبادی کون سی اور کتنے فاصلے پر تھی۔ میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ یا تو یہ اسکندریہ ہی کی حدود تھیں یا پھر اسکندریہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسکندریہ پہنچتے ہی میں قاہرہ روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ میں چند لمحے تاریکی میں کھڑا رہا اور پھر تاریکیاں میرے لیے روشن ہو گئیں۔ میں اب تاریکی کے باوجود دور دور تک دیکھ سکتا تھا۔ پھر میری ایک اور حیرت انگیز قوت متحرک ہو گئی۔ میری قوتِ بصارت نے فاصلوں کی طنابیں کھینچ لیں۔

مجھے آبادی نظر آ گئی۔ سمندر کے کنارے میری نگاہ سب سے پہلے ایک عظیم الشان قصر پر پڑی۔ اس قصر کی اطراف آبادی بھی تھی۔ اگر یہ اسکندریہ ہی تھا تو پھر اس قصر کا نام راس التین ہونا چاہیے تھا۔ مجھے علم تھا کہ قصر راس التین شاہ فاروق کا محل تھا اور اسی کی مناسبت سے اس علاقے کو قصر راس التین کہا جاتا تھا۔ ان اطراف میں قصر راس التین کے سوا کوئی اور قصر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی میرے قدم تیزی سے قصر کی جانب اٹھنے لگے۔

جس طرح میری قوتِ بصارت نے فاصلوں کی طنابیں کھینچ لی تھیں اسی طرح میرے پیر بھی یہی کام انجام دینے لگے۔ میری رفتار کسی بھی طرح ڈیڑھ سو کلومیٹر فی گھنٹہ سے کم نہیں ہو گی اور میں اس رفتار کو مزید بڑھا سکتا تھا۔ میں تین سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار تک دوڑ سکتا تھا لیکن فی الحال اتنی ہی رفتار کافی تھی۔ اتنا تیز دوڑنے کے باوجود بھی میرا سانس اعتدال پر رہتا تھا اور اسے بھی میں اپنی قوتوں میں سے ایک قوت تصور کرتا تھا۔ پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ مصر کا تاریخی شہر اسکندریہ تھا، قاہرہ کے بعد مصر کا سب سے بڑا شہر!

نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے

نام تھا۔ میں نے اب دوڑنا ترک کر دیا تھا اور آہستہ قدموں سے ایک بار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بار لب سڑک تھا اور اس کے سامنے کئی خالی ٹیکسیاں کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اسکندریہ میرے لیے قطعی اجنبی شہر تھا۔ ایسی صورت میں یہی ممکن تھا کہ میں ایئرپورٹ پہنچنے کے لیے کسی ٹیکسی کا سہارا لیتا۔ مصری کرنسی میرے پاس بالکل نہیں تھی مگر اس سلسلے میں مجھے فکر نہیں تھی۔ میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کیے بغیر بھی ایئرپورٹ تک پہنچ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں ایک ٹیکسی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اونگھتے اونگھتے چونک اٹھا۔ ٹیکسی کے اندر اندھیرا تھا۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا "ایئرپورٹ چلو!"

"دو گنی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ایئرپورٹ تک چلنے کا کرایہ بتایا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میں اس سے یہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جب ٹیکسی میں میٹر موجود ہے تو وہ کرایہ کیوں بتا رہا ہے۔ اس وقت میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اسکندریہ اور قاہرہ میں ٹیکسی ڈرائیور عموماً میٹر سے نہیں چلتے۔ ٹیکسی ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئی۔ ٹیکسی کے اندر اندھیرا تھا اس لیے اس کا ڈرائیور یہ نہ دیکھ سکا کہ ٹیکسی میں ایک نادیدہ وجود سفر کر رہا ہے۔

راستے میں ٹیکسی ڈرائیور کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ٹیکسی کے اندر روشنی کر دی۔ وہ غالباً عقبی آئینے کے ذریعے اپنی ٹیکسی میں سفر کرنے والے کا جائزہ لینا چاہتا ہو گا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر عقبی آئینے کا رخ تبدیل کیا۔ وہ خواہ مخواہ ایک حماقت کا مرتکب ہوا تھا اس لیے اسے اپنی حماقت کا نتیجہ بھگتنا ہی تھا۔ میں نے آئینے میں اس کی دہشت زدہ سی آنکھیں دیکھیں۔ ظاہر ہے کہ ٹیکسی خالی دیکھ کر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا ہو گا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیکسی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اتنا بوکھلا گیا تھا کہ اس نے ٹیکسی کو سڑک کے کنارے بھی کھڑا نہیں کیا تھا۔ اس نے بیچ سڑک پر ٹیکسی روک دی تھی۔ جب ٹیکسی چل رہی تھی تو اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اتنی تیز رفتاری میں چلتی ہوئی ٹیکسی سے کسی کا اتر جانا ٹیکسی ڈرائیور کے خیال میں ناممکن ہی ہو گا۔ ٹیکسی رکنے کے بعد وہ آنکھیں پھاڑے پچھلی نشست کو گھور رہا تھا جہاں میں موجود تھا مگر اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ احمق بے سبب وقت ضائع کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے فوراً ہی اس کے ذہن کو اپنے قابو میں کر لیا اور بولا: "احمقوں کی طرح مجھے کیوں گھورے جا رہے ہو؟ ایئرپورٹ چلو!"

"بہتر ہے جناب!" یہ کہتے ہی وہ مڑا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

پھر جب ٹیکسی ایئرپورٹ پہنچ گئی تو میں نے اسے حکم دیا: "تم یہ واقعہ بالکل بھول جاؤ گے کہ تمہاری ٹیکسی میں کسی نادیدہ وجود نے سفر کیا تھا!"

ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑبڑایا: "مجھے کچھ بھی یاد نہیں!"

میں ٹیکسی سے اتر کر ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ میرے لیے یہی ممکن تھا کہ ایک عام مسافر کی حیثیت سے قاہرہ تک سفر کرتا۔ اس کے علاوہ میں نادیدہ رہ کر بھی قاہرہ پہنچ سکتا تھا۔ میرے چہرے پر اس وقت بھی وہ میک اپ موجود تھا جس میں مجھے میرے دشمنوں نے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ میرا اصل چہرہ بھی ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ صرف میک اپ ختم کرنے سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے نئے میک اپ کی ضرورت تھی لیکن موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں نادیدہ رہ کر ہی قاہرہ تک پہنچتا اور اس وقت تک اپنے وجود کی تجسیم نہ کرتا جب تک نئے میک اپ کا بندوبست نہ ہو جاتا۔ مجھے قاہرہ پہنچ کر بہرحال کوئی نئی شخصیت اپنانا تھی۔

اس وقت ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ صبح پانچ بجے قاہرہ کے لیے ایک فلائٹ روانہ ہو گی۔ گویا مجھے ابھی ڈیڑھ گھنٹا ایئرپورٹ پر مزید گزارنا تھا۔ کچھ اور نہیں تو میں اس دوران میں اپنے لیے مصری کرنسی کا بندوبست تو کر ہی سکتا تھا جس کی مجھے قدم قدم پر ضرورت پڑتی لیکن اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے مجھے کسی کا دل دکھانا مقصود نہیں تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اپنی ضرورت کس طرح پوری کروں کہ میری نگاہ عربی اور انگریزی میں لکھی ہوئی ایک تختی پر پڑی۔ وہ تختی کسٹم کے شعبے کی نشان دہی کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں وہ تختی پڑھتے ہی خیال آیا کہ میری ضرورت کوئی کسٹم افسر بہ آسانی پوری کر سکتا ہے۔ اللہ کے ان "نیک" بندوں کے پاس کافی رقم ایسی ہوتی ہے جو یہ دوسروں کی جیبوں پر ڈاکا ڈال کر حاصل کرتے ہیں۔ پھر اگر ان کی جیب پر ڈاکا ڈال دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سوچ کر میں اس طرف بڑھ گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر مصری تھا جس کے سر پر نہ ہونے کے برابر

بال تھے۔ اس کے چہرے ہی سے عیاری ٹپکتی تھی۔ میں نے اس کی جیب صاف کر دی۔ اس "غریب" کا بٹوا اتنا بھر گیا تھا کہ اس نے بٹوے کے علاوہ اپنے کوٹ کی دونوں جیبوں میں بھی خاصے نوٹ ٹھونس رکھے تھے جو بہت جلد بٹوے سمیت میرے کوٹ کی جیبوں میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ مجھے اس کسٹم آفیسر کو کنگال کرنے پر کوئی دکھ نہیں تھا۔

پھر جیسے تیسے فلائٹ کا وقت ہو ہی گیا۔ میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز میں پہنچ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ جہاز کی تمام نشستیں پُر نہیں تھیں اور مجھے ایک نشست بیٹھنے کو مل گئی۔ میرے برابر والی بقیہ دو نشستوں پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی جوان اور خوب صورت تھی اور چہرے کے نقوش سے عربی النسل معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ جو مرد تھا' وہ عربی نظر نہیں آتا تھا۔ بہ ظاہر وہ دونوں میاں بیوی لگ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے گفتگو کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔ میں ان دونوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ مجھے بہرحال اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی تھا۔ میری سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ اپنے چہرے سے اس میک اَپ کو ختم کر دوں جس میں مجھے میرے دشمن دیکھ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد جب جہاز پرواز کر گیا تو میں نے باتھ روم میں جا کر پہلا کام یہی کیا۔ اب میں اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ میرا اصل چہرہ بھی دشمنوں کا دیکھا بھالا تھا لیکن اس میں تبدیلی کے متعلق بھی میں سوچ چکا تھا۔ جہاز میں میک اَپ کا سامان نہیں تھا مگر اس کے باوجود میں نے اپنا چہرہ اور جسم مناسب حد تک تبدیل کرنے کا حل نکال لیا تھا۔ یہ تبدیلی اس لیے ضروری تھی کہ میں قاہرہ پہنچ کر اپنی اس اصل شکل میں بھی ظاہر نہیں ہونا چاہتا تھا جو میرے دشمنوں کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ مجھے میرے اصل چہرے سے بھی شناخت کر سکتے تھے اور اس میک اَپ میں بھی پہچان لینا مشکل نہیں تھا جسے میں ختم کر چکا تھا۔

پندرہ سال کم نہیں ہوتے۔ پندرہ سال کے دوران آدمی کا چہرہ اور جسم بڑی حد تک تبدیل ہو جاتا ہے اور میں نے اپنی عمر کے کارواں کو پندرہ سال پیچھے لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ وہ حربہ تھا جو پہلے کبھی میں نے اپنی شخصیت کو چھپانے اور اپنے دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ تجربہ میں نے اس لیے کیا کہ ایک بار پہلے بھی

> ایک دانشور حلب کے بازار میں کہہ رہا تھا
> دولت مندو اگر تم میں انصاف اور ہم میں قناعت ہوتی
> تو سوال کا دستور ہی دنیا سے اُٹھ جاتا۔

بغداد کے دوران قیام میں یہ تجربہ کر چکا تھا۔ یہ تجربہ میں نے اس وقت کیا تھا جب ایک امریکن ایجنٹ نے مجھے میری اور میری ماں کی تصویر بھیجی تھی۔ اس تصویر میں میری عمر تقریباً ایک سال تھی اور مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ واقعی وہ میری ہی تصویر تھی۔ میں اس وقت بہ آسانی عمر کی پہلی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے علم ہی تھا کہ میں اپنے کاروانِ عمر کو پہلی منزل سے یعنی عمر کے پہلے سال سے تیسویں سال تک جہاں چاہوں اور جب تک چاہوں ٹھہرا سکتا ہوں لیکن میں اس تجربے سے کچھ خوف زدہ سا تھا۔ اس تجربے سے ایک بار گزرنے کے بعد میرے دل سے تمام شکوک و شبہات نکل چکے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ اس طرح میں اپنے دشمنوں کو کافی عرصے دھوکے میں رکھ سکتا ہوں۔ وہ ایک تیس سالہ شخص کو تلاش کرتے پھرتے' میں عمر کی پندرھویں منزل میں ان کی پہنچ سے دور رہتا۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ احتیاطاً اپنے چہرے پر میک اَپ بھی کر لوں گا تاکہ کسی قسم کا خطرہ ہی نہ رہے' لیکن یہ سب کچھ قاہرہ پہنچ کر ہی ممکن تھا۔ اس کا ایک بڑا سبب میرے جسم پر موجود لباس بھی تھا۔ وہ لباس ایک تیس سالہ شخص کے جسم کے مطابق تھا جو کسی پندرہ سالہ نوجوان کے جسم پر فٹ نہیں آ سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ لباس اور میک اَپ کا بندوبست کرنے سے پہلے اپنے وجود کو ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔

اسکندریہ سے قاہرہ تک کا سفر تقریباً ایک گھنٹے کا تھا۔ جہاز ٹھیک وقت پر قاہرہ پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ مصر کے اس قدیم اور تاریخی شہر قاہرہ کی زمین پر پہلا قدم رکھنے پر میرے احساسات بڑے عجیب سے تھے جنھیں لفظوں میں منتقل کرنا مشکل ہے۔ اس شہر کے ساتھ ماضی میں بڑے اسرار وابستہ رہے تھے اور خود میرا وجود بھی تو ایک اسرار ہی تھا۔ کچھ خوف اور کچھ مسرت کی ملی جلی کیفیت تھی۔ مسرت کا احساس شاید اس لیے تھا کہ میں اپنے دشمنوں کے چنگل سے نکل کر ایک بار پھر ایک اجنبی شہر میں پہنچ گیا تھا۔ تقریباً چار کروڑ آبادی کے اس وسیع و عریض شہر میں میری تلاش دشمنوں کے لیے بہرحال آسان کام نہ ہوتی' وہ بھی

اس صورت میں جب کہ میری عمر بھی انھیں دھوکا دیتی۔ اس بات کا مجھے پورا یقین تھا کہ جلد یا بدیر میرے دشمن اس شہر تک پہنچ جائیں گے کیونکہ ماضی میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ ہاں وہاں پہنچنے کے بعد میری تلاش ان کے لیے ضرور مسئلہ بن جاتی۔

راجپوٹ ایئر کے اس طیارے سے اترنے کے بعد جو مجھے اسکندریہ سے وہاں لے آیا تھا' میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی تھا کہ کہاں جانا چاہیے۔ قاہرہ فی الحال میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ میں ابھی ایئر پورٹ کی عمارت ہی میں تھا۔ قاہرہ کے بارے میں مجھے بنیادی ضروری معلومات درکار تھیں جس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور میں نے وہی طریقہ استعمال کیا۔ میں نے ایئر پورٹ کے عملے ہی میں سے ایک شخص کے ذہن کو ٹٹولا۔ وہ قاہرہ کا قدیم باشندہ تھا اور اس کے آباء واجداد بھی وہیں کے باشندے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی میں قاہرہ کے بارے میں بہت سی ضروری معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ شہر اجنبی ہونے کے باوجود میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

ایئر پورٹ سے نزدیک ترین آبادی ہیلیو پولس کی تھی۔ ایئر پورٹ سے اس کا فاصلہ بہ مشکل ایک میل ہوگا۔ وہ شہر سے متصل اعلیٰ طبقے کی ایک آبادی تھی۔ اسی آبادی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل' ہیلیو پولس شیرٹن تھا۔ یہ ہوٹل یوں تو صرف چار منزلہ تھا مگر بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ ہیلیو پولس پہنچ کر لباس' سکونت اور میک اَپ بھی کا بندوبست ہو سکتا تھا اس لیے میں نے فی الحال ادھر ہی کا رُخ کرنا مناسب سمجھا۔ قیام کے لیے فی الحال میں نے ہوٹل ہی پسند کیا تھا' لیکن یہ قیام بہت مختصر ہوتا۔ اپنی شخصیت کی تبدیلی کے بعد میں وہ ہوٹل فوری طور پر چھوڑ دیتا۔ ابھی صبح کے پونے سات بجے تھے اس لیے میں پیدل ہی ایئر پورٹ سے ہیلیو پولس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس طرح وقت بھی گزر جاتا اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع بھی مل جاتا کیونکہ ابھی بازار کھلنے میں بہرحال دیر تھی۔ نو بجے سے پہلے میں نہ اپنے لیے لباس خرید سکتا تھا نہ میک اَپ کا سامان لے سکتا تھا۔

میں چہل قدمی کرتا ہوا ہیلیو پولس کے علاقے تک تقریباً پون گھنٹے میں پہنچا۔ وہ علاقہ واقعی خوب صورت اور جدید تھا۔ میں نے مزید ایک گھنٹا اس علاقے میں ٹہلتے ہوئے گزار دیا۔ میں اس دوران میں ہوٹل شیرٹن بھی دیکھ چکا تھا۔ نئی شخصیت اپنانے کے لیے میں نے جو لائحہ عمل طے کیا تھا' اسے مدِنظر رکھتے ہوئے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میرا وجود نادیدہ نہ رہتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنے اصل چہرے میں ظاہر ہو جاتا۔ کچھ دیر کے لیے ایسا کرنا میرے نزدیک خطرناک نہیں تھا کیونکہ اس قدر جلد میرے دشمنوں کا اس شہر تک پہنچ جانا قطعی ناممکن تھا۔ میں اسی غرض سے نسبتاً ایک سنسان سی گلی میں نکل آیا تھا تاکہ میرے وجود کی تجسیم کے وقت کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔ میرے وجود کی تجسیم کا عمل لمحوں کا ہوتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس دوران میں کوئی مجھے دیکھ ہی لیتا لیکن احتیاط بہرحال ضروری تھی۔

کچھ دیر بعد جب میں وہ گلی عبور کر کے سڑک پر پہنچا تو میرا وجود نادیدہ نہیں رہا تھا۔ پھر میں نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔ سب سے پہلے میں نے ایک چھوٹی سی چمڑے کی اٹیچی خریدی اور پھر لباس۔ لباس کے بارے میں صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا تھا کہ ایک پندرہ سالہ نوجوان کے جسم پر کس ناپ کے کپڑے آ سکیں گے۔ میں نے اسی لیے فی الحال صرف ایک جوڑے پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد میں نے میک اَپ کا ضروری سامان خریدا۔ پھر پیدل ہی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہوٹل شیرٹن کی دوسری منزل پر مجھے ایک کمرا حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے وہاں خود کو اسکندریہ کا باشندہ ظاہر کیا تھا اور اپنا نام سعد لکھایا تھا۔

میں نے اسی ہوٹل میں ناشتا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ویٹر جب ناشتا لے کر آیا تو اسی کے ساتھ اس دن شائع ہونے والے کئی اخبارات بھی تھے جن میں سے دو اخبار انگریزی زبان کے تھے اور تین عربی زبان کے۔ میرے لیے یہ دونوں ہی زبانیں اجنبی نہیں تھیں۔ میں نے ناشتے کے دوران میں یوں ہی ایک عربی اخبار "الجمہوریہ" کی ورق گردانی شروع کر دی۔ دوسرے ہی صفحے پر میری نظر ایک نمایاں اشتہار پر پڑی اور میں اسے پڑھنے لگا۔ عموماً اس نوعیت کے اشتہارات چھوٹے چھوٹے چھپتے ہیں مگر وہ اشتہار کافی بڑا تھا اور میری توجہ کا سبب یہی تھا۔ اس اشتہار کے ساتھ جو تصویر شائع کی گئی تھی' وہ بھی خاصی بڑی' واضح اور نمایاں تھی۔ عام حالات میں اس قسم کے اشتہارات پر ایک نظر ڈال کر اخبار پڑھنے والا آگے بڑھ جاتا ہے لیکن میں عام حالات میں نہیں تھا۔ وہ اشتہار پڑھتے ہی میرے ذہن میں ایک انوکھے خیال نے جنم لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اشتہار میرے ہی لیے شائع کیا گیا ہے۔ عرصہ بھی کم نہیں تھا۔ اس نوجوان کو گھر سے غائب ہوئے پورے تین ماہ ہو چکے تھے اور اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ اس کی عمر سولہ سال تھی' ذہنی توازن کچھ ٹھیک نہیں

تھا لیکن اس کے چہرے سے پاگل پن کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی تھی تصویر میں وہ وجیہہ اور خوب صورت نظر آرہا تھا۔ اشتہار میں اس کے متعلق پوری تفصیل موجود تھی۔ قد، آنکھوں کی رنگت، جلد کا رنگ اور جس دن وہ گھر سے غائب ہوا تھا، کیا لباس پہنے ہوئے تھا، اس اشتہار میں سبھی کچھ موجود تھا۔ اس نوجوان کو گھر تک پہنچانے والے کے لیے پانچ ہزار گنی کے انعام کا اعلان اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کسی بڑے گھر کا بیٹا ہے۔ اس نوجوان کا نام ہارون اور اس کے باپ کا نام احمد سلمان تھا۔ اشتہار میں اس کا پورا پتا بھی موجود تھا۔

اس نوجوان کو غائب ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے اور اس کا ذہنی توازن بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ میرے خیال میں اس کی واپسی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو کر دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا ورنہ اب تک کوئی نہ کوئی اسے اس کے گھر پہنچا کر پانچ ہزار گنی کا انعام حاصل کر چکا ہوتا۔ وہ اشتہار بھی غالباً اخبار میں پہلی بار شائع نہیں ہوا ہوگا، اس سے پہلے بھی اشتہارات دیے گئے ہوں گے۔ اس اشتہار کو پڑھ کر میرے ذہن میں یہ انوکھا خیال پیدا ہوا کہ میں اس نیم پاگل نوجوان کی شخصیت اپنا لوں۔ اس نوجوان کا کردار میرے لائحہ عمل سے بہت حد تک مطابقت رکھتا تھا۔ پہلی بات تو عمر کی تھی۔ میں نے پہلے پندرہ سال کی عمر کا تعین کیا تھا جس میں ایک سال کا اضافہ کوئی زیادہ فرق نہ ڈالتا۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس کا کردار ادا کرتے ہوئے مجھے کسی بڑی الجھن کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ وہ خود ہی نیم پاگل تھا۔ ایسی صورت میں اگر میں وقتی طور پر کسی کو نہ پہچانتا یا کسی کے ساتھ خلاف توقع سلوک کرتا تو مجھ پر شک نہ کیا جاتا۔ ان باتوں سے قطع نظر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نوجوان کا کردار ادا کرتے ہوئے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ میں کسی کی زندگی تباہ کر کے اس کی شخصیت اپنا لینے کا گنہگار نہ ٹھہرتا۔ میں ان حالات و واقعات کا شکار نہ ہوتا جو مجھے بغداد میں پیش آ چکے تھے۔ ڈاکٹر حارث کا کردار ادا کرتے ہوئے میں جس روحانی کرب سے گزرا تھا، اس کے امکانات بھی نہیں تھے۔

ڈاکٹر حارث کا کردار ادا کرنے سے پہلے مجھے پورے ایک ہفتے تک اس کے ساتھ ساتھ لگا رہنا پڑا تھا لیکن اس معاملے میں نہ ایسا کرنے کی ضرورت تھی اور نہ یہ ممکن تھا۔ ہارون کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ایسی صورت میں اس کے انداز و اطوار اور عادات کا مطالعہ ناممکن تھا۔

ہارون کے متعلق تفصیلات کا علم مجھے اس کے اہل خاندان کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا اور میرے لیے یہ آسان کام تھا۔ اس کردار کی ادائیگی کے لیے میرے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا، ہارون کی آواز۔ اگر میں اس کی آواز سن لیتا تو میرے لیے اس کی آواز کی ہو بہو نقل مشکل نہ ہوتی۔ کچھ دیر سوچ بچار کے بعد آخر میں نے اس مسئلے کا ایک حل ڈھونڈ ہی لیا۔ وقتی طور پر یہ حل کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔

ناشتا کرتے کرتے میرا ذہن اس مسئلے میں الجھ گیا تھا اس لیے میں ٹھیک طرح ناشتا بھی نہ کر پایا۔ ویٹر برتن اٹھا کر لے گیا تو میں پھر اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ہارون کی تصویر رکھی تھی۔ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس چہرے کی معمولی سے معمولی بات کو بھی میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا اور ایک بار پھر اشتہار میں ہارون کا حلیہ غور سے پڑھا تھا۔ پھر کافی دیر بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ اب کچھ دیر کسی بھی قسم کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد میں مسہری کی طرف بڑھا۔ ہر چند کہ میرے لیے وہ تجربہ اب نیا نہیں رہا تھا پھر بھی دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں اپنے جسم پر موجود لباس اتارنے کے بعد مسہری کی پائنتی پر رکھی ہوئی چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میرے ذہن کی قوت متحرک ہو گئی۔ عمر کی سولھویں منزل تک پہنچنے کے بعد میرے لیے میرا چہرہ اور جسم اجنبی ہوتا لیکن اس اجنبیت کے لیے میرا ذہن پہلے ہی سے تیار تھا۔

وہ تجربہ صرف چند لمحوں کا تھا۔ پہلے میرے جسم کے خطوط دھندلے ہوئے، پھر جسم غائب ہو گیا اور اس کی صرف آؤٹ لائن باقی رہ گئی۔ اس کے بعد یہ آؤٹ لائن کچھ مخصوص خطوط میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ دوبارہ تجسیم کا عمل شروع ہو گیا۔ اب مسہری پر ایک تیس سالہ شخص کی بجائے سولہ سالہ نوجوان دراز تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ احساس مجھے پہلی ہی نظر میں ہو گیا کہ اب میرے جسم میں پہلے کی نسبت کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اب میرا جسم نسبتاً چھریرا ہو چکا تھا اور قد بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم کے نچلے حصے پر چادر باندھ لی اور کمرے ہی میں موجود ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ میں اب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ تر و تازہ گلاب ایسا چہرہ، ستواں ناک، نکھری ہوئی سی جلد اور خمار آلود سی بڑی بڑی گہری سبز آنکھیں

دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ ہر چند کہ خود میرا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا مگر یہ بہرحال یہ میرا اپنا چہرہ تھا۔ اجنبیت کے باوجود بھی مجھے اپنا چہرہ کچھ اجنبی نہیں لگا۔

میں کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑا رہا، پھر وہ لباس زیب تن کیا جو اسی دن بازار سے خریدا تھا۔ وہ لباس میرے جسم پر ٹھیک تو نہیں تھا مگر وقتی طور پر اس سے کام نکالا جا سکتا تھا۔ لباس تبدیل کرتے ہی میں میک اپ کرنے بیٹھ گیا۔ میں اپنے چہرے پر ہارون کا میک اپ کر رہا تھا۔ میک اپ پر میں نے تقریباً ایک گھنٹا صرف کیا اور اپنی شکل بالکل اسی تصویر سے ملا دی جو اشتہار میں شائع ہوئی تھی۔ ہارون کی پتلیوں کا رنگ سیاہ تھا، میں نے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مجھ میں اور ہارون کی تصویر میں اب کوئی فرق نہیں تھا۔ میں نے میک اپ سے مطمئن ہو کر جوتے پہنے تو وہ کچھ ڈھیلے تھے۔ انھیں پہن کر چلنے میں مجھے دشواری ہو رہی تھی۔ اب یہی صورت ممکن تھی کہ میں نئے جوتے خرید کر پہنتا۔ ہوٹل سے نکل کر کسی جوتے والے کی دکان تک پہنچنے کے لیے میں نے فیتوں کو کھینچ کر سختی سے باندھ لیا تاکہ جوتے پیروں سے نکل نہ سکیں۔

نئی خریدی ہوئی اچکن اور اپنا پرانا لباس میں وہیں چھوڑ جانا چاہتا تھا اس لیے کہ نئی شخصیت اپنانے کے بعد مجھے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے کسٹم آفیسر کا بٹوا بھی پرانے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا مگر اس میں سے تمام رقم نکال لی۔ اتنی بڑی رقم بھی میرے پاس نہیں ہونا چاہیے تھی مگر جوتا خریدنے کے بعد ہارون کے گھر تک پہنچتے پہنچتے میں یہ رقم ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

جس وقت میں ہوٹل کے کمرے سے نکلا، دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کمرہ مقفل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہوٹل سے نکلنے کے لیے احتیاطاً میں نے عقبی زینوں کا رخ کیا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر جوتوں کی دکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ میں پہلے ہی اس علاقے میں کافی گھوم پھر چکا تھا۔ اگر مجھے پہلے یہ اندازہ ہو جاتا کہ جوتا بھی میرے پیر میں ڈھیلا ہو جائے گا تو وہ بھی اپنے پیر کے ناپ سے ایک آدھ نمبر کم بتا کر خرید لیتا اور یہ دشواری پیش نہ آتی۔

جوتے والے نے میرے پاؤں میں جوتا پہناتے ہوئے کئی بار غور سے میرا چہرہ دیکھا تھا اور میں نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ ہارون کے متعلق اخبار میں شائع ہونے والا اشتہار غالباً اس کی نظر سے بھی گزرا تھا اور وہ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دکان میں اس وقت زیادہ گاہک نہیں تھے۔ کئی سیلز مین خالی بیٹھے تھے۔ مجھے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب ایک سیلز مین دبے پاؤں میرے عقب میں پہنچ گیا۔ میں چونکا تو اس وقت جب اس نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا اور مسرت سے چیخا: "یہی ہے... یہی ہے وہ!... میں نے ابھی اخبار میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔"

دکان میں ہنگامہ سا ہو گیا۔ دکان کے سارے سیلز مین اور وہاں موجود گاہکوں نے مجھے گھیر لیا۔ جہاں یہ بات میرے لیے خوشی کا سبب تھی کہ مجھے ان لوگوں نے مفرور نیم پاگل ہارون سمجھا تھا، وہیں موجودہ صورت حال نے تشویش میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ وہ لوگ میرے متعلق جو تبصرے کر رہے تھے وہ بھی مناسب نہیں تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ مجھے رسیوں سے باندھ دیا جائے تاکہ میں بھاگ نہ سکوں اور کوئی کہہ رہا تھا کہ مجھے اسی طرح دو افراد جکڑے رہیں۔ اب پہلے سیلز مین کی تقلید میں وہ سیلز مین بھی میرے جسم سے چمٹ گیا تھا جو مجھے جوتا پہنا رہا تھا۔ ایک جوتا میرے پاؤں میں تھا اور دوسرا جوتا سیلز مین پہنانے ہی والا تھا کہ یہ افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔

اشتہار میں ہارون کے باپ احمد سلمان کا فون نمبر بھی شائع کیا گیا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ فون کر کے احمد سلمان کو وہیں بلا لیا جائے۔ وہاں موجود دوسرے افراد نے ان کی تائید کی مگر وہ سیلز مین اس تجویز سے متفق نہیں تھا جس نے مجھے پہچانا تھا اور پہچاننے کے بعد مجھ پر پیچھے سے آ کر جھپٹ پڑا تھا۔ "نہیں۔" وہ سیلز مین چیخا۔ "میں اسے باندھنے کے بعد ٹیکسی میں ڈال کر اس کے گھر لے جاؤں گا۔"

"تاکہ تمھیں پانچ ہزار گنی کا انعام مل سکے!" کسی نے اس پر طنز کیا۔

"ہاں بالکل!" وہ سیلز مین بولا۔ "اسے میں نے پہلے پہچانا ہے اور پانچ ہزار گنی پر میرا حق ہے صرف میرا! میں کسی کو ایک پینی بھی نہیں دوں گا۔" وہ سیلز مین یقیناً غریب آدمی ہی تھا۔ اس کے لیے پانچ ہزار گنی کی رقم بہت بڑی تھی۔ اگر اس غریب کو وہ رقم مل جاتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر مجھے پہلے سے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایسی صورت حال پیش آئے گی ورنہ میں اپنے طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق خود کو گونگا ظاہر کرتا۔ میں اگر اس سیلز مین کے توسط سے ہارون کے گھر پہنچتا تو یہ بات کھل جاتی کہ میری قوت گویائی وقتی طور پر کسی

سبب ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ میں اس سیلز مین کے قابو میں نہ آتا۔

یہ سوچتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحے خود کو ان دونوں آدمیوں کی گرفت سے آزاد کرلیا جو مجھے پکڑے ہوئے تھے۔ انھیں غالباً یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں یوں ایک دم ان کی گرفت سے نکل جاؤں گا۔ یہ الگ بات کہ اگر وہ پہلے سے بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوتے تو مجھے اپنے قابو میں نہ رکھ پاتے۔ ان غریبوں کو کیا خبر تھی کہ میں کیا "بلا" ہوں۔

"پکڑو!... پکڑو!" کئی افراد بہ یک وقت چیخ اٹھے۔

مگر اب میں کب ان کے ہتھے چڑھنے والا تھا۔ میں تیزی سے جھکا اور دوسرا جوتا اٹھالیا' پھر ان افراد کے درمیان سے نکل گیا جو مجھے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو افراد اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ڈھیر ہوگئے۔ وہ دونوں میرے بالکل سامنے ہی راستہ روکے کھڑے تھے۔ پھر میں تیر کی طرح دکان سے نکلا اور سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ ایک نیم پاگل نوجوان سے اسی قسم کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں ہارون کا کردار بہت عمدگی سے ادا کررہا تھا۔ وہ لوگ بھلا پانچ ہزار گنی کی رقم کو یوں کس طرح اپنے ہاتھوں سے نکل جانے دیتے: نتیجتاً وہ بھی دکان سے نکل کر میرے پیچھے چیختے ہوئے بھاگے۔ بازار میں ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ ہر طرف سے "پکڑو پکڑو" کا شور بلند ہورہا تھا۔ لوگ شاید مجھے کوئی چور یا اُچکا سمجھ کر میرے پیچھے بھاگ رہے تھے لیکن وہ چیختے ہی رہ گئے اور میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ بھلا میری برق رفتاری کا مقابلہ کیسے کرسکتے تھے۔

اس سڑک پر دوڑتے ہوئے میں ایک گلی میں گھس گیا پھر وہ گلی عبور کرکے ایک اور سڑک پر پہنچ گیا اور وہاں سے دوبارہ ایک گلی میں پہنچ کر میں نے دوسرا جوتا بھی پہن لیا جو اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔ اس گلی سے نکلتے ہی مجھے سامنے ایک ٹرام کھڑی ہوئی نظر آئی۔ میں لپک کر ٹرام کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ ٹرام کہاں جارہی ہے مگر میں اب جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا جہاں مجھے ہارون کی حیثیت سے پہچان لیا گیا تھا۔ یہ خطرہ اب بھی تھا کہ پانچ ہزار گنی کے لالچ میں کہیں کوئی اور میرے گلے نہ پڑ جائے۔ اس لیے میں جلد از جلد اپنی منزل تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

میں نے جلد ہی یہ معلوم کرلیا کہ وہ ٹرام کہاں جارہی ہے اور وہاں سے میری منزل کتنی دور ہے کیونکہ وہ ٹرام میری منزل کی مخالف سمت بھی جاسکتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس ٹرام کا آخری اسٹاپ رَم سیس اسکوائر تھا گویا وہ میری منزل ہی کی جانب جارہی تھی۔ میری منزل اس سے آگے تھی۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا اور اپنا چہرہ مسافروں کی طرف سے پھیر لیا تھا تاکہ کم سے کم افراد کی نظر میرے چہرے پر پڑے۔ میں کھڑکی سے باہر کا نظارہ کررہا تھا۔ اس ٹرام میں چھ ڈبے تھے اور یہ بجلی سے چلتی تھی۔ چھ میں سے چار ڈبے درجہ اوّل کے تھے اور دو ڈبے درجہ دوم کے۔ میں درجہ اوّل کے ایک ڈبے میں بیٹھا تھا جس کی نشستیں آرام دہ تھیں۔ اس قسم کی ٹراموں کو میٹرو کہا جاتا ہے۔ وہ ڈبا صاف ستھرا اور خوب صورت تھا' ایسا جیسے ریل کے درجہ اوّل کا ڈبا! کنڈیکٹر بھی صاف ستھری وردی میں ملبوس تھا۔ وہ ٹرام ہیلیو پولس سے رَم سیس اسکوائر تک ہی جاتی تھی۔ کنڈیکٹر نے رَم سیس اسکوائر تک کا کرایہ پانچ پیاسٹر وصول کیا۔

ہیلیو پولس سے تقریباً دو میل نکل آنے کے بعد قبہ پیلیس کی عظیم الشان عمارت نظر آئی۔ اس عمارت کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو تجسس پیدا ہوا تھا اسے میں نے جلد ہی دور کرلیا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس عمارت کا نام کیا ہے۔ اس عظیم الشان پیلیس میں مختلف سربراہانِ مملکت ٹھہرتے تھے لیکن مصر کے موجودہ سربراہ مملکت کا دفتر یہاں نہیں تھا۔

رَم سیس اسکوائر پہنچنے تک مجھے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور اس میں میری احتیاط کو بہت دخل تھا۔

رَم سیس اسکوائر' ہیلیو پولس سے زیادہ جدید' شاندار اور پُررونق علاقہ تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے پہلی بار اس شہر کی عظمت اور اس کے رومان پرور حسن کا احساس ہوا۔ میں اس وقت رَم سیس چوک میں کھڑا ہوا تھا اور میری چاروں طرف بلند و بالا جدید عمارتیں تھیں۔ عمارتوں کے نیچے خوب صورت بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ایک بہت بڑا مجسمہ تھا جو اس چوک کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا۔ اس مجسمے کی وہاں موجودگی نے قدامت و جدت کا پُرحسین امتزاج پیدا کردیا تھا۔ اس مجسمے کی اطراف دائرے کی شکل میں چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ مجسمے کے قدموں سے ایک فوارہ نکل کر حوض میں گر رہا تھا جس سے ایک ایسی موسیقی جنم لے رہی تھی جسے صرف محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

وہ پُرہیبت مجسمہ کس کا تھا' یہ مجھے کافی دن بعد معلوم ہوا' میں چاہتا تو اسی وقت یہ معلوم کرلیتا مگر اس وقت تو میں نہ جانے کہاں کھوگیا تھا۔ اس مجسمے کے بارے میں دو روایتیں مشہور تھیں۔ ایک روایت یہ تھی کہ وہ مجسمہ فرعونِ موسیٰ کے باپ کا تھا اور دوسری روایت یہ ہے کہ وہ فرعونِ موسیٰ کے بیٹے کا مجسمہ تھا۔ اس مجسمے کا وزن اسّی ٹن تھا اور وہ مصر ہی کے کسی دور دراز علاقے سے لاکر وہاں نصب کیا گیا تھا۔

قاہرہ کے بارے میں جو نئی معلومات میں نے حاصل کیں' ان کے علاوہ بھی اس شہر کے متعلق بہت کچھ میرے علم میں تھا۔ قاہرہ حقیقی معنوں میں شہروں کا شہر ہے۔ تین شہروں کا ایک شہر! اس کے ایک حصے کو جیزا کہا جاتا ہے جس کا تلفظ مصری "گیزا" کرتے ہیں۔ میری موجودہ منزل جیزا ہی تھا۔ مشرق کی طرف رُخ کرنے کی صورت میں جیزا' دریائے نیل کی دائیں جانب ہے۔ اس کا محافظ (گورنر) اور محافظہ (گورنر ہاؤس) بھی الگ ہے اور اس کی انتظامیہ بھی۔ دریائے نیل کے بائیں جانب والے حصے کو قاہرہ کہا جاتا ہے' جدید قاہرہ! اس عظیم شہر کا تیسرا حصہ پُرانا قاہرہ کہلاتا ہے۔ یہ حصہ جدید قاہرہ کے بعد دریائے نیل کی بائیں جانب ہی اہرامِ مصر کے پیچھے آباد ہے۔ پُرانا قاہرہ ہی قدیم مصری تہذیب کا نمائندہ ہے۔

مجھے جیزا میں زمالک پہنچنا تھا۔ یہ علاقہ پہلے صرف قدیم اُمرا کے لیے مخصوص تھا مگر اب یہاں دوسرے طبقوں کے افراد بھی آباد ہوگئے ہیں: اس لیے اس کا شمار اعلیٰ درجے کی آبادیوں میں نہیں ہوتا۔ پہلے یہاں بڑے بڑے ممالک کے سفارت خانے بھی تھے جو اب جیزا ہی کے ایک علاقے دقّی میں منتقل ہوگئے ہیں۔

رَم سیس اسکوائر سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے بہتر صورت یہی تھی کہ میں ٹیکسی کرلیتا۔ ضروری نہیں تھا کہ میں جس ٹیکسی میں بیٹھتا' اس کے ڈرائیور کی نظر سے بھی وہ اشتہار گزر چکا ہوتا جو اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ ہارون کے میک اپ میں اب مزید اِدھر اُدھر گھومنا میرے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا کرسکتا تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں نے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا اور پھر تیزی سے اس کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور بہ غور میرا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ میں نے اسے اپنی منزل کا پتا بتایا اور کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے ہارون کی حیثیت سے پہچانتا ہے یا نہیں' اس کے ذہن کا جائزہ لیا۔ ٹیکسی اس وقت تک اسٹارٹ ہوچکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی نظر سے اس دن کا ایک اخبار "اہرام" گزر چکا تھا اور "اہرام" میں بھی وہ اشتہار شائع ہوا تھا۔ اسے مجھ پر شک تو تھا مگر یہ شک ابھی یقین میں تبدیل نہ ہوسکا تھا۔

میں اب مزید کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا اس لیے ٹیکسی ڈرائیور کے ذہن سے یہ شبہ نکال دیا کہ اس کی ٹیکسی میں مفرور نیم پاگل نوجوان ہارون سفر کررہا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا' کیونکہ وہ ٹیکسی ڈرائیور بہت کمزور ذہن کا مالک تھا۔

زمالک کے علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ میرے ذہن میں ہارون کے گھر کا پورا پتا محفوظ تھا۔ مجھے قدیم طرز کی وہ محل نما عمارت تلاش کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ اس عمارت کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے وقت میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہاں عجیب سی ویرانی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ میں قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔ میری دونوں جانب گھنے پیڑ تھے اور درمیان میں پختہ راستہ تھا جو آگے جاکر دو حصوں میں بٹ گیا تھا' دائیں جانب اور بائیں جانب! میں بڑھتا رہا اور اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے وہ راستہ دو حصوں میں بٹتا تھا۔ بائیں جانب وہ راستہ کچھ فاصلے پر گھوم کر جانے کدھر نکل گیا تھا اور دائیں جانب اس راستے کے اختتام پر سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ میں دائیں جانب مڑ گیا۔

میں سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ سیڑھیوں کے اوپر موجود برآمدے میں سامنے سے ایک نوجوان آتا دکھائی دیا۔ میں اس نوجوان کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ نوجوان بھی مجھے دیکھ کر چونکا تھا اور اپنی جگہ اس طرح ساکت کھڑا رہ گیا تھا جیسے اس نے کوئی ناقابلِ یقین منظر دیکھ لیا ہو۔ پھر وہ ایک دم ہی چیخ اٹھا۔ "ہارون!" اس کے بعد وہ چیختا ہوا ہی اندر کی جانب بھاگا۔ وہ کسی عورت لیلیٰ کا نام لے لے کر اسے پکار رہا تھا۔ "لیلیٰ!... لیلیٰ!... ہارون آگیا... ہارون آگیا!" اس گھر میں میرا استقبال عجیب طرح ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اگلا قدم کیا اٹھانا چاہیے۔ یہ وہی نوجوان تھا جو اسکندریہ سے قاہرہ آتے ہوئے جہاز میں میرا ہم سفر تھا۔ جہاز میں اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی' غالباً لیلیٰ اسی کا نام تھا جسے وہ پکار رہا تھا۔

مجھے ہارون کے اہلِ خاندان کے بارے میں اب تک کچھ علم نہیں

تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ اس نوجوان کا ہارون سے کیا رشتہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ لیلیٰ سے ہارون کا کیا تعلق ہے۔ میں ابھی سیڑھیوں کے نیچے ہی کھڑا ہوا تھا اور کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اسی اثنا میں وہ نوجوان پھر آتا دکھائی دیا مگر اس بار وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ہمراہ وہی لڑکی تھی جسے میں جہاز میں دیکھ چکا تھا۔ وہ دونوں ہی تقریباً دوڑتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر وہ لڑکی جو لیلیٰ ہی ہو سکتی تھی' تیر کی طرح جھپٹتی ہوئی میرے قریب آئی اور پھر مجھے اپنے سینے سے لگا کر سسکیوں کے درمیان وہ کہہ رہی تھی: "ہارون ہا... ہارون اتو... کہاں چلا گیا تھا ہارون؟"

میں کوئی جواب دینے کی بجائے اس کا ذہن پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کا نام لیلیٰ ہی تھا اور وہ ہارون کی بہن تھی۔ ہم دونوں کے قریب جو جوان کھڑا ہوا تھا وہ لیلیٰ کا شوہر تھا۔

"تو... تو کچھ بولتا کیوں نہیں ہارون!" لیلیٰ نے میرے سینے سے الگ ہو کر دونوں شانے پکڑ لیے اور مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں لیلیٰ کی بات کے جواب میں گونگوں کی طرح "آآ" کرنے لگا۔ لیلیٰ مجھے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ میں اس دوران میں یہ بھی معلوم کر چکا تھا کہ اس عمارت کے اندر ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری ہستی بھی موجود ہے۔ وہ تیسری ہستی ہارون کی اور لیلیٰ کی سوتیلی ماں تھی۔ مجھے گونگوں کی طرح "آآ" کرتے دیکھ کر لیلیٰ کی حیرت بے سبب نہیں تھی۔ اس کا نیم پاگل بھائی ہارون گونگا نہیں تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے لیلیٰ کہ کسی ذہنی صدمے نے ہارون کی قوتِ گویائی چھین لی ہے۔" لیلیٰ کے شوہر نے اظہارِ خیال کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ لیلیٰ کی پلکوں کے گوشے بھیگ گئے ہیں۔ کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ کانپے مگر آواز نہ نکل سکی۔

"ہارون کو اندر لیے چلتے ہیں۔" لیلیٰ کے شوہر نے مشورہ دیا۔ "تم ابو کو فون کر کے ہارون کے بارے میں بتا دو۔" یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑا اور بولا: "چلو' اندر چلو ہارون!"

میں خاموشی سے ان دونوں کے ہمراہ ہو لیا۔ چند قدم چل کر ہی بائیں جانب اوپری منزل پر جانے کے لیے زینہ بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے زینے کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ وہ دونوں مجھے عمدہ سامانِ آرائش سے مزین ایک کمرے میں لے گئے۔ وہ کمرا کافی بڑا تھا۔ اس کی چھت بھی قدیم عمارتوں کی طرح کافی اونچی تھی۔ وہاں فون بھی موجود تھا۔ لیلیٰ' فون کی طرف بڑھ گئی اور اس کا شوہر مجھے ساتھ لیے قدیم طرز کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

چند لمحے بعد ہی لیلیٰ' فون پر اپنے والد سے رابطہ قائم کر چکی تھی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی: "ابو... وہ... وہ ہارون... گھر آگیا ہے۔" وہ فون پر بتا رہی تھی: "جی نہیں... وہ خود آگیا ہے... جی... جی ہاں اسے کوئی لے کر نہیں آیا۔ میں... میں سچ کہہ رہی ہوں ابو!... وہ بھی موجود ہیں... نہیں... ابھی... ابھی امی کو اس کے بارے میں نہیں بتایا۔ ٹھیک ہے میں خود جا کر بتلانے دیتی ہوں انھیں... بہتر ہے... تو آپ آ رہے ہیں نا فوراً!... ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور اپنے شوہر سے بولی: "میں اوپر جا رہی ہوں' امی کو بتانے! ابو آ رہے ہیں۔"

"وہ یقیناً ہارون کی آمد پر خوش نہیں ہوں گی۔" لیلیٰ کے شوہر نے کہا۔

"ہاں یہ میں بھی جانتی ہوں شریف!" لیلیٰ نے طویل سانس لی' پھر بولی: "مگر ظاہر ہے کہ انھیں بتانا ہی پڑے گا۔" یہ کہتی ہوئی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں جب سے اس عمارت میں داخل ہوا تھا' وہاں کسی ملازم کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ اس گھر میں کوئی ملازم تھا ہی نہیں۔ اس عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہاں کوئی ملازم نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ بھی مجھے بعد ہی میں معلوم ہوئی۔ ہارون کی سوتیلی ماں ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادی تھی۔ اسے ملازمین پسند نہیں تھے۔ ملازمین نہ رکھنے کا سبب ان کی معاشی حالت ہرگز نہیں تھی۔ ہارون کا باپ احمد سالا چاہتا تو ایک کی بجائے چار ملازم گھر میں رکھ لیتا مگر وہ اپنی بیوی کی وجہ سے مجبور تھا جسے گھر میں ملازمین کا وجود پسند نہیں تھا۔

لیلیٰ چلی گئی تو اس کے شوہر شریف نے مجھ سے بات کرنا چاہی مگر میں جواباً "غوں غاں" ہی کرتا رہا۔ وہ کسی طرح مجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں تین ماہ قبل اچانک گھر چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا اور یہ کہ میں نے وہ تین ماہ کا عرصہ کہاں گزارا؟ جب وہ مجھ سے کچھ پوچھنے میں ناکام رہا تو خاموش بیٹھ گیا۔ یہ وہ لمحات تھے جن میں اس کا ذہن میرے لیے کسی کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا۔ وہ پانچ سال قبل امریکہ سے مصر آیا تھا اور اس نے خود کو یہاں امریکی ہی ظاہر کیا تھا۔ پھر کچھ دن بعد ہی لیلیٰ سے شادی کرنے کے بعد اس نے مصری شہریت اختیار کر لی تھی۔ لیلیٰ کے ایما پر وہ شادی سے پہلے عیسائی سے مسلمان بھی ہو گیا تھا لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی جس نے مجھے اس کا ذہن پڑھنے کے بعد چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہ وہ امریکی باشندہ تھا اور نہ عیسائی جیسا کہ اس نے خود کو ظاہر کیا تھا۔ درحقیقت تھی کہ وہ امریکہ ہی سے مصر آیا تھا لیکن اس کا اصل وطن اسرائیل تھا اور وہ عیسائی نہیں یہودی تھا۔ وہ حقیقتاً مسلمان بھی نہیں ہوا تھا بلکہ اب تک اپنے مذہب پر قائم تھا۔ اس نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنی اصل شخصیت پر پردہ ڈال لیا تھا اور لیلیٰ سے شادی کر لی تھی تاکہ یہ قسم کے شک و شبہ سے بچا رہے۔ وہ پانچ سال سے مسلمان بن کر مصر میں رہ رہا تھا اور اسرائیل کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اسی غرض سے اس نے مصری محکمۂ دفاع میں ملازمت کر لی تھی۔ ان دنوں وہ ایک ماہ کی چھٹی پر تھا۔ بظاہر وہ سیر و تفریح کی غرض سے لیلیٰ کو اسکندریہ لے گیا تھا مگر اس کا اصل مقصد کچھ اور ہی تھا۔ اسکندریہ میں اسے ایک اور اسرائیلی ایجنٹ سے ایک اہم ملاقات کرنا تھی۔ یہ ملاقات مصلحتاً قاہرہ میں ممکن نہیں تھی۔ وہ تو ہر وقت محکمے کے ایک علاقے قصر النیل میں رہتا تھا۔ جب وہ اپنی بیوی لیلیٰ کے ہمراہ اسکندریہ جا رہا تھا تو لیلیٰ کے باپ احمد سلمان نے وہاں سے واپسی کے بعد کچھ دن اس کے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی تھی۔ یہ دعوت اس نے قبول کر لی تھی اسی لیے وہ اسکندریہ سے سیدھا یہیں پہنچا تھا۔

میں ابھی شریف کے ذہن کا مطالعہ ہی کر رہا تھا کہ لیلیٰ کے ساتھ کمرے میں ایک مکروہ و ادھیڑ عمر عورت داخل ہوئی۔ اس کے رخساروں پر دسے ہوئے دو دو رے تھے جس نے اس کی شکل کو کریہہ بنا دیا تھا۔ اس کا جسم متناسب تھا اور رنگ بھی گورا تھا مگر اس کے ... چہرے ہی کی نظر آتی تھی ... اس ادھیڑ عمر عورت کی طرف ... حیران رہ گیا۔ اس عورت کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ... سے بھیگی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں حیرت نہیں بلکہ بے پناہ ... تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے پتھر کا بے جان مجسمہ بن گئی تھی۔ وہ پلکیں تک جھپکانا بھول گئی تھی اور ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی یوں جیسے میں کوئی اجوبہ ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پتلے پتلے سفاک سے ہونٹ لرزنے لگے اور پھر اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی۔

"نہیں... نہیں!" وہ روہانسی سی ہو کر چلائی' پھر میری طرف ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا: "یہ ہارون نہیں ہے' یہ ہارون نہیں ہو سکتا!" پھر وہ ایک دم پلٹی اور "نہیں نہیں" چیختی ہوئی اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگ اٹھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ ادھیڑ عمر عورت کے اس غیر متوقع رویے پر لیلیٰ اور اس کا شوہر دونوں ہی انتہائی حیرت زدہ نظر آ رہے تھے۔ اس ادھیڑ عمر عورت کے رویے نے خود مجھے بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ اس کے ذہن کا مطالعہ کر سکتا۔ اس عورت کے اس رویے کی تہ میں یقیناً کوئی الم ناک کہانی پوشیدہ تھی۔ وہ عورت کمرے سے جا چکی تھی مگر لیلیٰ اور اس کا شوہر دونوں خاموش تھے۔ پھر کچھ دیر بعد لیلیٰ کے شوہر شریف ہی نے اس خاموشی کو توڑا: "لیلیٰ! میں امی کے رویے کو سمجھ نہیں سکا۔"

"انھیں ہارون کی اچانک آمد نے پریشان کر دیا ہے۔" لیلیٰ بولی: "شاید انھیں یہ توقع نہیں ہوگی کہ ہارون اب کبھی گھر لوٹ کر آسکے گا۔ میں نے جب انھیں جا کر یہ بتایا تھا کہ ہارون واپس آگیا ہے تو وہ اچھل پڑی تھیں۔ انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا تھا جیسے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ پھر وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چلی آئی تھیں۔"

"لیلیٰ! تم نے مجھے بچپن سے ہارون کے ساتھ ان کے سلوک کے متعلق جو کچھ بتایا ہے اس کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہارون کا ذہنی توازن بگاڑنے میں امی کا ہاتھ ہے۔"

شریف کی بات سن کر لیلیٰ نے میری طرف نگاہ اٹھائی' پھر معنی خیز انداز میں شریف کی طرف دیکھا' اسی کے ساتھ اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا: "تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہاں ہارون بھی موجود ہے۔ ہمیں اس وقت ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" شریف نے لیلیٰ کی بات سے اتفاق کیا۔ "ہماری اس قسم کی باتیں ہارون کے ذہن کو مزید متاثر کر سکتی ہیں۔"

ان دونوں کی باتیں سن کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماضی میں ہارون کے ساتھ اس ادھیڑ عمر عورت کا رویہ نامناسب ہی رہا ہوگا۔ وہ ہارون کی سوتیلی ماں تھی اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔ پھر کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ میں اس دوران میں شریف کے متعلق سوچتا رہا اور اس کے ذہن کو کریدتا رہا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس بات پر غصہ تھا کہ ایک یہودی جاسوس' بھیڑ کی کھال اوڑھ کر ان لوگوں میں گھس

آیا تھا۔ شاید اس کا سبب وہ عرب خون تھا جو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں اتنا علم تو ہو ہی چکا تھا کہ میں عربی النسل ہوں۔

کچھ دیر بعد شریف کسی ضرورت سے اٹھ کر چلا گیا اور وہاں لیلیٰ تنہا رہ گئی۔ شریف کے کمرے سے نکلتے ہی لیلیٰ میرے پاس آ بیٹھی جو پہلے سامنے والے صوفے پر نیم دراز سی بیٹھی ہوئی تھی۔ لیلیٰ نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ مجھے اس بھولی بھالی اور معصوم سی لڑکی پر بہت رحم آیا جو اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ جسے اس نے دراصل زندگی سمجھ لیا ہے وہ اسے بہت جلد چھوڑ کر چلا جائے گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اتفاق سے میں نے اس کے ساتھ جو مذاق کیا تھا وہ اس سے نا آشنا تھی۔

پھر لیلیٰ نے بھی بہت شوہر کی طرح یہ کوشش کی کہ میں کچھ بولوں۔ "تم... تم پہلے تو ایسے نہیں تھے ہارون!" لیلیٰ کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔ "پہلے تو تم بولتے تھے ہارون! بولتے تھے نا؟"

"آں... آں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور لیلیٰ کا چہرہ یک دم کھل اٹھا۔

"تم ہارون... تم میری بات سمجھ سکتے ہو نا؟" وہ خوش ہو کر بولی۔

میں نے پھر سر ہلایا۔

"کیا اب تم بول نہیں سکتے؟ تمہاری زبان کام نہیں کرتی؟" اس نے محبت بھرے انداز میں پوچھا۔ پھر خود ہی بولی۔ "تھوڑی دیر میں ابھی آئی۔ شاید... شاید وہ کیسٹ اب بھی میرے کمرے میں ہو۔ تمہیں یاد ہے نا عید سے کچھ ہی دن پہلے تمہاری آواز ریکارڈ کی تھی جب تم مجھ سے ملنے آئی تھی۔" پھر لیلیٰ تیزی کے ساتھ صوفے سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی بات بن جائے گی۔ ہارون کی آواز سننے کے بعد مجھے گونگا بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ دیر کے بعد لیلیٰ لوٹ کر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تو یہ رہی وہ کیسٹ۔ جو میں نے ابھی سنائی ہوں تمہیں تمہاری آواز!" لیلیٰ میرے ساتھ بالکل بچوں جیسا سلوک کر رہی تھی۔ اسی وقت شریف بھی کمرے میں دوبارہ آ گیا اور لیلیٰ نے اسے بھی بتایا۔ "میں ہارون کو اس کی آواز سنا رہی ہوں تاکہ اسے یقین آ جائے کہ یہ پہلے خوب بولتا تھا۔"

"ہاں یہ تم نے خوب سوچا۔" شریف نے اس کی تائید میں کہا۔ "حیرت ہے کہ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی۔" یہ کہتا ہوا وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس دوران میں لیلیٰ ٹیپ ریکارڈر آن کر چکی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر سے پہلی آواز لیلیٰ ہی کی سنائی دی۔ "عید مبارک ہارون!" جواباً جو آواز سنائی دی وہ کسی بھی طرح کسی نوجوان کی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ آواز کسی سات آٹھ سالہ بچے کی لگتی تھی جس نے بھی "عید مبارک" کہا تھا۔

"دیکھو... دیکھا ہارون، تم نے سنی اپنی آواز؟" لیلیٰ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ پھر بولی۔ "ابھی اور بھی ہے بہت سی آوازیں ابو کی آواز کے بعد!"

ابھی یہ کہا ہی تھا کہ لیلیٰ کہتی ہی ٹیپ ریکارڈر سے ایک بھاری آواز ابھری۔ "اپنی بچی سے کیا مذاق کر رہی ہیں ابو!" وہی پہلی آواز پھر سنائی دی بچے کی سی آواز جسے لیلیٰ نے ہارون کی آواز بتایا تھا۔ پھر ٹیپ سے قہقہے ابھرے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بھاری آواز لیلیٰ کے باپ احمد سلمان کی ہوگی کیونکہ ہارون نے اس شخص کو ابو کہا تھا۔

قہقہوں کے بعد پھر لیلیٰ کی آواز سنائی دی۔ "تمہیں یاد ہے ہارون، تمہیں اور چڑیا کی وہ کہانی؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مجھے پوری یاد ہے وہ کہانی باجی!" ہارون کی آواز آئی۔

"اچھا تو پھر سناؤ۔" لیلیٰ کی آواز ابھری۔ لیلیٰ کے اصرار پر ہارون نے بالکل بچوں کی طرح وہ کہانی سنانا شروع کر دی۔ پوری توجہ سے ہارون کی آواز کے زیر و بم پر غور کر رہا تھا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہارون کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ وہ جسمانی طور پر تو بالغ ہو گیا تھا مگر اس کا ذہن نابالغ ہی تھا۔ گویا اس کے ذہن کی نشوونما رک گئی تھی۔ اس ٹیپ نے میری ایک بڑی الجھن ختم کر دی تھی۔ اب میں بہ آسانی ہارون کی آواز میں بول سکتا تھا اور اس کا کردار بھی بہ خوبی ادا کر سکتا تھا۔

ٹیپ ختم ہو گیا تو میں بالکل بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگا جیسے مجھے وہ ٹیپ سن کر بہت خوشی ہوئی ہو۔ میں نے ہارون کو ادا کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ لیلیٰ نے میری مسرت کو محسوس کر لیا۔ خود بھی کھل اٹھی۔ وہ بولی۔ "پھر سنو گے؟"

"آں۔" میں نے سر ہلایا۔

اس نے ٹیپ کو الٹا گھمایا اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہی آوازیں دوبارہ سنائی دینے لگیں۔ میرا مقصد دوبارہ اس ٹیپ کو سننے سے صرف یہ تھا کہ اگر پہلی بار کوئی بات میں نے محسوس نہ کی ہو تو دوبارہ اس پر غور کر لوں۔ کسی آواز کی ہو بہو نقل اتارنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایسا کرتے ہوئے لب و لہجے، آواز کے اتار چڑھاؤ، بولنے کے مخصوص انداز اور اس آواز کی نغمگی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں ذرا سی بے احتیاطی سارا راز افشا کر دیتی ہے۔

ابھی ٹیپ ختم نہیں ہوا تھا کہ ہارون کا باپ احمد سلمان کمرے میں داخل ہوا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنے دونوں بازو پھیلائے تیزی سے میری طرف بڑھا۔ "میرے بچے... میرے چاند... میرے..." اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے میرے قریب پہنچتے ہی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ یقیناً اپنے بیٹے ہارون سے بے حد محبت کرتا تھا۔

مجھے ان لوگوں کے معصوم اور بے غرض جذبوں نے بہت متاثر کیا۔ جب احمد سلمان کو اپنی بیٹی لیلیٰ سے یہ معلوم ہوا کہ میری قوتِ گویائی کسی سبب متاثر ہو چکی ہے تو وہ تڑپ اٹھا۔ احمد سلمان نے مجھے اسی وقت اس ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا جو ہارون کا علاج کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے بھی اس کے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔

احمد سلمان میری ناز برداریوں میں اس قدر منہمک تھا کہ وقتی طور پر وہ اپنی بیوی کو بھی بھول گیا۔ پھر جب وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا تو اس نے لیلیٰ سے اپنی بیوی کے بارے میں دریافت کیا۔

"امی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے، وہ اوپر اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔" لیلیٰ نے غالباً مصلحتاً اپنے باپ کو اصل بات سے آگاہ نہیں کیا۔

"ہوا کیا انہیں؟" احمد سلمان نے پوچھا۔ "کیا تم نے انہیں ہارون کی آمد کے بارے میں بتا دیا تھا؟"

"ہاں ابو!" لیلیٰ نے جواب دیا۔

"تو وہ اسے بھی دیکھنے نیچے نہیں آئیں؟" احمد سلمان کے لہجے میں کسی قدر تلخی تھی۔

"وہ آئی تھیں ابو!" لیلیٰ نے بتایا۔ "ہارون سے مل کر ہی وہ دوبارہ اوپر چلی گئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔" احمد سلمان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "میں ہارون کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ تم اس دوران میں اپنی ماں کی خبر گیری کرو۔ اگر ضرورت سمجھو تو فون کر کے ڈاکٹر کو بلا لینا۔ میں واپس آ کر انہیں دیکھوں گا۔"

"کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں ہے۔" شریف پہلی بار بولا۔ وہ کافی دیر سے خاموش تھا۔ اس نے مزید کہا۔ "ہارون کی اچانک آمد کی خوشی کے سبب..."

"آمد کی خوشی!" احمد سلمان شریف کی بات کاٹ کر بڑبڑایا۔ "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ہارون کی آمد پر انہیں کتنی خوشی ہوئی ہو گی۔ خیر... چھوڑو ان باتوں کو۔ تم دونوں ان کے پاس چلے جاؤ۔ ویسے یہ اندازہ مجھے بھی ہے کہ وہ ٹھیک ہی ہوں گی۔ بس ان کا مقصد یہ ہو گا کہ میری تمام تر توجہ ہارون ہی پر مرکوز نہ ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا بازو تھاما اور بولا۔ "چلو بیٹے!"

میں خاموشی سے احمد سلمان کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ اس کی کار عمارت کے باہر سیڑھیوں کے نیچے ہی کھڑی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور مجھے دوسری طرف سے گھوم کر آنے کا اشارہ کیا۔ میں کار کے سامنے سے گزر کر دوسری طرف پہنچا اور احمد سلمان نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں کار میں بیٹھ گیا اور احمد سلمان نے دروازہ بند کر کے اس کا قفل بھی لگا دیا۔

ان باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ہارون ذہنی طور پر نابالغ ہونے کے باوجود جنونی یا خطرناک نہیں تھا۔ وہ اپنے ذہنی بلوغ کے مطابق باتوں کو سمجھ سکتا تھا مگر صرف ایسی باتیں جنہیں کوئی سات آٹھ سالہ بچہ بھی بہ خوبی سمجھ سکتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو احمد سلمان کا رویہ میرے ساتھ کچھ اور ہی ہوتا۔

میں ان تمام باتوں سے پوری طرح مطمئن تھا لیکن ایک بات بہرحال مجھے فکر مند کیے ہوئے تھی۔ میرے وجود سے اٹھنے والی مخصوص خوشبو ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کر دیا جاتا اور اس خوشبو پر میرا کوئی بس بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً وہ خوشبو محسوس کی ہو گی لیکن محسوسات کا عمل کچھ یوں ہے کہ وقتی طور پر آدمی جب جذبات کے بڑے دائروں میں سفر کر رہا ہوتا ہے تو چھوٹے دائرے اس کی نظروں کے احاطے میں ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔ میری اچانک آمد نے ان کے احساسات کو اس قدر بیدار کر دیا تھا کہ وہ کچھ اور ٹھیک طرح محسوس ہی نہ کر پائے تھے۔

ڈاکٹر کے یہاں جاتے ہوئے مجھے اس بات کا موقع مل گیا کہ ہارون اور اس کے خاندان کے متعلق تمام تفصیلات سے آگاہ ہو سکتا

میری نظر میں ہارون کی سوتیلی ماں کا عجیب رویہ بھی تھا جس نے مجھے بہ حیثیت ہارون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ احمد سلمان کے ذہن کا مطالعہ کر کے مجھے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں جن کی روشنی میں بہتر نتائج اخذ کیے جا سکتے تھے۔ میں بعد میں پورے معاملے کو سمجھنے اور اس کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہارون کی سوتیلی ماں کا ذہن بھی پڑھ سکتا تھا لیکن فی الحال احمد سلمان کا ذہن میرے زیرِ مطالعہ تھا۔

احمد سلمان کا تعلق مصر کے قدیم اُمرا کے خاندان سے تھا۔ اس کے باپ کو ورثے میں اپنے اجداد سے بہت کچھ ملا تھا لیکن اپنی زندگی ہی میں اس نے ساری دولت اور جائیداد ٹھکانے لگا دی تھی، سوائے اس حویلی کے جس میں اب بھی احمد سلمان رہتا تھا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد احمد سلمان نے خود اپنی زندگی بنائی تھی۔ رَمسیس اسکوائر میں اس کا ایک بہت بڑا جنرل اسٹور تھا جس کی آمدنی خاصی تھی۔ اس کی پہلی بیوی سے دو بچے تھے لیلیٰ اور ہارون! لیلیٰ ہارون سے چھ سال بڑی تھی۔ جس وقت اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا ہارون کی عمر صرف تین سال تھی۔ اپنی بہن کے انتقال کے بعد لیلیٰ کو اس کی خالہ اپنے گھر لے گئی اور وہیں اس کی پرورش ہوئی۔ لیلیٰ اس وقت نو سال کی تھی۔ لیلیٰ کی جدائی پر تو احمد سلمان کسی طرح راضی ہو گیا مگر اس نے ہارون کی جدائی گوارا نہ کی اور اسے لیلیٰ کے ساتھ نہ جانے دیا۔ پھر اس نے سال بھر بعد ہی دوسری شادی کر لی۔ ابتدا میں تو اس کی ہدایت پر دوسری بیوی نے ہارون کا خیال رکھا مگر کچھ دن ہی میں اس کا رویہ بدل گیا۔ احمد سلمان نے اسے بہت سمجھایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دوسری بیوی سے احمد سلمان کے کوئی اولاد نہ ہو سکی جس نے اسے چڑچڑا بنا دیا۔ نتیجتاً ہارون کے ساتھ اس کا رویہ مزید خراب ہو گیا۔ ماہ و سال یونہی گزرتے رہے۔ اس عورت نے ہارون میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہونے دی۔ "تم ابھی بچّے ہو، بچے ہو!" اس فقرے کی تکرار نے ہارون کے ذہن پر رفتہ رفتہ اثر ڈالنا شروع کیا۔ ماں سے محرومی اور سوتیلی ماں کی نفرت نے آخرکار آٹھ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ذہنی طور پر ہارون کو بالکل ناکارہ بنا دیا اور پھر اس کی ذہنی نشوونما رک گئی۔ احمد سلمان اس زمانے میں اپنا مستقبل بنانے کی جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ جنگ تو اس نے جیت لی لیکن گھر کی طرف سے بے پروائی کے سبب اس نے اپنی متاعِ عزیز کی زندگی کی بہار کو خزاں میں بدل دیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وقت گزر چکا تھا۔ اس نے بہترین معالجوں سے ہارون کا علاج کرایا۔ اس علاج سے یہ تو ہوا کہ ہارون کی بیماری نے طول نہیں پکڑا اور اس کا ذہنی توازن نہیں بگڑا۔ مگر ظاہر ہے کہ دوائیں محبت کا بدل نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا یہ تھا کہ ہارون کو محبت کی ضرورت ہے وہ محبت جو ایک عورت دے سکتی ہے۔ وقت کا سفر جاری رہا اور پھر جب ہارون بڑا ہو گیا اس کی عمر سولہ سال ہو گئی تو ایک دن وہ خاموشی کے ساتھ گھر سے غائب ہو گیا۔ ہارون کی گمشدگی کا شبہ احمد سلمان کو اپنی بیوی پر تھا لیکن یہ شبہ ابھی یقین میں نہیں بدلا تھا۔ اس شبے کی بنیاد وہ نفرت تھی جو اس کی بیوی کو ہارون سے تھی۔

کار فاصلے طے کرتی رہی اور میں احمد سلمان کی محرومیوں کی داستان پڑھتا رہا۔ کار اس وقت دریائے نیل پر بنے ہوئے ایک پل سے گزرنے کے بعد قاہرہ کے ایک جدید ترین علاقے تحریر اسکوائر میں داخل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی کار مصر کے اس عظیم و قدیم میوزیم کے سامنے سے گزری جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہاں اب بھی فراعنۂ مصر کی ممیاں موجود ہیں۔ فرعونِ موسیٰ کی تاریخی ممی بھی اسی میوزیم میں تھی۔ میرے علم میں تھا کہ فراعنہ کے تابوتوں میں اب بھی ہزاروں من سونا موجود ہے۔

میوزیم کے سامنے سے گزر کر کار نے کچھ فاصلہ طے کیا اور پھر ایک بارہ منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ ڈاکٹر رافع کا مطب اس عمارت کی پانچویں منزل پر تھا۔ احمد سلمان مجھے لفٹ کے ذریعے وہاں لے کر پہنچا۔ اس نے اپنا کارڈ ڈاکٹر کے سیکرٹری کو دیا جس نے چپراسی کے ذریعے کارڈ اندر بھیج دیا۔ ڈاکٹر کے کمرے میں اس وقت کوئی مریض موجود تھا، نتیجتاً انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ایک عورت اور مرد کمرے سے باہر نکلے۔ عورت کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہیں ہے۔ وہ ادھر اُدھر دیکھنے کی بجائے خلا میں گھورتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ مرد نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ مرد کا چہرہ کرخت اور سخت گیری کا غماز تھا۔ وہ کسی بھی طرح اس عورت کا جوڑ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ حسین عورت اس بدصورت مرد کی بیوی ہی ہوتی جس کے جبڑے کسی بھیڑیے کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اس عورت کے لیے میں نے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔ اسی عورت پر کیا منحصر اس دنیا میں جانے کتنی چیزیں بے جوڑ ہیں۔ میں نے سوچا اور اسی وقت دروازے پر لگی ہوئی کال بیل گنگنائی۔ چپراسی لپک کر اندر گیا۔ پھر چند لمحے بعد

وہ واپس آیا تو اس نے احمد سلمان کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

"چلو بیٹے!" احمد سلمان نے میرا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ہمراہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر رافع مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ غالباً یہ بات اس کے علم میں بھی تھی کہ احمد سلمان کا بیٹا ہارون گھر سے غائب ہو چکا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کچھ پوچھتا، احمد سلمان نے اسے میری اچانک آمد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا، پھر بولا: "میں ہارون کو فوراً آپ کے پاس اس لیے لایا ہوں ڈاکٹر کہ اس کی قوتِ گویائی نہ جانے کس وجہ سے متاثر ہو گئی ہے۔ یہ اب بات بھی نہیں کرتا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے احمد سلمان کی آواز کسی قدر بھاری ہو گئی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر رافع نے احمد سلمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ قطعی فکرمند نہ ہوں۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "ہارون! ادھر یہاں اس کرسی پر آ کر بیٹھ جاؤ۔"

میں سامنے والی کرسی سے اٹھ کر اس کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا۔

ڈاکٹر رافع میرا معائنہ کرتا رہا۔ اس نے بلڈ پریشر چیک کیا، نبض دیکھی، زبان باہر نکلوا کر زبان کے نیچے موجود غدود کو دیکھا، پھر مجھے کمرے ہی میں ایک جانب میز پر لٹا دیا اور میرے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ہارون! یقین کرو تم سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم اتنے عرصے کہاں اور کیوں غائب رہے۔ بالکل نہ ڈرو تم! بولو تم اسی خوف سے بات نہیں کر رہے نا؟" ڈاکٹر نے میرے نہ بولنے کا جواز خود بہ خود پیش کر دیا تھا اس لیے میں نے فوراً سر ہلا دیا گویا اس نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا قطعی درست تھا۔ "تم بہت اچھے بچے ہو۔" ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔ "اب کے تم آؤ گے تو میں تمہیں ایک نیا کھلونا دوں گا۔"

میں نے اپنے چہرے سے مسرت کا اظہار کیا۔

"سنو! اب میں آہستہ آہستہ تمہارے والد کے سامنے مختلف چیزوں کے نام پوچھوں گا اور تم اٹک اٹک کر ان کے نام بتاؤ گے۔ ٹھیک ہے؟"

میں نے پھر سر ہلایا۔

ڈاکٹر نے مجھے میز سے اٹھایا اور پھر دوبارہ اپنے برابر والی کرسی پر لا بٹھایا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سامنے رکھا ہوا قلم اٹھا لیا۔

"یہ کیا ہے ہارون بیٹے؟ شاباش کوشش کرو بولنے کی!" ڈاکٹر نے کہا۔

"قا... قا... قلم!" میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اٹک کر جواب دیا۔

"بہت عمدہ! تم بہت ہی پیارے بچے ہو۔" ڈاکٹر کھل اٹھا۔ پھر اس نے احمد سلمان کی طرف انگلی اٹھائی: "یہ کون ہیں تمہارے؟"

"اب... اب... ابّو... ابّو جی!" میں احمد سلمان کی طرف دیکھ کر بولا جس کے چہرے سے انتہائی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ابّو جی نہیں ابّو جان! تم انہیں ابّو جان کہتے ہو۔" ڈاکٹر نے تصحیح کی۔

"اب... ابّو... جا... جان!"

پھر ڈاکٹر اس کمرے میں موجود مختلف چیزوں کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں جواب دیتا رہا۔ مجھے ہارون کی آواز کی نقل کرنے میں دقت تو ہو رہی تھی لیکن نقل بہرحال کامیاب ہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دونوں چونکتے ضرور۔

"سلمان صاحب! دو ایک دن کے اندر ہارون بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ یہ بولنے لگا ہے۔" ڈاکٹر نے احمد سلمان سے کہا، پھر مجھ سے بولا: "تم بیٹے باہر جا کر بیٹھو، تمہارے ابّو جان ابھی آتے ہیں۔" میں بغیر کچھ کہے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ڈاکٹر رافع تنہائی میں احمد سلمان کو کیا ہدایت کرے گا۔ یہ میرے ہی حق میں بہتر تھا کہ مجھ سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی جاتی۔

پھر یہی ہوا۔ گھر لوٹتے ہوئے احمد سلمان نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ میں تین مہینے کہاں اور کس حال میں رہا اور یہ کہ گھر سے کیوں غائب ہو گیا تھا۔ وہ رستے بھر اسی طرح میری دلجوئی کرتا رہا جیسے کسی بچے کو بہلایا جاتا ہے۔ گھر پہنچ کر میرا ذہن ایک بار پھر احمد سلمان کی بیوی کے مسئلے میں الجھ گیا۔ اس گھر میں صرف وہی عورت ایسی تھی جس نے مجھے بہ حیثیت ہارون تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا اور اس کی یقیناً کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔

احمد سلمان اب اپنے ہمراہ مجھے اسی کے کمرے میں لے جا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ لیلیٰ بھی تھی جس نے اپنے باپ کو بتایا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں اندر سے کمرا بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔ لیلیٰ نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ دروازہ کھول دے مگر ناکام رہی تھی اور مجبوراً نچلی منزل پر لوٹ آئی تھی۔ اس کا شوہر شریف اب گھر پر نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی دوست

سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہ لیلیٰ سے شام تک لوٹ آنے کے لیے کہہ گیا تھا۔ اوپری منزل کے ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر احمد سلمان رک گیا اور پھر اس نے دروازے پر دستک دی۔

"بھاگ جاؤ!" اندر سے ایک تیز آواز سنائی دی۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دو لیلیٰ! اکیلا چھوڑ دو۔"

"سلوت! دروازہ کھولو، میں ہوں احمد سلمان۔"

"کیا وہ... وہ... وہ ہارون بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

جواب میں احمد سلمان چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا: "نہیں، میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ تم دروازہ کھول دو۔" احمد سلمان نے غالباً مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی دروازے کے پیچھے قدموں کی چاپ ابھری اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے احمد سلمان کے ساتھ دیکھ کر وہ چیخ اٹھی، اسی کے ساتھ اس نے دوبارہ دروازہ بند کر دینا چاہا، لیکن احمد سلمان نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ "کیا پاگل ہو گئی ہو تم؟" احمد سلمان اسے ایک طرف ہٹاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ لیلیٰ بھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئی۔ احمد سلمان نے پھر اپنی بیوی کو مخاطب کیا: "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

وہ ادھیڑ عمر عورت اپنے شوہر کی بات کا جواب دینے کی بجائے دہشت زدہ سی ہو کر مجھے گھورے جا رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ احمد سلمان کے قریب پہنچ گئی اور اس کا ایک بازو مضبوطی سے تھام کر بولی: "سلمان! یہ... یہ... ہارون نہیں ہے۔ یہ ہارون... ہارون نہیں ہو سکتا۔"

احمد سلمان نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا لیا اور سخت لہجے میں بولا: "سلوت! میرے ضبط کا امتحان نہ لو۔ اس کی بجائے کہ ہارون کی آمد پر تم خوشی کا اظہار کرو، ایک اور ہی ڈھونگ رچا رہی ہو۔ تمہیں یہ خیال بھی نہیں کہ تمہارے اس رویے سے ہارون کے ذہن پر کتنا غلط اثر پڑے گا۔"

"میں... میں ڈھونگ رچا رہی ہوں!" وہ ہذیانی انداز میں چیخ اٹھی، پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"لیلیٰ؟" احمد سلمان اپنی بیٹی سے مخاطب ہوا۔ "تمہاری ماں کو واقعی تنہائی کی ضرورت ہے۔ آؤ ہم لوگ نیچے چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر احمد سلمان نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"ٹھہرو، ٹھہر جاؤ سلمان! میں... میں تم سے... تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" احمد سلمان کی ادھیڑ عمر بیوی سلوت اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"کہو۔" احمد سلمان رک کر مڑا۔ اس کے چہرے سے اب بھی غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں... تنہا... تنہائی میں بات کرنا چاہتی... ہوں۔" وہ سسکی۔

وہ تنہائی میں اپنے شوہر سے جو کچھ کہنا چاہتی تھی، مجھے اس کا علم ہو چکا تھا۔ جب سے میں نے اس کمرے میں قدم رکھا تھا، اس عورت کا ذہن میرے زیرِ مطالعہ تھا۔ اس عورت کا اعترافِ جرم میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں میرا اس گھر میں رہنا مشکل کیا ناممکن ہو جاتا اور ظاہر ہے کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" احمد سلمان بولا، پھر اس نے لیلیٰ سے کہا: "تم ہارون کو لے کر نیچے چلی جاؤ، میں ابھی تمہاری ماں سے بات کر کے آتا ہوں۔"

"کیسی بات؟" احمد سلمان کی بیوی حیران سی ہو کر بولی۔ "تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟" اس کا ذہن اب میرے قابو میں تھا۔ وہ میری مرضی کے خلاف اب کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

"تم ہی نے تو ابھی کہا تھا کہ تنہائی میں مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہو۔" احمد سلمان اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔

"یا تو تم پاگل ہو چکی ہو یا پھر مجھے پاگل کر دینا چاہتی ہو۔" احمد سلمان نے جھنجھلا کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہو کیا گیا ہے تمہیں؟"

"مجھے!... کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے! میں تو آج بہت خوش ہوں، بہت!" اور واقعی اس کے چہرے سے مسرت کا اظہار ہونے لگا۔ "آج ہارون گھر لوٹ آیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ میں تو تم سے یہ کہنے والی تھی کہ ہمیں ہارون کی جان کا صدقہ دینا چاہیے!"

احمد سلمان کچھ الجھا الجھا سا دکھائی دینے لگا۔ یہی حال لیلیٰ کا بھی تھا۔ وہ صورتِ حال ہی الجھا دینے والی تھی۔ سلوت کا رویہ ان دونوں ہی کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" احمد سلمان بڑبڑایا، پھر وہ لیلیٰ سے مخاطب ہوا: "لیلیٰ! تم ہارون کو ساتھ لے جاؤ، میں آتا ہوں ابھی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ تنہائی میں اپنی بیوی سے کچھ بات کرنا چاہتا

ہے۔ اپنی بیوی سے بات کر کے غالباً وہ اس کے غیر معمولی رویے کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا چاہتا ہوگا۔ لیلیٰ مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے نچلی منزل پر آ گئی۔ احمد سلمان کو ابھی یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ میرے بارے میں لیلیٰ کو کچھ بتا سکتا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ میری قوتِ گویائی بحال نہیں ہوئی۔ گھر آنے کے بعد مجھے بھی کچھ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

احمد سلمان کی بیوی سلوت اپنے شوہر سے جو کچھ کہنا چاہتی تھی، وہ اب ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس کے ذہن میں اچھی طرح یہ بات بٹھا دی تھی کہ اگر اس نے اعترافِ جرم کر لیا تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا اور وہ پھانسی کے پھندے سے نہ بچ سکے گی۔ میں اس کی طرف سے اسی لیے مطمئن تھا لیکن اس سے انکار ممکن نہیں تھا کہ اس عورت سے بہرحال ایک گناہِ عظیم سرزد ہوا تھا۔ اس نے اپنی زبان سے اعترافِ گناہ نہیں کیا تھا اور میں نے اسے ایسا کرنے سے روک بھی دیا تھا مگر اب ایک عبرت ناک سزا اس کا مقدر بن چکی تھی۔ میں نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا تھا، اس پر اسی دن سے عمل کرنے والا تھا۔

اس دن احمد سلمان اپنی دکان پر نہیں گیا۔ اس نے فون پر اپنے ملازمین کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ تمام دن وہ میری دل جوئی میں لگا رہا۔ اسی دوران میں اس نے لیلیٰ کو ڈاکٹر رافع کی ہدایت سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ مجھ سے گزشتہ تین ماہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے۔ لیلیٰ کا شوہر شریف بھی شام ہوتے ہوتے واپس آ گیا تھا۔ میرے علم میں تھا کہ وہ اپنے کسی دوست سے ملنے نہیں گیا تھا بلکہ تل ابیب سے رابطہ قائم کر کے تازہ ہدایات وصول کرنے گیا تھا۔ یہ بات میں اس کا ذہن پڑھ کر پہلے ہی معلوم کر چکا تھا کہ آج اسے اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب سے رابطہ قائم کرنا ہے۔

اس زمانے میں مصری حکومت کچھ خفیہ دفاعی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اسرائیلی حکومت انہی دفاعی تیاریوں کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتی تھی۔ یہ دفاعی تیاریاں اتنی رازداری کے ساتھ کی جا رہی تھیں کہ اب تک شریف کو ان کی ہوا نہیں لگی تھی۔ مصری حکومت کے اس اقدام کے بارے میں بھی شریف ہی نے اسرائیل کو خبر دی تھی لیکن ان کی تفصیلات نہ بتا سکا تھا۔ اسے اسرائیلی حکومت کی جانب سے آج یہی حکم ملا تھا کہ وہ ہر قیمت پر تفصیلات معلوم کرے اور ان سے جلد از جلد مطلع کرے۔ یہ حکم ملنے سے پہلے ہی شریف ان تفصیلات کی ٹوہ میں لگ چکا تھا لیکن ابھی تک اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی ان معلومات کے حصول کی خاطر کوئی واضح لائحہ عمل بھی ترتیب نہ دے سکا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہتا۔ اسرائیلی حکومت کو ان دفاعی تیاریوں کی تفصیلات کا علم ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ انتہائی خطرناک ہوتا، لیکن میرے باخبر ہونے کے بعد اب یہ خطرہ بڑی حد تک ٹل چکا تھا۔

شریف کے بارے میں ایک قطعی فیصلے تک پہنچنے کی خاطر مجھے لیلیٰ کا ضرور خیال آیا۔ وہ بھولی بھالی معصوم لڑکی اس بات سے ناواقف تھی کہ وہ جسے دل و جان سے چاہتی ہے، اندر سے کیا ہے اور ملک و قوم کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے۔ اس وقت لیلیٰ میرے پاس ہی بیٹھی تھی، اس بات سے قطعی بے خبر کہ میرے دل میں اس کے لیے کیا احساسات ہیں اور میں اس کی خاطر کتنا دکھ محسوس کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ اس کا رویہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنے بھائی ہارون کو بہت چاہتی تھی۔ اسے جب یہ معلوم ہوا تھا کہ میری قوتِ گویائی لوٹ آئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔

رات کا کھانا سبھی نے ساتھ کھایا۔ احمد سلمان کی بیوی سلوت کا رویہ اب بڑی حد تک بدل چکا تھا اور رویے کی اس تبدیلی میں خود میرا ہی ہاتھ تھا لیکن اس کے باوجود وہ کچھ خوفزدہ سی تھی۔

ہارون کا کمرا اوپری منزل پر احمد سلمان کی خواب گاہ کے ساتھ تھا۔ جب احمد سلمان مجھے ڈاکٹر رافع کے پاس لے گیا تھا تو لیلیٰ نے وہ کمرا صاف کر دیا تھا، پھر بھی اس کمرے سے عجیب وحشت سی ٹپکتی تھی۔ احمد سلمان نے اس شب اسی کمرے میں سونے کا فیصلہ کیا۔ وہاں دو مسہریاں پہلے سے موجود تھیں۔ احمد سلمان پہلے بھی کبھی کبھار اپنے بیٹے ہارون کے کمرے میں سوتا رہتا تھا۔ ایسا صرف دو صورتوں میں ہوتا تھا۔ ایک صورت تو یہ کہ اپنی بیوی سلوت سے اس کا جھگڑا ہو جاتا اور اس جھگڑے کا سبب ہارون ہی ہوتا، یا پھر ہارون بضد ہو جاتا کہ وہ اکیلا نہیں سوئے گا۔

احمد سلمان کو اس شب میرے ہی کمرے میں سونا چاہیے، اس کی تائید اس کی بیوی سلوت نے بھی کی تھی۔ اس کی تائید کا سبب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اگر احمد سلمان خود میرے ساتھ سونے کے لیے نہ کہتا تو سلوت خود یہ تجویز پیش کرتی۔

میرے بارے میں کس دل میں کیا احساسات و جذبات تھے اور کس ذہن میں کیا تھا، مجھے بخوبی علم تھا۔

لیلیٰ اور اس کا شوہر شریف نچلی منزل پر اسی کمرے میں سونے چلے گئے جو انھی کے لیے مخصوص رہتا تھا۔ عام دنوں میں وہ کمرا سطوت ہی کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہ دن کا بیشتر وقت وہیں گزارتی تھی۔

پھر سطوت بھی جب اپنی خواب گاہ میں سونے چلی گئی تو احمد سلمان مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے ہارون کے کمرے میں آ گیا۔ وہ مجھے کسی بچے کی طرح سلانے کے لیے میری ہی مسہری پر آ کر لیٹ گیا۔ "بولو ہارون، آج تم کون سی کہانی سنو گے؟" اس نے میرا سر اپنے دائیں بازو پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کہانی سنا کر میں اپنے بستر پر چلا جاؤں گا، پھر تم یہیں میرے ساتھ سونے کی ضد نہ کرنا۔ اس طرح صحت خراب ہو جاتی ہے۔ میں نے تمھیں یہ بات پہلے بھی بتائی تھی نا! ہاں تو بتاؤ کون سی کہانی سناؤں؟"

"بالکل نئی کہانی ابّو جان! جو میں نے پہلے کبھی نہ سنی ہو۔" میں نے بالکل بچوں کی طرح ہارون کی آواز میں جواب دیا۔

اسی وقت احمد سلمان خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "یہ گلابوں کی مہک کہاں سے آ رہی ہے؟"

یہ وہ جملہ تھا جسے سننے کا میں بہت پہلے سے منتظر تھا کیوں کہ احمد سلمان دن بھر میں کئی بار میرے بہت قریب آیا تھا۔ میں نے اس موقع پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی وہ مجھ سے مخاطب نہیں تھا۔

"دن میں بھی بار بار یہ مہک مجھے محسوس ہوئی تھی۔" وہ پھر بڑبڑایا۔ اس بار اس کی آواز مزید دھیمی تھی۔

میں نے اس خوشبو کی طرف سے اس کی توجہ مبذول کرنے کی خاطر ٹھنک کر کہا۔ "سنائیں نا کہانی ابّو جان!"

"ہاں سناتا ہوں، ابھی سناتا ہوں۔" وہ چونک کر بولا۔ اب وہ لمحہ آ گیا تھا کہ احمد سلمان محسوس کر لیتا "وہ خوشبو میرے جسم سے آ رہی ہے۔" ایسی صورت میں وہ نہ جانے کیا کیا سوچتا۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اس کے ذہن سے اس خوشبو کا خیال ہی نکال دوں اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ لمحوں کی بات تھی۔ عراق کے دورانِ قیام میں بھی میں کئی بار ایسا کر چکا تھا مگر صرف انتہائی مجبوری کی صورت میں!

احمد سلمان نے طویل سانس لیا اور ایک بار پھر بڑبڑایا۔ "اب... اب وہ خوشبو نہیں آ رہی۔" پھر غالباً اسے یہ خیال آ گیا کہ اس کی بڑبڑاہٹ میں بھی سن رہا ہوں، اسی خیال سے وہ بہ آوازِ بلند بولا۔ "ہاں بھئی ہارون، تو سنو کہانی۔" اس کا مقصد یہی تھا کہ میری توجہ اس کی بڑبڑاہٹ سے ہٹ کر کہانی کی طرف مبذول ہو جائے۔

"سنائیے ابّو جان!" میں فوراً ہی بول اٹھا۔

احمد سلمان مجھے کہانی سنا رہا تھا اور میرا ذہن اس وقت سطوت کے ذہن کو ٹٹول رہا تھا جو برابر والے کمرے ہی میں موجود تھی۔ وہ سخت مضطرب تھی اور ایک ایک لمحہ گزارنا اسے دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ اس کوٹھی کے باسی سو جائیں، اس کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلنا چاہتی تھی۔ سطوت کو اس کے ارادے سے باز رکھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر کہاں اور کیوں جانا چاہتی تھی، مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ کیا کرنے والی تھی، یہ بھی میرے علم میں تھا مگر جو کچھ ہونے والا تھا اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ اس عورت کی سزا یہی تھی۔

چھوٹی سی نصیحت آموز کہانی تھی جو جلد ہی ختم ہو گئی اور احمد سلمان مجھے سونے کی تلقین کر کے مسہری سے اٹھ گیا۔ اس نے تیز روشنی کا بلب بجھا کر مدھم روشنی والا نیلا بلب جلا دیا اور پھر دوسری مسہری پر دراز ہو گیا۔ سونے سے پہلے اس نے ایک بار مجھے آواز دے کر یہ اطمینان کیا کہ میں سو چکا ہوں یا نہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

سطوت کا ذہنی ہیجان اس وقت تک اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ اسے ابھی مزید کچھ دیر انتظار کرنا تھا۔

اسی طرح نصف گھنٹا گزر گیا۔ پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جس کے لیے سطوت اور میں دونوں ہی منتظر تھے۔ سطوت اب اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میرے خیال کی قوت نے میرا وجود نادیدہ بنا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا، احمد سلمان کی نیند کو میں نے مزید گہرا کر دیا۔ ایسا میں نے احتیاطاً کیا تھا کہ کہیں میری غیر موجودگی میں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مجھے بستر پر نہ پا کر وہ یقیناً بوکھلا جاتا اور پھر مجھے ڈھونڈنے کے لیے وہ بھی کمرے سے نکل جاتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔

احمد سلمان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اطمینان سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اسے دوبارہ بھیڑ کر آگے بڑھ گیا۔ راہ داری میں

کم پاور کا بلب روشن تھا مگر اس کے باوجود کافی فاصلے پر مجھے سطوت نظر آ گئی جس کا رُخ زینے کی طرف تھا۔ وہ کافی تیزی سے قدم اٹھا رہی تھی اور اس کا سبب ہیجان ہی تھا۔ تیز رفتاری کے باوجود راہ داری میں اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے پیروں میں جوتے نہ ہوں، پھر بعد میں یہی بات ٹھیک ثابت ہوئی۔ وہ احتیاطاً اپنے کمرے سے ننگے پاؤں ہی نکلی تھی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا مگر کچھ فاصلہ پھر بھی قائم رکھا۔ وہ اب سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ نچلی منزل پر پہنچ کر وہ مڑی اور کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف جانے لگی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس طرف نسبتاً نیم تاریکی سی تھی۔ کوٹھی کی پچھلی سمت گھنے پیڑوں کے درمیان ایک جانب چھوٹی سی کوٹھری بنی ہوئی تھی جس کی چھت پر ٹین پڑا ہوا تھا۔ وہ کوٹھری غالباً مالی کے لیے بنائی گئی ہو گی۔ اس کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے سطوت بے دھڑک اس میں داخل ہو گئی۔

میں اس کوٹھری میں داخل نہیں ہوا اور باہر ہی کھڑا ہوا سطوت کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کوٹھری میں کیوں گئی ہے۔ کچھ دیر بعد ہی سطوت اس کوٹھری سے نکلی مگر اب وہ خالی ہاتھ نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھاوڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ پھاوڑا ہاتھ میں سنبھالے ہوئے اس کوٹھری کی دائیں جانب گئی اور پھر چند لمحے بعد ہی اس نے پھاوڑے سے زمین کھودنا شروع کر دی۔

سناٹے میں پھاوڑا چلنے کی آواز بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ سطوت کو دیکھ کر اس جسمانی قوت کا اندازہ کرنا مشکل ہی تھا۔ جس کا وہ مظاہرہ کر رہی تھی۔ ایک گھریلو عورت سے یہ توقع کی بھی نہیں جا سکتی کہ اس قدر مشقت کا کام کر سکے۔ میں اس کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا مگر ظاہر ہے کہ وہ مجھے دیکھنے سے قاصر ہی تھی۔ میرا وجود اس کے لیے نادیدہ تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں سطوت کو اس کارِ عبث سے روک دیتا۔ میں آگے بڑھ کر بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔ اتنا کہ اب وہ میرے جسم کی مخصوص مہک کو بھی محسوس کر سکتی تھی۔

"سطوت!" میں نے سرگوشی کی اور پھاوڑا چلاتے چلاتے اس کا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ وہ نیم تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورنے لگی۔ میں نے پھر اس کا نام لیا۔ اس وقت دانستہ میں اپنی اصل آواز میں بول رہا تھا۔ "کک... کون... کون ہے؟... کون ہو تم؟" وہ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے خوف زدہ انداز میں بولی۔ پھاوڑا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"میں تمھارا ضمیر ہوں سطوت!" میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"ضمی... ضمیر..." وہ ہکلائی۔

"ہاں سطوت! میں تمھارا ضمیر ہوں۔" میں نے پھر کہا اور بولا۔ "تم نے زمین کے سینے میں اپنے جس گناہ کو چھپایا تھا، وہ اب یہاں نہیں ہے۔"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سطوت کے پاؤں کانپنے لگے خود کو سنبھالنے کے لیے اس نے کوٹھری کی دیوار کا سہارا لیا اور اسی وقت اس کے ہاتھ سے پھاوڑا بھی چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ "کیا ہوا تمھیں سطوت، تم تو بہت بہادر عورت ہو۔ ہارون کی لاش اس جگہ دفن کرتے ہوئے تو تم ذرا بھی نہیں گھبرائی تھیں۔" میں نے اس کے حواس پر ایک اور ضرب لگائی۔ "سطوت! اس وقت تو تمھارے ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپے تھے جب تم ہارون کا گلا دبا رہی تھیں پھر اب کیوں ڈر رہی ہو! اگر تمھیں مجھ پر یقین نہیں تو اس کی قبر کھود کر لاش دیکھ لو۔ تم اسی لیے تو یہاں آئی تھیں۔"

سطوت کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑی نہ رہ سکی اور اسی جگہ ڈھیر ہو گئی۔ "اٹھو!" میں اس کے اوپر جھکتا ہوا غرایا۔ "اگر تم نہ اٹھیں تو جس طرح تم نے ہارون کا گلا گھونٹ دیا تھا میں بھی تمھارا گلا دبا دوں گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ گئے۔ اپنی گردن پر میری انگلیوں کا لمس محسوس کرتے ہی وہ چیخ اٹھی۔ "نہیں!... نہیں!"

"تو پھر اٹھو!" میں سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔

وہ چند لمحے اسی طرح پڑی رہی اور پھر زمین پر ہاتھ ٹیک کر آہستہ آہستہ اٹھنے لگی۔ "چلو زمین کو پھر اسی طرح ہموار کر دو جس طرح پہلے تھی۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تو میں نے اسے حکم دیا۔

وہ کسی معمول کی طرح میرے حکم کی تعمیل میں پھاوڑا اٹھا کر زمین کی سطح برابر کرنے لگی۔ یوں بھی ابھی وہ زیادہ زمین نہیں کھودنے پائی تھی۔ کچھ دیر ہی میں زمین ہموار ہو گئی۔

"اب اس پھاوڑے کو بھی اسی کوٹھری میں ڈال دو جہاں سے نکالا تھا۔"

میرے دوسرے حکم کی بھی اس نے تعمیل کر دی اور پھر کوٹھری کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت سے آزاد کر دیا اور اسی کے ساتھ اس پر دوبارہ شدید خوف طاری ہو گیا۔ اسی خوف کے ردعمل میں وہ ایک دم چیختی ہوئی اصطبل سے عمارت کی طرف بھاگی جیسے کوئی بلا اس کے تعاقب میں ہو۔ میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اسی لیے لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ "سطوت!" میں نے اس کے ساتھ بھاگتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح مجھ سے یعنی اپنے ضمیر سے فرار حاصل کر لو گی!"

میری آواز سنتے ہی وہ بھاگتے بھاگتے ایک دم لڑکھڑا کر گر پڑی پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کا جسم ہچکیوں کے سبب جھٹکے کھا رہا تھا۔

"سطوت! تمہاری کوکھ سونی تھی تم بنجر تھیں، لیکن ہارون کی محبت سے تم اپنے سینے کا خلا بھر سکتی تھیں۔ بولو تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" میں نے اسے ایک اور کچوکا دیا۔

معاً وہ اپنے چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹا کر کسی شیرنی کی طرح دہاڑی۔ "میں اس سے نفرت کرتی تھی، نفرت! وہ میرا بیٹا نہیں تھا، اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا۔ سن لیا تم نے!" جذبات اور غصے کی شدت میں وہ یہ بھول بیٹھی تھی کہ اس سے ایک نادیدہ وجود مخاطب تھا، مگر چند ہی لمحے بعد اس پر دوبارہ خوف طاری ہو گیا۔

"احمق عورت! یہ اعتراف بھی تو کرو کہ ہارون کو راستے سے ہٹا کر تم احمد سلمان کی دولت کی تنہا وارث بن جانا چاہتی تھیں!" میں نے ایک زخم اور لگایا، وہ زخم جو اس کے جسم پر نہیں روح پر لگا ہو گا۔

وہ تڑپ اٹھی۔ "چپ... چپ ہو جاؤ... خاموش... ہو... ہو جاؤ۔" اس کی آواز میں لرزش اور خوف تھا۔

"مجھے خاموش کر رہی ہو، اپنے ضمیر کو! ضمیر کبھی خاموش نہیں ہوتا بے وقوف اور گنہگار عورت!" میں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ زمین پر جس جگہ پڑی ہوئی تھی وہاں سے نچلی منزل کا برآمدہ زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی برآمدے کے اختتام پر وہ کمرا تھا جس میں لیلیٰ اور اس کا شوہر شریف دونوں محو خواب تھے۔ سطوت کی مزید چیخ پکار انہیں بیدار کر سکتی تھی۔ سطوت کے لیے آج اتنی ہی سزا کافی تھی۔ یہ سوچ کر میں اسے وہیں زمین پر پڑا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر سطوت کے چہرے سے گزشتہ شب کے ہولناک تجربے کا اثر صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک ہی رات میں وہ برسوں کی مریضہ نظر آنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ احمد سلمان نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا اور سطوت کو مخاطب کیا۔

"تمہارے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے تم رات بھر سو نہیں سکیں۔ تمہاری آنکھیں بھی سوجی سوجی سی لگ رہی ہیں۔" پھر اس نے اپنے خیال کی تائید لیلیٰ سے چاہی، جو سطوت کے سامنے اور میرے قریب والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہاں ابو!" لیلیٰ بولی۔ "امی کچھ نڈھال نڈھال سی دکھائی دے رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوا مجھے، کچھ نہیں۔" سطوت اس طرح بولی جیسے لیلیٰ کی بجائے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

ناشتے سے فارغ ہو کر احمد سلمان دکان پر چلا گیا۔ وہ لیلیٰ سے میرا پورا خیال رکھنے کے لیے کہہ گیا تھا۔ احمد سلمان کے جاتے ہی سطوت حسب معمول گھر کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینے میں مصروف ہو گئی۔ لیلیٰ بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ وہ مجھے اپنے شوہر شریف کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ میرے لیے یہ موقع بہت غنیمت تھا کہ میں شریف کا معاملہ نمٹا دیتا۔ اس وقت وہ ایک کرسی پر نیم دراز سگریٹ کے کش پہ کش لیے جا رہا تھا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پوری توجہ سے کسی اہم مسئلے پر غور و خوض کر رہا ہے۔ میں اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ وہ اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی چھٹیاں منسوخ کرا دے۔

'اے خودغرض شخص! کبھی تمہیں یہ خیال بھی آیا، یہ بھی سوچا؟ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر تم نے ایک نیک اور معصوم لڑکی کا مستقبل تباہ کر دیا ہے؟' میرے ذہن نے شریف کے ذہن کو مخاطب کیا۔

وہ چونک پڑا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے در آیا۔ میرا ذہن پھر نشتر زنی کرنے لگا۔ 'سوچو کہ جب تم اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جاؤ گے تو لیلیٰ کے دل پر کیا گزرے گی؟'

وہ ایک دم کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"تم اپنی قوم کی بقا کے لیے دوسری قوم کے سینے میں خنجر کی طرح گڑے ہوئے ہو۔ تم مجسم ہلاکت ہو، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی! کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا؟ یا صرف یہی سوچتے رہ گئے کہ مصر کی دفاعی تیاریوں کی تفصیل کیسے معلوم ہو!"

اس بار شریف اضطراب کے عالم میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے سراسیمگی اور خوف نمایاں تھا، ماتھے پر پسینے کے قطرات چمکنے لگے تھے حالانکہ موسم خوش گوار تھا۔ ہاں شریف کے اندر کا موسم ضرور بدل گیا تھا۔ کمرے میں اس کے علاوہ صرف میں تھا۔ کرسی سے اٹھنے کے بعد اس نے میری طرف نگاہ ڈالی، پھر سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دی۔ اپنی بے چینی کا سبب جان لینا اس کے لیے ناممکن ہی تھا۔ اسی ذہنی بے چینی کے نتیجے میں وہ ٹہلنے لگا۔

میرے لیے اسے ہلاک کر دینا بھی ممکن تھا اور ذہنی طور پر قطعی ناکارہ بنا دینا بھی! تاکہ وہ اسرائیل کے لیے کسی کام کا نہ رہتا۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ اس کے ذہن سے اسرائیل کی وفاداری کے نقوش ہی قطعی طور پر مٹا دیے جاتے۔ یہ یقیناً بہتر صورت ہوتی، اس طرح لیلیٰ کے دل کو ٹھیس نہ پہنچتی مگر اپنے ملک و قوم سے غداری کی صورت میں اسے زندہ نہ چھوڑا جاتا۔ یوں بھی وہ سخت ترین سزا کا مستحق تھا۔ اس نے ایک نیک دل لڑکی کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا، وہ ایک ملک کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کا سزاوار تھا۔ وہ گنہگار تھا، مجرم تھا اور اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ اس انسانیت دشمن کی کم سے کم سزا موت تھی اور یہ سزا اسے انہی لوگوں کے ہاتھوں ملنا چاہیے تھی جن کے درمیان رہ کر اس نے خیانت کی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان لوگوں کے روبرو اعتراف جرم کر لیتا اور اپنے ان ساتھیوں کی بھی نشان دہی کر دیتا جو اس سازش میں اس کے شریک تھے۔

عموماً غیر ملکی ایجنٹ اعتراف جرم کی نوبت آنے سے پہلے یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر انہیں زبان کھولنے سے پہلے قتل کر دیا جاتا ہے، لیکن اس معاملے میں میری مداخلت کے بعد یہ امکان نہیں رہا تھا۔ نہ تو شریف اعتراف جرم سے پہلے خودکشی کرتا اور نہ ہی اس کے ارادوں سے اس کا کوئی ساتھی باخبر ہوتا جو قتل کی نوبت آتی۔ شریف کے ذہن کو میں نے پوری طرح اپنے تابع کر لیا تھا۔ اب اس کا ہر عمل میری مرضی پر منحصر تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں نے شریف کے ذہن کو احکام دینا شروع کر دیے۔ ان احکام کے بارے میں پہلے ہی میں سب کچھ سوچ چکا تھا۔ شریف کو وزارت دفاع کے اعلیٰ حکام کے روبرو پیش ہو کر اپنے جرم کا اعتراف کرنا تھا اور اسی کے ساتھ اپنے خلاف وہ تمام تحریری ثبوت بھی پیش کرنا تھے جو اس کی تحویل میں تھے۔

جانے سے قبل میں چاہتا تھا کہ لیلیٰ آخری بار شریف سے ضرور مل لے اسی لیے میں نے شریف کو فوری طور پر جانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس لڑکی نے بہرحال شریف کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول کیا تھا، ان رفاقتوں کے بھی کچھ تقاضے تھے۔ یوں اس کا شوہر اس سے بغیر ملے اور بظاہر بغیر کسی سبب ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلا جاتا یہ کچھ مناسب نہ ہوتا۔ شریف کے ذہن کو احکام دیتے ہوئے میں نے ان تمام باتوں کا خیال رکھا تھا اور اس کے علاوہ لیلیٰ کے لیے بھی کچھ فیصلہ کیا تھا۔

ہر چند کہ اس کوٹھی میں مستقل طور پر سکونت رکھنے والے افراد صرف تین تھے، احمد سلمان، ہارون اور سطوت! مگر کوٹھی کی نگہداشت بھی اور اس کی صفائی کا خیال رکھنا بھی بہرحال ایک کام تھا۔ اس کے علاوہ ملازمین نہ رکھے جانے کے سبب گھر کے دوسرے کام کاج بھی سطوت ہی کرتی تھی۔ سطوت غالباً دن بھر خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھ کر اپنی تنہائیوں اور محرومیوں کو بھول جانے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کے سوا ملازمین نہ رکھنے کا بظاہر کوئی اور سبب نظر نہیں آتا تھا۔ احمد سلمان صبح اٹھتے ہی خود گھر کا ضروری سامان لاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ دکان ہی پر ایک ملازم سے منگوا لیتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ دکان سے بھیجے جانے والے ملازم کو وقت پر کھانا نہ ملے۔ سطوت نے گھر کے کام کاج میں جینے کا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا۔ نچلی اور اوپری منزل کی صفائی ہی میں اس کا خاصا وقت صرف ہو جاتا تھا۔ ہاں جب لیلیٰ آ جاتی تھی تو اس کا کام جلدی نمٹ جاتا تھا۔ یہ بات لیلیٰ کے علم میں بھی تھی کہ اس کی آمد سطوت کو پسند نہیں تھی۔ اسی لیے وہ کئی کئی مہینے بعد ادھر کا رخ کرتی تھی۔ یہاں آنے کی بجائے وہ اپنی خالہ کے گھر کا رخ کرتی تھی۔ خالہ کے روپ میں اسے اپنی ماں کی محبت کا پرتو نظر آتا تھا لیکن وہ باپ کی محبت کو اپنے دل سے کس طرح نکال پھینکتی! یہ جاننے کے باوجود بھی کہ اس کی سوتیلی ماں اسے ناپسند کرتی ہے، وہ وہاں آنے پر مجبور تھی اور یہ مجبوری اس رشتے کی مجبوری تھی جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے باپ کے گھر آنے کے بعد کام کاج میں بھی اس کی مداخلت سطوت کو گراں گزرتی تھی۔ اس طرح کام جلدی نمٹ جاتے تھے اور سطوت کاموں کو جلدی نمٹانا نہیں چاہتی تھی۔ اس دن بھی لیلیٰ

کی ضد پر بہ مجبوری سطوت نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن حسب معمول وہ اس پر کچھ خوش نہیں تھی۔ اس گھر میں جتنے بھی افراد تھے ان کے ذہنوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے سب اگلی پچھلی باتوں کا علم ہو چکا تھا۔ وہ لوگ کن حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے معمولات کیا تھے اور ایک دوسرے سے ان کا رویہ کیا تھا۔ یہ سب کچھ جاننا میرے لیے ضروری تھا کیونکہ اب میں بھی اسی گھر کا ایک فرد بن چکا تھا۔

گھر کی صفائی کے بعد اور سطوت کے ساتھ باورچی خانے میں جانے سے پہلے لیلیٰ نے ایک چکر نچلی منزل کا لگانا مناسب سمجھا۔ اسے اپنے شوہر کا اور میرا، دونوں ہی کا خیال رہا ہوگا مگر پہلے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا جسے وہ اوپری منزل کے کسی کمرے سے اٹھا لائی تھی۔ وہ کھلونا ایک جہاز تھا جو چابی بھرنے سے چلتا تھا۔ اس نے میرے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اس کھلونے میں چابی بھری اور پھر اسے کمرے کے فرش پر چھوڑ دیا۔ کھلونا کمرے کے فرش پر چکر لگانے لگا تو وہ پرمسرت لہجے میں مجھ سے بولی۔ "دیکھا کتنا پیارا کھلونا لائی ہوں میں تمہارے لیے!"

ابھی اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ شریف نے اسے مخاطب کیا۔ "لیلیٰ! سنو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اس کی آواز ایسی غنودہ سی تھی جیسے وہ نیند میں بول رہا ہو کیونکہ اس وقت بھی اس کا ذہن، میرے ذہن کے زیر اثر تھا، مگر لیلیٰ نے اس بات کو محسوس نہیں کیا۔

"ابھی آئی۔" یہ کہہ کر لیلیٰ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے بولی۔ "ہارون! تم اس سے کھیلو۔"

میں نے خوشی کا اظہار کیا اور صوفے سے اتر کر بظاہر اس کھلونے سے کھیلنے لگا مگر میری پوری توجہ انھی دونوں کی طرف تھی۔

"ہاں کہو، کیا بات ہے؟" لیلیٰ اپنے شوہر کی کرسی کے قریب جا کر بولی۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیلیٰ کہ میں تمہارے قابل نہیں تھا۔" شریف نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی خوابیدہ سا تھا۔

"کیا!... کیا کہہ رہے ہو تم؟" لیلیٰ اس کی بات سن کر بوکھلا سی گئی۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں غلط نہیں ہے۔" شریف پرسکون آواز میں بولا۔ "میری باتیں غور سے اور توجہ سے سنو! جب تمہیں میری حقیقت کا علم ہو جائے گا اور میں نے اپنے چہرے پر جو نقاب ڈال رکھی ہے وہ ہٹ جائے گی تو تم بھی لیلیٰ اسی نتیجے پر پہنچو گی۔"

"یہ... یہ آج... آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے شریف؟" شدت جذبات سے لیلیٰ کی آواز بھاری سی ہو گئی۔ پھر شریف نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہوا تھا اور اب تک یہودی ہے۔ اس کے علاوہ شریف نے اس سے یہ بھی نہیں چھپایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے بیوی بچے اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب میں رہتے ہیں۔

شدید ذہنی صدمے نے فوری طور پر لیلیٰ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ کافی دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی جیسے کوئی بے جان مجسمہ ہو۔ چند لمحوں میں اس کے سارے خواب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے تھے۔ جب سچائیاں اپنا ظہور کرتی ہیں تو انسان اسی طرح پتھر بن جاتا ہے۔ پھر وہ کڑوے، کھردرے اور سنگین لمحے گزر گئے۔ اگر لیلیٰ کا ذہن اس وقت میرے قابو میں نہ ہوتا تو وہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ وہ شاید شریف کو قتل کر دیتی اور خود بھی زندہ نہ رہتی۔ لیلیٰ کے لیے یہ وقتی ذہنی صدمہ ناگزیر تھا۔ ورنہ میں کبھی ایسا نہ ہونے دیتا۔ اس طرح وہ زندگی بھر ایک فریب کا شکار رہنے سے بچ گئی تھی۔ اگر شریف اس کے روبرو اپنی اصل شخصیت کا اظہار نہ کر دیتا اور یوں ہی خاموشی سے چلا جاتا تو وہ زندگی بھر اس کی یاد کو سرمایۂ جاں بنائے رہتی، اسی کا انتظار کرتی، پھر اس کے ذہن میں شریف کے لیے وہ نفرت کبھی جنم نہ لیتی جس کا اظہار وہ اس وقت کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے شریف کا گریبان تھام رکھا تھا اور اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کے منہ میں جو بھی آ رہا تھا کہے جا رہی تھی اور شریف سر جھکائے سن رہا تھا۔ بالآخر انتہائی غصے کے عالم میں اور اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اس نے شریف کے منہ پر تھوک دیا۔ پھر چیخ اٹھی۔ "نکل جا یہاں سے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی!"

شریف نے آستین سے اپنا چہرہ صاف کیا اور خاموشی سے سر جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ رفاقتیں ایک دم نہیں بھلائی جاتیں۔ محبت کا تاج محل ٹوٹتے ٹوٹتے ٹوٹتا ہے۔ میں نے اسی لیے لیلیٰ کے ذہن سے رفاقتوں اور قربتوں کے نقوش مٹانے میں دیر نہیں کی تاکہ وہ محرومی اور پچھتاوے کے دکھ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

محبت کی جگہ اب لیلیٰ کے دل میں شریف کے لیے نفرت تھی اور وہ اپنے اس فیصلے پر مطمئن و شاکر تھی جو دراصل میں نے کیا تھا، لیکن لیلیٰ کے خیال میں وہ فیصلہ خود اسی کا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ایسی نظر آنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ طوفان گزر چکا تھا اور اس نے اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ یہی میری کامیابی کی

دلیل تھی جس کے لیے میں نے اتنی تگ و دو کی تھی۔

میں ابھی تک بظاہر اسی کھلونے سے کھیل رہا تھا جو لیلیٰ نے لا کر دیا تھا۔ شریف چلا گیا تو کافی دیر بعد لیلیٰ کو وہاں میری موجودگی کا خیال آیا۔ مجھے کھیلتا ہوا دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا پھر پرسکون آواز میں بولی۔ "تم یہیں کھیلو ہارون! میں ابھی اوپر سے ہو کر آئی۔"

"ٹھیک ہے باجی!" میں نے جواب دیا اور کھلونے میں چابی بھرنے لگا۔ لیلیٰ مجھے کھیلتا ہوا دیکھ کر یہی سمجھی تھی کہ میں اس ہنگامے سے لاتعلق اور بے خبر ہی رہا تھا اسی لیے وہ مطمئن تھی۔

شریف کو وہاں سے کہاں جانا تھا اور کیا کرنا تھا اس سلسلے میں تمام احکام میں اسے دے چکا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے تمام ساتھی بہت جلد قانون کی گرفت میں آ جائیں گے اور پھر انھیں ان کے اعمال کی سزا مل جائے گی۔ سخت ترین سزائیں بھی بعض افراد کے لیے بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ انھی افراد میں شریف اور اس کے ساتھی تھے۔ میرے خیال میں ان کے لیے موت کی سزا بھی کم تھی۔ میں اس وقت تک شریف ہی کے بارے میں سوچتا رہا جب تک لیلیٰ واپس نہ آ گئی۔ وہ بہت جلد لوٹ آئی تھی۔ شاید وہ مجھے زیادہ دیر تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ایک سبب احمد سلمان کی ہدایت بھی تھی۔ وہ یقیناً دوبارہ اپنے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس بات سے بے خبر ہی تھا کہ اس کا بیٹا مدت ہوئی تہ خاک سلا دیا گیا ہے۔

لیلیٰ اوپری منزل سے آئی تھی تو ہارون کے کمرے سے بھی کچھ اور کھلونے اٹھا لائی تھی۔ وہ آتے ہی میرے ساتھ کھیل میں لگ گئی۔ اسے اس وقت دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آ چکا ہے۔ شریف سے لیلیٰ کی شادی کو تقریباً پانچ سال گزر چکے تھے مگر اس کی گود خالی ہی تھی۔ شریف نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ اسے بچے پسند نہیں ہیں اور وہ اولاد کا متمنی نہیں۔ ہرچند کہ لیلیٰ اس بات سے متفق نہیں تھی مگر اس نے شریف کی خاطر یہ بھی قبول کر لیا تھا۔ شریف اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن لیلیٰ کو چھوڑ کر اسے جانا ہی پڑے گا اسی لیے وہ لیلیٰ سے اپنی کوئی جذباتی وابستگی برقرار رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ایسا ممکن نہ ہوتا۔ اس کے بچے تل ابیب میں تھے جن کی محبت میں وہ کسی اور کو حصہ دار بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ لیلیٰ ماں نہ بن سکی تھی، یہ خود اسی کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔ ماں بن جانے کی صورت میں شریف کی جدائی اس کے لیے اور بھی شاق ہوتی۔ پھر از سر نو زندگی کا آغاز کرنے میں بھی اسے بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑتا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے لیلیٰ مجھے اوپری منزل میں لے گئی۔ سطوت وہیں تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کچھ سہم سی گئی۔ "دکان سے ملازم کھانا لینے کے لیے آتا ہوگا۔" وہ جلدی سے بولی۔ اس کی مخاطب لیلیٰ ہی تھی۔ "میں ناشتے دان میں ان کے لیے کھانا نکال دوں۔" یہ کہتے ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ لیلیٰ مجھے لیے ہوئے ہارون کے کمرے میں آ گئی۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہارون کی شخصیت اپنا لینے کے بعد میری آزادی کچھ چھن سی گئی ہے۔ نہ میں اپنی مرضی سے کہیں آ سکتا ہوں، نہ جا سکتا ہوں۔ میں نے ابھی تک ابوالہول کا تاریخی مجسمہ بھی نہیں دیکھا تھا جس سے نہ معلوم کیوں میرا ایک تعلق پیدا کر دیا گیا تھا۔ میرے دشمن مجھے ابوالہول ہی تو کہتے تھے۔ آخر کیوں؟ یہی تجسس تو مجھے قاہرہ کی طرف کھینچ لایا تھا۔ قاہرہ پہنچنے سے قبل میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ وہاں اپنے ماضی کی الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا تلاش کروں گا لیکن موجودہ صورت حال میں یہ ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ انھی باتوں پر غور کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں لیلیٰ سے یہ کہوں وہ مجھے وہاں گھما لائے۔ اگر ہارون ذہنی طور پر بچہ تھا تو ہر بچہ ہی تفریح پسند کرتا ہے، یہ کوئی غیر معمولی بات بہرحال نہ ہوتی۔ اس طرح کم از کم میں ابوالہول کا مجسمہ تو دیکھ ہی لیتا۔

لیلیٰ نے اپنے باپ کی اجازت کے بغیر مجھے وہاں لے جانے سے صاف انکار کر دیا مگر میں انکار کو اقرار میں بدلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے میری بات ماننا ہی پڑی۔ اس نے میرا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ دوپہر کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ مجھے اہرام کی سیر کرانے لے جائے گی۔ سطوت کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ مجھ سے کچھ ڈری ڈری سی تھی۔ اس نے میرے اور لیلیٰ کے ساتھ کھانا کھانے سے بھی اجتناب کیا تھا۔

کھانا کھاتے ہی لیلیٰ نے مجھ سے کپڑے بدلنے کے لیے کہا اور خود لباس تبدیل کرنے نیچے چلی گئی۔ جانے سے پہلے وہ میرے لیے الماری سے ہارون کا ایک جوڑا نکال گئی تھی۔ ہارون یقیناً مجھ سے کچھ دبلا ہی رہا ہوگا کیونکہ اس کے کپڑے میرے جسم پر کسی قدر تنگ تھے۔ لیکن اتنے بھی نہیں کہ میں انھیں پہن ہی نہ سکتا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے لیلیٰ کی ہدایت کے مطابق نچلی منزل کا رخ کیا۔ میں زینے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ سامنے سے مجھے سطوت آتی دکھائی دی۔ وہ غالباً اپنے کمرے میں

جا رہی تھی جو میرے کمرے کے برابر ہی تھا۔ اس کی نگاہ میری ہی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جو کچھ کیا وہ اسی سزا کا ایک حصہ تھا جو سطوت کا مقدر بن چکی تھی۔ مجھے سامنے سے آتا ہوا دیکھ کر اور پھر ایک دم غائب ہوتا دیکھ کر اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل جانا فطری بات تھی۔ وہ دہشت زدہ سی ہو کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی جیسے اس کے پیروں میں کسی نے زنجیر سی ڈال دی ہو۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا پھر رک کر اپنی اصل آواز میں بولا: "تم نے ابھی جسے دیکھا تھا وہ ہارون نہیں، میں تھا۔ ہارون تو نیچے لیلیٰ کے کمرے میں جا چکا ہے۔ مجھے تم میری آواز سے پہچان ہی چکی ہو گی۔ میں تمھارا منیر ہوں، تمھارا مجرم منیر!"

میری آواز سن کر سطوت کے جسم پر لرزہ سا طاری ہوا اور پھر وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ میں وہاں بغیر رکے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس ظالم عورت سے ایک ایسے معصوم بچے کا انتقام لے رہا تھا جس کے قتل سے اب تک خود اس کا باپ بھی بے خبر تھا۔ اس بچے کا انتقام جو اسی عورت کے سفاکانہ رویے کے سبب اپنی ذہنی نشوونما جاری نہ رکھ سکا تھا اور بالآخر اسی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ لیلیٰ نے سطوت کی گھٹی گھٹی سی چیخ نہیں سنی ہو گی۔ خوف کی زیادتی کے سبب سطوت زیادہ زور سے نہیں چیخ سکی تھی۔ بعد میں میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ لیلیٰ نے اس کی چیخ نہیں سنی تھی۔ اگر اس نے چیخ سنی ہوتی تو یقیناً حقیقت حال جاننے کے لیے اوپر کی منزل کا رخ کرتی۔

میں نیچے پہنچا تو دیکھا کہ لیلیٰ لباس تبدیل کر چکی تھی اور اب وہ اپنے بال سنوار رہی تھی۔ کچھ دیر ہی میں وہ بالکل تیار ہو کر میرے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ کوٹھی سے نکل کر ہمیں ٹیکسی کے لیے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں اور لیلیٰ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ پھر ٹیکسی اہرام کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس وقت میرا دل بڑے عجیب سے احساسات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جنھیں پوری طرح سمجھنا خود میرے لیے بھی مشکل تھا۔ کچھ خوشی اور کچھ خوف کی سی ملی جلی کیفیت تھی لیکن میں خوش کیوں تھا اور خوف زدہ سا کیوں؟ اس کا کوئی واضح سبب بظاہر معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے سفر کرتی رہی اور اس کے ساتھ میرے خیالات کا سفر بھی جاری رہا۔ ان خیالات کا مرکز خود میری ذات تھی۔ خود میرا وجود تھا جو میرے لیے بھی ایک معما ہی تھا۔ مجھے آبلہ پا کر کے صحرا میں کسی منزل کا پتا بتائے بغیر تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ برگشتہ اور بے اماں ہوائیں کسی برگِ خزاں کی طرح مجھے اپنے ساتھ اڑائے پھر رہی تھیں۔ ہوا کی بھی کوئی منزل نہیں تھی اور میں بھی بے منزل تھا۔ وہ بھی ہمہ متحرک تھی اور میں بھی! کبھی روم کبھی اصفہان کبھی بغداد کبھی قاہرہ، کبھی یہاں کبھی وہاں! کیا میرا مقدر یہی تھا؟ ... نے بغداد کے دورانِ قیام میں اپنی بے معنی زندگی میں ایک معنی ... کی کوشش کی تھی بلکہ یہ زیادہ درست ہے کہ میری زندگی میں ... معنی پیدا ہونے لگے تھے اور پھر سب کچھ بکھر گیا تھا۔ جس طرح حسین خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں بھی بیدار ہو ... کاش میں آگہی کے عذاب میں نہ مبتلا ہوتا اور کاش میرے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا کوئی ٹکڑا ہوتا۔

میں اپنے خیالوں کی رو میں بہتا رہا۔ اس وقت مجھے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں کہاں ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں، کیوں جا رہا ہوں، مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ مجھے خاموش خاموش اور کھویا کھویا دیکھ کر ہی لیلیٰ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت لیلیٰ کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "ہارون! ہارون!" وہ مجھے پکار رہی تھی۔

"ہوں۔" میں نے جیسے خواب کے سے عالم میں کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو تم؟" وہ بولی۔ "تم تو ہمیشہ گھر سے باہر نکل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں؟"

"نہیں تو باجی!" میں پھر ہارون بن گیا۔ "میں... میں تو بہت خوش ہوں، ہاں سچی!" ہارون بن جانے کے سوا میرے بس میں تھا بھی کیا۔

پھر اس بھولی اور معصوم لڑکی کا دل رکھنے کے لیے میں بے حد باتیں کرتا رہا۔ بچکانہ اور بے مقصد باتیں! وہ میری باتوں پر ہنستی رہی اور مجھے بھی ہنساتی رہی۔ میں نے اسی دوران میں یہ بھی محسوس کیا کہ میرے جسم سے اٹھنے والی مخصوص خوشبو اس کے لیے الجھن کا سبب ہو رہی ہے۔ وہ کئی بار نتھنے سکیڑ کر لمبے لمبے سانس لے چکی تھی۔ پھر ... نے جیسے مہمان کی طرح اس کے ذہن سے بھی خوشبو کا خیال نکال دیا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگی۔

ہماری ٹیکسی اب قاہرہ کو پیچھے چھوڑ کر اہرام کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ دور ہی سے اہرام کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

"وہ دیکھو ہارون! فرعون خوفو کا مقبرہ!" لیلیٰ نے ٹیکسی کی کھڑکی

سے باہر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ہارون کی بتائی ہوئی سمت میں نظر ڈالی اور پھر بچوں کی طرح تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ "ہاں ہاں نظر آ گیا۔ مجھے نظر آ گیا۔"

پھر جیسے جیسے ٹیکسی اہرام کے قریب ہوتی گئی ایک ایک کر کے تمام تاریخی آثار واضح ہوتے چلے گئے۔ ابوالہول کا مجسمہ بھی میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہ سطح زمین سے تقریباً چالیس فیٹ بلند ہو گا۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے دہشت کا سا احساس ہوا تھا۔ غالباً اس احساس کا سبب وہ تعلق تھا جو میرے اور اس مجسمے کے درمیان پیدا کر دیا گیا تھا۔ ایسا دانستہ کیا گیا تھا یا نادانستگی میں، مجھے علم نہیں تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور سے کرایہ تین گنی طے ہوا تھا۔ لیلیٰ نے کرایہ ادا کر کے ٹیکسی چھوڑ دی۔ قاہرہ ایئر پورٹ پر میں نے ایک کسٹم آفیسر کی جیب صاف کی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک بڑی رقم ہاتھ آئی تھی جو ابھی تک میرے پاس موجود تھی۔ حالات ہی کچھ اس طرح پیش آئے تھے کہ میں اس رقم کو ٹھکانے نہ لگا سکا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد احتیاطاً میں وہ رقم بھی ساتھ لے آیا تھا کہ کیا خبر کہاں ضرورت پیش آ جائے۔ لیلیٰ جب ٹیکسی کا کرایہ ادا کر رہی تھی تو مجھے اس رقم کا خیال آیا تھا مگر میں نے دانستہ اسے کرایہ دینے سے نہیں روکا تھا۔ لیلیٰ کی بجائے میں کرایہ ادا کرتا تو وہ یقیناً مجھ سے اس رقم کے بارے میں استفسار کرتی۔ ظاہر ہے کہ میں اس رقم کے بارے میں لیلیٰ کو کوئی مناسب جواب نہ دے پاتا۔

ٹیکسی سے اتر کر لیلیٰ مجھے اپنے ساتھ لیے لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔ وہاں مقامی باشندے بھی تھے اور غیر ملکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی جن میں ہر رنگ و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ وہاں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی! مگر بچوں کی تعداد کم تھی۔ کسی کے گلے میں دوربین پڑی ہوئی تھی، کسی کے شانے سے کیمرا جھول رہا تھا۔ بعض غیر ملکیوں کے ساتھ مقامی گائیڈ بھی تھے۔

"تمھیں یاد ہے نا ہارون! تم پہلے بھی ایک بار میرے ساتھ یہاں آئے تھے۔" لیلیٰ نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولی: "یہ اس وقت کی بات ہے جب میری شادی... شادی..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر دکھ کی ایک پرچھائیں سی آ کر گزر گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ بات کہتے کہتے وہ ایک دم کیوں اداس ہو گئی تھی۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے اسے باتوں میں لگا لیا۔ شاید وہ خود بھی اپنے خیالوں سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی اسی لیے میری باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگی۔

صفحۂ دہر پر انسانی تاریخ نے اپنی ہیبت و جبروت کے جو نشان ثبت کیے تھے، وہ کافی بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاریخ نے جیسے ان آثار میں خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ ان آثار میں تین فراعنہ کے مقبرے سب سے بڑے تھے۔ ان تینوں میں سے سب سے بڑا مقبرہ وہی تھا جو لیلیٰ نے مجھے دور ہی سے دکھا دیا تھا۔ "فرعون خوفو کا مقبرہ!" دوسرا مقبرہ فرعون خفرع کا تھا جو خوفو کے مقبرے سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس کے بعد فرعون منقرع کا مقبرہ تھا جو ان تینوں بڑے مقبروں میں سب سے چھوٹا تھا۔ لیلیٰ نے مجھے وہ تینوں مقبرے دکھائے اور ان کے بارے میں بتایا۔ یہ تینوں مقبرے ترتیب وار تین فراعنہ کی تین نسلوں کی یادگار ہیں۔ خفرع فرعون خوفو کا بیٹا اور منقرع خفرع کا بیٹا۔ انھوں نے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے دانستہ اپنے مقبرے ایک دوسرے سے چھوٹے بنوائے تھے۔ ان مقبروں میں اندر جانے کے راستے بھی تھے مگر لیلیٰ مجھے اندر نہیں لے گئی۔ شاید اس ڈر سے کہ کہیں میں ڈر نہ جاؤں۔

پھر میں لیلیٰ کے ہمراہ ابوالہول کے پُرہیبت مجسمے کے سامنے بھی پہنچ گیا۔ مجھے اپنا وجود اس کے سامنے بہت حقیر سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ انسانوں کی طرح تھا اور جسم شیر کا تھا۔ میں نگاہیں اٹھائے اسے دیکھتا رہا مگر ظاہر ہے کہ وہ پتھر کا بے جان مجسمہ ان اسرار کی عقدہ کشائی نہیں کر سکتا تھا جن کی مجھے جستجو تھی۔ ایک ابوالہول دوسرے ابوالہول کے سامنے کھڑا تھا جن میں سے ایک بے جان تھا اور دوسرا جان دار۔ خوشی اور خوف کی ملی جلی سی کیفیت جو میں نے اہرام کی طرف آتے ہوئے محسوس کی تھی، اس وقت دو چند ہو چکی تھی۔

"کیا دیکھے جا رہے ہو ہارون!" لیلیٰ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "چلو اب گھر چلیں، کافی دیر ہو گئی ہے۔"

کس کا گھر؟ کیسا گھر؟ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ کیا میرا کوئی گھر بھی ہے؟ گھر تو رشتوں سے بنتا ہے۔ کیا میرا اس گھر سے کوئی رشتہ تھا جہاں مجھے لیلیٰ لے جانا چاہتی تھی؟ مگر اس کے باوجود میں لیلیٰ کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ واپسی میں کوشش کے باوجود لیلیٰ سے میں زیادہ گفتگو نہ کر سکا۔ وہ بھی سمجھ گئی کہ میں کچھ اداس سا ہو گیا ہوں۔

"تم گھومتے گھومتے شاید تھک گئے ہو۔" لیلیٰ نے کہا اور میں نے اثبات

میں سر ہلا دیا۔

سورج کی کرنیں دریائے نیل کی موجوں کو اس وقت آخری بوسہ دے رہی تھیں جب ہماری ٹیکسی پل عبور کر کے جیزا کے علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ اب ہماری ٹیکسی ذقی کی ایک پُر رونق سڑک سے گزر رہی تھی۔ ہماری دائیں جانب ہوٹل کیرو شیرٹن کی تیس منزلہ عمارت تھی۔ وہ اسی ہوٹل کی ایک شاخ تھی جو ہیلیو پولس میں تھی۔ وہ ہیلیو پولس شیرٹن کہلاتی تھی۔ قاہرہ پہنچنے کے بعد وہیں میں نے ایک کمرہ حاصل کر کے کچھ دیر قیام کیا تھا اور پھر وہاں سے ہارون کی شخصیت اپنانے کے بعد خاموشی سے فرار ہو گیا تھا۔ کیرو شیرٹن کے قریب ہی صدر سادات کی قیام گاہ تھی۔ جب ٹیکسی صدر سادات کی قیام گاہ کے سامنے سے گزر رہی تھی تو معاً ٹیکسی ڈرائیور نے عقبی شیشے پر نظر جمائے ہوئے لیلیٰ کو مخاطب کیا: "خاتون! معاف کیجیے گا، میں کافی دیر سے ایک نیلی کار کو اپنی ٹیکسی کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کار میری ٹیکسی کے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے۔ میں نے احتیاطاً اس کے بارے میں آپ کو باخبر کرنا ضروری سمجھا، ویسے آپ قطعی فکرمند نہ ہوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں آپ کو بہ خیریت آپ کی منزل تک پہنچا دوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ یقیناً کوئی فرض شناس شخص تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ لیلیٰ کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرے دشمنوں نے مجھے اتنی جلدی کیسے ڈھونڈ لیا؟ ابھی تو مجھے قاہرہ آئے ہوئے دوسرا ہی دن تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میرے دشمن اتنی جلدی مجھ تک پہنچ گئے ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں تو کوئی تشویش نہیں تھی لیکن لیلیٰ کی طرف سے ضرور فکرمند تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے تعاقب کا علم ہو جانے کے بعد لیلیٰ کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے تھے مگر پھر وہ خاموش ہی رہی تھی۔ شاید وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

میں بھی ٹیکسی ڈرائیور کی بات کا یقین کرنے کے لیے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح تعاقب کرنے والے چوکنا ہو سکتے تھے۔ انھیں علم ہو جاتا کہ ٹیکسی کے مسافروں کو تعاقب کا علم ہو چکا ہے۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی جو اس وقت میرے ذہن میں اس کے سوا کوئی اور بات آ ہی نہ سکی کہ تعاقب کرنے والے میرے دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔

ٹیکسی قدیم اُمرا کے علاقے زمالک میں داخل ہوئی تو ڈرائیور نے لیلیٰ سے رہنمائی چاہی کہ وہ کدھر چلے۔ لیلیٰ نے اسے راستے کے بارے میں ہدایات دیں۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس کی آواز حلق میں پھنس رہی ہو۔ اس معاملے میں ایک بات ضرور میرے لیے الجھن کا سبب تھی وہ یہ کہ میرے دشمن بہرحال اتنے اناڑی نہیں ہو سکتے۔ ان سے اتنی بڑی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کو تعاقب کا علم ہو جاتا۔ پھر وہ لوگ کون تھے؟ یہ سوال میرے لیے ایک معمہ ہی تھا۔ اگر وہ لوگ میرے دشمن نہیں تھے تو ایسی گھریلو اور معصوم لڑکی سے کسی کو کیا پرخاش ہو سکتی تھی؟ میرے ذہن میں پے در پے سوالات اُبھر رہے تھے مگر میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ذہن کو ٹٹول کر میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ نیلی کار اب بھی تعاقب میں ہے۔ اس نیلی کار کو ڈرائیو کرنے والا ایک ادھیڑ عمر کا حبشی تھا۔ کار میں اس کے سوا کوئی اور شخص ٹیکسی ڈرائیور کو نظر نہیں آیا تھا۔ نیلی کار میں تعاقب کرنے والا حبشی تھا، یہ اس بات کا ثبوت نہیں تھا کہ اس کا تعلق میرے دشمنوں سے نہیں ہے۔ میک اَپ میں بھی ہو سکتا تھا۔

احمد سلمان کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر لیلیٰ نے ٹیکسی رکوا لی۔ چند لمحے بعد ہی وہ نیلی کار ٹیکسی کے برابر سے گزرتی ہوئی آگے ہو گئی۔ میں نے ٹیکسی سے اتر کر کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جدھر وہ کار گئی تھی۔ آگے جا کر وہ سڑک بائیں جانب مڑ جاتی تھی۔ نیلی کار اس طرف مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لیلیٰ اس وقت ٹیکسی کا کرایہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طویل سانس لیا۔ اس کے چہرے سے اب بھی فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میرے خیال میں اس تعاقب کرنے والے کا مقصد میری جائے قیام معلوم کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنے کے بعد لیلیٰ نے میرا ہاتھ تھاما اور کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ کوٹھی حسبِ معمول ویران سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہاں ایک ادھیڑ عورت کے سوا اور تھا بھی کون۔ اتنی بڑی کوٹھی میں صرف ایک عورت کا وجود ظاہر ہے کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس وقت ہوا بہت تیز چل رہی تھی جس کے سبب گھنے پیڑ جھوم رہے تھے۔ ہوا پیڑوں کی ڈالیوں اور پتوں سے الجھ کر عجیب شور پیدا کر رہی تھی۔ وہ ایسا ہی شور تھا جیسے بہت سی خبیث روحیں ایک ساتھ چیخ رہی ہوں۔ لیلیٰ کی سماعت اس شور کی یقیناً عادی ہو گی

وہ بے جھجک میرا ہاتھ تھامے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ عمارت تک پہنچنے کے لیے ابھی نصف راستہ ہی طے ہو سکا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک مدھم سی آواز سنائی دی جیسے کوئی پنجوں کے بل دبے قدموں سے پیچھے آ رہا ہو۔ میں ایک دم پلٹا۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے لیے قطعی خلافِ توقع اور حیران کن تھا۔ وہ ایک دیوہیکل سیاہ فام حبشی تھا جو اپنے ہاتھ میں خنجر تھامے ہوئے تھا۔ وہ لیلیٰ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور اب اس پر حملہ آور ہونے والا تھا۔ اگر اس کی ادھر سے پھر کر میری جانب نہ ہو جاتی تو اس کا اٹھا ہوا ہاتھ لیلیٰ کے جسم میں خنجر اتار چکا ہوتا۔

وہ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ میں نے لیلیٰ کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا تھا اور خود جھپٹ کر اس حبشی کے سامنے آ گیا تھا۔

"ہارون!" مجھے لیلیٰ کی چیخ سنائی دی تھی مگر میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ نے بھی یقیناً اس خنجر بدست حبشی کو دیکھ لیا تھا۔

"ہٹ جا سامنے سے لڑکے!" وہ حبشی دانت پیس کر غرایا۔ "مجھے اس فاختہ کو دبوچ لینے دے تاکہ میں اس کے گلے پر خنجر پھیر سکوں۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا خنجر ہوا میں لہرایا۔ غالباً مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے!

ٹیکسی کا تعاقب کرنے والا بھی حبشی تھا اور میرے سامنے بھی ایک حبشی ہی کھڑا تھا جو لیلیٰ کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ وہ شاید پہلے ہی سے پیڑوں کے درمیان چھپا ہوا لیلیٰ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ وہ لوگ میرے نہیں لیلیٰ کے دشمن تھے اور اس دشمنی کا سبب وہ حبشی ہی بتا سکتا تھا جو میرے سامنے خنجر تانے کھڑا ہوا تھا۔ مجھے راہ میں حائل دیکھ کر اس حبشی نے پھر دھمکی دی: "اگر تو درمیان سے نہ ہٹا تو مجبوراً میں تجھے بھی قتل کر ڈالوں گا۔"

میری عمر اور جسمانی ساخت دیکھ کر یقیناً اس حبشی کو یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں اس سے بھڑنے کی ہمت کر سکتا ہوں۔ پھر یہ بھی کہ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور میں خالی ہاتھ تھا۔ اگر کسی طرح اسے میری حقیقت کا علم ہو جاتا تو وہ اس وقت مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔ پھر اس سے پہلے کہ معاملہ کوئی اور سنگین نوعیت اختیار کر جاتا، میں نے دیر نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی میری گرفت میں آ چکی تھی۔ اسی ہاتھ میں وہ خنجر تھامے ہوئے تھا۔

میں نے اس کی کلائی کو معمولی سا جھٹکا دیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسی کے ساتھ اس کا خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔

"بولو، تم میری بہن کو کیوں قتل کرنے آئے تھے؟" میں نے اس کی کلائی پر دباؤ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ لیلیٰ غالباً میرے عقب میں کھڑی تھی اس لیے مجبوراً مجھے ہارون کی بچکانہ آواز ہی میں بولنا پڑ رہا تھا۔ کمزور اور بچوں ایسی آواز تو ظاہر ہے کہ اس حبشی کو متاثر نہیں کر سکتی تھی مگر کلائی پر پڑنے والا دباؤ اسے یقیناً بوکھلائے دے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہے اور اس تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے!" میں برہم ہو گیا اور اسی کے ساتھ اس کی کلائی پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔

"تم اگر اب بھی نہ بولے تو میں تمھاری کلائی توڑ دوں گا۔" میں نے اس حبشی کو آخری وارننگ دی۔ لیلیٰ کے لیے یہ منظر یقیناً حیران کن ہی ہو گا۔ شاید اسی لیے وہ گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی اور کچھ نہیں بول رہی تھی۔ کہاں میں، کہاں وہ دیوہیکل حبشی! میرا اس کا بظاہر کوئی مقابلہ نہیں تھا مگر میں نے نہ صرف اس کے ہاتھ سے خنجر گرا دیا تھا بلکہ اسے بے بس کر دیا تھا۔ وہ میری گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے اپنی تمام جسمانی طاقت صرف کیے دے رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کی زبان کھلوانا ضروری تھا اسی لیے مجبوراً مجھے وہ قدم اٹھانا ہی پڑا جس سے اب تک گریز کر رہا تھا۔ "چٹ" کلائی ٹوٹنے کی ہلکی سی آواز آئی اور وہ حبشی شدید تکلیف و اذیت سے بلبلا کر کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح چیخنے لگا۔ وہ کانپ کر گرنے کے قریب تھا کہ میں نے اس کی دوسری کلائی تھام لی اور بولا: "بولو! میرے سوال کا جواب دو گے یا میں تمھاری دوسری کلائی بھی توڑ دوں!"

"نہیں... نا... نہیں!" وہ چیخ اٹھا۔ "بتاتا ہوں... مجھے... مجھے... اس لڑکی کو قتل کرنے کے لیے بھیجنے والا..."

عین اسی وقت فضا میں ایک سنسناہٹ سی ہوئی اور وہ حبشی اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ وہ گولی پیڑوں کے درمیان ہی سے چلائی گئی تھی اور گولی چلانے والے کا نشانہ بہت سچا تھا۔ گولی اس دیوہیکل حبشی کی کنپٹی میں گھس گئی تھی۔ جس ریوالور سے وہ گولی چلائی گئی تھی یقیناً اس پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا ورنہ گولی چلنے کا دھماکا ضرور سنائی

دیا۔ لیلی چیختی ہوئی عمارت کی طرف بھاگی اور میں نے اس طرف زقند بھری جدھر سے گولی چلائی گئی تھی۔ گھنے پیڑوں میں نیم تاریکی کے باوجود میرے لیے اس شخص کو تلاش کر لینا ناممکن نہیں تھا، جس نے حبشی کو زبان کھولنے سے پہلے سفرِ آخرت پر روانہ کر دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کا نام ظاہر ہو جائے جو لیلی کو قتل کرانا چاہتا تھا۔ غالباً کسی ایسے ہی موقع کے لیے وہ اس حبشی کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ حبشی راز فاش کر دے گا تو اس نے حبشی کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔

حبشی کا میرے ہاتھوں جو حشر ہوا تھا، اسے دیکھنے کے بعد یہ بھی یقین تھا کہ اس شخص نے مزید وہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں پیڑوں کے درمیان سے نکل کر عمارت کے پھاٹک کی طرف بھاگا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ میں اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکا کہ وہ بھی مقتول حبشی ہی کی طرح قوی ہیکل تھا مگر اس جسامت کے باوجود وہ کسی تیر کی طرح پھاٹک سے نکلا تھا۔ میں جب پھاٹک تک پہنچا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ چند لمحے میں پھاٹک پر کھڑا ہوا ادھر ادھر نظریں دوڑاتا رہا، پھر بوجھل قدموں سے عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔

حبشی کی لاش وہیں راستے میں اسی جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ بہہ کر زمین پر پھیل گیا تھا۔ اس کی لاش سے کچھ فاصلے پر وہ خنجر زمین پر پڑا تھا جس سے وہ لیلی پر حملہ آور ہوا تھا۔ لیلی خوف زدہ ہو کر عمارت کے اندر جا چھپی تھی اور اس نے دوبارہ باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں گم صم سا حبشی کی لاش کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سارا مسئلہ ہارون کے کردار کا تھا۔ اگر یہ مسئلہ میرے سامنے نہ ہوتا تو میں اطمینان سے اندر جاتا اور پولیس کو اس قتل کی اطلاع دے دیتا، مگر ہارون ذہنی طور پر نابالغ تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہارون کی حیثیت سے اب تک میں جو قدم اٹھا چکا تھا، وہ بھی بہت تھا لیکن اس کا جواز بہرحال موجود تھا۔ اپنی بہن کی جان خطرے میں دیکھ کر ایک بچے کو بھی جوش آ سکتا ہے اور وہ نتائج سے بے پروا ہو کر کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔

ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ عقب سے مجھے ایک گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور میں چونک اٹھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا

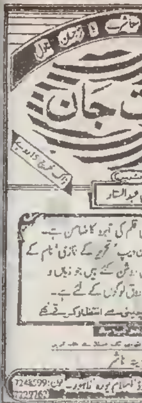

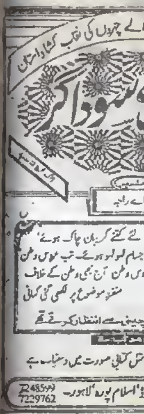

تو ایک کار پھاٹک سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کار ذرا قریب آئی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہارون کے باپ احمد سلمان کی کار تھی اور وہی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی آمد اس وقت میرے لیے خلافِ توقع ہی تھی کیوں کہ ابھی دکان سے اس کے آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ دکان سے عموماً رات نو بجے تک لوٹ کر آتا تھا اور ابھی شام کے چھ بھی نہ بجے تھے۔

اچانک کار آگے آتے آتے ایک دم رک گئی۔ احمد سلمان نے لازماً راستے میں پڑی ہوئی حبشی کی لاش دیکھ لی تھی۔ وہ انتہائی تیزی کے ساتھ کار سے اترا۔ اس نے بوکھلاہٹ کے سبب کار سے اتر کر اس کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا میرے قریب پہنچا اور اس طرح اپنے سینے سے لگا لیا جیسے مجھے کوئی بلا اچک کر لے جانے والی ہو۔ "ہارون!... ہارون میرے بیٹے! تم... تم تو ٹھیک... ٹھیک ہو؟" احمد سلمان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ میرے جسم پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

احمد سلمان نے مجھ سے نہ اس حبشی کی لاش کے بارے میں پوچھا، نہ کوئی اور بات کی۔ اسے سب سے پہلے میری فکر ہوئی کہ کہیں مجھے تو چوٹ نہیں آ گئی یا میں تو زخمی نہیں ہو گیا۔ محبت بھی آدمی کو کتنا خود غرض بنا دیتی ہے! وہیں ایک انسان کی لاش بھی پڑی تھی اور وہ بھی یقیناً کسی کا باپ، بیٹا اور بھائی ہو گا مگر احمد سلمان کو اس سے زیادہ اپنے بیٹے کی فکر تھی جو زندہ سلامت اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ابو جان!" میں نے احمد سلمان کے بازوؤں کی گرفت میں کسمساتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"تمھاری باجی کہاں ہیں؟ اور تم... تم یہاں باہر کیا کر رہے ہو؟" اس بار بھی احمد سلمان نے مجھ سے اس لاش کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور میری طرف سے مطمئن ہو کر مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

"وہ باجی... وہ اس وقت بھاگ کر اندر چلی گئی تھیں جب یہ مر گیا تھا۔" میں نے حبشی کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔ احمد سلمان نے آگے بڑھ کر لاش کا جائزہ لیا کہ وہ حبشی کسی کی گولی کا شکار ہوا تھا۔

"مگر... مگر یہ کیسے مر گیا؟ اور... اور یہ... یہ یہاں آیا کیوں تھا؟" احمد سلمان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اسے یقیناً مجھ سے یہ توقع نہیں ہوگی کہ میں اس کے کسی سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ غالباً یہی سوچ کر اس نے کہا۔ "اچھا چلو، پہلے اندر چلو۔" احمد سلمان نے یہ کہہ کر میرا

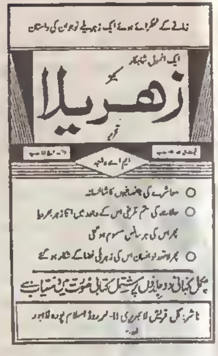

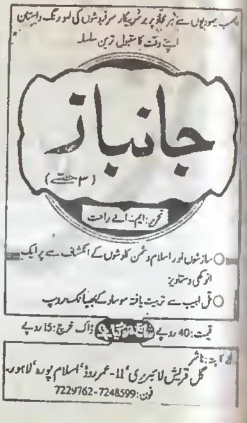

پرچھائیں
کتابی صورت میں
ایم اے راحت
کا
ہنگامہ خیز ناول
قیمت: 40 روپے ڈاک خرچ: 15 روپے
گل قریشی لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔
فون: 7248599
7229762

ڈیل کارنیگی کی نفسیاتی کتابیں
زندگی سے پیار پریشانیوں سے نجات۔ ڈیل کارنیگی 60
گفتگو اور تقریر کا فن ـــــــ ڈیل کارنیگی 36
اپنی شخصیت کو پرکشش بنائیے۔ ڈیل کارنیگی 30
کامیابی کے راستے ـــــــ ڈیل کارنیگی 27
کامیابی کے راز ـــــــ ڈیل کارنیگی 27
دوست بنئے دوست بنائیے۔ ڈیل کارنیگی 48
ترقی کی راہ پر ـــــــ ڈیل کارنیگی 30
زندگی کا سفر ـــــــ ڈیل کارنیگی 27
میٹھے بول کا جادو ـــــــ ڈیل کارنیگی 33
اپنی زندگی سے لطف اٹھائیے۔ ڈیل کارنیگی 30
ملنے کا پتہ رابعہ بک ہاؤس
7123555

باندھ تھام لیا اور عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔

"پتا ہے ابو جان، یہ جو کالا آدمی تھا نا، وہی جو مرا پڑا ہے، وہ باجی کو خنجر سے مار دینا چاہتا تھا۔ ہاں!" میں نے بالکل بچکانہ انداز میں احمد سلمان کو بتایا۔

"کیا؟" احمد سلمان میری بات سن کر اچھل پڑا۔

"ہاں ابو جان!" میں نے سر ہلا کر کہا، پھر مزید بولا۔ "وہ تو بس مجھے غصہ آگیا اور باجی کو ایک طرف ہٹا کر میں اس کے سامنے آگیا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" احمد سلمان کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"سچی ابو جان! میں جھوٹ بالکل نہیں بول رہا۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو خود باجی سے پوچھ لیجیے گا۔" میں اس طرح بات کر رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنا کارنامہ بیان کر رہا ہو اور اس کارنامے کی داد چاہتا ہو۔ ان باتوں سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جب احمد سلمان کو لیلیٰ سے تمام واقعے کا علم ہو تو وہ زیادہ حیرت کا شکار نہ ہو۔ میں اس کے ذہن کو پہلے ہی سے وہ سب کچھ سننے کے لیے تیار کر دینا چاہتا تھا جو لیلیٰ اس سے بیان کرتی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "میں نے اس کی کلائی پکڑ کر ابو جان، خنجر بھی اس کے ہاتھ سے گرا دیا تھا۔"

احمد سلمان نے میری بات سن کر مجھے ناقابلِ یقین سے انداز میں دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے اب عمارت کے برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ احمد سلمان کی خاموشی کا مطلب یہی تھا کہ اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا ورنہ وہ مجھ سے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال کرتا۔ وہ غالباً لیلیٰ سے اصل واقعہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ عمارت میں داخل ہو کر احمد سلمان نے نچلی منزل کے کمرے کا رخ کیا جو لیلیٰ اور اس کے شوہر کے لیے مخصوص تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ احمد سلمان نے کمرے کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ ساتھ ہی لیلیٰ کو اس کا نام لے کر بھی پکارا۔ لیلیٰ باہر سے بھاگ کر آنے کے بعد اس کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اسے شاید اب تک یقین نہیں رہا تھا۔ لیلیٰ نے احمد سلمان کی آواز سن کر فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ پھر احمد سلمان کو دیکھتے ہی وہ آگے بڑھ کر اس کے سینے سے لگ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔ احمد سلمان اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا۔ "فکر نہ کرو بیٹی! اب۔۔۔ اب تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمھارا۔۔۔ تمھارا باپ آگیا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

"ابو۔۔۔ ابو وہ۔۔۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا تھا۔ قتل۔۔۔ قتل کر دینا چاہتا تھا۔" لیلیٰ ہچکیاں لیتے ہوئے بتانے لگی۔

"ہاں مجھے معلوم ہو چکا ہے بیٹی!" احمد سلمان نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ہارون بتا چکا ہے۔ چھوڑو اور چلو، ابھی مجھے پولیس کو بھی فون کرنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے احمد سلمان نے لیلیٰ کو اپنے سینے سے جدا کیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

"میں پولیس کو فون کر چکی ہوں ابو!" لیلیٰ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ "انھوں نے بہت جلد آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے۔۔۔ میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ میرے بھائی کی زندگی خطرے میں ہے۔" پھر میری طرف دیکھتے ہوئے غالباً اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں۔۔۔ میں بہت بری ہوں ابو! میں ہارون کو وہاں اکیلا چھوڑ کر بھاگ آئی تھی۔"

"خود کو سنبھالو لیلیٰ!" احمد سلمان مضبوط لہجے میں بولا۔ "پولیس کے یہاں آنے سے قبل تم مجھے مختصراً تمام واقعہ بتا دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس کے سامنے تمھارے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو آئندہ پریشانی کا سبب بن جائے۔"

پھر لیلیٰ نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔ لیلیٰ یا تو یہ بتانا بھول گئی تھی کہ میں نے اس حبشی کی ایک کلائی توڑ دی تھی یا پھر وہ بدحواسی کے عالم میں کلائی ٹوٹنے کی آواز نہیں سن سکی تھی اور یہ میرے حق میں بہتر ہی تھا۔ لیلیٰ سے پورا واقعہ سننے کے بعد احمد سلمان نے ایک بار پھر میری طرف حیرت سے دیکھا، پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "یہ سب محبت کا کرشمہ ہے۔ محبت میں موت کی پروا نہیں رہتی۔ جب خون جوش مارتا ہے ایسے ہی ناقابلِ یقین واقعات جنم لیتے ہیں۔"

"دیکھ لیجیے ابو جان، میں سچ بول رہا تھا نا!" میں نے احمد سلمان کی طرف داد طلب انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹے، تم نے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اتنا بڑا کارنامہ کہ تم خود بھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔" یہ کہتے ہوئے احمد سلمان نے ہاتھ بڑھا کر مجھے خود سے قریب کر لیا۔ صوفے پر اس کے ایک جانب میں بیٹھا تھا اور دوسری جانب لیلیٰ۔

لیلیٰ بھی اپنے باپ کی تائید میں بولی۔ "ہاں، ہارون درمیان میں نہ آیا ہوتا تو۔۔۔ تو وہ مجھے قتل ہی کر دیتا۔" اس کے لہجے سے اب بھی خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ظاہر ہے کہ تمھاری ماں کو تو اس واقعے کا علم نہیں ہوگا۔ وہ تو اوپر ہی ہوں گی۔" احمد سلمان نے لیلیٰ سے کہا۔ کافی دیر بعد اسے اپنی بیوی کا خیال آیا تھا۔

"ہاں ابو!" لیلیٰ نے جواب دیا۔ "میں باہر سے بھاگ کر سیدھی اسی کمرے میں آئی تھی تاکہ فوری طور پر پولیس کو فون کر کے مدد کے لیے بلا سکوں۔ پھر پولیس کے آنے سے پہلے دروازہ کھول کر باہر جانے کی ہمت مجھ میں پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اگر آپ نہ آگئے ہوتے تو میں اب بھی دروازہ نہ کھولتی مگر ابو! آج آپ اتنی جلدی اسٹور سے کیسے لوٹ آئے؟ ہاں مجھے اب یاد آیا، میں نے پولیس کو فون کرنے کے بعد آپ کے اسٹور بھی فون کیا تھا۔ وہاں سے مجھے جواب ملا تھا کہ آپ موجود نہیں ہیں۔ کہاں گئے تھے آپ؟"

"میں۔۔۔" احمد سلمان کے چہرے پر ایک اضطراب سا نظر آیا۔ "میں ایک ضروری کام سے گیا تھا۔ بعد میں بتاؤں گا تمھیں کہ کہاں اور کیوں گیا تھا، یہ بھی کہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز کچھ بوجھل سی ہو گئی تھی اور چہرے پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اسی وقت کہیں دور سے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ "شاید پولیس والے آگئے۔" یہ کہتا ہوا احمد سلمان صوفے سے کھڑا ہو گیا، پھر لیلیٰ سے مخاطب ہوا۔ "تم یہیں رہو اور ہارون کو بھی اپنے ہی پاس رکھو۔ پولیس اس قتل کے سلسلے میں یقیناً تم دونوں کے بیانات بھی لے گی۔ جب اس کی ضرورت پیش آئی میں تم دونوں کو نشست گاہ میں بلا کر لے جاؤں گا۔" پھر آگے بڑھتے بڑھتے اسے کچھ خیال آیا۔ "ممکن ہے کال بیل کی آواز سن کر تمھاری ماں نیچے یہ دیکھنے آئیں کہ کون ہے، تم انھیں حالات سے آگاہ کر دینا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

پھر کافی دیر بعد میرے اور لیلیٰ کے بیانات کی نوبت آئی۔۔۔ احمد سلمان کا اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے پولیس والے ہی تھے۔ انھوں نے مجھے اور لیلیٰ کو باری باری اور الگ الگ نشست گاہ میں بلا کر بیانات لیے۔ نشست گاہ نچلی منزل ہی پر تھی۔ جب میرا بیان لیا جا رہا تھا تو نشست گاہ سے احمد سلمان کو بھی نکال دیا گیا تھا۔ میری ذہنی حالت کے بارے میں احمد سلمان غالباً پولیس والوں کو بتا چکا تھا۔ اسی لیے پوچھ گچھ کے دوران میں وہ بہت نرمی برت رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بچے سے کرید کرید کر اور بہلا پھسلا کر کوئی بات پوچھی

جاتی ہے۔ میں بھی ہارون کے کردار کو بہت عمدگی سے ادا کر رہا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے پولیس والوں کے ذہنوں کو بھی ٹٹول لیا تھا جس سے مجھے مقتول حبشی کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔

وہ مقتول حبشی قاہرہ پولیس کو کئی معاملات میں مطلوب تھا۔ وہ ایک پیشہ ور مجرم تھا اور پرانے قاہرہ کے ایک محلے عباسیہ میں رہتا تھا۔ پولیس نے اس کی شناخت کر لی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ کسی نے لیلیٰ کو اس کے ہاتھوں قتل کرانے کے لیے بھاری معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ پولیس بہرحال یہ معلوم نہیں کر سکی تھی کہ اس حبشی کو قتل کرنے والا کون ہو سکتا تھا۔ تمام ضروری کارروائیوں کے بعد پولیس وہاں سے چلی گئی۔ مقتول حبشی کی لاش بھی پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

میں نے اپنے بیان میں مقتول حبشی کی کلائی ٹوٹنے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے پولیس کو صرف اتنا بتایا تھا کہ کلائی پکڑتے ہی اس کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا تھا اور پھر کسی نے اسے گولی مار دی تھی۔ میں نے پولیس کو یہ بتانا بھی فضول سمجھا تھا کہ حبشی کو گولی مار کر فرار ہونے والا میرے سامنے پھاٹک سے نکلا تھا۔

اس دوران میں سطوت کو بھی صورتحال کا علم ہو چکا تھا اور وہ سہمی سہمی نظر آ رہی تھی۔ اس نے احمد سلمان سے اپنے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ جو شخص لیلیٰ کو قتل کرانا چاہتا تھا، اس کی طرف سے دوسرا حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ سطوت کی بات سن کر لیلیٰ کا چہرہ بجھ گیا تھا۔

"تم اس سلسلے میں فکر نہ کرو۔ لیلیٰ کی حفاظت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔" احمد سلمان نے جواب دیا۔ پھر اس نے طویل سانس لے کر کہا: "ابھی اس کا باپ زندہ ہے۔"

اس وقت سبھی نچلی منزل کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ معاً فون کی گھنٹی بجی تو احمد سلمان اس طرح اس کی طرف لپکا جیسے اسے فون ہی کا انتظار تھا۔ فون کے قریب پہنچ کر اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو... جی ہاں میں احمد سلمان ہی بول رہا ہوں... جی کیا کہا؟ لاش کل مل سکے گی... جی... جی ہاں... کل صبح نو بجے... ٹھیک ہے۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا... بہت بہتر۔ خدا حافظ!" یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔

لیلیٰ اور سطوت دونوں ہی احمد سلمان کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا سبب وہ گفتگو ہی تھی جو احمد سلمان نے فون پر کی تھی۔ احمد سلمان سر جھکائے بوجھل قدموں سے صوفے کی طرف بڑھا پھر اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھا اور اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "لیلیٰ!... میری بچی! تیرا سہاگ اجڑ گیا۔ تو... تو بیوہ ہو گئی میری بچی!... تیرے شوہر کو... شریف کو آج دوپہر کسی نے قتل کر دیا۔ اس وقت... اس کی لاش... لاش کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔ وہ... وہ کل صبح لاش ہمارے حوالے کریں گے۔ کل صبح نو بجے!"

شریف کو قتل کر دیا گیا! کیوں؟ کہاں اور کیسے؟ میں چکرا کر رہ گیا۔ کیا اسے اعترافِ جرم کی مہلت بھی نہیں مل سکی؟ مگر یہ ہوا کیسے؟ کیا لیلیٰ پر کیا جانے والا قاتلانہ حملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا؟ میرے ذہن پر پے در پے سوالوں نے یورش کر دی۔

شریف کے قتل کی خبر وہاں موجود افراد میں سب سے زیادہ لیلیٰ کے لیے شدید غم اور حیرت کا سبب بن سکتی تھی کیوں کہ وہ لیلیٰ کا شوہر تھا مگر اس وقت وہی پرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ یہ خبر سن کر وہ لمحہ بھر کو چونکی ضرور تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ معمول پر آ گئی تھی، یوں جیسے اس خبر سے اسے کوئی ذہنی دھچکا نہ پہنچا ہو یا وہ خبر اس کے لیے اہم نہ رہی ہو۔ لیکن شوہر کے قتل پر اس کا یہ ردِعمل غیر فطری ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ احمد سلمان نے اس کی طرف انتہائی حیرت سے دیکھا۔ اسی وقت لیلیٰ قطعی غیر جذباتی انداز میں بولی: "یہ واقعہ کب اور کہاں ہوا ابو؟ اور کیا اسے قتل کرنے والا پکڑا گیا؟"

جواب دینے کی بجائے احمد سلمان لیلیٰ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے لیلیٰ کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا ابو!" لیلیٰ اپنے باپ کو بدستور خاموش دیکھ کر پھر بولی۔ "حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ مجھے؟"

"اس لیے لیلیٰ کہ... کہ وہ تمہارا شوہر تھا اور... اور اس کے قتل کی خبر سن کر تمہیں اس قدر..." احمد سلمان نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی کہ غالباً احمد سلمان کو اظہارِ مدعا کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں ابو کہ مجھے یہ خبر سن کر رونا

چاہیے تھا۔" یہ کہتے ہوئے لیلیٰ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا: "رویا ان کو جاتا ہے ابو جن سے محبت ہوتی ہے۔ مجھے تو اس سے نفرت تھی، شدید نفرت!"

"تمہیں اس سے نفرت تھی لیکن... لیکن تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا اور ہم... ہم نے بھی اس نفرت کو محسوس نہیں کیا بیٹی!" احمد سلمان بدستور حیرت سے بولا۔ "آج سے پہلے تو تم نے کبھی اشارتاً بھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

"آج سے پہلے ابو خود میں نے بھی اس کا اصل چہرہ نہیں دیکھا تھا۔" لیلیٰ نے یہ کہہ کر وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے خود شریف نے آج ہی اپنے بارے میں بتایا تھا۔ آخر میں اس نے کہا: "اب آپ ہی بتائیے ابو کہ اس غدار اور بے وفا شخص کی موت پر مجھے رونا چاہیے!"

"وہ... اسرائیلی ایجنٹ تھا مگر اس نے تم سے یہ اعتراف کیوں کیا؟" احمد سلمان شدید حیرت کے عالم میں بولا۔

"شاید اس کی روح پر گناہوں کا بوجھ بڑھ گیا ہوگا یا پھر اس کے ضمیر نے اسے مجبور کر دیا ہوگا کہ وہ اعترافِ گناہ کر لے۔" لیلیٰ نے کہا۔ اس کی آواز اب بھی پرسکون تھی۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے سطوت کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔ میں نے اس کے ذہن میں جھانکا۔ وہ اس وقت سوچ رہی تھی۔ میری روح پر بھی ایک بوجھ ہے اور میرا ضمیر بھی تو مجھے سکون نہیں لینے دے رہا۔ کیوں نہ میں بھی اعترافِ گناہ کر لوں!

نہیں! میرے ذہن نے اسے حکم دیا۔

اسی وقت احمد سلمان کی آواز سنائی دی: "شریف کا قتل بڑے پراسرار حالات میں ہوا ہے۔ اب تم سے اس کی حقیقت جاننے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید اسے اسی کے ساتھیوں نے قتل کر دیا ہے۔ ویسے اس کے قتل کا شبہ ایک نوجوان عورت پر کیا جا رہا ہے۔" احمد سلمان اپنی بیٹی لیلیٰ کو شریف کے قتل کی تفصیلات بتا رہا تھا: "شریف اس نوجوان عورت کے ساتھ قصر النیل کے ایک کیفے میں گیا تھا۔ وہ کیفے اس کی قیام گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ کیفے کے اس ویٹر کا یہ بیان ہے جو ان دونوں کے لیے چائے لے کر کیبن میں گیا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ نوجوان عورت شریف کو کیبن ہی میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ پھر جب ویٹر کافی دیر انتظار کے بعد کیبن میں خالی برتن اٹھانے کی غرض سے اندر پہنچا تو اس نے شریف کو میز پر سر رکھے دیکھا۔ پھر ویٹر کی نگاہ اردگرد پھیلے ہوئے خون پر پڑی اور وہ اپنی چیخ نہ روک سکا۔ شریف کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن کسی نے بھی گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔ غالباً جس ریوالور کی گولی سے اسے قتل کیا گیا اس پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ماری گئی تھی اس کی چیخ بھی نہیں سنی گئی۔ پھر کیفے کے مالک نے پولیس کو طلب کر لیا۔ شریف کے کوٹ کی جیب سے پولیس والوں کو جو کاغذات ملے، ان سے انہیں مجھ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ میں قصر النیل پہنچ گیا اور شریف کی لاش کو شناخت کر لیا۔ پھر پولیس کو مختلف افراد کے بیانات لینے اور دیگر ضروری کارروائی میں شام ہو گئی۔ اس کے بعد شریف کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا گیا۔ میں لاش کے ساتھ اسپتال بھی گیا مگر لاش کا فوری پوسٹ مارٹم ممکن نہ ہوا۔ میں نے اسپتال کے ذمہ دار افراد کو اپنے گھر کا فون نمبر دے دیا تاکہ وہ مجھے مطلع کر دیں لاش کب ملے گی۔ پھر میں گھر چلا آیا اور یہاں..." احمد سلمان ایک دم چپ ہو گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا: "اب سوچنا یہ ہے کہ پولیس کو شریف کی اصل شخصیت سے آگاہ کیا جائے یا نہیں!"

"میرا خیال تو یہ ہے ابو کہ ہمیں ایک ذمہ دار شہری بننے کی حیثیت سے یہ بات چھپانا نہیں چاہیے۔ ممکن ہے اس سے وہ لوگ کوئی فائدہ اٹھا سکیں یا کم از کم چوکنا ہی ہو جائیں۔" لیلیٰ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ اس دوران میں احمد سلمان کی بیوی قطعی خاموش بیٹھی رہی تھی اور میں بھی بہ ظاہر لاتعلق سا ایک طرف بیٹھا تھا جیسے ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"مجھے بھی تمہارے خیال سے اتفاق ہے لیلیٰ!" احمد سلمان نے لیلیٰ کی تائید میں کہا۔

میرے خیال میں وہ دونوں غلط خطوط پر سوچ رہے تھے۔ پولیس کے لیے اب یہ اطلاع قطعی بیکار تھی۔ پولیس کو یہ بتانا کہ شریف ایک اسرائیلی ایجنٹ تھا، ان حالات میں خود احمد سلمان اور لیلیٰ کے لیے پریشانیوں کا سبب ثابت ہو سکتا تھا۔ میں

نے اسی لیے ان دونوں کے ذہن سے اس خیال کو نکال دیا۔ شریف کا قتل اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ اعتراف جرم نہیں کر پایا تھا اور اس سے پہلے ہی اُسے قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل کرنے والے اسرائیلی ایجنٹ ہی ہو سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ اُنھوں نے شریف کے پاس یا اس کی قیام گاہ پر کوئی ایسا ثبوت نہیں پہنچنے دیا ہوگا جو اُسے اسرائیلی ایجنٹ ثابت کر سکے۔

میری ہی ترغیب پر پہلے لیلیٰ نے احمد سلمان سے کہا "مگر ابّو! پولیس والے مجھے بھی تو اس سلسلے میں ملوّث کر سکتے ہیں کہ میں ایک اسرائیلی ایجنٹ کی بیوی ہوں!"

"اور مجھ پر انھیں شبہ ہو سکتا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اس سے تمھاری شادی کی تاکہ وہ ہر شبہے سے بچا رہے" احمد سلمان کا ذہن میرے ذہن کے زیرِ اثر تھا اور وہی سوچ رہا تھا جو میں چاہتا تھا۔

"اس طرح تو ہم پر ایک اسرائیلی ایجنٹ کی معاونت اور اُسے پناہ دینے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔" لیلیٰ نے مزید کہا۔

"ان حالات میں تو پھر یہی بہتر ہے کہ ہم پولیس کو اس سلسلے میں کوئی بات نہ بتائیں" احمد سلمان کا لہجہ فیصلہ کُن تھا۔ پھر وہ اپنی بیوی سطوت کی طرف دیکھ کر بولا "سنو! تم بھی اس سلسلے میں اپنی زبان قطعی بند رکھو گی!" احمد سلمان کا لہجہ تحکمیہ تھا۔

"ٹھیک... ٹھیک ہے!" سطوت پہلی بار بولی اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

احمد سلمان خاصے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اسی لیے رات آٹھ بجے تک لیلیٰ کی حفاظت کا ایسا بندوبست ہو گیا کہ اب اُس محل نما عمارت میں کوئی بھی پولیس کی نظر میں آئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے اُس کی کوٹھی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ عمارت کے باہر ہر طرف چپّے چپّے پر پولیس والے موجود تھے۔ اِن انتظامات کے سبب کم از کم میں لیلیٰ کی طرف سے مطمئن ہو گیا لیکن میرے ذہن میں جو خلش تھی پھر بھی وہ کم نہیں ہوئی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو لیلیٰ کو قتل کرانا چاہتے ہیں اور اس کی وجہ کیا ہے؟ جب سب افراد کھانا کھا رہے تھے تو میرے ذہن میں اس عقدے کو حل کرنے کی ایک تدبیر آ ہی گئی۔ وہ پیشہ ور حبشی قاتل جو قدیم قاہرہ کے ایک محلّے جمالیہ میں رہتا تھا اور جو اپنے ہی کسی ساتھی کی گولی سے ہلاک ہو گیا تھا، وہ اس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ مجھے اُس کا نام اور پتا معلوم ہو چکا تھا۔ جمالیہ پہنچ کر یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اس کے روابط کن لوگوں سے تھے۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ اُنھی لوگوں کے ذہنوں کا مطالعہ کر کے میں اصل شخصیت تک پہنچ جاتا۔ میرے اس خیال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ مقتول حبشی تنہا اس معاملے میں ملوّث نہیں تھا بلکہ اس کے کچھ اور ساتھی بھی اس کی معاونت کر رہے تھے۔ اُنھی میں سے ایک نے میرا اور لیلیٰ کا تعاقب کیا تھا اور ایک نے افشائے راز کے خوف سے اُس حبشی کو قتل کر دیا تھا۔ مقتول حبشی کے ساتھیوں کا سُراغ لگانے کے لیے میرا جمالیہ پہنچنا ضروری تھا۔ میرے لیے پولیس والوں کی نظروں میں آئے بغیر اس عمارت سے نکلنا کوئی مشکل نہیں تھا اور یہ بھی آسان تھا کہ میری غیر موجودگی کا کسی کو علم نہ ہوتا۔ اس کے لیے میں احمد سلمان، لیلیٰ اور سطوت کو گہری نیند سُلا سکتا تھا۔

رات کے دس بجے تک کوٹھی پر گہرا سنّاٹا چھا گیا۔ احمد سلمان نے لیلیٰ کو نچلی منزل کے کمرے میں سونے کی بجائے اوپر میرے کمرے میں سلایا تھا اور خود برابر والے کمرے میں سویا تھا جو سطوت اور اس کی مستقل خواب گاہ تھی۔ احمد سلمان اسی وقت اپنی خواب گاہ میں گیا تھا جب لیلیٰ نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ احمد سلمان اور لیلیٰ کے خیال میں مجھے سوئے ہوئے نصف گھنٹا ہو چکا تھا۔ لیلیٰ اسی کمرے میں موجود دوسری مسہری پر سونے کے لیے جانے سے پہلے میری مسہری کی طرف آئی اور اس نے جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کے بعد وہ مطمئن ہو کر دوسری مسہری کی طرف بڑھ گئی۔ میرا اضطراب اس کا متحمل نہیں ہو سکا کہ میں لیلیٰ کے سونے کا انتظار کر سکتا۔ مجھے جمالیہ پہنچنے کی جلدی تھی جو وہاں سے کافی دور تھا۔ پھر مجھے صبح ہونے سے قبل واپس بھی پہنچنا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے لیلیٰ کے ذہن سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے ذہن پر غنودگی کا ابھی خفیف سا اثر بھی نہیں تھا۔ وہ اس وقت اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس کے ذہن کو سونے کی

ترغیب دی۔ کچھ ہی دیر میں لیلیٰ کے ذہن پر گہری غنودگی چھا گئی۔ وہ اب صبح ہونے سے قبل بیدار نہیں ہو سکتی تھی۔ کمرے میں اس کے گہرے گہرے سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔ لیلیٰ کو گہری نیند سلانے کے بعد میں نے احمد سلمان کے ذہن پر توجہ کی۔ وہ بھی بیدار تھا اور گزشتہ ہونے والے واقعات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں نے اُسے بھی گہری نیند سُلا دیا۔ پھر میں اس کی بیوی سطوت کے ذہن کو ٹٹولنے لگا۔ اُس کے ذہن پر شدید خوف غالب تھا۔ مجھے علم تھا احمد سلمان اتنی گہری نیند سو چکا ہے کہ سطوت خوف کے عالم میں چیخ بھی اُٹھتی تو وہ بیدار نہیں ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے اس گنہگار عورت کو مزید خوف زدہ کرنے کی خاطر اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ اس کے بستر میں ایک زہریلا سانپ گھس گیا ہے۔ میری توقع کے مطابق اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے شوہر کو پکارنا چاہتی تھی لیکن خوف کی زیادتی کے سبب اس کی قوتِ گویائی اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"اب وہ تمھارے پیٹ پر رینگ رہا ہے۔" میرے ذہن نے اُسے ایک اور دہشت میں مبتلا کر دیا۔ "اگر تم ذرا بھی ہلیں تو وہ سانپ تمھیں ڈس لے گا۔"

وہ پہلے ہی سے خوف زدہ تھی، مزید اس خوف نے اُسے اتنا دہشت میں مبتلا کیا کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اس کی بے ہوشی کو طول دے دیا۔ اب وہ بھی صبح ہونے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتی تھی۔ عمارت کے اندر موجود تینوں افراد کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے کچھ دیر نہیں کی۔ میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میرا وجود نادیدہ ہو چکا تھا۔ دروازے تک پہنچ کر میں نے اطمینان سے چٹخنی کھولی اور پھر باہر نکل کر دوبارہ دروازہ بھیڑ دیا۔ زینے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی بہت آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا ہے۔ میں رُکا نہیں اور زینے کی طرف بڑھتا رہا۔ ظاہر ہے وہ جو کوئی بھی تھا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زینے کے قریب پہنچ کر نیچے جانے کی بجائے میں وہیں رُک گیا۔ وہ مدھم سی آواز اب بھی سُنائی دے رہی تھی۔ چند سیڑھیوں کے بعد زینہ بائیں جانب مُڑ گیا تھا۔ اس لیے زینے کی ابتدائی سیڑھیاں میری نظروں سے اوجھل تھیں۔ اوپر چڑھنے والا ابھی زینے کے موڑ تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ یقیناً بہت محتاط شخص تھا، اسی لیے انتہائی سست رفتاری سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا ورنہ اب تک اُسے اُوپر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ زینہ تاریک نہیں تھا، کم پاور کا ایک بلب زینے کے موڑ پر لگا ہوا تھا تاکہ نیچے اور اوپر دونوں جانب اُس کی روشنی جا سکے۔

پھر تقریباً دو منٹ بعد میں نے زینے کے موڑ پر اُسے دیکھ ہی لیا اور چونک اُٹھا۔ وہ ایک پولیس والا تھا۔ اس کی وردی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی سب انسپکٹر تھا۔ زینے کے موڑ پر پہنچ کر وہ رُک گیا اور اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہونے لگا جیسے وہ کچھ سُننے کی کوشش کر رہا ہو۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی نیت صاف نہیں تھی ورنہ اسے عمارت کے اُوپری حصّے میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

"کون ہو تم؟" اچانک میں نے اُسے مخاطب کیا۔ میری آواز اس تک آسانی سے پہنچ سکتی تھی کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ توقع کے مطابق وہ ایک دم اُچھل پڑا اور آواز کی سمت کسی کو نہ پا کر اس کے چہرے پر خوف نظر آنے لگا۔

"جواب دو!" میں نے پھر سخت لہجے میں کہا۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میرے قدموں کی چاپ نے اُسے مزید خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس نے میرے قدموں کی چاپ تو سُنی تھی مگر ظاہر ہے کہ میرا جسم اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اچانک وہ مُڑا اور وہاں سے بھاگنے کے لیے نیچے کا رُخ کیا۔ میں نے لپک کر پیچھے سے اس کی قمیص کا کالر پکڑ لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا ذہن میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں تھا۔

"اب تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے!" میرے ذہن نے اُسے حکم دیا۔

"ہاں میں نہیں بھاگوں گا۔" وہ بڑبڑایا۔

"تم اُوپری منزل پر کیوں آئے تھے؟" میرے ذہن نے سوال کیا۔

"لیلیٰ کو قتل کرنے۔" اس کے ذہن نے جواب دیا۔

میں چونک اُٹھا اور پھر تفصیل کے ساتھ اُس کے ذہن

کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ بھی ایک پیشہ ور قاتل تھا اور پولیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے جس سب انسپکٹر کا میک اپ اپنے چہرے پر کر رکھا تھا، وہ اس وقت قاہرہ کے ایک نائٹ کلب میں عیاشی کر رہا تھا۔ اُس سب انسپکٹر نے اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر ہونے کا بھاری معاوضہ وصول کیا تھا۔ یہ بھاری معاوضہ اس سب انسپکٹر کو اسی پیشہ ور قاتل سے ملا تھا جس کے عوض وہ اپنی وردی دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

پھر میرے ذہن نے اس پیشہ ور قاتل سے جو آخری سوال کیا وہ یہ تھا کہ اسے کس نے لیلیٰ کے قتل پر مامور کیا تھا؟ جواب میں اس نے ہوٹل مونٹانا کے منیجر کا نام لیا۔ اس ہوٹل سے متعلق دیگر معلومات بھی میں نے اسی سے حاصل کیں۔ وہ شاہراہِ شریف پر واقع ایک نو منزلہ بلڈنگ کے ساتویں اور آٹھویں فلور پر تھا اور تیسرے درجے کے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا جس شخصیت تک پہنچنے کے لیے میں نے عباسیہ جانے کا قصد کیا تھا وہاں جائے بغیر ہی مجھے اس کا سراغ مل گیا تھا یقیناً ان حبشیوں کی خدمات بھی ہوٹل مونٹانا کے منیجر ہی نے حاصل کی ہوں گی۔ اب میری منزل عباسیہ کی بجائے شاہراہِ شریف تھی لیکن اس سے پہلے اُس پیشہ ور قاتل کا بندوبست کرنا ضروری تھا اور یہ جاننا بھی کہ کہیں اس کا کوئی اور ساتھی تو وہاں موجود نہیں پھر مجھے یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تنہا ہی تھا۔ ہر چند کہ مجھے اس پیشہ ور قاتل سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی لیکن بہرحال وہ معاشرے کے لیے ایک ناسور کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اسی لیے اس کے ذہن کو ایک ایسا حکم دیا کہ اُسے بھی سزا مل جائے اور اُس سب انسپکٹر کو بھی جس نے اپنے فرض سے مجرمانہ غفلت برتی تھی۔

اُس پیشہ ور قاتل کو زمالک کے پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرنا تھا لیکن اس کے لیے مصلحتاً میں نے دو گھنٹے بعد کا وقت مقرر کیا تھا۔ یہ دو گھنٹے اُسے وہاں موجود رہنے کی بجائے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزارنا تھے۔ یہ دو گھنٹے اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ کہے جا سکتے تھے کیوں کہ اسے زندگی میں پھر کبھی اس کا موقع نہ ملتا۔ اُس نے کئی قتل کیے تھے جن کا سراغ پولیس کو آج تک نہیں مل سکا تھا۔ اعترافِ جرم کے بعد وہ سزائے موت سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اس کا گھر شاہراہِ شریف پر ریڈیو اسٹیشن کی قدیم عمارت کے قریب ہی تھا جہاں سے اب صرف مقامی پروگرام نشر ہوتے تھے۔ یہ قدیم عمارت مارکونی بلڈنگ کہلاتی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن کی نئی اٹھائیس منزلہ عمارت قصر العینی کے علاقے میں تعمیر ہو چکی تھی۔ اس لیے اب قدیم مارکونی بلڈنگ میں واقع ریڈیو اسٹیشن کی اہمیت ضمنی ہو گئی تھی۔ قاہرہ والے عظیم بین الاقوامی شہر کے بارے میں وقتاً فوقتاً میں ضروری معلومات حاصل کرتا رہتا تھا کیوں کہ بیک وقت تمام باتیں جان لینا ممکن نہیں تھا کوئی بھی بات کسی بھی وقت میرے کام آ سکتی تھی۔ میں اسی لیے کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا اس پیشہ ور قاتل کا ذہن پڑھ کر بھی مجھے کئی نئی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔

مجھے اُس پیشہ ور قاتل سے تمام ضروری معلومات حاصل کرنے میں بمشکل پندرہ بیس منٹ لگے۔ وہ میرے حکم پر وہاں سے روانہ ہو گیا تو میں بھی مزید وہاں نہیں رُکا۔ نیچے پہنچ کر میں نے عمارت کے احاطے میں پولیس کو مستعد اور چوکنا دیکھا۔ ان کی موجودگی میں لیلیٰ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور جو خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ اب ٹل چکا تھا۔ میں ان لوگوں کے درمیان سے خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح گزر گیا اور انھیں احساس بھی نہ ہوا۔ جب میں اس محل نما عمارت سے نکلا تو رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ میں کچھ دور پیدل ہی چلا پھر میں نے اِرد گرد نظر ڈال کر اپنے وجود کی تجسیم کی۔ اُس سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ مجھے اسی لیے تقریباً دس منٹ ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا۔ میری جیب میں اب تک وہ رقم محفوظ تھی جو میں نے اسکندریہ ایئرپورٹ پر ایک کسٹم آفیسر کی جیب صاف کر کے حاصل کی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے کم عمر جان کر زیادہ کرایہ بتایا مگر میں یہ جاننے کے باوجود ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میں کسی دوسری ٹیکسی کا انتظار کر کے مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو شاید شبہ ہو گیا کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ وہ اسی لیے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "پانچ گنی ہیں بھی تمھارے پاس!"

مجھے اُس پر غصہ آ گیا اور پھر میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اُسے دکھائی اور کہا "یہ

دیکھو! اب یقین آ گیا!" نوٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر میں نے دوبارہ جیب میں رکھ لیے۔

"ہوں!" اس نے ہنکارا بھرا اور عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر وہ ٹیکسی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اُس وقت میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی مسکراہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن کچھ دیر بعد ہی مجھے گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ ٹیکسی کی رفتار غیر معمولی طور پر انتہائی تیز ہو گئی تھی۔ میں نے چونک کر کہا "یہ تم اتنی تیز کیوں چلا رہے ہو ٹیکسی؟"

"خاموش بیٹھے رہو!" خلافِ توقع وہ غرایا اسی کے ساتھ اس نے ٹیکسی کی رفتار اور بڑھا دی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے اس کے ذہن کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ مجھ سے رقم ہتھیانا چاہتا تھا۔ اُسے شاہراہِ شریف جانے کے لیے دُقی کا رُخ کرنا چاہیے تھا لیکن اس کی ٹیکسی تیزی سے علاقے امبابہ کی طرف جا رہی تھی۔ امبابہ آبادیوں میں سے ایک علاقہ تھا جہاں غریب طبقے کے افراد کی سکونت تھی۔ خود وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی وہیں رہتا تھا۔

ابھی میں صورتِ حال کو سمجھ ہی رہا تھا کہ ٹیکسی کی رفتار کم ہو گئی اور پھر وہ ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ وہ ایک ویران سڑک تھی جس کے کنارے ٹیکسی رُکی تھی۔ ٹیکسی رکتے ہی ڈرائیور تیزی سے میری طرف مڑا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے پھل کا ایک چاقو تھا جو اُس نے آگے جھک کر میری گردن پر رکھ دیا۔ چاقو کی نوک میری گردن کو چبھنے لگی۔ "نوٹوں کی گڈی نکال کر مجھے دے دو اور ٹیکسی سے اُتر جاؤ!" اس نے مجھے حکم دیا۔

"تم غریب آدمی ہو اس لیے مجھے نوٹوں کی گڈی دینے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن تمھیں اپنے چھ بچوں کو حرام کی کمائی نہیں کھلانا چاہیے۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔

وہ میری بات سن کر چونکا کیوں کہ ایک اجنبی سے اُسے اپنے بچوں کی تعداد سننے کی اُمید نہیں تھی۔

"یہ چاقو جیب میں رکھ لو، تم جتنی رقم کہو گے میں تمھیں دوں گا لیکن مجھے شاہراہِ شریف ضرور پہنچا دو۔ میں جانتا ہوں کہ اب سے پہلے تم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تمھارے دل میں بدی آئی ہے۔ تمھاری بیوی اعصابی مریضہ ہے جس کے علاج کی خاطر تمھیں رقم چاہیے کیوں کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ اگر تم عادی مجرم ہوتے تو شاید مجھے تم پر رحم نہ آتا لیکن یہ تمھارا پہلا جرم ہے اس لیے تمھیں معاف کیا جا سکتا ہے۔"

میری بات سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "مگ ... تم ... تم ... تمھیں ... یہ سب کچھ کیسے .... کیسے معلوم ہوا؟" وہ بمشکل رُک رُک کر بولا "کون ... کون ہو تم؟" یہ کہتے ہوئے اس نے چاقو میری گردن سے ہٹا لیا۔

وہ زمانے کا ستایا ہوا ایک مجبور اور غریب آدمی تھا مجھے اسی لیے اس پر رحم آ گیا تھا۔ اُس کا ذہن پڑھ کر مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ یہ میرے بس میں تھا کہ بالجبر اُسے شاہراہِ شریف لے چلتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ کمزوروں پر طاقت کا استعمال میرا شعار نہیں تھا۔ بغیر طاقت کا استعمال کیے کام چل سکتا تھا تو میں کیوں ایسا کرتا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی وہ گڈی نکال لی۔ اس کے علاوہ بھی میری جیبوں میں کافی رقم موجود تھی۔ میں نے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پُرسکون آواز میں کہا "کل تم اپنی بیوی کو قاہرہ کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھا سکتے ہو۔ یہی تو خواہش تھی تمھاری! ہاں یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے ڈر کر یہ رقم تمھیں دے رہا ہوں!"

"نن ... نہیں!" وہ ہکلایا "تم ... میں ... میں نہیں لوں گا!"

"تمھیں یہ رقم لینا پڑے گی!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "اگر تم نے رقم لینے سے انکار کیا تو میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا!"

"مجھے منظور ہے۔ میں نے تمھیں لوٹنے کی کوشش کی تھی اور ... اور مجھے اس کی سزا ملنا چاہیے!" وہ جذباتی ہو گیا اور اس کی آواز بھرا گئی۔

"تمھارے دل میں ابھی نیکی زندہ ہے یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی لیکن یقین کرو کہ میں اپنی خوشی سے تمھیں یہ رقم دے رہا ہوں تم اسے قبول کر لو۔" کافی وقت ضائع ہو چکا تھا اس لیے میں نے

اس کے ذہن کو اپنے ذہن کی گرفت میں لے لیا اور پھر اُسے اپنا حکم ماننے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے نوٹوں کی گڈی لے کر اپنے بوسیدہ کوٹ کی ایک جیب میں رکھ لی۔ اسی لمحے میں نے اُس کے ذہن سے اس واقعے کی تفصیل کھرچ دی۔ اب اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ میں ابھی چند لمحے پہلے اُس کی ٹیکسی میں بیٹھا ہوں

"کہاں چلنا ہے؟" اس نے بالکل معمول کے مطابق اس طرح کہا جیسے واقعی میں ابھی اس کی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا ہوں۔ پھر اُس نے کرایہ بتایا جو مناسب تھا۔

"شاہراہِ شریف" میں نے جواب دیا اور اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ کچھ دیر بعد ہی میں نے اُس سے رفتار تیز کرنے کو کہا اور اُس نے رفتار بڑھا دی۔ جب کوئی نصف گھنٹے کے بعد ٹیکسی شاہراہِ شریف پر پہنچ گئی تو میں نے اُس سے کہا "ہوٹل مونٹانا چلنا ہے۔"

"بہتر ہے" اس نے جواب دیا "وہ سامنے ہی نظر آرہا ہے، اُسی بلڈنگ میں ہے۔"

ہوٹل کے سامنے پہنچ کر میں نے کرایہ ادا کیا اور پھر اُس عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ اگر درمیان میں مجھے کوئی واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو میں وہاں کچھ پہلے پہنچ گیا ہوتا۔ وہاں اوپری منزل تک جانے کے لیے لفٹ موجود تھی۔ میں لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں انکوائری کاؤنٹر پر میں نے ہوٹل کے منیجر کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا اس کا کمرا آٹھویں منزل پر ہے۔ میں لفٹ کی بجائے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر پہنچا اور پھر مجھے منیجر کا کمرا تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ میں نے اس کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اُس وقت راہ داری میں کوئی نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا۔

"کون ہے؟" اندر سے جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"سعید" میں نے جواباً کہا۔ یہ اسی پیشہ ور قاتل کا نام تھا جسے لیلیٰ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔ فوراً ہی دروازے کے پیچھے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے باہر کسی کو نہ پا کر اس شخص کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ پھر اس نے راہ داری کی دونوں جانب نگاہ دوڑائی "وہ خالی پڑی تھی" آج شاید نشہ زیادہ ہو گیا!" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا اور پھر دروازہ بند کرنے لگا۔

میں اُس وقت کمرے کے اندر پہنچ چکا تھا۔ سامنے ہی ایک بڑی سی میز کے پیچھے آرام دہ کرسی پڑی تھی اور میز پر شراب کی بوتل نظر آرہی تھی جس کے قریب ہی گلاس رکھا تھا جو نصف سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ دائیں جانب پردہ پڑا ہوا تھا۔ میز کے سامنے دو کرسیاں موجود تھیں جن میں سے ایک پر میں بیٹھ گیا۔ وہ شخص دروازہ بند کر کے دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کا چہرہ گول اور پھولا ہوا سا تھا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اس کے جسم پر بہترین سوٹ تھا مگر اس کے باوجود اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر اچھا نہیں تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی مینڈک کا تصور اُبھرتا تھا۔ اس کا قد پستہ تھا اور جسم فربہ! پھر اس نے شراب کا گلاس ہونٹوں سے لگانے کے لیے اُٹھایا ہی تھا کہ میں بول اُٹھا "تم لیلیٰ کو کیوں قتل کرانا چاہتے ہو؟" وہ میری آواز سن کر اتنے زور سے اچھلا کہ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا البتہ گلاس سے شراب چھلک کر اس کے کپڑوں پر ضرور گر گئی۔ اس نے جلدی سے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ میں نے اُسے دوبارہ مخاطب کیا "گھبراؤ مت میں کوئی خبیث روح نہیں ہوں اور یہ بھی نہ سوچو کہ تمہیں نشہ زیادہ ہو گیا ہے۔"

"تم... تم کون ہو اور سامنے... سامنے کیوں نہیں آتے!" وہ ہمت کر کے بولا۔

میں اس دوران میں اس کا ذہن پڑھ کر بہت سی باتیں معلوم کر چکا تھا۔ وہ اُن غداروں میں سے تھا جو زندگی کی راحتیں حاصل کرنے کے لیے ملک و ملت کو فروخت کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک مقامی اسرائیلی ایجنٹ!

میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تم کب سے اسرائیل کے لیے کام کر رہے ہو؟"

اس بار وہ پہلے سے زیادہ زور سے چونکا اور پھر اس کے چہرے پر دہشت سی پھیل گئی۔ میں اس کا ذہن

پڑھتا رہا۔ لیلیٰ کو قتل کرانے کا حکم اُسے آج ہی ایک اسرائیلی ایجنٹ سے ملا تھا۔ وہ اسرائیلی ایجنٹ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ لیزا شمعون اس کا اصل نام تھا مگر وہ ایک امریکی سیّاح مارتھا کے نام سے مشہور تھی۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ لیلیٰ کو ایک اسرائیلی ایجنٹ قتل کرانا چاہتی تھی لیکن اس کا سبب ہوٹل کے منیجر کو بھی معلوم نہیں تھا، وہ تو بس حکم کا غلام تھا۔ لیزا اُسے بھی اپنے حسن کی بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ اس لیے بھی وہ اُس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ اُن حبشیوں کو بھی اس نے لیلیٰ کے پیچھے لگایا تھا لیکن میری مداخلت کے سبب معاملہ بگڑ گیا تھا۔ پھر اُس نے فوراً ہی دوسرا بندوبست کر لیا تھا۔

میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کا خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر چکا تھا۔ میں اسی لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمرا چھوڑنے سے پہلے میں نے منیجر کے ذہن سے اُسے پیش آنے والے پُراسرار واقعے کی ہر تفصیل محو کر دی۔ پھر میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ میرے ہی حکم پر اُس نے دوبارہ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ لیزا شمعون کے کمرے کا نمبر مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے میں آسانی سے وہاں تک پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے مجھے عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ "شائیں! شائیں!" یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چمڑے کا ہنٹر ہوا میں لہرا رہا ہو۔ پھر "تڑاپ" کی سی آواز آئی اور اس کے ساتھ ایک سسکی اُبھری۔ میں نے دروازے پر دستک دینے کی بجائے کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ کمرے کے اندر کا منظر میرے لیے واقعی حیران کن تھا۔ ایک دراز قد شخص کے ہاتھ میں واقعی ایک چمڑے کا ہنٹر نظر آرہا تھا اور سامنے ہی مسہری پر ایک حسین و جوان عورت پڑی تھی۔ اُس عورت کے جسم پر موجود باریک لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا جس سے اُس کی سرخ و سفید جلد نظر آرہی تھی۔ دراز قد شخص کی پشت دروازے کی طرف تھی جس کے سبب میں اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دراز قد شخص کے ہاتھ کو پھر حرکت ہوئی اور اس نے چمڑے کا ہنٹر بلند کیا۔ عورت ہنٹر کی ضرب سے بچنے کے لیے ایک طرف ہو گئی مگر فوراً ہی دوبارہ ہنٹر ہوا میں لہرایا اور اس بار وہ نہ بچ سکی۔ پھر تو جیسے اُس دراز قد شخص پر جنون سوار ہو گیا۔ وہ عورت کو بُری طرح ہنٹر سے ضربیں لگاتا رہا۔ عورت کے جسم پر جگہ جگہ ضربوں کے سبب نیل پڑے ہوئے تھے اور بعض جگہ سے خون بھی رس رہا تھا۔ مسلسل ضربوں نے اب اس عورت کی سسکیوں کو ہلکی ہلکی چیخوں میں تبدیل کر دیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد یہ کھیل ختم ہو گیا۔

وہ زخمی عورت لیزا شمعون ہی ہو سکتی تھی لیکن وہ دراز قد شخص کون تھا؟ اور اگر وہ لیزا شمعون ہی تھی تو پھر اس شخص سے کیوں پٹ رہی تھی؟ اس کمرے میں کھیلے جانے والے اس خوفناک کھیل کا مقصد کیا تھا؟ میرے ذہن میں سوالوں کا تانتا سا بندھ گیا اور اسی وقت میں نے زخمی عورت کی آواز سُنی "اب تو بتا دو، تم نے وعدہ کیا تھا کہ..."

"اگر... اگر میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا کہ... کہ ابھی کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا تو... تو پھر تم مجھے آسودہ کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوتیں۔" دراز قد شخص اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے عورت کی بات کاٹ کر بولا۔

"تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا میجر!" عورت کے لہجے میں سختی آگئی۔

"اس معاملے میں اتنی ہی رازداری... برتی جا رہی ہے کہ... کہ ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہو سکی۔" ادھیڑ عمر دراز قد شخص نے کہا۔

"اور شاید اس کی اُمید بھی نہیں ہے! کیوں ٹھیک ہے نا میرا خیال!" عورت کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے مجھے پوری اُمید ہے کہ..."

"جھوٹ مت بولو میجر!" عورت نے اُسے ڈانٹ دیا "تم چاہتے ہو کہ مجھ سے اسی طرح کھیلتے رہو۔"

"مجھ پر اعتماد کرو لیزا!" دراز قد شخص کی آواز میں التجا تھی۔

"نہیں!" عورت اُٹھ کر بیٹھ گئی "اب مجھ سے نہیں ملو گے میجر!"

"ایسا نہ کہو لیزا! تم واحد عورت ہو جس نے میرے جذبات

کو سمجھا ہے، محسوس کیا ہے اور مجھے آسودہ کیا ہے۔ اتنی بختی نہ کرو، رحم کرو مجھ پر!"

"میں تمھیں صرف ایک ہفتہ دے سکتی ہوں!" عورت ہونٹ بھینچ کر بولی "اگر تم پھر بھی ناکام رہے تو میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی اور ہاں اس ایک ہفتے کے دوران میں تم مجھ سے ملنے کی ہرگز کوشش نہیں کرو گے!"

"بس ایک بار! ہفتے میں صرف ایک بار لیزا!" دراز قد شخص گڑگڑایا۔ پہلے تو عورت انکار کرتی رہی، پھر اس نے دراز قد شخص کی بات مان ہی لی "اچھا ٹھیک ہے" وہ بولی۔ "لیکن یہ خیال رکھنا اسپرے ختم ہو گیا ہے!"

"پچھلی بار آیا تھا تو اسپرے میں کافی دوا تھی!"

"ہاں تم بھی تو کسی جگہ ضرب لگائے بغیر نہیں رہتے اس لیے میں تمھارے ہر حصے پر اسپرے کرتی ہوں۔ پھر بھی جب اس کا اثر ختم ہونے لگتا ہے تو بس میں ہی جانتی ہوں کہ کیا گزرتی ہے مجھ پر! تم بہت دیر لگانے لگے ہو اب!"

میرے لیے ان دونوں کی گفتگو ناقابلِ فہم تھی۔ یہ جانے وہ کیا باتیں کرنے لگے تھے۔ لیزا شمعون کو دیکھ کر ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا تھا کہ شاید لیلیٰ کے شوہر شریف کو اسی نے قتل کیا ہے کیوں کہ شریف کے قتل کا شبہ ایک عورت ہی پر کیا جا رہا تھا۔ دراز قد شخص کا تعلق فوج سے تھا اور لیزا ایک غیر ملکی ایجنٹ تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ لیزا اس شخص کے ذریعے کچھ خفیہ راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے دراز قد شخص کے ذہن پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور پھر مجھ پر بیک وقت کئی حقیقتوں کا انکشاف ہوا۔ اس دراز قد شخص کو لیزا پر شبہ ہو چکا تھا کہ وہ یقیناً کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہے لیکن یہ جاننے کے باوجود بھی وہ ضمیر فروشی پر آمادہ تھا۔ لیزا سے اس شخص کو متعارف کرانے والا ہوٹل کا منیجر تھا۔ ہوٹل کے منیجر اور دراز قد شخص کے تعلقات کی نوعیت ایک طرح سے کاروباری تھی۔ منیجر دراز قد شخص کے لیے ایسی لڑکیاں فراہم کرتا تھا جو اس کی کج روی کے لیے آسودگی کا ذریعہ بن سکیں مگر لڑکیاں عموماً ایک ہی بار کے تلخ تجربے کے بعد بھاگ جاتی تھیں اور پھر کبھی ہوٹل لوٹنا کا رُخ نہیں کرتی تھیں حالانکہ انھیں جسمانی اذیت برداشت کرنے کا بھاری معاوضہ ملتا تھا۔ اس تمام عرصے میں صرف لیزا شمعون ہی ایسی مضبوط عورت ثابت ہوئی تھی جو مسلسل دو ماہ سے دراز قد شخص کا شکار بنی ہوئی تھی۔ دراز قد شخص ہر دوسرے تیسرے دن آ جاتا تھا۔ ابتدا میں لیزا کو بھی شدید جسمانی اذیت سے گزرنا پڑا تھا مگر دوسری ہی ملاقات میں اس نے اس کا حل دریافت کر لیا تھا۔ وہ ایک دوا تھی جو تمام جسم پر اسپرے کی جاتی تھی۔ اس دوا سے ایک مخصوص وقت تک کے لیے سارا جسم بے حس ہو جاتا تھا۔ لیزا نے دوسری ہی ملاقات میں اس دوا کا تجربہ کر لیا تھا۔ اس دوا میں اگر کوئی خرابی تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ زیادہ عرصے کے لیے جسم کو سُن نہیں رکھ سکتی تھی۔ لیزا کے لیے یقیناً وہ عرصہ بہت تکلیف دہ ہوتا تھا جب دوا کا اثر ختم ہو جاتا تھا۔ دو ماہ کے عرصے میں لیزا نے اس دراز قد شخص کو گویا اپنا بے دام غلام بنا لیا تھا۔ دراز قد شخص کو کچھ عرصے پہلے لیزا ہی سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ اس کا ملک خفیہ طور پر کچھ اہم فوجی تیاریاں کر رہا ہے۔ لیزا کو ان تیاریوں کی تفصیلات درکار تھیں۔ وقتاً فوقتاً لیزا اس سے مصری افواج کے متعلق اور بھی بہت سی تفصیلات معلوم کرتی رہتی تھی۔ دراز قد شخص کے علم میں جو کچھ تھا، وہ اب تک لیزا کو بتا چکا تھا لیکن اب لیزا جو کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں کوشش کے باوجود وہ کوئی کارآمد بات معلوم نہیں کر سکا تھا۔ دو دن پہلے جب وہ آیا تھا تو لیزا نے اُسے آسودہ کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، کیوں کہ وہ اس مرحلے میں ناکام رہا تھا۔ [illegible] اس نے جھوٹ بول کر اپنا کام نکالا تھا۔

میں نے جتنی دیر میں اس دراز قد شخص کے ذہن کا مطالعہ کیا، لیزا نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ اب وہ اپنے جسم کے زخمی حصوں پر کوئی دوا لگا رہی تھی۔ دراز قد شخص جانے کے لیے مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں اسی دوران میں اس غدارِ وطن فوجی کے لیے سزا تجویز کر چکا تھا۔ مجھے اس پر اتنا ہی شدید غصہ آ گیا تھا ورنہ میں کبھی وہ قدم نہ اُٹھاتا۔ جیسے ہی وہ لیزا سے اجازت لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے کی بھول سے کمرے میں جھانکنے کی ضرورت

...لی۔ چند لمحے بعد ہی قدموں کی چاپ دروازے پر ...گی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دراز قد شخص نے باہر نکلنے ...کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اسے دوبارہ کمرے میں ...دھکیل دیا۔ وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چت ...زمین پر گر پڑا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا تمھیں؟" لیزا اسے فرش پر گرتے دیکھ ...کر بولی اور پھر اسے اُٹھانے کے لیے لپکی۔

اس دوران میں دراز قد شخص کہنی کے بل اُٹھنے کی ...کوشش کرنے لگا۔ لیزا اس کے قریب پہنچ کر جھکی ہی تھی کہ ...سہارا دے کر اُٹھائے۔ وہ پھر کراہ کر ڈھیر ہو گیا۔ اس ...نے پیر کی ٹھوکر اس کی کہنی پر پڑی تھی اور اسی کے ساتھ ...ٹھوڑی پر میرا مکا پڑا تھا اور لیزا اُچھل کر دور جا گری۔ مکا ...زور سے پڑ گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اب تک کھلا ہوا ...میں نے پلٹ کر اسے اندر سے بند کر دیا۔ جب میں دروازہ ...کر کے پلٹا تو اُن دونوں کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے ...سبب اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے انھوں نے کوئی ناقابلِ ...یقین منظر دیکھ لیا ہو۔ وہ دونوں ابھی تک فرش ہی پر ...پڑے تھے۔ اُن کی حیرت کا سبب میں سمجھ چکا تھا۔ ان کے ...سامنے کمرے کا دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا اور پھر خود ہی ...کنڈی لگ گئی تھی کیوں کہ ان کی آنکھوں نے یہی دیکھا ہو گا ...میں جہاں کھڑا تھا اُس سے کچھ فاصلے ہی پر چمڑے کا وہ ہنٹر ...پڑا ہوا تھا جس سے دراز قد شخص نے لیزا کو ضربیں لگائی ...تھیں۔ میں آگے بڑھا اور فرش سے ہنٹر اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد ...پہلے اس کمرے میں جو تماشا ہو رہا تھا میں اُسے دہرانا چاہتا تھا لیکن ...میرا مقصد اُن دونوں سے مختلف تھا۔

ہنٹر کو یوں آپ ہی آپ فضا میں بلند ہوتے دیکھ کر میجر کا ...چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ دہشت زدہ سی آواز میں لیزا کی طرف دیکھ کر ...چلایا "لی... لیزا... وہ... وہ ہنٹر... ہنٹر!" لیزا ابھی تک ...فرش پر پڑی ہوئی اپنی ٹھوڑی سہلا رہی تھی۔ اس نے ہنٹر کو ...زمین سے اُٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اب جو اس نے میجر کے کہنے ...پر ہنٹر کو فضا میں معلق دیکھا تو اس کے منہ سے ایک دبی دبی سی ...چیخ نکل گئی۔ پھر وہ جذباتی انداز میں چیخی "میجر! ہم... ہم کسی ...شیطانی چکر میں پھنس گئے۔ بھاگو!... بھاگو یہاں سے!"

کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ گیا ہے
ہزاروں قارئین کی پسندیدہ تحریر
پرچھائیں
تحریر
ایم۔ اے راحت
دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی داستان
اس لڑکے کی کہانی
جس کی صورت ایک امیر زادے
سے مشابہ تھی
مکمل کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے
قیمت -/60 روپے محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔
گل قریشی پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11 [illegible] لاہور
فون: 7229762 - 7248690

یہ کہتے ہی نہ جانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ اٹھ کر تیر کی طرح دروازے کی طرف لپکی۔

میں نے جھپٹ کر اس کے لہراتے ہوئے سنہری بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا، پھر انہیں جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے چیخ کر وہ پھر پشت پر آ رہی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ان دونوں کی چیخ پکار دوسرے کمروں کے لوگوں یا ہوٹل کے ملازمین کو اس طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے ذہن نے ان دونوں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر باری باری ایک حکم دیا "انتہائی جسمانی اذیت برداشت کرنے کے باوجود تم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چیخے گا!" اس کے بعد میں نے ہنٹر ہاتھ میں لے لیا۔ ہنٹر کی شدید ضرب نے میجر کے جسم کو دہرا ہونے پر مجبور کر دیا مگر اس کے منہ سے چیخ نہیں نکلی۔ پھر تو میں نے میجر کے جسم کو دھن کے رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر میں لباس کی بجائے اس کے جسم پر چیتھڑے نظر آ رہے تھے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی۔ لیزا دہشت کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی مگر اس نے مداخلت نہیں کی۔ معاً میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے۔

"اب تم کھڑے ہو جاؤ میجر!" میرے ذہن نے اُسے حکم دیا اور اس نے فوراً تعمیل کی۔ پھر میں نے اسے دوسرا اور آخری حکم دیا "اب تم جاؤ۔ کل صبح تمہیں اپنے کمانڈر کے سامنے پیش ہو کر یہ اعتراف کرنا ہے کہ تم ایک غیر ملکی ایجنٹ کو معلومات فراہم کرتے رہے ہو۔ تمہیں اپنے کمانڈر کے روبرو اپنے ایک ایک گناہ کا اعتراف کرنا ہے، یہاں تک کہ اپنی کج روی کا بھی!"

"ہاں میں ایسا ہی کروں گا۔" وہ بڑبڑایا اور پھر اس کے قدم دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا لیکن بہرحال اس قابل ضرور تھا کہ ہوٹل سے نکل کر اپنی منزل تک پہنچ جاتا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے چٹخنی کھولی اور پھر پٹ کھولنے لگا۔

"مجھے... میجر!" لیزا کے منہ سے ڈری ڈری سی آواز نکلی "میں... میں... مجھے تنہا نہ چھوڑو... مجھے بھی لے چلو... لے چلو یہاں سے!"

میجر نے اُسے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا کیوں کہ اس

رنگ برنگے حلقوں کی سرزمین

ہزاروں قارئین کے پسندیدہ قلمکار اور سینکڑوں خوبصورت تحریروں کے خالق ایم اقبال کا ایک اور تحفہ

ایک انمول شاہکار

جبر و نادر

مرد آید کہ ہراساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

وقت اور حالات کے شعلے اپنی زد میں لیے ہر وقت شکار کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے والا ہر شخص ان شعلوں کی لپیٹ میں آتا ہے۔ بعض لوگ ان شعلوں میں جل کر کندن ہو جاتے ہیں اور کچھ ان کی تپش سے جھلس جاتے ہیں

ماضی، حال اور مستقبل کی ایسی داستانِ مسلسل جس میں بہت سے شناسا چہرے نظر آئیں گے!

آج ہی ایک خط لکھ کر طلب فرمائیں

گل قریشی پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

11- مزنگ روڈ، اسلام پورہ، لاہور

فون: 7228762-7246599

کا ذہن اب تک میرے ذہن کی گرفت میں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تو میں نے آگے بڑھ کر دوبارہ اُسے بند کر دیا۔ پھر میں نے پلٹتے ہی بلند آواز میں کہا "ہاں تو لیزا شمعون اب تم یہ بتاؤ کہ لیلیٰ کو کیوں قتل کرانا چاہتی ہو؟" پھر میں اس کے قریب پہنچ گیا اور مزید بولا "فرش سے اٹھ کر مسہری پر بیٹھ جاؤ اور جو میں سوالات کر رہا ہوں ان کے ٹھیک ٹھیک جواب دو ورنہ تمہارا حشر میجر سے بھی زیادہ ہولناک ہو گا!" اٹھو میں نے اس کے جسم کو ٹھوکر ماری۔ وہ لرزتی کانپتی فرش سے اٹھی اور مسہری پر جا بیٹھی۔ میں چاہتا تو اس کا ذہن پڑھ کر سب کچھ معلوم کر لیتا مگر ایک تو میں ہر موقع پر اپنے وجود میں چھپی ہوئی پراسرار قوتوں کو استعمال کرنے سے گریز کرتا تھا۔ دوم اُسے ذہنی اور جسمانی اذیت بھی پہنچانا چاہتا تھا۔ ذہنی اذیت کے لیے اس کا دہشت زدہ ہونا ہی کافی تھا۔ میں نے اُسے مزید دہشت زدہ کرنے ہی کے لیے مخاطب کیا تھا ورنہ تو اب تک جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اُس سے کم خوف زدہ نہیں تھی۔

لیزا خاموش رہی تو میں نے آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لیے اور انہیں جھٹکا دے کر بولا "بولو! جواب دو میرے سوال کا! تم اس بے گناہ لڑکی کو کیوں قتل کرانا چاہتی ہو؟"

عام حالات میں کوئی بھی ایجنٹ انتہائی جسمانی اذیت برداشت کرنے کے باوجود زبان نہیں کھولتا مگر وہ عام حالات نہیں تھے۔ لیزا سے جو بھی سوال کر رہی تھی وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لیزا اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی اور بے ساختہ اس کی زبان پر آگیا "مجھے شک ہے کہ اس کے شوہر نے اُسے ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہو گا، ہمارے نام اور پتے!"

"شریف تمہارے ہی ہاتھوں قتل ہوا تھا؟" یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اس کے بال چھوڑ دیے۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"اس کے قتل کا سبب یقیناً وہ اعتراف ہی ہو گا جو وہ مصری حکام کے سامنے کرنے والا تھا؟"

اس بار لیزا نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے جرائم کا اعتراف کرنے جا رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جرائم کا اعتراف نہیں بلکہ اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری تھی۔" لیزا سر اٹھا کر عجیب سے لہجے میں بولی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خود پر بڑی حد تک قابو پا چکی ہے۔

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے!" میرے لہجے میں سختی آگئی۔

"مگر یہ ضروری بھی تو نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں!" لیزا کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ پھر اس نے کہا "میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور خود کو میری نظروں سے کس طرح چھپائے ہوئے ہو مگر میں اتنا ضرور سمجھ چکی ہوں کہ تم اپنی تمام تر پراسرار قوتوں کے باوجود وہ باتیں نہیں جانتے جو مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم مجھ سے سوالات نہ کرتے۔ میں نے اسی لیے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی چاہے تم مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دو۔" اُس کا لہجہ مستحکم تھا اور اس کی پختگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے اپنی بات پوری کر کے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

میں اس کی حماقت پر ہنس دیا، پھر بولا "اگر تم اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ میں تمہیں بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا تو ایسا نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ جو باتیں میں تم سے پوچھ

حضرت جان

قاضی عبدالستار

قاضی عبدالستار کا نام ہی قلم کی آبرو کا ضامن ہے۔
لفظوں کی سیپ میں روشن دیپ 'تحریر کے غازی' نام کے
قاضی نے حضرت جان میں روشن کئے ہیں جو زبان و
بیاں کے رسیا صاحب ذوق لوگوں کے لئے ہے۔

ملنے کا پتہ: ناشر

گل قریشی لائبریری 11- مزنگ روڈ اسلام پورہ لاہور۔ فون: 7248599 7229762

ہوں وہ تمہارے بتائے بغیر مجھے معلوم نہ ہوں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ تم نے مجھے اپنا اصل نام نہیں بتایا اور میں تمہارا نام جان گیا!" یہ کہہ کر بس لمحے بھر کو میں نے اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کی اور مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ ہر فرد کسی نہ کسی شے سے انتہائی خوف کھاتا ہے اور یہ خوف اس کے لاشعور میں پڑی ہوئی کسی گرہ کے سبب ہوتا ہے۔ کوئی چھپکلی سے ڈرتا ہے، کوئی چوہے سے اور کسی کو مکڑیوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ لیزا مکڑیوں سے ڈرتی تھی۔ یہ جاننے کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا "لیزا! تم نے ابھی کہا تھا کہ میں چاہے تمہیں قتل کر دوں، تم میرے کسی سوال کا جواب نہیں دو گی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکو گی۔ ابھی چند لمحے بعد ہی تمہارے سارے جسم پر مکڑیاں رینگنے لگیں گی تو . . ."

"نن . . . نہیں . . .!" وہ ہاتھ اٹھا کر چیخی۔

میں نے صرف اتنا کیا کہ اس کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ مکڑیاں اس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔ اس نے خوف زدہ ہو کر چیخنا چاہا مگر اسی لمحے میرے ذہن نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ "تم چیخو گی نہیں لیزا!" میرے ذہن نے اسے حکم دیا۔

اس کی حالت بہت عجیب تھی۔ وہ ان خیالی مکڑیوں کو بھی میرے وجود کی طرح نادیدہ سمجھ کر حقیقی جان رہی تھی اور سارے کمرے میں ناچتی ناچتی پھر رہی تھی۔ اس کے چہرے سے انتہائی خوف اور اذیت کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ اذیت میں اُسے جان بوجھ کر دے رہا تھا۔ ورنہ اس کا ذہن پڑھ کر بہ آسانی سب کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ میں اس کے دعوے کو باطل کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی قیمت پر میرے سوالوں کے جواب نہیں دے گی۔

پھر چند ہی منٹ میں اس کی قوتِ ارادی جواب دے گئی اور وہ چیخ اٹھی "میں . . . میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہوں۔ مجھے . . . مجھے اس عذاب سے نجات دلا دو!"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ میں تمہیں قتل ہی کیوں نہ کر دوں، میرے کسی سوال کا . . ."

"غلط کہا تھا میں نے۔" وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔ "معاف کر دو مجھے! اس عذاب سے بچا لو مجھے! تمہارا احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی اور . . . اور جو تم کہو گے کروں گی۔"

پھر میں نے اُسے اس عذاب سے نجات دلا ہی دی جو صرف اس کے محسوسات کے دائرے تک اپنا وجود رکھتا تھا، در حقیقت اس کا وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد لیزا مسہری پر یوں نڈھال ہو کر گر پڑی جیسے کہیں دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔ اس کے سانس بے ترتیب تھے۔ اسے اپنی حالت قابو میں لانے میں کچھ دیر لگی اور پھر وہ کہنی کے بل نیم دراز ہو گئی۔

"اب تم حواس میں معلوم ہوتی ہو اور غالباً میرے سوالوں کا جواب دینے پر بھی آمادہ نظر آتی ہو!" میں نے اس سے کہا۔ پھر اطمینان سے وہ سوال دہرایا جو اس سے پہلے کر چکا تھا۔ "لیزا! تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ شیلے اوران مجرم کرشمہ والا تھا؟"

"تمہارا اس سے ملنے اس کے گھر قصر النیل گئی تھی۔" اس نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔ "جب میں وہاں پہنچی تو وہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے کہیں جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بریف کیس تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے حالات کے غیر معمولی ہونے کا احساس ہو گیا! اس کی حالت کسی ایسے شخص جیسی تھی جو نیند کے عالم میں چل رہا ہو۔ میں نے اس سے بات کی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ کسی ہپناٹسٹ کے زیرِ اثر تھا۔ اس نے میرے ایک سوال کے جواب میں مجھے بتا دیا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ اس کے بریف کیس میں اہم ترین کاغذات موجود تھے جو اسے اسرائیلی ایجنٹ ثابت کر سکتے تھے بلکہ قاہرہ، دمشق اور دیگر شہروں میں جو اسرائیلی ایجنٹ مقامی اور غیر مقامی تھے، سبھی کے نام اور پتے اس نے لکھ کر بریف کیس میں رکھ لیے تھے۔ وہ ان کاغذات کو مصر کی وزارتِ دفاع کے اعلیٰ حکام کے سپرد کرنے جا رہا تھا۔ میں نے موقع دیکھ کر اس کے جذبات اور احساسات پر قبضہ کر لیا۔ پھر اسے اپنے ساتھ ایک قریبی کیفے میں چلنے کی دعوت دی۔ وہاں میں نے اس سے یہ دریافت کیا کہ وہ اور کس کس کو یہ راز بتا چکا ہے؟ جواب میں اس نے صرف اپنی بیوی لیلیٰ کا نام لیا۔ میں اس وقت اسے

یہ پوچھنا بھول گئی کہ لیلیٰ کو اس نے اور کیا کیا بتا دیا ہے؟ یعنی کہیں اس نے لیلیٰ کو اسرائیلی ایجنٹوں کے نام اور پتے بھی تو نہیں بتا دیے؟ بعد میں جب میں نے اُسے قتل کر دیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں اسے قتل کرنے کے بعد وہ بریف کیس لے کر وہاں سے فرار ہو گئی۔ پھر میں نے فوری طور پر اپنے ایک مقامی ایجنٹ کے ذریعے لیلیٰ کو قتل کرانے کا بندوبست . . ."

"اور وہ مقامی ایجنٹ اسی ہوٹل کا منیجر تھا۔" میں اسے حیرت میں ڈالنے کے لیے درمیان میں بول اُٹھا۔

وہ چونک اُٹھی "تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے!"

جس وقت وہ میرے سوال کا جواب دے رہی تھی میری توجہ اس کے ذہن پر تھی کہ کہیں وہ دروغ گوئی تو نہیں کر رہی! اسی دوران میں اس کے ذہن کا مطالعہ کر کے مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جس کا تعلق اس کی جنس سے تھا۔

"لیزا!" میں نے اُسے مخاطب کیا "تم صرف ایک شخص کا انتقام پوری ایک قوم سے لے رہی ہو! کیا تم ایسا کرنے میں حق بجانب ہو؟"

"میں . . . میں نہیں سمجھی کہ . . . کہ تم . . . تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ چونکی اور رک رک کر بولی۔

"تمہارا شوہر کیپٹن شمعون عرب اسرائیل جنگ کے دوران میں مارا گیا تھا۔ تو جس طرح تمہارا شوہر جنگ میں مارا گیا، ہزاروں عرب فوجی نہیں مارے گئے ہوں گے! کیا ان کی بیویاں بیوہ نہیں ہوئی ہوں گی! کیا ان کی اولادیں یتیم نہیں ہو گئی ہوں گی!"

"جس کا گھر جل گیا ہو اُسے یہ کہہ کر تسلی نہیں دی جا سکتی کہ سارا شہر جل گیا ہے، تمام شہر میں کوئی گھر سلامت نہیں!" لیزا کے لہجے میں تلخی تھی۔ پھر وہ بدستور تلخ لہجے میں بولی "میں جس قوم سے تعلق رکھتی ہوں، وہ دنیا کی مظلوم ترین قوم ہے۔ اس قوم کو تمام اقوام نے مل کر نیست و نابود کرنا چاہا۔ دوسری جنگِ عظیم کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ کیا ستم نہیں ہوئے اس قوم پر! پھر بھی یہ قوم زندہ رہی اور اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک یہ دنیا باقی ہے۔ اسے نہیں مٹایا جا سکتا! اس طویل و عریض کرۂ ارض پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس قوم کے پاس ہے، وہ بھی دوسری قوموں کی نظر میں کھٹکتا ہے۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے!"

میں تلخی سے ہنس دیا کیوں کہ مجھے اس قوم کی تاریخ کا علم تھا۔ میرے حافظے میں سب کچھ محفوظ تھا اسی لیے جواباً میں نے کہا "تمہیں شاید تمہاری قوم کی تاریخ نہیں پڑھائی گئی ورنہ شاید تم اپنی قوم کو مظلوم نہ کہتیں۔ تم انصاف کی بات کرتی ہو تو بتلاؤ کیا یہ انصاف ہے کہ دوسروں کے گھر آ جا کر انہیں بے گھر اور بے خانماں کر کے ان کے گھر لے لیے جائیں؟"

"یہ ہم پر سراسر الزام ہے۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا "وہ زمین ہماری تھی جو ہم نے بالآخر حاصل کر لی۔"

"اور یہ جو تمہاری قوم کے افراد مختلف عرب ممالک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں! اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

"ہمارے وجود کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو مضبوط و مستحکم نہ ہونے دیں۔ جس طرح ہم ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ بھی تو ایسا کرنے میں آزاد ہیں۔ کیا تمام عرب ممالک کے دروازے غیر ملکیوں کے لیے بند کر دیے گئے ہیں؟ مگر ہماری قوم کے لوگ اپنے ملک و ملت کے وفادار ہیں۔ وہاں کسی بھی قیمت پر لوگوں کو خریدا نہیں جا سکتا۔ وہاں غدار نہیں ہوتے۔ اگر ان میں بھی غدار ہوتے تو اب تک اس کا وجود مٹ چکا ہوتا۔ ہر فرد کو اپنی قوم کے مفادات کی خاطر اپنے جسم و جان کی بازی لگانے کی پوری آزادی ہے۔ پھر اب تک اس آزادی سے عربوں نے کوئی فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟ میں جو اپنے وطن سے دور ہر لمحہ موت کے قریب ہوں، کیا تمہارے خیال میں اس سے واقف نہیں کہ میری زندگی کا کوئی بھی لمحہ آخری لمحہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ پیشہ اپنانے پر کسی نے مجبور نہیں کیا۔ میں نے خود یہ راہ اپنائی ہے۔"

"تم نے خود کو دھوکا دیا ہے لیزا! تم نے اپنی قوم کی خاطر نہیں بلکہ اپنی ذاتی انا کی تسکین کے لیے یہ راہ منتخب کی ہے۔"

"اگر ایسا بھی ہے تو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا لیزا کہ وہ بچہ جسے تم اپنی ماں کے پاس اسرائیل میں چھوڑ آئی ہو، وہ تمہیں یاد کرتا ہو گا! تم نے اس

سکے جذبات پر ضرب لگائی۔ وہ جیسے تڑپ اٹھی اور بے چینی کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اسے خبر بھی نہ ہوگی کہ اس کی ماں کہاں اور کس حال میں ماری گئی! وہ شاید ساری زندگی تمہاری واپسی کا انتظار کرتا رہے گا۔"

"میرا بچہ!" وہ سسک اٹھی۔ میں نے دانستہ اسے اس کے بچے کی یاد دلا کر روحانی کرب میں مبتلا کیا تھا۔ اس کے بچے کی عمر آٹھ سال تھی اور اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد تھا۔ میں اسے جتنی جسمانی اور روحانی اذیت دینا چاہتا تھا دے چکا تھا اور اب فیصلہ کن لمحات آ چکے تھے۔ میں نے اس کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کے تابع کر لیا، پھر اسے حکم دیا۔ "لیزا! تم خود کو مصری حکام کے حوالے کر دو گی!" میرے اس حکم پر اس کے ذہن نے کسی قدر مزاحمت کی لیکن بالآخر سپر ڈال ہی دی۔ میں نے اسے دوسرا حکم دیا۔ "مصر میں جتنے بھی مقامی اور غیر مقامی اسرائیلی ایجنٹ تمہارے علم میں ہیں، تم ان کے نام اور پتے مصری حکام کے حوالے کر دو گی۔"

"میں ایسا ہی کروں گی۔" وہ بڑبڑائی۔ اس کا ذہن پوری طرح میرے قابو میں تھا۔

"تم نے اب تک یہاں اس ملک میں رہ کر جو کچھ اس کے خلاف کیا ہے اور جو معلومات جس شخص سے بھی حاصل کی ہیں ان کی پوری تفصیل سے مصری حکام کو آگاہ کر دو گی اور تمہارے پاس اس سلسلے میں جو بھی تحریری ثبوت ہیں، وہ بھی ان کے سپرد کر دو گی! تمہیں یہ بالکل یاد نہیں رہے گا کہ ایسا کرنے کے لیے کسی نے تمہیں مجبور کیا تھا۔ تم مصری حکام سے یہی کہو گی کہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر تم نے اعتراف جرم کیا ہے۔ اٹھو اور اپنے کمرے میں موجود تمام ثبوت اکٹھا کر کے تحریر اسکوائر روانہ ہو جاؤ۔ تحریر اسکوائر کی اس دس منزلہ عمارت کا علم ہوگا ہی تمہیں جس میں پولیس ہیڈ آفس بھی ہے اور سی آئی ڈی آفس بھی!!" اس کے ذہن نے اثبات میں جواب دیا اور پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں کچھ دیر مزید وہیں رک کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اسی وقت مجھے یہ خیال آیا کہ شریف کو بھی میں نے یہی حکم دیا تھا، لیکن وہ اعتراف جرم سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ کہیں اسی سے ملتا جلتا کوئی واقعہ لیزا کو بھی پیش نہ آ جائے۔ یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک لیزا سی آئی ڈی آفس پہنچ کر اعتراف جرم نہیں کر لے گی، میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اس وقت اس کا ہر عمل میرے ذہن کے تابع تھا۔ میں نے اسے جو احکام دیے تھے، وہ انہی پر عمل کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس دوران میں اگر اس کا کوئی ساتھی آ جاتا یا اسے تحریر اسکوائر جاتے ہوئے راستے میں مل جاتا تو وہ اس سے کچھ بھی نہ چھپاتی۔ جس وقت میں یہ سوچ رہا تھا میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال آیا۔ میں ایسا بھی تو کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا۔ اس صورت میں مجھے اس کے ساتھ سی آئی ڈی آفس تک جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں موجود ایک آہنی الماری کھول کر اس میں سے ایک ٹرانسمیٹر سیٹ نکال رہی تھی۔ غالباً وہ اسی کے ذریعے اپنے ملک اسرائیل سے رابطہ قائم رکھتی تھی اور اسی کے ذریعے مصر کے دیگر شہروں میں موجود اسرائیلی ایجنٹ بھی اس سے گفتگو کرتے ہوں گے۔ ایک بڑی سی چمڑے کی اٹیچی میں اس نے وہ ٹرانسمیٹر رکھ دیا۔ اٹیچی میں اب بھی کافی جگہ تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے الماری میں موجود کچھ خفیہ خانے کھولے اور ان کے اندر سے کاغذات نکال کر اٹیچی میں رکھنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میرے ذہن نے اسے ایک اور حکم دیا۔ "اعتراف جرم کرنے سے پہلے تم کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤ گی لیزا!" اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا ذہن اب پوری طرح میرا ہر حکم ماننے پر آمادہ تھا۔

اب یہ خدشہ نہیں رہا تھا کہ اعتراف جرم سے قبل وہ اپنے کسی ساتھی کو سب کچھ بتا دیتی۔ میرا اب وہاں رکنا فضول تھا۔ میں وہاں سے چلنے کا قصد کر رہا تھا کہ اچانک رک گیا۔ کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔

"کون ہے؟" لیزا نے بلند آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں۔ دروازہ کھولو!" باہر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی جسے میں پہچان گیا۔ وہ اسی ہوٹل کے منیجر کی آواز تھی۔

"اچھا ٹھہرو! ابھی کھولتی ہوں دروازہ۔" یہ کہہ کر لیزا نے جلدی سے آہنی الماری بند کی اور پھر اٹیچی کا ڈھکنا بھی گرا کر اسے قریبی مسہری کے نیچے سرکا دیا۔ اس کا یہ عمل اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کا ذہن میرے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ وہ اعتراف جرم سے پہلے کسی کو کچھ نہ بتانا چاہتی تھی اور نہ کسی کو کوئی شک کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ اٹیچی میں ٹرانسمیٹر دیکھ کر یقیناً ہوٹل کا منیجر شبہے میں مبتلا ہو سکتا تھا اور اس سلسلے میں لیزا سے استفسار بھی کر سکتا تھا، مگر لیزا نے پہلے ہی اپنے بچاؤ کی صورت کر لی تھی۔ اٹیچی کو مسہری کے نیچے سرکانے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ ہوٹل کا

منیجر اس وقت لیزا کے پاس کیوں آیا ہے؟ اسی تجسس نے مجھے وہاں رکنے پر مجبور کر دیا اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا ورنہ میں اپنی طرف بڑھنے والے ایک بڑے خطرے سے آگاہ نہ ہو سکتا۔

لیزا نے دروازہ کھول دیا تو منیجر کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھا۔ اس نے وہ لفافہ لیزا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر اس لفافے پر تمہارے اصل یا فرضی نام کی بجائے کوڈ نہ لکھا ہوتا تو میں فوراً اسے تم تک نہ پہنچاتا۔ یقیناً یہ کوئی اہم پیغام معلوم ہوتا ہے۔"

جواب میں لیزا نے بغیر کچھ کہے اس سے وہ لفافہ لے لیا اور بولی۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

"جاؤں!" منیجر نے حیرت سے کہا۔ "تم مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھو گی کہ لفافہ کون دے گیا تھا!"

"ظاہر ہے کہ وہ کوئی اجنبی ہوگا جسے تم تک یہ لفافہ پہنچانے کے لیے مناسب معاوضہ دیا گیا ہوگا۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" لیزا پرسکون آواز میں بولی۔ "اگر تم اس سے پوچھتے بھی کہ لفافہ کس نے بھیجا ہے تو وہ کچھ نہ بتا پاتا۔"

"تم اب تک جاگ رہی ہو؟" منیجر شاید وہاں مزید رکنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ سو چکی ہوگی تم! وہ کب گیا ہے؟"

"کچھ دیر ہی پہلے گیا ہے۔" لیزا نے جواب دیا۔ "اب تم جاؤ۔ مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔" لیزا کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"کیسا؟"

"تمہیں یہ بتانا ضروری ہے؟" لیزا نے سخت اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ منیجر خفیف سا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ لیزا نے دروازہ بند کرنے کے بعد اس لفافے کو کھولا اور پڑھنے لگی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا اور وہ خط پڑھ رہا تھا جو کسی نے لیزا کو لکھا تھا۔ خط کی عبارت پڑھتے ہوئے میرے تمام جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس خط کی عبارت یہ تھی: "لیزا! امید ہے کہ تم [illegible] نہ بھولی ہوگی۔ تمہیں قاہرہ میں میری موجودگی پر یقیناً حیرت ہوگی، لیکن ایک ایسا ہی اہم معاملہ تھا کہ مجھے خود واشنگٹن سے یہاں آنا پڑا۔ میں ابھی چند گھنٹے قبل قاہرہ پہنچا ہوں۔ اپنی روانگی سے قبل میں نے تمہاری خاطر اسرائیلی انٹیلی جنس سے رابطہ قائم کیا کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ اس اہم مشن پر تم بھی میرے ساتھ ہو۔ اس کی وجہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہیں علم ہے کہ میں اپنے ذہین شاگردوں کو کبھی نہیں بھولتا اور تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان دنوں تم قاہرہ میں ہو۔ میں بھی تمہیں قاہرہ پہنچنے ہی کی تاکید کرتا۔ بہرحال میں جس اہم مشن پر قاہرہ آیا ہوں اس کی تکمیل کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ ذہین ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ یہاں قاہرہ میں امریکی ایجنٹوں اور مقامی امریکی ایجنٹوں کی بھی کمی نہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ذریعے اسرائیلی ایجنٹ اور مقامی اسرائیلی ایجنٹ بھی ایک پراسرار وجود کی تلاش میں مجھ سے معاونت کریں۔ پراسرار وجود کی وضاحت ملاقات ہونے ہی پر کر سکوں گا..."

عبارت پڑھتے پڑھتے میں چونک اٹھا۔ "پراسرار وجود کی تلاش" ان الفاظ نے یک لخت بہت سی حقیقتیں روشن کر دی تھیں۔

میں نے خود پر قابو پا کر دوبارہ عبارت پر نظریں جما دیں۔ تحریر تھا: "میں تمہیں اتنا لکھ دینا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایک خوشبو کو ڈھونڈنا ہے۔ اس پراسرار وجود کی اور کوئی واضح شناخت ہمارے پاس نہیں ہے جسے ہم ابوالہول کہنے سے یاد کرتے چلیں — اس کے جسم سے ہر وقت تازہ کھلتے ہوئے گلابوں کی خوشبو آتی ہے۔ قاہرہ جیسے عظیم اور کثیر آبادی والے شہر میں ظاہر ہے کہ کسی ایسے وجود کی تلاش آسان نہیں۔ مجھے اسی لیے زیادہ سے زیادہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ اس کی تلاش کے سلسلے میں ایک اہم بات اپنی روانگی سے قبل مجھے معلوم ہوئی۔ یہ بات مجھے اپنے اعلیٰ احکام کے ذریعے چند گھنٹے قبل معلوم ہوئی تھی جب میں واشنگٹن سے چلنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ اہم بات بھی اس پراسرار وجود کی تلاش میں ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں قاہرہ میں ایک ایسے سولہ سالہ نوجوان کو ڈھونڈنا ہے جس کے جسم سے گلابوں کی خوشبو آتی ہو۔ مجھے علم ہے کہ قاہرہ میں لاکھوں نوجوان اس عمر کے ہوں گے اور ان میں سے مطلوبہ نوجوان کو تلاش کرنا بہت مشکل اور دیر طلب کام ہے، لیکن ہمیں بہرحال یہ کام انجام دینا ہی ہے۔ باقی تفصیلات ملاقات ہونے پر بتاؤں گا۔ میں کل رات ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تمہیں میریڈین ہوٹل کے بار میں ملوں گا۔ تم اچھی طرح واقف ہو کہ میں وقت کے معاملے میں کتنا پابند اور حساس ہوں۔ تمہیں ٹھیک وقت پر وہاں پہنچنا ہے۔ نہ وقت سے پہلے نہ بعد میں۔ اپنی پہچان کے لیے اتنا ہی لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت بغیر میک اپ کے ہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم میرا چہرہ نہیں بھولی ہوگی۔

تھا۔ ایتھری ناٹ۔" یہ اس کے بعد ایک نوٹ بھی تھا۔ "اسی مقصد پر خوبصورت پہننا ہے اور اپنے بالوں میں بھی سرخ گلاب لگانا ہے تاکہ اگر تم میک اپ میں ہو تو میں تمہیں پہچان لوں۔"

وہ خط پڑھ کر لیزا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کا اندازہ میں نے اس کے چہرے سے لگایا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی؟ یہ جاننے کے لیے میری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز ہو گئی۔ اس وقت لیزا کے ذہن میں بار بار صرف ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ مجھے موجودہ صورتحال میں کیا کرنا چاہیے؟ مجھے اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال پر حیرت ہوئی کیونکہ اس سلسلے میں اسے میرا ذہن پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ پھر اس کا ذہن تذبذب کا شکار کیوں ہو گیا تھا؟ یہ جاننے کے لیے میں نے اس کے ذہن کو ٹٹولنا شروع کر دیا تھا۔

اس کا ذہن پڑھ کر مجھے جو کچھ معلوم ہوا، اسے جاننے کے بعد میں تذبذب کا سبب سمجھ گیا۔ جس شخص نے اسے وہ خط لکھا تھا، اس سے لیزا کو گہری جذباتی وابستگی تھی۔ اس وابستگی کی جڑیں اس کے ذہن میں بہت گہری پیوست تھیں۔ وہ شخص جس کا اصل نام بھی لیزا کو معلوم نہیں تھا اور وہ اسے صرف اس کے کوڈ نمبر سے جانتی پہچانتی تھی، لیزا کا استاد بھی تھا اور محبوب بھی۔ لیزا نے ذہنی تربیت کے بعد پہلی بار اسی شخص سے جسمانی اور روحانی رشتہ استوار کیا تھا اور اس رشتے کی بنیاد کسی غرض پر مبنی نہ تھی۔ اس شخص کے لیے لیزا کے ذہن میں تعلق، محبت و احترام بھی تھا اور بے پناہ محبت بھی۔ اس کا حکم نہ ماننا لیزا کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اسی لیے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ اسی شخص نے لیزا کی مکمل تربیت کی تھی۔ لیزا نے پورے دو سال امریکہ میں اس کے ساتھ گزارے تھے اور یہ دو سال اس کی زندگی کا حاصل تھے۔ اسے اپنے ملک اسرائیل کی جانب سے دوسرے ایجنٹوں کی طرح جاسوسی کی مکمل تربیت حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجا گیا تھا۔ اس شخص تھری ناٹ اس محکمے کا [illegible] ایجنٹوں کو تربیت دیتا تھا۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے سبب اور بے مثال حسن کی وجہ سے لیزا نے جلد ہی تھری ناٹ کی خصوصی توجہ حاصل کر لی۔ یہ بات لیزا کے لیے قابل فخر تھی کہ اس محکمے کا سربراہ براہ راست اس کی تربیت میں دلچسپی لے رہا تھا۔ پھر بہت جلد لیزا اور تھری ناٹ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ ان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ رہا۔ لیزا نے اسے بتا دیا کہ اس سے کیوں یہ خطرناک زندگی اختیار کی ہے۔ تھری ناٹ نے اس کے جذبات کو سراہا اور عملی طور پر اسے ایک اعلیٰ درجے کی ایجنٹ بنا دیا۔ اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ گزشتہ سال ہی کا واقعہ تھا۔ امریکہ سے اسرائیل واپس آنے کے چند ماہ بعد ہی لیزا کو قاہرہ بھیج دیا گیا اور جب سے وہ یہیں تھی۔

میں جس دوران میں لیزا کے ذہن کا مطالعہ کر رہا تھا، وہ یہی سوچ رہی تھی کہ کیا اسے خود کو مصری حکام کے حوالے کر دینا چاہیے؟ یا رفتہ رفتہ اپنے استاد اور اپنے محبوب سے ملنا چاہیے۔ لیکن وہ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک کشاکش جاری تھی۔

پھر میرے ذہن میں بھی ایک خیال سا آیا ہوا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی میرے دشمن مجھ تک پہنچ جائیں گے کیونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے تلاش کرنے میں انہیں کافی وقت لگتا تھا۔ دنیا کے متعدد ملکوں اور شہروں میں سے میں کہاں ہوں، یہ جاننا ان کے لیے ممکن تو تھا، مگر آسان نہیں۔ میں اکثر ایک جگہ سے فرار ہونے کے بعد کئی کئی مہینے کے لیے روپوش رہتا تھا۔ وہ کس طرح یہ سراغ لگاتے تھے کہ میں دنیا کے کس ملک اور کس شہر میں ہوں، یہ بھید یہ معما آج تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ اس بار انہوں نے بے حد تیزی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے قاہرہ آئے ابھی دو ہی دن تو گزرے تھے۔ میرے لیے سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ میرے دشمنوں کی تیزی کی وجہ کیا ہو گئی تھی۔ میرے لیے تو میرا ہی وجود گویا پُراسرار بنا ہوا تھا۔ اس پر

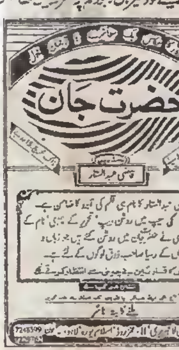

متعدد باتیں میری فہم سے بالاتر تھیں، ساتھ ہی ناقابل فہم باتوں میں اب ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں عمر کی کسی بھی منزل پر ٹھہر جاتا، میرے دشمنوں کو میری عمر کا سراغ مل جاتا اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ میری عمر اس وقت کیا ہے اور میں اپنی عمر کی کس منزل میں ہوں۔ مجھے اسی کے ساتھ اس شخص کا خیال آیا جس نے لیزا کو خط لکھا تھا۔ وہ شخص معمولی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹوں کو تربیت دینے والے محکمے کا سربراہ یقیناً انتہائی ذہین اور غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہوگا۔ اسے اسی لیے تو میری تلاش میں قاہرہ بھیجا گیا تھا۔ میں نے اس شخص کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر لیزا کے ذہن کا مطالعہ کیا۔ لیزا بہرحال دو سال اس کے ساتھ رہی تھی، لیزا یقیناً اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہو گی۔

میں نے لیزا کے ذہن کا مطالعہ کیا تو میرے اندازے صحیح ثابت ہوئے۔ وہ شخص انتہائی نڈر، بہادر اور ذہین تھا۔ دنیا کے ہر اس ملک میں اس کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے جو امریکہ کا زیر نگیں تھا یا جن سے امریکہ کے گہرے روابط تھے۔ اس کی عمر چالیس سال تھی مگر اپنی جسمانی ساخت کے سبب وہ تیس سال سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ صنف مخالف کے لیے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی رنگت بھوری تھی اور ان میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو ایک عمر کی ریاضت و محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ملک کی خاطر کئی کارنامے انجام دیے تھے۔ انہی کارناموں کے سبب اسے کچھ ایسے خصوصی اختیارات حاصل ہو گئے جو کسی اور اسرائیلی ایجنٹ کو حاصل نہیں تھے۔ بظاہر وہ جتنا خوش مزاج، نرم اور ہنس مکھ نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی سخت، کھردرا اور سفاک تھا۔

ان تمام معلومات کی روشنی میں اس شخص کو انتہائی خطرناک ہی کہا جا سکتا تھا۔ ایسے افراد اپنے ملک و قوم کے لیے عظیم سرمایہ ہوتے ہیں۔ امریکہ نے اس بار یقیناً میرے حصول کی خاطر اپنا عظیم سرمایہ داؤ پر لگا دیا تھا۔ میرے لیے یہ آسان تھا کہ میں لیزا کے ذریعے باآسانی اس خطرناک شخص تک پہنچ جاتا لیکن مجھے اس میں اپنی [illegible] نظر آئی۔ آج رات لیزا خود کو مصری حکام کے حوالے کر دیتی تو یقیناً صبح ہونے تک کم از کم قاہرہ میں موجود اسرائیلی ایجنٹ اور مقامی ایجنٹ زیر حراست لے لیے جاتے۔ پھر مصر کے دیگر شہروں سے بھی انہیں گرفتار کر لیا جاتا۔ اس طرح وقتی طور پر ہی سہی مصری حکومت ایک بڑے خطرے سے بچ جاتی۔ اسرائیل کو دوبارہ اپنے ایجنٹوں کا جال پھیلانے میں مشکل بھی پیش آتی اور وقت بھی بہت لگتا۔ یوں بھی کسی ملک کے لیے اس کا ایجنٹ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ ہر حکومت اپنے ایجنٹوں کی تربیت اور ان کے دیگر مصارف پر کافی سرمایہ خرچ کرتی ہے۔ بات صرف ایک رات ہی کی تھی۔ لیزا آج رات کی بجائے کل رات اعتراف جرم کر سکتی تھی، لیکن ایک دن میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ کل تک کیا صورتحال پیش آتی، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آج ہی صبح سے اب تک جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بھی تو غیر متوقع ہی تھے۔ پھر یہ کہ کل رات تک کے لیے مجھے لیزا کے ذہن کو آزاد چھوڑ دینا پڑتا۔ یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کہ لیزا بدستور میرے طاقتور ذہن کے زیر اثر رہنے کی حالت میں تھری ناٹ جیسے چالاک اور خطرناک شخص سے ملے۔ جب خود لیزا شریف کی حالت دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ ٹرانس میں ہے تو تھری ناٹ کے لیے تو لیزا کو اس حال میں دیکھ کر اس نتیجے تک پہنچنا بہت آسان ہوتا۔ اس صورت میں فی الحال مجھے لیزا کے ذہن کو آزاد چھوڑ دینا پڑتا اور اسی کے ساتھ اعتراف جرم کا خیال بھی اس کے ذہن سے کھرچ دینا پڑتا۔ پھر آئندہ شب از سر نو مجھے لیزا کو اعتراف جرم پر آمادہ کرنا پڑتا۔ ایسا کرنے میں ایک اور خطرہ بھی تھا اور وہ خطرہ لیلیٰ کی زندگی کے لیے تھا۔ لیزا ایک بار پھر لیلیٰ کو قتل کرانے کی کوشش کرتی اور اس سلسلے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہتی۔ کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے اپنی جنگ لیزا کے سہارے کے بغیر ہی لڑنا چاہیے اور یہ کہ لیزا کو آج ہی شب اعتراف جرم کر لینا چاہیے۔

لیزا کے ہاتھ میں اب تک تھری ناٹ کا خط موجود تھا۔ تھری ناٹ کے لیے اس کے دل میں جو شدید جذبات تھے، وہ اب اتنے حاوی ہو چکے تھے کہ لیزا کے ذہن پر میرے حکم کی گرفت کمزور پڑنے لگی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس کا ذہن ان جذبات کے زیر اثر اعتراف جرم کے خیال کو پس پشت ڈال دیتا۔ اس وقت میری توجہ اس کے ذہن ہی پر تھی۔

لیزا! بھول جاؤ کہ تھری ناٹ نے تمہیں کوئی خط لکھا ہے اور وہ خود یہاں قاہرہ آ پہنچا ہے۔ میرے ذہن نے اسے حکم دیا۔ جواب میں اس کے ذہن نے بغاوت کرنا چاہی مگر وہ ایک ذہنی جھٹکوں

ہی نے اُس کو میری بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اُسے پھر حکم دیا۔ اس خط کو پھاڑ کر فلش میں بہا دو۔ یقین کرو کہ تھری ناٹ نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ یہ دھوکا ہے۔

• ہاں مجھے یقین ہے۔ وہ خواب کے سے عالم میں بڑبڑائی اور پھر اُس نے تھری ناٹ کا خط پرزے پرزے کر دیا۔ اس کے بعد وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ باتھ روم سے واپس آئی تو اُس کے ذہن سے تھری ناٹ کا خیال قطعی محو ہو چکا تھا اور اب ایک بار پھر وہ میری کہے پیچھے سے اُٹھی کھنچی رہی تھی۔

تمہیں وقت ضائع کیے بغیر فوراً سی آئی ڈی آفس جا کر اعترافِ جرم کرنا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اُس کے ارادے کو مضبوط کرنے کی خاطر اُسے حکم دیا۔

• ہاں میں فوراً روانہ ہو رہی ہوں۔ میں نے تمام تحریری اور دیگر ثبوت اٹیچی میں رکھ لیے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اٹیچی اپنے ہاتھ میں اٹھالی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر جس وقت میں اُس کے ساتھ ساتھ ہوٹل کے صدر دروازے سے نکل کر نیچے جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں نے لفٹ سے پانچ باوردی پولیس والوں کو اسی منزل پر اُترتے دیکھا۔ اُس وقت رات کے پونے دو بج رہے تھے۔

لیزا پولیس والوں پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک کر ٹھٹھکی، پھر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اسی دوران میں پولیس والوں میں سے ایک کے ذہن کو ٹٹول کر میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ اس وقت اُن کی وہاں آمد کا مقصد کیا ہے۔ میرا ذہن لیزا کے سلسلے میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ اُس پیشہ ور قاتل کا خیال ہی مجھے نہیں آیا تھا جس کا نام سعید تھا اور جسے میں نے دو گھنٹے بعد پولیس اسٹیشن پہنچ کر اعترافِ جرم کا حکم دیا تھا۔ یہ وہی پیشہ ور قاتل تھا جو ایک سب انسپکٹر کی وردی میں تھا اور لیلیٰ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب میں نے اُسے اعترافِ جرم کا حکم دیا تھا اُس وقت تقریباً پونے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے لگ بھگ ایک بجے پولیس اسٹیشن پہنچ کر اعترافِ جرم کیا ہوگا۔ پولیس کو اُس کا بیان لینے اور ہوٹل مونٹانا پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اس سلسلے میں پولیس نے یقیناً تیزی کا ثبوت دیا تھا۔ پولیس اُس پیشہ ور قاتل کے بیان ہی کی روشنی میں ہوٹل مونٹانا کے منیجر کو گرفتار کرنے کے لیے آئی تھی۔ اُس پیشہ ور قاتل کو دو گھنٹے کے بعد اعترافِ جرم کا حکم دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس دوران میں خود ہوٹل کے منیجر سے مل سکوں۔ اس کے بعد ہی پولیس نے راستہ

حضرت جان

قیمت: 40 روپے

قاضی عبد الستار

میں لے سکے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اگر پہلے ہی پولیس اُسے گرفتار کر لیتی تو میں لیزا تک نہ پہنچ سکتا۔ میں پولیس سے پہلے اُس تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اُس کا ذہن پڑھ کر یہ جان سکوں کہ لیلیٰ کو قتل کرانے کا سبب کیا ہے۔

میں لیزا کے ساتھ ہی ساتھ لفٹ کے ذریعے اُس بلڈنگ سے نیچے اُتر آیا۔ اس بلڈنگ کے قریب ہی ٹیکسی اسٹینڈ موجود تھا جہاں کئی خالی ٹیکسیاں کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لیزا نے ہاتھ ہلا کر ٹیکسی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحے بعد ٹیکسی قریب آ کر رک گئی۔

• پولیس ہیڈ آفس تحریر اسکوائر۔ لیزا نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے لیزا کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ رات کو اس وقت ایک تنہا عورت پولیس ہیڈ آفس جا رہی تھی۔ غالباً ٹیکسی ڈرائیور کی حیرت کا سبب یہی تھا۔ کسی قدر توقف کے بعد اُس نے کرایہ بتایا اور لیزا اثبات میں سر ہلا کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولنے لگی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے اٹیچی کو سیٹ پر رکھا، پھر خود بیٹھ گئی۔ میرا ارادہ پہلے یہ تھا کہ میں تحریر اسکوائر تک لیزا کے ساتھ ہی جاؤں گا اور پھر کسی خالی ٹیکسی میں زمالک روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر لیزا نے اٹیچی کچھ اس طرح سیٹ پر رکھی تھی کہ وہاں جگہ نہ ہونے کے برابر ہی رہ گئی تھی۔ میں نے اسی لیے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اگر میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بیٹھتا اور اُسے بند کرتا تو ٹیکسی ڈرائیور خود بخود دروازہ کھلتے اور بند ہوتے دیکھ کر بوکھلا جاتا۔ میں اس صورت حال پر بھی قابو پا لیتا مگر میں نے اسے غیر ضروری ہی تصور کیا اور اُس ٹیکسی میں نہیں بیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے لیزا نے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

لیزا اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ اس سفر کے بعد اُس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ یہ موت کی طرف سفر تھا جس کے لیے میں نے اُسے مجبور کیا تھا۔ اُس لمحے مجھے لیزا کے آٹھ سالہ بچے کا خیال بھی آیا جس کے ذکر پر لیزا تڑپ اٹھی تھی۔ ہر چند کہ لیزا قابلِ معافی نہیں تھی اور میں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ اسی کی مستحق تھی، پھر بھی نہ جانے کیوں اُس کے عبرتناک انجام پر میرا دل اداس سا ہو گیا۔ اس کا سبب شاید وہ بچہ تھا، وہ معصوم بچہ جس کو ابھی کچھ بھی خبر نہیں تھی کہ اُس کا باپ شمعون کیوں مارا گیا اور اس کی ماں اُسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ غالباً اس بچے کے لیے میرے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات اس لیے بھی پیدا ہو گئے تھے کہ خود میں بھی تو ایک بچہ ہی تھا جس کی عمر صرف ایک سال تھی۔ مجھے بھی تو اُس بچے ہی کی طرح کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ بچہ تو پھر بھی مجھ سے زیادہ خوش قسمت تھا کہ اس نے عالمِ ہوش میں اپنی ماں کو دیکھ تو لیا تھا، مگر میں نے تو اپنی ماں کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔

میرے وجود میں محرومیاں جاگ اٹھیں۔ میں سوچنے لگا کہ کب تک یونہی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں بھاگتا رہوں گا اور میرے دشمن بھوکے بھیڑیوں کی طرح میرا تعاقب کرتے رہیں گے؟ کیا مجھے کسی گھنے سایہ دار پیڑ کا سایہ نصیب نہیں ہوگا؟ کیا کبھی مجھے ماں کی آغوش میسر نہیں آئے گی؟ ماں کا خیال آتے ہی میری آنکھوں میں وہ چہرہ گھوم گیا جسے میں نے صرف ایک تصویر میں دیکھا تھا۔ وہ تصویر مجھے ایک امریکی ایجنٹ نے بھیجی تھی۔ یہ واقعہ مجھے لندن میں پیش آیا تھا۔ میں اُس تصویر میں اپنی ماں کی گود میں تھا۔ اُس مہربان چہرے کی ایک ایک تفصیل میرے ذہن پر نقش تھی۔ پھر میری چشمِ تصور نے خود اپنا ایک سالہ چہرہ دیکھا اور پھر اُسی لمحے میرے ذہن پر تاریکی کی ایک چادر سی پھیلتی چلی گئی۔ نہ مجھے یہ احساس رہا کہ میں کون ہوں، نہ یہ ہوش رہا کہ کہاں اور کن حالات میں ہوں اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کب تک اُسی کیفیت سے دوچار رہا۔ میں جیسے کوئی خواب سا دیکھ رہا تھا اور میرا شعور نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ جب دوبارہ میرے حواس درست ہوئے تو میں ایک دم چونک اٹھا۔ میرے چونک اٹھنے کا پہلا سبب خود میرا وجود تھا۔ مجھے قطعی یاد نہیں تھا کہ میں نے اپنے وجود کی تجسیم کے لیے خواہش کی تھی۔ میرا وجود اب نادیدہ نہیں تھا۔ میرے لیے دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں شاہراہِ شریف کی بجائے دریائے نیل پر بنے ہوئے ایک پُل کے کنارے اُس کی ریلنگ پکڑے کھڑا تھا اور میری نگاہیں دریا کی موجوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے بھی تعجب خیز بات یہ تھی کہ مجھے وقت گزرنے کا قطعی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو چکے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں ہوٹل مونٹانا سے نکلا تھا تو رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ میں کچھ دیر حیران حیران سا وہیں کھڑا رہا اور پھر مجھے یہ خیال آیا کہ دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے میرے لیے زمالک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ اگر لیلیٰ بیدار ہو جاتی یا احمد سلمان جاگنے کے بعد مجھے اُس کمرے میں نہ پاتا تو معاملہ بگڑ جاتا۔ میں کوٹھی سے اچانک غائب ہو جانے کا کیا جواز پیش کرتا۔ اگر وہ مجھے نیم پاگل سمجھ کر استفسار نہ بھی کرتا تو خواہ مخواہ پریشان ضرور ہوتا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں نے اپنا رخ پھیرا اور پُل کے اوپر سے گزرتے ہوئے ٹریفک پر نظر جما دی۔ مجھے کسی خالی ٹیکسی کی تلاش تھی جو جلد ہی مل گئی اور میں زمالک کے لیے روانہ ہو گیا۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد ایک بار پھر میرا ذہن اُسی معمے میں اُلجھ گیا۔ اب سے پہلے کبھی مجھے کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میں یہ سوچ کر کانپ اٹھا کہ اگر اس دوران میں اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو کیا ہوتا؟ آخر مجھے ہو کیا گیا تھا؟ میں سوچنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میرے ذہن پر تاریکی کی چادر پھیلی تھی تو اُس سے پہلے مجھ پر شدید اُداسی نے حملہ کیا تھا۔ میں اُس وقت اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر میری آنکھوں میں خود اپنا ایک سالہ چہرہ گھومنے لگا تھا۔ اُس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ کب میں نے اپنی تجسیم کی اور کب اور کس طرح وہاں سے دریائے نیل کے ایک پُل تک پہنچ گیا۔ غالب امکان یہی تھا کہ میں نے شاہراہِ شریف سے دریائے نیل تک کا وہ فاصلہ شعور کی نیم غنودگی کے عالم میں پیدل ہی طے کیا ہوگا۔ اس وقت صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تین گھنٹے سے بھی زیادہ بے شعوری کے عالم میں رہا تھا اور یہ بات بہرحال خطرناک تھی۔ میرے پیچھے دنیا کی تین بڑی طاقتوں کے خطرناک ایجنٹ لگے ہوئے تھے اور وہ کبھی بھی میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اب تک میرے علم میں یہی تھا کہ میرے وجود کی سب سے بڑی کمزوری صرف وہ خوشبو ہے جو ہر وقت میرے جسم سے اٹھتی رہتی ہے یا میری کمزوری وہ نرم جذبات ہیں جن کے سبب میں اپنے دشمنوں کو بھی قتل کرتے ہوئے کانپ اٹھتا ہوں لیکن اپنی اس

کمزوری کا علم آج مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ اس طرح قطعی بے شعوری کی کیفیت میں پہنچ جانا میری زندگی کے لیے کبھی بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ جب تک ٹیکسی زمالک کے علاقے میں داخل نہ ہو گئی میرا ذہن انہی خیالوں میں الجھا رہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد مجھ سے رہنمائی چاہی تو میں چونکا اور اُسے راستہ بتانے لگا کہ کدھر جانا ہے۔

میں نے ٹیکسی کو احمد سلمان کی کوٹھی سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دیا اور پھر ایک نیم تاریک سی گلی میں گھس گیا۔ سڑک پر ٹریفک خاصا تھا۔ وہاں کوئی شخص بھی میرے وجود کو نادیدہ ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے اس گلی کا رخ کیا تھا کہ وہ سنسان سی تھی۔ کچھ فاصلہ طے کرتے ہی میرا وجود نادیدہ ہو گیا اور میں دوبارہ پلٹ آیا۔ اپنے وجود کو نادیدہ بنائے بغیر میں احمد سلمان کی کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے پولیس والے موجود تھے جن کی نگاہ میں آئے بغیر اندر جانا ممکن نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں اطمینان کے ساتھ پولیس والوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اصل عمارت تک پہنچ گیا۔ کوٹھی کے اندر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں زینہ عبور کر کے اُوپری منزل پر پہنچا اور دبے پاؤں اُس کمرے کی طرف بڑھا جہاں لیلیٰ کو سوتے چھوڑ گیا تھا۔ دروازے کے باہر رک کر پہلے میں نے اندر کی سن گن لی اور پھر دروازے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال دیا۔ دروازہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ اندر نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اندر پہنچتے ہی آہستگی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ پھر میری نگاہ اس مسہری کی طرف اٹھی جس پر لیلیٰ ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے رخسار کو چوم رہی تھی۔ سوتے ہوئے وہ مجھے بہت معصوم، بھولی اور حسین معلوم ہوئی۔ چند لمحے میں وہیں کھڑا ہوا اُسے دیکھتا رہا، پھر اپنی مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی میں نے اپنے وجود کی تجسیم کر لی تھی۔ میں رات بھر نہیں سو سکا تھا اور کچھ دیر بعد ہی مجھے جگا دیا جاتا۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ اگر مجھے پانچ منٹ بھی سونے کا موقع مل جاتا تو میری تمام تھکن دور ہو جاتی۔ پورے چوبیس گھنٹے میں صرف پانچ منٹ کی نیند بھی میری تمام جسمانی توانائیوں کو بحال رکھنے کے لیے کافی تھی اور اس کا میں تجربہ بھی کر چکا تھا۔ اپنے وجود کی تجسیم کرتے ہی میں نے فوراً اپنے ذہن کو سونے کی ترغیب دی اور دوسرے ہی لمحے میرا ذہن نیند کی گہری آغوش میں پہنچ گیا۔

"اٹھو... اٹھو ہارون! صبح ہو گئی۔" میں نے لیلیٰ کی آواز سنی جو میرا شانہ ہلا کر مجھے بیدار کر رہی تھی۔ میں نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اُس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ گویا میں بمشکل آدھے پون گھنٹے سو پایا تھا لیکن اس کے باوجود خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے وہ کپڑے پہن لیے جو لیلیٰ نے مجھے نکال کر دیے تھے۔ یہ ہارون کے کپڑے تھے جو میرے کام آ رہے تھے۔

ناشتا سب نے ساتھ ہی کیا۔ اسی دوران میں احمد سلمان بولا۔ "مجھے فوراً اسپتال پہنچنا ہے اور وہاں سے شریف کی لاش کو لانا ہے مگر اُس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری خالہ اور دیگر عزیز اقارب کو اس حادثے کی اطلاع دے دوں۔ ابھی تو تمہاری خالہ کو میں ہارون کی واپسی کے بارے میں بھی نہیں بتا سکا۔ خیر۔ اور ہاں لیلیٰ! میں تمہیں ایک بات سمجھانا بھول ہی گیا۔"

"کیا ابو؟" لیلیٰ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں... تھوڑی سی اداکاری کرنا پڑے گی ورنہ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔" احمد سلمان بولا۔

"میں سمجھی نہیں ابو!" لیلیٰ حیرت سے بولی۔ "اداکاری کیسی؟"

"تمہیں شریف کی موت پر آنسو بہانا ہوں گے۔"

"لیکن ابو! مجھے تو اُس کی موت کا کوئی دکھ نہیں، کوئی ملال نہیں بلکہ میں تو خوش ہوں کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ پھر میں کس طرح رو سکوں گی؟"

"اگر تم نہ روئیں تو لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ جانے کیا کیا شک کریں گے۔" احمد سلمان نے اُسے سمجھانا چاہا۔

"میں کوشش... پوری کوشش کروں گی ابو!" لیلیٰ نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے اپنے باپ کو یقین دلایا۔

ناشتا کرنے کے بعد احمد سلمان نچلی منزل میں عزیز اقارب کو فون کرنے چلا گیا اور لیلیٰ میز سے برتن اٹھا کر ٹرے میں رکھنے لگی۔

"تم رہنے دو لیلیٰ! میں رکھ دوں گی برتن۔" سطوت ناشتے کی میز پر پہلی بار بولی۔ وہ اب تک گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔

"نہیں امی! میری موجودگی میں آپ کو زیادہ کام نہیں کرنا چاہیے۔" لیلیٰ نے کہا۔ "اور اب تو میں مستقل ہی یہاں رہوں گی۔"

لیلیٰ کی بات سن کر سطوت کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آنے لگے۔ وہ ہارون اور لیلیٰ دونوں ہی سے سخت نفرت کرتی

تھی۔ اُس کے لیے یقیناً یہ خیال سوہانِ روح ہو گا کہ اب لیلیٰ کا قیام مستقل طور پر یہیں ہو گا۔ لیلیٰ ٹرے میں برتن رکھ کر کمرے سے نکل گئی تو سطوت نے سہمی سہمی سی نگاہ میری طرف اٹھائی۔ وہ حتی الامکان یہ کوشش کر رہی تھی کہ میرے ساتھ تنہا نہ رہ جائے اور اب تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کے ساتھ تھا اور وہاں کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا۔ سطوت کے چہرے سے اسی لیے خوف کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"سطوت! تمہیں وہ سانپ یاد ہے جو رات کو تمہارے پیٹ پر رینگ رہا تھا!" معاً میرے ذہن نے اُس کے ذہن سے رابطہ قائم کر کے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے مزید کہا۔ "وہ میں ہی تھا سطوت! تمہارا انجام قریب ہے!" اسی کے ساتھ میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا اور سطوت اپنی چیخ نہ روک سکی۔

"کیا ہوا... کیا ہوا امی؟" دور سے لیلیٰ کی تیز آواز سنائی دی اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔

سطوت آنکھیں پھاڑے اُس کرسی کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر میں موجود تو تھا مگر اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور شاید خوف کی زیادتی کے سبب وہ چیخنے پر بھی قادر نہیں رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ لیلیٰ اس کمرے میں داخل ہوتی، میں نے اپنے وجود کی تجسیم کر لی۔ سطوت اس بار بھی غالباً چیخ اٹھنا چاہتی تھی لیکن یا تو اس کی چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی یا پھر لیلیٰ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ چیختے چیختے رک گئی۔

"امی!" لیلیٰ قریب آتے ہوئے فکرمند لہجے میں بولی۔ "آپ... آپ کیوں چیخی تھیں؟"

جواب میں سطوت نے کچھ کہے بغیر میری طرف ہاتھ اٹھا دیا اور پھر ہکلائی۔ "یہ... یہ..."

"کیا ہوا ہارون کو! یہ تو مجھے ٹھیک معلوم ہو رہا ہے۔" لیلیٰ نے میری طرف دیکھا اور میں دانستہ مسکرا دیا۔

"یہ... یہ بد... کوئی بدروح ہے۔" سطوت ہذیانی سے لہجے میں تقریباً چیخ کر بولی۔ "یہ... یہ ہارون... ہارون نہیں ہے۔"

"امی!" لیلیٰ کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ "برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ... آپ میرے ہی سامنے میرے بھائی میرے معصوم بھائی کو بدروح کہہ رہی ہیں۔ میں... میں یہ... یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتی... کبھی نہیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اُس کی آواز بھرا گئی۔

"یقین... یقین کرو لیلیٰ کہ یہ... یہ واقعی کوئی بدروح ہے۔ ابھی... یہ ابھی یہاں بیٹھے بیٹھے غائب ہو گیا تھا۔" پھر سطوت قسمیں کھا کھا کر لیلیٰ کو اپنی بات کا یقین دلانے لگی۔

"میں جانتی ہوں، مجھے معلوم ہے امی کہ آپ... آپ ابو اور ہارون سے نفرت کرتی ہیں لیکن... لیکن نفرت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔" لیلیٰ اُس کی قسموں کو نظر انداز کر کے بدستور سخت لہجے میں بولی۔ "آئندہ آپ کبھی میرے سامنے میرے بھائی کے لیے ایسے نازیبا الفاظ استعمال نہیں کریں گی! یہ نہ سمجھیے کہ اب میں بچی نہیں رہی۔ جوان ہو چکی ہوں۔"

سطوت کے خوف پر نفرت اور غصہ غالب آ گیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "لیلیٰ! تم حد سے زیادہ گستاخ ہو چکی ہو! میں اپنے گھر میں تمہارا وجود ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی! میں ابھی تمہارے ابو سے جا کر بات کرتی ہوں۔ یا تو اس گھر میں تم رہو گی یا میں!" یہ کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

لیلیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے اُس پر بہت ترس آیا۔ میری وجہ سے اُسے خواہ مخواہ سطوت کی ناگوار باتیں سننا پڑی تھیں۔ میں تو سطوت کو اذیت پہنچانا چاہتا تھا، لیلیٰ ناحق ہی درمیان میں آ گئی تھی۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ دیے، پھر بولا۔ "باجی! کیوں رو رہی ہیں آپ؟" میرا انداز بالکل بچوں ایسا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہارون! تم کچھ خیال نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری دلجوئی کی خاطر زبردستی مسکرانے لگی۔ اُس کی حالت قابلِ دید تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اُسے یقیناً اپنے بھائی ہارون سے انتہائی محبت تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد اُس نے مجھ سے کہا۔ "چلو ہارون! ہم بھی نیچے ہی چلتے ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا اور پھر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ نچلی منزل پر پہنچتے ہی مجھے احمد سلمان اور سطوت کی تیز آوازیں سنائی دیں۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اُن دونوں میں زبردست ٹھنی ہوئی ہے۔ اُن دونوں کی آوازیں اُسی کمرے سے آ رہی تھیں

جس میں ٹیلی فون تھا اور جو کمرا لیلیٰ کے لیے مخصوص تھا۔ لیلیٰ میرے ساتھ قدم بڑھاتی ہوئی اس طرف بڑھتی رہی۔ میں نے میرا ایک ہاتھ تھام رکھا تھا۔ کمرے کے قریب پہنچتے ہی سطوت کی آواز سنائی دی۔ وہ تقریباً چیخ کر اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔ "اس کی صرف ایک ہی صورت ہے بس! اور وہ یہ کہ لیلیٰ مجھ سے اپنی گستاخی کی معافی مانگے۔"

"تمہارا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا ورنہ تم ایسی احمقانہ باتیں نہ کرتیں۔ بہتر یہی ہے کہ خاموش ہو جاؤ اور میرے صبر کا مزید امتحان نہ لو۔" احمد سلمان کی تیز آواز آئی۔ اسی وقت لیلیٰ مجھے لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور سطوت نے اس کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے بہرحال یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میں اس کی ماں نہ سہی مگر اس کے باپ کی بیوی ضرور ہوں! اسے میرا احترام کرنا پڑے گا!"

"کیا بکواس کر رہی ہو تم!" احمد سلمان بگڑ کر بولا۔ "تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنا چاہیے!"

"میں تو ہوں ہی بے شرم! حیادار تو بس تمہاری بیٹی ہے۔" سطوت نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر کہا۔ "میں کہہ چکی ہوں کہ اگر اس نے مجھ سے معافی نہیں مانگی تو میں ہرگز اس گھر میں نہیں رہوں گی! یہ میرا آخری فیصلہ..." اور پھر اس کی آواز ایک دم اس طرح رک گئی جیسے کسی نے اس کی زبان پکڑ لی ہو یا منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ میرے سوا اور کون اس کی زبان پر تالا ڈال سکتا تھا۔ اس کا ذہن اب میرے قابو میں تھا۔ میں نے خود اس کی منطق ذلیل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ معاً جیسے اس کی قوت گویائی لوٹ آئی اور پھر وہ تیر کی طرح لیلیٰ کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر لپکی۔ لیلیٰ کچھ گھبرا سی گئی اور سلمان بھی اس کی یہ غیر متوقع حرکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیلیٰ کے قریب پہنچتے ہی وہ اس کے قدموں میں گر کر سسکنے لگی۔ "مجھے... مجھے معاف کر دو لیلیٰ!... معاف کر دو۔"

چند لمحے تو لیلیٰ سکتے کے سے عالم میں کھڑی رہی، پھر اسے شاید یقین آ گیا کہ اس کی آنکھیں جو منظر دیکھ رہی ہیں فریب نظر نہیں حقیقت ہے۔ پھر وہ فوراً ہی جھکی اور سطوت کو شانوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ "امی!" لیلیٰ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "یہ... یہ آپ کو کیا... کیا ہو گیا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے سطوت کو اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر خود بھی رونے لگی۔ احمد سلمان حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک ناقابل یقین منظر!

"مجھے اعتراف ہے لیلیٰ کہ میں تم سے اور ہارون سے شدید نفرت کرتی ہوں مگر... مگر اس کا سبب میری محرومی ہے۔ کاش میں بھی ماں بن سکتی۔" سطوت، لیلیٰ سے جدا ہو کر بولی۔ اس کے لہجے سے گہرے تاسف کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ ہارون میرے ہی رویے کے سبب اس حال کو پہنچا ہے۔ میں... میں بہت بڑی گنہگار ہوں۔ مجھے... مجھے معاف کر دو۔" پھر وہ اپنے شوہر کی طرف پلٹی اور بولی۔ "تم... تم بھی معاف کر دو مجھے کہ میں نے کبھی تمہارے بچوں کو اپنے بچے نہیں سمجھا۔"

"سطوت! تمہارا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارے دل سے بدی ختم ہو چکی ہے اور نیکی جاگ اٹھی ہے۔ تم واقعی قابل رحم اور قابل معافی ہو۔" احمد سلمان کے لہجے میں بھی رقت آ گئی۔ "کاش تمہیں پہلے ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ بہرحال میں نے اور میرے خدا نے تمہیں معاف کیا۔" پھر وہ لیلیٰ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "لیلیٰ! مجھے امید ہے کہ تم بھی اپنی ماں کو معاف کر دو گی۔"

"میں نے بھی معاف کیا۔" لیلیٰ نے بھی کہہ دیا۔

"تمہیں چاہے ساری دنیا معاف کر دے سطوت مگر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا!" میں نے سطوت کے ذہن کو گویا کا لگایا اور وہ چونک اٹھی۔ میں نے مزید کہا۔ "اس لیے سطوت کہ میں تمہارا ضمیر ہوں۔"

"مگر... مگر میرا ضمیر... وہ... وہ تو مجھے معاف نہیں کرے گا!" سطوت تقریباً چیخ اٹھی۔ "میں کیا کروں... کیا کروں میں؟"

احمد سلمان صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کی پشت تھپکتا ہوا بولا۔ "تمہارا ضمیر بھی ایک دن تمہیں معاف کر ہی دے گا سطوت! خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہیں سکون دے۔"

"ہاں میں دعا کروں گی۔ دعا۔" وہ نیند کے سے عالم میں بڑبڑائی اور اسی وقت میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ ایک دم چونک کر اپنی اطراف کا جائزہ لینے لگی جیسے ابھی ابھی گہری نیند سے بیدار ہوئی ہے۔ کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا تھا، اس نے جو کیا اور کہا تھا اس کی ہر تفصیل اس کے ذہن میں تھی۔ اس کے چہرے سے شدید الجھن اور اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچتے سوچتے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "میں... مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا؟ جو کچھ اس نے کیا اور کہا تھا وہ اس کی خواہش کے قطعی خلاف تھا مگر نہ تو اسے جسمانی اعضا پر قابو رہا تھا اور نہ زبان پر! اور اس کا سبب وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ اسی لیے وہ پریشان تھی۔

احمد سلمان اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوا سطوت۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ۔ کچھ دیر جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سطوت نے اپنے شوہر کا مشورہ قبول کر لیا اور پھر ٹوٹے ٹوٹے قدموں سے جھکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تھا تو میں نے اسے چڑانے کے لیے جان بوجھ کر مسکرا دیا تھا۔

"قدرت کا نظام بہت عجیب ہے لیلیٰ!" احمد سلمان دوبارہ صوفے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "ایک نہ ایک دن آدمی کا ضمیر اسے مجبور کر ہی دیتا ہے اور وہ اپنے گناہ پہلے سے تو بہ کر لیتا ہے۔ تمہاری ماں کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے لیلیٰ! اس کا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے سچے دل سے اسے معاف کر دیا ہو گا۔ آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ! اور تم وہاں کیوں کھڑے ہو ہارون بیٹے! آؤ ادھر آ جاؤ۔"

احمد سلمان کے کہنے پر میں اور لیلیٰ دونوں ہی قریبی صوفوں پر بیٹھ گئے اور لیلیٰ نے کہا۔ "ابو! میں نے امی کو واقعی سچے دل سے معاف کر دیا ہے۔ میرے لیے یہ دن انتہائی مسرت کا دن ہے۔ شاید اس گھر کی ویرانیاں دور ہو جائیں گی..."

"شاید۔" احمد سلمان طویل سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے صوفے کے سامنے موجود میز پر پڑے ہوئے عربی اور انگریزی اخبارات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ لوگوں کو فون کرتا ہوں جنہیں میں شریف کے انتقال کی اطلاع نہیں دے سکا۔ اتنے تم اخبارات دیکھو۔ تمہارے بھائی کی تصویر آج ہر اخبار میں شائع ہوئی ہے۔" یہ جملہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ "کیا آج کے اخبارات میں میری تصویر کیوں شائع ہوئی تھی؟" بالکل بچکانہ انداز میں خوش ہو کر احمد سلمان سے کہا۔ "جی"

"ہاں بیٹے، تم خود دیکھ لو۔" یہ کہہ کر احمد سلمان نے صوفے کی جانب تپائی پر رکھے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں بھی ہاتھ بڑھا۔ میں نے فوراً اوپر ہی رکھا ہوا ایک عربی اخبار اٹھا لیا۔ جس کے نیچے ہی ایک اور انگریزی اخبار "الشباب" رکھا تھا جسے لیلیٰ نے اٹھایا اور اس کا صفحہ پلٹنے لگی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ لیلیٰ انگریزی زبان سے بھی واقف تھی۔

"الشباب" کے دوسرے ہی صفحے پر مجھے اپنی نہیں بلکہ ہارون کی واضح اور نمایاں تصویر نظر آ گئی۔ تصویر وہی تھی جو پہلے بھی اخبارات میں شائع ہو چکی تھی، ہارون کی گمشدگی کے سلسلے میں! اسی تصویر کو دیکھ کر شہ نے اپنے چہرے پر ہارون کا میک اپ کیا تھا۔ اس بار تصویر کے ساتھ عبارت مختلف تھی جسے پڑھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ عموماً لوگ تلاش گمشدہ کے بعد کبھی اس طرح کے اشتہارات شائع نہیں کراتے۔ وہ یہ اطلاع نہیں دیتے کہ ان کا بیٹا، بھائی یا عزیز مل گیا ہے۔ لیکن احمد سلمان نے یہ اشتہار دینا ضروری خیال کیا تھا۔ غالباً اس کا سبب وہ بھاری انعام تھا جس کا اس نے گزشتہ شائع ہونے والے اشتہارات میں اعلان کیا تھا۔ میرا ہر وقت گھر میں رہنا تو ضروری نہیں تھا۔ شاید سطوت یا تو احمد سلمان کے ساتھ گھر سے باہر جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں کوئی بھی شخص زبردستی مجھے پکڑ کر انعام کے لالچ میں احمد سلمان کے گھر پہنچا کر انعام کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ احمد سلمان نے اس اشتہار میں یہی اطلاع دی تھی کہ اس کا بیٹا ہارون گھر سے چھ ماہ غائب رہنے کے بعد دوبارہ گھر پہنچ گیا ہے اس لیے پہلے شائع شدہ اشتہارات کو منسوخ سمجھا جائے۔ میری نظر سے پہلی بار اس نوعیت کا کوئی اشتہار گزرا تھا۔ یہ اشتہار بھی سابقہ اشتہارات کی طرح سوئی بڑا اور نمایاں شائع ہوا تھا۔ اخبار کا مطالعہ کرنے والا اس اشتہار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس اشتہار کی عبارت میں میرے لیے صرف ایک بات تشویش ناک تھی۔ اشتہار میں میری عمر بھی تحریر تھی، سولہ سال! میری تشویش کا سبب یہ تھا کہ میرے دشمنوں کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ میں عمر کی سولہویں منزل میں ہوں۔ اس اشتہار کو ہمیٹ ایسا ذہین اور چالاک ایجنٹ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات بھی اسے چونکا سکتی تھی کہ چھ ماہ غائب رہنے کے بعد ہارون کیسے گھر پہنچ گیا؟ وہ اس امکان کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا کہ میں بھی ہارون کی جگہ لے سکتا ہوں؟

خطرہ! بار بار میرے ذہن میں یہی ایک لفظ گردش کر رہا تھا۔ یقیناً اس اشتہار نے میرے لیے خطرات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ میری تلاش کے سلسلے میں میرے دشمن کسی بھی خفیف سے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہرحال معمولی یا اوسط ذہانت کے لوگ نہیں تھے۔ ان کے لیے ذرا سا اشارہ کافی تھا۔

[illegible] میری نگاہ ابھی [illegible] پر تھی [illegible] نسبتاً نمایاں اشتہار پر پڑی اور اس اشتہار کے نمایاں الفاظ پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ "تازہ کھلتے گلابوں کی خوشبو اور [illegible]" یہ الفاظ تھے جنہوں نے مجھے چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اشتہار قاہرہ کے [illegible] نائٹ کلب اوبرج کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ [illegible] عبارت پڑھتے گئے [illegible] چینی حسینہ [illegible] وقت تازہ کھلتے گلابوں کی خوشبو آتی ہے۔ آج شب [illegible] اوبرج [illegible] حسینہ [illegible] چینی رقاصہ [illegible] گلابوں کی خوشبو بکھر جاتی ہے۔ [illegible] کے بعد چینی رقاصہ لونی چو کے حسن کی تعریف [illegible] کے قلابے ملائے گئے تھے۔ اشتہار کے ساتھ ہی قاہرہ کی ایک بڑی سی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ تصویر میں وہ [illegible] نظر آ رہی تھی۔ وہ تصویر یقیناً کسی ماہر فوٹوگرافر نے کھینچی تھی۔ تصویر نہایت واضح، پرکشش اور خوبصورت تھی۔ فوٹوگرافر نے جیسے کسی زندہ لمحے کو تصویر میں بند کر دیا تھا۔ لگتا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ رقاصہ ابھی تصویر سے نکل کر رقص کرنے لگے گی۔

اس اشتہار کو پڑھ کر میرے ذہن میں [illegible] خیال پیدا ہوا یہ تھا۔ دنیا میں کیا [illegible] جس کے جسم سے ہر وقت تازہ کھلتے گلابوں کی خوشبو [illegible] مجھے اس رقاصہ کو قریب سے دیکھنے [illegible] کی خوشبو محسوس کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ [illegible] تھی۔ پھر مجھے نفرتیری نائٹ کا خیال آیا۔ آج ہی شب ساڑھے گیارہ بجے مجھے اُس کی تلاش میں میریڈین ہوٹل بھی پہنچنا تھا۔ یہ ہوٹل [illegible] کے علاقے میں تھا اور قاہرہ کے بڑے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ٹھیک وقت پر میریڈین ہوٹل کے [illegible] پہنچوں گا۔ [illegible] نفرتیری نائٹ نے لیزا کو [illegible] تھا۔ وہ یقیناً لیزا سے ملاقات کے [illegible] گا اور [illegible] کسی سے شخص کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو وہ یہی ہوگا جس کا قد [illegible] ہو اور جس کی آنکھیں [illegible] ہوں۔ اس نے لیزا کو خط میں لکھا تھا کہ وہ میک اپ میں نہیں ہوگا۔ یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ میں نے لیزا کا [illegible] اپنے ذہن میں [illegible]

تھی۔ اس کے علاوہ میں نفرتیری نائٹ کو تلاش کرنے کے لیے اپنی [illegible] ترتیب بھی [illegible] تھا۔ میں بار میں موجود لوگوں کے ذہن [illegible] یہ معلوم کر لیتا کہ ان میں سے نفرتیری نائٹ کون ہے۔ [illegible] کا انتظار ہے۔ گذشتہ شب کی طرح آج بھی میں [illegible] نہا کر باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مجھے پوری امید تھی کہ میں اپنی پہلی ہی کوشش میں اُس خطرناک امریکی ایجنٹ تک پہنچ جاؤں گا اور اس کا مطلب اس کی موت ہی تھا۔ وہ اپنی موت سے بے خبر لیزا شمعون کا منتظر ہوتا اور میں اسی دوران میں اپنا کام کر جاتا۔ اسی سبب میرے لیے آج رات میریڈین ہوٹل پہنچنا بہت ضروری تھا۔ مجھے وہاں ساڑھے گیارہ بجے پہنچنا تھا اور اوبرج نائٹ کلب میں اُس چینی رقاصہ لونی چو کا رقص ساڑھے دس بجے تھا۔ اوبرج نائٹ کلب قاہرہ کی سب سے طویل شاہراہ، شاہراہ اہرام پر تھا۔ یہ شاہراہ پندرہ میل لمبی تھی اور [illegible] اسکوائر سے سیدھی اہرام تک جاتی تھی۔ تحریر اسکوائر سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر اوبرج نائٹ کلب تھا۔ قصر العینی کا علاقہ جہاں میریڈین ہوٹل تھا، تحریر اسکوائر کے قریب ہی تھا۔ میریڈین اور اوبرج نائٹ کلب کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ میل تھا۔ اب اوبرج سے فوراً ہی کوئی ٹیکسی مل جاتی تو میں وہاں نصف گھنٹہ [illegible] کے بعد بھی ٹھیک وقت پر میریڈین ہوٹل پہنچ سکتا تھا۔ نصف [illegible] کے دوران میں اس چینی رقاصہ کو میں قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ [illegible] قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ نصف گھنٹے میں مجھے اس رقاصہ کے اتنے قریب جانے کا موقع مل ہی جاتا۔ قریب سے اس کے جسم کی خوشبو محسوس کرنے اور اس تک پہنچنے میں زیادہ وقت لگ سکتا تھا۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ کوئی بھی غیر ملکی رقاصہ کسی [illegible] نائٹ کلب میں صرف ایک ہی دن اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ [illegible] مختصر وقت بھی کم از کم ایک ہفتے کا تو ہوتا ہی ہے۔ اس [illegible] رقاصہ کو تو بہر حال میں آئندہ شب بھی قریب سے دیکھ سکتا تھا لیکن کسی بھی سبب اگر آج میریڈین ہوٹل نہ پہنچ پاتا تو پھر [illegible] دوسرا موقع نہ تھا۔ میں نے اسی لیے اوبرج نائٹ کلب جانے کا

کم از کم آج شب کے لیے اپنے ذہن سے نکال دیا۔

"تم کس سوچ میں بیٹھے ہو ہارون؟" معاً مجھے لیلیٰ نے مخاطب کیا تو میں چونک اٹھا۔ "تمہارے لیے اوپر سے کھلونے لا دوں؟ کھیلو گے؟" میں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا تو لیلیٰ اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور احمد سلمان نے اس کا ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو! جی... کون؟ کیا کہا آپ نے... جی... ہارون سے بات کرنا ہے مگر میں... میں تو آپ کو نہیں جانتا... جی؟ .... وہ جانتا ہے آپ کو!" احمد سلمان کے لہجے میں حیرت تھی اور وہ فون پر بات کرتے ہوئے میری طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ "ہوں... جی... اچھا... تو... تو وہ اس دوران میں آپ کے پاس تھا... اچھا ٹھیک ہے... میں... جی ہاں وہ میرے پاس ہی بیٹھا ہے میں دیتا ہوں اُسے فون!" یہ کہہ کر احمد سلمان نے ریسیور کان سے ہٹایا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہارون بیٹے! دیکھو تو کوئی صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ نام نہیں بتایا انھوں نے مگر ان کا کہنا ہے کہ تم انھیں اُن کی آواز سے پہچان لوگے۔ لو ادھر آ کر بات کر لو۔"

میرے ذہن میں مسلسل خطرے کا الارم بجنے لگا۔ مجھے فون کرنے والا میرا کوئی دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ وہ غالباً فون پر مجھ سے بات کر کے کوئی اندازہ لگانا چاہتا ہوگا۔ یہ سوچتا ہوا میں صوفے سے اٹھ کر احمد سلمان کے قریب پہنچ گیا جس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ میں نے اس سے ریسیور لے لیا اور ہارون کی مخصوص بچکانہ آواز میں "ہیلو" کہا۔

"ہیلو ابوالہول!" دوسری جانب سے بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ لہجہ خالص امریکی تھا۔

"جی!" میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو ہارون بول رہا ہوں جناب!"

"مجھے معلوم ہے ابوالہول کہ تم اپنی آواز بدلنے پر حیرت انگیز قوت رکھتے ہو اس لیے میں تمہاری باتوں میں نہیں آ سکتا!" دوسری جانب سے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا گیا پھر آواز آئی۔ "اگر تم ابوالہول نہیں ہو تو پھر تمہارے جسم سے ہر وقت تازہ کھلتے ہوئے گلابوں کی خوشبو کیوں آتی ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے بے ساختہ معصوم سے لہجے میں کہا۔ "میرے جسم سے تو نہیں آتی خوشبو!"

"خیر تم اقرار نہ کرو کوئی بات نہیں۔ میں نے تمہیں ایک اطلاع دینے کے لیے اس وقت فون کیا تھا۔ یہ اطلاع یقیناً تمہارے لیے دلچسپی کا سبب ہوگی کہ تمہاری ماں کو ہم یہاں قاہرہ لے آئے ہیں۔" اُس سے یہ خبر سن کر واقعی میرا دورانِ خون تیز ہو گیا۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ "اگر تم اسے محض دھمکی نہ سمجھو تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ تمہاری ماں کو ہم قتل کر دیں گے۔ کل کے اخبارات میں تم اس کے قتل کی خبر پڑھ لوگے۔ خبر کے ساتھ ہی اُس کی تصویر بھی شائع ہوگی جسے پہچاننا یقیناً تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ بغداد کے دوران قیام میں تمہیں ہماری ایک ایجنٹ نے اُس کی تصویر بھیجی تھی جس میں وہ تمہیں گود میں اٹھائے ہوئے ہے۔ یاد آ گیا؟" چند لمحے وہ کچھ نہ بولا۔ وہ غالباً میرے کچھ بولنے کا منتظر تھا مگر جب میں نے جواب میں کچھ نہ کہا تو وہ دوبارہ ہنس کر بولا۔ "بہت چالاک ہو! غالباً کوئی ردِعمل ظاہر نہ کر کے تم اپنی اصل شخصیت چھپانا چاہتے ہو لیکن شاید تم یہ بھول گئے، تمہاری خاموشی بھی اس کا ثبوت ہے کہ تم میری بات دلچسپی اور توجہ سے سن رہے ہو ورنہ تمہارا ردِعمل قطعی مختلف ہوتا۔ تم یا تو سلسلہ منقطع کر دیتے یا پھر میری باتوں کو لایعنی اور بے سر و پا جان کر ان پر حیرت کا اظہار کرتے۔ تم نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب بھی واضح طور پر یہی ہے کہ تم ہارون نہیں، ابوالہول ہو!" وہ شخص یقیناً شیطانی ذہانت کا مالک تھا۔ اس نے میری خاموشی سے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا۔ اب اگر میں اُس کی باتوں پر حیرت کا اظہار بھی کرتا تو وہ مصنوعی ہی معلوم ہوتا۔ پھر بھی میرے خیال میں میری جانب سے حیرت کا اظہار ضروری تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر بول اٹھا۔ "تو سن لیا تم نے ابوالہول! میں تمہیں کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے شام تک کا وقت دے سکتا ہوں۔ میں ٹھیک چار بجے تمہیں پھر فون کروں گا۔ اگر تم نے عقل و ہوش سے کام لے کر خود کو ہمارے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا تو پھر تمہاری ماں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ میں تمہیں اسی وقت یہ بتا دوں گا کہ تم کب، کہاں اور کس طرح خود کو ہمارے حوالے کرو گے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"کون تھا بیٹے؟" احمد سلمان نے مجھ سے دریافت کیا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"معلوم نہیں ابو جان!" میں نے بھولپن سے جواب دیا۔ میں

تو نہیں جانتا انور اُسے۔"

"تم نہیں جانتے اُسے؟" احمد سلمان حیرت سے بولا۔ "مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو اور یہ کہ تم اُسے اُس کی آواز سے پہچان لوگے۔ وہ... وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تم پچھلے چھ ماہ اُسی کے پاس رہے ہو۔ عجیب بات ہے!" احمد سلمان کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"جانے کیسی کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔" میں نے جواب دیا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا انور جان!" پھر کچھ سوچ کر میں نے اُسے خوف زدہ سے لہجے میں بتایا۔ "وہ پھر شام کو چار بجے فون کرے گا۔"

"تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے!" مجھے خوف زدہ محسوس کر کے احمد سلمان جلدی سے بولا۔ "میں اُس سے بات کروں گا، تمہیں بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" پھر وہ مجھے تسلی دینے کی خاطر بولا۔ "میں اُس کا دماغ درست کر دوں گا! جب تم اُسے جانتے ہی نہیں تو وہ کیوں تم سے بات کرنا چاہتا ہے!"

"ہاں انور جان! اب میں اُس سے بات نہیں کروں گا، آپ ہی کیجیے گا نا۔" میں نے احمد سلمان سے دانستہ یہ بات کہی تھی کیوں کہ اب اس شخص سے فون پر بات کرنا لاحاصل ہی تھا۔ یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں خود کو اُن لوگوں کے حوالے کر دیتا جو مجھے اپنے قبضے میں کرنے کے بعد دنیا کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے تھے۔ میری ماں کو قتل کر دینے کی اطلاع میری دانست میں محض دھمکی ہی تھی۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ جب میں بغداد میں تھا تو اُس وقت بھی میرے سامنے تقریباً ایسی ہی صورت حال تھی۔ مجھے اُس وقت بھی یہی دھمکی دی گئی تھی اور میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے اس بات پر بھی یقین نہیں آیا تھا کہ وہ میری ماں کو قاہرہ لے آئے ہیں۔ یہ بھی محض فریب ہو سکتا تھا۔

فون پر مجھ سے رابطہ قائم کرنے والا وہ شخص میرے خیال میں وہی امریکی ایجنٹ تھری ناٹ ہی ہو سکتا تھا جس نے لیز تھومن کو خط لکھا تھا۔ خود اُس نے بھی یہ بات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ امریکی ایجنٹ ہے ورنہ وہ اس امریکی ایجنٹ کا حوالہ ہرگز نہ دیتا جس نے بغداد میں مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور وہ تصویر بھیجی تھی۔ پھر جہاز میں میرے ہی ہاتھوں ماری گئی تھی۔ تھری ناٹ نے مجھے اتنی جلدی کس طرح ڈھونڈ نکالا؟ اس سوال کا جواب وہ اشتہار ہی ہو سکتا تھا جو اُس دن کے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

تھری ناٹ نے میری توقع کے عین مطابق ہی عمل کیا تھا اور بالکل صحیح نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اتنا چالاک اور عیار شخص تھا کہ مجھ سے فون پر گفتگو کر کے میری خاموشی کے باوجود اور میرے اقرار کے بغیر یہ معلوم کر لیا تھا کہ میں ابوالہول ہی ہوں۔ اُس نے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا، وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا اور خود وہ بھی اس سے باخبر ہو چکا تھا۔

ہارون کی حیثیت سے اپنے دشمنوں کی نظر میں آجانے کے بعد میں اب خود کو قطعی غیر محفوظ تصور کر رہا تھا۔ لیلیٰ اوپر سے میرے لیے کھلونے لے آئی اور میں اُن سے کھیلنے بھی لگا مگر میرا ذہن اسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ اب صبح کے آٹھ بج رہے تھے اس لیے احمد سلمان شریف کی لاش لانے کے لیے ہسپتال روانہ ہو چکا تھا۔ صالحہ اپنے کمرے میں تھی اور لیلیٰ میرے پاس۔ احمد سلمان روانگی سے قبل لیلیٰ کو یہ بتا گیا تھا کہ پولیس بہ دستور کوٹھی کی اطراف موجود ہے اور اُسے کسی طرح گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ احمد سلمان نے اُسے میرا خیال رکھنے کی بھی تاکید کی تھی۔

موجودہ حالات میں یہ بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں جلد از جلد اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دوں، لیکن فی الحال قاہرہ سے فرار ہونے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ اگر میں فوری طور پر وہاں سے فرار ہو جاتا تو حالیہ تجربات کی روشنی میں جلد ہی مجھے تلاش کر لیا جاتا۔ تو پھر فرار سے کیا فائدہ تھا؟ میں قاہرہ ہی کے کسی اور حصے میں کسی اور حیثیت سے رہ سکتا تھا۔ قاہرہ سے فوراً فرار نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں وہاں رہ کر اپنے وجود کا کم از کم ایک معما تو حل کر ہی لینا چاہتا تھا۔ میں اس سے پہلے فرار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ معما یہ تھا کہ مجھے میرے دشمن ابوالہول کیوں کہتے تھے؟ آخر اس کا کوئی تو سبب تھا اور وہ سبب قاہرہ میں رہ کر ہی آسانی سے سمجھ میں آ سکتا تھا۔ پھر یہ کہ قاہرہ اتنا بڑا شہر تھا کہ اگر ایک بار میں اپنے دشمنوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ مجھے جلد تلاش نہ کر پاتے۔ کسی چھوٹے شہر میں میری تلاش نسبتاً اُن کے لیے آسان ثابت ہوتی تھی اسی لیے میں ہمیشہ دنیا کے بڑے شہروں ہی کا انتخاب کرتا تھا۔ اب تک میں اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد فرار ہو جاتا تھا مگر اس بار میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ایک مقصد اپنے دشمنوں کو دھوکا دینا بھی تھا۔ وہ یہی سوچتے کہ میں قاہرہ سے فرار ہو چکا ہوں اور وہ مجھے کہیں اور تلاش کرتے پھرتے۔

انھی حالات پر غور کرتے ہوئے میری نگاہ لیلیٰ کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ مجھے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی جس کا اظہار اُس کے چہرے سے نمایاں طور پر ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ وہ کتنی بدقسمت لڑکی ہے کہ اُس کا شوہر ایک جرائم پیشہ ایجنٹ ثابت ہوا اور بھائی سوتیلی ماں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ ماں پہلے ہی اُسے اپنی محبت سے محروم کر چکی تھی۔ وقتی طور پر میری صورت میں اُسے جو ایک بیٹے کا سہارا مل گیا تھا، وہ بھی اب زیادہ دن کا نہیں تھا۔ مجھے بہرحال اب ہارون کے کردار کو ترک کرنا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرا دل دکھنے لگا کہ جب اس لڑکی سے یہ سہارا بھی چھن جائے گا تو اُس کا کیا حال ہوگا؟ وہ کس طرح جی سکے گی؟ مجھے تو اب جلد یا بدیر وہاں سے جانا ہی تھا۔ پھر مجھے احمد سلمان کا خیال آیا۔ دوبارہ بیٹے کو کھو کر اُس پر کیا گزرے گی! کیا وہ یہ دکھ برداشت کر سکے گا؟ بیٹی بیوہ ہو گئی اور بیٹا مل کر دوبارہ بچھڑ گیا۔ احمد سلمان کی دکھ بھری کہانی کا یہی انجام تھا۔ میں چاہتا بھی تو وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار جب میرے دشمن میری تلاش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ فوراً ہی اس کی رپورٹ اپنے اعلیٰ حکام تک پہنچا دیتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک امریکی انٹیلی جینس کے سربراہ کو یہ اطلاع مل چکی ہوگی کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں۔ ایسی صورت میں دشمنوں کو ٹھکانے لگا دینے کے باوجود میں اُس جگہ اور اُس حیثیت میں قطعی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر مجھے بہ مجبوری ہی سہی اُس گھر کو چھوڑنا پڑتا تاکہ میں اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگاتا تو کوئی دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ ہمیشہ میں اپنے دشمنوں کے مقابل کامیاب ہی ہوتا۔ اب تک میں کئی بار اُن کے چنگل میں آتے آتے بچا تھا۔ روسی ایجنٹ میخائیل تو مجھ پر پوری طرح قابو پانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اگر وہ اپنی ذہانت سے کام نہ لیتا اور ماسکو سے ملنے والے احکام پر عمل کرتا تو آج میں آزاد فضا میں سانس نہ لے رہا ہوتا۔

وقت گزر جاتا ہے اور اپنے پیچھے سلگتے ہوئے زخموں کی داستان چھوڑ جاتا ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی تھا۔ بغداد کے دوران بھی میری روح پر کچھ زخم لگے تھے جو اب تک نہیں بھرے تھے۔ صالحہ کو میں اب تک بھلا نہیں سکا تھا۔ وہی صالحہ جو ڈاکٹر کی محبوبہ تھی اور وہی جس کے سینے میں خود میرے ذہن نے میرا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اُسی ظالم کی یاد کو بھلانے تو میں قاہرہ آیا تھا۔ مگر یہاں آ کر میری روح کا کرب اور بڑھ گیا تھا اور اس وقت یہ کرب کچھ اور سوا ہو گیا تھا۔ لیلیٰ اور احمد سلمان مستقبل میں جن دکھوں سے گزرنے والے تھے، انھیں میں ابھی سے اپنی روح میں محسوس کر رہا تھا۔ بوڑھے کرنل کو تو اُس کا بیٹا مل گیا تھا اور صالحہ نے بھی اپنے محبوب کو پا لیا تھا۔ ان لوگوں کو کوئی محرومی کوئی دکھ نہیں تھا۔ میں جس طرح خاموشی کے ساتھ اُن کی زندگی میں داخل ہوا تھا، اسی خاموشی کے ساتھ اُن کی زندگی سے نکل گیا تھا، لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔ یہاں بڑا سوگ منایا جاتا، بڑا ماتم ہوتا کسی کا بھائی بچھڑ جاتا اور کسی کا بیٹا ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ ہر چند کہ مجھے ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے تیسرا دن ہی تھا مگر میں اُن کے سارے دکھ اور شکوہ جان چکا تھا۔ میرے دل میں اسی لیے ان کی خاطر ہمدردی اور محبت کے گہرے جذبات پیدا ہو گئے تھے اور انھی جذبات نے میری روح کو بے چین کر دیا تھا۔

وہ نصف گھنٹا میں نے بڑے کرب کے عالم میں گزارا کیوں کہ میری توجہ کسی اور طرف مبذول ہی نہیں ہوئی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب تعزیت کرنے والوں کی آمد شروع ہو گئی تو کچھ میرا دھیان بٹا۔ سب سے پہلے آنے والی لیلیٰ اور ہارون کی خالہ تھی جس نے لیلیٰ کو اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ اُدھیڑ عمر عورت آتے ہی لیلیٰ کے گلے لگ کر زور زور سے رونے لگی۔ دوسرے کو روتے دیکھ کر یوں بھی خود بہ خود آنکھوں میں آنسو آنے لگتے ہیں شاید اسی لیے لیلیٰ بھی رو پڑی ورنہ شریف کی موت کا اُسے قطعی صدمہ نہیں تھا۔ پھر اُس اُدھیڑ عمر عورت کی نگاہ مجھ پر پڑی تو دونوں بانہیں پھیلائے میری طرف بڑھی اور پھر مجھے سینے سے لگا کر رونے لگی۔ مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "تو... تو کہاں... کہاں چھپ... کہاں جا چھپا تھا میرے چاند!"

دیر تک وہ مجھے سینے سے لگائے رہی، پھر لیلیٰ کے قریب جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی اور عورتیں آ گئیں جن کے ساتھ مرد بھی تھے۔ ان کے لیے لیلیٰ نے نشست گاہ کھول دی۔ لیلیٰ کی خالہ کے ساتھ ایک نو سالہ لڑکی تھی جو ایک طرف صوفے پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ لیلیٰ نے عورتوں کے لیے زمین پر دری بچھا دی جو کافی بڑی تھی، پھر وہ خود بھی انھی عورتوں کے ساتھ دری پر بیٹھ گئی۔ مجھے زمین پر پڑے ہوئے اپنے کھلونے سمیٹنا پڑے۔ لیلیٰ نے مجھے اسی کمرے میں موجود کھلونوں سمیت مسہری پر بٹھا دیا تھا۔ اس طرح غالباً وہ مجھے

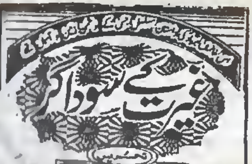

ایم اے راحت
خاک وطن کا سودا کرنے والے
چہروں کی نقاب کشا داستان
ایک جلد میں مکمل
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
غیرت کے سوداگر
وطن عزیز کے حصول کے لئے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہولہو ہوئے۔ تب عروس وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن ناموس وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔
(زیر طبع)
کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ ۲۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔
گل ٹریش لائبریری ... 11 ... فون: 7229762 - 7248990

اپنی نظروں کے سامنے ہی رکھنا چاہتی تھی۔ میری وہاں موجودگی پر کسی بھی عورت کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ان سبھی کو معلوم تھا کہ ذہنی اعتبار سے میں بالکل بچہ ہی ہوں۔ اسی دوران میں سطوت بھی اوپری منزل سے نیچے آ گئی تھی۔ وہ خاموش خاموش سی تھی۔ لیکن بھی جو عورت آ رہی تھی وہ لیلیٰ ہی سے تعزیت کر رہی تھی۔ شریف کے قتل پر عورتیں اپنی اپنی عقل کے مطابق مختلف تبصرے کر رہی تھیں۔

مجھے اب لیزا کو اس کے انجام تک پہنچا کر لیلیٰ کی طرف سے تو کوئی فکر نہیں رہی تھی، مگر اپنا ضرور خیال تھا۔ پولیس اب بھی کوٹھی کی اطراف موجود تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ تعزیت کرنے کے لیے آنے والوں سے نہ تو کچھ پوچھ گچھ کر سکتی تھی اور نہ ہی انھیں روک سکتی تھی۔ انہی لوگوں میں شامل ہو کر کوئی میرا دشمن بھی اندر آ سکتا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا اس لیے مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتا تھا، ہاں یہ ضرور ممکن تھا کہ قریب سے میری خوشبو محسوس کر لیتا اور اُسے یقین ہو جاتا میں ہی ابوالہول ہوں۔ تھری ناٹ فون پر بڑی حد تک تصدیق ہو جانے کے باوجود یقین حاصل کرنے کے لیے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔ لیکن کیوں کہ اب تک نشست گاہ میں گیا ہی نہیں تھا اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ میرے قریب آئے بغیر کسی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ خوشبو محسوس کر سکتا جو میری پہچان تھی۔

پھر کوئی پونے دس بجے کے قریب شریف کی لاش لے کر احمد سلمان آ ہی گیا۔ لاش ایک ایمبولینس میں آئی تھی اور اسے نچلی منزل ہی کے ایک کمرے میں رکھوا دیا گیا تھا۔ لاش کو جنازے کی صورت میں قبرستان لے جانے کے لیے غسل دیا گیا اور پھر کفن پہنا دیا گیا۔ تمام سامان وغیرہ احمد سلمان واپسی میں اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ یہ تمام کارروائی بہت تیزی کے ساتھ ایک گھنٹے کے اندر اندر تکمیل کو پہنچ گئی اور جنازہ ایک بس میں قبرستان روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل کم ہی افراد نے آخری دیدار کیا۔ انہی میں لیلیٰ بھی تھی۔ جس وقت وہ شریف کا مردہ چہرہ آخری بار دیکھ رہی تھی، میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ آنسو جھوٹے نہیں تھے۔ حالانکہ میں نے اس کے ذہن میں شریف کے لیے انتہائی نفرت بٹھا دی تھی مگر پھر بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں محبت کی کوئی چنگاری دبی ہوئی تھی جو آخری وقت بھڑک اٹھی تھی۔ بہرحال اس نے شریف کے ساتھ شریک حیات کی حیثیت سے کئی سال گزارے تھے۔ وہ شریف کی موت پر واقعی سچ مچ بلک بلک کر رو سکتے تھے، وہاں

تھے۔ وہ رونے والے تل ابیب میں تھے جنھیں شاید ابھی یہ خبر بھی نہیں مل سکی تھی کہ وہ جس کی واپسی کا انھیں طویل عرصے سے انتظار ہے اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ جو مسلمان نہیں ایک یہودی تھا اُسے وطن سے بہت دور کچھ لوگوں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے زمین کے اندر دفن کر دیا ہے۔ تمام نظریات سارے فلسفے اور سبھی تصورات موت کے مقابل آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ موت کسی سے نہ اس کا نظریہ پوچھتی ہے نہ عقیدہ، وہ تو ایک اٹل حقیقت ہے جو سبھی سے یکساں سلوک کرتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی نیک نام مرتا ہے اور کوئی بدنام، مگر اس سے مرنے والے کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُسے کس نے کیا سمجھا، یہ زندہ لوگوں کی باتیں ہیں۔

جس طرح بچوں کو قبرستان لے جانے سے گریز کیا جاتا ہے مجھے بھی ساتھ نہیں لے جایا گیا اور اگر کوئی مجھ سے چلنے کے لیے کہتا بھی تو میں شاید نہ جاتا۔

شام ہوتے ہوتے سارا ہنگامہ ختم ہو گیا اور تمام افراد رخصت ہو گئے۔ صرف لیلیٰ کی خالہ نہیں گئیں۔ پھر جس وقت چار بجے تو میری نظریں ٹیلی فون کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں اس وقت بھی نیچے والے کمرے ہی میں تھا۔ احمد سلمان کے ذہن سے شاید صبح کی بات نکل گئی تھی اسی لیے وہ اُس وقت وہاں موجود نہیں تھا لیکن میں یہ نہیں بھولا تھا کہ شام کو ٹھیک چار بجے تھری ناٹ فون کرے گا۔ میں یہ بات احمد سلمان کو یاد بھی نہیں دلانا چاہتا تھا کیوں کہ ایسا کرنا میرے کردار سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ دیوار گیر گھڑی نے جیسے ہی چار بجنے کا اعلان کیا، ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ لیلیٰ فون کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی، اُس نے ریسیور اٹھا لیا۔ ہرچند کہ میں تھری ناٹ سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن احمد سلمان کی غیر موجودگی میں مجبوراً مجھے بات کرنا پڑتی۔ جس طرح تھری ناٹ نے احمد سلمان کو شیشے میں اتار کر مجھ سے بات کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، وہ لیلیٰ کو بھی شیشے میں اُتار سکتا تھا۔

لیلیٰ ابھی فون پر بات کر ہی رہی تھی کہ احمد سلمان کمرے میں داخل ہوا۔ غالباً اُسے یاد آ گیا تھا کہ چار بجے کوئی فون آنے والا ہے۔ اُسے آتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ احمد سلمان نے دور ہی سے آگے بڑھتے ہوئے لیلیٰ سے پوچھا۔ "کس کا فون ہے؟"

"نام تو نہیں بتایا ہے صاحب۔" لیلیٰ اپنے کان سے ریسیور ہٹاتے ہوئے بولی۔ "یہ کہہ رہے ہیں کہ ہارون سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

جوانی کی امنگ حسن کی نزاکتوں کو بھول کر آزادی وطن کے جذبے سے سرشار
ایک فلسطینی مجاہدہ کی سرگزشت
ناموس وطن اور عروس آزادی کی متوالی
دشمن
تحریر: ایم اے راحت
دیوانوں کی کہانی آتش و آہن کی انوکھی داستان
٥ ہزاروں قارئین کی پسندیدہ تحریر
٥ بدی کے خلاف جہاد کرنے والوں کی کہانی
ایک جلد میں مکمل
آج ہی قریبی بک اسٹال سے یا براہ راست ہم سے طلب کریں!
گل ٹریش لائبریری، 11۔ عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔ فون: 7229762 - 7248990
قیمت
فی حصہ ۲۵ روپے
علاوہ محصول ڈاک

"لاؤ مجھے دو! میں کرتا ہوں اس خبیث سے بات!" احمد سلمان تیزی سے بڑھتا ہوا غصے میں بولا۔ "یہ وہی معلوم ہوتا ہے صبح والا!"

"لیں! آپ ہی ان سے بات کریں۔" لیلیٰ نے ریسیور احمد سلمان کی طرف بڑھا دیا جو اب قریب پہنچ چکا تھا۔

"کون ہے؟" احمد سلمان نے سخت لہجے میں پوچھا۔ دوسری طرف سے جواب میں کچھ کہا گیا جس پر احمد سلمان بگڑ کر بولا: "تم جھوٹے ہو! وہ تمہیں بالکل نہیں جانتا! بند کرو اپنی بکواس! کیا؟.... ہاں! خبردار! آئندہ کبھی فون!" یہ کہہ کر اس نے ریسیور لیلیٰ کو تھماتے ہوئے کہا: "رکھ دو۔"

یہ کہہ کر وہ لیلیٰ ہی کے قریب بیٹھ گیا۔

"تھا کون ابو!" لیلیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کون حرام زادہ تھا!" احمد سلمان ناگواری سے بولا۔ پھر لیلیٰ کو صبح آنے والے فون سے اور اس گفتگو سے آگاہ کرنے لگا جو اس شخص نے کی تھی۔

"لیکن سوال یہ ہے ابو کہ وہ شخص ہارون کو کیسے جانتا ہے!" لیلیٰ کے لہجے میں فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"لعنت بھیجو! جانتا ہوگا کیسے ہی!" احمد سلمان بات کو درگزر کرنے کی خاطر بولا۔ "ویسے بھی اس نے کہا ہے کہ اگر ہارون اسے بھول گیا ہے تو اب وہ کبھی اسے فون نہیں کرے گا۔"

"میں تو کسی اور وجہ سے کہہ رہی تھی ابو کہ...." لیلیٰ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس نے احمد سلمان کی طرف جھک کر آہستہ سے کچھ سرگوشی کی۔ غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی بات سن سکوں لیکن میں ان دونوں سے کچھ فاصلے ہی پر تھا مگر اس کے باوجود میں نے لیلیٰ کی بات سن لی۔ میں نے اپنی قوتِ سماعت کے دائرے کو ذرا سا وسیع کر لیا تھا۔ لیلیٰ نے احمد سلمان سے کہا تھا: "میں یہ کہہ رہی تھی ابو کہ ہارون نے اپنی گمشدگی کا زمانہ کہاں گزارا؟ یہ بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہو اور.... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ.... وہ کوئی خطرناک آدمی ہو اور وہ ہارون کو اغوا کر لے یا پھر...." لیلیٰ نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

جواباً احمد سلمان بھی اسی سے مدھم لہجے میں بولا: "خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں لیلیٰ! تم قطعی نہ گھبراؤ۔ اگر میں نے ذرا سا بھی خطرہ محسوس کیا تو فوراً پولیس کو مطلع کر دوں گا اور پھر ابھی تو پولیس یوں بھی کئی دن کوٹھی کی نگرانی کرتی رہے گی۔ میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ضرورت پڑی تو میں ہارون کی حفاظت اور تمہاری حفاظت کے لیے مستقل طور پر مسلح باڈی گارڈز رکھ لوں گا۔ میں نے جو دولت کمائی ہے وہ تم دونوں سے تو زیادہ نہیں!"

اپنے باپ کی تسلی بخش بات سن کر لیلیٰ کے چہرے سے کسی قدر اطمینان کا اظہار ہونے لگا اور پھر اس سلسلے میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس بھولی لڑکی کو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ تمام حفاظتی انتظامات یونہی دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور اس کا ہارون اس کا بھائی غائب ہو جائے گا۔ پھر سلوت آگئی اور اس نے شام کی چائے پینے کے لیے کہا۔ لیلیٰ کی خالہ اوپری منزل ہی میں تھیں۔ احمد سلمان اور لیلیٰ مجھے ساتھ لے کر اوپری منزل کے اس کمرے میں آ گئے جہاں کھانے کی میز بچھی ہوئی تھی۔ چائے سے فراغت پانے کے بعد معاً احمد سلمان خود کلامی کے سے انداز میں بولا: "ارے! آج تو ڈاکٹر کی ڈیٹ ہے! میں بھول ہی گیا تھا!"

"کیا ابو؟" لیلیٰ جو اس کے قریب ہی بیٹھی تھی بول اٹھی۔

"مجھے آج ہارون کو لے کر ڈاکٹر رافع کے کلینک جانا تھا! انھوں نے آج کا وقت دیا تھا!" احمد سلمان نے بتایا۔ "ویسے ابھی وقت ہے! اطمینان سے تیار ہو جائیں گے ہم دونوں!" احمد سلمان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "کیوں بھئی ہارون! چلو گے نا! تمہاری سیر بھی ہو جائے گی۔"

میں نے اس پر حسبِ معمول خوشی کا اظہار کیا۔ ایک بچے کے لیے باہر گھومنے سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے اور ذہنی طور پر میں ایک بچے ہی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ میری آمادگی کے اظہار پر احمد سلمان بولا: "تو پھر غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لو!" پھر وہ لیلیٰ سے مخاطب ہوا: "لیلیٰ! تم میرے بیٹے کے لیے کپڑے نکال دو! اچھے سے!" وہ بھی مجھ سے بالکل اسی طرح بات کرتا تھا جیسے واقعی کسی بچے سے بات کر رہا ہو۔ لیلیٰ چائے پی چکی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور مجھے بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

پھر تقریباً پون گھنٹے کے بعد میں احمد سلمان کے ساتھ منزل کے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سیڑھیوں سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ پولیس والوں کو میں نے اس وقت بھی مستعد و چوکنا پایا۔ احمد سلمان اور میں دونوں ہی سے بے خبر اپنی دانست میں ڈاکٹر رافع کے کلینک جا رہے جو تحریر اسکوائر پر تھا اور جہاں ایک بار پہلے بھی مجھے لے جا چکا تھا۔ کار ابھی زمالک کے علاقے ہی میں تھی کہ مجھے تعا

کا احساس ہو گیا کیونکہ میں بہت چوکنا تھا۔ اس کار کو ایک مقامی عورت ڈرائیو کر رہی تھی۔ عورت کا رنگ اجلا تھا مگر اس کے قریب بیٹھا ہوا شخص قطعی بے جوڑ معلوم ہو رہا تھا کیونکہ وہ ایک حبشی تھا۔ ان دونوں کے علاوہ بھی کار کی پچھلی نشست پر تین افراد اور تھے جن کے چہرے میں واضح طور پر ابھی نہیں دیکھ پایا تھا۔

تعاقب کرنے والی کار اور احمد سلمان کی کار کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن یہ فاصلہ میرے لیے قطعی بے معنی تھا۔ میں نے ابھی لیے کار چلانے والی اور اس کے قریب بیٹھنے والے کے چہرے کو واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ میں ان دونوں کے چہروں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ بالکل میرے سامنے ہوں۔ قوتِ بصارت کے ساتھ ساتھ ہی میری قوتِ سماعت کا دائرہ بھی وسیع ہو چکا تھا۔ میں ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننا چاہتا تھا لیکن ان سبھی نے جیسے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ ان کی کار میں مکمل خاموشی تھی۔ بصارت و سماعت کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کو بھی میں اپنی پُراسرار قوتوں میں شمار کرتا تھا۔

زمالک سے تحریر اسکوائر تک متعاقب کار میں بیٹھے ہوئے افراد کے درمیان ایک جملے کے سوا کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ جملہ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے حبشی نے مڑ کر اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا: "اسے ہر حال میں زندہ ہی پکڑنا ہے ورنہ تم جانتے ہو کہ ذالبعش ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا!"

ذالبعش کون تھا اور اس نے مجھے زندہ پکڑنے کا حکم دیا تھا؟ یہ معلوم کرنا بھی میرے لیے مشکل ثابت نہ ہوا لیکن اس کے باوجود بھی میں تاریکی ہی میں تھا۔ ہاں! میں نے ذالبعش کے بارے میں بقیہ تفصیلات ضرور معلوم کر لیں۔ یہ سب کچھ مجھے اس حبشی کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوا تھا جس نے وہ جملہ ادا کیا تھا۔ ذالبعش ایک جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ تھا اور جو لوگ میرے تعاقب میں تھے ان کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ ذالبعش کے حکم پر وہ مجھے اغوا کرنے والے تھے۔ وہ آج دوپہر ہی سے احمد سلمان کی کوٹھی کے ارد گرد منڈلا رہے تھے، مگر وہاں پولیس کی موجودگی کے سبب کوٹھی کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مجبوراً انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کے کسی حصے میں کوٹھی کے اندر داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ پھر یہ اُن کی خوش قسمتی ہی تھی کہ انھیں رات کا انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ احمد سلمان رات ہونے سے پہلے ہی مجھے لے کر کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اب میری اطراف پولیس کا حصار نہیں تھا اور انھیں صرف یہ انتظار تھا کہ احمد سلمان کہیں کار روکے۔ اس حبشی کا ذہن پڑھ کر ہی میں یہ بھی جان سکا کہ ایک ویگن بھی ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ وہ ویگن تعاقب کرنے والی کار کے پیچھے کچھ فاصلے پر تھی۔ میں اسی لیے اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس بند ویگن میں بھی انھی لوگوں کے ساتھی تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ذالبعش کسی کے اشارے ہی پر مجھے اغوا کرا رہا تھا۔ اس جرائم پیشہ شخص کیلیے مجھے اغوا کرانے کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ذالبعش کو میرے اغوا پر کس نے آمادہ کیا تھا؟ اس سے ذالبعش کے ساتھی بے خبر تھے۔

تحریر اسکوائر پہنچنے تک میرا ذہن وہ لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا جس پر مجھے چلنا تھا۔ احمد سلمان قطعی لاعلم تھا کہ کچھ دیر بعد ہی کیا ہونے والا ہے۔ اس نے پورے اطمینان کے ساتھ اس بارہ منزلہ عمارت کے سامنے اپنی کار روکی اور پھر میرے ساتھ ہی کار سے اتر گیا۔ ابھی کار سے اتر کر اس نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک دم جیسے قیامت سی آگئی۔ میرے اور احمد سلمان کے ارد گرد پے در پے دھماکے سنائی دیے اور پھر ہر طرف گہرا دھواں پھیل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ حبشی اور اس کے ساتھیوں نے دھوئیں کے بم مارے تھے۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ مجھے کس طرح اغوا کیا جانا تھا؟ ان تفصیلات کا علم یقیناً اس حبشی کو نہیں تھا جس کا ذہن میں نے پڑھا تھا۔ اس حبشی اور اس کے ساتھیوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ میری اطراف دھوئیں کے بم پھینک کر شدید افراتفری مچا دی تھی۔ بقیہ کام حبشی کے ان ساتھیوں نے انجام دیا تھا جو بند ویگن میں تھے۔ دھواں پھیلتے ہی احمد سلمان گھبرا گیا تھا: "ہارون!.... ہارون بیٹے!" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے پکارا اور میرا ہاتھ تھامنا چاہا جو میں نے دانستہ اس سے چھڑا لیا تھا۔

میں اُسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اوپر جال پھینکا گیا ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط جال ہی تھا جو عموماً درندوں کو گرفت میں لانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ مجھے یہ علم تھا کہ مجھے پکڑنے کے لیے جال کا سہارا لیا جائے گا۔ یہی سبب تھا کہ میں اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میرا سر گرتے ہی سخت زمین سے ٹکرایا اور میری آنکھوں کے آگے چند لمحوں کو اندھیرا سا چھا گیا۔ انھی لمحوں میں جال کی سخت ڈوریاں کھینچ لی گئیں اور میں جال سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جال کی ڈوریاں اتنی سختی کے ساتھ اور اس حد تک کھینچی گئی تھیں کہ میرا جسم گٹھری سا بن گیا تھا۔

مجھے احمد سلمان کی آواز پھر سنائی دی جو زور زور سے کھانستے ہوئے مجھے پکار رہا تھا مگر مجھ پر اس دھوئیں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا میں اپنا سانس روکے ہوئے تھا۔ اگر مجھے اسی طرح پورے ایک گھنٹے بھی سانس روکنا پڑتا تو میں اس پر قادر تھا۔ پھر اچانک ہی تیزی سے جال سمیت میرے جسم کو گھسیٹ لیا گیا۔ قریب ہی بند وین کھڑی ہوئی تھی جس کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے کچھ [illegible] نے اٹھا کر وین کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ اسی لمحے وین کا عقبی دروازہ تیزی سے بند ہو گیا مگر اس سے پہلے تین افراد وین میں چڑھ چکے تھے۔

"ہارون!... میرے بچے!... ہارون!" میں نے آخری بار احمد سلمان کی آوازیں سنیں اور پھر وین حرکت میں آگئی۔

"جلدی کرو۔ اسے فوراً انجکشن لگانا ہے۔" وین میں موجود تینوں افراد میں سے ایک بولا۔

"ہاں جلدی! زالبش نے یہی ہدایت کی تھی۔" دوسرے نے پہلے کی تائید میں کہا۔

"تو پھر وہ بیگ اٹھاؤ جلدی سے۔" تیسرا شخص بھی بول اٹھا جو اب تک خاموش تھا۔ اس نے وین کی سیٹ پر ایک جانب رکھے ہوئے چمڑے کے بیگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں اس دوران میں ان کے ذہن پڑھ کر یہ معلوم کر چکا تھا کہ انھیں بھی علم نہیں زالبش نے کس کے ایما پر مجھے اغوا کرایا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے علم میں یہ بھی آگیا تھا کہ اس وین کی منزل جیزا کی ایک خوب صورت آبادی "النسیل" تھی۔ یہ خوب صورت علاقہ تقریباً جزیرہ ہے۔ دریائے نیل نے اسے بقیہ خشکی کے راستوں سے کاٹ دیا ہے اب یہ علاقہ پلوں کے ذریعے خشکی سے منسلک ہے۔ تحریر اسکوائر سے النسیل کا فاصلہ ایک میل سے زیادہ نہیں تھا اور وہ وین آناً فاناً وہاں پہنچ سکتی تھی۔ یہی حسین علاقہ زالبش کا ٹھکانا تھا۔ وہ لوگ مجھے اغوا کر کے اُسی کے ٹھکانے پر لیے جا رہے تھے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جس نے بھی زالبش کو میرے اغوا پر آمادہ کیا تھا، یہ ہدایت کر دی ہوگی کہ اغوا کے فوراً بعد ہی اور مجھ پر قابو پانے کے بعد بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا جائے۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں حرکت میں آجاتا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میری پُراسرار قوتیں بیدار ہو گئیں۔ میں نے ایک معمولی سے جھٹکے میں وہ مضبوط جال توڑ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں وہ مضبوط جال توڑ کر اس کی گرفت سے آزاد ہونے میں صرف چند لمحے لگے تھے۔ وہ تینوں یہ دیکھ کر ایک دم اچھل پڑے تھے۔ حیرت کی زیادتی کے سبب ان کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں اور وہ سیٹوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر انھی میں سے ایک نے تیزی کے ساتھ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا اور اُسے میرے سینے کی طرف تانتا ہوا غرایا: "اگر اب تم ذرا بھی ہلے تو میں تمھیں گولی مار دوں گا!" وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ پھرتیلا اور نڈر تھا۔ زالبش اُسے اپنے خاص گرگوں میں شمار کرتا تھا۔ اس شخص نے مجھے دھمکی دینے کے بعد اپنے دونوں ساتھیوں کو مخاطب کیا: "سیٹ کے نیچے رسی پڑی ہے تم دونوں اسے جکڑ لو۔" پھر اُس نے دوبارہ مجھے دھمکی دی۔

میں اُس کی حماقت پر ہنس ہی سکتا تھا سو ہنس دیا پھر بولا: "اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تم بھی زالبش کے ہاتھوں قتل ہونے سے نہیں بچو گے!" اسی کے ساتھ میں نے اس کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل نہیں کر سکے گا اور یہی ہوا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھین کر میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شاید انھیں مجھ سے یہ توقع نہیں ہوگی کہ میں ریوالور جیب میں رکھ لوں گا۔ دوسرے ہی لمحے اسی شخص نے مجھے گھورا جس کا ریوالور میں نے چھینا تھا اور پھر اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس کے جسم کو کسی کھلونے کی طرح لپک لیا اور پھر اُسے اسی کے دونوں ساتھیوں کی طرف اچھال دیا۔ پھر میں تیزی سے پلٹا۔ وین کے پچھلے اور اگلے حصے کے درمیان ایک آہنی دیوار حائل تھی میرا ہاتھ بلند ہوا اور دوسرے ہی لمحے آہنی پارٹیشن پر پڑا۔ لوہے کی چادر درمیان سے پھٹ گئی۔ میں نے اُسے پکڑ کر خفیف سا جھٹکا

دیا اور وہ آہنی چادر میرے قدموں میں آرہی۔ وین کے اگلے حصے میں ڈرائیور سمیت تین افراد موجود تھے۔ انھوں نے آہنی دیوار کو درمیان سے غائب دیکھا تو چیخ اٹھے۔ اُن کے لیے یقیناً یہ منظر ناقابلِ یقین ہی رہا ہوگا۔ میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا: "وین روک دو اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے!"

مگر شاید اُسے اپنی زندگی عزیز نہیں تھی۔ اُس نے وین روکنے کی بجائے اس کی رفتار اور بڑھا دی۔ اب میں ونڈ اسکرین کے ذریعے وین سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وین اس وقت ایک پل سے گزر رہی تھی۔ یہ پل عبور کرنے کے بعد وہ النسیل کے علاقے میں داخل ہو جاتی۔ مجھے وین سے اترنے کی زیادہ جلدی نہیں تھی اور یہ بھی تھا کہ میں بے سبب کشت و خون سے گریز کرتا تھا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ وہ وین جہاں جا رہی تھی، مجھے بھی بالآخر وہیں پہنچنا تھا۔ اب میرے لیے زالبش سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں اُسی کے ذریعے اپنے اصل دشمن تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور وین کے اندر موجود افراد کے منہ سے خوف زدہ سی چیخیں نکل گئیں۔ میں گویا اُن کے دیکھتے دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ مجھے اغوا کرانے والے نے شاید زالبش کو میرے متعلق کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا ورنہ شاید وہ اس کام میں ہاتھ ڈالنے پر راضی نہ ہوتا۔

"ارے وہ... وہ غائب... غائب ہو گیا!" چند لمحے بعد اُن میں سے ایک شخص بمشکل بول سکا۔ یہ وہی تھا جس سے میں نے ریوالور چھینا تھا۔ اب وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈرائیور کیوں کہ اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر صرف کیے ہوئے تھا اس لیے وہ مجھے غائب ہوتے نہ دیکھ سکا تھا۔ اُس نے جو یہ سنا تو فوراً وین کو بریک لگا دیے اور پھر وین روک کر مڑا۔ پھر اُس کے چہرے پر بھی حیرت اور خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ہکلایا: "یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"یہ ہو چکا ہے!" اُس کے ایک ساتھی نے کہا: "اُس کا جسم ہماری آنکھوں کے سامنے یک دم غائب ہوا ہے۔"

میں وین ہی میں اُن کے قریب کھڑا ہوا اُن کی حیرت سے لطف لے رہا تھا۔ مزید کچھ دیر رک کر انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ انھیں اس واقعے کی اطلاع فوراً زالبش کو دے دینا چاہیے۔

"وین کا اُس نے کیا کباڑا کر دیا! زالبش کیا کہے گا!" ڈرائیور نے وین کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ یقیناً معمولی اعصاب کے مالک نہیں تھے ورنہ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اُسے دیکھ کر اتنی جلدی اپنے حواس پر قابو نہ پا لیتے۔

وین مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی بالآخر ایک سہ منزلہ عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی۔ درمیان میں پختہ راستہ تھا جس پر بجری بچھی ہوئی تھی اور دونوں جانب سبز گھاس کے قطعے تھے۔ سامنے ہی اُس عمارت کا صدر دروازہ نظر آرہا تھا۔ ڈرائیور نے وین کو عمارت کے صدر دروازے پر روک دیا اور وہ سب اتر گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ وین سے اتر گیا اور پھر ان کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہو کر دائیں جانب ایک برآمدے میں مڑ گئے تھے۔ برآمدے کے اختتام پر ایک دروازہ نظر آرہا تھا جو بند تھا۔ ان میں سے ایک نے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر آنے والوں کو دیکھ کر دونوں پٹ پوری طرح کھول دیے۔ دروازہ کھولنے والے کے ہاتھ میں مجھے ایک شاٹ گن نظر آرہی تھی۔ وہ لوگ اندر داخل ہو گئے تو دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔ وہ ایک بڑا سا ہال تھا جو بہترین ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ہال بالکل خالی پڑا تھا۔ اُس ہال سے گزر کر وہ سب ایک راہداری میں پہنچے۔ کچھ فاصلے ہی پر بائیں جانب ایک زینہ نظر آرہا تھا۔ انھوں نے زینے کا رخ کیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی اُن کے اختتام پر پھر ایک مسلح شخص نظر آیا اس کے ہاتھ میں بھی شاٹ گن تھی۔

"زالبش کہاں ہے؟" اُن میں سے ایک نے مسلح شخص سے پوچھا۔

"وہ اپنے ایک مہمان کے ساتھ نشست گاہ میں ہے۔" مسلح شخص نے جواب دیا پھر بولا: "کیا تم لوگ خالی ہاتھ لوٹے ہو؟" اُسے غالباً علم تھا کہ وہ لوگ کس کام سے گئے تھے۔

"ہاں۔" ایک شخص نے جواب میں کہا: "ہم ذرا زالبش سے مل آئیں پھر تمھیں بتائیں گے کہ ہمیں کیا عجیب اور پُراسرار واقعہ پیش آیا ہے۔"

مسلح شخص ہنس پڑا پھر بولا: "پُراسرار واقعہ اور اس زمانے میں!" اس کے لہجے میں استہزا تھا۔

"جب ہم تمھیں واقعہ بتائیں گے تو تم اس طرح نہیں ہنس سکو گے۔" ایک اور شخص نے کہا پھر وہ سب آگے بڑھ گئے۔

وہ ایک چوڑی اور لمبی سی راہداری تھی جس کی دونوں جانب غالباً کمرے بنے ہوئے تھے مگر کمروں کے دروازے بند تھے۔ راہداری کچھ دور جا کر دائیں جانب مڑ گئی اور اُسی وقت مجھے کچھ فاصلے پر ایک اور مسلح شخص نظر آیا۔ وہ ایک دروازے کے سامنے مستعد اور چوکنا کھڑا

ہوا تھا۔ وہ سب وہاں پہنچ کر رک گئے۔ وین کے ڈرائیور نے اس مسلح شخص سے کہا کہ وہ رالبعن کو ان لوگوں کی آمد سے مطلع کر دے۔ مسلح شخص جواب میں کچھ کہے بغیر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور اُسی کے ساتھ میں بھی اندر پہنچ گیا۔ وہ نشست گاہ کسی امیر کبیر آدمی کی معلوم ہوتی تھی۔ سامنے ہی آرام دہ صوفوں پر دو افراد آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان ایک خوب صورت اور بڑی آبنوسی میز رکھی ہوئی تھی۔ اُس میز پر غیر ملکی شراب کی بوتل اور سوڈے کی خالی اور بھری بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُن دونوں کے بالکل سامنے بلوریں جام تھے۔ اُن میں سے ایک نے جو تقریباً چالیس سال کی عمر کا معلوم ہوتا تھا اور جس کے چہرے ہی سے کرختگی کا اظہار ہوتا تھا، مسلح محافظ کو آتے دیکھ کر منہ بنایا اور ناگواری سے بولا۔ "کیا ہے؟" یہی رالبعن تھا۔ میں اُس کے ذہن سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔

"وہ لوگ لوٹ آئے ہیں۔" محافظ نے بتایا۔

رالبعن چونک اٹھا اور پھر محافظ کو حکم دیا کہ انھیں اندر آنے دے۔ وہ سب اندر آ گئے اور رالبعن کو گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کرنے لگے۔

"بکواس! بری بکواس!" رالبعن سخت لہجے میں بولا۔ "میں نہیں مان سکتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

وہ بھی رالبعن کو یقین دلانے لگے کہ انھوں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔ انھوں نے رالبعن سے یہ بھی کہا کہ اگر اُسے اُن کی بات پر یقین نہیں تو خود چل کر وین کا حشر دیکھ لے۔ "تم لوگ اپنی ناکامی کو ایک پُراسرار اور من گھڑت واقعے کی آڑ میں چھپانا چاہتے ہو۔" رالبعن کو اب بھی یقین نہیں آیا۔ "ٹھیک ہے، دفع ہو جاؤ۔ میں تمھاری بجائے اب دوسرے لوگوں کے سپرد یہ کام کروں گا۔"

وہ سب دروازے کی طرف مڑ گئے۔ رالبعن کے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی یہ واقعہ سن کر حیران نظر آ رہا تھا۔ میں اس دوران میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ اُسی شخص کے ایما پر رالبعن نے مجھے اغوا کرانا چاہا تھا۔ اُس شخص کے جسم پر بھی رالبعن کی طرح بہترین لباس تھا۔ وہ نیلے سوٹ میں ملبوس تھا۔

"میں شرمندہ ہوں۔" رالبعن نیلے سوٹ والے سے بولا۔ "بہرحال آج رات یہ کام یقیناً ہو جائے گا۔ مجھے تمھارا فون نمبر یاد ہے۔ کام ہوتے ہی تمھیں اطلاع دے دوں گا۔"

نیلے سوٹ والے کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے وقت ضائع کیے بغیر اُس کے ذہن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ایک مقامی امریکی ایجنٹ تھا۔ میرے اغوا کا حکم اُسے جفری ناٹ ہی کی طرف سے ملا تھا۔ جفری ناٹ نے آج ہی اُس سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے اُسے یہ حکم دیا تھا۔ جفری ناٹ نے اُس سے دس بجے صبح رابطہ قائم کیا تھا، لیکن اُس نے نہ تو یہ بتایا تھا کہ وہ قاہرہ ہی میں ہے اور نہ ہی اپنا پتا بتایا تھا۔ جفری ناٹ نے اُسے میرے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ مجھے اغوا کرتے ہی ہر گھنٹے کے بعد کم از کم اتنی طاقت کا انجکشن دیا جائے جو ایک عام آدمی کو چوبیس گھنٹے بے ہوش رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس حکم کا یہی مطلب تھا، مجھے فون کرنے کے بعد جفری ناٹ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں ابوالہول ہی ہوں۔ جفری ناٹ آج شب رات کو نو بجے ٹرانسمیٹر ہی پر دوبارہ رابطہ قائم کرنے والا تھا۔ جفری ناٹ نے اُس مقامی ایجنٹ کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو گا یا یہ کہ میرے بے ہوش جسم کو کب تک اُسی مقامی ایجنٹ کی حفاظت میں رہنا تھا۔

وہ امریکی ایجنٹ جفری ناٹ یقیناً انتہائی چالاک تھا۔ اُس نے میرے لیے اپنے پیچھے کوئی ایسا سراغ نہیں چھوڑا تھا کہ میں اُس تک پہنچ سکتا۔ میری تمام بھاگ دوڑ بے سود ہی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ میرے اغوا میں کس کا ہاتھ تھا لیکن اس تک پہنچنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اُس نے تو یہاں تک احتیاط برتی تھی کہ خود ہی مقامی ایجنٹ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تھا۔ جفری ناٹ کے سلسلے میں میری ہی طرح وہ مقامی ایجنٹ بھی مکمل تاریکی میں تھا۔ مقامی ایجنٹ چاہتا بھی تو جفری ناٹ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سامنے جفری ناٹ تک پہنچنے کی اب صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی۔ جفری ناٹ کو کم از کم آج شب ساڑھے گیارہ بجے میریڈین ہوٹل کے بار میں موجود رہنا تھا۔ لیزا شمعون کو اُس نے ملاقات کا یہی وقت دیا تھا۔

اب میرا وہاں مزید رکنا بے سود ہی تھا۔ میں اسی لیے اُس عمارت سے نکل آیا۔ اُسی وقت مجھے یہ خیال آیا کہ بہرحال میرے لیے یہ تو ضروری ہی ہو گیا ہے کہ احمد سلمان کے گھر سے غائب ہو جاؤں تو پھر کیوں نہ اسی موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اسی کے ساتھ مجھے لیلیٰ کا وہ خدشہ یاد آیا جس کا اظہار اُس نے آج ہی احمد سلمان سے کیا تھا۔ جفری ناٹ کا فون آنے کے بعد لیلیٰ نے میرے اغوا ہونے کے خطرے کا اظہار کیا تھا۔ پھر آج ہی خود احمد سلمان کے سامنے

کچھ لوگ مجھے اغوا کر لے گئے تھے۔ میرے خیال میں یہ صورتِ حال میرے غائب ہونے کے لیے بہترین جواز تھی۔ احمد سلمان ہمیشہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ اس کا بیٹا ہارون زندہ ہے اور اُسے کچھ اجنبی لوگ اغوا کر لے گئے ہیں۔ آدمی کی آس ٹوٹ جائے تو زندگی اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے، آس بندھی رہے تو اُسے جینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ احمد سلمان کو بھی یہ آس رہتی کہ ایک نہ ایک دن اس کا بیٹا پھر گھر لوٹ آئے گا۔

ہارون کا کردار ترک کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں کوئی اور کردار اپناتا لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا۔ مجھے رہنا تو قاہرہ ہی میں تھا مگر کس حیثیت سے، ابھی میں نے اس کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اپنے مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنے کی خاطر میں پیدل ہی اُس راستے کی طرف بڑھ گیا جو نیل کی جانب جاتا تھا۔ دور ہی سے نیل کی روشنیاں مجھے نظر آ رہی تھیں۔ وہاں سے تحریر اسکوائر تک کا فاصلہ میں نے پیدل ہی طے کیا اور اس دوران میں ایک نتیجے تک پہنچ ہی گیا۔ اس وقت شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ تحریر اسکوائر کے علاقے میں بہت رونق تھی۔ میں وہاں اپنے وجود کی تجسیم نہیں کر سکتا تھا۔ میں پُر رونق علاقے کو پیچھے چھوڑتا ہوا اسمبلی ہال کی طرف نکل گیا۔ دن کے وقت وہ علاقہ بھی خاصا پُر رونق اور پُر ہجوم رہتا تھا لیکن اب دفاتر بند ہو چکے تھے اس لیے وہاں نسبتاً سکون تھا۔ اسمبلی ہال کے قریب ہی مختلف وزارتوں کے دفاتر تھے اور میں انھی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

میں اُن دفاتر کے درمیان ایک پتلی سی سڑک پر مڑ گیا جو بالکل ویران نظر آ رہی تھی۔ یوں بھی اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ کچھ فاصلے ہی پر ایک طرف مجھے ایک درخت نظر آیا۔ میں اُس درخت تک پہنچ کر رکا اور پھر اُس کے عقب میں پہنچتے ہی اپنی تجسیم کر لی۔ میں اُس درخت کی آڑ سے نکل کر واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ "ہالٹ!" میرے قدم رک گئے۔ پھر مجھے اپنے عقب میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی جو لحظہ لحظہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ایک باوردی مسلح فوجی میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور ادھر آئے کیسے؟" اُس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ممنوعہ علاقہ تھا اور اس سڑک کے موڑ پر ہی ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر "ممنوعہ علاقہ" لکھا تھا۔ اُس بورڈ پر میری نظر نہیں پڑی تھی۔ سمجھ جواب نہ بن سکا۔ بچنے کے لیے مجبوراً اس فوجی کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینا پڑا اور پھر میرے منہ سے نکلا۔ "اباؤٹ ٹرن!" فوجی یہ حکم سنتے ہی مخصوص فوجی انداز میں مڑا۔ میں نے مزید کہا۔ "لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ!" وہ میرے حکم پر لیفٹ رائٹ کرتا ہوا واپس چلا گیا اور میں تیزی کے ساتھ اس ممنوعہ علاقے سے باہر آ گیا۔

میری جیب میں کافی رقم موجود تھی۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے اُسے نکلنے نہیں لگایا تھا۔ جب بھی میں لباس تبدیل کرتا تھا تو موقع دیکھ کر رقم بھی جیب میں رکھ لیتا تھا۔ آج بھی میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ سلمیٰ یا سطوت کی نظر اس رقم پر نہ پڑے اور وہ مجھ سے اُس کے بارے میں استفسار نہ کر سکیں۔

تحریر اسکوائر کے پُر رونق و پُر ہجوم بازار میں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے چمڑے کی ایک اٹیچی خریدی، پھر میک اپ کا ضروری سامان خریدا۔ اس کے بعد میں ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان میں گھس گیا۔ سیلز مین نے مجھ سے پوچھا۔ "جی؟ کیا آپ کے ناپ.....؟"

"نہیں۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے اپنے بڑے بھائی کے لیے کپڑے چاہییں۔ ان کا جسم بس مجھ جیسا ہی ہے، عمر میں مجھ سے کوئی چھ سال بڑے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ بائیس سال کی عمر کے ہوں گے۔"

"جی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر سیلز مین قمیصوں اور پینٹوں کے ڈبے کھول کھول کر مجھے دکھانے لگا اور بولا۔ "آپ پہلے کپڑا اور رنگ پسند کر لیں، سائز کی فکر نہ کریں۔"

میں نے دو جوڑے خریدے اور ایک کوٹ بھی لے لیا۔ رقم ادا کر کے میں باہر آ گیا تو مجھے جوتوں کا خیال آیا۔ جب میں نے ہارون کی شخصیت اپنائی تھی تو جوتوں کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا ہونا پڑا تھا۔ قریب ہی جوتوں کی ایک دکان سے میں نے دو جوڑے جوتے بھی خرید لیے اور انھیں بھی دوسرے سامان کے ساتھ اٹیچی میں رکھ لیا۔ اب میں اپنی شخصیت تبدیل کرنے کے سلسلے میں تمام ضروری تیاریاں کر چکا تھا۔ مجھے اب کسی ہوٹل کی تلاش تھی جہاں میں اپنے بقیہ منصوبے پر عمل کر سکتا۔ میں کچھ دور ہی چلا تھا کہ میری نگہ ایک ہوٹل کے بورڈ پر پڑی۔ اُس کے مقابل ہی ایک اور ہوٹل بھی

تھا۔ میں نے دونوں جانب نگاہ کی۔ میری دائیں جانب ایک بلند منزلہ ہوٹل تھا "قلوپطرہ ہوٹل"۔ بائیں جانب ہوٹل ہلٹن کا وجود نظر آ رہا تھا۔ وہ ہوٹل دس منزلہ تھا۔ ان دونوں ہوٹلوں میں خاصا فرق تھا، کرائے اور معیار دونوں میں! میں نے قلوپطرہ ہوٹل کا رخ کیا جس کا شمار قاہرہ کے اوسط درجے کے ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔

قلوپطرہ ہوٹل میں تیسری منزل پر مجھے ایک کمرا مل گیا۔ میں نے وہ کمرا صرف ایک شب ہی کے لیے کرائے پر لیا تھا کیوں کہ وہاں مجھے صرف کچھ وقت گزارنا تھا۔ اس ہوٹل کے ایک کمرے کا کرایہ تیس گنی یومیہ تھا۔ میں نے رقم پہلے ہی ادا کر دی تھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سب سے پہلے میں نے اٹیچی کھول کر میک اپ کا سامان نکالا اور پھر اپنے چہرے سے اردن کا میک اپ ختم کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی کو قتل کر رہا ہوں اور میری آنکھوں میں بار بار لیلیٰ کا چہرا گھوم رہا تھا۔ چہرے سے میک اپ ختم کر کے میں نے منہ دھویا اور پھر لباس اتار کر وہیں موجود مسہری کی ایک جانب پڑی ہوئی چادر لپیٹ کر مسہری پر دراز ہو گیا۔ اب میرا ذہن ایک پراسرار تجربے سے گزرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا میں اب اپنی عمر کی بائیسویں منزل تک پہنچنا چاہتا تھا اور یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ میرے دشمنوں کو میری موجودہ عمر کا علم ہو چکا تھا۔ میری موجودہ عمر سولہ سال تھی۔ عمر میں اس تبدیلی کا علم ظاہر ہے کہ اگر انھیں ہو بھی جاتا تو شاید اس میں وقت لگتا۔ وہ کسی سولہ سالہ نوعمر لڑکے کو تلاش کرتے پھرتے اور میں عمر کی اگلی منزل تک پہنچ چکا ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ میں نے اپنے دشمنوں سے چھپنے کے لیے اور بہت کچھ سوچا تھا۔ میں عمر کی پہلی منزل سے تیسویں منزل تک جہاں چاہوں اپنے کاروانِ عمر کو ٹھہرا سکتا ہوں۔ اپنی اس حیرت انگیز قوت سے میں پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

اب تک دو مرتبہ میں اس سنسنی خیز تجربے سے گزر چکا تھا۔ پہلی بار بغداد کے دورانِ قیام میں، جب میں اپنی اصل عمر کو پہنچ گیا تھا۔ میری عمر ایک ہی سال تو تھی: سو میں فوراً ایک سالہ بچہ بن گیا تھا مگر میرا ذہن پوری طرح بالغ تھا۔ وہ لذت، ایک سالہ بچہ بن جانے کی لذت میں اب تک نہیں بھولا تھا۔ دوسری بار یہی تجربہ میں نے قاہرہ میں چند دن پہلے کیا تھا۔ میری عمر تیس سال تھی اور میں اردن کا کردار اپنانے کے لیے سولہ سال کا بن گیا تھا۔ اب یہ عمر بھی مجھ سے بے وفائی کرنے والی تھی۔ مجھے اب اپنی عمر کی بائیسویں منزل پر رکنا تھا۔

غالباً میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ میرے وجود میں پوشیدہ ہر پُراسرار قوت میری خواہش اور خیال کی تابع ہے۔ خواہش کے ساتھ ہی میری مطلوبہ پُراسرار قوت متحرک ہو جاتی ہے۔ سو میں نے اس وقت بھی خواہش کی کہ میں سولہ سال کی بجائے بائیس سال کا ہو جاؤں۔ حسبِ معمول میرے جسم کی اطراف ہلکی ہلکی دھند سی پھیلنے لگی اور پھر میرا جسم اس دھند میں غائب ہونے لگا جسے دھوئیں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس دھوئیں نے پھیل کر میرے جسم کو گویا بالکل چھپا لیا۔ مجھے اپنا وجود بہت ہلکا پھلکا سا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد میرا جسم قطعی غائب ہو گیا اور دھوئیں کی لکیریں سی رہ گئیں جو ایک جسم کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں دھوئیں کا ایک جسم سا نظر آنے لگا اور پھر دھواں آہستہ آہستہ غائب ہونے لگا اور دھوئیں کے درمیان سے ایک جسم ابھرنے لگا جو نادیدہ نہیں تھا۔ یہ جسم اجنبی ہونے کے باوجود میرا اپنا جسم تھا۔ پھر دھواں غائب ہو گیا مسہری پر اب ایک بائیس سالہ نوجوان کا جسم نظر آ رہا تھا۔ وہ پُراسرار تجربہ ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنی عمر کی بائیسویں منزل میں پہنچ گیا تھا۔

میں چادر لپیٹے مسہری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مجھے اپنا چہرہ دیکھنے کی خواہش تھی۔ کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی۔ میں اس میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آئینے میں مجھے ایک اجنبی چہرہ نظر آ رہا تھا جو اجنبی ہونے کے باوجود اپنے نقوش کے تیکھے پن کی وجہ سے آشنا آشنا سا تھا۔ ہر چند کہ میرے تیس سالہ چہرے اور بائیس سالہ چہرے میں نمایاں فرق تھا لیکن پھر بھی بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ میری پتلیوں کا رنگ سبز ہی تھا، چہرہ کتابی ہی تھا، ناک ستواں تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور خواب آلود سی تھیں۔ میں کچھ دیر آئینے کے سامنے ہی کھڑا ہوا اپنا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے لباس زیب تن کیا۔ کپڑے میرے جسم پر ٹھیک ہی آئے تھے۔ ایک مرحلہ پورا ہو چکا تھا اور اب میں دوسرے مرحلے کے لیے اپنے چہرے پر ایک پختہ عمر کے مرد کا میک اپ کرنا چاہتا تھا۔

میک اپ کرنے میں مجھے تقریباً ایک گھنٹا لگا۔ میرا چہرہ بھی کہ اب کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری عمر چالیس سال سے کم ہے۔ کنپٹیوں کے کچھ بالوں کو بھی میں نے سفید کر دیا تھا۔ اپنے دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے یہ میرا دوسرا حربہ تھا۔ جلد یا بدیر بالفرض انہیں یہ معلوم بھی ہو جاتا کہ میری موجودہ عمر کیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہ

پڑتا۔ وہ کسی بائیس سالہ نوجوان کو تلاش کرتے پھرتے اور میرے چہرے پر ایک چالیس سالہ شخص کا میک اپ ہوتا۔ اب تک میں نے اپنی عمر کے مطابق ہی چہرے پر میک اپ کیا تھا۔ یہ پہلا اتفاق یا موقع تھا کہ میں نے اپنے چہرے اور جسم کی عمر میں تضاد پیدا کر دیا تھا اور یہ تضاد یقیناً میرے لیے سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی میں نے اپنا تمام سامان سمیٹ کر اٹیچی میں رکھا اور وہاں سے روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ میں اس دوران یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کس ہوٹل میں مستقل قیام کرنا ہے۔

قصر العینی کا علاقہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میریڈین ہوٹل وہیں تھا اور اسی ہوٹل میں آج شب ساڑھے گیارہ بجے [illegible] کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اسی ہوٹل میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ اردن کے کپڑے اور جوتے میں نے وہیں چھوڑ دیے تھے۔ اب میں اس کردار سے اپنی کوئی وابستگی قائم رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں اطمینان سے باہر راہداری میں نکل آیا۔ اگر مجھے کوئی اس کمرے سے نکلتے بھی دیکھ لیتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ وہ کمرا کس نے کرائے پر لیا تھا۔ اگر ہوٹل کے کسی بیرے کی نظر بھی مجھ پر پڑ جاتی جس نے مجھے اردن کی حیثیت سے اس کمرے میں جاتے بھی دیکھا ہوتا تو وہ یہی سمجھتا کہ میں اردن کا کوئی مہمان ہوں گا۔ اس وقت راہداری میں اکا دکا مسافر آ جا رہے تھے مگر کوئی بیرا نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

قلوپطرہ ہوٹل سے نکل کر میں نے میریڈین ہوٹل تک پہنچنے کے لیے ایک ٹیکسی کر لی کیوں کہ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ قصر العینی کے علاقے میں یہ ہوٹل کہاں تھا۔ میریڈین ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام میں نے ضرغام لکھوایا اور خود کو اسوان کا باشندہ ظاہر کیا۔ اسوان مصر کا چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔ یہ سوڈان کی سرحد پر واقع ہے۔ خشکی کے راستے مصر سے سوڈان جانے والے اسی شہر سے ہو کر جاتے ہیں۔ یہ شہر اسوان بند کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ میریڈین ہوٹل کے کمرے کا کرایہ پچاس گنی یومیہ تھا کیوں کہ یہ بڑا ہوٹل تھا۔ مجھے اس کی پہلی منزل پر ایک کمرا مل گیا۔ جس وقت کاؤنٹر کلرک کو اپنا خود اختیاری نام بتا رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ یقیناً میرا ابھی کوئی نام ہو گا جس سے مجھے آگہی نہیں۔ میرا ابھی کوئی وطن ہو گا جہاں میں پیدا ہوا ہوں گا مگر میں اس سے لاعلم تھا۔ کیسی بے بسی تھی کہ میں دوسروں کی شخصیت اور دوسروں کے نام اپنانے پر مجبور تھا۔ میرے اندر محرومیاں جاگنے لگیں۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد بھی محرومیوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور اسی دوران میں جانے کیوں اور کیسے مجھے سالمہ یاد آ گئی۔ اس غارت گرِ ہوش کا تصور مجھے بہت دیر تڑپاتا رہا۔ جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ بغداد میں ہو گی یا پیرس!

رات کا کھانا میں نے تنہائی کے عذاب سے بچنے کی خاطر نیچے ہوٹل کے ڈائننگ روم میں جا کر کھایا۔ اس وقت سوا نو بج رہے تھے۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجنے میں کافی دیر تھی۔ مگر وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اسی ہوٹل کے بار میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تیری ناٹ کو آنا تھا۔ میں اس وقت خود کو بہت تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا جیسے بھری دنیا میں اکیلا ہوں۔ بغداد کو خیرباد کہنے کے بعد اب تک میں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اس کا بڑا سبب وہ حالات و واقعات تھے جن سے میں گزر رہا تھا۔ جیسے بھری دنیا میں اکیلا ہوں۔ مجھے اس وقت شراب کی طلب محسوس ہونے لگی۔ اب میں شراب پی سکتا تھا۔ میرا کردار ایسا کرنے میں مانع نہیں تھا۔ میں نے کھانے کا بل ادا کیا اور ہوٹل کے بار کا رخ کیا۔

ہوٹل کا وہ بار خوب صورت، پُرسکون اور چھوٹا سا تھا۔ بار کی فضا میں تیرنے والی مدھم موسیقی سماعت کو بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہاں زیادہ تر میزیں خالی ہی تھیں۔ ڈم لائٹ میں وہ ماحول اس وقت میری اندرونی کیفیات سے ہم آہنگ ہی تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے موجود اونچے اسٹولوں میں سے ایک اسٹول پر ایک بوڑھا شخص اپنے سامنے شراب کا گلاس رکھے اسے گھور رہا تھا۔ اسے شاید نشہ ہو گیا تھا۔ میں ایک میز پر جا بیٹھا اور پھر ویٹر آ گیا تو اسے اسکاچ کی ایک بوتل کا آرڈر دے دیا۔ ابھی میں نے اطراف کا جائزہ لینے کے لیے ادھر ادھر نگاہیں گھمائی تھیں کہ بار کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان جوڑا اندر داخل ہوا۔ نوجوان نے اپنی ساتھی کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ وہ دونوں میرے قریب ہی ایک میز پر آ بیٹھے۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ وہ نوجوان مقامی ہی تھا مگر لڑکی غیر ملکی تھی۔

"بس کرو تم نے پہلے ہی بہت پی رکھی ہے۔ چلو اب گھر چلتے ہیں۔" نوجوان اپنی ساتھی لڑکی کو سمجھا رہا تھا۔

"نائیں!" لڑکی جو واقعی زیادہ نشے میں معلوم ہوتی تھی، انگلی نچا کر بولی: "ابھی اور..... بس اور!"

مجبوراً نوجوان کو اس کے لیے شراب منگوانا ہی پڑی۔ اسی

وقت کے سب سے بڑے جلاد کی سرگزشت
ہزاروں قارئین کے پسندیدہ قلم کار اور سینکڑوں خوبصورت تحریروں کے خالق ایم اے اقبال کا ایک اور تحفہ
ایک انمول شاہکار
جلاد
مرد آید کہ ہراساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
وقت اور حالات کے شعلے اپنی زد میں لیے ہمیشہ وقت شکار کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے والا ہر شخص ان شعلوں کی لپیٹ میں آتا ہے۔ بعض لوگ ان شعلوں میں جل کر کندن ہو جاتے ہیں اور کچھ ان کی تپش سے جھلس جاتے ہیں۔
ماضی، حال اور مستقبل کی ایسی داستانِ مسلسل جس میں بہت سے شناسا چہرے نظر آئیں گے!
آج ہی ایک خط لکھ کر طلب فرمائیں
گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
۲۱- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7246509-7228762

دوران میں بیرا میری میز پر شراب کی بوتل اور گلاس رکھ گیا اور میں نے اس نوجوان جوڑے کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ میں نے ابھی پہلا پیگ ہی ختم کیا تھا کہ ایک دم میرے ذہن میں عجیب سی سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں نے اپنا سر جھٹکا مگر وہ سنسناہٹ ختم نہیں ہوئی بلکہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی رہی۔ مجھے اپنے سر میں تکلیف اور درد سا محسوس ہونے لگا۔ اس سے پہلے کبھی میں ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ پھر سنسناہٹ میں اضافے کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے تیز ہوا سی چلنے لگی ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ چند لمحے بعد ہی ایک تیز گونج سی سنائی دینے لگی اور درد بڑھنے لگا۔

ابھی میں نہیں سمجھ پایا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے کہ وہ سنسناہٹ اور گونج ختم ہو گئی اور ہلکی ہلکی ٹک ٹک کی سی آواز آنے لگی۔ یہ آواز بھی چند لمحے بعد ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے صفحۂ ذہن پر کچھ روشن حروف ابھر رہے ہیں اور میں انہیں پڑھ سکتا ہوں۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں نے ان حروف سے بننے والا پہلا لفظ پڑھا۔ روشن حروف میں ابوالہول لکھا ہوا تھا۔ یہ میرے لیے بڑا عجیب سا تجربہ تھا عجیب، انوکھا اور پہلا تجربہ! کچھ ہی دیر میں ایک روشن عبارت دکھائی دینے لگی اور میں اسے پڑھنے لگا۔ اس عبارت کا جتنا حصہ میرے ذہن میں روشن ہوتا جا رہا تھا، میں اسے پڑھتا جا رہا تھا، بالکل یوں جیسے کوئی لکھ رہا ہو اور ساتھ ساتھ کوئی اسے پڑھتا جا رہا ہو۔ میں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنے ذہن میں ابھرنے والی وہ روشن عبارت پڑھ رہا تھا جو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ وہ عبارت جس زبان میں تھی اس زبان کو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے سمجھنے پڑھنے اور بولنے والے اس عہد میں خال خال ہی ہیں۔ دنیا کے انتہائی قدیم کتبات پر بھی یہی زبان درج پائی گئی ہے۔ اس زبان کا نام حمیری تھا اور یہ عربی زبان کی قدیم شاخوں میں سے ایک تھی۔ میں اس زبان کو نہ صرف لکھنے اور پڑھنے پر قادر تھا بلکہ اسے روانی کے ساتھ بول بھی سکتا تھا۔ اس زبان کو مجھ سے گفتگو کا انداز دنیا میں صرف ایک ہی شخص نے بتایا تھا۔ میں اسی لیے اس زبان میں وہ عبارت روشن دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ عبارت مندرجہ ذیل تھی۔

ابوالہول! میرے بچے! میری تخلیق!

آخر کب تک یوں ہی بھاگتا رہے گا! اپنی تقدیر کو قبول کیوں نہیں کر لیتا! دیکھ یہ میرے لیے بالکل آسان ہے کہ میں تیری تمام پراسرار قوتوں کو سلب کر لوں، مگر پھر اسے میرے بچے تو جی نہ سکے گا

اور تجھ پر جو اربوں ڈالر خرچ ہوئے ہیں، وہ ضائع ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے میرے لیے کہ میں تیری قوتوں کو سلب کرنے کی بجائے ان میں سے چند کو ضائع کر دوں۔ اس صورت میں تو زندہ تو رہے گا لیکن دوبارہ تیرے وجود میں ان قوتوں کو بیدار نہ کیا جا سکے گا۔ سن کبھی تنگ آجاتے ہیں لوگ تو ان میں انتقام ہی باقی رہ جاتا ہے! سو تو اس دن سے بچ! وہ جو ساری دنیا میں تیرے پیچھے پیچھے بھٹکتے پھر رہے ہیں اور تیرے حصول کی خاطر اب تک تیرے ہاتھوں اپنے بہت سے قیمتی افراد کو ہلاک کرا چکے ہیں، انہیں بھی تجھ پر غصہ آ سکتا ہے۔ تجھے خبر ہو ہی چکی ہے کہ تیری ماں امریکیوں کے قبضے میں ہے اور تیرا سات سالہ بھائی روسیوں کی قید میں ہے۔ تجھے شاید یہ علم نہ ہو گا کہ تیرا باپ کہاں ہے! تو مجھ سے سن میں بتاتا ہوں تجھے کہ اسے چینیوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ میں ڈرتا ہوں اس دن سے جب ان میں سے کسی کو قتل کر دیا جائے۔ تیرے وجود میں پوشیدہ پُراسرار قوتوں کا نظام ایک خاص قسم کے میکنزم کے تابع ہے اس لیے تیرا یہ فرار بھی خطرناک ہے۔ اس طرح بھی تیری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ تو شاید یہ جانتا ہو کہ ایک خالق کو اپنی تخلیق سے کتنی محبت ہوتی ہو گی، محبت مجھے تجھ سے ہے۔

تو ہی میری زندگی بھر کی کمائی ہے جسے میں ضائع کرنا نہیں چاہتا اور اب میں اپنی عمر کی اس منزل میں ہوں کہ کوئی اور تخلیق نہیں کر سکتا۔ تو ہی میری پہلی اور آخری تخلیق ہے، تو ہی میرا اکلوتا ہے! تو بغاوت چھوڑ دے اور مان جا! اگر تو اب بھی نہ مانا تو میں ایک ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گا جس پر شاید مجھے زندگی بھر ملال رہے۔ اسے تو میری طرف سے انتباہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ بس مجھے تجھ سے اور کچھ نہیں کہنا۔

تیرا پروفیسر
تیرا خالق

ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ عبارت روشن بجھ گئی اور چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں تاریکی پھیل گئی۔ فرار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ پروفیسر نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا وہ بھی بڑے ہی پُراسرار انداز میں! میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا ہے اور میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ پروفیسر نے مجھے جو دھمکی دی تھی، وہ ایجنٹوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں سے مختلف تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ چاہے تو مجھ سے میری کسی بھی حیرت انگیز و پُراسرار قوت کو چھین سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ وہ میرے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھا

ایک منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
ایک دور کا عکاس — ایک معاشرے کا ترجمان ناول
حضرت جان
ایک جلد میں مکمل
تحریر
قاضی عبدالستار
قاضی عبدالستار کا نام ہی قلم کی آبرو کا ضامن ہے۔
لفظوں کے سیپ میں روشن دیپ، تحریر کے غازی نام کے قاضی نے حضرت جان میں روشن کیے ہیں جو زبان و بیان کے رسیا صاحب ذوق لوگوں کے لیے ہے۔
(زیر طبع)
قیمت فی حصہ ۱۵ روپے علاوہ محصول ڈاک
ہزاروں قارئین کی دل پسند تحریر
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
گل قریش لائبریری ۲۱- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7229762-7245599

پر بھی مجبور ہو سکتا تھا جس پر سے زندگی بھر ملال رہتا۔ اس بات کا مطلب سمجھنا بھی میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس کا سیدھا اور واضح مطلب گویا میری موت ہی تھا یا پھر کوئی ایسا مرحلہ جس سے میری پراسرار قوتوں میں سے کسی ایک یا زائد قوتوں کو نقصان پہنچ جائے یا بغیر کسی [illegible] کیونکہ دوبارہ وہ میرے وجود میں اس قوت کو بیدار نہیں کر سکتا تھا۔

جب سے میں فرار ہوا تھا مجھے سکون نہیں ملا تھا۔ قدم قدم پر مجھے خطرات سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن اس کے باوجود ملال میسر نہیں ڈالی تھی۔ میرے ہاتھوں دنیا کے متعدد خطرناک ایجنٹ ہلاک ہو چکے تھے جن کی موت پر خود مجھے بھی انتہائی دکھ تھا، مگر اب سے پہلے پروفیسر کی جانب سے مجھے وارننگ نہیں دی گئی تھی۔ اس نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ کہیں غصے میں اگر کوئی ٹھگ میرے والدین میں سے کسی ایک کو یا میرے بھائی کو قتل نہ کر دے۔ یہ بھی میرے لیے اطلاع ہی تھی کہ میرے والد کو چینیوں نے یرغمال بنا رکھا ہے کیونکہ اب تک کسی چینی ایجنٹ نے مجھ سے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا۔ گویا دنیا کی تینوں بڑی طاقتوں کے قبضے میں میری ایک ایک کمزوری تھی۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ قریبی میز پر بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی ایک دم اپنی کرسی سے اٹھی اور بار میں تیرنے والی ہلکی ہلکی موسیقی پر ہیجان انگیز انداز میں کولہے مٹکانے لگی۔ وہ اسی کے ساتھ گا بھی رہی تھی۔ ایک انگریزی گیت!

"جب تیز آگ برسے تو تم میری روح پر بارش بن کر برسنا اور میرے سارے وجود کو اپنی خوشبو سے بھر دینا۔" وہ یہی گیت گنگناتی ہوئی پھر اس میز پر گئی جہاں کوئی بیٹھا تھا، پھر وہ میری طرف بھی پلٹی اور میری میز کے آگے جھک کر گنگنائی اور میں چونک اٹھا: "اے تازہ کھلے گلابوں کی خوشبو، آ اور میرے اندر اتر جا! چل میرے ساتھ چل کہ نیلے آسمانوں پر ستاروں کی چمک ہمیں اپنی آغوش میں لینا چاہتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ جانے اس لمحے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لیے رقص کرتی رہی اور گاتی رہی۔ اس کا نوجوان ساتھی حیرت سے منہ پھاڑے اسے اور مجھے دیکھ رہا تھا اور وہ اب بھی گنگنا رہی تھی اور اس کی آواز میں ایک عجیب سا سحر تھا: "تازہ کھلے گلابوں کی خوشبو میری آغوش میں ہے اور میں نیلے آسمانوں کی طرف پرواز کر رہی ہوں۔"

وہ گنگناتی اور رقص کرتی ہوئی بار کے دروازے تک پہنچ گئی۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی حسین خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرا ذہن اس وقت بالکل خالی خالی سا تھا۔ پھر وہ مجھے لیے ہوئے بار کے دروازے سے نکل گئی۔ اسی وقت میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا سا لگا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس کی باہوں میں جھول گیا۔ یہ صرف چند لمحے تھے جنہوں نے مجھے میرے وجود سے بے خبر کر دیا تھا۔ انہی لمحوں کے دوران میں مجھے معاً اپنے دائیں بازو میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ میرے ذہن میں بے شمار خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میں نے اپنے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے خود کو ایک ہی جھٹکے میں اس کی باہوں کے گھیرے سے آزاد کر لیا۔ میرے ذہن پر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کا تجزیہ کر سکتا اور اس لڑکی کا ذہن پڑھ کر اس کے متعلق کچھ جان سکتا۔ میرے بچاؤ کا اب صرف ایک ہی راستہ تھا، فرار کا راستہ! اس سے پہلے کہ میرا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب جاتا، مجھے فرار ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ حملہ مجھ پر اچانک کیا گیا تھا اور مجھے کچھ سوچنے سمجھنے یا فیصلہ کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اگر میں اسی حالت میں اپنے ہوش گنوا بیٹھتا تو یقیناً میرے دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے ریسپشن کی طرف بڑھا جہاں مجھے ایک خالی صوفہ نظر آ رہا تھا۔ اگر میرے بازو میں چبھن محسوس ہوتی تو شاید مجھے خطرے کا احساس نہ ہونے پاتا یا میرے ذہن کو جھٹکا نہ لگتا تو میں اسی خواب کے سے عالم میں اس لڑکی کے ساتھ چلتا رہتا، پھر وہ جہاں چاہتی مجھے لے جاتی۔

بہ مشکل میں صوفے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا لیکن مجھے اس پر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ میں صوفے کی دائیں جانب ایک طرف لڑھک گیا اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ تاریکیاں چھٹیں تو کچھ دیر مجھے کچھ یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں بار میں بیٹھا تھا کہ ایک حسین نوجوان لڑکی مجھے وہاں سے نکال لائی تھی اور پھر میں نے ایک ذہنی جھٹکا محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد میرے بازو میں چبھن ہوئی تھی۔ شاید میرے بازو میں کوئی زہریلی چیز چبھائی

گئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا تھا۔ چند لمحے اسی جگہ اور پڑا رہا اور پھر ایک دم مجھے وہ اہم بات یاد آ گئی جسے میں یاد کرنے کی کوشش میں اپنا ماتھا ہاتھ سے رگڑ رہا تھا۔ تھری ناٹ! میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ مجھے اس بار میں تھری ناٹ سے ملنا تھا۔ میں اسی کے ساتھ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میری نگاہ ریسپشن کاؤنٹر کی طرف اٹھی۔ وال کلاک میں ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور دو منٹ اوپر ہو گئے تھے۔ میرا وجود اب تک نادیدہ ہی تھا۔ میں لپکتا ہوا سامنے موجود بار کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی تصور کر رہا تھا کہ مجھے بروقت ہوش آ گیا تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ میرے لیے تھری ناٹ سے ملنا تھا۔ اس کے بعد ہی میں گزرے ہوئے واقعات پر غور کر کے آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل بنانا چاہتا تھا۔

بار میں داخل ہوتے ہی میں نے تھری ناٹ کی تلاش شروع کر دی۔ اس کا حلیہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ہر چند کہ مجھے وہاں پہنچنے میں تقریباً تین منٹ کی تاخیر ہو چکی تھی لیکن تھری ناٹ اتنی جلدی وہاں سے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ یہ وقت تو اسے لیزا کو بار میں تلاش کرنے پر صرف ہو جاتا۔ پھر بھی میں کسی قدر مایوسی کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے بار کے اندر اس حلیے کا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ ڈم لائٹ میرے لیے قباحت نہیں بن سکی تھی۔ میری قوت بصارت نے بار کو میرے لیے بالکل روشن کر دیا تھا۔ ہر چند کہ تھری ناٹ نے اپنے خط میں یہی لکھا تھا کہ وہ میک اپ میں نہیں ہو گا لیکن اس کا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔ وہ لیزا کو سرخ کوٹ اور سرخ گلاب سے پہچان سکتا تھا، پھر وہ میک اپ بھی کر لیتا تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ اگر لیزا اسے نہ پہچان سکتی تو وہ لیزا کو پہچان لیتا۔ یہ سوچ کر میں نے بار میں موجود افراد کے ذہنوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس وقت بھی بار میں زیادہ افراد موجود نہیں تھے۔ عورتیں صرف دو ہی تھیں۔ ایک عورت کسی مرد کے ساتھ تھی اور دوسری تنہا ایک میز پر بیٹھی تھی۔ میرے ذہن کی طاقت ور لہریں وہاں موجود افراد کے ذہنوں کو ٹٹولتی رہیں کہ ان میں سے تھری ناٹ کون ہے۔ یہ بار میرا ذہن "تھری ناٹ، تھری ناٹ" کی گردان کر رہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن کو سگنل موصول ہوا۔ وہاں کوئی نہ کوئی ذہن ایسا ضرور تھا جو اس وقت تھری ناٹ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ سگنل ملنے کا سبب میرے علم میں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کہیں قریب ہی کوئی ایسا ذہن موجود ہے جس کا ابھی میں نے مطالعہ نہیں

کیا اور اس ذہن کا تعلق میرے ذہن کے سوال سے ہے۔ میری اس کیفیت کو ایک مثال سے سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ ہمارے اطراف ہر وقت مختلف آوازیں بکھری رہتی ہیں مگر ہماری توجہ جس آواز پر ہوتی ہے ہم اسی کو سنتے ہیں اور دوسری آوازیں اپنا وجود رکھنے کے باوجود بھی بے وجود سی رہتی ہیں۔ کچھ یہی عمل ٹیلی پیتھی کا بھی ہے۔ ایک ٹیلی پیتھ جب کسی ذہن کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے تو اطراف میں موجود دوسرے ذہنوں سے بھی اس کے ذہن کی طاقت ور لہریں ٹکراتی رہتی ہیں لیکن اس کی توجہ ایک ہی ذہن پر ہوتی ہے۔ وہ سب ذہنوں میں پیدا ہونے والے خیالات کو گویا جان لینے کی طاقت ہونے کے باوجود وہ نہیں جانتا اور نظر انداز کر دیتا ہے۔ میرا ذہن کیونکہ ایک عام ٹیلی پیتھ سے مختلف اور ہمہ گیر قوتوں کا مالک تھا اس لیے اس میں ایک اضافی خصوصیت اور بھی تھی۔ وہ اضافی خصوصیت یہ تھی کہ اطراف میں موجود کسی ذہن میں اگر مطلوبہ سوال سے متعلق کوئی بھی بات ہوتی تھی تو وہ مجھے سگنل دے دیتا تھا۔ یہ سگنل یا اشارہ ایک خفیف سے مخصوص ذہنی جھٹکے کی صورت میں ہوتا تھا۔

وہاں موجود تمام مردوں کے ذہن کا میں مطالعہ کر چکا تھا لیکن ان میں سے کوئی تھری ناٹ نہیں تھا اور نہ ہی تھری ناٹ کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک اس وقت تھری ناٹ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس نتیجے تک پہنچتے ہی میں نے فوراً ان میں سے ایک کے ذہن کو ٹٹولا، یہ وہی تھی جو تنہا ایک میز پر بیٹھی تھی۔ میری پہلی ہی کوشش کامیاب رہی۔ میری مطلوبہ عورت وہی تھی۔ وہ بھی تھری ناٹ کے بارے میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ تھری ناٹ خود اس سے کیوں نہیں ملا اور وہ لیزا کون ہے جسے تھری ناٹ کا خط بھیجا ہے؟ اس عورت کے لیے اس کے ذہن میں رقابت تھی۔

میں اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کیے آگے بڑھا اور پھر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کو میں نے بہت آہستگی اور احتیاط سے ذرا سا سرکایا تھا تاکہ وہ عورت کرسی کو حرکت کرتے دیکھ کر چونک نہ جائے یا خوف زدہ ہو کر وہاں سے اٹھ نہ جائے۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن حسن جیسے اس پر ٹوٹ کر برسا تھا۔ اس پر اس کا متناسب جسم مزید قیامت تھا۔ اس کے ہونٹ لپ اسٹک سے محروم ہونے کے باوجود سرخ تھے اور گہری نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ مجموعی طور پر وہ بے پناہ حسن اور کشش

کی مالک تھی۔ یہ میں نے پہلی ہی نظر میں سمجھ لیا تھا کہ وہ مقامی نہیں امریکی ہے۔

اسے کے ظاہر کو نظر انداز کر کے میں نے فوراً ہی باطن کا مطالعہ شروع کر دیا، یہ جاننے کے لیے کہ تھری ناٹ سے اس کا کیا تعلق تھا اور وہ لیزا کے لیے رقابت کیوں محسوس کر رہی تھی؟ جلد ہی مجھے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں کے جواب مل گئے۔ میرے ذہن نے اسے حکم دیا تھا وہ لفافہ میز پر رکھ دو جو تھری ناٹ کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ اس کے بعد یہاں سے چلی جاؤ۔

اس نے فوراً ہی معمول کے انداز میں اپنی جگہ سے حرکت کی اور میز پر ایک جانب رکھا ہوا اپنا ذیشان بیگ کھول لیا، ذیشان بیگ سے اس نے ایک لفافہ نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے ویٹر کو بلایا اور بل ادا کر کے کھڑی ہو گئی حالانکہ ابھی اس کے پیگ میں کافی شراب باقی تھی۔

تم نے سُرخ کوٹ پہنے ہوئے اور اپنے بالوں میں سُرخ گلاب لگانے والی عورت کو تھری ناٹ کی طرف سے ملنے والا لفافہ پہنچا دیا ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا! میرے ذہن نے سوال کیا۔

”ہاں میں نے ایسا ہی کیا ہے۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑائی اور پھر بار کے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے میز پر رکھا ہوا لفافہ فوراً ہی اٹھا لیا کیونکہ ویٹر میز کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔ وہ میز پر سے گلاس سوڈے کی خالی بوتل اور وہ پلیٹ اٹھانے آیا تھا جس میں شیش کباب رکھا تھا اور عورت نے ابھی اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ غالباً اسے بار میں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ابھی اس نے شراب منگوا کر چند ہی گھونٹ لیے تھے کہ میں اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ لفافے کو اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لفافے پر کسی کا نام نہیں لکھا تھا اور وہ بند تھا۔ مجھے اس لفافے میں موجود خط پڑھنے کی عجلت تھی کیونکہ اسی کو پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ تھری ناٹ نے خود آنے کی بجائے لیزا کو وہ خط کس لیے لکھا تھا؟ اس لفافے میں موجود خط پڑھنے کی مجھے اتنی جلدی تھی کہ میں نے کچھ بھی نہیں سوچا اور گھنٹے قبل ہی مجھے جو واقعہ پیش آ چکا تھا اس کے بعد اپنے کمرے کا انتخاب میرے لیے مناسب نہیں تھا۔ مگر اس وقت میرے ذہن پر صرف تھری ناٹ سوار تھا۔

پہلی منزل پر اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے جیب سے وہ لفافہ نکال لیا۔ میں کمرے میں موجود صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر اسے پھاڑ کر تیزی سے اس میں تہ کیا ہوا خط باہر نکال لیا۔ ابھی وہ خط پڑھنے کے لیے کھولا ہی تھا کہ کسی نے اسے میرے ہاتھ سے اچک لیا جس نے بھی یہ حرکت کی تھی یقیناً وہ صوفے کے پیچھے کھڑا تھا اور اسے شاید اپنی زندگی عزیز نہیں تھی ورنہ اس سے یہ حرکت سرزد نہ ہوتی۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ اسے اپنی زندگی عزیز ہی تھی اسی لیے مجھے صوفے کے پیچھے کوئی نظر نہیں آ سکا تھا۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا اور اسی وقت میں نے کسی کو تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بھاگتے دیکھا میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے بار میں ملی تھی اور جس نے اچانک ہی مجھے بے بس کر دینا چاہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی، اسے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہی اس کے ہاتھوں میں وہ خط تھا جو اس نے مجھ سے چھینا تھا اس نے وہ گرتے ہی وہ خط ایک طرف اچھال دیا۔ اس لمحے بھر کو میری توجہ اس خط کی طرف مبذول ہوئی اور اسی سے وہ فائدہ اٹھا گئی۔ یقیناً اس نے حیرت انگیز تیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میرے ہاتھ کی گرفت سے اپنی ٹانگ کو چھڑا کر وہ اسپرنگ کی طرح اچھلی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھول کر اس کے تعاقب میں جا سکتا، اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اس کے پاس یقیناً کمرے کے قفل کی چابی موجود تھی۔ میں نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی تھی وہ قفل ایسا تھا کہ اندر سے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ میرے لیے اس دروازے کو توڑ کر باہر نکلنا دشوار نہیں تھا لیکن جب تک میں دروازہ توڑ کر باہر نکلتا وہ غائب ہو جاتی۔ وہ کتنی پھرتیلی تھی، اس کا مجھے اندازہ ہو چکا تھا۔ بظاہر وہ لڑکی برطانوی معلوم ہوتی تھی لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کے چہرے پر میک اپ نہ ہو۔ یوں بھی اب تک کسی برطانوی ایجنٹ سے میرا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ امریکہ، روس اور چین کے سوا کسی دوسرے ملک نے اب تک میرے وجود میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ چہرے پر میک اپ ہونے کی صورت میں وہ لڑکی امریکی بھی ہو سکتی تھی، روسی اور چینی بھی! لیکن اس کے امریکی ہونے پر مجھے یقین نہیں تھا۔ جب وہاں خود تھری ناٹ موجود تھا تو پھر کسی اور ایجنٹ

وہاں پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس پر بھی غور کیا کہ ممکن ہے وہ تھری ناٹ ہی کے ساتھ امریکہ سے آئی ہو لیکن یہ بات بھی میرے دل کو نہیں لگی۔ وہ تو خود ہی اتنی تند مزاج اور حیرت انگیز قوتوں کی مالک معلوم ہوتی تھی کہ تنہا اسے بھی مجھ سے نمٹنے کے لیے بھیجا جا سکتا تھا۔ اب تک کسی ایجنٹ کی یہ جرأت و ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میرے اتنا قریب آنے کا تصور بھی کر سکتا۔ میخائیل الیساچا اللک اور خطرناک روسی ایجنٹ بھی یہ ہمت نہیں کر سکا تھا۔ اسے امریکی ایجنٹ تسلیم نہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ابھی تھری ناٹ کو وہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوا تھا۔ اس نے میرا سراغ لگا بھی لیا تھا مگر میں اپنی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ

میں کہاں اور کس میک اپ میں ہوں جب دی یہ بات نہیں جان سکتا تھا تو پھر اس کے کسی ساتھی کو یہ علم کس طرح ہو سکتا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں وہ لڑکی یا عورت چینی یا پھر روسی ایجنٹ ہی ہو سکتی تھی۔ اس میں تو کوئی شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کسی ملک کی ایجنٹ نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے بے بس کرنے کی کوشش کیوں کرتی، اور پھر میرے کمرے میں کیوں

آتی! اس میں بھی کوئی کلام نہیں تھا کہ وہ یقیناً کچھ ایسی حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے جنہوں نے کچھ دیر ہی کو سہی مجھے دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا تھا۔ کمرے میں مجھے شدید محسوس کرنے کے باوجود بالکل خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ خوفزدہ ہوتی تو مجھے چھیڑنے کا تصور بھی نہ کرتی۔ یہ بہرحال بڑی ہمت کی بات تھی کہ اس نے میرے ہاتھ سے تھری ناٹ کا خط چھین لیا تھا۔ میرے جسم سے آنے والی بو سے اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے چھیننے کا مطلب بھی یہی تھا کہ وہ تھری ناٹ کی ساتھی نہیں ہے اور امریکہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا ورنہ وہ اس خط سے واقف ہوتی اور اسے مجھ سے نہ چھینتی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے وجود میں پوشیدہ تمام پراسرار قوتوں کا اسے علم ہے۔ میں واقف تھا کہ جو ایجنٹ بھی میرے پیچھے لگتا تھا اسے میرے بارے میں تمام باتوں کا علم ہوتا تھا یہی سبب تھا کہ وہ

اس ناول کے بعد پہلی بار کتابی شکل میں
غیرت کے سوداگر
(تحسین)
ایم اے واجد
خاک وطن کا سودا کرنے والے
چھوں کی نقاب کشا داستان
ایک جلد میں مکمل
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
غیرت کے سوداگر
وطن عزیز کے حصول کے لئے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہو لہو ہوئے۔ تب ناموس وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن ناموس وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔
(زیر طبع)
کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر
قیمت فی حصہ ۲۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔

مجھ سے دور دور رہتے تھے۔ یہ لڑکی پہلی تھی جو غالباً نادانستگی میں یا دانستہ سامنے آکر مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی۔

میں کچھ دیر اپنی جگہ کھڑا ہوا اسی فتنہ سامان کے بارے میں سوچتا رہا، پھر طویل سانس لے کر صوفے کی جانب بڑھنے سے پہلے فرش پر ایک جانب پڑا ہوا تھیری ناٹ کا خط اٹھا لیا جو اس نے لیزا کو لکھا تھا۔

صوفے پر بیٹھنے کے بعد میں اس خط کو پڑھنے لگا جو انگریزی میں ٹائپ کیا گیا تھا۔ خط طویل نہیں مختصر تھا اور اس میں صرف اتنا لکھا تھا: "مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت تم سے ملنے نہیں آسکا۔ میں جانتا ہوں کہ گزشتہ شب میرا خط ملنے کے بعد سے اب تک تم مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب رہی ہوگی اور تمہارے ذہن میں ماضی کے گزرے ہوئے لمحات تازہ ہوں گے۔ مجھے تمہارے جذبات کا بخوبی اندازہ ہے۔ ہم آج ہی شب مل کر پچھلی رفاقتوں کی یاد تازہ کریں گے۔ میں آج رات، کسی بھی وقت خود ہوٹل میں آکر تم سے ملوں گا۔ میرا انتظار کرنا۔ انتظار کرو گی نا! تمہارا، تھیری ناٹ۔"

خط پڑھ کر مجھے اس عورت کا خیال آیا جس سے میں نے تھیری ناٹ کا خط حاصل کیا تھا۔ وہ عورت بھی امریکی ایجنٹ تھی اور تقریباً پانچ سال سے مختلف عرب ممالک میں امریکہ کی جاسوسی کر رہی تھی۔ مصر آئے ابھی اسے تین ہی ماہ ہوئے تھے اس سے پہلے وہ اردن میں تھی۔ اردن میں اس کا قیام سال بھر سے زیادہ رہا تھا اور ابھی اسے مزید وہیں رہنا تھا لیکن ایک مقامی ایجنٹ کی حماقت کے سبب اسکی شخصیت بے نقاب ہو گئی تھی۔ اگر وہ اپنی ذہانت سے کام لے کر بر وقت وہاں سے فرار ہو کر شام نہ پہنچ جاتی تو یقیناً اردنی حکومت اسے حراست میں لے لیتی۔ شام میں اس نے صرف ایک ہفتہ گزارا تھا کیونکہ واشنگٹن سے اسے تازہ احکام مل گئے تھے۔ انہی احکام پر عمل کی غرض سے وہ مصر آئی تھی۔ عرب ممالک میں اس نے اتنا طویل عرصہ گزارا تھا کہ امریکی سی آئی اے اسے تجربے کی بنیاد پر وہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اہل زبان کی طرح عربی بولتی تھی اور مختلف عرب اقوام کے درمیان باہمی جھگڑوں اور کشمکش سے اچھی طرح واقف تھی۔ پانچ سال قبل وہ امریکہ ہی میں تھی۔ تھیری ناٹ نے اور اس نے امریکہ کے لیے کئی بار مختلف ممالک میں مختلف کارنامے انجام دیے تھے۔ یہ پانچ سال سے بھی پہلے کی بات تھی جب تھیری ناٹ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور اس شعبے کا سربراہ نہیں بنا تھا جو تمام ایجنٹوں کو تربیت دیتا ہے۔ بہرحال چونکہ جنسی معاملات میں وہ پارسا نہیں تھی اور تھیری ناٹ بھی یہ جانتا تھا مگر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد تھیری ناٹ ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اسے ایک ایسے تجربے سے آشنا کیا تھا کہ وہ لڑکی سے ایک عورت بن گئی تھی۔ پہلی جذباتی وابستگی کو عورت زندگی بھر یاد رکھتی ہے اور مرد بھی! وہ عورت گلوریا بھی اسی لیے تھیری ناٹ کو نہیں بھولی تھی۔ دوسرے مردوں سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ تھیری ناٹ کی محبت کا دم بھرتی تھی اور ہمیشہ اولیت اسی کو دیتی تھی کئی مواقع پر اس نے تھیری ناٹ کی خاطر اپنے دوسرے دوستوں کو ناراض کیا تھا۔ گلوریا کے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ وہ تھیری ناٹ کا خط پڑھ کر اسے دوبارہ کسی لفافے میں بند کر دیتی۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ تھیری ناٹ کا وہ خط ایک عورت کو بھیجا گیا تھا۔ تھیری ناٹ نے اپنے خط میں پچھلی رفاقتوں کا ذکر کیا تھا یہی ذکر اس کے جذبۂ رقابت کو ابھارنے کا سبب بنا تھا۔ قاہرہ آنے کے بعد اب تک تھیری ناٹ اس سے نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے۔ اسے علم تھا کہ تھیری ناٹ کو اسکی قاہرہ میں موجودگی کی خبر ہے۔ تھیری ناٹ سے اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اس کی بجائے قاہرہ پہنچ کر کسی اور عورت کو اولیت دے گا۔ اسے تھیری ناٹ کا وہ خط بھی براہ راست ملنے کی بجائے ایک مقامی ایجنٹ سے ملا تھا جسے شیخ ادریس کے ساتھ دیکھا تھا۔ ملنے کے ساتھ ہی اس مقامی ایجنٹ سے گلوریا کو تھیری ناٹ کی ہدایات زبانی ملی تھیں۔ انہی ہدایات پر عمل کرنے وہ میریڈین ہوٹل کے بار میں آئی تھی۔ اس نے مقامی ایجنٹ سے بھی تھیری ناٹ کا پتا دریافت کیا تھا مگر ناکامی ہوئی تھی۔ وہ لفافہ تھیری ناٹ نے ایک اجنبی شخص کے ہاتھوں اس کے پاس بھجوایا تھا اور بقیہ ہدایات ٹرانسمیٹر پر دی تھیں۔ گلوریا کو سارا رنج اس پر تھا کہ تھیری ناٹ نے اب تک ٹرانسمیٹر پر اس سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ میں نے بس احتیاطاً ہی گلوریا کے بارے میں بھی معلوم کر لیا تھا۔ وہ قاہرہ کے ایک علاقے مہندسین میں رہتی تھی۔ اس علاقے میں اونچی اونچی عمارتوں کی بجائے خوبصورت بنگلے بنے ہوئے تھے جو جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھے۔ اس آبادی کو قاہرہ کی اعلیٰ درجے کی آبادیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ گلوریا سے تھیری ناٹ کے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے یقینی ہی تھا کہ تھیری ناٹ اس سے کبھی نہ کبھی ملتا ضرور، یہی سوچ کر میں نے گلوریا کی قیام گاہ سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔

تھیری ناٹ کا خط پڑھنے کے بعد میں بس پانچ چھ منٹ کمرے میں اور رکا، پھر میں نے کمرے کی عقبی کھڑکی کھول لی۔ عقبی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر نیچے پہنچنا میرے لیے دشوار نہیں تھا۔ میں چاہتا تو دروازہ توڑ کر بھی کمرے سے نکل سکتا تھا لیکن بے سبب توڑ پھوڑ کو میں نے غیر ضروری ہی سمجھا تھا۔ میں ابھی اس ہوٹل کی عمارت سے نکل ہی رہا تھا کہ میری نگاہ اسی نوجوان پر پڑی جو اس فتنۂ قیامت کے ساتھ تھا۔ میں لپک کر اس نوجوان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نوجوان کا ذہن پڑھ کر پُراسرار لڑکی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا، مگر کچھ دیر بعد ہی مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بہت مایوس کن تھیں۔ اس نوجوان سے لڑکی کی ملاقات دو روز قبل ہی ایک نائٹ کلب میں ہوئی تھی۔ لڑکی نے خود ہی اس نوجوان میں دلچسپی لی تھی۔ لڑکی بہت جلد ہی نوجوان سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ میرے لیے اگر کوئی بات کسی قدر اہم ہو سکتی تھی تو وہ صرف اتنی تھی کہ اس نوجوان کا باپ وزارت دفاع میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ دو روز سے وہ لڑکی شہر کے مختلف ہوٹلوں میں اس نوجوان سے مل رہی تھی۔ آج بھی اس لڑکی نے نوجوان سے ہوٹل ہلٹن میں ملنے کا وعدہ کیا تھا، مگر وہاں بیٹھنے کی بجائے وہ نوجوان کو میریڈین ہوٹل کے بار میں لے آئی تھی۔ لڑکی جب اس سے ملی تھی تو پہلے ہی سے بہت نشے میں معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکی نے زیادہ نشے میں ہونے کی اداکاری ہی کی ہوگی، یقیناً وہ اتنے نشے میں نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ پھر مجھ پر جال پھینکنے کے قابل نہ ہوتی۔ لڑکی نے اس نوجوان سے وعدہ کیا تھا کہ آج وہ اس کے گھر چلے گی اور وہیں رات گزارے گی۔ نوجوان لڑکی کے حسن سے بہت متاثر تھا اور یہ خوش خبری سن کر اسکی آنکھوں میں سپنے جاگ اٹھے تھے۔ میریڈین ہوٹل کے بار سے جب لڑکی مجھے لے کر باہر چلی گئی تھی تو کچھ دیر بعد ہی واپس آکر اس نے نوجوان سے کہا تھا کہ وہ ہوٹل کے بڑے ہال میں بیٹھ کر اسکا انتظار کرے۔ نوجوان نے اب تک لڑکی کا انتظار کیا تھا، مگر وہ نہیں آئی تھی۔ مجبوراً اسے اٹھنا پڑا تھا اور اب وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ جب تک وہ نوجوان، ہوٹل کے پارکنگ لاٹ تک پہنچا جہاں اس کی کار کھڑی تھی، میں اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔

میں ابھی مڑ کر چند قدم ہی چلا تھا کہ یک لخت عقب سے اسی نوجوان کی حیرت زدہ سی آواز سنائی دی تھی: "ارے تم!" اس نوجوان نے کہا۔

جواب میں ہلکی سی سرگوشی گونجی تھی، مگر اتنی مدھم کہ میں کچھ نہ سن سکا تھا۔ میرے قدم رک گئے اور اسی وقت میں نے کار کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر میں پلٹا اور میرا جسم سنسنا اٹھا۔ وہی لڑکی، اس نوجوان کے پہلو میں کار کے اندر بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر میں نے دیر نہیں کی اور فوراً ہی زقند بھر کے کار تک پہنچ گیا، مگر اسی لمحے کار زن سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

"جلدی!... تیز... بہت تیز!" لڑکی نے تقریباً چیخ کر نوجوان سے کہا۔

میری تمام پُراسرار قوتیں بیک وقت بیدار ہو چکی تھیں۔ میں کسی بھی قیمت پر اس لڑکی کو بچ کر نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ کار کی رفتار یقیناً بہت تیز تھی۔ وہ انتہائی تیزی کے ساتھ ہوٹل کے گیٹ سے نکلی تھی، لیکن اس کار کی انتہائی رفتار بھی میری بلاخیز رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں بھی ہوا کے ایک طوفانی جھکڑ کی طرح ہوٹل کے گیٹ سے نکلا۔ وہ کار اس وقت تک کافی فاصلہ طے کر چکی تھی لیکن میری قوت بصارت اسے بھی نزدیک لے آئی تھی۔ اس کا رُخ تحریر اسکوائر کی طرف تھا۔ یا نوجوان پاگل ہو گیا تھا یا پھر لڑکی کے کہنے پر اس نے خود کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس قدر تیز رفتاری کسی بھی لمحے کسی خطرناک حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے لیکن سڑکوں پر ٹریفک موجود تھا۔ یوں بھی وہ علاقہ قاہرہ کا معروف ترین علاقہ تھا۔ کار تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کرتی رہی اور میں اس کے تعاقب میں دوڑتا رہا۔ میں نے اب تک اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ جب تک وہ تحریر اسکوائر سے گزر کر شاہراہ اہرام تک پہنچی، میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"روک دو... کار روک دو!" لڑکی ایک دم چیخ اٹھی۔ اس نے یقیناً میری خوشبو کو محسوس کر لیا تھا۔

نوجوان نے کار کی رفتار کسی قدر کم کی، مگر اب بھی پورے بریک لگانا ناممکن ہی تھا۔ میں اس دوران کار کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے اس کا پچھلا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں نے دوڑتے ہوئے ہی کار کا دروازہ پکڑ کر اس کے اندر جست بھری اور عقبی نشست پر گر گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے لڑکی کو قابو میں کرنے کے لیے اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں کی مگر وہ

ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی ہو اور پھر میرے ذہن میں تاریکی سی پھیل گئی تھی۔ یہ بات میرے لیے انتہائی حیران کن تھی۔ اس سے پہلے کسی کے ذہن سے رابطہ قائم کرتے ہوئے میں ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔

اسی دوران میں کار رک گئی اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور حقیقت حال جاننے کے لیے اطراف کا جائزہ لیا۔ میری اطراف گاڑھا گاڑھا دھواں پھیل رہا تھا اور اس دھوئیں میں شدید بدبو تھی۔ سانس روکتے روکتے کچھ دھواں میرے پھیپھڑوں میں پہنچ ہی گیا اور مجھے چکر سا آ گیا، ساتھ ہی کھانسی بھی آئی۔ سینے میں جلن محسوس ہوئی تو میں اسے ہاتھ سے سہلانے لگا۔ وہ یقیناً کوئی انتہائی تیز قسم کی بے ہوشی کی گیس تھی، اس کا اندازہ مجھے فوراً ہی ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے حصار سے نکلنے کے لیے کار سے چھلانگ لگادی۔ کار کا وہ دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا جس سے میں اس کے اندر آیا تھا۔

کار سے نکلتے ہی میں نے وہ زہریلی گیس خارج کر دی اور اپنے پھیپھڑوں کے اندر تازہ ہوا بھرنے کے لیے گہرا سانس لیا۔ اسی وقت میری نگاہ میلوں تک سیدھی لمبی سڑک پر پڑی اور میں اچھل پڑا۔ اس وقت سڑک پر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بھاگنے والی وہی لڑکی ہو سکتی تھی، اس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ سڑک روشن تھی اسی لیے وہ مجھے بھاگتی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ اس کا جسم کسی متحرک ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا اسے طے کر لینا کوئی مشکل نہ تھا۔ میں نے ایک دم جست بھری اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ مجھے اس سے اتنی تیز رفتاری کی توقع ہرگز نہیں تھی، لیکن میں پھر بھی اس تک پہنچ ہی گیا پھر میں نے جیسے ہی اس کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، بھاگتے بھاگتے وہ ایک دم پلٹی اور پھر اس کا جسم فضا میں اچھلا اور دوسرے ہی لمحے اس کے دونوں پیر پوری قوت کے ساتھ میرے سینے پر پڑے۔ میں اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا، نتیجتاً اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ڈھیر ہو گیا ورنہ پہلے سے میرا ذہن آمادہ ہوتا تو وہ میرے جسم کو اپنی جگہ سے معمولی حرکت بھی دینے میں کامیاب نہ ہو سکتی۔ میرا وجود اب تک نادیدہ ہی تھا اس کے باوجود اس لڑکی کا اندازہ حیرت انگیز حد تک درست ثابت ہوا تھا۔ صرف میرے وجود کی خوشبو محسوس کر کے اتنا صحیح اندازہ لگا لینا واقعی کمال ہی تھا۔

میں اپنی دانست میں گر کر لوٹ آیا مجھے میں دیر نہیں لگی تھی، لیکن اس کے لیے اتنا موقع مل جانا بھی سودمند ثابت ہوا تھا۔ اسے اٹھنے میری اطراف پے در پے چند دھماکے سنائی دیے تھے اور پھر میرا وجود دھوئیں میں ڈوب گیا تھا۔ میری چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ میں نے پہلا دھماکا سنتے ہی اپنا سانس روک لیا تھا۔ اس بار وہ گیس میرے سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں داخل نہیں ہو سکی تھی۔ میری سماعت سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز ٹکرا رہی تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور دھوئیں کے اس بادل سے نکل گیا۔ وہ لڑکی اس بار مجھے مخالف سمت میں بھاگتی نظر آئی۔ اسی سمت میں کار بھی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ لڑکی کا ساتھی نوجوان غالباً اسی کار میں بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ شاید دوبارہ کار میں بیٹھ کر فرار ہو جانا چاہتی ہے اور پھر میری رفتار تیز ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کار میں بیٹھ کر فرار ہونے کی کوشش کرتی میں اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس بار میں اپنی دانست میں اس کے ہر حملے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا، مگر یہ میرا خیالِ خام ہی ثابت ہوا۔ میں بس اتنا دیکھ پایا تھا کہ کار تک پہنچتے پہنچتے وہ تیزی سے مڑی تھی اور میرے چہرے سے کوئی نرم لجلجی سی شے ٹکرا کر پھٹی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میری دونوں آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلاخیں گھسیڑ دی ہوں۔ ضبط کے باوجود میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس نرم لجلجی سی شے میں کوئی سیال تھا جو میری آنکھوں میں پھیلنے کے علاوہ چہرے کے دوسرے حصوں پر پھیل گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آیا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیا میں اپنی آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکا ہوں؟ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال نے جیسے میری روح میں ایک تیز نشتر اتار دیا۔

ایک معصوم لڑکی کی داستانِ الم جو انجانے دشمنوں میں گھر گئی تھی۔

جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے

اندھیرے کا تیر

تحریر
ایم اے راحت

○ انگلینڈ کے ایک مارشل آرٹس ماسٹر کی تربیت یافتہ۔ اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش میں سرگرداں لیکن اژدہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

○ اسے پناہ ملی ـ ـ ـ ـ ـ تو ایسی جگہ جہاں وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ شیدے۔ کالے بدنما چہرے والا فرشتہ۔ جو اس کی ڈھال بنا معاشرے کے تلخ پہلو اجاگر کرتی ہوئی سنسنی خیز داستان۔

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہو گا

ایک جلد میں | قیمت فی جلد/ روپے | ڈاک / روپے

ایک عجیب داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!

ال قریش پبلیکیشنز اینڈ لائبریری ۱۱۴ ○ مزنگ روڈ اسلام پورہ

فون 7229762 - 7238599

بینائی سے محروم ہو جانے کے احساس نے میرے وجود کو لرزا کر رکھ دیا۔ میری دونوں آنکھوں سے جیسے اب بھی شعلے سے نکل رہے تھے مگر میں جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ روحانی اذیت میں مبتلا تھا۔ جنھوں نے مجھ پر لاکھوں ڈالر خرچ کیے میری کیلئے تھے میری بصارت سے بھی محروم کر سکتے ہیں! میرے ذہن کے کسی گوشے سے ایک سوال اُبھرا ابھی میں اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال کا کوئی جواب نہ سوچ پایا تھا کہ میری سماعت سے کال بیل بجنے کی آواز ٹکرائی۔ وہ دشمنِ جاں جس نے مجھے میری بینائی سے

محروم کر دیا ہے، انتقام پورا ہو رہی ہے، یہ سوچ کر میرا وجود انتقام کی آگ سے بھڑک اٹھا۔ میں آواز کی سمت لپکا اور چیخ اٹھا: "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا!" جواب میں مجھے ایک کھنکتا ساقہقہہ سنائی دیا۔ اس فتنہ ساماں کو یقیناً میری بے بسی کا علم ہو گا اسی لیے تو وہ ہنس پڑی تھی۔

کار کے انجن کی آواز میری رہنمائی کر رہی تھی اور میں اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ بصارت سے محروم ہو جانے کے باوجود میں اسے بچ کر نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں بہت تیز دوڑ رہا تھا اسی لیے غالباً دوڑتے دوڑتے کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا گیا۔ کار کی انتہائی رفتار بھی میری بلا رفتاری کے سامنے ہیچ تھی اگر میری بینائی سلامت ہوتی تو یقیناً یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ میں کار سے نہ ٹکراتا، کار سے ٹکرانے کے سبب میرے جسم کو غیر متوقع طور پر دھکا لگا۔ گرتے گرتے میرے ہاتھوں میں کار کا پچھلا بمپر آ گیا۔ میرے جسم کو زبردست جھٹکا لگا۔ یقیناً کار اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میرا جسم شاید کچھ دور تک زمین پر گھسٹتا چلا گیا لیکن اس کے بعد میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ کار ایک انچ بھی آگے بڑھ سکتی۔ کار کا انجن اب بھی غرا رہا تھا۔ یہ صورتِ حال اس لڑکی کے لیے غیر متوقع ہی رہی ہو گی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اگر میں کار کا بمپر ایک دم چھوڑ دوں تو یقیناً کار بے قابو ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں کار کو خطرناک حادثہ پیش آ جانا لازمی تھا، یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ ادھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا ادھر میری توقع کے خلاف ایک دم کار کا انجن خاموش ہو گیا اور اسی کے ساتھ ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے اچانک کار کا دروازہ کھول کر اس سے باہر چھلانگ لگا دی ہو۔ اگر میں اس وقت فوراً ہی کار کا بمپر نہ چھوڑ دیتا تو شاید میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ جو قوت میں کار کو روکے رکھنے کے لیے صرف کر رہا تھا وہی میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیتی۔ اس خطرناک لڑکی نے مجھ پر وہی حربہ استعمال کیا تھا جو اسے ختم کرنے کے لیے میرے ذہن میں آیا تھا۔ کار کے رکتے ہی اس نے یقیناً صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

پھر چند لمحے گزرے تھے کہ میری سماعت سے ایک زبردست دھماکے کی آواز ٹکرائی۔ غالباً کار پوری قوت کے ساتھ سڑک کی دونوں جانب لگے ہوئے کسی بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئی تھی۔ اندھیرا اب بھی میری اطراف محیط تھا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر تیزی سے اس طرف بڑھا جدھر سے مجھے دھم کی سی آواز سنائی دی تھی وہ لڑکی کار سے چھلانگ لگا کر بائیں جانب ہی گری تھی۔ مجھے توقع تو نہیں تھی کہ وہ اب بھی وہیں موجود ہو گی مگر میں کسی امکان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب سے مجھے کسی نے دھکیلا اور ہنسی کے ساتھ ایک نسوانی آواز ابھری۔

"ابوالہول! تم تو کسی چوہے کی طرح میری نظروں سے چھپتے پھرتے ہو۔ تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو مجھ سے! میں نے تو یہ سنا تھا کہ تمہارے دشمن تم سے چھپتے پھرتے ہیں!" اس کی آواز میں بلا کی چبھن تھی اور یہ اسی لڑکی کی آواز تھی۔ اس کے دھکا دینے سے میں لڑکھڑا تو گیا تھا مگر فوراً ہی آواز کی طرف جھپٹ پڑا تھا۔

"ارے میں ادھر ہوں، یہاں!" اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس سمت چھلانگ لگا دی جدھر سے اس کی آواز سنی تھی۔

"نادیدہ ہی بنے رہو گے! بڑے بزدل ہو تم!" اس بار مجھے اپنے عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

یہ صحیح ہے کہ غصے میں اچھے اچھوں کی عقل خبط ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی اس وقت میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں تقریباً چیخ اٹھا "اچھا یہ لے!" اسی کے ساتھ میں نے اپنے وجود کی تجسیم کر لی۔

"ہاں یہ بات ہوئی نا!" ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی میرے رخسار پر بھرپور تمانچہ پڑا۔

میں نے غصے میں یقیناً حماقت کا ثبوت دیا تھا جس کی مجھے پوری سزا مل رہی تھی۔ پہلے بات برابر کی تھی کم از کم بصارت کی حد تک! نہ وہ مجھے نظر آ رہی تھی، نہ میں اُسے! لیکن اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ وہ مجھ سے بالکل اس طرح کھیل رہی تھی جیسے بلی کسی چوہے سے کھیلتی ہے۔ میں اُسے پکڑنے کبھی ایک طرف لپکتا کبھی دوسری طرف جھپٹتا۔ اس دوران میں اس کے قہقہے جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ مجھے کچھ ہی دیر میں یہ احساس ہو گیا کہ میں اُسے نہیں پکڑ سکوں گا، اگر وہ ایک بار بھی میری گرفت میں آ جاتی تو اس کا زندہ بچنا محال ہی تھا۔ یہ خیال آتے ہی کہ میں ناحق اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں میرے قدم رک گئے۔

"کیوں تھک گئے کیا!" اس نے مجھے تپایا۔

میں جواب میں کچھ نہ بولا اور اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ مجھ سے کچھ کہتے ہی وہ تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدل دیتی تھی۔ ایسی صورت میں اس طرف جھپٹنا فضول ہی تھا۔

کیا میں موجودہ صورتِ حال میں اس سے نمٹ سکتا ہوں؟ میں نے سوچا اور میرے ذہن نے اس سوال کا جواب نفی ہی میں دیا۔ پھر میں یہاں کیوں وقت ضائع کر رہا ہوں؟ کیوں اس کے تمسخر اور تحقیر کا نشانہ بن رہا ہوں؟ مجھے آخر عقل آ ہی گئی اور اسی کے ساتھ ایک بار پھر میرا وجود نادیدہ بن گیا۔

"ارے۔۔۔ ارے ابوالہول یہ کیا! تم تو بھاگ کھڑے ہوئے مقابلے سے!" وہ تمسخر آمیز انداز میں بولی۔ "تم تو بھگوڑے نکلے!"

"میں تجھ سے اپنی توہین اور ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا احمق لڑکی!" میں نے دانت پیس کر کہا اور خود کو بمشکل اس پر جھپٹ پڑنے سے روکا۔

"خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی! جانے کتنے ہی خواب دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے سو گئے۔" اس کی زہریلی آواز میں نے اپنے عقب سے سنی۔ اب میں ہر قیمت پر اس سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا اسی لیے تیزی سے سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ پھر میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میرے قدموں کے نیچے پختہ سڑک تھی، مگر سمت کا تعین میرے لئے بہت ہی مشکل تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں قاہرہ کی طرف دوڑ رہا تھا یا مخالف سمت اہرام کی جانب! یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اپنے کسی دشمن کے مقابلے سے میں نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ اس پر مجھے انتہائی شرمندگی بھی تھی اور شدید غصہ بھی۔

میں اپنے اندازے کے مطابق سڑک کے کنارے کنارے دوڑ رہا تھا۔ رات کا وقت ہونے کے باوجود بھی اس سڑک پر ٹریفک رہتا تھا۔ دوڑتے ہوئے بھی میرا ذہن اسی لڑکی میں الجھا ہوا تھا جس کے بارے میں مجھے اب تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔ میں اس کے بارے میں اب تک صرف یہی جان سکا تھا کہ وہ میرے دشمنوں ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مجھے یوں بھی اب یقین ہو چکا تھا کہ اس نے میرا وہی نام لے کر پکارا تھا جس سے میں اپنے دشمنوں میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور روح فرسا خیال آیا۔

یا تو اس خطرناک لڑکی سے حماقت ہو گئی تھی یا پھر میری قسمت ہی اچھی تھی کہ بچ گیا تھا ورنہ مجھ سے غصے میں بڑی بھیانک غلطی ہوئی تھی۔ کیا اس وقت جب وہ میری بے بسی سے کھیل رہی تھی، مجھے بے ہوش دوا سے بیگانہ نہیں کر سکتی تھی جب میرا وجود نادیدہ نہیں تھا؟

تھا تو وہ بآسانی میرے جسم کے کسی حصے میں کوئی ایسی زہریلی پن اتار سکتی تھی جو مجھے بے ہوش کر دیتی۔ وہ اسی شب ایسا کر بھی چکی تھی میریڈین ہوٹل کے بار سے نکلتے ہی اس نے میرے بازو میں ایسی کوئی پن چبھوئی تھی۔ اس وقت بھی مجھے فرار ہونا پڑا تھا پھر میں کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آیا تھا۔ اس وقت اس نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟ اس سوال کے دو ہی جواب تھے۔ یا تو اس کے پاس اب کوئی اور پن نہیں تھی یا پھر اسے یہ توقع نہ تھی کہ میں ایک دم ہی اس کے مقابلے سے بھاگ کھڑا ہوں گا وہ مجھ سے کچھ دیر کھیلنے کے بعد وہ حربہ آزمانا چاہتی ہو گی۔ انہی دونوں باتوں میں سے کوئی ایک ہو سکتی تھی، مگر مجھے پہلی بات پر زیادہ یقین تھا۔ وہ یقیناً اتنی احمق نہیں تھی کہ موقع سے فائدہ نہ اٹھاتی۔ ایک بار بے ہوشی کے عالم میں میں اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد مشکل ہی تھا کہ میں اپنی آزادی برقرار رکھ سکتا۔ پہلے صرف دو بار ایسا ہوا تھا، مگر اپنے دشمنوں کی حماقت کے سبب میں ان کے چنگل سے نکل آیا تھا۔ ایک مرتبہ چینی ایجنٹ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تھے اور دوسری مرتبہ روسی ایجنٹ میخائیل نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ دونوں مرتبہ بس قسمت ہی نے میرا ساتھ دیا تھا ورنہ میرے دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ پھر کون سی بڑی طاقت دنیا پر کیا تباہی لاتی، اس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے کسی بھی بڑی طاقت کا وفادار بنا دیا جاتا اور وہ بڑی طاقت میرے بل پر بڑی تباہی پھیلاتی۔ میری شکست کا مطلب دنیا کے امن اور سلامتی کی شکست تھا۔

میرے دوڑنے کی رفتار کسی بھی طرح ڈیڑھ سو میل فی گھنٹا سے کم نہیں ہو گی جب کہ میں اس سے دگنی رفتار سے بھی دوڑ سکتا تھا۔ میرے قدم اسی لیے کچھ دیر بعد رک گئے۔ اب وہ لڑکی میری گرد کو بھی نہیں پا سکتی تھی۔ ابھی تک میری اطراف اندھیرا ہی تھا ابھی مجھے

ٹنگے ہوئے چند ہی لمحے ہوئے تھے اور میں یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا، مجھے اب کیا کرنا چاہیے کہ میرے دماغ میں روشنی کے جھماکے سے ہونے لگے۔ ان جھماکوں کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی روشنی کی آڑی ترچھی لکیریں سی ناچنے لگیں۔ روشنی کی ان لکیروں نے اندھیرے میں شگاف ڈال دیے تھے۔ میں اپنی اس کیفیت پر حیران ہی تھا کہ ایک اور تیز جھماکا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھماکے بند ہو گئے۔ چند لمحے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ میری بصارت واپس آ چکی تھی اور یقیناً یہ امر میرے لیے انتہائی خوشی کا تھا۔ یا تو میرے وجود کے خود کار مدافعتی نظام نے اس محلول کا اثر ختم کر دیا تھا جس نے مجھے اندھا بنا دیا تھا یا پھر وہ محلول ہی عارضی اثر رکھتا ہوگا۔ ممکن ہے دونوں ہی باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہوں یا ان میں سے کوئی ایک بات درست ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ بصارت کی بحالی نے میرے اندر پھیلنے والی مایوسی کو قطعی ختم کر دیا تھا۔ میں نے سامنے نظر اٹھائی تو کچھ ہی فاصلے پر قدیم اہرام کے آثار نظر آئے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں قاہرہ کی طرف واپسی کی بجائے ادھر نکل آیا تھا۔ وہاں رات کے وقت بھی روشنی کا مناسب انتظام تھا۔ مجھے وہیں سے ابوالہول کا پُرہیبت مجسمہ نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر میں وہیں کھڑا ہوا ابوالہول کی طرف دیکھتا رہا، پھر جانے کیسے مجھے امریکی ایجنٹ تھری ناٹ کا خیال آ گیا۔ اسے آج ہی شب ہوٹل موشاتا میں لیزا سے ملنا تھا۔ اس نے اپنے خط میں لیزا کو یہی لکھا تھا۔ مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کم از کم اپنے ایک دشمن کو تو راستے سے ہٹا ہی دینا چاہیے۔ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ تیز رفتار کوئی ٹیکسی مجھے اتنی جلدی شاہراہ شریف تک نہیں پہنچا سکتی تھی جتنی جلدی میں خود وہاں پہنچ سکتا تھا۔ یوں بھی اس وقت وہاں کوئی خالی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ تھری ناٹ کا خط لیے صرف ایک ہی گھنٹہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے خط میں وقت کا کوئی تعین نہیں کیا تھا۔ وہ رات کے کسی بھی حصے میں لیزا سے ملنے ہوٹل موشاتا پہنچ سکتا تھا اس لیے میرا وہاں جلد از جلد پہنچنا ضروری تھا۔ مسافت زیادہ نہیں، صرف تقریباً سولہ میل تھی اور مجھے یہ مسافت طے کرنے میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے۔ یہی سوچ کر میں تیز رفتاری سے قاہرہ کی طرف دوڑنے لگا۔ میرا وجود اب تک نادیدہ ہی تھا اور میں اسے نادیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

ہوٹل موشاتا پہنچنے میں مجھے واقعی چند ہی منٹ لگے۔ اب میں اس نو منزلہ بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا جس کے ساتویں اور آٹھویں منزلیں ہوٹل موشاتا کے لیے مخصوص تھیں۔ لیزا کا کمرہ آٹھویں منزل پر تھا۔ میں گذشتہ شب وہاں آ چکا تھا۔ میرے لیے باعثِ تشویش نہیں ہوا کہ اس کا کمرا مقفل تھا۔ قفل کھول کر اندر داخل ہو جانا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ راہداری میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ہلکا سا جھٹکا ہی قفل کھولنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا، چونک اٹھا۔ "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو!" مجھے ایک سخت آواز سنائی دی پھر کہا گیا۔ "سامنے آ جاؤ! اگر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا!" کمرے میں تاریکی تھی اور یہ آواز تاریکی ہی سے آ رہی تھی۔

یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ اندر جو کوئی بھی موجود تھا اس نے مجھے دیکھ لیا ہوگا کیونکہ میرا وجود نادیدہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے سامنے آنے کے لیے نہ کہتا جب کہ میں اس کے سامنے ہی تھا۔ اس نے یقیناً دروازہ کھلنے سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ابھی کوئی کمرے میں قدم رکھنے والا ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ جسے اندر آنا تھا، وہ آ چکا ہے۔ میرے لیے وہاں کسی کی موجودگی خلافِ توقع ہی تھی۔ یہ تو خیر سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کمرا کسی اور مسافر کو کرائے پر اٹھا دیا گیا ہوگا۔ اس کا سبب یہ کہ وہاں ابھی لیزا کا سامان موجود تھا۔ گذشتہ شب وہ صرف ایک ہی اٹیچی لے کر وہاں سے گئی تھی۔

"کہیں فرار نہ ہو جائے!" اندھیرے سے ایک آواز اور ابھری، مگر یہ آواز پہلی آواز سے مختلف تھی۔ کمرے میں صرف ایک ہی شخص نہیں تھا۔

"ہو سکتا ہے۔" پہلی آواز سنائی دی۔ "آؤ!"

میں دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ اندھیرے سے دو افراد نکل کر تیزی کے ساتھ میرے قریب سے گزر گئے۔

"ارے یہاں تو کوئی نہیں!" یکے بعد دیگرے ان دونوں

کی حیرت بھری آوازیں باہر سے سنائی دیں۔

"راہداری دور تک خالی پڑی ہے اور لفٹ کا دروازہ بھی بہت دور ہے یہاں سے۔"

"پھر وہ کہاں گیا؟ اتنی جلدی ناممکن ہے کہ وہ فرار ہو جاتا۔"

وہ دونوں کھلے ہوئے دروازے کے باہر کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں اس دوران میں ان کے ذہن پڑھ چکا تھا کہ وہ کون ہیں اور وہاں لیزا کے کمرے میں کیا کر رہے ہیں! میں نے اس لیے باآوازِ بلند انھیں مخاطب کیا: "میں یہاں ہوں کمرے میں!" میری آواز سن کر ان کا بوکھلا جانا فطری بات تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ بوکھلاہٹ میں ان سے کوئی حماقت سرزد ہو جاتی، میں نے ان کے ذہنوں کو قابو میں لے لیا۔ اس کے بعد میرے ذہن نے انھیں جو حکم دیا، اس پر انھوں نے فوراً عمل کیا۔

وہ کمرے کے اندر آ گئے اور اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ "تمھیں بہت زور کی نیند آ رہی ہے۔ تم سو رہے ہو۔۔۔ سو رہے ہو تم!" میرے ذہن نے انھیں سونے کی ترغیب دی۔ وہ دونوں ہی بہت کمزور ذہنوں کے مالک تھے اس لیے فوراً ہی وہیں فرش پر ڈھلک گئے۔ ان کے سے کمزور ذہن افراد کو سی آئی ڈی ایسے محکمے میں نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا اور پھر سوئچ کی طرف بڑھ گیا۔ اندھیرا میری قوتِ بصارت کے سامنے بے حقیقت تھا۔ اندھیرے یا اجالے سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں اندھیرے میں بھی روشنی کی طرح دیکھنے پر قادر تھا۔ میں نے اسی لیے اس کمرے کا جائزہ لینے کے لیے روشنی کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کمرے کا تمام ساز و سامان بے ترتیب پڑا ہوا تھا۔ الماری بھی کھلی ہوئی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ایک چیز کی اچھی طرح تلاشی لی گئی ہے۔ لیزا کے کمرے کی تلاشی لینے والے ظاہر ہے کہ سی آئی ڈی والے ہی ہوں گے۔ لیزا نے گذشتہ شب ہی اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ ہر چند کہ لیزا نے اپنے تمام ساتھیوں کے نام پتے اور سارے ثبوت سی آئی ڈی والوں کو فراہم کر دیے تھے اور ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا، پھر بھی وہ کسی امکان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ باتیں مجھے ان دونوں سی آئی ڈی والوں کے ذہن پڑھ کر معلوم ہوئی تھیں جو مجھے اس کمرے میں ملے تھے اور اب گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ اس لیے لیزا کے کمرے میں تھے کہ اگر لیزا کا کوئی ساتھی اس سے ملنے آئے یا رابطہ قائم کرے تو اسے حراست میں لے لیا جائے۔ لیزا کے اعترافِ جرم اور اسرائیلی ایجنٹوں کی گرفتاری کو اسی لیے ابھی تک پردۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ابھی کوئی خبر اخبارات میں اشاعت کے لیے نہیں دی گئی تھی۔ انھوں نے یقیناً لیزا کے بیان پر پورا یقین نہیں کیا تھا حالانکہ میرے خیال میں یقین نہ کرنے کا کوئی سبب نہیں تھا۔

ان دونوں کو گہری نیند سلانے کے بعد اب مجھے ان کی طرف سے کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے پہلے بیدار نہیں ہو سکتے تھے۔ اب مجھے امریکی ایجنٹ تھری ناٹ کا انتظار تھا جسے لیزا سے ملنے آنا تھا۔ لیزا کے متعلق اخبارات میں کچھ نہیں آیا تھا، یہ میرے لیے سودمند ہی ثابت ہوا تھا ورنہ تھری ناٹ ہوشیار ہو جاتا اور لیزا سے ملنے کے لیے نہ آتا۔ تھری ناٹ لیزا کی گرفتاری سے لاعلم تھا، اس کا ثبوت وہ خط تھا جو آج ہی رات اس نے لیزا کو لکھا تھا۔ یہ وہی خط تھا جو میریڈین ہوٹل کے بار میں، میں نے امریکی ایجنٹ گھوریا سے حاصل کیا تھا۔ تھری ناٹ کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس خطرناک لڑکی کا بھی خیال آیا جس نے میرے سارے منصوبے کو خاک میں ملا دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک نئی اجنبی شخصیت اپنا لینے کے بعد میرے دشمن کانی چین دھوکے میں رہیں گے اور مجھے تلاش نہ کر سکیں گے لیکن یہ میرا خیال خام ہی ثابت ہوا تھا۔ میری عمر اور میرے چہرے کا میک اپ اس لڑکی کو دھوکا نہیں دے سکا تھا۔ اس نے مجھے ابوالہول کی حیثیت سے صرف پہچان لیا تھا بلکہ مجھ پر قابو پانے کی بھی پوری کوشش کی تھی۔ اس نے کس طرح مجھے پہچان لیا تھا اور کیسے مجھ تک پہنچ گئی تھی، ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن اب یہ بات یقیناً طے شدہ تھی کہ مجھے اپنی موجودہ حیثیت میں مزید نہیں رہنا تھا۔ تھری ناٹ سے نمٹتے ہی میں نے اپنی شخصیت بدل لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج رات ہی مجھے تھری ناٹ کو راستے سے ہٹا دینا تھا، پھر صبح ہونے سے پہلے ہی کوئی نئی شخصیت اپنا لینا تھی۔

میں جانے کب تک انھی خیالوں میں کھویا رہا، لیکن اتنا احساس ضرور تھا کہ وہاں آئے مجھے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ تھری ناٹ اب تک نہیں آیا تھا، اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ دن کا اجالا پھیلنے میں اب کم ہی وقت رہ گیا تھا۔ اسے اب تک بہرحال آ جانا چاہیے تھا۔ معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ

کہیں وہ اگر روپوش تو نہیں گیا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن تھی جس پر میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ پھر میں یا ہی پر غور کرنے لگا۔ تیمری ناٹ نے ہوٹل کے منیجر کے ذریعے لیزا سے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہ ایک اہم بات تھی جسے کم از کم مجھے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ تیمری ناٹ کو لیزا کے کمرے کا نمبر نہیں معلوم تھا ورنہ وہ اپنا پیغام منیجر تک پہنچانے کی بجائے براہِ راست لیزا تک پہنچاتا۔ میرا ذہن ایک کہانی ترتیب دینے لگا۔ تیمری ناٹ حسبِ وعدہ ہوٹل ہوتا تا آیا اور منیجر سے ملنا چاہا۔ اُسے معلوم ہوا کہ گزشتہ شب منیجر کو پولیس گرفتار کر کے لے جا چکی ہے۔ تیمری ناٹ ایسے ذہین اور چالاک شخص کے لیے اتنا ہی کافی ہوا۔ وہ فوراً ہی ہوٹل سے فرار ہو گیا۔ پولیس جب ہوٹل کے منیجر تک پہنچ سکتی تھی تو اس کے لیے لیزا تک پہنچنا بھی مشکل نہیں ہوگا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ چونک اٹھا مسہری کے قریب تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں صوفے سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ فون کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے کریڈل سے ریسیور اٹھاتے ہوئے سوچ لیا تھا کہ اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے دوسری جانب سے فون کرنے والے کے بولنے کا انتظار کیا، مگر کوئی نہ بولا۔ کچھ سوچ کر میں بول اٹھا۔ "ہیلو! کون ہے؟" میں ہو بہو لیزا کی آواز میں بولا تھا۔ گزشتہ شب میں نے کافی دیر اس کی آواز سنی تھی اس لیے اس کی آواز کی نقل کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔

"لیزا! مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم اپنے کمرے میں مل جاؤ گی۔" دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ اس نے یقیناً لیزا کی آواز کو پہچان لیا تھا اور میں نے بھی اس کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ تیمری ناٹ ہی تھا۔ میں فون پر ہارون کی حیثیت سے اُس کی آواز سن چکا تھا۔

"تم... تم آئے کیوں نہیں۔ میں... تمہیں نہیں معلوم کہ میں تم سے ملنے کے لیے کس قدر بے چین ہوں!" میں نے لیزا کی آواز میں جذباتی لہجہ اختیار کر لیا۔

"لیزا! تم سے اتنی حماقت کی توقع مجھے نہیں تھی کیا تمہیں ہوٹل کے منیجر کی گرفتاری کا علم نہیں؟ کیا تم اپنے ارد گرد سے اتنی بے خبر تھی ہو؟ ان حالات میں کیا تمہیں فوراً یہ ہوٹل نہیں چھوڑ دینا

پائل کی جھنکار تلے جنم لینے والے غیرت مند بیٹے کی کہانی
پائل
(ہستوں میں مکمل)
ایم۔ اے راحت
کتابی شکل میں تیار ہے
زمانہ قدیم سے دورِ جدید تک طوائف کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔ کہیں وہ چھپن چھری کہلائی، امراؤ جان ادا ہوئی کہیں کچھ لیکن سب ہی ایک بد نصیب کردار کو بھول گئے۔ کوٹھوں پر بیٹا بھی تو پیدا ہوتا ہے اور غیرت کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
مکمل کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے
قیمت فی حصہ ۴۵ روپے
محصول ڈاک 16 روپے
ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!
5 حصے ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
یا براہِ راست ہم سے منگوائیں
گل قریش پبلیکیشنز اینڈ لائبریری 11 مزنگ روڈ لاہور
فون 7248509- 7220762

چاہیے تھا؟" تیمری ناٹ کے لہجے میں سرزنش تھی۔

"پھر تم... تم سے کس طرح رابطہ قائم ہوتا؟"

"تو گویا تمہیں اپنے ملک کے مفاد پر ذاتی مفاد عزیز ہے!" تیمری ناٹ کی آواز میں تلخی آ گئی۔

"میں... اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی ورنہ... ورنہ کل ہی رات..."

"مجھے حیرت ہے کہ تم اب تک آزاد فضا میں کیسے سانس لے رہی ہو!" تیمری ناٹ میری بات کاٹتے ہوئے گرجا۔

"اعتماد بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے! مجھے اس پر اعتماد ہے کہ وہ مر جانا قبول کر لے گا مگر زبان نہیں کھولے گا۔"

"میں نے اسی توقع پر تمہیں فون کیا تھا کہ شاید تم اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ابھی تک اسی ہوٹل میں ہو اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔" یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا، پھر بولا۔ "میں تمہیں ہدایت دیتا ہوں کہ فوراً یہ ہوٹل چھوڑ دو!"

"مگر تم... تم کب اور کہاں ملو گے؟"

"تمہاری تربیت کے دوران میں تمہیں شاید میں نے یہ سبق بھی دیا تھا کہ اپنے سوا کسی پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے، مگر شاید وہ سبق تم نے بھلا دیا ہے... سنو موجودہ صورتِ حال میں جب کہ تمہارا ایک مقامی ایجنٹ پکڑا جا چکا ہے، تم سے ملنا میں خطرناک سمجھتا ہوں۔ میں جب خود تمہارے حالات کا تجزیہ کر لوں گا تو خود ہی تم سے رابطہ قائم کر لوں گا اور..."

"مگر کہاں؟" میں بول اٹھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں یہ ہوٹل چھوڑ کر کہاں جاؤں گی اور کہاں سکونت اختیار کروں گی؟"

"کیا ہو گیا تمہیں لیزا!" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کیا تم بھول گئیں کہ میرا نام تیمری ناٹ ہے!"

"میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی!"

"مجھے تم سے اس وقت گفتگو کرتے ہوئے جانے کیوں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم لیزا نہیں ہو۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ مجھے تم سے ایسی احمقانہ باتوں کی توقع نہیں تھی۔ کیا تم اتنی ہی احمق ہو چکی ہو کہ یہ بھی نہ سمجھ سکو کہ میرے لیے تمہارا نیا پتا معلوم کر لینا کیں ہاتھ کا کھیل ہے! کیا تمہارے ذہن میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ تم اپنے نئے ٹھکانے سے تل ابیب کو ضرور آگاہ کرو گی... اور وہاں سے مجھے تمہارے متعلق تمام تفصیلات کا علم ہو سکتا ہے!"

اس خاندانِ بہادر کی داستانِ مسلسل جس کے دشمن زمین و آسمان تھے
کُندن
۲۲ جلدوں پر مشتمل
ایم اے راحت
ہزاروں قارئین کی پسندیدہ تحریر
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
(زیرِ طبع)
مکمل کہانی دو جلدوں پر مشتمل
زندگی کے فریب کے شکار ایک نوجوان کی داستانِ الم جس کے چاروں طرف موت رقصاں تھی۔ ہر طرف خون رنگ آنکھیں اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زمین اس پر تنگ کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سے پڑنے والی ٹھوکروں نے اسے فولاد بنا دیا۔ پھر اس فولاد کی کاٹ نے دنیا کی نیند حرام کر دی۔
کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ ۴۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے اخبار یا قریبی بک اسٹال سے طلب کریں۔
گل قریش پبلیکیشنز اینڈ لائبریری
11 مزنگ روڈ لاہور
فون: 7248509- 7220762

میں نے اس کی بات سن کر طویل سانس لیا۔ وہ یقیناً انتہائی چالاک شخص تھا اور غیر معمولی ذہین بھی! وہ کسی طور زیرِ دام آنے پر آمادہ نہیں تھا، پھر بھی میں نے ایک کوشش اور کی۔ میں بے حد جذباتی لہجے میں بولا: "تم ٹھیک کہتے ہو مگر۔۔۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک بار صرف ایک ہی بار مل سکیں؟ تم ہی نے تو لکھا تھا کہ ہم آج ہی شب مل کر پچھلی رفاقتوں کی یاد تازہ کر سکیں گے!"

"فی الحال اسے بھول جاؤ لیزا! اور پہلی فرصت میں یہ ہوٹل چھوڑ دو!" اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ تیمری ناش نے امریکہ کے لیے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ اگر وہ اتنا ہی چالاک ہوشیار اور چوکنا نہ ہوتا تو شاید کبھی کا مارا جا چکا تھا۔ اسے امریکی ایجنٹوں میں جو مرتبہ حاصل تھا، وہ یوں ہی تو نہیں تھا۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب لیزا کے ذریعے اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ تیمری ناش ایسے شخص کے لیے یہ سراغ لگا لینا مشکل نہیں تھا کہ لیزا اور دوسرے اسرائیلی ایجنٹ گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ حالات کا تجزیہ کرنے کا مطلب یہی ہوتا کہ اُسے سب کچھ معلوم ہو جاتا، لیکن اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ اگر اُسے یہ سب کچھ معلوم بھی ہو جاتا تو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہاں وہ مزید اس الجھن میں مبتلا ہو جاتا کہ جب لیزا ایک شب پہلے ہی گرفتار ہو چکی تھی تو فون پر اس سے کس نے بات کی اور یہ کہ اس کا خط تھوڑی دیر پہلے کس نے لے لیا۔

اب لیزا کے کمرے میں میرا مزید رکنا لاحاصل تھا۔ میرے قدم اسی لیے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی دن کا اُجالا پھیلنے میں دیر تھی۔ میں اس سے پہلے پہلے کم از کم کچھ کام نمٹا لینا چاہتا تھا۔ مجھے ابھی یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ تیمری ناش وہاں آیا بھی تھا یا نہیں! اسی لیے میں نے ساتویں منزل کا رُخ کیا۔ پھر انکوائری کاؤنٹر پہ بیٹھے ہوئے کلرک کا ذہن پڑھ کر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ تقریباً ایک گھنٹے قبل کوئی مقامی شخص، ہوٹل کے منیجر کی تلاش میں وہاں آیا تھا۔ کلرک نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ منیجر اس وقت ہوٹل میں نہیں ہے۔ اس پر مقامی شخص نے استفسار کیا تھا کہ منیجر کہاں مل سکتا ہے؟ جب کلرک نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا تو بیس گنی کے ایک نوٹ سے سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ کلرک نے اس مقامی شخص کو منیجر کی گرفتاری کے بارے میں تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتا دیا تھا۔ کلرک سے منیجر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے والا وہ مقامی شخص ظاہر ہے کہ تیمری ناش کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ میک اپ میں ہو گا۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ تیمری ناش وہاں آیا تھا، میں پھر وہاں نہیں رُکا۔ اس نو منزلہ عمارت سے نکل کر میں نے قصر السینی کا قصد کیا۔ اب میں میریڈین ہوٹل میں پہنچنا چاہتا تھا، مجھے وہاں سے اپنا سامان سمیٹ کر روانہ ہو جانا تھا۔ میں نے درمیان تک کرا اپنے چہرے پر کوئی نیا میک اپ کرنے کے خیال کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ وہ جگہ بہرحال میرے دشمنوں کی نظر میں آ چکی تھی۔ اگر وہاں میک اپ کا سامان نہ ہوتا تو میں اُدھر کا رُخ ہی نہ کرتا، کیونکہ نیا سامان خریدنے کے لیے مجھے صبح ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔

اب تک میرا وجود نادیدہ ہی تھا اور میں نے ایسا دانستہ کیا تھا۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس خطرناک لڑکی نے مجھے انتہائی چوکنا رہنے پر مجبور کر دیا تھا، یہی سبب تھا کہ میریڈین ہوٹل پہنچنے کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے یہ تصدیق کر لی کہ اندر کوئی ذی روح نہیں ہے۔ اگر کوئی اندر ہوتا تو میرے طاقتور ذہن کی لہریں اس کے ذہن سے ضرور ٹکراتیں۔ مجھے یہ علم بھی تھا کہ وہ خطرناک لڑکی میرے کمرے میں ہوئی تو بھی میں اس سے بے خبر نہ رہوں گا۔ میرے ذہن پر اس کا ردِعمل ضرور ہوتا۔ میں نے اس لڑکی کو قابو میں کرنے کے لیے جب اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا چاہا تھا تو میرے سارے جسم میں ایک برقی سی لہر دوڑ گئی تھی اور لمحے بھر کو میرے ذہن میں تاریکی سی پھیل گئی تھی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب وہ کار میں بیٹھ کر فرار ہو رہی تھی اور میں اس پر قابو پانا چاہتا تھا۔ اگر اس وقت بھی وہ میرے کمرے میں موجود ہوتی تو یہی ہوتا اور میں چوکنا ہو جاتا، مگر میرے اندیشے غلط ثابت ہوئے، کمرا خالی ہی تھا۔ میں اس کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر تاریکی تھی لیکن میں نے روشنی نہیں کی۔ مجھے وہاں رکنا بھی کتنی دیر تھا۔ جو تھوڑا بہت سامان تھا، وہ اٹیچی ہی میں تھا۔ مجھے بس اٹیچی اٹھا کر وہاں سے چل دینا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا! مسہری پر ایک لفافہ پڑا ہوا دیکھ کر میرے قدم الماری کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئے۔

میں نے تیزی سے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھا لیا۔ اس پر نمایاں الفاظ میں "ابوالہول" لکھا ہوا تھا جسے اندھیرا ہونے کے باوجود میں واضح طور پر پڑھ رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی لفافہ کھول کر اس کے اندر سے خط نکال لیا اور پڑھنے لگا: "ابوالہول! مجھے یقین ہے کہ اب تک تمہاری

بصارت بحال ہو گئی ہو گی۔ وقتی طور پر تمہیں اس سے جو پریشانی ہوئی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا، تم سے بچنے کا! مجھے یہ علم نہیں تھا کہ تم مجھ سے اتنے افسردہ ہو جاؤ گے کہ یہاں کا رُخ ہی نہیں کرو گے۔ میں کافی دیر یہاں تمہارا انتظار کر کے جا رہی ہوں لیکن اب بھی کم از کم پانچ فیصد مجھے یہ امید ہے کہ تم یہاں لوٹ کر ضرور آؤ گے۔ اسی توقع پر تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ تمہیں شاید اس پر یقین نہ آئے کہ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں، اتنی۔۔۔ کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری ہی طرح میں بھی ایک غیر معمولی لڑکی ہوں جس کا اندازہ اب تک تمہیں ہو گیا ہو گا۔ سوچو ابوالہول کہ تمہارے اور میرے ملاپ سے جو نئی نسل جنم لے گی، وہ کس قدر خطرناک ذہانت کی مالک ہو گی۔ یہ میرا خواب ہے جس کی تکمیل کے لیے مجھے اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے خود پر اور اپنی محبت پر کہ میں تمہیں ایک نہ ایک دن حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گی۔ ممکن ہے کہ کچھ دن تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہیں ایک بار کھو کر دوبارہ پا لینا مشکل ہے! یقیناً یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں کون ہوں۔ تم مجھے پہچان ہی گئے ہو گے۔

صرف اور صرف تمہاری، ایک بے نام محبوبہ"

میں اب تک اپنے جن دشمنوں سے نبرد آزما ہوتا رہا تھا، یہ لڑکی ان سب سے مختلف تھی، مختلف بھی اور غیر معمولی بھی! اس نے اپنے متعلق یہ کچھ بھی نہیں لکھا تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے اور نہ یہ کہ میں خود کو اس کے حوالے کر دوں۔ اس نے ایک عجیب سی بات لکھی تھی اور میرے حصول کا مقصد کچھ اور ہی بتایا تھا۔ میں نے ایک بار اس کا خط پڑھا پھر اسے پھاڑ دیا۔ اس نے خود ہی مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا تھا اور پھر خود ہی میری بے نام محبوبہ بن گئی تھی۔ یہ سوچ کر جانے کیوں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں سوچا کیا اسے میری اصل عمر کا علم ہو گا؟ یقیناً ہو گا! میرے ذہن نے جواب دیا تو گویا ایک سالہ بچے کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے۔ غالباً اسی خیال نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میرے بارے میں باقی دو بڑی طاقتوں کے سوا کسی کو کچھ علم ہو۔ وہ لڑکی انہی میں سے کسی ایک کی آلۂ کار تھی۔ اس نے اپنی اصل شخصیت پر پردہ ڈالنے کے لیے محبت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔

پھر میں نے چند لمحے رک کر ایک فیصلہ کیا اور اٹیچی لیے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اسی منزل پر دو کمرے اور خالی ہیں۔ حالات ہی کچھ ایسے پیش آ رہے تھے کہ میں قدم قدم پر اپنی پُراسرار قوتوں کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ میں لوٹ کر پھر اپنے کمرے میں آیا اور اس بار جب باہر نکلا تو میرے ساتھ اٹیچی بھی تھی۔ دونوں خالی کمروں میں سے ایک کا قفل کھول کر میں اندر پہنچ گیا۔ اس طرح وقت بھی بچ گیا تھا اور بے سبب بھاگ دوڑ بھی نہیں کرنا پڑی تھی۔ دوسری صورت میں مجھے اپنے چہرے پر نیا میک اپ کرنے کے لیے وہاں سے نکل کر کسی اور ہوٹل میں کوئی کمرا حاصل کرنا پڑتا اور پھر وہاں سے بھی میں کسی اور ہوٹل کا رُخ کرتا۔ میں ان سب چکروں سے بچ گیا تھا۔

میں نے اس کمرے کی بتی بھی نہیں جلائی اور جلدی جلدی پچھلا میک اپ ختم کر کے نیا میک اپ کرنے لگا۔ یہ میک اپ میں نے اپنی موجودہ عمر کو مدِنظر رکھ کر کیا تھا۔ میں جو میک اپ کرتا تھا وہ معمولی نہیں ہوتا تھا۔ اس میں کافی وقت لگتا تھا۔ جب تک ایک خاص قسم کے محلول سے چہرہ نہ دھو لیا جاتا، وہ میک اپ ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اسی لیے میریڈین ہوٹل سے نکلتے نکلتے صبح کے چھ بج گئے مگر اب میں مطمئن تھا۔

میں چاہتا تو نئی حیثیت اور نئے نام سے میریڈین ہوٹل ہی میں کوئی اور کمرا لے سکتا تھا، لیکن احتیاط کے پیشِ نظر ایسا نہیں کیا۔ اب میرا وجود بھی نادیدہ نہیں رہا تھا۔ اب وقتی طور پر میرا ارادہ ہوٹل ہلٹن میں سکونت کا تھا۔ میں کچھ وقت وہاں سکون و اطمینان سے گزارنے کے لیے اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں غور و خوض کرنا چاہتا تھا۔ اس ہوٹل میں قیام کرنے والے زیادہ تر غیر ملکی ہوتے تھے۔ میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام اشم لکھوایا تو کاؤنٹر کلرک نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اشم مصری زبان میں اونچی ناک والے کو کہتے ہیں اور اس کے معنی پیشوا کے بھی ہیں۔ یہ نام یقیناً منفرد اور اچھوتا تھا مگر جانے کیوں عربوں میں یہ نام زیادہ مستعمل نہیں۔ مجھے کلرک نے اسی لیے مسکرا کر دیکھا تھا، پھر اتنے خوبصورت اور منفرد نام پر تعریف بھی کی تھی۔ خود کو میں نے صعید کا باشندہ ظاہر کیا تھا۔ صعید بالائی مصر کا علاقہ ہے، اسی مناسبت سے یہ نام رکھا گیا ہے۔ صعید کے معنی اوپر چڑھنا ہیں۔ مصر کے اس علاقے میں قدیم اور کٹر مذہبی لوگ آباد ہیں۔

"آپ صعید سے آئے ہیں اور آپ کا نام اشم ہے، یہ بات بہت

غاصب یہودیوں سے ہر محاذ پر برسرِ پیکار
سرفروشوں کی لہو رنگ داستان
جانباز
تحریر
ایم اے راحت
مکمل کہانی 2 جلدوں پر مشتمل
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
جانباز
سازشوں اور اسلام دشمن کاوشوں کے
انکشاف سے پر ایک انوکھی دستاویز
تل ابیب سے تربیت یافتہ
موساد کے بھیانک روپ
(زیرِ طبع)
کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ 45 روپے محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔
علی قریش پبلیکیشنز اینڈ لائبریری
11 لاہور
فون: 7248599- 7229762

دلچسپ ہے۔" کلارک بولا۔ وہ یقیناً خوش مزاج آدمی تھا۔
"ہاں۔" میں آہستہ سے ہنس دیا۔ مجھ دونوں ہی سے بلند کا انتظار ہوتا ہے۔"

مجھے ہوٹل ہلٹن کی تیسری منزل پر کمرا مل گیا۔ میں نے تر و تازہ ہونے کے لیے غسل کیا اور پھر ناشتا منگوا لیا۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ ویٹر نے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔ میری اجازت پا کر وہ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کئی عربی اور انگریزی اخبارات تھے جو وہ میرے اشارے پر مسہری کی پائنتی رکھ کر چلا گیا۔ خبروں سے مجھے کوئی خاص دلچسپی تو نہیں تھی مگر پھر بھی مسہری پر نیم دراز ہو کر میں نے "اہرام" اٹھا لیا۔ اس زمانے میں مشہور مصری صحافی حسنین ہیکل اس اخبار کے مدیر تھے۔ اخبار پر ایک نظر ڈالنے کا سبب لیزا اور دوسرے اسرائیلی ایجنٹ تھے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کی گرفتاری کے متعلق اب بھی اخبار میں کوئی خبر آئی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ روز تحریر اسکوائر پر مجھے جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی خبر بھی ہونا چاہیے تھی۔ وہ واقعہ یقیناً بڑا سنسنی خیز تھا لیکن دن دہاڑے، ایک پُر رونق علاقے سے، وہ بھی سرِ شام کسی نوجوان کا اغوا بہرحال کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اخبارات کے لیے غیر اہم نہیں تھی کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔

پھر میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ پہلے صفحے پر ہی وہ خبر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔ خبر کے ساتھ ہی ہارون اور احمد سلطان کی تصاویر بھی تھیں۔ اس تین کالمی خبر میں احمد سلطان کا بیان بھی تھا۔ بیان میں احمد سلطان نے ان ٹیلی فون کالوں کا بھی ذکر کیا تھا جو گزشتہ دن اور پھر شام، ہارون کو کی گئی تھیں۔ احمد سلطان نے ہارون کے اغوا کا الزام اسی گمنام شخص پر لگایا تھا جس نے دو بار فون کیا تھا۔ اس میں ہارون کے متعلق پوری تفصیل موجود تھی کہ وہ چھ ماہ غائب رہنے کے بعد بس اچانک ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ خبر کے مطابق قاہرہ پولیس تن دہی سے مجرموں کی تلاش میں تھی۔ خبر پڑھ کر میں نے احمد سلطان کی تصویر پر پھر ایک نظر ڈالی۔ وہ اس کی تازہ تصویر تھی جو غالباً انھی کے فوٹو گرافر نے کھینچی تھی۔ تصویر میں وہ انتہائی مغموم نظر آ رہا تھا جیسے ابھی رو دے گا۔ میرا دل بھی اس کی تصویر دیکھ کر اداس ہو گیا۔ میں نے طویل سانس لیا اور تصویر سے نظر ہٹا لی۔ میں اپنی توجہ منتقل کرنے کے لیے دوسری خبروں پر نظر ڈالنے لگا۔ پھر اسی صفحے پر شائع ہونے والی ایک تصویر پر جیسے میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ میں نے غور سے

دیکھا، دوبارہ اس تصویر کو دیکھا۔ وہ نہ فریبِ نظر تھا نہ میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا کہ شاید پہلے کبھی نہ دھڑکا ہوگا۔ وہ چہرہ میں ہزاروں لاکھوں چہروں کے درمیان پہچان سکتا تھا کیونکہ وہ میری ماں کا چہرہ تھا۔ اس چہرے کی ایک ایک تفصیل میرے ذہن پر نقش تھی۔ تصویر میں اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اس تصویر کے ساتھ جو خبر تھی، اسے پڑھنے کے لیے مجھے بہت ہمت سے کام لینا پڑا۔ پھر جیسے میرا پورا جسم چیخ اٹھا "نہیں... یہ نہیں ہو سکتا!... کبھی نہیں!"

جانے کب تک مجھ پر شدید ہیجانی کیفیت طاری رہی اور جانے کتنی دیر میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔ پھر مجھے اس روشن عبارت کے الفاظ یاد آئے جو گزشتہ شب ہی میرے ذہن پر ابھرے تھے۔ وہ جو ب الخالق تھا اور جس نے میرے وجود کو تقریباً ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا، اسی نے اس روشن عبارت کے ذریعے اپنے ایک خدشے کا اظہار کیا تھا۔ مجھے ایک ایک لفظ یاد تھا: "سن کہ جب تنگ آ جاتے ہیں لوگ تو ان میں انتقام جاگ اٹھتا ہے، سو تو اس دن سے بچ! وہ جو ساری دنیا میں تیرے پیچھے بھٹکتے پھر رہے ہیں اور تیرے حصول کی خاطر اب تک بہت سے قیمتی افراد کو ہلاک کرا چکے ہیں، انھیں بھی تجھ پر غصہ آ سکتا ہے۔ تجھے خبر ہو ہی چکی ہے کہ تیری ماں امریکیوں کے قبضے میں ہے، اور تیرا بھائی روسیوں کی قید میں ہے۔ تجھے شاید علم نہ ہوگا کہ تیرا باپ کہاں ہے؟ تو مجھ سے سن! میں بتاتا ہوں تجھ کو کہ اسے چینیوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ میں ڈرتا ہوں اس دن سے جب ان میں سے کسی کو قتل کر دیا جائے..."

"تو پھر کیا انتقام کا وقت آ گیا؟" میں بے خیالی میں بڑبڑانے لگا۔ "اگر ایسا ہے تو... تو پھر وہ بھی... وہ بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے!" یہ بڑبڑاتے ہوئے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "میں تباہی پھیلا دوں گا۔ انھیں اپنے ایجنٹ کی اس حماقت کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی... بہت بھاری قیمت!" میرا وجود لمحہ بہ لمحہ ایک دہکتے ہوئے آتش فشاں میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے میری ماں کے قتل کی دھمکی دینے والا امریکی ایجنٹ تھورپ تھا۔ اسی نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ میں کل کے اخبارات میں اپنی ماں کے قتل کی خبر پڑھ لوں گا۔ میں نے اس کی اس دھمکی کو

غیرت کے سوداگر
تحریر
ایم اے راجہ
خاکِ وطن کا سودا کرنے والے
چہروں کی نقاب کشا داستان
ایک جلد میں مکمل
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
غیرت کے سوداگر
وطن عزیز کے حصول کے لئے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہو لہو ہوئے۔ تب عروسِ وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن ناموسِ وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔
(زیرِ طبع)
کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ 45 روپے محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔
علی قریش پبلیکیشنز اینڈ لائبریری
11 لاہور
فون: 7248599- 7229762

ور خورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اسی لیے میرے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے۔

"ایک لاوارث عورت کی لاش" خبر کے یہ الفاظ جیسے کسی تیز دھار خنجر کی طرح میرے سینے میں اتر گئے تھے۔

"وہ لاوارث نہیں! اس کا وارث ابھی زندہ ہے۔ تم سے ایک بھیانک انتقام لینے کے لیے!" میں پھر غصے میں بڑبڑانے لگا۔ "اس کا وارث میں ہوں... میں!" میں طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ خبر بہت اندوہناک تھی۔ اس کی لاش نہایت خراب حالت میں پرانے قاہرہ کے ایک محلے حبابیہ کی ایک سڑک پر پائی گئی تھی۔ اُسے خنجر مار کر بے دردی سے ہلاک کیا گیا تھا۔ لاش کی ظاہری حالت دیکھ کر قیاس لگایا گیا تھا کہ اسے قتل کرنے سے پہلے بے آبرو بھی کیا گیا ہے۔ اس قیاس آرائی نے میری روح میں اور بھی نشتر چبھو دیے تھے۔ لاش نصف شب کے بعد وہاں پائی گئی تھی۔ لاش دریافت کرنے والا ایک راہ گیر تھا جو اتفاقاً وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس وقت تک وہ زندہ ہی تھی لیکن اس قابل بہرحال نہیں تھی کہ اپنے قاتلوں کی نشاندہی کر سکتی۔ وہ کچھ بھی نہ بتا سکی تھی اور کوئی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اُس نے دم توڑ دیا تھا۔ اُس کے سینے پر زخموں کے کئی نشانات تھے جس کا مطلب تھا کہ اس پر کئی قاتلانہ وار کیے گئے تھے۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر وہاں رہنے والوں سے پوچھ گچھ کی تھی، مگر کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی لاش کو شناخت نہیں کیا جا سکا تھا۔ پولیس نے اسی لیے اسے لاوارث قرار دے کر سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا جہاں اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔

اخبار میں جس اسپتال کا نام درج تھا وہ قاہرہ کا قدیم اسپتال سمجھا جاتا تھا۔ یہ اسپتال اب بھی قصر العینی کے علاقے میں ہے۔ اسپتال کے بارے میں پوری تفصیل اور پتا غالباً اس لیے شائع کیا گیا تھا کہ تصویر دیکھ کر اگر اُسے کوئی شناخت کر لے تو پولیس کو مطلع کر دے اور اس کی لاش بھی چاہے تو حاصل کر لے جبکہ آدمی شدید غصے اور جوش میں ہوتا ہے تو ضمنی باتوں پر زیادہ غور نہیں کرتا حالانکہ بعض حالات میں یہ باتیں بہت اہم ہوتی ہیں۔ میں نے اسی لیے یہ نہیں سوچا تھا کہ اسپتال والے اس وقت تک لاش میرے حوالے نہیں کریں گے جب تک میں یہ ثبوت فراہم نہیں کر دوں گا کہ واقعی میں اس کا بیٹا ہوں۔ میں تو بس ایک طیش کے عالم میں اسپتال روانہ ہو گیا تھا۔ اپنی ماں کو زمین کی آغوش میں خود میں اپنے ہاتھوں سے سلانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی آغوش نصیب نہیں ہو سکی تھی اور نہ اس کی توقع رہی تھی، مگر میری رگوں میں تو اُس کا لہو گردش کر رہا تھا۔ اسی لہو کا یہ تقاضا تھا کہ میں اسے ایک لاوارث عورت کی حیثیت سے دفن نہ ہونے دوں۔ میں ہر قیمت پر اس کی لاش حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

جوش ہی کے عالم میں میں ہوٹل ہلٹن کی عمارت سے نکل کر پیدل ہی قصر العینی کی طرف روانہ ہو گیا، مگر کچھ دور ہی چل کر جب میری نظر ایک ٹیکسی پر پڑی تو جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے فوراً ہی وہ خالی ٹیکسی روک لی۔ مجھے یاد نہیں کہ ٹیکسی والے نے کتنا کرایہ طلب کیا تھا۔ میں تو فوراً ہی بول اُٹھا تھا: "ٹھیک ہے، جلدی چلو!"

یقیناً ٹیکسی والے نے زیادہ کرایہ ہی بتایا ہوگا اور اُسے مجھ سے سودے بازی کی توقع ہوگی۔ غالباً اسی لیے اس نے مجھے مُڑ کر پہلے حیرت سے دیکھا تھا پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی تھی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجنے والے تھے جب ٹیکسی اسپتال کی عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔ یہ وقت زیادہ بھیڑ بھاڑ کا نہیں تھا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس تین منزلہ اسپتال کی پہلی منزل پر مُردہ خانہ ہے۔ میں اس بات سے ناواقف تھا کہ لاش حاصل کرنے کے لیے مجھے کن مراحل سے گزرنا ہوگا اور کیا ضروری خانہ پُری کرنا ہوگی۔ انکوائری سے مُردہ خانے کے بارے میں معلوم کر کے میں تو سیدھا اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مجھے اس وقت اپنے ارد گرد کی خبر تھی نہ کسی اور بات کا ہوش تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے ان دو افراد پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جو میرے ساتھ ساتھ ہی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ وہ دونوں انکوائری سے میرے ساتھ ہو لیے تھے۔ بس سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو سامنے ہی راہداری میں دو افراد نظر آئے۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ میں چونک اٹھا۔ ان دونوں میں ایک یقیناً میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے گزشتہ دن دیکھا تھا۔ یہ وہی مقامی امریکی ایجنٹ تھا جسے تھری ناٹ نے ہارون کے اغوا پر مامور کیا تھا۔ اس مقامی امریکی ایجنٹ نے ایک مشہور جرائم پیشہ شخص دالعفی سے رابطہ قائم کر کے ہارون کے اغوا کا منصوبہ

کیا تھا۔ میں اُسے فوراً اس لیے بھی پہچان گیا کہ گزشتہ روز کی طرح اس وقت بھی وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ بات بھی مجھ سے چھپی نہ رہ سکی تھی کہ وہ دونوں بھی چونکے تھے مگر غالباً ان کے چونک اُٹھنے کا سبب میں نہیں، میرے ساتھ ساتھ چلنے والے تھے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ میرے پیچھے پیچھے چلنے والوں نے سامنے سے آنے والوں کو کوئی اشارہ کیا تھا۔ یہی اشارہ سامنے سے آنے والوں کے لیے چونک اٹھنے کا سبب بنا تھا۔ ہاں، اُس مقامی امریکی ایجنٹ کو دیکھتے ہی میں نے خطرے کی بُو محسوس کر لی تھی۔

راہداری کافی طویل تھی اور وہ دونوں ابھی کچھ فاصلے پر تھے۔ ان کا انداز بہت تیزی کا سا تھا۔ میں نے بھی اپنی رفتار کم کر دی اور اسی کے ساتھ سب سے پہلے شناسا مقامی امریکی ایجنٹ کے ذہن کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اس کا ذہن اس وقت ہیجان کا شکار تھا اور اس ہیجان کا سبب میرا وجود تھا۔ وہ دونوں بھی اسی کے ساتھی تھے جو پیچھے سے میرے ساتھ ساتھ آئے تھے۔ انھی دونوں نے اُسے میرے بارے میں اشارہ کیا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن "ابوالہول، ابوالہول" کی گردان کر رہا تھا اور وہ خوفزدہ بھی تھا۔ یقیناً تھری ناٹ سے اسے میرے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اس کے خوف کا سبب وہی معلومات تھیں۔ میں نے اس کے ذہن کو کریدا تو اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ تھری ناٹ نے نہ صرف اُسے بلکہ تمام ہی امریکی ایجنٹوں کو میرے متعلق مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں تاکہ وہ دھوکے میں نہ مارے جائیں حالانکہ گزشتہ روز تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے گزشتہ دن تھری ناٹ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کے ذہن کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔

پھر اس مقامی امریکی ایجنٹ اور اس کے تینوں ساتھیوں کے ذہن پڑھ کر جیسے میری روح سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا۔ تھری ناٹ کی سازش پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی۔ یہ سازش یقیناً کامیاب ہو جاتی، اگر میں اس نیلے سوٹ والے کو نہ پہچان لیتا۔ تھری ناٹ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ آیا ہوگا کہ میں اس کے کسی ساتھی کو پہچان سکتا ہوں ورنہ وہ کوئی دوسری راہ اختیار کرتا۔ تھری ناٹ خود سامنے آنے کی بجائے اپنے مہروں کو آگے بڑھا دیتا تھا۔ اس کا یہی طریقہ کار دوسرے ایجنٹوں سے مختلف تھا۔ وہ خود چھپا ہوا انھیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتا رہتا تھا۔ اگر اُس کا یہ طریقہ کار نہ ہوتا اور اس وقت وہ خود وہاں اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود ہوتا تو مجھ سے بچنا محال تھا۔ میں اُسے زندہ نہ چھوڑتا۔ اتنا محتاط اور چالاک شخص پہلے میری نگاہ سے نہیں گزرا تھا۔ وہ شاید اپنے سوا کسی پر اعتماد کا قائل نہیں تھا اسی لیے خود اس کے ساتھی بے خبر ہوتے تھے کہ وہ کب کہاں ہوگا یا یہ کہ وہ کہاں قیام پذیر ہے۔ جب ضرورت ہوتی تھی وہ خود اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کر کے انھیں احکام دے دیتا تھا اور خود ہی مطلوبہ جواب حاصل کر لیتا تھا۔ اس کے ساتھی خود اس سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔

تھری ناٹ نے مجھے پھانسنے کے لیے خود پس پردہ رہ کر جو منصوبہ تشکیل دیا تھا وہ یقیناً اس کی ذہانت کا ثبوت تھا۔ اس نے بالکل صحیح اندازے قائم کیے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ خود مجھ سے اور میرے حملوں سے پوری طرح محفوظ تھا۔ گزشتہ دن کی ناکامی کے بعد اتنی جلدی کسی اور طرح وہ میرا سُراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ گزشتہ دن سے اب تک اپنی غیر معمولی ذہانت کے سبب وہ تین بار موت کے منہ سے بچا تھا کیونکہ میرے سامنے آ جانے کے بعد اس کا بچنا محال ہی ہوتا۔ ایک بار تو وہ اس وقت میرے حملے سے بچ گیا تھا جب میریڈین ہوٹل کے باہر وقت پر پہنچنے کی بجائے اس نے صرف پیغام بھیجنے پر اکتفا کیا تھا۔ دوسری مرتبہ گزشتہ رات کہ جب اُسے لیزا سے ملنے ہوٹل موشانا آنا تھا، اُس کی زندگی بچ گئی تھی۔ تیسرا موقع یہ تھا کہ وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا مگر اُس وقت بھی وہ دامن بچا گیا تھا۔ اس کے چاروں ساتھی اس کے حکم پر اسپتال پہنچے تھے لیکن انھیں یہ علم نہیں تھا کہ منصوبے کی کامیابی کے بعد تھری ناٹ کب اور کہاں ان سے رابطہ قائم کرے گا یا یہ کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔

مجھے چند ہی لمحوں میں تھری ناٹ کے پورے منصوبے کا علم ہو گیا تھا اور پھر میں نے تھری ناٹ کے خلاف جوابی اقدام میں دیر نہیں کی تھی۔ اس طرح وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں آسانی سے پھنس سکتا تھا۔ اس وقت تھری ناٹ سے نمٹنے کے لیے میرے ذہن میں جو انوکھا خیال آیا تھا، اگر کل ہی یہ خیال آ جاتا تو شاید وہ اب تک اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوتا۔

سامنے سے آنے والے اب بہت قریب آ گئے تھے اور پہلے کی نسبت انھوں نے اپنے خوف پر بھی کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔

"تم جو چاہتے ہو وہی ہوگا تھری ناٹ!" میں نے اپنے دل میں کہا، لیکن اب اس میں میری مرضی بھی شامل ہو گی حقیقتاً حالات اب اس طرح پیش آئیں گے جس طرح میں چاہوں گا مگر تم یہی سمجھو گے کہ تمھارا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی میں نے ان چاروں کے ذہن کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اب وہ میرا ہر حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اپنی جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکالی، پھر رومال۔ اس کے بعد اس نے شیشی کی ڈاٹ کھولے بغیر اُسے رومال پر اوندھا دیا۔ پھر وہ شیشی اُس نے فرش پر پھینک کر رومال کو تیزی کے ساتھ میری ناک پر رکھ دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے نہایت اناڑی پن کا ثبوت دیا تھا مگر وہ اور اس کے ساتھی یہی سمجھتے تھے کہ اس نے بہت پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ رومال ناک پر رکھتے ہی اس کے تینوں ساتھی جھپٹ کر قریب آ گئے تھے اور انھوں نے اپنی دانست میں میرے گرتے ہوئے جسم کو سنبھال لیا تھا۔

"اس کا جسم ڈھیلا ہو گیا ہے، رومال ہٹا لو ناک پر سے!" ایک آواز آئی اور اس کے ساتھ میری ناک سے وہ رومال ہٹا لیا گیا جس میں کلوروفارم کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اس کا احساس نہیں کر سکا تھا کہ رومال سادہ ہے۔ میں نے پلکوں کی جھری سے دیکھا کہ رومال بھی وہیں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

"جلدی کرو، اسے اٹھا کر نیچے وین تک لے چلنا ہے۔" پہلی آواز پھر سنائی دی۔ یہ اسی نیلے سوٹ والے کی آواز تھی۔ پھر ان میں سے جو نسبتاً جسیم تھا، اُس نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ یوں بھی میرا جسم زیادہ بھاری نہیں تھا مگر جسم ڈھیلا ہونے کے سبب اس سے سنبھل نہیں رہا تھا۔

"کاندھے پر ڈالو اسے! اس طرح نہیں۔" نیلے سوٹ والے نے ہدایت دی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی کی مدد کرنے لگا جو اپنے جسم کو جھٹکا دے کر مجھے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب میرے دونوں ہاتھ اس شخص کی کمر پر جھول رہے تھے جو مجھے اٹھائے ہوئے تھا۔

"تھری ناٹ نے تو ہمیں اس سے ناحق اتنا ڈرا دیا تھا، اس نے تو ذرا بھی مزاحمت نہیں کی!" ان میں سے کسی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"وہ کبھی کوئی بات بے سبب نہیں کرتا!" یہ نیلے سوٹ والے کی آواز تھی۔ "اسے محض اتفاق ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ اتنی آسانی سے قابو میں آ گیا۔"

"یہ نہیں کہو گے کہ میں نے نہایت ہوشیاری اور تیزی دکھائی تھی! میں نے اُسے ذرا بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے!" یہ شخص غالباً وہی تھا جس نے نہایت بھونڈے پن سے میری ناک پر رومال رکھا تھا۔

"چپ رہو کوئی اوپر چڑھ رہا ہے۔" نیلے سوٹ والے نے اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کی تاکید کی۔ وہ سب اب سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ میں نے پلکوں کی جھری سے دیکھا کہ کوئی آنے والا کوئی ڈاکٹر تھا مگر اس پر نظر پڑنے کے باوجود وہ لوگ رکے نہیں۔ مجھے علم تھا کہ کسی ایسے موقع کے لیے ان لوگوں نے کیا سوچ رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر حیرت سے اوپر دیکھتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ پھر قریب پہنچ کر وہ رک ہی گیا اور ان لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "کیا ہوا اسے؟"

"اسے بے ہوشی کے دورے پڑتے ہیں جناب!" نیلے سوٹ والے نے ڈاکٹر کی بات کا جواب دیا۔

"وجہ؟"

"وجہ آج تک کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ ویسے ہمارا خیال یہ ہے کہ اس پر کسی بدروح کا سایہ ہے۔"

"کیا!" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت اور ناگواری تھی۔ "آپ لوگ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں، پھر بھی ایسی بے سروپا باتوں پر یقین رکھتے ہیں! نہایت افسوس کی بات ہے! لائیے اسے لے کر آئیے میرے ساتھ، میں اس کا معائنہ کرتا ہوں۔"

"جی نہیں شکریہ!" نیلے سوٹ والے کے لہجے میں رکھائی تھی۔ "اس طرح ہم اپنے ساتھی کو مزید جسمانی اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ دیر بعد اسے خود ہی ہوش آ جائے گا۔"

"اس میں جسمانی اذیت کی کیا بات ہے!" وہ ڈاکٹر بھی ملی اڑیل ٹٹو معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سبب شاید وہ جملہ تھا جو نیلے سوٹ والے نے ڈاکٹروں کے بارے میں کہا تھا کہ آج تک کوئی ڈاکٹر بے ہوشی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ ڈاکٹر نے غالباً اسی جملے کو اپنے لیے چیلنج سمجھ لیا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "معائنہ کرنے میں کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی مریض کو!"

"آپ سمجھے نہیں ڈاکٹر صاحب!" نیلے سوٹ والا [illegible]

انداز میں بولا۔ "اس سے وہ روح برا مان جاتی ہے اور پھر ہوش میں آنے کے بعد بہت مار لگاتی ہے، سارے جسم پر کالے نیلے داغ پڑ جاتے ہیں۔ ہم اسی لیے اب اسے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھاتے۔"

"پھر یہاں اسپتال میں کیوں جھک مارنے آئے تھے!" ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"آپ تو برا مان گئے جناب!" نیلے سوٹ والے نے نرمی سے کہا۔ "یہاں ہم اسے دکھانے نہیں آئے بلکہ اپنے ایک دوست کی عیادت کرنے آئے تھے۔ ہم لوٹ رہے تھے اسے دیکھ کر کہ..."

"بس بس تشریف لے جائیے!" ڈاکٹر، نیلے سوٹ والے کی بات کاٹ کر سختی سے بولا اور پھر ایک لمحہ بھی مزید رکے بغیر تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اس کا موڈ یقیناً خراب ہو گیا تھا۔

"جلدی چلو، کہیں کسی اور سے یہ کہانی نہ دہرانا پڑ جائے!" نیلے سوٹ والے نے مدھم آواز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی۔ پھر وین تک پہنچتے ہوئے راستے میں صرف ایک ادھیڑ عمر شخص نے میرے بارے میں ان لوگوں سے استفسار کیا۔ "کیا ہوا بھائی؟" اُس کے لہجے میں انسانی ہمدردی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا، راستہ لیں اپنا بڑے صاحب!" نیلے سوٹ والے نے درشت آواز میں کہا۔

"لو تم تو اُلٹا کھانے کو دوڑنے لگے!" وہ شخص منہ بنا کر بولا۔ "ہمیں تو ہمدردی کے ناتے..."

"نہیں چاہیے ہمیں آپ کی ہمدردی! شکریہ۔" نیلے سوٹ والا یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص وہیں بڑبڑاتا رہ گیا اور وہ مجھے لیے اسپتال کے گیٹ سے نکل آئے۔ سامنے ہی ایک وین کھڑی تھی۔ انھوں نے مجھے اس کے پچھلے حصے میں لٹا دیا۔ وہ پہلے ہی سے سارا انتظام کر کے چلے تھے۔ وین میں سیٹوں کے درمیان کپڑا بچھا ہوا تھا اور انھوں نے مجھے اسی پر لٹایا تھا۔ اس کے بعد ان میں نیلے سوٹ والا اور اس کا ایک ساتھی وین کے پچھلے حصے میں آ بیٹھے اور انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ بقیہ افراد وین کے اگلے حصے میں بیٹھ گئے تھے۔ بے ہوش ہونے کی اداکاری کے ساتھ ہی میں نے ان کے ذہنوں کو آزاد چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چند لمحے بعد ہی جب وین روانہ ہو گئی تو نیلے سوٹ والا کچھ فکرمند سے لہجے میں اپنے ساتھی سے بولا۔ "ایک غلطی ہو گئی مگر... مگر شاید تمھیں آتا ہو؟"

"کیا؟" اس کے ساتھی نے پوچھا جو اس کے قریب ہی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"انجکشن لگانا!" نیلے سوٹ والے نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔

"مجھے تو خیر نہیں آتا لیکن یہ کون سا مشکل کام ہے! تم نہیں لگا سکتے تو لاؤ میں ٹھونک دیتا ہوں۔"

"نس میں لگانا ہے، لگا لو گے؟" نیلے سوٹ والے نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "اور ذرا بھی گڑبڑ ہو گئی تو خبر ہے..." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں پلکوں کی جھری سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"نس... نس میں لگانا ہے انجکشن! یہ... یہ تو ذرا مشکل ہے۔" پھر میں نے اس سے وہ بات کہلوا دی جو کہلوانا چاہتا تھا۔ "گھبرا کیوں رہے ہو، کہہ دینا کہ لگا دیا تھا انجکشن۔"

"ہاں... ہاں یہ ٹھیک ہے مگر... مگر..."

"مگر کیا؟"

"تم تو کسی سے کچھ نہیں کہو گے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!" نیلے سوٹ والے کے ساتھی نے یقین دلایا۔

"تو پھر احتیاطاً اس انجکشن ہی کی شیشی کو پھینک دیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے ایک ڈبیا نکال لی۔

"ہاں بالکل پھینک دو۔" دوسرے نے اس کی تائید کی۔

"لیکن ٹھہرو، جب جھوٹ ہی بولنا ہے تو کوئی کسر ہی کیوں چھوڑی جائے۔"

نیلے سوٹ والا اب جو کچھ کرنے والا تھا، وہ میں نے اس کے ذہن میں ڈالا تھا۔ تھری ناٹ ایسے ذہین شخص سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ سرنج کا معائنہ بھی کر لیتا۔ ایسی صورت میں اس کا جھوٹ کھل جاتا، پھر تھری ناٹ چوکنا ہو جاتا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ نیلے سوٹ والے نے شیشی کا محلول، سرنج میں بھرا اور پھر میری کلائی پر بھی اس کے دو قطرے ٹپکا دیے۔ اس کے بعد اس نے سرنج میں بھرا ہوا سارا محلول وین کے ایک کونے میں خالی کر دیا۔ وہ ایسے اپنے ذہن کی سطح سمجھ رہا تھا، سرنج خالی

کر کے اس نے اسے دوبارہ ڈبیا میں رکھا اور جیب میں ڈال لیا۔ خالی شیشی اس نے وین سے باہر پھینک دی تھی۔

مجھے ان لوگوں کی منزل کا علم تھا۔ ان کی منزل پرانے قاہرہ کی وہی آبادی تھی جہاں کی سڑک پر لاش پائی گئی تھی۔ وہ بھی انہی لوگوں کا کارنامہ تھا۔ اس غریب بھکارن کو وہ تھری ناٹ کا حکم ملتے ہی اغوا کر لائے تھے۔ پھر تھری ناٹ نے انھیں جو تصویر بھیجی تھی، بھکارن کے چہرے پر ہوبہو ویسا ہی میک اپ کر دیا گیا تھا۔ بھکارن کو کافی رقم دے کر انھوں نے رام کیا تھا کہ وہ کسی بات پر اعتراض نہ کرے۔ وہ بھکارن بدقسمتی سے جوان اور قبول صورت تھی اس لیے ان کی نیت خراب ہو گئی۔ قتل کرنے سے پہلے انھوں نے اس بھکارن کو اپنی ہوس کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ وہ غریب یوں بھی کب باعصمت رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا، لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات بھی ثابت ہو گی۔ نصف شب کے قریب ہی وہ اس بھکارن کو بے دردی سے اپنی دانست میں لب دم چھوڑ کر عباسیہ ہی کی ایک سڑک پر پھینک آئے تھے۔ اس بھکارن پر قاتلانہ اور مجرمانہ حملوں سے پہلے انھوں نے اُسے لباس بھی دوسرا پہنا دیا تھا کیونکہ اس بھکارن کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ اس بھکارن کے چہرے پر میری ماں کا میک اپ کرنے کا مقصد مجھے دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر بعد میں یہ راز کھل بھی جاتا کہ مقتولہ کے چہرے پر کسی اور کا میک اپ تھا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔

تھری ناٹ کو یقین ہو گا کہ میں اخبار میں اپنی ماں کی تصویر دیکھتے ہی بے قابو ہو کر بغیر کچھ سوچے سمجھے اسپتال کی طرف دوڑ پڑوں گا اور یہی ہوا بھی تھا۔ اس نے اسی لیے وہاں علی الصبح اپنے آدمی بھیج دیے تھے۔ ان لوگوں کو میری پہچان بھی بتا دی گئی تھی۔ ان میں سے دو کی ڈیوٹی انکوائری کاؤنٹر پر تھی اور دو کی پہلی منزل کی اس راہداری میں جو مردہ خانے کی طرف جاتی تھی۔ جب میں نے انکوائری کاؤنٹر پر مردہ خانے کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ دونوں میرے قریب آ گئے تھے اور میرے جسم کی مخصوص خوشبو کو محسوس کر لیا تھا۔ مجھے قابو میں کرنے کے لیے انھوں نے پہلے ہی سے پہلی منزل کی راہداری کا انتخاب کر لیا تھا کیونکہ وہاں ان کے بقیہ دو ساتھی بھی موجود تھے پھر جو کچھ ہوا تھا وہ اُن کے خیال و توقع کے مطابق ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی دانست میں بغیر کسی ہنگامے کے مجھ پر قابو پا لیا تھا حالانکہ وہ کسی ہنگامے کے لیے بھی پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ چاروں ہی مسلح تھے۔ ان کے پاس ریوالوروں کے علاوہ اور بھی جدید اسلحہ تھا۔ اُن کے پاس بے ہوش کر دینے والی گیس کے چھوٹے چھوٹے بم بھی تھے اور دستی بم بھی! اُن کے کوٹوں کی جیبیں بے سبب پھولی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ تھری ناٹ کی طرح انتہائی چالاک اور غیر معمولی ذہین تو نہیں تھے، لیکن بہرحال تھے خطرناک! اگر اُن میں صلاحیتیں نہ ہوتیں تو وہ مرکزی ایجنٹ ہی نہ بنائے جاتے۔ وہ اوسط ذہانت کے مالک کہے جا سکتے تھے مگر مجھ ایسے کسی وجود کو دھوکا دینا یا قابو پا لینا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ غالباً اس بات کو تھری ناٹ نے بھی فراموش نہیں کیا ہو گا، لیکن میری ماں کے قتل کا سوانگ رچا کر اس نے مجھے جس ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے کامیابی کے امکانات سو فی صد تھے۔ جذباتی ہیجان کا شکار ہو جانے کے بعد اعلیٰ سے اعلیٰ ذہانت رکھنے والا شخص دھوکا کھا جاتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تھری ناٹ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ جوش کے عالم میں مجھے واقعی ہوش نہیں رہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ تھری ناٹ نے اس منصوبے میں نیلے سوٹ والے کو بھی شامل کر لیا تھا ورنہ میں دھوکا کھا ہی جاتا۔

وین کی رفتار خاصی تھی اس لیے وہ لوگ قاہرہ سے پرانے قاہرہ تقریباً بیس منٹ میں ہی پہنچ گئے۔ عباسیہ کا شمار پرانے قاہرہ کے علاقوں میں ہوتا تھا۔ یہاں زیادہ تر متوسط طبقے کے افراد کی آبادی تھی۔ عمارتیں بھی پرانے طرز کی تھیں۔ جب وین رکی اور انھوں نے مجھے اس سے اُتارا تو میں نے خود کو پرانی طرز ہی کی ایک عمارت کے احاطے میں پایا۔ وہ عمارت دو منزلہ تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر عمارت میں داخل ہو گئے۔ ایک ہال سے گزر کر وہ ایک نیم تاریک سے کمرے میں پہنچے، جہاں ایک جانب لکڑی کی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہاں سیلن اور بدبو سی تھی۔ اس کمرے میں بائیں جانب کی دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑی اور پرانی سی لمبی میز رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے اس میز پر لٹا دیا۔

"اب چھٹی؟" ان میں سے ایک کی آواز سنائی دی غالباً اسے مکمل تفصیلات کا علم نہیں تھا۔

"نہیں،" نیلے سوٹ والا بولا۔ "ابھی اسے نیچے تہ خانے میں لے کر چلنا ہے اور ہم چاروں کو اسی وقت تک اس کی سخت نگرانی کرنا ہے جب تک تھری ناٹ نہ آ جائے۔"

"مگر وہ کب آئے گا؟" نیلے سوٹ والے سے سوال کیا گیا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے!" نیلے سوٹ والا ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "وہ خود ہی رابطہ قائم کرے گا۔ اس کے آنے تک پوری طرح چوکنا رہنا ہے۔"

"ٹھیک۔" وہ جو چھٹی مانگ رہا تھا، اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ چند لمحے بعد ہی مجھے ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کوئی بھاری پتھر کی سل اپنی جگہ سے سرکی ہو۔ میں سن ہی چکا تھا کہ وہ مجھے تہ خانے میں لے جا رہے ہیں اس لیے نہیں چونکا۔ پھر وہ مجھے ایک زینے کے ذریعے تہ خانے میں لے آئے جو شاید دو کمروں پر مشتمل تھا۔ وہاں تازہ ہوا کے گزر کا مناسب انتظام نہیں تھا اس لیے بدبو اور گھٹن سی تھی۔ اس کمرے میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی اور چند کرسیاں۔ ایک جانب دیوار سے لگی ہوئی لکڑی کی الماری رکھی تھی۔ انھوں نے مجھے چارپائی پر ڈال دیا۔ وہاں روشنی کا بندوبست بھی تھا۔ کمرے میں گھستے ہی انھوں نے بلب جلا دیا تھا۔ مجھے چارپائی پر لٹانے کے بعد وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے اور اب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"کل رات اس چارپائی پر وہ بھکارن، رانی بنی ہوئی لیٹی تھی اور آج..."

"یہ ذکر نہ کرو!" نیلے سوٹ والے نے اپنے ایک ساتھی کی بات کاٹ دی۔ "یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔"

"یہ گویا کل رات سے اسی بھکارن کے گن گائے جا رہا ہے۔" ایک اور شخص کی آواز آئی۔ "معلوم نہیں کبھی اس نے پہلے کوئی عورت دیکھی بھی تھی یا نہیں، اتنے قریب سے!"

"تم نے کچھ کہا تھا تم لوگوں سے!" نیلے سوٹ والے کی سخت آواز گونجی۔ غالباً اسے اپنے ساتھیوں سے سخت لہجے میں بات کرنے کا حق تھا۔

"اچھا بابا! نہیں کرتے اس کی بات!" پہلا ساتھی ہنس کر بولا۔ "تم کہو تو اس لونڈے کی بات شروع کر دیں جو سامنے اتنا نخیل پڑا ہے۔"

"میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ یہ کتنی خطرناک چیز ہے!"

"خاک خطرناک ہے! اتنا تو بھر کا تو لونڈا ہے جس کے لیے تھری ناٹ نے ڈھیر ساری ہدایتیں دے ڈالی تھیں کہ یوں ہے، اور یوں ہے!"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ عطر میں اس قدر کیوں ڈوبا رہتا ہے! اس وقت بھی کمرا مہک رہا ہے!" ایک اور شخص نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"اب اتنی تیز بھی نہیں خوشبو جتنی تم بتا رہے..."

دوسرے شخص کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ اسی وقت ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ آواز اس دروازے کی طرف سے آ رہی تھی جو برابر والے کمرے میں کھلتا تھا۔ میرے لیے یہ مخصوص قسم کی آواز اجنبی نہیں تھی۔ معاً نیلے سوٹ والا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "وہی ہو گا ٹرانسمیٹر پر تھری ناٹ! میں آیا ابھی!" وہ برابر والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ٹرانسمیٹر سیٹ اسی میں تھا۔ میں نے اپنی سماعت کا دائرہ وسیع کر لیا۔ میں نیلے سوٹ والے اور تھری ناٹ کے درمیان ہونے والی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ وہ گفتگو سن کر مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ تھری ناٹ وہاں کب تک پہنچنے والا تھا۔ کچھ دیر بعد ٹرانسمیٹر پر تھری ناٹ کی آواز سنائی دینے لگی۔ "تھری ناٹ کالنگ... تھری ناٹ کالنگ!... اے وَن گو میں آنسر اوور۔" اس نے نیلے سوٹ والے کو اس کے نام کی بجائے کوڈ نمبر سے پکارا تھا۔

"اے وَن آن دی لائن سر! اوور۔" نیلے سوٹ والے کی آواز ابھری۔

"رپورٹ اوور۔"

جواب میں نیلے سوٹ والے نے میرے اغوا کی پوری داستان بیان کر دی، پھر آئندہ احکام دریافت کیے۔ اپنی رپورٹ میں اس نے مجھے انجکشن دینے کے متعلق بھی جھوٹ بول دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں خود بہت جلد وہاں آ رہا ہوں، اس وقت تک پوری طرح چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ویسے تم نے انجکشن لگا دیا ہے تو اس کے ہوش میں آنے کا تو فی الحال سوال نہیں، پھر بھی میں ہدایت کرتا ہوں کہ ذرا بھی یہ محسوس کرو، وہ ہوش میں آنے والا ہے تو بغیر وقت ضائع کیے، دوسرا انجکشن لگا دینا!"

"میرے پہنچنے تک اس پر کڑی نظر رکھو! اوور اینڈ آل۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی تھری ناٹ کی آواز آنا بند ہو گئی۔ وہ کسی بھی موقع پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس نے وقت کا کوئی تعین نہیں کیا تھا۔ اگر وہ وقت کا تعین کر دیتا تو کم از کم یہ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا تھا کہ وہ کتنے فاصلے سے آ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ قاہرہ ہی میں کہیں موجود ہے یا پھر جیزا یا قاہرہ سے آ رہا ہے۔

نیلے سوٹ والا دوبارہ واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ مجھے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ اس کے پاس انجکشن کی دو شیشیاں تھیں جن میں سے ایک وہ ضائع کر چکا تھا۔ میں نے پلکوں کی جھری سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو وہ کچھ فکر مند سا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی چہرے سے اس کی فکر مندی کو محسوس کر لیا۔

"کیا بات ہے؟ کچھ فکر مند سے نظر آ رہے ہو تم!" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ "کون تھا ٹرانسمیٹر پر؟"

"تھری ناٹ!" نیلے سوٹ والے نے جواب دیا اور طویل سانس لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا اس نے کوئی ایسا حکم دیا ہے جس سے تم فکر مند ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔" نیلے سوٹ والا اپنے ساتھی کی بات کاٹ کر بولا۔ "دراصل....."

ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کے ذہن کو قابو میں کر لیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کیوں ایک دم فکر مند ہو گیا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کیا کہنے والا ہے۔ میں نے تھری ناٹ کی ہدایت کو اس کے ذہن سے محو کرنے میں دیر نہیں کی۔ دراصل دوبارہ انجکشن کی ہدایت پر اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے تو پہلا انجکشن بھی نہیں لگایا تھا۔ وہی بات اپنے ساتھیوں کو بتانا چاہتا تھا اور اپنے بقیہ دو ساتھیوں سے بھی یہ دریافت کرنے والا تھا کہ ان میں سے بھی کوئی انجکشن لگانا جانتا ہے یا نہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ان دونوں میں سے ایک انجکشن لگانے کا اہل تھا مگر مجھ سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے اسی لیے انجکشن کا خیال ہی اس کے ذہن سے نکال دیا تھا۔

"تم کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟" نیلے سوٹ والے کو خاموش دیکھ کر اس کے ساتھی نے کہا۔

"تھری ناٹ بہت جلد یہاں پہنچنے والا ہے۔"

"تو اس میں اتنے فکر مند ہونے کی کیا بات ہے!"

"نہیں، میں کیوں فکر مند ہوتا۔" نیلے سوٹ والا پُرسکون لہجے میں بولا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تو تمہارے چہرے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔"

"وہم ہو گا تمہارا۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟" نیلے سوٹ والے نے دریافت کیا۔

"تھری ناٹ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم کامیاب ہو کر یہاں واپس آ چکے ہیں!"

"وہ تھری ناٹ ہے! امریکہ کا ذہین ترین ایجنٹ سمجھے کچھ!" نیلے سوٹ والا بولا۔

"خیر اس میں بہت زیادہ ذہانت کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہ کسی بھی ذریعے ہماری نگرانی بھی کرا رہا ہو گا۔" ایک شخص نے قیاس آرائی کی۔ "اتنے بڑے شہر میں بس ہم ہی تو مقامی ایجنٹ نہیں ہوں گے! اپنے علاوہ ایک کو میں بھی جانتا ہوں، میری مراد یہاں موجود افراد کے علاوہ ایک مقامی ایجنٹ سے ہے۔"

"تو اس میں برائی بھی کیا ہے! اچھا ہی ہے کہ وہ ہماری طرف سے غافل نہیں رہتا۔" ایک اور شخص بول اٹھا۔ پھر وہ یونہی دیر تک گپ لڑاتے رہے۔ ان میں سے ایک تو جیزا میں رہتا تھا، ایک قاہرہ میں اور بقیہ دو کا قیام پرانے قاہرہ میں تھا۔ اس عمارت میں نیلے سوٹ والے کی سکونت تھی۔ بظاہر اس نیلے سوٹ والے کا کاروبار ظروف کی تھوک سپلائی کرنا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ظروف سازوں سے مال خرید کر مصر کے دوسرے شہروں کو بھیجتا تھا۔ اس کے بیوی بچے اسی عمارت کی اوپری منزل میں رہتے تھے۔ نچلی منزل ظاہری کاروبار کے لیے وقف تھی۔ نیلے سوٹ والا بہت شریف اور نیک نام مشہور تھا۔ اس کے متعلق کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ غدار وطن ہو گا۔ اس کا صحیح روپ لوگوں کی نظر سے چھپا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اگر لوگوں کے اصلی چہرے ظاہر ہو جائیں تو کیا قیامت ہو! اسی وقت جانے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بہت آہستگی سے کسی خیال کی لہر نے

میرے ذہن کو چھوا ہو۔ میں چونک اٹھا۔ میرا ذہن اگر اتنا حساس نہ ہوتا تو شاید اس خیال کی لہر دھیرے سے میرے ذہن میں داخل ہو جاتی، بالکل یوں جیسے کوئی دبے پاؤں چوری چھپے کہیں داخل ہوتا ہے۔ میرے ذہن کا خودکارانہ نظام فوراً ہی اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور پھر میرے ذہن پر ایک تاریک چادر سی تن گئی۔ اب اس تاریکی کو عبور کر کے کوئی طاقتور سے طاقتور خیال میرے ذہن میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی نے میرے ذہن سے رابطہ قائم کر کے اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ خواب یا بے ہوشی کے عالم میں ذہن پر شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ایسے میں کسی کے ذہن کو پڑھنا یا اسے اپنے قابو میں کر لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً مجھے بے ہوش ہی سمجھ رہا تھا ورنہ یہ لاحاصل کوشش نہ کرتا۔

چند لمحے اسی عالم میں گزر گئے اور پھر خود بخود تاریکی کی چادر سمٹ گئی، گویا اب کسی نے مایوس ہو کر میرے ذہن سے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرے خیال کی طاقتور لہریں بجلی کی طرح کوند کر دور دور تک پھیل گئیں۔ اب مجھے اس شخص کی تلاش تھی جس نے میرا ذہن پڑھنا چاہا تھا۔ میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ میرا طاقتور ذہن اس کے ذہن کو مغلوب بھی کر سکتا ہے۔ پھر میں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ یقیناً اس عمارت کے اندر ہی تھا۔ شاید اسے جوابی کارروائی کی توقع نہیں رہی ہو گی اسی لیے پہلے ذہنی جھٹکے سے وہ ایک دم نہ سنبھل سکا۔ میرے ذہن کی لہریں اس کے ذہن میں داخل ہونے لگیں۔

کون ہو تم؟ میرے ذہن نے اس سے پہلا سوال کیا۔

تھری ناٹ! اس کے ذہن نے جواب دیا مگر اسی کے ساتھ وہ سنبھل گیا۔ اب اس کا ذہن، میرے طاقتور ذہن کی لہروں کو باہر دھکیلنے کے لیے شدید جدوجہد کر رہا تھا۔

تم ایسا نہیں کر سکتے تھری ناٹ! تمہیں نیند آ رہی ہے، گہری نیند!

نہیں! اس کے ذہن نے سخت احتجاج کیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی! ہرگز نہیں! میں نہیں سوؤں گا، بالکل نہیں!

میں نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن کی مدافعت لمحہ بہ لمحہ کمزور پڑتی جا رہی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا۔ بس اچانک ہی اس نے اپنی تمام تر ذہنی قوت صَرف کر کے میرے ذہن کی لہروں کو باہر دھکیل دیا اور اسی کے ساتھ تاریکی پھیل گئی۔ بالآخر وہ اپنی سخت جدوجہد میں کامیاب ہو ہی گیا تھا لیکن میں نے بھی اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے اس کا ذہن اس قابل نہیں رہا تھا کہ کسی کا ذہن پڑھ سکتا یا اس سے رابطہ قائم کر سکتا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ایک دم چارپائی سے جست لگائی۔

"ارے!" وہاں موجود تمام ہی افراد کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ انہیں سکتہ سا ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آتے، میرا وجود ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ کر ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ وہ یقیناً مضبوط اعصاب کے مالک نہیں تھے۔ میں تہ خانے کے زینے کی طرف لپکا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تھری ناٹ زندہ بچ کر نکل جائے۔ اگر مجھے پہلے سے یہ علم ہوتا کہ وہ بھی یہیں چھپا بیٹھا ہے تو میں یوں وہاں خاموشی سے پڑا ہوا اس کا انتظار نہ کرتا اور اسے گرفت میں لینے کی کوئی دوسری راہ اختیار کرتا۔ اس نے میرے ذہن سے اسی لیے رابطہ قائم کیا تھا کہ میں بے ہوش ہوں یا نہیں! ہر چند کہ اسے نیلے سوٹ والے سے پوری رپورٹ مل چکی تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنی عادت کے مطابق مکمل اعتماد نہیں کیا تھا اور یہی بے اعتمادی اس کی زندگی بچا لینے میں معاون ثابت ہوئی تھی۔

میں دوڑتا ہوا زینے تک پہنچا تو پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس کے اختتام پر راستہ مسدود ہے۔ بھاری پتھریلی سِل نے باہر نکلنے کی راہ بند کر دی تھی۔ وہ پتھریلی سل یقیناً کسی خاص میکنزم سے حرکت کرتی ہو گی اور اس سے نیلے سوٹ والا یقیناً واقف ہو گا۔ میں نے سوچا اور پھر فوراً ہی اس کے ذہن سے رابطہ قائم کر کے اسے حکم دیا کہ راستہ کھول دے۔ نیلے سوٹ والا میرا حکم ملتے ہی بوکھلا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔ زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے بائیں جانب والی دیوار پر دباؤ ڈالا اور پھر دوسرے ہی لمحے ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ پتھریلی سل اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگی۔ میں اس وقت تک سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ چکا تھا۔ میں تہ خانے سے نکل تو آیا مگر اب مجھے امید نہیں رہی تھی کہ تھری ناٹ کو پکڑ سکوں گا۔ اس کے لیے یہ مہلت

یقیناً کافی ہوگی۔ اگر وہ چھپکلی بیچ میری راہ میں حائل نہ ہوجاتی یا مجھے پہلے ہی اس کا خیال آجاتا تو شاید کامیابی کا کچھ امکان تھا۔ اس وقت میرے اور تھری ناٹ کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا لیکن ہم دونوں کے لیے ان لمحات کی نوعیت قطعی مختلف تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میں نے آس پاس کا تمام علاقہ چھان مارا مگر تھری ناٹ کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ تھری ناٹ کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد میں پھر اسی عمارت کی طرف پلٹا جہاں وہ چاروں مقامی امریکی ایجنٹ موجود تھے۔ میری نگاہوں میں وہ غداران وطن قابل معافی نہیں تھے۔ غداری کے الزام کے علاوہ وہ ایک مظلوم بھکارن کے بھی قاتل تھے۔ بھلا وہی ایک بھکارن کیا، جانے ان کے ہاتھوں کتنے بے گناہ مارے جاچکے ہوں گے۔ انھیں ان کے گناہوں کی سزا ضرور ملنا چاہیے تھی۔ اس سے قطع نظر انھیں قتل کرنے میں میرا ابھی ایک مفاد تھا۔ مجھے موجودہ میک اَپ میں ابوالہول کی حیثیت سے ان کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ قتل کردیے جاتے تو مجھے موجودہ میک اَپ ختم کرنے کی ضرورت بھی نہ رہتی۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ اس عمارت میں گھسے بغیر ہی انھیں ان کے انجام تک پہنچادوں گا۔ لیکن اسی وقت اپنا ارادہ بدل دیا۔ ارادہ بدلنے کا صرف ایک ہی سبب تھا کہ اب میرے پاس وہ رقم تقریباً ختم ہونے والی تھی جو اسکندریہ ایئرپورٹ پر ایک کسٹم آفیسر کی جیب صاف کرکے حاصل کی تھی۔ بس کسٹم آفیسر اور ان لوگوں میں صرف جرائم کی نوعیت کا فرق تھا۔ مجرم دونوں ہی تھے اور دونوں کی کمائی حلال کی نہیں تھی۔ ضرورت پڑنے پر میں ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو تلاش کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نیلے سوٹ والے کے پاس ایسی حرام کی رقم بہت ہوگی۔

میں عمارت کے صدر دروازے پر پہنچا تو مجھے صدر دروازہ اندر سے بند ملا لیکن اسے کھلوا لینا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے بہت جلد ان لوگوں کو ڈھونڈ لیا۔ وہ عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند کرکے دوبارہ اسی تہ خانے میں جاچھپے تھے اور اس وقت ان کے ذہنوں پر میرا خوف سوار تھا۔ میں نے نیلے سوٹ والے کے ذہن سے رابطہ قائم کرکے اُسے صدر دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری سماعت کا دائرہ بھی اس وقت وسیع تھا۔ میں عمارت کے باہر وسیع علاقے پر کھڑا تہ خانے کے اندر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ اب تک میرا وجود نادیدہ تھا اور تمام حیرت انگیز قوتیں بیدار تھیں۔

"کہاں؟... کہاں چلے تم؟" نیلے سوٹ والے کا ایک ساتھی گھبرا کر بول اٹھا۔

"وہ... وہ آگیا، وہ آگیا ہے۔" نیلے سوٹ والے نے جواب دیا اور اسی کے ساتھ آگے بڑھا۔

"کون آگیا؟" اس کے ایک اور ساتھی نے خوفزدہ سی آواز میں پوچھا۔ "کک... کیا... ابوال... ابوالہول؟"

"نہیں، تھری ناٹ۔" نیلے سوٹ والا جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ میرا حکم تھا۔ وہ میرے حکم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس کا ذہن میرے قابو میں تھا۔

"مگر... مگر ہم اس سے... اس سے کیا کہیں گے کہ ابوالہول کہاں گیا؟"

"وہی جو گزرا ہے۔" نیلے سوٹ والے نے کہا اور پھر کمرے کے دروازے سے نکل کر زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

چند منٹ میں وہیں کھڑا ہوا نیلے سوٹ والے کا انتظار کرتا رہا۔ میرے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ دروازہ توڑ کر اس عمارت میں داخل ہوجاتا لیکن میں ہمیشہ طاقت کے بے جا استعمال سے گریز کرتا تھا۔ جب طاقت کے استعمال کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں رہ جاتا تھا تو بہ مجبوری میں یہ قدم اٹھاتا تھا۔ جب تک نیلے سوٹ والے نے اوپر آکر صدر دروازہ کھولا میں اس کا ذہن پڑھ کر یہ معلوم کرچکا تھا کہ اس نے حرام کی کمائی کہاں چھپا کر رکھی ہے۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا میں ہوا کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوگیا۔ وہ دروازے کے باہر کسی کو نہ پاکر حیران حیران سا کھڑا تھا۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ واقعی تھری ناٹ آیا ہے۔

"دروازہ بند کرکے نیچے تہ خانے میں چلو!" میرے ذہن نے اُسے حکم دیا۔

وہ کسی معمول کی طرح میرے حکم پر عمل کرکے تیزی سے مڑا۔ پھر میں نے سوچا اب اسے نیچے لے جانے کی بھی کیا ضرورت ہے! اس کا قصہ یہیں کیوں نہ نمٹا دیا جائے! مجھے یہ علم ہی ہوچکا تھا کہ حرام کی کمائی نیچے تہ خانے میں جو الماری رکھی تھی اس کے اندر تھی۔ غنیمت یہی کہوں کہ میرے ذہن میں یہ بات اسی لیے آئی کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات آچکے تھے ورنہ وہ کچھ دیر اور زندہ رہ لیتا۔ ہر شخص

کی زندگی کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، نہ وہ اس سے لمحہ بھر پہلے مرسکتا ہے، نہ بعد میں! لیکن اسے موت سے ہمکنار کرتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آگیا کہ کم از کم وہ بے خبر نہ مرے۔ اُسے مرتے وقت احساس جرم ضرور ہو، اسے اتنی مہلت تو دینا چاہیے کہ مرنے سے پہلے گناہوں سے توبہ کرلے اور اپنے عقیدے کے مطابق اپنے خالق سے معافی کی درخواست کرسکے۔ یہ سوچ کر میں نے اسے ایک دم مخاطب کیا۔ "تمھاری موت کا وقت قریب آچکا ہے۔ کیا تمھیں اپنے گناہوں کا احساس ہے؟ اور کیا تم اپنے پیدا کرنے والے سے اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگو گے؟"

"تم... کون... کون ہو تم؟" وہ دہشت زدہ سا ہوکر بولا۔

"میں تمھارا ضمیر ہوں اور تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ وقت ضائع نہ کرو اور مرنے سے پہلے..."

"نہیں... نہیں!" وہ چیخ اٹھا۔ "میں... میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ میرے... میرے بچے ابھی بہت... بہت چھوٹے ہیں... وہ... وہ بے سہارا ہوجائیں گے... یتیم ہوجائیں گے!"

لمحہ بھر کو مجھے اس پر رحم آیا، مگر پھر فوراً ہی سوچا کہ ہر شخص اسی طرح جیتا چلا آتا ہے جسے اس کے جرائم کی سزا دی جاتی ہے۔ زندگی میں کبھی کچھ تو اس کے لیے اختیاری ہوتا ہے۔ وہ خود ہی آسائشوں کے حصول کی خاطر جرم کی راہ اختیار کرلیتا ہے۔ مجھے اس کو قتل کرتے ہوئے دکھ محسوس نہ ہو، یہ سوچ کر میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر ہال کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ نہ خود اپنی موت کے فیصلے کو قبول کرے گا اور نہ گناہوں سے توبہ کرے گا۔ توبہ اس کی تقدیر میں نہیں تھی۔ وہ ذہنی جھٹکا اتنا ہی شدید تھا کہ اس کے دماغ کی رگوں سے خون بہنے لگا ہوگا۔ مجھے اسی لیے اگلا قدم اٹھاتے ہوئے اپنے عقب میں اس کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ منظر یقیناً کوئی اچھا منظر نہ ہوتا۔ ہاں میں نے اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرکے یہ ضرور معلوم کرلیا کہ واقعی سفر آخرت پر روانہ ہوچکا ہے۔ وہاں تاریکی اور سناٹا تھا۔

نیلے سوٹ والا نیچے تہ خانے کا راستہ بند کرکے نہیں گیا تھا۔ میں تہ خانے میں اتر گیا۔ وہاں جو تینوں افراد تھے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یہ فطری بات ہے کہ آدمی مصیبت کے وقت غیر ارادی طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوجاتے ہیں۔ ان تینوں نے جیسے کسی ان دیکھی بلا سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ میں نے انھیں بھی توبہ کی مہلت دی، لیکن انھوں نے بھی نیلے سوٹ والے کی طرح اس مہلت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان میں کوئی زندہ رہنے پر مُصر تھا، گویا وہ موت کے فرشتے سے حجت کرنے میں وقت ضائع کررہے تھے۔ میں نے یکے بعد دیگرے انھیں ہمیشگی کی نیند سُلا دیا۔ پھر میں الماری کی طرف بڑھا جو مقفل تھی۔ مجھے اُس الماری کو کھولنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کے ایک خفیہ خانے میں میری توقع سے کہیں زیادہ رقم موجود تھی۔ رقم بڑے نوٹوں میں تھی اس لیے اُسے میں نے بہ آسانی اپنے کوٹ کی جیبوں میں رکھ لیا۔ سو سو گینی کے نوٹوں کی وہ تین گڈیاں تھیں۔ ان گڈیوں کے علاوہ بھی پچیس اور پچاس پیاسٹر کے نوٹ تھے جو میں نے نہیں لیے اور نہ سکوں کو ہاتھ لگایا۔ اس کے بعد میں نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔

جب میں اس عمارت سے نکلا تو صبح کے پونے نو بج رہے تھے۔ اب میں اپنے وجود کی تجسیم کرچکا تھا۔ سڑک تک پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی کی اور قاہرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں رات بھر کیونکہ بالکل نہیں سو سکا تھا اس لیے اب کچھ دیر ہی آرام ضرور کرلینا چاہیے تھا۔ اب ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے مسہری کا رخ کیا۔ کیونکہ میں نے سونے سے پہلے اپنے ذہن کو کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ کس وقت بیدار ہونا ہے اس لیے شام چار بجے کے قریب ہی میری آنکھ کھلی۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر میں نے چائے اور کچھ ناشتا منگوالیا۔ اسی دوران میں میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ میں کوئی مکان کرائے پر لے کر اس میں سکونت اختیار کرلوں۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ غیر ملکی ایجنٹ عموماً بڑے ہوٹلوں میں زیادہ سرگرم رہتے ہیں۔ اس طرح میں ان کی پہنچ سے بڑی حد تک دور رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ تجربہ بھی تھا کہ ہوٹلوں میں قیام کرکے میں جلد ہی اپنے دشمنوں کی نظر میں آجاتا تھا۔ رقم کی طرف سے یوں بھی اب مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ یہی سوچ کر میں نے میز پر ایک جانب رکھے ہوئے اخباروں میں سے ایک اخبار الجمہوریہ اٹھا لیا۔ بڑے ہوٹلوں کی تعداد زیادہ تر قاہرہ میں تھی۔ میں نے اسی لیے پرانے قاہرہ میں سکونت کا فیصلہ کیا اور

اس فیصلے کے بعد وہ کالم پڑھنے لگا جو جائیدادوں کی خرید و فروخت اور کرائے پر اٹھائے جانے کے متعلق تھا۔ اخبار میں مجھے اپنے مطلب کا صرف ایک ہی اشتہار نظر آیا، مگر اس میں بھی ایک قباحت تھی۔ مالکہ مکان ایک بیوہ تھی جو خود بھی اسی مکان کے ایک حصے میں رہتی تھی۔ کرائے کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ یہ مکان مصر قدیمہ کے علاقے میں تھا جو قدیم ترین علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جو تاریخ میں فسطاط کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں مسلمان فاتح مصر نے ایک کبوتر کا گھونسلا دیکھ کر شہر بسانے کا حکم دیا تھا۔ یہ علاقہ خاصا وسیع ہے۔ میں کیونکہ فوری طور پر کہیں مستقل سکونت کا فیصلہ کر چکا تھا اور ہوٹل میں قیام ترک کرنا چاہتا تھا اس لیے بیوہ مالکہ مکان کو بھی برداشت کرنے پر راضی ہو گیا۔ اشتہار میں مالکہ مکان کے مکمل پتے کی بجائے ایک اسٹیٹ ایجنسی کا پتا دیا ہوا تھا۔ اس مکان کو کرائے پر حاصل کرنے کے لیے اسٹیٹ ایجنسی سے رابطہ قائم کرنا ضروری تھا۔ اشتہار میں ملاقات کے لیے پانچ بجے تک کا ٹائم دیا گیا تھا۔ اس لیے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں یہ معاملہ آج ہی نمٹا لینا چاہتا تھا۔

ہوٹل ملٹن کی عمارت سے نکل کر میں نے رمسیس اسکوائر کے لیے ٹیکسی کی تو مجھے احمد سلمان یاد آگیا، ارون کا لپ احمد سلمان! اس کا جنرل اسٹور بھی وہیں کہیں تھا جسے دیکھنے کا موقع مجھے نہیں ملا تھا۔ اس اسٹیٹ ایجنسی کا دفتر التحریر کی طرف جانے کے راستے میں تھا۔ تحریر اسکوائر سے رمسیس اسکوائر تک کا فاصلہ بمشکل ڈیڑھ دو میل ہوگا اس لیے جلد ہی میں وہاں پہنچ گیا۔ ہاں وہ اسٹیٹ ایجنسی ڈھونڈنے میں کچھ وقت ضرور لگا۔

اسٹیٹ ایجنٹ نے وہ مکان لے جا کر دکھانے اور بقیہ معاملات طے کرانے کے لیے دوسرے دن صبح ساڑھے نو بجے کا وقت دیا۔ وہ صورت ہی سے چلتا پرزہ معلوم ہو رہا تھا اور شاید اس کی فطرت میں بھی تجسس تھا۔ اس نے ایک ہی نشست میں میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لینا چاہا کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ کہاں ٹھہرا ہوں؟ کرائے پر مکان کیوں لے رہا ہوں؟ وغیرہ۔ میں نے اس کے سامنے بھی خود کو صعید کا باشندہ ظاہر کیا اور اپنے متعلق یہ بتایا کہ جامعۃ الازہر میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔ نام بھی اسے میں نے وہی بتایا تھا جو ہوٹل میں لکھا چکا تھا۔ اپنی دانست میں پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اس

اس خاندان برباد کی داستان مسلسل جس کے دشمن زمین و آسمان تھے
کندن
مصنف
ایم اے راحت
ہزاروں قارئین کی اولین پسند تحریر
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
(زیر طبع)
مکمل کہانی دو جلدوں پر مشتمل
زندگی کے فریب کے شکار ایک نوجوان کی داستان الم جس کے چاروں طرف موت رقصاں تھی۔ ہر طرف خون رنگ آنکھیں اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زمین اس پر تنگ کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سے پڑنے والی ٹھوکروں نے اسے فولاد بنا دیا۔ پھر اس فولاد کی کاٹ نے دنیا کی نیند حرام کر دی۔
کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ ۴۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے آرڈر قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔
گل قریشی پبلیکیشنز اینڈ کتب خانہ
11 مزنگ روڈ اسلام پورہ
فون: 7248599، 7229762

نے میری جان چھوڑی تھی۔ میں نے واپسی میں رمسیس ہی سے اپنے لیے مزید ضروری ساز و سامان اور کپڑے خرید لیے کیونکہ میرے پاس دو جوڑی کپڑوں کے سوا اور کپڑے پہننے کے لیے نہیں تھے ایک اور اٹیچی بھی خرید لی جس میں میں نے تمام سامان بھر لیا تھا۔ سامان کی خریداری کے بعد میں ٹیکسی کر کے دوبارہ ہوٹل ملٹن پہنچا اور وقت گزاری کے لیے پھر اخبار اٹھا لیا۔ صبح میں اخبار میں لیزا کے متعلق خبر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اخبار میں مجھے لیزا کے بارے میں تو کوئی خبر نہیں ملی، ہاں ایک اشتہار دیکھ کر وہ بات ضرور یاد آگئی جو میرے ذہن سے بالکل نکل گئی تھی۔ تقریباً یہی اشتہار گزشتہ روز بھی میری نگاہ سے گزر چکا تھا، اس میں زیادہ تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ آج بھی اور برج نائٹ کلب میں ساڑھے دس بجے شب اسی چینی رقاصہ کا پروگرام تھا جس کے جسم سے کھلتے گلابوں کی خوشبو آتی تھی۔

لوئی چو! میں نے سوچا عجیب نام ہے پھر مجھے خیال آیا کہ چینیوں کو بھی تو دیگر ملکوں والوں کے نام عجیب ہی لگتے ہوں گے۔ یہ میرے لیے پہلا اتفاق ہوتا کہ اپنے سامنے کسی عورت کے جسم سے گلابوں کی خوشبو آتی محسوس ہوتی۔ مجھے اسی لیے چینی رقاصہ لوئی چو کو قریب سے دیکھنے اور اس کے جسم کی خوشبو محسوس کرنے کا اشتیاق تھا۔ اشتہار میں لوئی چو کو حسن و رعنائی کا شاہکار لکھا گیا تھا لیکن وہ حقیقتاً کیا تھی، یہ میں خود دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور اچھوتا خیال آیا۔ لوئی میرے لیے سپر ثابت ہو سکتی تھی مگر ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں اس کی قربت حاصل کر لیتا اور میری نظر میں یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ دیر تک میرا ذہن اسی مسئلے میں الجھا رہا۔

کمرے میں پڑے پڑے میرا جی اوب گیا تو میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی اب رات کے آٹھ بج رہے تھے میں رات کا کھانا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بھی کھا سکتا تھا۔ سو میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں زیادہ تر میزیں بھری ہوئی تھیں۔ زیادہ تعداد غیر ملکیوں ہی کی تھی۔ میں ایک خالی میز دیکھ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ کسی نے اسی چینی رقاصہ لوئی چو کا نام لیا تھا۔ میں نے اپنی دائیں جانب نگاہ اٹھائی۔ میں جس میز کے قریب سے گزر رہا تھا اس پر چار ایرانی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نوجوان تھا۔ سدو و سواد میز نمبر اسی منظر ان میں سے کسی نے چینی رقاصہ کا نام لیا

اس خاندان برباد کی داستان مسلسل جس کے دشمن زمین و آسمان تھے
کندن
ایم اے راحت
زندگی کے فریب کے شکار ایک نوجوان کی داستان الم جس کے چاروں طرف موت رقصاں تھی۔ ہر طرف خون رنگ آنکھیں اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زمین اس پر تنگ کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سے پڑنے والی ٹھوکروں نے اسے فولاد بنا دیا۔ پھر اس فولاد کی کاٹ نے دنیا کی نیند حرام کر دی۔
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
مکمل کہانی دو جلدوں میں مکمل کتابی صورت میں دستیاب ہے
ناشر: گل قریشی لائبریری 11 مزنگ روڈ اسلام پورہ لاہور فون: 7229762، 7248599

دلچسپ کہانیوں کی مصنفہ
سیما غزل
چاند کے قیدی
2 جلدوں میں مکمل
آپ کا ادب
فون: 7229762، 7248599

تھا۔ وہ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر خاموش ہو گئے تھے۔ میں یہ محسوس کر کے آگے بڑھ گیا، لیکن اسی کے ساتھ میں نے اپنی قوتِ سماعت کا دائرہ وسیع کر لیا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ دونوں لوئی چو کے بارے میں کیا گفتگو کر رہے تھے۔ ابھی میں خالی میز تک پہنچا ہی تھا کہ مجھے ان میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: ”یقین کرو، وہ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے اسے لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر جاتے دیکھا تھا۔ میں بھی اس وقت لفٹ میں تھا۔ مجھے پانچویں منزل میں جانا تھا، مگر یہ دیکھنے کے لیے وہ کس منزل پر اترتی ہے، میں لفٹ سے پانچویں منزل پر نہیں اترا تھا۔“

”اگر تمہاری بات درست بھی مان لی جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ میں نے دوسری آواز سنی، جو نسبتاً بھاری تھی۔ یہ آواز غالباً ادھیڑ عمر شخص کی تھی۔ میں اطمینان سے کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ اسی ادھیڑ عمر شخص نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ”تم اس کے چکر میں نہ پڑو، نہ معلوم تمہاری طرح کتنے اس کے دیوانے ہوں گے!“

”کاش تم نے بھی اسے رقص کرتے دیکھا ہوتا!“ نوجوان نے سرد آہ کھینچی: ”یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلیاں سی کوند رہی ہوں۔ ظالم کے بدن میں بلا کا لوچ ہے۔“

”اچھا تو تم کل رات اسی لیے غائب ہو گئے تھے!“ ادھیڑ عمر شخص ہنس کر بولا: ”تم اوبرج میں اس کا رقص دیکھنے گئے تھے!“

”ہاں!“ نوجوان نے اقرار کیا، پھر کہا: ”اس وقت بھی دیکھو وہ کتنی حسین نظر آ رہی ہے! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان سے کوئی۔۔۔“

”بس بس!“ ادھیڑ عمر شخص نے اپنے ساتھی نوجوان کی بات کاٹ دی: ”مجھے اس میں کوئی حسن نظر نہیں آ رہا۔ سوجی سوجی سی آنکھیں اور پھولا پھولا سا گول چہرہ، اس کو حسن کہتے ہیں؟“

تو وہ اس وقت ڈائننگ ہال میں موجود ہے! میں چونک اٹھا۔ پھر میری بصارت نے فاصلوں کی طنابیں کھینچ لیں۔ میں نے اسے بہت جلد تلاش کر لیا۔ وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ ایک چینی نوجوان بھی نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ادھیڑ عمر شخص کی بدذوقی پر غصہ آیا۔ معلوم نہیں اس کے ذہن میں حسن کا معیار کیا تھا! ایک ویٹر اس کی میز سے کھانے کے برتن اٹھا رہا تھا۔ اسی دوران میں نوجوان چینی نے اس سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں چائے لانے کو کہا۔ ویٹر سر ہلا کر چلا گیا۔ اسی وقت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے قدم اب اسی میز کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ چینی رقاصہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی میز کے قریب پہنچ کر چینی زبان میں اور خالص چینیوں کے لہجے میں بولا: ”اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہاں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟“ میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

وہ دونوں مجھے چینی زبان بولتے دیکھ کر چونک اٹھے۔ ان کے چہروں سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ انھیں غالباً کسی غیر ملکی سے اتنی فصاحت اور زبان کی درستی کی اتنی توقع نہیں تھی۔ ”میں آپ کے لیے اجنبی سہی، لیکن آپ لوگ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔“ میں نے مزید کہا۔

”بیٹھیں۔۔۔ بیٹھ جائیے!“ لوئی کے نازک ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

میں بغیر کسی تکلف کے کرسی کھینچ کر فوراً بیٹھ گیا، مگر مجھ سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی کہ نوجوان چینی میرے وہاں بیٹھنے سے خوش نہیں تھا۔ ”دراصل میں ایک پامسٹ ہوں اور مجھے مشہور و معروف لوگوں کے ہاتھ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ میں لوئی چو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاتھ دیکھنے کی فیس کتنی لیتے ہیں آپ؟“ نوجوان بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

”معاف کیجیے گا، یہ میرا شوق ہے، پیشہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں آپ لوگوں سے کوئی فیس نہیں لوں گا۔“

”مگر۔۔۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں۔۔۔ میں کوئی مشہور شخصیت ہوں؟“ لوئی چو نے سوال کیا۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح حسین اور دل آویز تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، نوجوان چینی اپنی ساتھی سے مخاطب ہوا: ”تم بھی کمال کرتی ہو لوئی! روزنامہ اخبارات میں تمہاری تصویر چھپ رہی ہے۔ انھوں نے وہی تصویر دیکھ لی ہو گی۔“

”جی ہاں!“ میں نے اعتراف کیا: ”میں نے ان کی تصویریں دیکھی تھیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت انھیں اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں لوئی چو سے مخاطب ہوا: ”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اپنا ہاتھ دکھا دیں۔ ممکن ہے کہ میں آپ کے مستقبل۔۔۔“

”ان کا ہاتھ تو آپ بعد میں دیکھیے گا۔“ نوجوان چینی نے میری بات کاٹ دی: ”پہلے آپ میرا ہاتھ دیکھ کر میرے بارے میں کچھ بتائیں۔ ان کے متعلق تو ویسے بھی آپ کو بہت سی باتوں کا علم ہو گیا ہو گا۔ مثلاً یہ کہ ان کا نام لوئی چو ہے اور یہ کہ ان کے جسم سے گلابوں کی خوشبو آتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، پھر بولا: ”پہلے میں اپنے ماضی کے متعلق جاننا چاہوں گا۔“

میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا: ”لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی! اپنے ماضی کے بارے میں تو آپ سب کچھ خود ہی جانتے ہیں، میری زبانی اپنے ماضی کا حال سننے سے کیا فائدہ!“

”کوئی تو فائدہ ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“

میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ چینی نوجوان مجھے کوئی فراڈ سمجھ رہا ہے۔ وہ اسی لیے مجھ سے اپنے ماضی کے متعلق جاننا چاہتا تھا تاکہ میرا جھوٹ کھل جائے۔ میں نے اس کے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ”ابھی آپ نے مجھے اپنا نام تو نہیں بتایا!“

”کیوں، کیا آپ میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر میرا نام بھی بتا سکتے ہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں!“ میں بولا: ”اگر لکیریں دیکھنے والا انھیں پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو نام بھی بتایا جا سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی توجہ اس کے ذہن پر مرکوز کر دی۔ اب اس کا ماضی میرے لیے کسی کھلی کتاب کی طرح تھا: ”آپ کا نام ہوچن فا ہے اور آپ لوئی چو کے کزن ہیں۔“

میری بات سن کر وہ تقریباً اچھل پڑا۔ اس کی حیرت میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ ہکلایا: ”آپ۔۔۔ آپ واقعی بہت بڑے پامسٹ ہیں۔۔۔ حیرت انگیز! آج تک میں نے۔۔۔ میں تو ان باتوں کو آج تک ڈھکوسلا ہی سمجھتا آیا تھا، مگر۔۔۔ مگر پامسٹری واقعی حیرت انگیز علم ہے اور آپ۔۔۔ آپ بھی کم حیرت انگیز نہیں۔“

”میں بذاتِ خود کچھ بھی نہیں۔“ میں نے انکساری سے کام لیتے ہوئے ایک نظر لوئی چو پر ڈالی۔ وہ بھی متاثر نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: ”یہ سب کچھ علم کی دین ہے۔ میں تو ابھی بہت کچھ بتانے والا ہوں، ایک ایسی بات جو آپ دونوں ہی کے لیے۔۔۔ مگر۔۔۔“ میں دانستہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”مگر کیا؟“ نوجوان نے بے تابی سے پوچھا۔

”یہ کہ آپ اس کا برا نہیں مانیں گے۔“ میں نے کہا۔

”بالکل نہیں! آپ جو بات ہے کہہ دیں، میں ہرگز اس کا برا نہیں مانوں گا۔“ نوجوان نے یقین دلایا۔

”تو پھر سنیں کہ آپ بچپن ہی سے لوئی چو کو چاہتے ہیں، لیکن انھوں نے کبھی آپ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔“

نوجوان کے چہرے پر حیرت نظر آنے لگی، لیکن چہرے سے ناگواری کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ”آپ۔۔۔ آپ نے درست کہا۔“ وہ چند لمحے بعد بولا، پھر کہا: ”لیکن کیا۔۔۔ کیا آپ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔“ نوجوان نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی اور چور نظروں سے لوئی چو کو دیکھنے لگا۔

”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔“ میں بول اٹھا: ”آپ کے سوال کا جواب میں ان کا ہاتھ دیکھ کر ہی دے سکتا ہوں۔“ میں نے لوئی چو کی طرف اشارہ کیا۔

”تو پھر اب آپ پہلے انہی کا ہاتھ دیکھ لیں۔“ نوجوان ہوچن فا نے اپنا ہاتھ نرمی سے کھینچتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، جو آپ کی مرضی!“ میں بولا کیونکہ مجھے ہوچن فا کی بجائے لوئی چو سے دلچسپی تھی۔ میں اس کی طرف مڑا: ”لائیے اپنا ہاتھ دکھائیے!“

اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی جس میں پسندیدگی کا عنصر تھا، پھر مسکرا کر بولی: ”اچھا ہی ہے کہ آج آپ کے توسط سے یہ بات صاف ہی ہو جائے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے خود ہی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اس کے خوبصورت سڈول اور گداز ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا سا بلند کیا، یوں جیسے اس کے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھ رہا ہوں، مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ میں اس کے جسم کی خوشبو محسوس کرنا چاہتا تھا، کیونکہ خود میرے جسم سے ہر لمحہ گلابوں کی خوشبو اٹھتی رہتی تھی، اس لیے کسی اور خوشبو کو اسی طرح محسوس کیا جا سکتا تھا، بہت قریب ہو کر۔ میری ناک اس کی ہتھیلی سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھی اور میرا طاقت ور ذہن اس کے ذہن کو ٹٹول رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے یقین ہو چکا تھا کہ واقعی

اس کے جسم سے گلابوں کی خوشبو آرہی تھی اور میں یہ محسوس کر کے بہت خوش تھا۔ میں نے اصل گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری سمجھا: "میں جو کچھ کہوں گا، اس کا آپ بُرا نہیں مانیں گی کیونکہ میری نیت درست ہے اور نہ آپ کسی سچی بات کو جھٹلائیں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" اس نے اپنی نشیلی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں کیونکہ اس وقت میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو پھر سنیے!" میں نے اس کی ہتھیلی پر نظر جما دی اور اس کا ذہن پڑھنے لگا۔ میں اس کا ذہن پڑھ کر جو کچھ معلوم کرنا چاہ رہا تھا، زبان سے وہی بتا بھی رہا تھا: "آپ کے والدین کا انتقال اسی وقت ہو گیا تھا جب آپ چھ سال کی تھیں۔ آپ کی پرورش آپکے چچا نے کی ہے، یعنی ہوؤن فا کے والد نے! کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل صحیح!" اس نے مسرت آمیز لہجے میں میری تائید کی، پھر بولی: "آپ تو واقعی جادوگر ہیں۔"

"شکریہ!" میں نے کہا: "میں کوئی جادوگر نہیں، ایک عام انسان ہوں۔"

"اچھا اب آگے بتائیے، پھر کیا ہوا؟" اس کے انداز میں معصومیت تھی جیسے کوئی بچہ کہانی سن رہا ہو۔

"آپ کو بچپن ہی سے رقص و موسیقی سے قدرتی لگاؤ تھا، مگر۔۔۔" میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ہوؤن فا کی طرف دیکھا۔

"آپ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں، میں بُرا نہیں مانوں گا۔" ہوؤن فا بول اٹھا۔

"مگر ہوؤن فا کو اس سے چڑ تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب آپ ذرا بڑی ہوئیں اور رقص کی تربیت لینا چاہی تو ہوؤن فا نے اس کی مخالفت کی، مگر ان کے والد نے آپ کی بات مان لی پھر جب آپ نے جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تو بہترین رقاصہ بن چکی تھیں۔ اسی زمانے میں ہوؤن فا نے پہلی بار آپ سے اظہارِ عشق کیا مگر آپ نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اس کا سبب طبیعتوں کا فرق تھا۔ پھر آپ کا قرب اور محبت حاصل کرنے کی خاطر ہوؤن فا نے بھی رقص و موسیقی میں دلچسپی لینا شروع کر دی، لیکن اس کے باوجود آپ کے ذہن سے بچپن کی تلخ یادیں محو نہ ہوئیں جو ہوؤن فا نے بچپن میں آپ کو بہت پریشان کیا تھا۔ وہ اب بھی اپنے اندر سے رقص و موسیقی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور یہ بات آپ کے علم میں تھی۔ آپکے خوابوں کا شہزادہ کوئی ایسا نوجوان تھا جو رقص و موسیقی کا دلدادہ ہو یا کم از کم اسے بُرا تو نہ سمجھتا ہو۔ پھر یوں ہی کئی سال بیت گئے مگر آپ ہوؤن فا کو قبول نہ کر سکیں۔ اس کے بعد ایک تقریب میں آپ کو ادھیڑ عمر جانگ ملا جس نے آپ کی زندگی ہی بدل دی۔ یہ اب سے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی کی۔۔۔" ابھی میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا تھا کہ اچانک چونک اٹھا۔

"کیا ہوا آپ۔۔ آپ رُک کیوں گئے؟" ہوؤن فا نے سوال کیا۔

"یہاں لکیریں کچھ الجھی ہوئی ہیں، کچھ دیر ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی میں آگے کچھ بتا سکوں گا!" میں نے اُسے جواب دیا اور چپ ہو گیا۔ میری توجہ ایک بار پھر لوئی چو کے ذہن پر مرکوز ہو گئی۔ اس بار واضح طور پر میں نے وہ بات محسوس کر لی جس پر پہلے چونک اٹھا تھا۔ میری ہی طرح کوئی اور بھی لوئی چو کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاً میرے طاقتور ذہن کی لہریں، اُس کے ذہن سے متصادم ہو گئیں۔ ٹکراؤ یقینی تھا مگر اس کے نتیجے میں لوئی چو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لوئی چو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور پھر وہ جھکتی چلی گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہوؤن فا گھبرا گیا۔ "کیا ہوا!۔۔ کیا ہوا لوئی!" وہ لوئی چو کو سنبھالتے ہوئے فکر مند لہجے میں بولا۔ لوئی چو کا جسم ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا۔

لوئی چو کی چیخ سُن کر آس پاس میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ لوئی چو اب بے ہوش ہو چکی تھی اور اس کی بے ہوشی کا سبب صرف دو افراد کو معلوم تھا، ایک مجھے اور ایک اس شخص کو جو میری طرح اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس سے میرے ذہن کی لہریں ٹکرائی تھیں۔ لوئی چو کی بے ہوشی کی وجہ یہی ذہنی تصادم تھا۔ جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے ان میں سے کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ، مگر میں تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں، جسمانی طور پر وہاں موجود ہو کر بھی میں گویا کہیں اور ہی تھا۔ میرے طاقتور ذہن کی لہریں اُس پُرہجوم ڈائننگ ہال میں اس شخص کو تلاش کرنے میں مصروف تھیں جس سے میرا ذہنی ٹکراؤ ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اتنے افراد کے ذہنوں کو پڑھ لینا آسان نہیں تھا۔ اس میں بڑا

وقت لگتا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس وقت تک وہ شخص وہیں بیٹھا رہتا۔ اس دوران میں وہ راہِ فرار بھی اختیار کر سکتا تھا خصوصاً اس لیے بھی کہ اُسے یہ خبر ہو چکی تھی، کوئی اور ٹیلی پیتھ وہاں موجود ہے۔ یہ خیال آتے ہی جیسے میں پھر وہاں واپس آ گیا۔

اس وقت تک ہوٹل کا منیجر بھی وہیں آ چکا تھا۔ ہوؤن فا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہر چند کہ لوئی چو اُس سے محبت نہیں کرتی تھی، لیکن وہ اُسے دل و جان سے چاہتا تھا۔

"آپ بالکل نہ گھبرائیں۔" ہوٹل کا منیجر ہوؤن فا سے کہہ رہا تھا: "میں ابھی فون کر کے اسپتال سے ایمبولینس منگواتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے منیجر کی بات کاٹ دی۔ "انھیں ابھی ہوش آ جائے گا۔"

"تمھیں کیا الہام ہو گیا ہے کہ یہ ابھی ہوش میں آ جائیں گی!" میرے قریب ہی کھڑے ہوئے نوجوان نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کو گھور کر دیکھا۔ یہ وہی ایرانی نوجوان تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ادھیڑ عمر ساتھی سے لوئی چو کے حُسن کی تعریفیں کر رہا تھا۔ وہ میرے گھورنے کو نظر انداز کرتے ہوئے مزید بولا: "ایمبولینس کا انتظار کرنے کی بجائے ہمیں خود انھیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلنا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ ہوؤن فا سے مخاطب ہوا: "آپ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ہٹ جائیے۔ میں انھیں اُٹھا کر باہر لے چلتا ہوں۔ آپ اتنے کوئی ٹیکسی روک لیجیے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایرانی نوجوان آگے بڑھا۔

"رُک جاؤ!" میں نے سخت لہجے میں ایرانی نوجوان سے بات ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو!" میں نے اُس سے فارسی زبان ہی میں بات کی تھی۔

وہ ٹھٹک کر رُک گیا اور مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے اپنی مادری زبان ہی میں بولا: "تم تو غیر ملکی معلوم ہوتے ہو، اتنی صاف اور رواں فارسی۔۔۔"

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم مداخلت نہ کرو اور خاموشی سے اپنی میز پر جا کر بیٹھ جاؤ۔" میں نے فارسی ہی میں اس سے کہا، پھر وہاں موجود لوگوں سے انگریزی میں بولا: "آپ لوگ اپنی میزوں پر جائیں اور دیکھیں کہ انھیں کس طرح ابھی ہوش آیا جاتا ہے۔"

"کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟" ایک غیر ملکی نے مجھ سے سوال کیا۔

"ان کے معاملے میں آپ مجھے ڈاکٹر سمجھ سکتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر لوئی چو کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جس کے جسم کا بوجھ ہوؤن فا سنبھالے ہوئے تھا۔ پھر بمشکل ہی لوگ وہاں سے ٹلنے کو تیار ہوئے، مگر اس میں بھی میری کوشش کو بھی تھوڑا سا دخل تھا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر کے ذہن کو اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔ لوگ اُسی کے اصرار پر اپنی اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھے تھے۔ منیجر بھی ایک خوب پروں میں بیٹھ گیا تھا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں کسی کو اپنی ذہنی قوتیں بروئے کار لا کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کیونکہ ایک ذہنی تصادم کے نتیجے میں بے ہوش ہوئی تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ میں اُسے ہوش میں لے آؤں گا۔ میں نے اس کے ذہن پر پوری توجہ مرکوز کرنے میں دیر نہیں کی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ لوئی چو نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"ارے یہ تو واقعی ہوش میں آ گئیں!" منیجر کے لہجے میں خوشگوار حیرت تھی: "آپ تو واقعی ٹھیک کہہ رہے تھے، لیکن آپ کو اپنی بات پر اتنا یقین کیسے تھا؟"

میں نے منیجر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے لوئی چو کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے سے اب بھی تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس کے ذہن کو ابھی مزید میری ذہنی توجہ کی ضرورت تھی۔ اب وہ ہوؤن فا کا سہارا لیے بغیر بیٹھی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا: "آپ کو اپنے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا ہے؟" میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

"جی۔۔۔ جی ہاں۔" اس نے جواب دیا، پھر بولی: "مگر مجھے۔۔۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"آپ اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں۔" میں نے اُسے بتایا۔

"ہاں مجھے۔۔۔ مجھے یوں لگا تھا ایک دم کہ میرے دماغ میں برقی لہریں سی دوڑنے لگی ہوں، پھر۔۔۔ پھر چنگاریاں سی اُڑی تھیں اور اس کے بعد تاریکی پھیل گئی تھی۔" لوئی چو نے تفصیل کے ساتھ اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا اور وہ جو کچھ کہہ رہی تھی درست تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" میں اس کی تائید میں بولا: "آپ ابھی کچھ دیر میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی، بس ذرا دیر آرام کی ضرورت ہے۔"

"میں لوئی کو اُوپر کمرے میں لے جاتا ہوں۔" ہوؤن فا نے کہا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ بھی چاہیں تو ساتھ چلیں۔"

"اچھا اب مجھے اجازت دیں۔" منیجر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شکریہ منیجر!" میں نے اس سے کہا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت ویٹر چائے لے کر آگیا۔ ہوؤن فا نے اس سے کہا: "چائے واپس لے جاؤ اور بل لے آؤ کھانے کا۔ چائے ہم اپنے کمرے ہی میں پئیں گے، وہیں منگوا لیں گے۔"

ویٹر چائے واپس لے کر چلا گیا، پھر جلد ہی بل لے کر آگیا۔ ہوؤن فا نے بل ادا کیا، پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں بھی چل رہا ہوں آپ لوگوں کے ساتھ!" میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔

لوئی چو کو ابھی میری ذہنی توجہ کی ضرورت تھی اور دُور رہ کر بھی میں ایسا کر سکتا تھا لیکن میں تو اُس کی قربت چاہتا تھا اسی لیے ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہوؤن فا مجھ سے ساتھ چلنے کو نہ کہتا تو لوئی چو یہ پیش کش ضرور کرتی۔ میں ان دونوں کے ہمراہ لفٹ میں سوار ہو کر ساتویں منزل کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر وہ شخص کون تھا جس نے لوئی چو کا ذہن پڑھنے کی کوشش کی تھی! وہ کیوں لوئی چو کا ذہن پڑھنا چاہتا تھا! لوئی چو میں اس کی دلچسپی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ کیا لوئی چو کا غیر معمولی حُسن؟ لیکن اسے لوئی چو کا ذہن پڑھنے کی کیا ضرورت تھی! جب تک میں ہوؤن فا اور لوئی چو کے ساتھ اُن کے سویٹ میں داخل نہ ہو گیا، میرے ذہن میں ایسے ہی سوالات چکراتے رہے، مگر میں کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔

لوئی چو اندرونی کمرے میں پہنچ کر اپنی مسہری پر دراز ہو گئی۔ مسہری کے قریب ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ ہوؤن فا نے مجھے اس پر بٹھا دیا اور خود اپنے لیے بیرونی کمرے سے کرسی لینے چلا گیا۔ "شاید میں آج پروگرام نہ کر سکوں۔" لوئی چو کمزور سی آواز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں آج آپ آرام ہی کریں تو اچھا ہے، لیکن آپ کے سر کا درد ابھی اچھا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"واقعی!" وہ حیرت سے بولی، پھر طویل سانس لے کر کہا: "آپ کہہ رہے ہیں تو میں یقین کرنے پر مجبور ہوں کیوں کہ جب سے آپ ملے ہیں، آپ نے ایک بات بھی غلط نہیں کہی۔"

اسی وقت ہوؤن فا کرسی اٹھائے وہاں آگیا۔ اس نے اپنی کرسی میرے برابر ہی ڈال لی تھی۔

"یہ کہہ رہے ہیں ہوؤن کہ میرے سر کا درد ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" لوئی چو نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

"اگر یہ کہہ رہے ہیں تو پھر واقعی ٹھیک ہو جائے گا۔" ہوؤن فا بولا، پھر لوئی چو کو یہ بتانے لگا کہ اس کے بے ہوش ہو جانے کے بعد بھی میں نے جلد ہوش میں آ جانے کی پیش گوئی کی تھی۔ آخر میں اس نے کہا: "میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں تمھیں اسپتال لے جاتا۔ وہاں جو لوگ جمع ہو گئے تھے وہ بھی یہی مشورہ دے رہے تھے۔"

میرے اندازے کے مطابق لوئی چو کے ذہن کو جو جھٹکا لگا تھا اسی کی وجہ سے اُس کے سر میں درد تھا۔ اُسے ہلکے ہلکے ذہنی مساج کی ضرورت تھی لیکن میں بہر حال یہ نہیں چاہتا تھا کہ انھیں مجھ پر کسی پُراسرار وجود کا شبہ ہو جائے۔ میں نے اسی لیے اُن کے ذہنوں کو ایک اور ہی راہ پر ڈال دیا۔ میں نے کہا: "سر درد کا تعلق دماغ کی طرف جانے والی اُن نسوں سے ہے جو دماغ کو خون پہنچاتی ہیں۔ یہی نسیں کسی سبب سکڑ جاتی ہیں تو دماغ کو پورا خون نہیں پہنچتا۔ سر میں درد ہونے کا ایک سبب یہی ہے۔ سر درد کی دوسری وجہ بھی یہی نسیں ہیں۔ دوسری صورت میں کسی ذہنی دباؤ کی وجہ سے یا شدید خوشی، حیرت اور غم کے سبب یہی نسیں نسبتاً پھیل بھی جاتی ہیں جس سے دماغ کو خون زیادہ پہنچنے لگتا ہے۔ اس سے بھی پہلے سر بوجھل ہو جاتا ہے پھر درد شروع ہونے لگتا ہے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ بھی سر درد کے اور کئی اسباب ہیں، لیکن ان اسباب پر قابو پانا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ مخصوص نسوں کو مخصوص انداز میں سہلانا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتی ہیں۔"

"آپ تو واقعی کمال آدمی ہیں!" ہوؤن فا مرعوب آواز

میں بولا: "مجھے تو یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا ہوں۔"

میں ہنس دیا "ایسی کوئی بات نہیں۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے پہلے ان کا سر درد دور کرنا ضروری ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی کرسی ذرا آگے سرکائی۔ اس کے بعد میں نے آہستہ آہستہ اپنے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں سے لوئی چو کی دونوں کنپٹیاں سہلانا شروع کر دیں۔ اسی کے ساتھ میری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز تھی۔ مجھے اس کے ذہن کا مساج کرتے ہوئے ابھی بمشکل دو منٹ ہوئے تھے کہ وہ پُرمسرت آواز میں تقریباً چیخ اٹھی۔

"میرا سر درد غائب ہو گیا، بالکل غائب!" میں نے اس کے ماتھے سے ہاتھ ہٹا لیا تو وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہوؤن فا جوشِ جذبات میں اپنی کرسی سے اٹھ کر لوئی چو کے قریب مسہری پر بیٹھ گیا۔

"کیا واقعی... واقعی تم ٹھیک ہو گئیں!" وہ بولا۔

"ہاں بالکل!" لوئی چو نے عالمِ خوشی میں اسے جواب دیا "ان کے ہاتھ میں جانے... جانے کیا جادو تھا۔"

"آپ ٹھیک تو ہو گئی ہیں، لیکن میں یہ مشورہ دوں گا کہ آج پروگرام نہ کریں۔" میں نے مصلحتاً کہا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" ہوؤن فا بھی میری تائید میں فوراً بول اٹھا۔

"ٹھیک ہے، تم اوبرج فون کر دو، میری طبیعت خراب ہونے کے بارے میں بتا دینا۔" لوئی چو نے کہا، پھر میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی: "ظاہر ہے کہ ان کی بات تو نہیں ٹالی جا سکتی۔"

"میں ابھی فون کیے دیتا ہوں۔" ہوؤن فا نے مسہری سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں روم سروس بھی فون کر دینا، چائے کے لیے!" لوئی چو نے اسے یاد دلایا۔ وہیں ایک میز پر فون رکھا ہوا تھا۔ ہوؤن فا اس کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے لوئی چو کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "کیا اب اپنی بقیہ کہانی نہیں سنیں گی؟"

"کیوں نہیں!" وہ جلدی سے بولی "مگر یہ کتنی تعجب کی بات ہے کہ ابھی تک آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا!"

"میرا تعارف ہی کیا!" میں ہنس دیا "بہت معمولی آدمی ہوں۔ اخم میرا نام ہے اور مصر کے ایک شہر صعید کا رہنے والا ہوں۔ یہاں قاہرہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔ دنیا کی مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق ہے اور پامسٹری کو تو آپ میرا اوڑھنا بچھونا کہہ سکتی ہیں۔ فی الحال میرا قیام اسی ہوٹل میں ہے، لیکن کل شاید میں کرائے کے ایک مکان میں منتقل ہو جاؤں۔"

"تعارف کا شکریہ!" وہ بولی "حیرت ہے کہ اتنی کم عمری کے باوجود آپ اتنی صلاحیتوں کے مالک ہیں!"

"یہ منیجر خود تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" ہوؤن فا پست آواز میں بولا۔

"لے آؤ فون یہیں!" لوئی چو نے کہا۔ ہوؤن فا نے فون اٹھا لیا۔ اس کا تار خاصا لمبا تھا۔ لوئی چو نے فون کو مسہری پر رکھ کر ریسیور تھام لیا۔ وہ مجھ سے اب تک اپنی مادری زبان ہی میں گفتگو کر رہی تھی، لیکن اوبرج نائٹ کلب کے منیجر سے اس نے انگریزی میں بات کی۔ اس کی انگریزی ہوؤن فا سے بہرحال بہتر تھی۔ وہ منیجر سے کہہ رہی تھی: "مجبوری ہے ورنہ میں ضرور آتی... جی... جی ہاں رقم کی کوئی فکر نہیں۔ جی... آپ کاٹ سکتے ہیں... ٹھیک ہے، اگر کانٹریکٹ میں یہ نہیں بھی لکھا تو آپ اس طرح کا کوئی ڈرافٹ بنا لیں، میں کل آؤں گی تو دستخط کر دوں گی... جی... بہتر ہے۔" اس نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" ہوؤن فا نے مسہری سے فون اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں، بس ڈبل کونٹریکٹ کی رقم میں سے سوگنی کٹ جائیں گے۔" لوئی چو نے اسے بتایا۔

"تم سے زیادہ سوگنی نہیں ہیں، لعنت بھیجو۔" ہوؤن فا نے لوئی چو کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ لوئی چو جواب میں کچھ نہیں بولی۔ ہوؤن فا، ہوٹل کی روم سروس کو چائے کے لیے فون کرتے ہوئے مجھ سے بولا "کچھ کھائیں گے آپ تو بتا دیں، منگوا لوں۔"

"نہیں، بس چائے منگوا لیجیے۔" میں بولا۔ ہوؤن فا روم سروس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"آپ نے کہاں لیا ہے کرائے پر مکان؟" لوئی چو نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں نے قاہرہ میں۔" میں نے دانستہ احتیاطاً محلے کا نام نہیں بتایا اور اس نے بھی نہیں پوچھا۔

"پھر تو آپ سے ملاقات مشکل ہو جائے گی۔"

"مشکل ہی کیا بات ہے، میں آپ سے ملتا رہوں گا!"

اس دوران میں ہوؤن فا روم سروس فون کر کے پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ فون اس نے دوبارہ میز پر لے جا کر رکھ دیا تھا۔ فون کرتے ہوئے وہ ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے بھی اسی لیے مجھ سے مکان وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا۔ اسے بھی میں نے مختصراً مکان کے متعلق بتا دیا اور اپنا تعارف بھی کرا دیا۔ دراصل میں لوئی چو کے ذہن کا ابھی پورا مطالعہ نہیں کر سکا تھا اس لیے دوبارہ اس سے پامسٹری کا موضوع چھیڑ دیا۔ توقع کے مطابق کچھ دیر بعد ہی اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے ذہن کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے آج تک جتنے بھی ذہنوں کو پڑھا تھا، لوئی چو کی ذہنی ساخت ان سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے ذہن کا ایک چوتھائی حصہ تو بالکل واضح اور روشن تھا، ایک چوتھائی نیم تاریک جسے کوشش کر کے پڑھا جا سکتا تھا اور تقریباً نصف حصہ بالکل تاریک! یہی تجسس مجھے دوبارہ اس کا ذہن پڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں اب اسے جو کچھ بتانے والا تھا، وہ ذہن کے نیم تاریک حصے ہی میں تھا: "ہاں تو لوئی، میں آپ کو بتا رہا تھا کہ..."

"ذرا ٹھہر جائیں۔" لوئی چو ایک دم بول اٹھی "میرا خیال ہے کہ میں عمر میں آپ سے دو ایک سال ہی بڑی ہوں گی اور یہ فرق اتنا زیادہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے تکلف کے ساتھ بات کریں۔"

"ٹھیک ہے" میں فوراً راضی ہو گیا "میں تکلف نہیں برتوں گا لیکن تم بھی مت۔"

"میں اگر اخم کی بجائے اخی کہوں تو بُرا تو نہیں لگے گا تمہیں؟" وہ میری بات کاٹ کر فوراً بے تکلفی پر اتر آئی۔

"نہیں،" میں نے جواب دیا "تم اخی ہی کیا، مجھے صرف شی بھی کہہ سکتی ہو۔"

"اگر تم مجھے اپنا نام بگاڑنے کی اجازت دے رہے ہو تو پھر میں تمہیں اپنے پسندیدہ نام ہی سے کیوں نہ پکارا کروں!" اس کے انداز میں بچپنا تھا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو پھر میں تمہیں شیانگ کہوں گی۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور پھر اس کے ہاتھ کی طرف متوجہ ہو گیا جو میرے ہاتھ میں تھا لیکن میری اصل توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ میں نے دوبارہ اس کا ذہن پڑھتے ہوئے بولنا شروع کیا: "تو میں کہہ رہا تھا کہ تمہیں ایک ادھیڑ عمر شخص چانگ اب سے تقریباً ایک ماہ قبل ملا اور اس نے تمہاری زندگی بدل کر رکھ دی۔ تم نے ایک دم شہرت اور ناموری کی منزلوں کو چھو لیا اور اس کا سہرا چانگ کے سر تھا۔ ٹھیک ہے!" میں نے تصدیق طلب انداز میں لوئی چو کی طرف دیکھا "میرا بیان غلط تو نہیں ہے؟"

"تم جو کہہ رہے ہو، اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے لیکن میں... میں تم سے ایک گزارش کروں گی۔" اس نے التجا آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"بولو۔"

"میں سمجھ چکی ہوں کہ تم وہ بھی جان لو گے جو صرف چند افراد کے علم میں ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو شیانگ کہ اس سلسلے میں اپنی زبان کبھی نہیں کھولو گے!"

"وعدہ۔" میں نے فوراً کہہ دیا۔

"مجھے تم سے یہی امید بھی تھی۔" وہ کھل اٹھی "اب تم بے جھجک ہر بات کہہ سکتے ہو، میں تمہاری طرف سے مطمئن ہوں۔"

"ہاں تو چانگ نے ہی تمہیں شہرت اور ناموری کا گر بتایا۔" میں کہنے لگا۔ میرے ذہن کی لہریں اب روشنی کی حدوں سے نکل کر نیم تاریکی کی حدود چھونے والی تھیں۔ مجھے اب خاصی دشواری پیش آنے لگی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ذہن کا وہ حصہ پڑھ ہی لیا "چانگ نے تمہیں ایک محلول بنا کر دیا کہ تم اسے اپنے جسم پر اسپرے کر لو، تم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور تمہارے جسم سے گلابوں کی خوشبو آنے لگی۔ اسی نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ ایک بار اسپرے کرنے کے بعد پورے ایک مہینے دوبارہ اسپرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ایک بوتل کا محلول دو مرتبہ اسپرے کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے تمہیں اس محلول کی چار بوتلیں دیں جن میں سے تین اب بھی تمہارے پاس ہیں۔ اب تمہیں تقریباً مہینے بھر بعد ہی اسپرے کی ضرورت پڑے گی، گویا یوں

مجھ لو کہ ابھی مزید سات مہینے تمھیں اس کھلونے کی ضرورت نہیں۔ پھر ابھی... ابھی غالباً یہ ماہین کا ذہن مزید تاریک ہو جائے گا۔" بہرحال... میں اپنے ذہن کی پوری توجہ کے ساتھ تھیر کا چہرہ چیر کر اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ "پھر اسی نے تمھیں یہاں قاہرہ بھیجنے کا تمام بندوبست کیا اور برج مانٹ کلب سے اسی نے تمھارا کونٹریکٹ کرایا تھا۔ اس میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اپنے جسم پر اس کھلونے کا اسپرے کرنے کے بعد تمھیں ایک ہی ماہ میں انتہائی شہرت مل گئی۔ تم نے چین کے کئی بڑے شہروں میں پروگرام کیے اور پھولوں کی شہزادی کہلانے لگیں۔ چانگ نے تمھیں مصر روانہ کرتے ہوئے شاید... شاید یہ بھی کہا تھا کہ وہ تم کو عالمگیر شہرت کا حامل دیکھنا چاہتا ہے۔" اس کے بعد میں کوشش کے باوجود کچھ اور نہ پڑھ سکا۔ اب اس کے ذہن کا وہ نصف حصہ شروع ہو چکا تھا جو مکمل تاریکی میں تھا۔ یوں جیسے قدم قدم چلتے ہوئے کوئی گلی بند ہو جائے۔ میں نے ہر طرح اور ہر طرف سے کوشش کی مگر اس کا ذہن تو بند گلیوں کا ایک جال سا تھا جن میں صرف ایک حد تک جانا ممکن تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں میرا ذہن، تاریکی میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔

"شیانگ!" معاً لوئی چو نے مجھے مخاطب کیا۔ "میرے سر میں یکبارگی درد سا شروع ہونے لگا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نوکیلی سی شے زبردستی میرے دماغ میں گھسنا چاہتی ہے۔"

میں نے فوراً ہی اپنی کوشش ترک کر دی اور اسی کے ساتھ اسے بے وقوف بنانے کی خاطر اپنا بایاں ہاتھ جھک کر اس کے ماتھے پر رکھ دیا، پھر بولا۔ "اب تمھیں یہ تکلیف نہیں ہو گی؟"

"ارے واقعی شیانگ!" اس نے حیرت سے کہا۔ "تم نے جیسے ہی میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا، وہ تکلیف جاتی رہی۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ تاریکی میں شگاف ڈالنے کی کوشش کے سبب ہی اسے تکلیف پہنچی تھی۔ میں نے اب اسی لیے اس کے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔

"شیانگ! تم نے میرے ماضی کے بارے میں تو سب کچھ بتا دیا مگر ابھی تک مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا۔" وہ مجھے متاسف ہو کر بولی۔ میں نے اب اس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا تھا جو اس نے اپنی بات پوری کرتے کرتے دوبارہ میری طرف بڑھا دیا۔ "اب ہاتھ دیکھنے کی مزید ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں سب کچھ پڑھ چکا ہوں۔ بولو تم اپنے مستقبل کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"میں کتنے سال جیوں گی؟ مطلب یہ کہ میری عمر کتنی ہے؟" اس نے مستقبل کے بارے میں پہلا سوال وہی کیا جو عموماً لوگ کیا کرتے ہیں۔

"تم بہت دن جیو گی، بڑی عمر ہو گی تمھاری۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"پھر بھی کتنی؟"

"بس یوں سمجھ لو کہ تمھاری گردن ہلنے لگے گی۔" میں ہنس کر بولا۔ مستقبل کے متعلق کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اس لیے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس دوران میں ہوؤن بالکل خاموش ہی رہا تھا حالانکہ لوئی چو اور میں چینی زبان ہی میں گفتگو کر رہے تھے۔ پھر کافی دیر میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس دوران میں چائے بھی پی لی گئی اور دنیا بھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ہوؤن فا نے بھی مجھے اپنا ہاتھ دکھایا تھا، مگر وہ ماضی کے متعلق کچھ جاننے کا آرزومند نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے جتنے بھی سوال کیے، وہ مستقبل ہی کے متعلق تھے۔ ان سوالوں میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا لوئی چو اس کی ہو جائے گی؟ میں، لوئی چو کا ذہن پڑھ کر یہ معلوم ہی کر چکا تھا کہ وہ کسی طور ہوؤن فا کو اپنانے پر آمادہ نہیں تھی۔ میں نے اسی لیے انکار میں جواب دے دیا۔ میرا جواب سن کر وہ کچھ بجھ سا گیا اور پھر اس نے زیادہ سوالات نہیں کیے۔ "ہوؤن فا! یہ تمھاری تقدیر کا فیصلہ ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ "تمھیں فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے تقدیر کا فیصلہ قبول کر لینا چاہیے۔"

"تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو شیانگ!" وہ ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولا۔ وہ بھی لوئی چو کی طرح مجھ سے بے تکلف ہو چکا تھا اور اسی کی تقلید میں اس نے بھی مجھے شیانگ کہنا شروع کر دیا تھا۔

جب میں ان دونوں کے پاس سے آئندہ ملنے کا وعدہ

کر کے اٹھا تو میرا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ اس الجھن کا سبب یہ تھا کہ ہوؤن فا کے ذہن کی ساخت بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں نے لوئی چو کی ذہنی ساخت دیکھی تھی۔ ہوؤن فا کے ذہن کا نصف حصہ بھی مکمل تاریکی میں تھا۔ اس کا ذہن بھی لوئی چو کی طرح تین حصوں میں بٹا ہوا تھا: روشن، نیم تاریک اور مکمل تاریک؛ اور تاریک حصہ تقریباً نصف تھا۔ مجھے کچھ یقین سا تھا کہ اگر میں اپنی تمام تر ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاؤں تو تاریکی میں شگاف ڈال سکتا ہوں، لیکن اس میں خطرہ بہرحال تھا۔ اس کے بعد یقیناً ان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اس کوشش میں ان کے دماغ کی رگیں پھٹ سکتی تھیں۔ میں نے اسی لیے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے ذہنوں کو نہیں چھیڑوں گا۔ بس تجسس ہی تو تھا مجھے، مگر اس تجسس کو رفع کرنے کے لیے ان کی زندگی سے نہیں کھیلا جا سکتا تھا۔

بھوک اب کھل کر لگ آئی تھی اس لیے میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی کھانا منگوا لیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ میں نے اسی لیے کھانے سے فراغت پا کر سونے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی مجھے دوسرے دن صبح جلدی اٹھنا تھا۔ ساڑھے نو بجے صبح مجھے اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر پہنچنا تھا، پھر اسٹیٹ ایجنٹ کو اپنے ساتھ لے جا کر پرانے قاہرہ میں مکان دیکھنا تھا۔ میں نے مسہری پر دراز ہوتے ہی اپنے ذہن کو سونے کی ترغیب دی اور پھر چند لمحے بعد ہی غافل ہو گیا۔

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا جو شور اور ہنگامے سے میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ ہنگامہ ایک دم جیسے ختم ہو گیا۔ اب میں نے اتنا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہنگامہ کمرے کے باہر راہ داری میں ہو رہا تھا۔ معاً باہر سے ایک آواز سنائی دی: "ان میں سے دو بھاگ گئے ہیں اور دو کو ہم نے گرا لیا ہے۔ تم اپنا کام شروع کر دو۔" پھر وہی آواز چند لمحوں کے توقف سے پھر سنائی دی: "آپ لوگوں سے ہماری درخواست ہے کہ اس معاملے میں مداخلت نہ کریں اور خاموشی کے ساتھ اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ ہم آپ سے کچھ نہیں کہیں گے ورنہ ہمیں انتہائی کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہمارے سب آدمی مسلح ہیں۔" یہ دھمکی آمیز الفاظ انگریزی زبان میں ادا کیے گئے تھے، لیکن لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ شخص انگریز نہیں تھا، اس کی عمر چالیس سال سے کم معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میں صرف آواز سن کر بھی لوگوں کی عمروں کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

یقیناً اس شخص کے الفاظ نے لوگوں پر اثر کیا تھا۔ میں نے ایسی آوازیں سنی تھیں جیسے ادھر ادھر آس پاس کے کمروں کے دروازے بند کیے جا رہے ہوں۔ اسی کے ساتھ اچانک مجھے بدبو سی محسوس ہوئی۔ یہ بدبو میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنا سانس روک لیا اور پھر جیسے سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ سارا ہنگامہ یقیناً میرے ہی لیے برپا ہوا تھا اور یہاں وقت میرے کمرے میں بے ہوشی کی گیس نہ بھری جا رہی ہوتی، میں ایک دم بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اب تک میرے لیے یہ بات ایک معما ہی تھی کہ مجھے اغوا کرنے جانے والوں کی راہ میں کون لوگ حائل ہو گئے تھے؟ ان میں سے دو فرار ہو چکے تھے اور دو کو گرا لیا گیا تھا، اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ انھوں نے مجھے اغوا کرنے والوں سے مقابلہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ بے ہوش کر دینے والی گیس کس طرح اور کیسے میرے کمرے میں بھری جا رہی تھی؟ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ میرے دشمن ہی تھے، مگر ان کا تعلق کس ملک سے تھا؟ میں کم از کم ایک گھنٹے اپنا سانس روک سکتا تھا اس لیے مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ گیس مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اسی لیے کمرے کے باہر موجود افراد کے ذہنوں سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں کی۔

ان کی تعداد چھ تھی۔ مسلح ہونے کے علاوہ ان کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ انھی میں سے دو میرے کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے بڑا سا گیس سلنڈر سنبھال رکھا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ربڑ کی لمبی سی نلکی تھی۔ ان دونوں کے چہروں پر گیس ماسک بھی موجود تھے۔ ربڑ کی نلکی کا ایک سرا گیس سلنڈر سے منسلک تھا اور دوسرے سرے سے ذرا پہلے چھوٹا سا ایک آہنی ہینڈل سا لگا ہوا تھا جسے اس شخص نے دبا رکھا تھا۔ گیس کا اخراج یقیناً اسی ہینڈل کے دبانے سے ہو رہا تھا۔ نلکی کا دوسرا سرا کمرے کے کواڑوں کے نیچے سے اندر سرکا دیا گیا تھا۔ ان دونوں کے قریب ہی بقیہ چاروں ساتھی ریوالور تانے مستعد کھڑے تھے۔ ان لوگوں سے ذرا فاصلے پر راہ داری میں دو افراد پڑے ہوئے تھے جو غالباً ان لوگوں کے خیال میں

بے ہوش تھے۔ یہ انھی چاروں میں سے تھے جنھوں نے مزاحمت کی تھی۔ بقول بے ہوش افراد کے چہروں پر نقابیں نہیں تھیں۔ لوگوں کے ذہن پڑھ کر کسی بھی جگہ کا حلیہ بیان کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا، اس کا تجربہ مجھے بارہا ہو چکا تھا۔

یہ بات میرے لیے دلچسپی سے خالی نہیں تھی کہ اُن چھ افراد میں سے ایک عورت بھی تھی اور وہ عورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اُس عورت کا ذہن پڑھنے کے بعد مجھے مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ امریکی ایجنٹ گلوریا تھی۔ وہی گلوریا جس کے ذریعے تھری ناٹ نے میریڈین ہوٹل کے بار میں لیزا کو ایک پیغام بھیجا تھا۔ گلوریا ہی کے ہاتھ میں اس وقت ربر کی وہ نلکی تھی جس سے گیس خارج ہو کر میرے کمرے میں بھر رہی تھی۔ گویا مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ تھری ناٹ نے مجھے ایک بار پھر تلاش کر لیا تھا۔ اس بار مجھے اغوا کرنے کے لیے تھری ناٹ نے گلوریا کو آگے کر دیا تھا۔ خود وہ حسبِ معمول پس پردہ رہا تھا۔ گلوریا کے ساتھ جو لوگ تھے، اُن کی حیثیت کرائے کے ٹٹوؤں سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ سب جرائم پیشہ تھے اور رقم کے حصول کی خاطر سب کچھ کر سکتے تھے۔

گلوریا کا ذہن پڑھ کر مجھے تھری ناٹ کے پورے منصوبے کا علم ہو گیا تھا۔ تھری ناٹ نے آج ہی رات نو بجے کے قریب ٹرانسمیٹر کے ذریعے گلوریا سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ گیس سلنڈر بھی تھری ناٹ ہی نے گلوریا کی قیام گاہ پر بھجوایا تھا۔ اسی نے گلوریا کو میرے کمرے کا نمبر بتایا تھا اور یہ بھی کہ مجھ پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تھری ناٹ نے میرے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کر دی تھیں۔ یہ کام بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے تھری ناٹ نے ہی گلوریا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کچھ جرائم پیشہ افراد کو بھی اپنے ساتھ لے لے۔ مجھے بے ہوشی کی حالت ہی میں ایک بند وین کے ذریعے [illegible] لے جایا جانے والا تھا، گلوریا کی قیام گاہ پر! گلوریا کو بقیہ احکام تقریباً وہی دیے گئے تھے جن پر پہلے میرے اغوا کے سلسلے میں نیلے سوٹ والے کو عمل کرنا تھا۔ وین ہی میں مجھے بے ہوشی کا ایک انجکشن اور دیا جاتا تھا، پھر گلوریا کو اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر تھری ناٹ کے پیغام کا انتظار کرنا تھا۔ میرے اغوا میں اس مرتبہ بھی تھری ناٹ نے بہت محتاط انداز اختیار کیا تھا جب تک اسے میرے ذہن سے رابطہ قائم کر کے اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ میں واقعی بے ہوش ہوں، وہ سامنے نہ آتا۔ ایسی صورت میں اگر میں دوبارہ وہی طریقۂ کار اختیار کرتا جس پر گزشتہ دن عمل کیا تھا تو ایسا کرنا بیکار ہی ہوتا۔ میں اس طرح ہرگز تھری ناٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میرے لیے یہ بہت آسان تھا کہ گلوریا سمیت ان تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ پانچوں جرائم پیشہ افراد اس معاملے سے قطعی الگ اور لاتعلق تھے۔ انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ براہِ راست اُن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ انھیں قتل کرنا زیادتی ہوتی۔ رہی گلوریا تو اُسے میں مصلحتاً ابھی زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ ایک وہی ایسی تھی جس سے جلد یا بدیر تھری ناٹ کی ملاقات کا امکان تھا۔ پچیس فی صد یہ امکان تھا کہ میں اُس کے ذریعے تھری ناٹ تک پہنچ جاتا۔ پچیس فی صد اس لیے کہ تھری ناٹ ایسے چالاک ایجنٹ سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ اس واقعے کے بعد گلوریا سے ملنے کی بھی کوشش نہ کرتا۔ بہرحال یہ امکان تھا اور میں اس امکان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے پھر دیر نہیں کی۔ باری باری میں نے ان پانچوں جرائم پیشہ افراد کے ذہنوں سے رابطہ قائم کیا۔ پھر نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ اُن میں سے ایک چیخ اٹھا: "بھاگو، پولیس!"
پھر وہ سب ایک دم اس طرح گلوریا کو وہاں تنہا چھوڑ کر بھاگ اٹھے جیسے موت اُن کے تعاقب میں ہو۔ جو شخص گیس سلنڈر سنبھالے ہوئے گلوریا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، وہ بھی اچانک اٹھ کر بھاگ گیا تھا۔

"ٹھہرو!... ٹھہرو!" گلوریا نے انھیں آوازیں دیں، مگر اُن میں سے کوئی نہیں رکا۔ چند ہی لمحوں میں گلوریا کو صورتِ حال کا احساس ہو گیا۔ وہ تنہا رہ گئی تھی اور اُس کے لیے اب مجھے اغوا کر کے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ نتیجتاً اُسے بھی راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ گیس سلنڈر زیادہ بھاری نہیں تھا اس لیے اُسے اٹھا کر وہ تیزی سے لفٹ کی طرف بھاگی۔ راہ داری ابھی تک سنسان ہی پڑی تھی۔ وہ پانچوں فرار ہو چکے تھے۔ ابھی گلوریا لفٹ کے دروازے تک نہیں پہنچ سکی تھی کہ اچانک سیٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ یقیناً اس واقعے سے بے خبر نہیں رہی تھی۔ تیسری منزل ہی کے کسی مسافر نے انتظامیہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہو گا اور انتظامیہ نے فوراً ہی پولیس کو طلب کر لیا ہو گا۔ پولیس

کی وہاں آمد سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی کہ میں نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا۔ سیٹیوں کی آوازیں زینے کی طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ گلوریا کے لیے لفٹ کے ذریعے فرار ہونے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا لیکن اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ لفٹ کی آمد کا انتظار کر سکتی۔ میرے ذہن کی تمام قوتیں بیدار تھیں اور میری سماعت کا دائرہ بھی وسیع ہو چکا تھا۔ میں کمرے میں رہ کر بھی باہر کی ہر آواز بہ آسانی سن رہا تھا۔

گلوریا اگر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی تو میرے لیے تھری ناٹ تک پہنچنے کا ایک امکانی راستہ بھی بند ہو جاتا۔ میں نے اسی لیے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنے دوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس نے لفٹ کے ذریعے فرار ہونے کی راہ بھی مسدود کر دی ہو گی۔ گلوریا نہ اب لفٹ کے ذریعے نیچے جا سکتی تھی اور نہ فرار ہونے کے لیے زینے استعمال کر سکتی تھی۔ فی الحال پولیس سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ تھی کہ وہ نیچے جانے اور فوراً ہوٹل سے فرار ہونے کی بجائے اوپری منزلوں کا رُخ کرتی۔ میں نے جب گلوریا کے ذہن سے رابطہ قائم کیا تو وہ بے حد بوکھلائی ہوئی تھی۔ اُس صورتِ حال سے نمٹنے کی اُس کے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا ذہن میری گرفت میں آ گیا۔ اب وہ ہر عمل میری ہی مرضی کے مطابق کرتی لیکن سمجھتی یہی کہ وہ بات خود بہ خود اُس کے ذہن میں آ گئی ہے۔

پولیس سے فی الحال اسی طرح بچا جا سکتا ہے کہ اوپری منزلوں کا رُخ کیا جائے۔ میں نے اُس کے ذہن کو ترغیب دی۔ اُس کے ذہن نے فوراً ہی اس ترغیب پر عمل کیا۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف دوڑی۔

گیس سلنڈر کہیں پھینک دینا چاہیے اور چہرے پر نقاب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میرے ذہن نے اسے پھر حکم دیا جسے وہ خود اپنے ہی ذہن کا خیال سمجھی۔ اُس نے زینے کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے گیس سلنڈر بھی پھینک دیا اور نقاب بھی چہرے سے اتار کر پھینک دی۔ ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں اسے مجرم ہی تصور کیا جاتا۔ گلوریا کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں مجھے یقیناً چند لمحوں کی تاخیر ہو گئی تھی اسی لیے زینے سے اوپر چڑھتے ہوئے پولیس والوں نے اُسے اوپر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

"ایک عورت اوپر گئی ہے، بھاگتی ہوئی!" کوئی پولیس والا چلایا۔
"اُس کا پیچھا کرو!" جواب میں کسی نے عقب سے حکم دیا۔
"وہ بھی مجرموں کی ساتھی ہو سکتی ہے۔"
گلوریا نے بھی یہ الفاظ سن لیے تھے اور وہ گھبرا گئی تھی۔

اب میرا کمرے سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اسی کے ساتھ میرا وجود نادیدہ ہو گیا۔ کمرے سے باہر آتے ہی میں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ جب تک میں آگے بڑھا، پولیس والے، گلوریا کے تعاقب میں سیڑھیاں چڑھ چکے تھے۔ گلوریا کے ذہن سے اب تک میرا رابطہ قائم تھا۔ وہ چوتھی منزل پر پہنچ چکی تھی اور اب اُس کا رُخ پانچویں منزل کے زینے کی طرف تھا۔ میں کسی طوفانی جھونکے کی طرح پولیس والوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا چوتھی منزل پر پہنچ گیا۔ پولیس والوں کے مقابلے میں گلوریا کے بھاگنے کی رفتار کم تھی اس لیے درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اِدھر گلوریا نے پانچویں منزل کے زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، اُدھر میں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا لیا۔ وہ شدتِ حیرت اور خوف کے سبب چیخنے ہی والی تھی کہ میں نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا اور اُسے اٹھائے ہوئے پانچویں پھر چھٹی اور پھر ساتویں منزل تک پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ ساتویں منزل تک پہنچنے میں مجھے صرف چند لمحے لگے تھے۔ پولیس والے یقیناً ابھی پانچویں منزل کے زینے تک پہنچ سکے ہوں گے۔ ساتویں منزل کی راہ داری تک پہنچ کر میں نے اس عقبی زینے کا رُخ کیا جو عموماً ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ عقبی زینے عام طور پر استعمال میں نہیں رہتے تھے اس لیے وہ گندے اور تنگ بھی تھے اور اُن میں روشنی بھی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ تاریکی میرے لیے کوئی دشواری پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ میں اسی لیے تیزی سے نیچے اترتا رہا۔ اُن زینوں کے ذریعے میں ہوٹل کے عقب میں پہنچ سکتا تھا۔ جلد ہی میں پہلی منزل تک پہنچ گیا، مگر میں وہاں بھی نہیں رکا۔

اگر میں اندھیرے میں دیکھنے کا اہل نہ ہوتا تو یقیناً اُس بند آہنی دروازے سے ٹکرا گیا ہوتا جو سیڑھیوں کے اختتام پر مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ آہنی دروازہ دوسری جانب سے مقفل تھا۔ میرے بجائے کوئی اور ہوتا تو یقیناً ہمت ہار بیٹھتا کیوں کہ اُس

دروازے سے نکلنا ناممکن تھا۔ وہ کافی مضبوط تھا۔ کوئی طاقتور سے طاقتور شخص اُسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ گوریا کو میں اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ دروازہ توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے ہاتھ آزاد ہوتے۔ میں نے اسی لیے اُسے آہستگی سے کھڑا کر دیا۔ اُس کی زبان پر اب بھی گویا مُہر لگی ہوئی تھی، مگر اُس کے ذہن میں بھونچال سا آ رہا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، اُس پر وہ انتہائی حیرت زدہ تھی اور خوف زدہ بھی! اُس نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ اُسے کوئی اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے ہے، لیکن نظر کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے یہ بات حیرت انگیز اور پُراسرار تھی۔ اسی دوران میں اُسے ایک بار میرا خیال بھی آیا تھا۔ تھری ناٹ اُسے میرے متعلق سب کچھ بتا چکا تھا کہ میرے وجود میں کیا قوتیں چھپی ہوئی ہیں! اُس نے سوچا تھا کہ کہیں وہ ابوالہول کے بازوؤں میں تو نہیں؟ لیکن خود ہی اس نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں ابوالہول کو آخر کیا پڑی تھی جو اُسے فرار ہونے میں مدد دیتا! اور پھر ابوالہول تو اپنے کمرے میں غالباً بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

میں گوریا کو زینے کی آخری سیڑھی پر کھڑا کرتے ہی آہنی دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دروازہ توڑ بھی دیا جاتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ بعد میں یہی سمجھا جاتا کہ مجرم اسی راستے سے فرار ہوئے ہوں گے۔ ہاں یہ بات ان کے لیے حیران کُن ضرور ہوتی کہ مجرموں نے اتنے مضبوط آہنی دروازے کو توڑ کیسے دیا؟ لیکن ظاہر ہے کہ ہوٹل کی انتظامیہ یا پولیس کی حیرانی سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے وہ آہنی دروازہ توڑنے میں دیر نہیں لگی، مگر میں نے اس کا خیال رکھا تھا کہ زیادہ شور نہ ہو۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ دروازے کے دونوں پٹوں میں سے ایک پٹ کے قبضے نکال دیے تھے۔ اس سے دروازے کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور زیادہ شور بھی نہیں ہوا تھا۔

زینے کے دروازے سے کچھ فاصلے ہی پر ہوٹل کا عقبی پھاٹک نظر آ رہا تھا۔ وہاں اُس وقت کوئی نہیں تھا، لیکن پھاٹک بھی بند ہی تھا۔ اُس میں بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا۔ اُس پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کود جانا زیادہ مشکل نہیں تھا اس لیے تالا توڑنا بے ضرورت ہی تھا۔

زینے کا دروازہ ٹوٹ جانے کے باوجود بھی گوریا اپنی جگہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود سے ایک قدم بھی اٹھا سکتی۔ مجبوراً مجھے ہی یہ بتانا پڑا کہ اب اُسے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ اسی کے ساتھ میں نے گوریا کے ذہن کو چند ضروری احکام دیے اور پھر اُس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ اب اگر تھری ناٹ اس سے کچھ پوچھتا یا اُس کا ذہن پڑھتا تو اُسے وہی معلومات حاصل ہوتیں جو میں چاہتا تھا۔ گوریا کے ذہن میں اب اُس تجربے کی کوئی یاد تازہ نہیں تھی جسے وہ پُراسرار سمجھی تھی۔ اپنی دانست میں وہ خود پولیس کو جُل دے کر فرار ہوئی تھی۔ فرار کے لیے اُس نے عقبی زینوں کو استعمال کیا تھا اور زینے کا دروازہ اُسے ٹوٹا ہوا ملا تھا۔

گوریا میرے سامنے عقبی پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی تو میں نے وہاں مزید رُکنا ضروری نہ سمجھا۔ واپسی کے لیے بھی میں نے عقبی زینے ہی استعمال کیے۔ میں تیسری منزل پر پہنچا تو چونک اٹھا۔ وہاں سے وہ دونوں افراد غائب ہو چکے تھے جو بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ پولیس والے کیوں کہ گوریا کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اُس کا تعاقب کر رہے تھے اس لیے یا تو اُن دونوں کو انھوں نے دیکھا ہی نہیں تھا یا پھر دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ غالباً یہ سوچ کر کہ وہ لوگ بے ہوش ہیں، کہاں جائیں گے! اور یہ کہ اُن دونوں بے ہوش افراد کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ وہ غائب ہو گئے تھے۔ اِس کا مطلب یہی تھا کہ اُنھیں ہوش آ گیا ہوگا، پھر ہوش میں آتے ہی وہ فرار ہو گئے ہوں گے۔

وہ دونوں پولیس کی تحویل میں بھی ہو سکتے ہیں! اِس کا امکان صرف پانچ فی صد تھا۔ میں اُن دونوں کے بارے میں قطعی بے خبر ہی رہا تھا کہ وہ کون ہیں؟ مجھے اسی لیے اُن کی تلاش تھی اور اُن کے غائب ہو جانے پر افسوس تھا۔ میں بہرحال یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے جو مجھے تھری ناٹ کے حملے سے بچانا چاہتے تھے، اور اس سے اُن کا مقصد کیا تھا؟ پھر یہ بھی میرے لیے معما ہی تھا کہ انھیں تھری ناٹ کے حملے کی خبر کیسے ہو گئی؟ اِس کا میری نظر میں صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ میرے کمرے کی نگرانی کر رہے ہوں، مگر کیوں؟ وہ میرے کمرے کی نگرانی کیوں کر رہے تھے؟ اور اگر وہ میرے دوست نہیں، دشمن تھے تو پھر خود انھوں نے اس موقعے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟ میں ان تمام سوالوں پر اطمینان سے غور کرنا چاہتا تھا اس لیے فی الحال اُن دونوں کی تلاش تک اپنے خیالات کو محدود رکھا۔

میرا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ پولیس والوں نے اُن دونوں کو دیکھ تو لیا تھا مگر وقتی طور پر نظر انداز کر دیا تھا کیوں کہ وہ بے ہوش تھے۔ وہ دونوں پولیس کی تحویل میں نہیں تھے۔ پولیس والے اب تک اوپری منزلوں پر گوریا کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ اس وقت وہ ہوٹل کی دسویں منزل سے ناکام لوٹ رہے تھے۔ گوریا انھیں کہیں نہیں مل سکی تھی۔ پولیس والوں کے خیال میں یا تو گوریا خود اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی یا پھر وہاں اُس کا کوئی ساتھی ٹھہرا ہوا تھا۔ پولیس والوں کے خیال میں گوریا نے وہیں پناہ لے لی تھی۔ یہ بات اُن کے وہم و گمان میں نہیں تھی کہ گوریا ہوٹل سے فرار ہو چکی ہے۔ پولیس والوں نے گوریا کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھا تھا اس لیے ہوٹل میں سکونت اختیار کرنے والوں کو پریشان کرنا، اُن کے خیال میں بے سود ہی تھا۔ گوریا کے پانچوں جرائم پیشہ ساتھیوں کو یقیناً پولیس کی آمد سے پہلے ہی ہوٹل سے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا ورنہ وہ زیرِ حراست ہوتے۔ پولیس والوں کو اب تیسری منزل پر پڑے ہوئے بے ہوش افراد کا خیال آیا تھا۔ گوریا کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد اب انھیں یہ امید تھی کہ وہ بے ہوش افراد اِس واقعے پر تفصیلی روشنی ڈال سکیں گے۔

میں بھی ان دونوں کی تلاش میں ناکام ہو کر الجھا الجھا سا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنا سانس روک لیا تھا کیوں کہ اس میں اب بھی گیس بھری ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں تاکہ گیس باہر نکل جائے۔ پھر صوفے پر بیٹھتے ہی میں نے اپنی تجسیم کر لی۔ اب مجھے مزید نادیدہ بنے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ گیس، کھڑکیوں کے راستے باہر نکل چکی ہوگی تو میں نے آہستہ سے سانس لیا۔ ہوا میں اب بھی گیس کی ہلکی سی آمیزش تھی، مگر وہ زیادہ مضر ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اسی لیے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ذرا سی دیر میں وہ ہلکی سی آمیزش بھی ختم ہو گئی۔ میں نے وقت دیکھا تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اب میں موجودہ حالات پر از سرِ نو غور کرنا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں پہلا خیال تو مجھے یہ آیا کہ اب یہاں مزید قیام میرے لیے ناممکن ہے۔ وہ جگہ بہرحال میرے دشمنوں کی نظر میں آ چکی تھی۔ وہ دوسرا حملہ بھی کر سکتے تھے، لیکن مجھے فوراً ہی دوسرے حملے کی توقع نہیں تھی۔ اس میں یقیناً کچھ وقت لگتا، مگر مجھے اُس سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے تھی۔ کسی اسباب پر فی الحال غور و خوض کرنے کی بجائے میں نے اسی کو فوقیت دی۔

شخصیت کی تبدیلی پھر ضروری ہو گئی تھی کیوں کہ میں اشتر کی حیثیت سے بھی تھری ناٹ کی نظر میں آ چکا تھا۔ میں نے اِس لیے سب سے پہلے اپنا پرانا میک اَپ ختم کر کے نیا میک اَپ کیا جس میں مجھے تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ میں نے اپنے چہرے پر ایک بار پھر ادھیڑ عمر شخص کا میک اَپ کر لیا تھا۔ اب میرے چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری عمر پینتالیس سال سے کم ہوگی۔ میک اَپ کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ میری شخصیت پُرکشش اور باوقار نظر آئے۔

میک اَپ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اٹیچیاں اٹھا لیں جو کپڑوں اور دیگر ضروری اشیا سے بھری ہوئی تھیں۔ میں اپنے ذہن میں لائحہ عمل پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ کمرے سے نکل کر عقبی زینوں تک پہنچنے میں، میں نے بہت تیزی کا ثبوت دیا۔ راہ داری خالی پڑی تھی۔ پولیس والے وہاں سے بہت پہلے ہی جا چکے تھے اور صبح ساڑھے چار بجے کسی کو کیا پڑی تھی کہ اپنے کمرے سے نکلتا۔ پولیس والوں نے یا تو تیسری منزل پر مختلف کمروں میں قیام پذیر افراد سے پوچھ گچھ نہیں کی تھی یا پھر اس سلسلے میں انھوں نے میرے کمرے کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا۔ مجھے یہ جاننے کی کوئی جستجو بھی نہیں تھی کہ پولیس نے کیا معلوم کیا اور کیا نہیں! اگر پولیس نے لوگوں کے بیانات بھی لیے ہوں گے تو اُسے یہی معلوم ہوا ہوگا کہ پہلے دو گروہوں میں جھڑپ ہوئی جن میں سے ایک گروہ نقاب پوشوں کا تھا۔ پھر ایک گروہ شکست کھا گیا۔ اس کے بعد اُن مسلح نقاب پوشوں نے انھیں اپنے اپنے کمروں میں چلے جانے کا حکم دیا۔ پھر کیا ہوا؟ اس کا جواب کوئی نہ دے سکا ہوگا۔

عقبی زینہ طے کر کے میں نیچے پہنچ گیا۔ دونوں اٹیچیاں اٹھائے ہوئے پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا مشکل تھا اس لیے مجبوراً مجھے پھاٹک کا تالا توڑنا پڑا۔ پھاٹک کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔ ہوٹل کے عقب میں ایک پتلی سی سڑک تھی جو سنسان پڑی ہوئی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے دوبارہ ہوٹل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہونے کے لیے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑا۔

پولیس ابھی ہوٹل میں موجود تھی۔ میں سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے دوبارہ ہوٹل بلڈنگ میں کمرا مل گیا۔ اس بار مجھے دوسرا

بی منزل پر ایک خالی کمرا مل گیا تھا۔ اب میں ایک نئی حیثیت اور نئے نام سے وہاں ٹھہرا تھا۔ میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام ابوزید لکھایا تھا۔ میرے حافظے میں یہ بات محفوظ تھی کہ ابوزید عرب کا ایک مشہور و معروف شاطر گزرا ہے۔ شاید اپنا یہ نام رکھنے کا سبب وہ شاطرانہ کھیل ہو جو میں اپنے دشمنوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس بار میں نے خود کو اسکندریہ کا ایک تاجر ظاہر کیا تھا۔

بلٹر بوائے کمرے میں سامان رکھ کر چلا گیا تو میں نے دروازہ بند کیا اور لباس تبدیل کر کے مسہری پر دراز ہو گیا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے اتنی جلدی جلدی اپنی شخصیت نہیں بدلنی پڑی تھی اور نہ دوبارہ اتنی جلدی میرے دشمن مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ شاید اس کا سبب کچھ تو میری کمزوریاں تھیں اور کچھ یہ کہ میرے دشمن غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس بار میں نے وہ شہر اور وہ ملک نہیں چھوڑا تھا جہاں میرے دشمنوں نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔

میرے ذہن میں متعدد سوالات گردش کر رہے تھے جن پر میں باری باری غور کرنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس سوال پر غور کرنا ضروری سمجھا کہ مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی جو جیری ناٹ نے دوبارہ اتنی جلدی مجھے تلاش کر لیا؟ میں نے اس وقت سے حالات پر غور شروع کیا جب سے گزشتہ میک اپ کیا تھا اور ایک نئی شخصیت اپنائی تھی۔ گزشتہ روز ہی صبح میں ہوٹل ہلٹن میں ایک نئے نام اور نئی شخصیت سے داخل ہوا تھا۔ میرے چہرے پر اس وقت ایک بائیس سالہ نوجوان کا میک اپ تھا اور ہوٹل میں اپنا نام میں نے اشم بتایا تھا۔ پھر میں کچھ دیر ہوٹل میں رہ کر اسپتال روانہ ہو گیا۔ ابوالہول کی حیثیت سے مجھے اس میک اپ میں جن چار افراد نے دیکھا تھا وہ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس صورت میں جیری ناٹ کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کہاں اور کس نام سے رہ رہا ہوں اور میری سکونت کے متعلق تو ان چاروں کو بھی کچھ خبر نہیں ہو سکتی تھی جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ پھر جیری ناٹ کو یہ علم کیسے ہو گیا کہ میں ہوٹل ہلٹن میں کس نام سے ٹھہرا ہوا ہوں؟ اس سوال پر میں کافی دیر سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اور اپنی گزشتہ روز کی نقل و حرکت پر غور کرتے ہوئے اچانک مجھے وہ شخص یاد آ گیا جس نے ٹونی جو کا ذہن پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جیری ناٹ بھی تو ہو سکتا ہے! میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ میں انھی خطوط پر سوچنے لگا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے ٹونی جو کی طرف متوجہ کرنے کا جو سبب بنا تھا، اسی وجہ سے جیری ناٹ نے اُدھر توجہ دی ہو؟ وہ اشتہار جیری ناٹ ایسے شخص کو بھی توجہ دینے پر مجبور کر سکتا تھا جو صفت مجھ سے مخصوص تھی، وہی اس چینی رقاصہ میں تھی۔ کیا جیری ناٹ نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ میں، ٹونی جو سے ملنے کی کوشش کروں گا؟ یقیناً وہ یہ سوچ سکتا تھا۔

تھوڑی دیر میں میرے ذہن نے ایک ممکنہ کہانی ترتیب دے لی۔ جیری ناٹ نے وہ اشتہار دیکھا جو دور دور سے اخبارات میں شائع ہو رہا تھا کہ پہلے دن تو تقریباً شام تک میں باردن کی حیثیت سے اس کی نظر میں تھا اس لیے اس نے ٹونی جو کی طرف توجہ نہیں دی۔ لیکن جب وہ مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکا اور ناکام رہا تو دوسرا حربہ استعمال کیا۔ یہ دوسرا حربہ میری ہال کے فرضی قتل کا ڈھونگ تھا۔ اس کا یہ ڈھونگ بھی کھل گیا اور میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے ٹونی جو پر توجہ دی۔ وہ ٹونی جو کی حقیقت جاننا چاہتا تھا اس لیے ہوٹل ہلٹن کے ڈائننگ ہال میں اس نے ٹونی جو کا ذہن پڑھنا چاہا۔ اس کے بعد وہ غالباً ٹونی جو پر نظر رکھنا چاہتا تھا یہ اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے یا جیری ناٹ کی خوش قسمتی کہ جب وہ ٹونی جو کا ذہن پڑھ رہا تھا تو اس وقت خود میں بھی اسی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے یقیناً مجھے ٹونی جو کی میز پر بیٹھے دیکھا ہوگا۔ پھر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے علاوہ اور کون ٹونی جو کا ذہن پڑھ سکتا ہے۔ اس وقت جیری ناٹ یقیناً تنہا نہیں ہوگا۔ وہ اسی لیے خود تو وہاں سے فرار ہو گیا اور اپنے کسی ساتھی کو میری نگرانی پر چھوڑ گیا۔ اپنے ساتھی ہی سے جیری ناٹ کو میرے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ میں، ہوٹل ہلٹن کی کون سی منزل اور کس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ساتھی نے ٹونی جو کے کمرے کے باہر گوش بر آواز ہو کر اندر ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کی ہو اور کچھ باتیں سننے میں کامیاب بھی ہو گیا ہو۔ اپنے ساتھی سے یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے گویا سے رابطہ قائم کیا اور میرے اغوا کے احکام دیے۔

مجھے اپنی مفروضہ کہانی میں خود بھی کہیں کہیں جھول نظر آ رہے تھے اس لیے مزید سوچ بچار کرنے لگا کہ جیری ناٹ کو اور کس طرح یہ معلوم ہو سکتا ہے، میں کہاں ہوں؟ وہ کس طرح میرا سراغ لگا سکتا ہے؟ مزید سوچ بچار کے بعد میرے ذہن نے ایک اور کہانی ترتیب

دے دی اور یہ کہانی پہلی کہانی سے زیادہ مضبوط تھی۔ اس نئی کہانی کی ترتیب کا سبب وہ گفتگو تھی جو مقامی اطالوی ایجنٹوں کے درمیان اس وقت ہوئی جب میں بہ ظاہر بے ہوش اور ان کی قید میں تھا۔ جب نیلے سوٹ والے سے اس کے کسی ساتھی نے یہ سوال کیا تھا کہ جیری ناٹ کو ان کی واپسی کا علم کس طرح ہو گیا؟ نیلے سوٹ والے نے تو اس کا کوئی مناسب جواب نہیں دیا تھا مگر انھی میں سے ایک نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جیری ناٹ ان لوگوں کی نگرانی کراتا ہوگا۔ اسے اسی لیے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ چکے ہیں۔ اس بات پر میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا ورنہ ان چاروں کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں اپنا میک اپ تبدیل کر دیتا اور انھیں موت کے گھاٹ اتار کر مطمئن نہ ہو جاتا۔ ان چاروں کی نگرانی کا واضح مطلب یہ تھا کہ ان کے علاوہ بھی جیری ناٹ کے کسی ساتھی نے مجھے اشم کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اس نتیجے تک پہنچ کر میرا ذہن دوسری کہانی ترتیب دینے لگا۔ وہ شخص جو ان چاروں کی نگرانی پر جیری ناٹ کی طرف سے مامور تھا اس نے جیری ناٹ کو ٹرانسمیٹر پر یہ اطلاع دی کہ مجھے اغوا کر کے عمارت میں لے جایا جا چکا ہے۔ جیری ناٹ نے اسے وہیں عمارت کی نگرانی کا حکم دیا کہ اگر میں کسی طرح ان لوگوں کی قید سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں تو وہ میرا تعاقب کرے اور میرے ٹھکانے کا سراغ لگائے۔ وہ شخص، جیری ناٹ کا گرگا، عمارت کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ پھر جب جیری ناٹ مجھے ہوش میں پا کر وہاں سے بھاگا تو بھی وہ شخص وہیں تھا۔ میری نظر اس پر اس لیے نہیں پڑ سکی ہوگی کہ میں اس وقت جیری ناٹ کی تلاش میں تھا۔ پھر جب میں ان چاروں کو قتل کر کے اس عمارت سے نکلا اور اپنے وجود کی تجسیم کر لی تو اسی شخص نے ہوٹل ہلٹن تک میرا تعاقب کیا۔

دوسری مفروضہ کہانی میں میرے خیال سے کوئی جھول نہیں تھا۔ اس طرح جیری ناٹ کو بہ آسانی یہ علم ہو سکتا تھا کہ میں کہاں اور کس حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں اور یہ کہ میرے کمرے کا نمبر کیا ہے! میں نے اس پر جتنا غور کیا، یہی کہانی مجھے درست معلوم ہوئی۔ گویا گزشتہ دن صبح ہی سے میں، جیری ناٹ کی نظر میں تھا۔ پھر رات کو اس نے مجھے ٹونی جو کی میز پر دیکھا۔ میں کیوں کہ کافی دیر ٹونی جو کے کمرے میں رہا تھا اور اس کے بعد اپنے کمرے کا رخ کیا تھا اس لیے جیری ناٹ کو مجھ پر حملہ کرانے کا موقع نہیں ملا ہوگا لیکن اب اسے علم ہی تھا کہ میں، ہوٹل کے کس کمرے میں ہوں، غالباً اس لیے اس نے اطمینان اور سکون کے ساتھ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیری ناٹ کے متعلق ایک نتیجے تک پہنچنے کے بعد اب میرا ذہن ایک اور مسئلے کو حل کرنے میں مصروف تھا۔ آخر وہ لوگ کون تھے جنھوں نے جیری ناٹ کے منصوبے کو ناکام بنا دینا چاہا تھا؟ بہ ظاہر تو وہ میرے دوست ہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن دنیا میرے دشمنوں سے بھری ہوئی تھی، دوستوں سے نہیں۔ بھلا میرا دوست کون ہو سکتا تھا! اگرچہ بہ ظاہر ایسا نظر بھی آ رہا تھا تو اس کے پیچھے حقیقت کچھ اور ہی ہو سکتی تھی۔ اسی سوال پر غور کرتے ہوئے مجھے وہ خطرناک لڑکی یاد آ گئی جس نے مجھ سے عشق کا دعویٰ کیا تھا اور خود ہی میری محبوبہ بن بیٹھی تھی۔ کہیں اس نے تو مجھے دوبارہ تلاش نہیں کر لیا؟ میں نے سوچا۔ مجھے اس کے عشق پر تو اعتبار نہیں تھا اور نہ ان باتوں پر جو اس نے اپنے خط میں لکھی تھیں، لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ بھی تینوں ملکوں میں سے کسی نہ کسی کی ایجنٹ تھی۔ گویا بہ الفاظ دیگر وہ بھی میرے دشمنوں ہی میں سے تھی۔ مجھے تلاش کر لینے کے بعد وہ مجھ پر کسی مناسب وقت حملہ کرنے کی غرض سے میری نگرانی کرا سکتی تھی۔ اس نے میری نگرانی کرنے والوں کو یہ حکم دیا ہوگا کہ اگر کوئی اور اس کے شکار کو لے جانے کی کوشش کرے تو مزاحمت کی جائے۔ پہلے بھی یہ بات کئی بار میرے تجربے میں آ چکی تھی کہ میرے حصول کی خاطر تینوں ملکوں کے ایجنٹ ایک دوسرے سے بھڑ گئے تھے اور مجھے وقتی طور پر فرار ہونے یا انھیں ٹھکانے لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ ترکی کے شہر استنبول میں بھی میرے ساتھ تقریباً ایسا ہی ایک واقعہ پیش آ چکا تھا۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ اس لڑکی کے علاوہ بھی ممکن ہے، بقیہ دو ملکوں یعنی چین یا روس کا کوئی ایجنٹ میری بو پا چکا ہو اور جنھوں نے مجھے جیری ناٹ کے حملے سے بچانے کی کوشش کی ہو وہ اسی ایجنٹ کے ساتھی ہوں۔ تینوں ملکوں کے ایجنٹوں میں میرے حصول کی خاطر پیکار نئی بات نہیں تھی۔ ہر ملک کا ایجنٹ مجھ پر اپنا پہلا حق سمجھتا تھا کیوں کہ میرے پُراسرار اور حیرت انگیز وجود کی تہ میں تینوں ہی ملکوں کا بڑا سرمایہ لگا تھا۔ میں نے یہ بہرحال کسی حد تک وہ مسئلہ حل کر ہی لیا تھا۔ صرف اتنی بات میرے علم میں نہیں آ سکی

تھی کہ مجھے پھانسنے کی کوشش کرنے والوں کا تعلق کس ملک سے تھا؟ اگر مجھے کسی طرح اس سوال کا جواب مل جاتا تو کوئی زیادہ فرق نہ پڑتا۔ بس یہی ہوتا کہ میں اور زیادہ محتاط ہو جاتا۔ اپنی شخصیت کی تبدیلی کے بعد میں نہ صرف تبریزی ناٹ کے حملوں سے محفوظ ہو گیا تھا بلکہ اُن دوست نما دشمنوں سے بھی مجھے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا جو کسی اور ہی ملک کے ایجنٹ ہو سکتے تھے۔

قاہرہ آنے کے بعد مجھے ایک پل سکون نہیں مل سکا تھا۔ میں کچھ دن سکون و اطمینان سے گزارنا چاہتا تھا تاکہ اس دوران میں اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکوں۔ میں ابھی یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ میری ماں، ہندوستان کے ایک شہر دہلی میں ہے اور امریکی ایجنٹ اُس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ امریکی ایجنٹ جب چاہیں، اُسے کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں یا اُسے اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔ امریکی ایجنٹوں نے تو یہ دعویٰ کیا تھا کہ میری ماں ان کے قبضے میں ہے۔ میری ماں ان کے قبضے میں نہ سہی۔ لیکن یہ دعویٰ بہرحال بے بنیاد نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اُسے جب چاہتے، وہاں سے اغوا کر کے کہیں لے جاتے اور اپنا قیدی بنا لیتے۔ بغداد سے کلکتہ سفر کرتے ہوئے میں نے ہوائی جہاز میں جس امریکی ایجنٹ کا ذہن پڑھا تھا اور بعد میں جو میرے ہاتھوں ہلاک ہو گئی تھی، اسی سے مجھے یہ معلومات اپنی ماں کے بارے میں حاصل ہوئی تھیں۔ اتنے دن میں صورتِ حال بدل بھی سکتی تھی۔ امریکی ایجنٹ، اس دوران میں میری ماں کو اپنا قیدی بھی بنا سکتے تھے۔ یقینی طور پر اس سلسلے میں کسی نتیجے تک نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ جب میں بغداد میں تھا تو ایسا ہی تھا۔ میری ماں امریکی ایجنٹوں کے نرغے میں تو تھی، مگر ان کی قید میں نہیں تھی۔ امریکی ایجنٹوں نے اُس وقت تک اسے کیوں آزاد چھوڑ رکھا تھا؟ یہ سوال بھی میری نظر میں خاصا اہم تھا۔ امریکی ایجنٹ اس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈال سکے تھے؟ انھوں نے دانستہ میری ماں کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا پھر وہ اُسے اغوا کرنے میں ناکام ہو گئے تھے؟ بہرحال ان سارے سوالوں کے جواب مجھے ہندوستان جائے بغیر نہیں مل سکتے تھے، لیکن موجودہ صورتِ حال میں ہندوستان کا سفر میرے لیے فی الحال ممکن نہیں تھا۔ اوّل تو قاہرہ چھوڑنے سے پہلے میں اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دینا چاہتا تھا، دوم یہاں کچھ دن قیام کر کے اپنے وجود کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھانا چاہتا تھا۔ پھر کب قاہرہ لوٹنا ہو؟ کسے خبر، کون جانے!

انھی اُلجھنوں، انھی خیالوں میں دن نکل آیا۔ ہوٹلوں میں قیام نہ کرنے کے متعلق میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں اِسی لیے گزشتہ روز اُس اسٹیٹ ایجنٹ سے بھی ملا تھا جس کے توسط سے پرانے قاہرہ میں مجھے ایک مکان کرائے پر مل سکتا تھا۔ شخصیت کی تبدیلی سے میرے ارادے میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی۔ میں اُس اسٹیٹ ایجنٹ سے نئی حیثیت میں بھی مل سکتا تھا۔

اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں نے ناشتا کرنے سے پہلے غسل کیا، پھر لباس تبدیل کر کے ناشتا منگوالیا۔ ناشتے ہی کے دوران میں، اخبارات کا مطالعہ کر کے میں نے اُن کالموں کو بہ غور دیکھا جو جائیدادوں کی خرید فروخت اور کرائے پر اٹھائے جانے سے متعلق تھے۔ میں پرانے قاہرہ ہی میں رہنا چاہتا تھا، مگر اُس دن پرانے قاہرہ کے متعلق کوئی ایسا اشتہار شائع نہیں ہوا تھا کہ کوئی مکان کرائے پر خالی ہو۔ گزشتہ دن جو اشتہار میری نظر سے گزرا تھا، وہ بھی دکھائی نہ دیا۔ غالباً وہ ایک ہی دن کے لیے دیا گیا تھا۔ ہاں قاہرہ اور جیزا میں کئی فلیٹ اور مکانات کرائے پر مل سکتے تھے مگر میں نے ان اشتہارات کو نظرانداز کر کے گزشتہ روز والے اشتہار ہی کو اوّلیت دی۔ وہی مکان مجھے اپنے لیے غنیمت معلوم ہوا تھا۔ میں نو بجے تک ہوٹل ہلٹن سے نکل گیا۔

مجھے اُشم کی حیثیت سے ایجنٹ نے ساڑھے نو بجے کا وقت دیا تھا۔ میں کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ راستہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ٹیکسی کرنے اور اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر پہنچنے میں مجھے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

اس اسٹیٹ ایجنٹ کے لیے میں اجنبی ہی تھا، اپنے نئے میک اَپ اور نئی شخصیت کے سبب۔ مگر وہ میرے لیے آشنا تھا۔ میں گزشتہ روز ہی اُس سے مل چکا تھا۔ "جی فرمایئے؟" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ اپنی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں گھما کر بولا۔

"میں نے آپ کا ایک اشتہار پڑھا تھا، کل کے اخبار میں، کرائے پر ایک مکان کے متعلق!" میں نے گفتگو شروع کی۔

"ہاں ہاں، وہ مکان پرانے قاہرہ کے ایک محلے میں ہے۔" اُس نے کہا۔

"جی ہاں مصرِ قدیمہ میں۔"

"بالکل وہی؟" اُس کی آنکھوں میں مجھے عیاری کی چمک نظر

ی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا: "بات دراصل یہ ہے برادر کہ اُس مکان کا سودا میں ایک طالبِ علم کے ہاتھ ل
کا ہوں۔ اُس نے مجھے کمیشن بھی خاصا دیا ہے۔ وہ بس آتا ہی ہوگا۔"

میں اُس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ وہ صاف صاف جھوٹ ل رہا تھا۔ مجھے صرف اُس مکان کا مکمل پتا چاہیے تھا، میں خود ی مالکِ مکان سے بات کر سکتا تھا۔ میں نے دوسرے ہی لمحے ٹ کا ذہن ٹٹولا اور پتا معلوم کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اطمینان رکی: "اگر آپ سودا کر ہی چکے ہیں تو پھر مجبوری ہے۔ مجھے اجازت۔"

"نہیں تو جناب، بیٹھیں آپ!" وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا اور میرا ہاتھ تھام لیا کیوں کہ میں بات کرتے ہوئے اُٹھنے لگا تھا۔

"جی فرمایئے؟" میں پھر بیٹھ گیا۔

"اگر آپ کچھ زیادہ کمیشن دیں، اُس طالبِ علم سے تو اب بھی ں اُس کی رقم واپس کر کے..."

"اِس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اُس کی بات کاٹ پھر دانستہ اُسے چڑانے کے لیے بولا: "میں خود مالکِ مکان بات کر سکتا ہوں۔"

"جی؟" اُس نے مجھے یوں حیرت سے دیکھا جیسے میں نے ی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

"جی ہاں۔" میں اُسے چڑانے کے لیے مسکرانے لگا۔

"اخبار میں تو مکان کا پتا شائع نہیں ہوا، پھر آپ کس طرح اں پہنچ سکتے ہیں؟" اِس بار وہ بھی مسکرا دیا جیسے میری کم علمی لطف اندوز ہونا چاہتا ہو۔

"مجھے نہ صرف اس مکان کا پتا معلوم ہے بلکہ مالکِ مکان کا بھی جانتا ہوں۔"

"ناممکن!" وہ میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

"تو پھر کچھ شرط ہو جائے۔" میں مسکرایا اور اُس کی آنکھوں میں ھیں ڈال دیں۔ میرا مقصد اُسے تنگ کرنا تھا۔

"ہو جائے شرط!" وہ طیش میں آ گیا اور جیب سے سو گنی کا ک نوٹ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا: "میرے سو گنی تمھارے پچاس۔ بولو منظور ہے؟" اُسے یقیناً اپنے جیت جانے ارتی شبہہ نہیں تھا۔ اس کا یقین اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو اُس کے پاس کیوں آتا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ سے شام تک وہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے ناجائز رقم اینٹھتا ہوگا۔ مجھے اخلاقی طور پر شکست دینے کے لیے اُس نے میری رقم نصف رکھی تھی۔ مجھے اس سے کوئی مالی منفعت مقصود نہیں تھی، لیکن میں اُسے سبق ضرور دینا چاہتا تھا۔ رقم پر جان دینے والوں کو کوئی نقصان ہو جائے تو وہ تلملا اُٹھتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی لالچی آدمی تھا۔ جانے اس نے کتنے لوگوں کا دل دکھایا ہوگا اور کتنے لوگوں کو لُوٹا ہوگا! اس لیے اُس کی جیب ہلکی کرنا میری نظر میں کوئی گناہ نہیں تھا۔ میں نے اِسی لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو گنی کے نوٹوں کی ایک نئی گڈی نکال لی اور طیش دلانے والے لہجے میں بولا: "مرد بنو! کیا سو گنی کی شرط لگاتے ہو بچوں کی طرح! اور کچھ نہیں جیب میں؟"

میرے ہاتھ میں سو گنی کے نوٹوں کی گڈی دیکھ کر پہلے تو اُس کے چہرے پر حیرت نظر آئی، پھر ایک دم غصے میں بولا: "بولو کتنے کی شرط لگاؤ گے؟"

"ایسا کرو کہ جتنے نوٹ تمھاری جیب میں ہیں، اس سے دُگنے میری طرف سے! تم شرط جیت گئے تو میں دُگنی رقم ادا کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" غصے میں وہ بالکل بیوقوف لگ رہا تھا۔ اپنی بات پوری کرتے ہی اس نے کوٹ، پینٹ اور قمیص کی جیبوں سے نوٹ پر نوٹ نکالنا شروع کر دیے اور انھیں میز پر ڈھیر کرنے لگا۔ جب اُس نے اپنی تمام جیبیں خالی کر دیں تو غرایا: "گن لو کتنی رقم ہے۔ شرط ہارنے پر تمھیں اِس سے دُگنی رقم دینا ہوگی!"

"خود گن کر بتا دو، میں تم پر یقین کر لوں گا۔" میں نے کہا پھر اسی کے ساتھ بولا: "مگر بہتر یہ ہے کہ کچھ گواہ بھی بلا لو تاکہ تم اپنی زبان سے پھر نہ سکو!"

اسٹیٹ ایجنسی میں اُس کے علاوہ تین افراد موجود تھے جو اُسی کے ملازم تھے۔ اُس نے ان تینوں کو آواز دے کر وہاں بُلا لیا اور انھیں شرط سے آگاہ کیا۔ "ہر چند کہ یہ سب تمھارے ملازم ہیں لیکن مجھے ان کی گواہی منظور ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ میرا انداز اب بھی چڑانے والا ہی تھا: "تم یقیناً اپنے ملازمین کی نظر میں ذلیل ہونا پسند نہیں کرو گے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو!" وہ بگڑ گیا۔ "میں اس لہجے میں گفتگو پسند نہیں کرتا۔" پھر اُس نے کہا: "میں اپنی رقم گن کر ان لوگوں میں سے کسی کے سپرد کر دیتا ہوں، تم اُس سے دُگنی رقم اس شخص کے حوالے کر دو جسے میں رقم دوں۔ ہم دونوں میں سے

جو بھی شرط جیت گیا، اُسے ساری رقم مل جائے گی۔"

"گننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟" میں بولا۔ "یہ دس ہزار گنی کی گڈی ہے، یقیناً تمھاری کُل رقم اس کی نصف سے بھی کم ہوگی۔ بولو، ان میں سے کسے دے دوں یہ گڈی؟"

"تھمادو۔" اُس نے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا جو صورت سے اُسی کی طرح چالاک معلوم ہوتا تھا۔ میں نے نوٹوں کی گڈی، اُس شخص کو تھمادی۔ اسٹیٹ ایجنٹ اپنی رقم گننے لگا۔ رقم گننے کے بعد اُس کا چہرہ کچھ بجھ سا گیا۔ نوٹوں کی اُس ڈھیری میں گنی کے نوٹ کم اور پیاسٹر کے نوٹ زیادہ تھے۔ اس کا اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ اُسے شاید یہ غلط فہمی تھی کہ رقم کافی ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مزید نشتر زنی کی۔ "میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ یہ کتنی رقم ہے۔ تمھارا چہرہ ہی بتا رہا ہے کہ دس ہزار گنی کے مقابلے میں یہ بہت حقیر رقم ہے، مگر میں تمھیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم کہو تو میں شرط کی رقم میں مزید اضافہ کر دوں؟"

"ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ مجھے شرمندہ کرنا نہیں چاہتے اور دوسری طرف شرط کی رقم میں اضافے کی بات کر رہے ہو؟" وہ جیسے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑا۔

"تم سمجھے نہیں کہ میرا مقصد کیا تھا۔" میں نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا، پھر بولا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمھاری جتنی بھی رقم ہو، اس کے مقابلے میں، میں اپنی طرف سے شرط کی رقم بڑھا رہا ہوں۔ یوں سمجھو کہ تم یہ شرط جیت گئے تو میں دس ہزار گنی ہار جاؤں گا اور تم ہار گئے تو تمھاری صرف یہی رقم جائے گی۔"

"سوچ لو!" اس نے مجھے اپنی دانست میں چڑانا اور گویا بانس پر چڑھانا چاہا۔ "بعد میں تمھیں افسوس ہوگا اور میں رقم کسی قیمت پر واپس نہیں کروں گا! شرط شرط ہوتی ہے۔"

"سوچ لیا۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے ایک خیال آگیا اور میں فوراً ہی بولا۔ "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم دروغ گوئی نہیں کرو گے؟"

"کیا مطلب؟" اُس نے تیوریوں پر بل ڈالے۔

"مطلب یہ کہ اگر میں نے مالکِ مکان کا صحیح نام بھی بتا دیا تو تم اُسے نہیں جھٹلاؤ گے؟" میں نے وضاحت کی۔

"ایسی باتیں نکال کر تم شاید شرط سے دامن بچانا چاہتے ہو۔" وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ اُسے یقیناً اپنے جیتنے میں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ مزید بولا۔ "تم ان تین افراد کے سامنے شرط لگا چکے ہو اور اب مُکر نہیں سکتے! رہی جھوٹ سچ کی بات تو میں اس کا بھی بندوبست ابھی کیے دیتا ہوں۔ میں ایک پرچے پر مالکِ مکان کا نام لکھے دیتا ہوں۔ وہ پرچہ بھی اسی شخص کے پاس رہے گا جس کے پاس میری اور تمھاری رقم جمع ہے۔ اب تو تمھیں کوئی اعتراض نہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

اُس نے ایک پرچے پر کچھ لکھا، پھر وہ پرچہ تہ کر کے اُس شخص کے حوالے کر دیا جسے گویا منصف بنایا گیا تھا۔ اپنی رقم بھی اُس نے اسی شخص کو دے دی تھی۔ "ہاں اب بتاؤ اُس مالکِ مکان کا نام!" وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کا نام یاما ہے۔" میں نے وہی نام بتا دیا جو خود اُس کا ذہن پڑھ کر معلوم کیا تھا، پھر کہا۔ "کہو ہار گئے!"

"تم یقیناً کوئی جعل ساز ہو!" وہ چیخ اٹھا۔ "تم نے یہ سارا چکر مجھے دھوکا دینے کے لیے چلایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ پھانسنے جانتے ہوگے۔ مگر تم ایسے جعل سازوں سے میں اچھی طرح نمٹنا جانتا ہوں۔ دھوکا دینے کی سزا میں تمھیں تمھاری شرط کی رقم واپس نہیں کی جائے گی تاکہ آئندہ تم کسی کے ساتھ جعل سازی کا تصور بھی نہ کر سکو! دفع ہو جاؤ یہاں سے!" یہ کہہ کر وہ اپنے آدمی کی طرف پلٹا اور اس سے بولا۔ "ساری رقم مجھے دے دو!"

اگر وہ میری رقم ہضم کرنے پر نہ تل جاتا تو شاید مجھے اُس پر غصہ نہ آتا۔ میں نے اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور اُس شخص کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا جو اُس کی طرف رقم بڑھا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ساری رقم اُس سے چھین لی۔ میں اسٹیٹ ایجنٹ کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ میں نے اُسے میز کی دراز کھولتے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے بہت تیزی کے ساتھ میز کی دراز سے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔

"مجھے قتل کر کے ذرا سی رقم کے لیے پھانسی پر چڑھنا چاہتے ہو تم!" میں نے تمام رقم اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"خبردار!" وہ دہاڑا۔ "میں واقعی تمھیں گولی مار دوں گا!"

"مگر تمھارا ریوالور تو خالی ہے، اس میں گولیاں تو ڈالی ہی نہیں تم نے!" یہ بات میں نے اُس کا ذہن پڑھ کر کہی تھی۔ حقیقتاً ریوالور خالی ہی تھا اور اُسے اس پر افسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے ذہن پر

میں نے اس لیے فوری توجہ دی تھی کہ وہ کہیں سچ مچ غصے میں گولی نہ چلا دے۔ میری بات سن کر اُس کا چہرہ تاریک ہو گیا جو میری بات کی صداقت کا کُھلا ثبوت تھا۔ وہ اس کے باوجود بھی جھوٹ بولنے سے باز نہ آیا۔ "ریوالور بھرا ہوا ہے! تم حرکت کر کے دیکھو اپنی جگہ سے!"

"اگر ایسا ہے تو پھر یہ لو، چلاؤ گولی اگر تمھارا ریوالور خالی نہیں ہے!" کہتے ہوئے میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ ورنہ میں واقعی۔۔۔"

"صلح کر لو مجھ سے۔" میں نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "اپنے ملازمین کے سامنے کان پکڑ کر معافی مانگ لو، میں تمھاری رقم واپس کر دوں گا۔"

وہ واقعی انتہائی لالچی شخص تھا۔ اپنی اتنی تذلیل گوارا کرنا میری توقع کے قطعی خلاف تھا۔ وہ ایک دم بول اٹھا۔ "مجھے منظور ہے!"

"تم ان لوگوں کے سامنے کان پکڑ کر معافی مانگنے کو تیار ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بالکل تیار ہوں، تم رقم نکالو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے خالی ریوالور دوبارہ میز کی دراز میں رکھ دیا۔ میں نے جیب سے اس کی رقم نکال کر میز پر رکھ دی اور بولا۔ "کان پکڑنے کی ضرورت نہیں، تم جیت گئے! اپنی رقم اٹھا لو۔"

"اسے اتنی رقم کے لیے تم مجھ سے مرغا بن جانے کو بھی کہتے تو میں بن جاتا۔" اُس نے بے غیرتی سے ہنستے ہوئے سارے نوٹ سمیٹ لیے۔ پھر میں وہاں مزید نہیں رکا۔ اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر سے نکلتے ہی میں نے ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک دم چونک اٹھا۔ مجھے جیسے لمحہ بھر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ جو شخص کچھ فاصلے پر اپنی کار روک رہا ہے، وہ احمد سلمان ہے۔ ہارون کا باپ احمد سلمان! زم زم سیس چوک وہاں سے دور تھا اور احمد سلمان کا جنرل اسٹور وہیں تھا۔ پھر اُس نے وہاں اپنی گاڑی کیوں روک دی تھی؟ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ کار سے اتر کر میری ہی طرف آنے لگا۔ میں نے ہمت کر کے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اُس کے چہرے سے بلا کی اداسی کا اظہار ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ اُس نے اپنے بیٹے کے دوبارہ بچھڑ جانے پر یقیناً بہت ملال کیا تھا، اُس بیٹے کے بچھڑ جانے کا ملال جسے اُس کی دوسری بیوی سلوت بہت پہلے زمین کی آغوش میں سلا چکی تھی۔

میں وہیں کھڑا رہا اور احمد سلمان میرے قریب سے گزر گیا، بالکل کسی اجنبی کی طرح! جانے کیوں مجھے اُس کے اس طرح اجنبیوں کے مانند گزر جانے پر دکھ ہوا۔ کیا واقعی وہ میرے لیے ایک اجنبی ہی تھا؟ پھر اُس وقت بھی میں چونکے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے اُسے اُسی اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر میں داخل ہوتے دیکھا جس سے میں نکل کر آیا تھا۔ احمد سلمان وہاں کیوں گیا ہے؟ میرے ذہن میں تجسس بیدار ہو گیا اور اسی کے ساتھ میری سماعت کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ اب میں اسٹیٹ ایجنسی میں ہونے والی تمام گفتگو واضح طور پر سن سکتا تھا۔

"تشریف لائیے جناب!" میں نے اسٹیٹ ایجنٹ کی آواز سنی۔

"شکریہ!" احمد سلمان کی بجھی بجھی سی آواز آئی۔

"ہمارے لائق خدمت؟"

"مجھے جیزا میں ایک مکان چاہیے۔" احمد سلمان کی آواز پھر اُبھری۔ "مکان خریدنا چاہتا ہوں میں، جلد از جلد! اگر زمالک کے علاقے میں کوئی مکان مل جائے تو بہت اچھا ہے، میں اُسے ترجیح دوں گا۔ ایسی صورت میں مجھے مکان کی قیمت کی بھی زیادہ پروا نہیں ہوگی۔"

"معاف کیجیے گا محترم، زمالک میں تو کوئی مکان فی الحال ہماری نظر میں نہیں، لیکن آپ کسی اور علاقے میں چاہیں تو۔۔۔"

"مثلاً کون سا علاقہ؟" احمد سلمان، ایجنٹ کی بات کاٹ کر بول اٹھا۔ اُس کی آواز سے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجوزہ میں ایک مکان ہے برائے فروخت۔ اگر آپ کہیں تو میں اس کے مالک سے بات کروں! کل آپ اسی وقت آ کر اس سلسلے میں معلوم کر لیں۔"

میں نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے مزید گفتگو سننے سے گریز کیا اور احمد سلمان کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔ مجھے کچھ ہی دیر میں سب کچھ معلوم ہو گیا کہ محل نما ایک کوٹھی کا مالک ہونے کے باوجود احمد سلمان کو ایک دم نیا مکان خریدنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تھی۔ احمد سلمان، اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ جب تک وہ باہر نکلا، میں اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ اُس کے ذہن سے اب تک میرا رابطہ بحال تھا۔

زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، معاملات ٹھیک

ہو جائیں گے۔

مگر کب؟ اس کے ذہن نے میرے ذہن کی ترغیب پر احتجاج کیا۔

بہت جلد میرے ذہن نے اس احتجاج کا جواب دیا، پھر اُسے مزید مشورہ دیا۔ نیا مکان خریدنا فضول ہے، نیا مکان نہیں خریدنا چاہیے۔

میرا ذہن اُس کے ذہن کو جو ترغیب دے رہا تھا، وہ اُسے اپنے ہی ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات سمجھ رہا تھا۔ گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ بڑبڑایا: "ٹھیک ہے، میں نیا مکان نہیں خریدوں گا۔"

میرا مقصد پورا ہو گیا تو میں نے اُس سے ذہنی رابطہ منقطع کر لیا۔ پھر جب احمد سلمان اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو رہا تھا تو میری نگاہ بھی ایک خالی ٹیکسی پر پڑ گئی۔ میں نے اُسے روک لیا۔ میں اب جلد از جلد پرانے قاہرہ کے ایک محلے معرقہ میں پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں سے واپس آنے کے بعد احمد سلمان کے گھر بھی جانا تھا اور آج ہی کرائے کے مکان میں منتقل بھی ہونا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے جانے کیوں لونی جو بھی یاد آئے جا رہی تھی جس سے میں نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ موجودہ حالات میں یہ وعدہ کیسے وفا ہو سکتا تھا، لہٰذا مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب مجھے اُس سے از سر نو تعلقات استوار کرنا تھے۔ ابھی میرے ذہن سے یہ خیال نہیں نکلا تھا کہ لونی جو کی قربت میرے لیے سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اُس کے جسم سے اٹھنے والی گلابوں کی بھینی بھینی خوشبو میرے دشمنوں کو دھوکے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ میری نمایاں شناخت یہی تو تھی کہ میرے جسم سے گلابوں کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ اگر میں لونی جو کے ساتھ ہوتا تو میرے دشمن یہی سمجھتے کہ وہ خوشبو لونی جو کے جسم سے آ رہی ہے۔ یوں گویا لونی جو میری سپر بن جاتی۔ پھر اُس کے ساتھ میرا جتنا وقت بھی گزرتا، میں خطرے میں نہ ہوتا۔ لونی جو کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر احمد سلمان کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے اُس کے گھر جانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ یوں بھی میں نے ابھی سلوت کو معاف نہیں کیا تھا۔ ابھی اُس کی بہت سزا باقی تھی۔ مجھے دو ایک دن بعد وہاں جانا ہی تھا تو پھر فوراً آج بھی جا سکتا تھا۔

احمد سلمان جس ذہنی کرب میں مبتلا تھا، کم از کم میں اُسے اُس کرب سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا سکتا تھا۔ اُس نے مجبور ہو کر ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیوہ بیٹی لیلیٰ کے ساتھ سلوت سے الگ رہے گا۔ اس کا اظہار اُس نے آج صبح سلوت اور لیلیٰ سے کر بھی دیا تھا۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ صرف اتنی سی تھی کہ لیلیٰ نے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا تھا۔ سلوت نے اسی پر طوفان اٹھا دیا تھا۔ اُس نے احمد سلمان کو دھمکی دی تھی کہ گھر میں یا تو لیلیٰ رہے گی یا وہ! احمد سلمان نے جواب میں کہہ دیا تھا کہ وہ خود ہی گھر سے نکل جائے گا اور اپنی بیٹی کو ساتھ لے جائے گا۔ سلوت اتنی تنگ دل عورت تھی کہ اُس نے ایک شرط پر احمد سلمان کی یہ بات مان لی تھی۔ وہ شرط تھی کہ احمد سلمان اس کے اخراجات پورے کرتا رہے گا۔ اس پر احمد سلمان کا دل ٹوٹ گیا تھا کیوں کہ اُسے اپنی بیوی سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ پہلے تو اُس نے غصے ہی میں یہ بات کہہ دی تھی کہ وہ لیلیٰ کو ساتھ لے جائے گا اور اب اس گھر میں نہیں رہے گا لیکن سلوت کی بات سن کر اس کا ارادہ پختہ ہو گیا تھا۔ اپنے بیٹے ہارون کے غم سے وہ پہلے ہی نڈھال تھا۔ اس پر سلوت کے رویے نے اُسے اندر سے اور بھی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سلوت کے ذہن میں اپنی سوتیلی بیٹی لیلیٰ کے خلاف نفرت کی جو جڑیں پیوست تھیں، انھیں جنبش کے لیے اکھاڑ پھینکنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ نفرت کی جگہ میں سلوت کے ذہن میں بہ آسانی لیلیٰ کی محبت کے بیج بو سکتا تھا۔

میں انھی خیالوں میں غلطاں پرانے قاہرہ کے محلے معرقہ پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے رہنمائی چاہی تو میں نے اُسے یامہ کا پورا پتا بتا دیا۔

"ٹھیک ہے جناب!" ٹیکسی والا بولا: "مگر مکان نمبر آپ کو ڈھونڈنا پڑے گا۔ میں آپ کو پوسٹ آفس کے نزدیک اتار دوں گا۔"

"تم اُس پوسٹ آفس تک تو چلو۔" میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ کچھ دیر بعد ہی ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جگہ ٹیکسی روک دی اور میری طرف مڑ کر کہا: "وہ جو آپ کو سڑک کی اُس طرف مکانات نظر آ رہے ہیں، انھی کی دوسری یا تیسری گلی میں آپ کو اُس نمبر کا مکان مل جائے گا جو آپ نے بتایا تھا۔ میرا اندازہ تو یہی ہے، مگر آپ کسی سے پوچھ لیجیے گا۔"

میں نے اس طرف دیکھا جدھر ٹیکسی ڈرائیور نے انگلی سے اشارہ کیا تھا، پھر بولا: "پوچھ بھی لوں گا، تمھاری رہنمائی کا شکریہ!" پھر میں نے اُسے طے شدہ کرایہ ادا کر دیا اور ٹیکسی سے اُتر گیا۔ یامہ کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کچھ دقت تو ہوئی لیکن میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کا گھر دوسری یا تیسری گلی کی بجائے پانچویں گلی میں ملا۔ میں نے دروازے پر دستک دینے سے پہلے ایک نظر اس مکان کا جائزہ لیا۔ قدیم طرز پر بنا ہوا وہ مکان بہ ظاہر خاصا بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ گھر کا صدر دروازہ بھی موٹی لکڑی کا تھا جس پر لکڑی ہی کو کاٹ کر نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ دروازے کے پٹ کافی بڑے تھے اور ان پر کتھئی رنگ کیا گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی بھاری کنڈی بجائی۔ وہاں کال بیل کا کوئی بٹن تلاش کرنا حماقت ہی ہوتی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے دوبارہ کنڈی بجائی۔ اس بار کہیں دور سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ آواز کسی اُدھیڑ عمر عورت کی بجائے کسی نوجوان لڑکی کی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے کہا تھا: "ٹھہر جائیں! ابھی آتی ہوں۔" کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے ایک دراز قد نوجوان لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت پتلی دُبلی اور ہلکی پھلکی سی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں بول اٹھا: "مجھے مسز یامہ سے ملنا ہے۔"

"کس سلسلے میں جناب؟" لڑکی نے اپنی گھنی لانبی پلکیں اٹھائیں۔

"مجھے یہ مکان کرائے پر لینا ہے، کل میں نے اشتہار پڑھا تھا آپ کا۔" آخری الفاظ میں نے یہ سوچ کر ادا کیے تھے کہ اس نوجوان لڑکی کا تعلق بھی اسی گھر سے ہو سکتا ہے۔

"مگر اشتہار میں تو انھوں نے گھر کا پتا نہیں دیا تھا جب کہ امی نے ان صاحب سے میرے سامنے اس کی تاکید کی تھی، پھر آپ کس طرح..."

"آپ کا اشارہ جن صاحب کی طرف ہے، مجھے انھوں نے ہی بتا کے بھیجا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ لڑکی کی بات سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یامہ اُس کی ماں ہے۔

"اُسی اسٹیٹ ایجنٹ نے؟" لڑکی نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ اندر آ جائیے۔" وہ بولی: "میں آپ کو بیٹھک میں بٹھائے دیتی ہوں۔ امی ذرا پڑوس میں گئی ہیں، میں انھیں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔" یہ کہتے لڑکی نے دروازے کا پٹ کچھ اور کھول دیا، پھر مجھے اندر آنے کا راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر اُس کی رہنمائی میں آگے بڑھتے ہوئے پوچھا: "کوئی بھائی بھی ہے تمھارا؟"

"جی نہیں!" اُس نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا: "میں اپنی امی کی اکلوتی بیٹی ہوں۔"

"کوئی عزیز رشتے دار بھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہتا؟"

"ساتھ رہنا تو الگ کوئی ہم سے ملتا بھی نہیں۔ محلے میں بھی بس ایک گھر ایسا ہے جہاں امی چلی جاتی ہیں، لیکن وہ لوگ بھی یہاں ہمارے گھر کبھی نہیں آتے۔" اُس نے بتایا۔

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔ مجھے اُس کی بات کچھ عجیب سی لگی تھی حالانکہ مجھے یہ بات سن کر خوشی ہی ہوئی تھی۔ میں اس طرح وہاں بہت سکون و اطمینان سے رہ سکتا تھا۔

"معلوم نہیں، کیوں نہیں آتے لوگ یہاں۔" اُس کی آواز میں افسردگی سی تھی۔ پھر جیسے اچانک ہی اُسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ چلتے چلتے رک کر میری طرف مڑی اور بولی: "ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"ہاں پوچھو۔"

"آپ تو مجھے اپنے کمرے میں آنے سے نہیں روکا کریں گے؟" اُس کے لہجے میں عجیب سی محرومی تھی۔

"نہیں تو!" میں نے اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شروع شروع میں سب یہی کہتے ہیں، وعدہ کر لیتے ہیں اور پھر..." اُس کی آواز بھرا سی گئی۔

"کون سب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جو یہاں رہنے آتے ہیں اور کون!" اُس کی عمر پندرہ سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"تو یہاں لوگ آتے رہتے ہیں، رہنے کے لیے؟"

"ہاں!" اُس نے جواب دیا، پھر بولی: "مگر کوئی بھی مہینے بھر سے زیادہ نہیں رہتا، بس ایک صاحب ایسے تھے جو پورے ڈھائی مہینے رہے تھے۔ پھر امی ہی نے انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"انھوں نے ایک رات امی سے چھپ کر مجھ سے ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ معلوم نہیں امی کو کیسے خبر ہو گئی۔" اُس کا انداز رازدارانہ تھا۔ "ادھر میں بستر سے اٹھ کر اُن سے ملنے چلی اُدھر امی جاگ گئیں اور پھر انھوں نے مجھ سے ڈرا دھمکا کر سب کچھ پوچھ لیا حالانکہ اُن صاحب

نے کہا تھا، میں امی کو کچھ نہ بتاؤں۔"

"لیکن تم اُن سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟"

"تو کیا میں کسی سے نہ ملوں؟" وہ روہانسی ہو گئی: "امی خود تو..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی: "خیر چھوڑیے اس بات کو! امی کو معلوم ہو گیا کہ میں نے آپ سے ان کی شکایت کی ہے تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھر آگے بڑھی۔ ڈیوڑھی سے نکل کر میں اور وہ ایک بڑے سے صحن میں پہنچ گئے۔ دائیں جانب ایک کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے اس میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں مونڈھے بچھے ہوئے تھے اور ایک جانب بڑی سی چوکی پڑی تھی جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمرا صاف ستھرا تھا۔

"آپ یہاں بیٹھ جائیں، میں امی کو بُلا کر لاتی ہوں۔" وہ مڑی، پھر پلٹ کر بولی: "دیکھیے امی سے کچھ نہ کہیے گا۔"

"کس سلسلے میں؟"

"یہی کہ آپ نے مجھ سے کوئی وعدہ کر لیا ہے۔"

"نہیں کہوں گا، تم مطمئن رہو۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔

وہ چلی گئی اور میں وہاں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ وہاں بہت سکون تھا، قاہرہ کی طرح شور اور ہنگامہ نہیں تھا۔ میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے کتنی عجیب باتیں کی تھیں۔ میں چاہتا تو بہ آسانی اِن عجیب باتوں کا سبب معلوم کر سکتا تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ ایک تو میں اپنی پُراسرار قوتوں کے بے جا استعمال سے یوں ہی گریز کرتا تھا، پھر یہ کہ کسی کے باطن میں جھانکنے کو اخلاقی طور پر بھی بُرا سمجھتا تھا۔ میں نے آج تک بغیر ضرورت ایسا نہیں کیا تھا۔ میں اِسے کسی کی خلوت میں بغیر اجازت داخل ہو جانے سے بھی گرا ہوا عمل سمجھتا تھا۔ میری کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ اِس سے گریز کروں۔

میں تقریباً پانچ منٹ تنہا بیٹھا رہا، پھر مجھے کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی جو قریب آتی جا رہی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت باہر سے ایک نسوانی آواز آئی: "نبیلہ! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"جی اچھا امی!" اُسی لڑکی کی آواز اُبھری جو مجھے وہاں بٹھا کر گئی تھی۔ اسی کا نام نبیلہ تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ لڑکی کی آواز کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ چند لمحے بعد ہی ایک دراز قد عورت نے کمرے میں قدم رکھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہر شخصیت کے بارے میں انسانی ذہن پہلے سے ایک تصور قائم کر لیتا ہے۔ وہ بیوہ تھی اور ایک نوجوان لڑکی کی ماں تھی، یہ جاننے کے بعد میں نے اپنے ذہن میں اُس کا جو تصور قائم کیا تھا، وہ اُس تصور سے قطعی مختلف تھا۔ اس کے جسم پر بہترین لباس تھا اور اس کی عمر کسی بھی طرح تیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ جسم چھریرا اور انتہائی پُرکشش تھا۔ وہ اس نوجوان لڑکی کی بڑی بہن لگتی تھی۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک جوان لڑکی کی ماں ہو گی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا اور چہرے کے نقوش میں تیکھا پن تھا۔ اُس کے چہرے پر بہت باریک سی نقاب تھی۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین اور پُرکشش تھی۔ اُس کی شخصیت میں ایک رُعب سا تھا۔ صالحہ کے سوا میں نے اب تک کوئی اِتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ اس گھر کی فضا سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا بھرپور جائزہ لے لیا۔

وہ قدم قدم چلتی ہوئی میرے سامنے ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اور پھر مجھے مخاطب کیا: "میری بیٹی نبیلہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ میرا مکان کرائے پر لینا چاہتے ہیں اور آپ کو اسٹیٹ ایجنٹ نے بھیجا ہے؟" اس کا انداز تصدیق طلب تھا۔ اس کے لہجے میں بھی شائستگی اور رکھ رکھاؤ تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے اُس کی نیلی آنکھوں سے نظر ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"اُس نے آپ کو کرایہ اور بقیہ شرائط تو بتا ہی دی ہوں گی؟"

"جی نہیں، میری اس سے زیادہ تفصیلی بات نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ ہی سے مل کر براہِ راست تمام معاملات طے کروں گا۔"

میری بات سن کر اس نے جانے کیوں طویل سانس لیا، پھر بولی: "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"تاجر ہوں میں۔" میں نے پہلے سے طے شدہ جواب دیا: "مگر اس کا تعلق مکان سے..."

"تعلق ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی: "دراصل بات یہ ہے کہ میرا مکان وہی لوگ کرائے پر لیتے ہیں جو خوش حال ہوں۔ میں یہ بات نہیں چھپانا چاہتی کہ ہر شخص اِس مکان کا کرایہ برداشت کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا، میرا مقصد ہرگز

آپ کی دل آزاری نہیں۔"

"کیا کرایہ بہت زیادہ ہے اس کا؟" میں نے سوال کیا۔

"کرایہ بتانے سے پہلے میں کچھ باتیں عرض کر دینا چاہتی ہوں جو ضروری ہیں۔" وہ مونڈھے پر پہلو بدلتے ہوئے بولی، پھر بغیر توقف اپنی بات جاری رکھی: "میرا ذریعہ آمدنی صرف یہی مکان ہے۔ اس کے سوا میری گزر بسر کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ میرے شوہر کو انتقال کیے ہوئے پورے بارہ برس ہو چکے ہیں، اس وقت میری بچی صرف ڈھائی تین سال کی تھی، جب سے اب تک یہی مکان کرائے پر اٹھا کر میں اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پال رہی ہوں۔ یہ تمہید میں اس لیے باندھ رہی ہوں کہ جو کرایہ بتاؤں، وہ آپ کو زیادہ معلوم نہ ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" میں نے سر ہلایا: "آپ کرایہ بتائیں۔"

"دو سو گنی ہفتہ کرایہ ہے اس مکان کا۔" اس نے نیلی آنکھیں اٹھا کر میرے چہرے کی طرف دیکھا جیسے میرا ردِعمل جاننا چاہتی ہو۔

"دو سو گنی ہفتہ!" میں نے حیرت سے کہا: "اور پھر ماہانہ کی بجائے ہفتہ وار...؟"

"یہ اس لیے کہ لوگ یہاں زیادہ دن نہیں رہتے۔" اُس نے میری بات کاٹ کر وضاحت کی، پھر بغیر رکے بولتی چلی گئی: "دراصل بات یہ ہے جناب کہ یہاں وہی لوگ آتے ہیں جنھیں سکون کی تلاش ہوتی ہے جو زندگی کے ہنگاموں سے کچھ دن الگ رہ کر اپنا وقت خوش گوار اور حسین ماحول میں گزارنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو یکسانی سے اُوب جاتے ہیں، ایسے جو اپنی بدصورت اور بدخو بیویوں سے تنگ آ جاتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"ہوں۔" میں نے طویل سانس لیا۔ میں اب اُس کی باتوں کا مطلب سمجھنے لگا تھا۔

"آپ کو چھ ہفتے کی رقم پیشگی بھی ادا کرنا ہو گی جو اگر آپ چاہیں گے تو مکان چھوڑتے وقت واپس مل جائے گی۔" اُس نے مجھے مزید ایک شرط سے آگاہ کیا۔

"چاہیں گے سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"یہ میں نے اِس لیے عرض کیا کہ عموماً لوگ یہ رقم واپس نہیں لیتے۔" اُس نے جواب دیا: "دراصل اُنھیں یہاں سکون و آرام ہی اتنا ملتا ہے کہ وہ اس رقم کو میرا حق الخدمت سمجھتے ہیں۔ میں ان کی ہر خدمت بہ حسن و خوبی انجام دیتی ہوں اور ایسا کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اُنھیں یہاں کسی شے کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ میں اُنھیں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ "آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" اُس کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔ میں نے چند لمحے غور کیا، پھر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال لی کہ اُسے پیشگی رقم ادا کر دوں۔

"ہاں میں آپ کو ایک بات بتانا بھول ہی گئی۔ اگر آپ پسند کریں تو کھانے وغیرہ کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو صرف پچاس گنی ہفتہ مزید دینا ہوں گے۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" میں رقم گننے لگا۔

"آخر میں ایک بات عرض کر دینا اور ضروری سمجھتی ہوں کہ میں اپنی بچی کے معاملے میں بہت حساس ہوں۔ میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ خود ہی اُس سے کہہ دیں، وہ آپ کے کمرے میں نہ آیا کرے۔"

میں نے رقم گن کر اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "آپ کہہ رہی ہیں تو میں اُسے آنے سے منع کر دوں گا لیکن اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ میں ذرا مختلف آدمی ہوں۔"

وہ اس دوران میں نوٹ گن چکی تھی۔ اُس نے میری بات کو نظرانداز کر کے حیرت سے کہا: "یہ تو ڈیڑھ ہزار گنی ہیں!"

"تو کیا ہوا؟"

"کیا آپ پورے چھ ہفتے رہیں گے؟ آپ نے کھانے وغیرہ کی رقم بھی دے دی ہے۔ میں اس لیے حیران تھی۔"

"کیوں، آپ کو کوئی اعتراض ہے اس پر؟"

"نہیں، مجھے تو خوشی ہے۔" وہ واقعی پُرمسرت لہجے میں بولی۔ "میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ لوگ عموماً ایک دو ہفتے سے زیادہ..."

"میں نے آپ سے کہا نا کہ میں ذرا مختلف آدمی ہوں۔" پھر مجھے خیال آیا کہ اُس نے اب تک مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا تھا۔ یہی بات میری زبان پر بھی آ گئی۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" اُس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ آپ مجھے کس نام سے پکاریں گی؟"

"دراصل مجھے اپنے مرحوم شوہر سے بہت محبت تھی۔ اُس کا

یہ ضیغم تھا۔ میں اس کی یادوں کو ہمیشہ تروتازہ رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اسی لیے اپنے گھر میں قیام کرنے والوں کو اسی نام سے پکارتی ہوں۔ جب تک وہ یہاں ٹھہرتے ہیں، میں انھیں ضیغم ہی کی طرح ہر دم پہچاننے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس طرح میرے جذبات کو بھی بالکل ٹھہراؤ سا آرام اور سکون مل جاتا ہے۔ میں بھی خوش رہتی ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" اس عورت کی عجیب منطق تھی۔ میں نے جواب میں کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اس نے مجھے وہ کمرا دکھایا جہاں قیام کرنا تھا۔ وہ کمرا سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسہری، دو کرسیاں اور ایک میز بھی موجود تھی۔ "بیکر! اور بیٹھک آپ کے استعمال میں رہے گی۔" اس نے بتایا۔ "گھر کے بقیہ دو کمرے میرے استعمال میں رہتے ہیں۔"

"میں تب تک پتا سنانا سے کر آجاؤں گا۔" میں نے اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں جو ساز و سامان آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی آپ بلا تکلف استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔"

"شکریہ!" میں نے کہا۔ "اب میں چلوں گا۔"

پھر مجھے دروازے تک رخصت کرتے ہوئے اس نے خواب ناک سے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کروں گی ضیغم!" چلتے چلتے اس نے مجھے اپنے شوہر کے نام سے پکار ہی لیا۔

"میں ضرور آؤں گا۔" میں نے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی دروازے سے نکل گیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں ہاشم کے حسن سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے واقعی مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس کے متعلق یہ اندازہ کر لینے کے باوجود بھی کہ وہ کس کردار کی عورت ہے۔ مجھے اس سے نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پہلے ملنے میں بھی کوشش چھپایا تھا۔ اس سے زیادہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

لیکن اس نے تہذیب و شائستگی کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ سب کچھ بتا دینے کے باوجود اس کے غرور حسن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی تمکنت، اس کا رکھ رکھاؤ اسی طرح برقرار رہا تھا۔

ہاشم کے گھر سے میرا ارادہ سیدھا جانے کا تھا اور میں نے وہیں کے لیے ٹیکسی بھی کی تھی۔ لیکن راستے میں میرا ارادہ بدل گیا۔ بھی کافی دن پڑا تھا۔ سوچا کہ وہ ہی بیٹھے تھے، ابھی میں ہوٹل کے

"مجھ پہ بہت سا تھا۔" میں اب پہلے ہوٹل جیمسن پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مجھے دو چینی، ہاشم، اور لوئی چو نے جو سکتے دی تھی اور اس پر میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔ میں نے اندر ان دنوں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا جس کا سبب نامعلوم تھا۔ اب سے پہلے میں نے کبھی عورتوں میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ صرف بغداد کے دوران تیا میں مہ جبینہ نے مجھے متاثر کیا تھا۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب مجھے ہر حسین عورت متاثر کرنے لگی تھی۔ یہ تبدیلی لوئی چو سے ملاقات کے بعد ہی میں نے واضح طور پر محسوس کی تھی۔ کچھ ہلکا سا شبہ مجھے ایک دو بار پہلے بھی ہوا تھا کہ میں حسین عورتوں کی طرف کھنچنے لگا ہوں۔ لیکن اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ آج ہاشم سے ملنے کے بعد مجھے سو فی صد یقین ہو گیا تھا کہ میرے اندر کوئی نمایاں تبدیلی آ گئی ہے۔ اس وقت بھی اچانک لوئی چو کا خیال آ جاتا۔ اسی سبب سے کی گئی تھی۔ ٹیکسی والے کو میں نے اپنے ارادے کی تبدیلی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے طے شدہ کرایے میں کوئی تخفیف نہ کرنے کی شرط رکھی تھی جس پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

ہوٹل پہنچنے تک میں یہ سوچ چکا تھا کہ مجھے لوئی چو سے دوبارہ کس طرح تعلقات استوار کرنا ہیں۔ میں لوئی چو سے مل کر خود کو ہاشم کا دوست ظاہر کرنا چاہتا تھا اور اس دوستی کا سبب میں نے پاسپورٹ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس طرح خود کو بھی ایک باعث فخر کر کے اسے متاثر کر سکتا تھا۔

ہوٹل جیمسن پہنچ کر میں اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لفٹ میں ساتویں منزل کے لیے سوار ہو گیا۔ میرے علاوہ لفٹ میں اور لوگ بھی تھے۔ مگر میں ان سے لاتعلق لوئی چو کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود بھی ہو گی یا نہیں؟ لفٹ مختلف منزلوں پر رکتی ہوئی بالآخر ساتویں منزل پر پہنچ گئی۔ میں لفٹ سے اتر گیا۔ لوئی چو کا کمرا راہداری کے آخر میں تھا۔ میں نے راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے لوئی چو کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ میں کمرے میں اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ وہ اس وقت انتہائی غصے میں تھی۔ یہ جان کر میں چونک اٹھا۔ اس کے ذہن سے میرا رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ اگر اس وقت وہ اتنے غصے میں نہ ہوتی تو یقیناً میں اس کے ذہن کو مزید ٹٹولتا اور ذہنی رابطہ منقطع کر دیتا۔ کیوں کہ

مجھے کمرے میں اس کی موجودگی کا علم ہو چکا تھا۔ مگر اب میرے ذہن میں تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ میں اس کے غصے کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ جب کوئی کچھ کہتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں وہ بات آتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ بات الفاظ کی صورت میں ادا ہوتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ لوئی چو اس وقت جو بھی کہہ رہی تھی اس کا علم مجھے الفاظ کی ادائیگی سے پہلے ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اب اپنی سماعت کا دائرہ بھی وسیع کر لیا تھا اور میرے قدم بہت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔

"تم نے اسے اپنی نظروں سے کیوں اوجھل ہونے دیا؟ برزو۔" جواب دو۔ وہ کسی پر برس رہی تھی۔ مگر یہ گفتگو چینی زبان میں تھی۔

"انھیں معاف کر دیں مادام!" آخر ان سے ایسی غلطی نہیں ہو گی۔" ایک التجا آمیز مردانہ آواز سنائی دی اور یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ ہوانگ فا کی آواز تھی۔

"ہرگز نہیں!" لوئی چو کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں قصور معاف نہیں کیا کرتی۔ ان چاروں کو ان کے قصور کی سزا ضرور ملے گی!" چند لمحے توقف کے بعد اس کی آواز پھر ابھری۔ "اب وہ ہوٹل سے غائب ہے! تم لوگ جانتے ہو کہ اسے دوبارہ تلاش کرنا کتنا مشکل ہے۔ اگر اس کے دوران میں وہ لوگ اسے اڑا لے گئے تو میں چیف کو کیا منہ دکھاؤں گی! امریکی ایجنٹ تو ہمیں قابو میں ہے اور روسی۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گئی اور چونک اٹھی۔

بس لمحہ بھر کو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کوئی اس کا ذہن پڑھ رہا ہے، پھر فوراً ہی اس کے ذہن پر ہلکی سی دھند پھیل گئی تھی۔ "وہ۔۔۔ وہ ابوالہول!" لوئی چو اچانک چیخ اٹھی۔ "وہ کہیں قریب ہی ہے بہت قریب! اسے تلاش کرو!"

میں اچھل پڑا۔ اسی وقت جیسے میرے ذہن میں دھواں سا بھرنے لگا۔ میں نے لوئی چو کے ذہن سے رابطہ منقطع کرنا چاہا مگر میری پہلی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ لوئی چو سے ذہنی رابطہ منقطع نہ کر سکنے کا سبب یہ تھا کہ مجھے بالکل یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ دھواں اسی کے ذہن سے نکل کر میرے ذہن میں بھرتا جا رہا ہو۔ میں نے اس سے ذہنی رابطہ منقطع کرنے کی دوسری کوشش کی اور اپنے ذہن کو زبردست جھٹکا دیا۔ میں اپنی دوسری کوشش میں کامیاب تو ہو گیا مگر اس جھٹکے نے میرے ذہن کو جیسے تہ و بالا کر دیا۔ مجھے

بہت زور کا چکر آ گیا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ میں راہداری میں ڈھیر ہو گیا۔ میرے ذہن میں ابھی تک وہ دھواں بھرا ہوا تھا جو بہت آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ وہ دھواں جب تک بالکل نہ چھٹ جاتا، میں شاید اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس وقت اپنا پورا وجود تیز آندھی میں تنکے کی طرح گردش کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسی عالم میں اپنی جانب دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اسی وقت میرے ذہن کو ایک اور شدید جھٹکا لگا اور اسی کے ساتھ میرے اطراف تاریکیاں سی پھیلتی گئیں۔

خوشبو یہ خود میرے پکڑتے ہوئے ذہن سے جیسے مجھے آخری وار شکست۔

وہ بے حد پریشان تھا۔ بوجھل سر، تاریکی اور اداسی۔ زندگی بہت مگر ابھی مجھے بہت جینا تھا۔ شاید اسی لیے میں نے اپنے ذہن پر چھائی تاریکی بھی پہلے ہی خود کو دشمنوں کی نظروں سے چھپا لیا، خود کو دھوکا دیا۔ مگر ان سے پہلے تو ایک روشنی سی پھیلی تھی۔ یوں جیسے مجھ پر کسی نے کوئی روشنی پڑی۔ ہوش کے بعد کیا ہوا۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ میں کتنی دیر تاریکی میں ڈوبا رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اپنے کمرے میں ہوش ہونے سے پہلے میرے دل کو چھیننے والا تھا۔ تم نے مجھے کر کہا تھا۔ ہوٹل کا۔ آج ہو گیا۔ اس قدر خوشبو کے قریب جاؤ۔ اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو تم تمہارے جسم کا خون ہو جانے گا، تم تنہا رہ جاؤ گے۔ مگر موت جس کا مقدر ہو جاتے اسے کون بچا سکتا ہے! موت کا وقت بھی آ چکا تھا۔ اسے دشمنوں کے جانے کے بعد تو ہوش رہا اور میں گویا اسی نے اپنی موت کو گلے لگا لیا۔ اس کی موت کے بعد ہی مجھے ہوش آنے کے بعد ہی معلوم ہوا۔

مجھے تقریباً تھوڑے ہی عرصے بعد ہی ہوش آ گیا تھا۔ ہوش آ جانے پر بھی کچھ دیر میرا ذہن پوری طرح بیدار نہ ہوا۔ تاہم سکتہ سا تھا ایک گونج کی تھی لیکن سب کچھ نہیں تھا۔ بیکر آپ ہی تھے۔ چند لمحے میں یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اس سے میرے ذہن کو سکون ملا اور پھر میری حالت

کُندن
ایم اے راحت
زندگی کے قریب کے شکار ایک نوجوان کی داستانِ الم جس کے چاروں طرف موت رقصاں تھی۔ ہر طرف خون رنگ آنکھیں اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زمین اس پر تنگ کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سے اٹھنے والی ٹھوکروں نے اسے فولاد بنا دیا۔ پھر اس فولاد کی کاٹ نے دنیا کی نیند حرام کر دی۔
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
مکمل کہانی دو جلدوں پر مشتمل کتابی صورت میں دستیاب ہے
ناشر: گل قریشی لائبریری ۱۱- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور فون: 7229762-7248599

ڈاکٹر ذکاء الرب رباب کے شاہکار ناول

تجھ بن تیری بینا روئے	ذکاء الرب رباب	90
شوگراں کی چاندنی	ذکاء الرب رباب	30
ہم بھی تیرے ہیں دل بھی تیرا	ذکاء الرب رباب	90
سیاہ کار	ذکاء الرب رباب	80
پھولوں کی شہزادی	ذکاء الرب رباب	100
ٹوٹ گیا تاج محل	ذکاء الرب رباب	100
کیا دل پہ چوٹ کھائی	ذکاء الرب رباب	125
کمال الدین قتل کیس	ذکاء الرب رباب	75
مس نیلیمی قتل کیس	ذکاء الرب رباب	99
آنکھوں کے تارے	ذکاء الرب رباب	100

ملنے کا پتہ: رابعہ بُک ہاؤس
نگر سوما مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان

پاک وطن کا سودا کرنے والے چہروں کی نقاب کشا داستان
غیرت کے سوداگر
ایم اے راحت
وطن عزیز کے حصول کے لیے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہو لہو ہوئے۔ تب عروس وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن ناموس وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
مکمل کہانی ایک جلد پر مشتمل کتابی صورت میں دستیاب ہے
ناشر: گل قریشی لائبریری ۱۱- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور 7248599 7229762

معمول پر آ گئی۔ مجھے یکے بعد دیگرے ساری باتیں یاد آتی چلی گئیں۔ پھر میں نے آنکھیں کھول دیں اور چونک پڑا۔ میرے قریب ہی دائیں جانب ہوٹن فا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ لاش ہے کیونکہ اس میں نام کو بھی حرکت نہیں تھی۔ بے ہوش یا خوابیدہ شخص کے جسم میں بھی سانس لینے کے سبب خفیف سی حرکت ضرور ہوتی ہے۔ اس کی لاش ترچھی پڑی تھی۔ میں ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت مجھے دو لاشیں اور نظر آئیں۔ اُن میں سے ایک لاش کسی ویٹر کی تھی کیونکہ اس کے جسم پر ویٹروں کی وردی تھی۔ ویٹر کی لاش کے پاس ہی شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس لڑھک رہے تھے۔ بوتل کا ڈھکن بند تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کے لیے شراب لے کر جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے اجل نے گرفتار کر لیا۔ بوتل سے کچھ فاصلے پر ٹرے پڑی تھی۔ ویٹر غالباً بوتل اور گلاس اسی ٹرے میں رکھ کر لے جا رہا تھا۔ پھر میں نے بائیں جانب پڑی ہوئی دوسری لاش کا جائزہ لیا۔ وہ کسی غیر ملکی مسافر کی لاش تھی۔ اپنے چہرے کے نقوش اور جلد کی رنگت سے وہ کوئی افریقی باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ ان لاشوں کو دیکھ کر میں اتنا حیران اور سراسیمہ ہو گیا کہ مجھے اطراف کا کوئی خیال ہی نہیں رہا۔ میری نگاہ پہلی بار اُوپر اٹھی تو میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ کچھ ہی فاصلے پر لوگوں کا

ہجوم تھا۔ پھر مجھے اپنے عقب میں بھی لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ وہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ لوگ بھی مجھ سے چند فٹ ہی کے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سبھی بہت خوفزدہ تھے۔ اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

وہ لوگ کیوں اور کیسے مر گئے؟ میرا ذہن اس سوال کا جواب فوراً ہی نہیں دے سکا۔ میری توجہ ایک بار پھر ان لاشوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کے جسموں سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اُن کے جسم سفید پڑے ہوئے تھے۔

میرا وجود اب تک نادیدہ تھا اس لیے مجھے اپنے دیکھ لیے جانے کا خوف نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے جھک کر اُن لاشوں کو باری باری چھوا۔ ان مرنے والوں کے جسم جیسے پتھر ہو گئے تھے۔ پھر جب میں اُٹھ کر کھڑا ہوا تو میری سماعت میں اچانک ہی وہ جملے گونج اٹھے جو ٹوٹی چو نے چیخ کر ادا کیے تھے اور اس کا مخاطب ہوٹن فا تھا جو اس وقت میرے سامنے مردہ پڑا تھا۔ ”ہوٹن فا! رک جاؤ! اس قاتل خوشبو کے قریب نہ جانا! اگر تم نے اُسے چھو بھی لیا تو تمہارے سارے جسم کا خون سوکھ جائے گا۔ تم زندہ نہ بچ سکو گے۔“ ٹوٹی چو نے اپنے ساتھی سے چیخ کر کہا تھا اور اب واقعی اُس کا ساتھی زندہ نہیں بچا تھا۔

میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے اپنی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ اس سے پہلے ٹوٹی چو نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ مجھے تلاش کریں۔ میں اُس کے اندازے کے مطابق یہیں کہیں بہت قریب ہی تھا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ایسی صورت میں یہی سوچا جا سکتا ہے کہ میری طرف دوڑنے والے ٹوٹی چو کے ساتھی ہی تھے اور غالباً اُن میں سب سے آگے ہوٹن فا تھا جسے بعد میں ٹوٹی چو نے آگے بڑھنے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ ان تمام باتوں سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ ”قاتل خوشبو“ ٹوٹی چو نے مجھی کو کہا تھا۔ تو کیا ہوٹن فا اور دوسرے دو افراد کی موت کا سبب میں ہی بنا ہوں؟ مگر کیسے؟ میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے سوالات ابھرنے لگے۔ بالفرض یہ ناقابلِ یقین بات تسلیم بھی کر لی جاتی تو ٹوٹی چو کو اس کا علم کیسے تھا؟ میرے جسم کا لمس آج تک تو کسی کے لیے پیامِ اجل نہیں بنا تھا۔ پھر ٹوٹی چو نے کیوں کہا تھا کہ مجھے چھونے سے بھی ہوٹن فا کے سارے جسم کا خون سوکھ جائے گا؟ کیا میرے حیرت انگیز وجود کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہے جو خود میری نظر میں اب تک نہیں آ سکا؟ پھر جب میں ہی اُس سے ناآشنا تھا تو میرے دشمن اس سے کس طرح آگاہ تھے؟ سوالوں کا ایک سلسلہ سا چل نکلا۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ میری بے ہوشی کے دوران میں جو واقعات پیش آئے ہوں گے، اُن سے وہاں موجود افراد کو ضرور واقف ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ میں اس طرح حالات کا صحیح تجزیہ کر سکوں اور کوئی نئی راہِ عمل مل جائے۔

پھر وہاں جو افراد جمع تھے، اُن میں سے اکثر کے ذہن پڑھ کر مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہو گئیں۔ یہ باتیں جاننے کے بعد میری اُلجھن تو خیر اپنی جگہ برقرار رہی لیکن اس یقین میں مزید اضافہ ہو گیا کہ ان تینوں افراد کی پُراسرار موت کا سبب میرا ہی حیرت انگیز وجود ہے۔ میری بے ہوشی کے کچھ دیر بعد جو واقعات جس طرح پیش آئے، اُن کی ترتیب کچھ یوں تھی۔ ساتویں منزل پر مقیم ایک مسافر نے کسی کی بھیانک چیخ سن کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو اسے راہداری میں ہوٹن فا کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس نے ٹوٹی چو اور اس کے ساتھ ہی مزید تین افراد کو بھی مخالف سمت میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ چند ہی لمحوں بعد دو ایک کمروں کے دروازے اور بھی کھلے۔ پھر لوگ کمروں سے باہر نکل آئے۔ انھی میں سے ایک نے کمرے میں جا کر ہوٹل کے منیجر کو فون پر اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ ابھی لوگ ہوٹن فا کی لاش کے قریب نہ پہنچ سکے تھے کہ ایک ویٹر اسی منزل کے ایک مسافر کے آرڈر کی تعمیل میں شراب کی بوتل اور گلاس ٹرے میں رکھے آگے بڑھتا دکھائی دیا۔ اس ویٹر نے بھی ہوٹن فا کی لاش دیکھ لی تھی۔ وہ دہشت زدہ سا ہو کر لاش کے قریب سے گزرنے والا تھا کہ یوں معلوم ہوا جیسے اُس کی راہ میں کوئی دیوار حائل ہو گئی۔ ویٹر یکدم اس طرح اچھل کر پیچھے جا پڑا جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اسی کے ساتھ ویٹر کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں ہی میں اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

ساتویں منزل پر ایک افریقی باشندہ بھی مقیم تھا۔ وہ بھی انھی لوگوں میں شامل تھا جو یہ عجیب منظر دیکھ چکے تھے۔ اسی افریقی باشندے نے لوگوں سے کہا کہ ممکن ہے ویٹر زندہ ہو اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہو۔ یہ کہہ کر وہ خود تیزی سے ویٹر کی لاش کی طرف لپکا۔ پھر وہ جیسے ہی ویٹر کی لاش پر جھکا، اُس کے جسم کو بھی شدید جھٹکا پہنچا اور وہ اچھل کر اوندھا گرا۔ افریقی باشندہ بھی بڑے دل گردے کا آدمی تھا لیکن جھٹکا پہنچنے کے بعد اُس کا رنگ اُڑ کر رہ گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے اپنی آنکھوں کے سامنے دو افراد کو پُراسرار انداز میں مرتے ہوئے دیکھنے کے بعد پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ سکتا۔ اس کے بعد ہی اُن تینوں لاشوں کی دونوں جانب ہی راہداری میں کچھ فاصلے سے چند افراد کھڑے ہو گئے کہ کہیں کوئی اور شخص حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ وہ لوگ دوسروں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے اور اسی کے ساتھ وہاں جو کچھ پیش آ چکا تھا وہ بھی بتا رہے تھے۔ اس واقعے کی خبر پورے ہوٹل میں جنگل کی آگ کی طرح

پھیل گئی تھی۔ چونکہ اس وقت ساتویں منزل کا کوئی اور کمرہ صرف ایک شخص سے [illegible] تھا ہوٹل کے منیجر نے پولیس کو فون کر دیا تھا اور کسی بھی لمحے وہاں پولیس پہنچنے والی تھی۔ ہوٹل کا منیجر خود بھی وہیں تھا اور سخت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی پریشانی کا سبب ہوٹل کی ساکھ تھی۔ گزشتہ شب بھی ہوٹل کی تیسری منزل پر ایک ایسا واقعہ پیش آ چکا تھا کہ پولیس کو طلب کرنا پڑا تھا۔ مگر آج تو پانی سر سے ہی گزر گیا تھا۔ بیک وقت تین موتیں ہوئی تھیں جن کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہاں جو لوگ موجود تھے ان میں سے شاید ہی کوئی توہم پرست ہو لیکن اس وقت وہ بھی عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ قتل کرنے والا کوئی مافوق الفطرت اور پراسرار ہے۔

لوگوں کے ذہنوں کو [illegible] حقیقت جان لینے کے بعد وہاں میرے رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا [illegible] کہ اچانک پولیس پہنچ گئی [illegible] پھر چند لمحے بعد ہی کچھ وردی پوش پولیس والے نظر آنے لگے۔ پھر پولیس والے [illegible] لاشوں کی طرف بڑھنا چاہا۔ لوگوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ [illegible] ایک پولیس افسر [illegible] قانون کی راہ میں [illegible]

ہوٹل کے منیجر نے [illegible] پولیس کو تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا [illegible] پولیس افسر [illegible] کی کوشش کر رہا تھا [illegible] ہوٹل کا منیجر [illegible] پولیس والے بھی [illegible] پولیس والے اور منیجر کے درمیان وہ لاشیں حائل تھیں۔

"آپ لوگ ابھی تک ہمیں راستہ نہیں دے رہے۔" پولیس افسر چند لمحے بعد پھر غرایا۔

[illegible] ایک [illegible] نے پولیس افسر سے کہا۔ [illegible] ہم ابھی آپ لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں [illegible] ان لاشوں کے پاس گئے تو [illegible] آپ کا بھی وہی حشر ہوگا [illegible]

"کیا مطلب؟" پولیس افسر کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی۔ جواب میں جب اس پولیس افسر کو پیش آنے والے واقعات [illegible]

[illegible] پھر اس کی سمجھ میں [illegible]

چلیے، اب پولیس والے ان لاشوں [illegible] میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں [illegible] لیکن پھر خیال آیا کہ شاید [illegible] پراسرار واقعات سننے کے بعد انھیں لاشوں کے قریب جانے [illegible] لاشیں تماشا [illegible] نہیں بننا چاہیے تھا [illegible] پولیس افسر [illegible] قطعی [illegible] جبکہ پولیس افسر [illegible] ان لاشوں تک جا کر دکھاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں میرا کیا بگڑتا ہے؟ [illegible]

پھر جب وہ پولیس افسر لاشوں کی طرف بڑھنے لگا تو لوگوں کے چہروں پر [illegible] انھیں یقین تھا کہ کچھ ہی دیر بعد اس پولیس افسر کا [illegible] پولیس افسر ان لاشوں کے قریب پہنچ کر ایک لاش پر جھکا [illegible] پولیس افسر کے [illegible] لاش کو [illegible] لوگوں سے مخاطب ہوا۔

[illegible] لاشیں [illegible] ہٹا سکتیں؟ [illegible]

پولیس افسر کی ذات [illegible] جوش آیا۔ وہ تیزی سے لاشوں کی طرف بڑھنے لگے [illegible]

[illegible]

بخدا [illegible]

[illegible]

ٹوٹی پھوٹی [illegible] میرے لیے یہ

[illegible]

ذہن! میرا مقابلہ اس وقت تین حریفوں سے تھا۔ دو کے متعلق یقین ہو جانے کے بعد ظاہر ہے کہ تیسرا حریف روسی ایجنٹ ہی ہو سکتا تھا جو خطرناک روسی جو بظاہر معذور معلوم ہوتی تھی اور جس کے متعلق ابھی علم نہ ہو سکا تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔ وہ موجودہ حالات کے پیش نظر روسی ایجنٹ ہو سکتی تھی۔ اس نتیجے کے بعد جیسے میرے ذہن سے ایک بوجھ کم ہو گیا۔ مجھے تقریباً اپنے تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے، لیکن ایک سوال اب بھی ایسا تھا جو میرے ذہن میں خیمہ زن تھا اور یہ سوال خود میرے اپنے وجود کے بارے میں تھا۔ آخر میرے وجود میں وہ کونسی ایسی پوشیدہ قوت تھی جس کا علم خود مجھے نہیں تھا اور جس کے سبب تین افراد موت کی نیند سو چکے تھے؟

میں ادھر نواس عجیب واقعے پر غور کرنے لگا جو میرے بے ہوش ہو جانے کے بعد تین افراد کی موت کا سبب بنا تھا۔ جو حالات پیش آئے تھے ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میرا وجود نادیدہ ہو چکا تھا، لیکن میرے نادیدہ ہونے کے باوجود ہوزن خان میری طرف لپکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی رہنمائی کے لیے میرے وجود کی خوشبو کافی تھی۔ میرے وجود کی خوشبو سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نادیدہ ہونے کے باوجود میں کہاں تھا۔ مجھے اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ نادیدہ ہونے کی صورت میں بھی میرے جسم کو چھونا ممکن تھا۔ روسی ایجنٹ سے نبرد آزمائی کے وقت میرا وجود نادیدہ تھا اور اس نے میری خوشبو محسوس کر کے کئی بار مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس سے اس روسی ایجنٹ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ نادیدہ ہونے کی صورت میں میرے جسم کو چھونے سے کوئی ہلاک نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور اہم سوال پیدا ہوا۔ یہ سوال اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا اہم تھا کہ میں چونک اٹھا۔ یہ سوال مجھے پیش آنے والے ایک واقعے سے متعلق تھا۔ ہوٹل میٹرون کے بار سے نکلنے کے بعد اس روسی ایجنٹ نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میرے بازو میں کوئی پن چبھو دی تھی جس سے میں بے ہوش ہونے لگا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس وقت بھی میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا تھا۔ پھر میں لڑکھڑاتے قدموں سے روشنی کی طرف بڑھا تھا۔ وہاں مجھے ایک خالی صوفہ نظر آگیا تھا۔ میں بمشکل صوفے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا، لیکن مجھے اس پر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ میں صوفے کے دائیں جانب ایک طرف لڑھک گیا۔ اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت جو اہم سوال پیدا ہوا، وہ یہ تھا کہ روسی ایجنٹ نے اس موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟ وہ بہ آسانی میرے وجود سے اٹھتی ہوئی خوشبو کو محسوس کر کے مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ پھر چاہے میرا جسم نادیدہ ہی رہتا، وہ وہاں سے میرے جسم کو کہیں بھی لے جا سکتی تھی۔ پھر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس بھی نہیں تھی کہ بے ہوشی کی حالت میں میرے جسم کو موت سے ہمکنار کر دیا جاتا۔ اگر یہی ہو تو پھر بغداد میں چینی ایجنٹ مجھے بے ہوش رکھ کے نہ جاتے! اور روسی ایجنٹ بغداد ہی سے مجھے ہوائی جہاز کے ذریعے ستمبر لے جانے کا فیصلہ نہ کرتا۔ میرا وجود چاہے نادیدہ ہو یا میں بے ہوشی کی حالت میں ہوں، دونوں ہی صورتوں میں میرے جسم کو چھونا ممکن تھا۔ گذشتہ واقعات سے یہی ثابت ہوتا تھا۔ پھر حال ہی میں جو واقعات پیش آئے ان کا سبب کیا تھا؟ گذشتہ واقعات اور موجودہ واقعات میں مجھے صرف ایک ہی بات مختلف نظر آئی اور اسی سے میں نے ایک نیا نتیجہ اخذ کیا۔ فرق صاف ایک تھا کہ دوسرے دونوں واقعات کے وقت میرا وجود نادیدہ بھی تھا اور میں بے ہوش بھی تھا۔ یہ دونوں باتیں پہلے ایک ساتھ نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ نادیدہ اور بے ہوش ہونے کی حالت میں یقیناً میرے حیرت انگیز وجود میں چھپی ہوئی کوئی قوت خود بخود بیدار ہو جاتی تھی جس کے سبب کسی کا میرے قریب آنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ وہ روسی لیڈی ایجنٹ بھی اکیلے مجھ سے لڑ رہی تھی اور وہ چینی ایجنٹ ہوئی ہوتے بھی اسی لیے ہوزن خان کو میرے قریب جانے سے روکا تھا۔ میرے وجود میں چھپی ہوئی وہ پراسرار قوت کس طرح خود بخود متحرک ہو جاتی تھی، یہ تو نہیں معلوم، لیکن وہ میرے دشمنوں کے لیے کس قدر خطرناک تھی، اس کا علم مجھے ہو چکا تھا۔ اس قوت کے بیدار ہونے کے بعد جو بھی میرے قریب آتا، زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ میرے قریب آنے والے کے جسم کا سارا خون حیرت انگیز طور پر خشک ہو جاتا تھا۔ مجھے اپنے وجود میں چھپی ہوئی اس نئی حیرت انگیز اور ہولناک قوت کے بارے میں جان کر عجیب سی مسرت ہوئی۔ مجھے اس کا یقین یوں بھی ہو گیا کہ خود میرے دشمنوں نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ اب مجھے اپنا ذہن بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا اور میں خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا تھا۔

ٹیکسی تیزی سے داخل ہو کر ڈقی کے علاقے تک پہنچ چکی تھی اور اب چڑیا گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اب میرے خیال کی رو احمد سلمان کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ زمالک پہنچنے تک میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ٹیکسی میں نے احمد سلمان کے محل نما گھر سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دی اور فٹ پاتھ پر چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی کہ احمد سلمان کی کوٹھی کے احاطے میں پولیس بھی موجود ہو گی۔ شاید اسی لیے میں نے یہ سوچا تھا کہ پھاٹک کے اندر داخل ہو کر عمارت تک پہنچتے

ہوئے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لوں گا۔ پھر جب میں پھاٹک تک پہنچا اور اندر نگاہ ڈالی تو مجھے پولیس والے نظر آ گئے۔ میں پھاٹک سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے وجود کو نادیدہ بنانے کے لیے ایک تنگ سی گلی میں گھسنا پڑا۔ جس میں بظاہر اس وقت کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند قدم چلتے ہی میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا۔ اس وقت مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ مجھے ایک مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی میں کسی نوجوان لڑکی کا چہرہ نظر آیا۔ یقیناً اس کے لیے یہ منظر پراسرار اور خوف زدہ کر دینے والا ہو گا کہ ایک نوجوان چلتے چلتے اچانک غائب ہو گیا۔ میں اس گلی میں اس لیے گھسا تھا کہ کوئی میرے وجود کو نادیدہ ہوتے نہ دیکھ سکے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں خواہ مخواہ سنسنی پھیلانے اور لوگوں کو خوف زدہ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اگر پہلے میری نظر اس لڑکی پر پڑ گئی ہوتی تو میں کسی اور گلی کا رخ کرتا۔ اس لڑکی کو میں نے دانستہ خوف زدہ نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے علم نہیں تھا وہ میری ہی طرف دیکھ رہی ہو گی۔ میں اس انسان کے لیے ایسی بے یقینی اور مرتے مرتے اس لڑکی کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ واقعہ اسے مضطرب اور بے چین کر دے۔ وہ یقیناً ایک مدت تک اس پراسرار واقعے کو نہیں بھول سکتی تھی۔

تم نے کسی نوجوان کو غائب ہوتے نہیں دیکھا۔ میرے ذہن نے اسے حکم دیا اور اس کے ذہن نے میرے ذہن کے اس حکم کو قبول کر لیا۔ وہ لڑکی اس وقت یا تو گھر میں اکیلی تھی یا پھر کسی گھر والے نے اس کی چیخ نہیں سنی تھی۔ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ کوئی اس کی چیخ سن کر کیوں اس کے پاس نہیں پہنچا تھا، اس کے ذہن کو نہیں کریدا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے گھر میں تنہا ہے یا اور لوگ بھی گھر میں موجود ہیں! مجھے تو اس کے ذہن سے ایک پراسرار واقعے کے نقوش مٹانا تھے، جو مٹا چکا تھا۔ میں اسی لیے اس لڑکی کے ذہن سے رابطہ منقطع کر کے سیدھا چلتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہی میں احمد سلمان کی محل نما کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ اب مجھے پولیس والوں کی پروا نہیں تھی۔ میں ان کے درمیان سے سکون کے ساتھ گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے ذہن میں مستور لہریں لیلیٰ اور سطوت کو تلاش کر چکی تھیں۔

لیلیٰ اس وقت نچلی منزل کے اسی کمرے میں تھی جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اس وقت رو رہی تھی۔ صبح سے اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ واقعی وہ بہت دکھی تھی۔ اس کا شوہر اسرائیلی ایجنٹ ثابت ہوا تھا جسے قتل کر دیا گیا تھا اور بھائی جس سے اسے بے حد محبت تھی، اس کی دنیت ہی اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس پہ ستم یہ کہ سوتیلی ماں اس کے وجود کو اپنے گھر میں برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس وقت وہ خودکشی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میری ازدواجی زندگی تو ختم ہو چکی ہے، پھر میں اپنے والدین کی ازدواجی زندگی کو جہنم کیوں بناؤں؟ مجھے مر جانا چاہیے! مجھے کوئی حق نہیں کہ اس گھر کے سکون کو تباہ کروں۔ مجھے خودکشی کر لینا چاہیے!

نہیں! تم زندہ رہو گی لیلیٰ! تمہاری سوتیلی ماں کو تم سے معافی مانگنا ہو گی! میرے خیال کی صدا لیلیٰ کے ذہن میں گونج اٹھی۔

"مگر ایسا تو پہلے بھی ہو چکا ہے۔" لیلیٰ جیسے خود سے باتیں کرنے لگی۔ "پہلے بھی تو انہوں نے مجھ سے معافی مانگی تھی مگر کیا ہوا؟ وہ پھر بدل گئیں۔"

اب ایسا کبھی نہیں ہو گا! میں نے اسے یقین دلایا اور بادل ناخواستہ اسے یقین کرنا ہی پڑا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ میرے ذہن کے زیر اثر بڑبڑائی۔ "پھر میں خودکشی نہیں کروں گی... نہیں کروں گی۔"

لیلیٰ کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اوپری منزل کا رخ کیا۔ سطوت اوپری منزل کے باورچی خانے میں تھی اور اس وقت احمد سلمان کے لیے لنچ تیار کر رہی تھی۔ "کیا ہو رہا ہے سطوت؟" میں نے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی اسے بلند آواز میں مخاطب کیا۔

وہ میری آواز سن کر اتنے زور سے اچھلی کہ اس کے ہاتھ سے ٹفن چھوٹ گیا جسے اس نے ابھی بند نہیں کیا تھا۔ ٹفن گرنے سے سالن زمین پر گر گیا مگر سطوت کو اس وقت ٹفن کا ہوش نہیں تھا۔ وہ تڑپ کر باورچی خانے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جدھر سے اسے میری آواز سنائی دی تھی۔ دالان میں اسے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "اب تو تمہارے راستے کا کانٹا خود ہی نکل گیا سطوت! اب تم بہت خوش ہو گی!" میں پھر بولا۔ میرا اشارہ ایمن کی طرف تھا۔

"کک... کون؟... کون ہو تم؟" وہ بمشکل خوف زدہ آواز میں بولی۔

"میری آواز سن کر تو تمہیں پہچان لینا چاہیے کہ میں کون ہوں! تم پہلے بھی تو میری آواز سن چکی ہو۔ سوچو، خود سوچو کہ میں کون ہو سکتا ہوں!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

"تم... تم وہی... وہی تو نہیں... وہی میرا... میرا ضمیر؟" وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔

"ہاں میں وہی ہوں تمہارا ضمیر!" میں نے تصدیق کی۔

[illegible]

[illegible]

پرچھائیں

کتابی صورت میں

ایم اے راحت

کا

ہنگامہ خیز ناول

قیمت: 40 روپے ڈاک خرچ: 15 روپے

گل قریش لائبریری
11- عمر روڈ' اسلام پورہ' لاہور۔
فون: 7248599
7229762

[illegible]

[illegible]

خارج ہو گئی۔

سلطنت کا رویہ بدل جانے سے اس گھر کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔ احمد سلمان کو جب اس بات کا علم ہو گا تو یقیناً اس کا دکھ کچھ ہلکا ہو جائے گا میں نے سوچا اور گھر سے ٹھوکر کھاتا ہوا کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے ایک بار زکریہ کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ گیا۔ احمد سلمان کے تعاقب قتل ہونے کے بعد بھی میں نے اپنے وجود کی تجسیم نہیں کی اور اس کی وجہ تھی۔ اب میں ہوٹل پہنچ کر اپنا سامان رکھنے کے بعد ایسا کرنا چاہتا تھا۔ میں اب فوری طور پر قاہرہ میں یمامہ کے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی شخصیت اپنا لینے کے بعد یمامہ مجھے کسی طرح اپنے مکان میں رہنے کی اجازت دے سکتی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد سڑک کے کنارے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی تو میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائیور سے کہا: "ہوٹل لے چلو۔" میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے بغیر کرایہ طے کیے گاڑی اسٹارٹ کر دی کیوں کہ اس کے ذہن پر میرا تصرف تھا۔ پھر جب میں ہوٹل پہنچ کر ٹیکسی سے اترنے لگا تو پانچ گنی کا ایک نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا: "لو کرایہ لے لو۔"

"جی صاحب، شکریہ۔" ٹیکسی ڈرائیور نے نوٹ لے لیا اور اسی کے ساتھ میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور یہ جان ہی نہ سکا کہ اس کی ٹیکسی میں سفر کرنے والا حیرت انگیز وجود تھا ورنہ اسے نظر بھی نہیں آیا تھا۔ اسے تو صرف یہ پتہ تھا کہ ایک مسافر اس کی ٹیکسی میں بیٹھا تھا اور ہوٹل کے سامنے اتر گیا تھا۔

ہوٹل میں داخل ہو کر میں لفٹ کے ذریعے فوراً دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی لفٹ میں سوار ہو گیا تھا اور لفٹ آپریٹر کی نظر بچا کر دوسری منزل کا بٹن دبا دیا تھا۔ دوسری منزل کا کوئی مسافر لفٹ میں نہیں تھا اور اتفاق یہ کہ وہاں سے سوار ہونے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اسی لیے جب دوسری منزل پر لفٹ رکنے لگی تو وہ بقیہ مسافروں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "کیا آپ میں سے کسی نے دوسری منزل کے لیے بٹن دبایا تھا؟"

جتنی دیر میں لفٹ آپریٹر کو اس کے سوال کا جواب ملتا، لفٹ دوسری منزل پر پہنچ کر رک گئی تھی اور اس کا خودکار دروازہ کھل گیا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ لفٹ آپریٹر یہی سمجھا ہو گا کہ کسی نے شرارت کی ہو گی۔

ایک حسن نصیب کی داستانِ الم جو چاندنی راتوں میں قہر و غضب کی علامت بن جاتی تھی

دلچسپ کہانیوں کی مصنفہ

سیما غزل

کے سرِ تحیر قلم سے ماہنامہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

ایک نادر پُر تحیر سنسنی خیز سلسلہ وار آپ بیتی

چاند کے قیدی

2 جلدوں میں مکمل

نسل در نسل چلنے والے انتقام کی روداد

قیمت فی حصہ 45 روپے
ڈاک خرچ 13 روپے

شائع ہو گیا

ملنے کا پتہ: ناشر
گل قریش لائبریری 11 - عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون: 7229762 - 7248599

نادیدہ وطن اور عوام آزادی کی متوالی ایک فلسطینی مجاہدہ کی سرگزشت

دشمن

تحریر

ایم اے راحت

• جوانی کی امنگ حسن کی نزاکتوں کو بھلا کر آزادیٔ وطن کے جذبے سے سرشار
• دیوانوں کی کہانی آتش و آہن کی انوکھی داستان
• جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کرتے تھے

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال یا ہم سے طلب کریں

ناشر
گل قریش لائبریری 11 - عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7229762 - 7248599

قیمت
40 روپے
ڈاک خرچ الگ

تب میں جیسے ہی اپنے کمرے کی طرف بڑھا، چونک اٹھا۔ ایک عورت میرے کمرے کا قفل کھولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا چہرہ مجھے واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے لباس اور جسم کی رنگت سے افریقی معلوم ہو رہی تھی۔ میں کھٹک گیا۔ یہ عورت کون ہے اور میرے کمرے میں کیوں داخل ہونا چاہتی ہے؟ میرے ان سوالات کا جواب مجھے فوراً ہی اس کا ذہن پڑھ کر مل سکتا تھا لیکن میں نے اس سے اجتناب کیا۔ اس اجتناب کا سبب یہ خیال تھا کہ وہ عورت میک اپ میں بھی ہو سکتی تھی اور اس کا تعلق میرے دشمنوں سے بھی ہو سکتا تھا۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا اور جن لوگوں سے اس بار میرا مقابلہ تھا، وہ قطعی مختلف لوگ تھے۔ عام قسم کے مجرموں سے الگ! وہ غیر معمولی ذہن اور کچھ مخصوص صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض بڑی تیزی سے میرا استخلاص ہو چکا تھا۔ وہ تینوں ہی یقیناً بہترین ذہنوں کے مالک تھے، ان کے ذہنوں کو قابو میں کر لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں امریکی ایجنٹ جیفری ناٹ کا ذہن نہیں پڑھ سکا تھا، چینی ایجنٹ لیلیٰ تو نے مجھے ابتدا میں پڑھنے کی اجازت بھی دی تھی تو جان بوجھ کر دی تھی۔ وہ اس کی اصل شخصیت نہیں تھی۔ وہ خطرناک لڑکی جسے میں اب تک ایجنٹ سمجھ چکا تھا اور جس کا ابھی مجھے نام بھی نہیں معلوم تھا، اس کا ذہن پڑھنے میں بھی مجھے ناکامی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ذہن سے ناقابلِ برداشت ہونے کے باعث میرے ذہن میں تاریکی سی پھیل گئی تھی۔ اس سے پہلے میں کبھی ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس وقت ایک عورت کو اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے دیکھ کر میں نے اس کے ذہن سے رابطہ قائم نہیں کیا اور نہ ہی اس کے قریب گیا کیونکہ وہ مجھے میرے وجود کی خوشبو سے پہچان کر چوکنا ہو سکتی تھی۔ میں اس بے خبری میں حملہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر ادھر وہ عورت میرے کمرے کا قفل کھولنے میں کامیاب ہوئی، ادھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس طرح میں اس پر حملہ کر سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکیاں کبھی اندر سے بند نہیں رکھتا تھا۔ شاید کھڑکیاں کھلی ہی رہتی تھیں یا پھر انہیں صرف بھیڑ دیتا تھا۔ اس وقت مجھے کھڑکیوں ہی کا خیال آیا تھا۔ وہ عورت یقیناً اس سے غافل نہیں ہو گی کہ میں بھی کسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ سکتا ہوں۔ مجھے اسی لیے یقین تھا کہ کمرے میں پہنچتے ہی وہ اندر سے دروازہ بند کر لے گی۔ اندر سے دروازے کی چٹخنی لگ جانے کے بعد اسے باہر سے کھول لینا ممکن نہیں تھا، ایسی صورت میں دروازہ توڑ کر ہی اندر پہنچا جا سکتا تھا۔ اس دوران یقیناً وہ اپنے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی تدبیر کر سکتی تھی۔ اس نے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہو گا۔ اس نے مجھ سے بچنے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور سوچ رکھا ہو گا، لیکن میں کھڑکیوں کے راستے بھی کمرے میں داخل ہو سکتا ہوں، یہ خیال اس کے ذہن میں نہ آیا ہو۔ یہی سوچ کر میں تیزی سے نیچے جانے والے زینے کی طرف لپکا۔ میں لفٹ کے انتظار میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی مجھے اپنی رفتار پر یقین تھا۔

مجھے نیچے پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ پھر میں وہاں رکے بغیر تیزی سے ہوٹل کی پچھلی سمت میں بھاگا۔ مجھے اپنے دیکھے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا اس لیے آنے جانے والوں پر میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر جیسے ہی میں اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے بالکل نیچے پہنچا ایک کھڑکی کھلی اور وہی افریقی عورت کھڑکی میں نظر آئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر ادھر ادھر دیکھا پھر کھڑکی بند کر دی۔

"تو اس نے کھڑکیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا!" میں نے سوچا۔ یقیناً وہ بہت چالاک عورت تھی۔ میرے ذہن میں آیا ممکن ہے اس نے دوسری کھڑکی پر توجہ نہ دی ہو۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے اس کھڑکی کے راستے کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر کی طرف جست بھری اور دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ اوپر پہنچتے ہی میں نے دوسری کھڑکی کے ایک پٹ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ وہ کھڑکی اندر سے بند نہیں کی گئی تھی۔ میں نے انتہائی محتاط انداز میں آہستگی سے کھڑکی ذرا سی کھولی اور پھر دوسرے لمحے اس پر چڑھ کر کمرے کے اندر کود گیا۔ کودتے ہوئے میں نے اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک ذرا سی میری طرف پلٹی تھی۔ غالباً اس کی قوتِ شامہ نے میری خوشبو محسوس کر لی تھی۔ وہ مجھ سے چند ہی فٹ کے فاصلے پر تھی اور میرے خیال میں اب وہ کسی طور پر اپنی موت سے نہیں بچ سکتی تھی۔ اس کے جسم سے بھی میرے جسم کی طرح گلابوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں اس پر جست لگانے ہی والا تھا کہ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکال لی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ریوالور سے ملتی جلتی ایک سیاہ شے نظر آنے لگی جس کے نچلے حصے میں ایک سرخ بٹن تھا۔ اس بٹن پر اس کی ایک انگلی رکھی ہوئی تھی۔ معاً اس نے ایک طویل سانس کھینچا اور اسی وقت میں نے اس پر چھلانگ لگا دی! ابھی میرے جسم نے اس تک پہنچنے کے لیے نصف فاصلہ طے کیا ہو گا کہ مجھے یوں لگا جیسے میں شعلوں میں گھر گیا ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور سے ملتی جلتی عجیب سی شے تھی، اس کی نال سے خنکی جیسی روشنی نکل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس روشنی میں میر

پورا وجود ہل گیا اور وہ اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ میں بے ساختہ منہ کے بل آ رہا۔

زمین پر گرتے ہی مجھے ایک سخت قسم کی تکلیف کا احساس ہوا۔ پہلا احساس یہ تھا کہ میں کوشش کے باوجود اٹھ نہیں سکتا اور دوسرا احساس یہ کہ میرا وجود سمیٹ جانے کے باوجود مکمل طور پر چھپ نہیں ہوا۔ میرے جسم کی اطراف بنفشی روشنی کی لکیریں سی ابھری تھیں۔ میں منہ کے بل زمین پر چت پڑا ہوا اس بنفشی روشنی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت میں نے ایک کھنکتا ہوا سا زہریلا قہقہہ سنا۔ "ابوالہول!" وہ سعادت نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر جیسے میری قوت گویائی بھی سلب ہو چکی تھی۔ کوشش کے باوجود میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"دیکھو ابوالہول! کہ تم اپنی تمام تر قوت کے باوجود کتنے بے بس ہو!" یہ کہہ کر وہ پھر زور سے ہنسی۔ "تم اپنی جگہ سے اس وقت حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ میں چاہوں تو تمہیں ہلاک بھی کر سکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گی کیونکہ تم پر میرے ملک نے بہت سرمایہ خرچ کیا ہے۔ میں جس مقصد کے لیے تم سے گفتگو کر رہی ہوں اس سے تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میرا تعلق کس ملک سے ہے۔"

کوئی چیز میں نے کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔ اسی کے ساتھ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیسا میرا وجود طویل عرصے کے لیے تو ناکارہ نہیں بن گیا؟ میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوندی۔ تو کیا اگر ایسا ہی ہے تو پھر وہ پوری طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ میں بے بس ہو چکا ہوں اور وہ مجھے اس حالت میں جہاں چاہے بہ آسانی لے جا سکتی ہے۔

"ابوالہول! نصیحت چھوڑو اور اس خیال کو بھی اپنے ذہن سے نکال دو کہ تمہارے وجود سے کوئی کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارا مقصد تو تم ہو" اس نے پھر مجھ سے کہا۔ "حالت اگر تم ہمارے تصرف میں پہنچ جاؤ تو اس کا جائز استعمال نہیں ہوتا مگر صحیح تصرف میں پہنچنے کے بعد سے دنیا کے مفاد کے لیے فوری کو ذریعہ بنا سکتے ہے۔ تمہارے حیرت انگیز وجود کو میرا ملک انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر تم غلط تصرف میں پہنچ گئے تو پھر دنیا کی تباہی یقینی ہے۔ ابوالہول! میں تم سے انسانیت کے نام پر اپیل کرتی ہوں کہ خود کو میرے ملک کے حوالے کر کے دنیا کو تباہی سے بچا لو۔" لڑکی کے لہجے میں واقعی التجا تھی۔

حضرت جان
قاضی عبدالستار
ملنے کا پتہ: ناشر
گل قریشی لائبریری 11- محمد روڈ اسلام پورہ لاہور

زہریلا
ایم اے راحت
ناشر: گل قریشی لائبریری 11- محمد روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7248599-7229762

وہ مجھے اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔ مجھے بے بس کر دینے کے باوجود میرے ذہن میں جیسے روشنی سی ہو گئی کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سب بے بس کر دینے کے باوجود وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور مجھے میری مرضی کے خلاف کہیں نہیں لے جا سکتی۔ میں موت کی سی کیفیت میں پڑا تھا۔

"اب میں جا رہی ہوں ابوالہول!" وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو کر مجھے گھورتی ہوئی بولی۔ "اس کا فیصلہ آنے والا وقت اور تمہارا رویہ کرے گا کہ تم پر میری باتوں کا کیا ردعمل ہوا!" یہ کہہ کر وہ مڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں اسے جاتے ہوئے بے بسی سے دیکھتا رہا۔ دروازہ کھول کر وہ خاموشی سے باہر نکل گئی اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ کیا وہ دوسرے میری آمد ہی کا انتظار کر رہی تھی؟ کیا اسے کسی ذریعے سے یہ معلوم تھا کہ میں یہاں آؤں گا؟ وہ میرے کمرے تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ میرا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے چہرے پر نقاب پہن رکھا تھا۔ اس وقت وہ دانستہ بھی کوئی نہیں رہی تھی۔ مجھے ان باتوں کے بارے میں سوچنا تھا مگر اس وقت اس حالت میں میرا ذہن بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ہی میری جسمانی قوتیں بھی اس وقت کام نہیں کر رہی تھیں۔ جتنا میرا ذہن بھی اس بنفشی روشنی کی وجہ سے ماؤف ہو رہا تھا۔ [illegible] میں پوری طرح بے حس ہو چکا تھا اور اب اس نقاہت کے سبب مجھے اپنا جسم ابھی تک مفلوج سا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر یہ تکلیف ناقابل برداشت نہیں تھی۔

پھر مجھے اس حالت میں چند ہی منٹ گزرے کہ بنفشی روشنی غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ طمانیت کا احساس ہوا کہ شاید میری قوتیں بحال ہو گئی ہیں۔ میں نے سوچا۔ اب مجھے اپنی حرکات سے بھی تصدیق ہو رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنے جسم کو حرکت دی اور اس کے ساتھ ہی ایک سنسناہٹ سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ جسم کی سنسناہٹ کے بعد جب میں نے محسوس کرنے کے قابل ہوا تب اس وقت خون بحال ہونے سے جو سنسناہٹ سی ہوتی ہے، وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ میرا وجود بحال تھا مگر یہ کیفیت بھی ختم ہو

اپنے وقت کا مقبول ترین سلسلہ
جانباز
(۳ حصے)
تحریر: ایم اے راحت
قیمت 40 روپے
ناشر: گل قریشی لائبریری 11- محمد روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7248599-7229762

دشمن
تحریر: ایم اے راحت
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال یا ہم سے طلب کریں
قیمت 40 روپے
ناشر: گل قریشی لائبریری 11- محمد روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7248599-7229762

گئی اور میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اپنی قوتیں بحال ہونے کے بعد پہلا خیال یہ آیا کہ مجھے فوراً وہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے بعد میں نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔ اپنے وجود کی تجسیم کر کے میں خود کو کسی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میں نادیدہ رہ کر اپنی دونوں اٹیچیوں کو اُٹھاتے ہوئے ہوٹل سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ایسا اسی وقت ممکن تھا جب میں اپنے وجود کی تجسیم کر لیتا۔ ایسی صورت میں مجھے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ کوئی چوکیں قریب ہی موجود نہ ہو۔ اس طرح میرا نیا میک اپ بھی اس کی نظر میں آ جاتا۔ مجھے بہر حال نادیدہ رہ کر ہی کسی طرح ہوٹل سے نکلنا تھا۔ میں اس ہوٹل سے کافی دور نکل جانے کے بعد ہی اپنے وجود کی تجسیم کرنا چاہتا تھا۔ بنفشی روشنی غائب ہونے کے بعد ہی میرے ذہن نے ـــــ بالکل صحیح انداز میں کام شروع کر دیا تھا۔ لیما جو میری بدلی ہوئی شخصیت کے باوجود میرے کمرے میں کیسے پہنچ گئی؟ یہ سوال میرے لیے اب لاینحل نہیں رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے جو روشنی سی نمایاں تھی وہ کسی کیمرے کی فلیش گن کی ہوگی۔ میری تصویر دکھا کر ہوٹل کے ویٹر سے اس نے بہ آسانی یہ معلوم کر لیا ہوگا کہ میں کس منزل کے کون سے کمرے میں سکونت پذیر ہوں۔ اس نے بے ہوش ہونے اور میرے وجود کے نادیدہ بن جانے سے پہلے میری تصویر کھینچ لی تھی۔ اس سے اس کی ذہانت [illegible] ظاہر ہوتی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامی حالات میں بھی اس کا ذہن پوری طرح کام کرتا ہے۔ میرا ذہن اب کیوں کہ پوری طرح فعال تھا اس لیے ہوٹل سے بہ حفاظت نکل جانے کی راہ مجھے فوراً ہی نظر آ گئی۔ اس طرح اول تو کسی ہنگامے کا امکان نہیں تھا اور کوئی ہنگامہ ہوتا بھی تو زیادہ جگہ دُور نہ پہنچتی۔

اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر کے میں نے دونوں اٹیچیاں اٹھائیں اور ایک کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اس وقت وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر کھڑکی پر چڑھ گیا اور پھر دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔ میرا جسم، دونوں اٹیچیوں سمیت آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ یہ بھی میرے وجود میں پوشیدہ قوتوں میں سے ایک قوت تھی۔ میں ہزاروں فٹ بلندی سے چھلانگ لگا سکتا تھا اور ہزاروں فٹ اونچائی تک بھی اچھل سکتا تھا۔ ابھی میں کئی بار میں اپنی اس قوت کا عملی تجربہ کر چکا تھا۔

ابھی میں زمین کی سطح سے بمشکل دس فٹ اوپر ہی تھا کہ معاً کوئی کہیں قریب ہی سے چیخا: "ارے یہ اٹیچیاں اوپر سے کس نے پھینکی ہیں؟ وہ دیکھو، اُدھر دیکھو!"

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ہوٹل ہی کا کوئی ملازم تھا جس کے جسم پر ہوٹل مینجمنٹ کی مخصوص وردی تھی۔ وہ بھی پھاٹک کی طرف سے آ رہا تھا اور تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا جس کا تعلق یقیناً ہوٹل سے نہیں تھا کیوں کہ وہ سادہ کپڑے والا تھا۔ ہوٹل کے ملازم نے اسی شخص کو اٹیچیوں کی طرف متوجہ کیا تھا۔ جب دونوں اٹیچیاں زمین پر گرنے کی بجائے تیزی سے ان دونوں کی طرف بڑھنے لگیں تو ان کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے سبب پھیل گئیں۔ میں نیچے آتے ہی بغیر وقت ضائع کیے مخصوص پھاٹک کی طرف لپکا۔ ان دونوں کا جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے ہوئے اٹیچیوں کو زمین سے چند انچ اوپر گویا ہوا میں تیرتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھتے رہے۔ یہ منظر یقیناً ان کے لیے ناقابل فہم اور حیرت انگیز تھا۔ ہوگا کیوں کہ میرا وجود تو ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔

میں ایک تیز جھونکے کے مانند ان کے قریب سے گزرا اور پھاٹک عبور کر کے چلتی سی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس اکا دکا سواریاں ادھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان سواریوں میں سے بھی کسی کی نظر اٹیچیوں پر پڑ سکتی تھی اسی لیے میں نے اپنے وجود کی تجسیم میں زیادہ دیر نہیں کی۔ یوں بھی میں چند ہی لمحوں میں ہوٹل سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اپنے وجود کی تجسیم کے بعد بھی میں رکا نہیں اور تیزی سے ایک گلی میں گھس گیا۔ وہ گلی عبور کر کے میں ایک اور سڑک پر پہنچ گیا۔ اس سڑک پر خاصا ٹریفک تھا۔ مگر مجھے فوراً ہی کوئی خالی ٹیکسی نہ مل سکی۔ میں ٹیکسی کے انتظار میں وہاں رکنے کی بجائے چلتا رہا۔ پھر بالآخر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ ہی گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے میرے ساتھ دو اٹیچیاں دیکھ کر زیادہ کرایہ طلب کیا جسے میں نے بغیر کسی حجت کے منظور کر لیا۔ میں اسے بتا چکا تھا کہ مجھے پرانے قاہرہ کے محلے مصر قدیمہ جانا ہے۔ منہ مانگا کرایہ مل جانے پر ٹیکسی ڈرائیور خود ہی نیچے اتر آیا۔ اس نے ڈکی کھول دی۔ میں دونوں اٹیچیاں ڈکی میں رکھوا کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد ہی ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ میری آنکھوں میں اس وقت یمامہ کا حسین سراپا گھوم رہا تھا۔

شاید وہ یمامہ کا حسین تصور ہی تھا کہ کچھ پہلے پیش آنے والا واقعہ میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ اب میں صرف یمامہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر اس کی نیلی آنکھوں میں کتنے رنگ لہرا جائیں گے اور یہ

وہ بہت ممکن ہے مجھے اپنے گھر میں رکھنے پر آمادہ بھی ہو جائے گا یا نہیں؟ یہ سوچنے کا سبب وہ نیا میک اپ تھا جو اب میرے چہرے پر تھا۔ اس نے گویا مکان کرائے پر دینے کا وعدہ مجھ سے نہیں کسی اور سے کیا تھا جس سے وہ چھ ہفتے کا پیشگی کرایہ بھی وصول کر چکی تھی۔

محویت کا عالم ہو تو نہ وقت کا کچھ احساس رہتا ہے نہ فاصلوں کا۔ میں اسی لیے اس وقت ہی چونکا جب ٹیکسی مصر قدیمہ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ پھر میں نے یمامہ کے گھر کے سامنے ہی ٹیکسی رکوائی اور اتر گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میری دونوں اٹیچیاں ڈکی سے نکال کر میرے قریب رکھ دیں اور میں نے طے شدہ کرایہ ادا کر دیا۔ ٹیکسی چلی گئی تو میں نے آگے بڑھ کر یمامہ کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، مگر کنڈی کھلنے کے بعد دروازے کے پٹ نہیں کھولے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے پٹوں کے درمیان پیدا ہونے والی جھری سے دیکھ رہا ہے۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک نسوانی سی آواز کواڑوں کی اوٹ سے سنائی دی: "جی فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

میں نے یمامہ کی ترنم آواز پہچان لی اور جواب دیا: "مجھے آپ ہی سے ملنا ہے۔ مجھے میرے بڑے بھائی ابو زید نے بھیجا ہے۔"

"میں کسی ابو زید کو نہیں جانتی۔"

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یمامہ نے صبح میرا نام پوچھا ہی نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فوراً کہا: "معاف کیجیے گا! مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ آپ نے ان کا نام پوچھا ہی نہیں تھا۔"

"ہاں میں نامعلوم لوگوں سے ان کے نام نہیں پوچھا کرتی، خصوصاً مردوں سے تو بالکل نہیں۔" وہ بولی: "آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"کیوں...؟"

"اس لیے کہ سارے مرد تقریباً ایک ہی نسل کے ہوتے ہیں۔" اس نے جواباً کہا: "آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"دراصل جو صاحب صبح آپ سے ملے تھے، وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ وہی جنہوں نے آپ کے مکان کا ایک حصہ کرائے پر لیا ہے۔" میں مطلب کی بات پر آ گیا۔

"اچھا!" اس نے ایک طویل سانس لیا: "تو آپ ان کے چھوٹے بھائی ہیں!"

"جی ہاں۔ مجھے انہوں نے ہی بھیجا ہے۔" میں نے بتایا۔

دروازے میں ذرا سی جھری اور ہوئی۔ پھر چند لمحے بعد یمامہ کی آواز آئی: "یہ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے آپ کے ہاتھ اپنا سامان بھیجا ہے۔" پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "اندر آ جائیے! میں ان کے کمرے میں سامان رکھوا دیتی ہوں۔"

میں نے اس وقت دانستہ یمامہ کی یہ غلط فہمی دور نہیں کی کہ میں صرف سامان پہنچانے کی غرض ہی سے آیا ہوں۔ دروازے پر کھڑے رہ کر بات کرنے سے بہر حال یہ بہتر تھا کہ میں گھر میں داخل ہونے کے بعد اصل معاملے کی بات کرتا۔ میرے اندر داخل ہونے پر اس نے دروازے کو صرف بھیڑ دیا تھا۔ اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اسے میری فوری واپسی کی توقع تھی۔

اس وقت بھی یمامہ کے جسم پر عمدہ لباس تھا اور اس نے کوئی خوشبو بھی لگا رکھی تھی۔ صبح کی نسبت وہ اس وقت زیادہ حسین اور پرکشش نظر آ رہی تھی۔ محتاط ہو کر میں نے بس ایک ہی نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔ چہرے پر جالی کی سفید نقاب اب بھی تھی جو اس کے حسن میں اضافے کا سبب بنی ہوئی تھی۔ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کی رفتار میں عجیب سا نشہ تھا۔ شاید غرورِ حسن کا نشہ! یوں لگ رہا تھا جیسے سارا زمانہ اس کی ٹھوکر میں ہو۔ وہ اس کی نیلگوں خمار آلود آنکھیں، وہ اس کا جمال و جلال۔ وہ واقعی یگانۂ روزگار تھی۔

تب وہ مجھے لیے ہوئے اس کمرے میں آ گئی جہاں میں، صبح بھی آ چکا تھا اور جہاں مجھے سکونت اختیار کرنا تھی تو میں نے دونوں اٹیچیاں ایک طرف دیوار سے لگا کر رکھ دیں، پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے، اگر زحمت نہ ہو تو تشریف رکھیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ان کرسیوں کی طرف اشارہ کیا جو مسہری کے قریب رکھی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی۔

"مجھ سے کچھ گفتگو کرنا ہے آپ کو!" وہ حیرت سے بولی: "کیا؟"

"آپ تشریف رکھیں۔" میں کرسیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں پہلے ہی دوسری کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کہا: "جی... کیا بات ہے؟"

"آپ کو شاید میرے بھائی صاحب نے بتایا ہوگا کہ وہ تاجر ہیں۔" میں نے گفتگو شروع کی۔

"جی ہاں بتایا تھا۔" اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"تو پھر آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ کوئی بھی تاجر اولیت تجارت ہی کو دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کی بات کا مطلب سمجھی نہیں۔"

"میں عرض کرتا ہوں۔" میں سنبھل گیا۔ "دراصل وہ اسکندریہ سے آئے تھے۔ اسکندریہ میں اُن کے شب و روز بہت مصروف گزرتے تھے۔ وہ یہاں قاہرہ میں کچھ دن کاروبار سے الگ تھلگ رہ کر آرام کرنے کی غرض سے آئے تھے لیکن پھر ایسی ہی کاروباری مجبوری پیش آگئی کہ انھیں آج ہی اسکندریہ واپس جانا پڑا۔ میں ہی انھیں آج اسکندریہ سے یہ پیغام دینے یہاں آیا تھا۔ خود مجھے بھی کیوں کہ قاہرہ دیکھنے کا شوق تھا اس لیے انھیں تار دینے کی بجائے بہ ذاتِ خود یہاں آگیا۔" میں یہ کہہ کر وہ کہانی سُنا رہا تھا جو میں نے پہلے ہی ترتیب دے لی تھی۔ "وہ ہوٹل ہلٹن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے علم تھا کہ وہ کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔ میں اُن سے آج دوپہر ملا تو انھوں نے مجھے آپ کے بارے میں اور اس مکان کے کرائے پر لینے کے متعلق سب کچھ بتایا۔ وہ قاہرہ کی پُرشور زندگی سے الگ رہ کر یہاں سکون سے کچھ وقت گزارنا چاہتے تھے، مگر مجھ سے ضروری کاروباری پیغام پا کر انھوں نے فوراً اسکندریہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ان سے کہا کہ کچھ دن قاہرہ میں گزارنا چاہتا ہوں تو انھوں نے مجھے آپ کے مکان میں قیام کا مشورہ دیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ آپ سے اُن کے کیا معاملات طے ہوئے تھے اور یہ کہ وہ آپ کو کتنی رقم پیشگی ادا کر چکے ہیں۔ اب آپ سے میری یہ درخواست ہے کہ مجھے یہاں قیام کی اجازت دے دیں۔ اگر میں کچھ عرصے سے زیادہ رکوں گا تو آپ کو مزید رقم دے دوں گا۔"

میری پوری کہانی سُن کر عامرہ نے ایک طویل سانس لیا پھر اپنی خمار آلود آنکھیں میری طرف اٹھائیں اور غیر یقینی سے لہجے میں بولی: "کیا واقعی آپ کے بھائی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ یہاں قیام کریں؟" سوال کرنے کے بعد بھی اس کی نظریں میرے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ شاید میرے چہرے سے کوئی اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

"جی ہاں۔" میں جلدی سے بولا۔ "بھائی صاحب ہی نے مجھے یہاں رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں میرا وقت بہت خوشگوار گزرے گا اور اب آپ سے مل کر مجھے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"ناممکن!" وہ بڑبڑائی، پھر خود کلامی کے سے انداز میں دھیرے سے کہا۔ "کبھی ایک بھائی ایسا مشورہ نہیں دے سکتا!"

"جی، کیا کہا؟" میں اس کی بات سُن کر بھی انجان بن گیا۔

"کچھ۔ کچھ نہیں۔" وہ کچھ الجھی الجھی سی نظر آنے لگی اور میں اس کا سبب سمجھ گیا۔

"دراصل ہم دونوں بھائی بھی ہیں اور دوست بھی!" میں نے بات بنائی۔ "اور پھر یہ کہ وہ میرے سگے بھائی نہیں ہیں۔ ہم عمر کے ایک رشتے سے میرے بھائی لگتے ہیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے!" وہ مسکرا دی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ اُن کا سگا بھائی ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"وہ مجھ سے سگے بھائی کی سی محبت کرتے ہیں۔"

"وہ کب لوٹیں گے قاہرہ؟" اس نے میری بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

"کچھ خبر نہیں۔ اب انھیں دو چار مہینے بھی فرصت مل سکے یا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہُوں۔" اس نے ہنکارا بھرا، چند لمحے توقف کے بعد بولی: "دیکھیے معاف کیجیے گا، میں کس طرح تسلیم کر لوں کہ آپ کو انھوں نے بھیجا ہے؟ آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"آپ کے اور اُن کے مابین تنہائی میں جو گفتگو ہوئی تھی ظاہر ہے کہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتی تھی، اگر انھوں نے مجھے نہ بھیجا ہوتا!" میں نے کہا۔

"پھر بھی میرے معاملات اُن سے طے ہوئے تھے، آپ سے نہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے بولا۔

"مطلب یہ کہ میں یہاں آپ کو قیام کی اجازت نہیں دے سکتی۔" اس کا لہجہ فیصلہ کُن تھا۔ "اس کے باوجود اگر آپ کو یہاں قیام پر اصرار ہے تو میری چند شرائط آپ کو ماننا ہوں گی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"آپ کی شرائط سُننے سے پہلے ہی انھیں تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔" میں جلدی سے بول اٹھا۔

"جلد بازی نہ کیجیے!" وہ بولی۔ "پہلے آپ میری شرائط سُن لیجیے۔"

"اچھا بتائیں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ آپ کے قیام کے دوران میں آ گئے تو فوراً آپ کو مکان خالی کرنا پڑے گا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

"جی ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے منظور ہے۔ یقیناً وہ اسکندریہ سے اتنی جلدی نہیں لوٹیں گے۔"

"بہر حال وہ تو میں یاد دلا دوں، میں نے شرط بیان کر دی ہے۔" اس نے کہا۔ "دوسری شرط یہ ہے کہ اگر آپ کو یہاں قیام کرنا ہے تو مجھے بھی ماہ کی پیشگی ادا کرنا ہو گی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا! میں اس کی وجہ بھی عرض کیے دیتی ہوں، میرے معاملات کیوں کہ اُن سے طے ہوئے تھے اس لیے وہ مجھ سے رقم واپس لینے کے مجاز ہیں۔ بالفرض ایسا ہوا تو مجھے نقصان اٹھانا پڑے گا۔

مجھے ایک طرف تو اُن کی رقم واپس کرنا ہو گی، دوسری طرف اس رقم کے عوض آپ یہاں قیام کر چکے ہوں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!"

میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھ سے دوبارہ پھر اتنی ہی رقم اینٹھنا چاہتی ہے جتنی پہلے اینٹھ چکی تھی، گویا مجھے از سرِ نو مکان کرائے پر لینا تھا۔ میں تو پہلے ہی اُس کی شرطیں ماننے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے فوراً ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد رقم میں نے اس کے حوالے کر دی۔ اس نے پھر تقریباً وہی ساری باتیں کیں جو صبح کر چکی تھی۔ رقم لیتے ہی اُس کا رویہ بدل گیا۔

"کیا آپ مجھ سے بھی میرا نام نہیں پوچھیں گی۔؟" میں نے دانستہ اُسے یہ بات یاد دلانا چاہی جو شاید وہ بھول گئی تھی، یعنی یہ کہ وہ مجھے اپنے شوہر کے نام سے مخاطب کیا کرے گی۔

جواب میں اُس نے وہی سب کچھ کہہ دیا جو میں سننا چاہتا تھا۔

"مگر میری عمر تو آپ سے بہت کم ہے۔" میں نے اُسے چھیڑا۔

"مرد اور عورت کے درمیان عمر سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا، مسئلہ صرف قبولیت کا ہوتا ہے۔ کس نے کسے کس حیثیت سے قبول کیا! آپ سمجھ رہے ہیں نا!" اُس کی نیلی آنکھوں میں اپنے لیے میں نے پسندیدگی دیکھی۔ وہ اب بلا تکلف اور بغیر کسی جھجک کے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ بولی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ اب ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل نہیں رہنا چاہیے۔ تم مجھے صرف عامرہ کہہ سکتے ہو اور میں تمھیں ضیغم! تم سمجھ رہے ہو نا!" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی خمار آلود نیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"خود میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا عامرہ!" میں بولا۔ "تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔"

"اچھا ضیغم، اگر تم کہو تو میں تمھارا سامان تھیلے سے نکال کر الماری میں رکھ دوں!" وہ ایک جانب دیوار سے لگی ہوئی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولی۔

"ارے تم کہاں زحمت کرو گی! میں خود رکھ لوں گا۔ ہاں اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہہ دوں، کیوں کہ خود تم نے بے تکلفی کا مشورہ دیا ہے۔"

"ہاں کہو۔"

"بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے واقعی بے تکلفی سے کہہ دیا۔ "دوپہر کو میں کھانا نہیں کھا سکا۔"

"کھانا ابھی تو نہیں، لیکن تیار ہو جائے گا۔ ویسے بھی آج سے تم ہی نے لے بھی حق دار ہو۔"

"اگر یہ سمجھ رہی ہو تو پھر نہیں کھاؤں گا۔ میں نے یہ سوچ کر نہیں کہا تھا۔"

"ارے تم تو خفا ہو گئے! میں تو چھیڑ رہی تھی تمھیں۔ سمجھ رہے ہو نا۔" اُس نے کہا۔ "تم کپڑے بدل لو اور کہو تو نہانے کا بندوبست کر دوں! میں کھانا تیار کر لیتی ہوں۔"

"نہانے کی جلدی تو ابھی نہیں ہے۔ بس کھانا لے آؤ جلدی سے۔" میں نے جواب میں کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ بالآخر میں نے اُسے رضامند کر ہی لیا تھا کہ مجھے وہاں رہنے دے۔ ہوٹلوں میں قیام کرنے سے بہر حال وہ جگہ میری نظر میں محفوظ اور کہیں بہتر تھی۔ پھر یہ کہ وہاں عامرہ بھی تھی۔ میں اُس کے جاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور پہلے الماری کا جائزہ لیا۔ اس میں میرا تمام سامان آسانی سے آ سکتا تھا۔ میں ابھی ایک ہی تھیلے کا سامان الماری میں رکھ سکا تھا کہ اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سُن کر چونک اٹھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ عامرہ کی نوجوان بیٹی نبیلہ تھی جو کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

"آپ... آپ تو وہ صبح والے نہیں ہیں!" وہ میری طرف حیرت سے تکتی اٹھا کر بولی۔ میں سمجھ گیا کہ اُس کی ماں نے اسے میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"سنو نبیلہ، اِدھر آؤ یہاں!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ تقریباً اچھل پڑی۔

"آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تمھاری امی نے بتایا تھا تمھارا نام!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس کے علاوہ بھی اور کچھ کہا تھا، میں وہی تمھیں بتانا چاہتا ہوں۔"

وہ کچھ جھجکتی ہوئی اُس کرسی پر آ بیٹھی جس پر کچھ دیر پہلے اُس کی ماں بیٹھی تھی۔ میں نے الماری یونہی کھلی چھوڑ دی اور اس کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ "اگر تم اپنی امی سے کچھ نہ کہو تو میں تمھیں ایک راز کی بات بتاؤں!" میں بولا۔

"نہیں کہوں گی۔ آپ بتائیں!" وہ جلدی سے بول اٹھی۔

"تمھاری امی یہ نہیں چاہتیں کہ تم یہاں آ کر ٹھہرنے والوں سے ملو، مگر اس سلسلے میں وہ خود پر کوئی الزام نہیں لینا چاہتیں۔ انھوں نے مجھ سے بھی یہی کہا ہے کہ میں اپنی طرف سے یہ کہہ دوں کہ تم میرے کمرے میں نہ آیا کرو۔"

"مگر وہ... وہ تو ہمیشہ یہ کہتی ہیں کہ مہمان اپنے کمرے میں میری آمد پسند نہیں کرتے! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ... کہ امی مجھ سے جھوٹ بولتی رہی ہیں مگر... مگر کیوں؟ وہ کیوں چاہتی ہیں کہ میں... میں کہیں نہ جاؤں۔ کسی سے نہ ملوں؟ اور بس، کسی اپنے کمرے میں پڑی رہوں؟" اس کی آواز بھرا سی گئی۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مادام اپنی نوجوان بیٹی کو وہاں آنے والوں سے کیوں نہیں ملنے دیتی تھی! اور یہ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا کہ نبیلہ تنہائی کا شکار تھی۔ میں نبیلہ کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ میں نے آج صبح ہی اُس معصوم سی لڑکی کی محرومی کو محسوس کر لیا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اُسے تنہائی کے عذاب سے بچا لوں گا۔

"سنو نبیلہ! تم اداس نہ ہو۔ میں تمہیں اپنے کمرے میں آنے سے منع نہیں کروں گا لیکن تمہیں بھی میری بات ماننا ہوگی، بولو منظور ہے؟"

وہ میری بات سُن کر کھل اٹھی۔ "سچ؟" اُس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھلک آئے۔

"ہاں سچ!" میں نے اُسے یقین دلایا، پھر بولا "تم اسی وقت میرے کمرے میں آؤ گی جب میں تمہیں بلاؤں گا۔"

"مگر امی...؟" اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "وہ اگر یہ... یہ نہیں چاہتیں تو پھر کیسے..." اُس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

"اپنی امی کی فکر نہ کرو۔ انہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ تم کب میرے کمرے میں آئیں اور کب واپس چلی گئیں"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ تو ہر وقت گھر پر ہی رہتی ہیں۔"

"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

پھر وہ میرے کہنے پر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ اس طرح خوش تھی جیسے اُسے دنیا زمانے کی دولت مل گئی ہو۔

کچھ دیر بعد ہی مادام میرے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا "نبیلہ آئی تھی یہاں...؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا "میں نے اُس سے آج ہی کہہ دیا کہ وہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔"

"سمجھ ہی گئی ہوگی وہ" یہ سُن کر مادام میز پر کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے بولی، پھر خود ہی کہا "میں بھی کیا کروں ضیغم، یہ میری مجبوری ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"ہاں مادام! سمجھ رہا ہوں میں! تم اپنی بیٹی کو اُس راہ پر نہیں چلانا چاہتیں جس پر چل کر عورت، عورت نہیں رہتی بلکہ بازار کی جنس بن جاتی ہے جسے جب جو چاہے خرید سکتا ہے۔" میں نے سوچا مگر بولا نہیں۔

"ارے ابھی تک تم نے سامان، الماری میں نہیں رکھا!" اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں جبکہ آدھا سامان خالی کر کے الماری میں رکھ چکا تھا اور دوسری اٹیچی کھول ہی رہا تھا کہ وہ آگئی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچ کر بولی "کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا، تم کھانا کھاؤ، میں سامان رکھ دیتی ہوں۔ شاید نبیلہ نے تمہیں باتوں میں لگا لیا ہوگا۔ وہ بڑی باتونی ہے۔"

"اگر تم اسی سے خدمت گزاری پر تلی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا اور اٹیچی اسی طرح کھلی چھوڑ کر میز کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے میں پانی تو لانا بھول ہی گئی۔ آئی ابھی لے کر۔" مادام میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم کھانا شروع کرو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی پھر پانی کا جگ اور گلاس لے کر آ گئی۔ جگ اور گلاس میز پر رکھ کر کہنے لگی "ضیغم، تمہاری اٹیچی میں کوئی ایسی خاص چیز تو نہیں جو ذاتی نوعیت کی ہو، میرا مطلب ہے کہ جو چیز تم مجھ پر ظاہر کرنا نہ چاہتے ہو؟ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"نہیں، میری اٹیچی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔" میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"معلوم ہے ایک بار کیا ہوا!" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "میرے ایک مہمان کے سامان میں شراب کی بوتل تھی۔ اس کے ذہن سے شاید یہ بات نکل گئی۔ جب اس کی اٹیچی سے شراب کی بوتل نکلی تو وہ جھینپ سا گیا۔ پھر جب میں نے اس کے سامنے بوتل کا ڈھکنا کھول کر اُسے منہ سے لگا لیا تو وہ حیران رہ گیا۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پیتی بھی ہو!" میں نے اُس کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ حقیقتاً مجھے یہ بات سُن کر خوشی ہوئی تھی۔

"عادی نہیں ہوں۔ کبھی کبھار پی لیتی ہوں۔ وہ بھی اپنے مہمانوں کی دلجوئی کے لیے! بعض مہمان ایسے آتے ہیں کہ بغیر شراب کے انہیں لطف ہی نہیں آتا۔ وہ کچھ تو اپنے ساتھ منگا لیتے ہیں اور کچھ کو تو میرے ہاتھ سے پینے ہی پر مزہ آتا ہے۔ اپنی اپنی عادات اور مزاج کی بات ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!" وہ اپنی بات مکمل ہونے پر "تم سمجھ رہے ہو نا!" کا اضافہ ضرور کر دیتی تھی اور جس لب و لہجے میں وہ یہ الفاظ ادا کرتی تھی وہ لب و لہجہ کمال ہی تھا۔ اس لہجے میں شوخی بھی تھی اور ایک عجیب سی معصومیت بھی! حیرت کا تاثر بھی تھا اور کچھ سمجھانے کا انداز بھی! وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی "میں اسی لیے اپنے یہاں شراب کا بندوبست بھی رکھتی ہوں لیکن صرف اعلیٰ درجے کی شراب! وہ اس لیے کہ میرے یہاں آنے والے بہرحال معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہوتے۔ اب تو خیر مہینے میں دو ایک ہفتے ایسے بھی آجاتے ہیں کہ میرے گھر میں کوئی مہمان نہیں ہوتا اور مجھے مجبوراً اشتہار دینا پڑتا ہے۔

لیکن ضیغم، ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ مسلسل چار چار چھ چھ مہینے کی ایڈوانس بکنگ رہتی تھی میرے پاس! لوگ منتظر رہتے تھے کہ کب اُن کی باری آتی ہے۔ یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں، بس چھ سات سال پہلے کی بات ہے۔ وقت وقت کی بات ہے ضیغم!" اُس نے طویل سانس لیا جیسے اپنے ماضی کو یاد کر رہی ہو "تم سمجھ رہے ہو نا!"

"ہاں مادام، خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے بھی طویل سانس لیا، پھر کہا "تمہارا خیال ہے یہ دور شباب بھی تم سیکڑوں میں ایک ہو۔"

"یہی تو فرق ہو گیا ہے ضیغم! تم اس وقت مجھے سیکڑوں میں ایک کہہ رہے ہو، مگر کبھی مجھے لاکھوں میں ایک کہا جاتا تھا۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ تمہیں بھی پینے پلانے کا شوق ہے؟"

"ہے تو، مگر تمہارے پاس اتنی شراب کہاں ہوگی!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر میں نے پینا شروع کر دی تو روزانہ کم سے کم دس بارہ بوتلیں تو ضرور ہو جائیں گی۔" میں نے وضاحت کی۔

"دس... بارہ بوتلیں... روزانہ!" اس کے لہجے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا "میرے پاس تو بس چار چھ بوتلیں پڑی رہتی ہیں۔ جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو اور منگوا لیتی ہوں، لیکن مجھے تمہاری بات پر کچھ... معاف کرنا ضیغم کہ یقین سا نہیں آرہا۔ میں نے تو لوگوں کو چار چھ پیگ پی کر بہکتے دیکھا ہے۔ خود میں کبھی چار پیگ سے زیادہ نہیں پیتی اس میں مجھے اچھا خاصا نشہ ہو جاتا ہے۔ میں اس کی قائل نہیں کہ آدمی پی کر ہوش و حواس گنوا بیٹھے۔ شراب لطف اندوزی کے لیے پی جاتی ہے، بہکنے کے لیے نہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"تو پھر ٹھیک ہے، آج کر لینا اس کا تجربہ۔" میں نے مسکرا کر کہا "پھر شاید تمہیں یقین آجائے گا جب میں تمہارا سارا ذخیرہ ختم کر دوں گا۔"

میری یقین دہانی کے باوجود اس کے چہرے سے بے اعتباری مترشح تھی۔ اس کے باوجود وہ بولی "ٹھیک ہے، رات کو پئیں گے، مگر کچھ رات ڈھلے! تم سمجھ رہے ہو نا!"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تاکہ میں بھی تمہارا ساتھ دے سکوں۔" اُس نے جواب دیا "نبیلہ سو جائے گی اُس وقت تک! تم سمجھ رہے ہو نا!"

"تو اتنی سی شراب میں تم بھی حصہ بٹاؤ گی!"

"چھ بوتلیں کم ہیں! تم بھی کمال کرتے ہو ضیغم!"

"میں کہہ چکا ہوں نا کہ کم ہیں، مگر تمہیں یقین ہی نہیں آرہا۔ خیر رات کو خود ہی تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا تھا۔"

"تم کھانا تو کھا نہیں رہے ضیغم، بس باتیں بنائے جا رہے ہو۔ لو مجھے بھی تم نے باتوں میں لگا لیا ہے۔ ابھی سامان بھی رکھنا ہے الماری میں!" وہ میری بات کو نظرانداز کر کے بولی اور پھر اٹیچی کی طرف بڑھ گئی جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔

پھر میں کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا اور وہ اٹیچی سے کپڑے اور دیگر سامان نکال نکال کر الماری میں سلیقے سے رکھنے لگی۔ کھانے کے دوران پانی پیتے ہوئے میری نگاہ ایک بار پھر اس کی طرف اٹھی تو چونک اٹھا۔ وہ الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے اُن کی جیبیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ تمام رقم میرے اُس کوٹ کی جیب میں تھی جو میں پہنے ہوئے تھا اس لیے میں نے اس سے کچھ کہنا یا اُسے ٹوکنا ضروری نہ سمجھا۔ غالباً وہ اپنے مہمانوں کی جیبیں خالی کر کے ہی انہیں جانے کی اجازت دیتی تھی۔ اُس کے پاس رقم اینٹھنے کے بہت سے حربے تھے، غالباً ان میں سے ایک حربہ ہاتھ کی صفائی بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شراب کی قیمت بھی دگنی تگنی وصول کرتی ہوگی۔ بہرحال میرے کپڑوں کی جیبیں خالی ہی تھیں۔ پھر بھی اب کھانا کھاتے ہوئے میں کبھی کبھی نظر بچا کر اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ میں نے اسی دوران میں ایک بار یہ دیکھا کہ اس نے میرے ایک کوٹ کی اندرونی جیب سے کوئی چیز نکالی تھی جو اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ دیکھ کر میں بھی چونک اٹھا۔ یہ کوٹ بالکل نیا تھا اور میرے خیال میں اس کی جیبیں خالی ہی ہونا چاہئیں تھیں۔

"کیا ہے؟" میں اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا اور بول اٹھا۔

وہ ایک بار پھر چونک اٹھی۔ اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے عین موقع پر چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اس کے چہرے سے بوکھلاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے توقف سے وہ ہکلا کر بولی "یہ... یہ تمہارے کوٹ کی جیب سے... یہ چیز... معلوم نہیں کیا ہے... گر گئی تھی۔" اس نے بات بنا ہی دی۔

"مجھے دکھاؤ۔" میں نے ہاتھ سے لقمہ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا جیسے مجھے اُس کی بات پر یقین آ گیا ہو۔

وہ میرے قریب آ گئی اور پھر جیبی گھڑی سے ملتی جلتی ایک چیز میری طرف بڑھا دی۔ اُس عجیب سی شے کے اوپری حصے پر ایک ننھا سا ہلال بار بار چمک رہا تھا۔ وہ شے، سیاہ پلاسٹک دھات کی بنی ہوئی تھی، گھڑی ہی کی طرح اُس کے ڈائل پر شیشہ تھا جس کے نیچے چینی زبان میں کچھ الفاظ اور ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ شیشے کے نیچے دو سوئیاں بھی حرکت کر رہی تھیں

میں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ میرے لیے بالکل نئی چیز تھی۔
"کیا ہے یہ؟" یامہ کچھ دیر خاموش رہ کر آخر بول ہی اٹھی۔
"تمھارے سمجھنے کی چیز نہیں ہے یہ!" میں نے جواب دیا اور پھر ڈائل پر لکھی ہوئی باریک عبارت پڑھنے لگا۔ مجھے اُس وقت یامہ کی مداخلت گراں گزر رہی تھی۔ میں نے اُس شے کا جائزہ لیتے ہوئے یامہ سے کہا۔ "تم سامان رکھو جاکر۔"

یامہ کچھ کہے بغیر دوبارہ الماری کی طرف بڑھ گئی۔ شاید اُس نے میرے لہجے سے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے اس کی مداخلت گراں گزر رہی ہے۔ بہرحال وہ میرا دل خوش کرنے کے سلسلے میں جواب طلبی سے بچ گئی تھی! اس لیے اُس نے میرے پاس سے ہٹ جانا ہی غنیمت سمجھا۔

اُس عجیب شے کے ڈائل پر چینی الفاظ اور ہندسے دیکھ کر ہی میرا ذہن یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ یقیناً اُس شے کا کوئی نہ کوئی تعلق چینی ایجنٹ کوئی چور سے ہے۔ یہ عجیب شے وہی میرے کپڑوں میں چھپا سکتی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میرے ہوٹل کے کمرے میں اسی لیے آئی ہو گی کہ میری اٹیچی میں یہ عجیب شے چھپا دے۔ اس کا مقصد؟ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا اور اُسی وقت میری نگاہ ڈائل پر حرکت کرتی ہوئی سوئیوں پر پڑی۔ ایک سوئی حرکت کرتی ہوئی آٹھ کے ہندسے سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ سوئی گھڑی کی سوئی سے مختلف اور ذرا چوڑی تھی۔ اُس پر بھی چینی زبان میں باریک حروف سے ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ مگر حروف اتنے باریک تھے کہ میں غیر معمولی بصارت کا مالک نہ ہوتا تو ہرگز کچھ نہ پڑھ سکتا تھا: "فاصلہ"۔ آخر میں نے باریک حروف میں لکھا ہوا وہ لفظ پڑھ ہی لیا۔ پھر میں حرکت کرتی ہوئی دوسری سوئی پر لکھا ہوا لفظ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس پر "سمت" لکھا ہوا تھا۔ وہ دوسری سوئی بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ میرے ذہن نے فوراً ہی ایک نتیجے پر جست لگائی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ کوئی چور نے وہ شے میری اٹیچی میں کیوں چھپائی تھی! یامہ کی لالچی طبیعت نے مجھے گویا بروقت ایک خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مگر ابھی میں یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اس خطرے کو ٹالنا ممکن بھی ہے یا نہیں!

"میں ابھی آیا یامہ!" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"کہاں ... کہاں جا رہے ہو تم؟" وہ پلٹ کر حیرت سے بولی۔
میں اتنی دیر میں دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں وہی عجیب شے تھی۔ یامہ میرے پیچھے لپکی۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ میری تیز رفتاری کا ساتھ کیسے دے سکتی تھی! میں نے اس کے گھر سے نکلنے اور اپنے وجود کو نادیدہ بنا لینے میں چند ہی لمحے صَرف کیے تھے۔ وہ اس دوران میں کمرے سے بھی باہر نہ آسکی تھی۔ یامہ کے گھر میں مزید قیام کا انحصار اب اس بات پر تھا کہ کوئی چور اس سے واقف نہ ہو۔ تاہم مجھے یہی معلوم بھی کرنا تھا۔

اُس عجیب شے کو دیکھ کر میرے ذہن نے جو نتیجہ اخذ کیا، وہ یہ تھا کہ بالکل ویسی ہی شے کوئی چور یا اس کے ساتھیوں کے پاس ہو گی۔ جس کے ڈائل کی سوئیاں بھی حرکت میں ہوں گی۔ کوئی چور نے یقیناً یہ معلوم کرنے کے لیے وہ شے میری اٹیچی میں رکھی ہو گی کہ میں ہوٹل سے کہاں جاتا ہوں۔ یقیناً کوئی چور کے پیش نظر اس نے یا اس کے ساتھیوں نے میرا تعاقب نہیں کیا ہو گا بلکہ وہ اس عجیب شے کی مدد سے، میری روانگی کے کچھ دیر بعد یامہ کے گھر کی طرف چلے ہوں گے۔ اس عجیب شے نے یامہ کے گھر تک پہنچنے میں اُن کی رہنمائی کی ہو گی۔ مجھے یامہ کے گھر میں کافی وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے اب وہ لوگ گھر دیکھ کر واپس ہو رہے تھے۔ اس کا اندازہ میں نے بڑھتے ہوئے فاصلے سے لگایا۔ اگر وہ یامہ کے گھر کی طرف آرہے ہوتے تو فاصلہ بڑھنے کی بجائے کم ہوتا۔ ایسی صورت میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ یامہ کا گھر تلاش کر لینے کے بعد اب وہ قاہرہ کی طرف واپس ہو رہے تھے۔ سمت بتانے والی سوئی قاہرہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اندازے کے مطابق اس وقت ان لوگوں کو شاہراہ اہرام پر ہونا چاہیے تھا۔

اُن کے اور میرے درمیان جو آٹھ میل کا فاصلہ تھا، وہ اتنا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بچ کر نکل جاتے۔ میرے تعاقب میں اگر یامہ کے گھر تک آنے والی کوئی چور خود تھی تو پھر مجھے بہرصورت یامہ کا گھر فوری طور پر چھوڑ دینا تھا۔ لیکن اُس کی بجائے وہاں تک پہنچنے والے اس کے ساتھی تھے تو انھیں کوئی چور تک یہ خبر پہنچانے سے پہلے ٹھکانے لگایا جا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور ایسا خیال آیا جس سے میرا دل بجھ گیا۔ دل بجھا دینے والا خیال یہ تھا کہ کوئی چور کے ساتھیوں کے پاس ٹرانسمیٹر بھی ہو سکتا تھا اور ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے کوئی چور کو اس سے آگاہ کر سکتے تھے کہ میں کہاں ٹھہرا ہوں۔ وہ آٹھ میل اور نکل گئے تھے اور اس دوران میں ٹرانسمیٹر پر کوئی چور سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ مگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو پھر میری ساری بھاگ دوڑ لاحاصل ہی تھی۔ مجھے بہ مجبوری یامہ کا گھر چھوڑ کر فرار ہونا پڑتا۔ اس بار میرے مقابلے پر ایسے دشمن تھے جو غیر معمولی ذہین ثابت ہو رہے تھے۔ مجھے سانس لینے کی مہلت بھی نہیں مل رہی تھی اور وہ پے در پے مجھ پر حملے کر رہے تھے۔ میں نے یہ بات بطورِ خاص محسوس کی تھی کہ بہ تدریج مجھ سے نمٹنے کے لیے تینوں ہی دشمن ممالک اپنے بہتر سے بہتر ایجنٹ بھیج رہے تھے۔ ہر آنے والا ایجنٹ پہلے سے زیادہ مکار، تیز اور غیر معمولی ذہین ہوتا تھا۔ ان دنوں میرے مقابلے پر تینوں ہی ملکوں کے ایسے خطرناک ایجنٹ تھے کہ میری ذرا سی غفلت سے وہ فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ میں اُن تینوں میں سے کسی کے ذہن کو بھی نہ پڑھ سکتا تھا، نہ انھیں اپنے ذہن کا حکم ماننے پر مجبور کر سکتا تھا۔ ہر چند کہ میرے مقابلے میں وہ حیرت انگیز قوتوں کے مالک نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ اُن میں سے کسی ایک کو بھی زیر کر لینا آسان نہیں تھا۔

تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے بھی میرا ذہن سوچنے میں مصروف تھا اور اسی کے ساتھ میری نظر اُس عجیب شے کے ڈائل پر بھی تھی۔ فاصلہ بتانے والی سوئی اب حرکت کرتے کرتے ایک کے ہندسے کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میں یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ کوئی چور یا اس کے ساتھی یقیناً کسی تیز رفتار کار میں تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اب تک انہیں پیچھے چھوڑ چکا ہوتا کیوں کہ میری رفتار کم نہیں تھی۔

پھر اگلے ہی چند لمحوں میں فاصلہ بتانے والی سوئی نے ایک کے ہندسے کو چھو لیا۔ اس وقت شاہراہ اہرام پر خاصا ٹریفک تھا۔ ہر چند کہ ایک میل کے اندر اندر میں کسی کے بھی ذہن سے رابطہ قائم کر سکتا تھا اور اس کے ذہن کو اپنا حکم ماننے پر مجبور کر سکتا تھا، لیکن ذہن سے ایسا نہیں کیا۔ میرا مقابلہ بہرحال معمولی دشمنوں سے نہیں تھا اور میں نے اس بات کو بھی مدنظر رکھا تھا کہ جس تیز رفتار کار کے تعاقب میں ہوں اُسے خود کوئی چور بھی ڈرائیو کر رہی ہے۔ ذہنی رابطہ قائم کرنے کی صورت میں وہ چوکنا ہو سکتی تھی جو بہرحال میں نہیں چاہتا تھا۔ وہ چوکنا ہو جاتی تو پھر اُس پر قابو پانا مشکل ہوتا۔ اِس کا تجربہ مجھے آگا ہی ہو چکا تھا۔ اس وقت جب کوئی چور نے مجھے قطعی بے بس کر دیا تھا۔ وہ عجیب ہتھیار جس سے بنفشی روشنی نکلتی تھی، اِس وقت بھی اُس کے پاس ہو سکتا تھا۔

بھاگتے ہوئے میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اس عجیب شے کے دوسرے حصے پر یقیناً اس وقت کوئی چور یا اُس کے ساتھیوں کی نظر نہیں ہو گی کیوں کہ وہ شے اپنا مقصد پورا کر چکی تھی۔ وہ لوگ میرے ٹھکانے کا سراغ لگا چکے تھے۔ اب اس عجیب شے کے ڈائل پر نظر رکھنا ان کے لیے ضروری نہیں تھا، لیکن بالفرض اب بھی ڈائل پر ان کی نظر ہوتی تو فاصلہ کم ہونے سے وہ بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ یہ محض قیاس ہی تھا کہ اس عجیب شے کے ڈائل پر اب اُن کی نظر نہیں ہو گی، کسی یقینی نتیجے تک پہنچنا میرے لیے دشوار ہی تھا۔ مگر مجھے اِس کی پروا نہیں تھی۔ اگر انھیں یہ علم ہو بھی جاتا کہ میں اُن کے تعاقب میں ہوں تو وہ مجھ سے اس بے وقت بھی نہیں بچ سکتے تھے، وہاں وہ چوکنا ضرور ہو جاتے۔ میری نظروں میں کوئی چور اور اس کے ساتھیوں کے چوکنا ہونے میں فرق تھا کہ کوئی چور کے چوکنے؟ جانے سے میرے لیے دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں، لیکن اس کے ساتھی چوکنا بھی ہو جاتے تو مجھ سے بچ کر نہ جا پاتے۔

میری طوفانی رفتاری کے آگے ایک میل کے فاصلے کی حیثیت ہی کیا تھی! گویا پلک جھپکتے یہ فاصلہ طے ہو گیا۔ فاصلہ بتانے والی سوئی اب صفر کے قریب تھی اور سمت بتانے والی سوئی نے اُس پیلے رنگ کی کار کی نشان دہی کر دی تھی جسے ایک مقامی شخص ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر والی نشست پر ایک مقامی نوجوان نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار بہت کم کر دی کیوں کہ وہ کار اسی میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میں کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ کوئی چور کی بجائے اس کے ساتھیوں سے نمٹنا تھا۔

میں نے اُن دونوں کے چہروں پر انتہائی دہشت دیکھی۔ مجھے پہلی ہی نظر میں نوجوان کے پاس ویسی ہی عجیب شے نظر آگئی جو میرے پاس تھی۔ نوجوان کی نظریں اُسی شے پر جمی ہوئی تھیں۔

"وہ ... ابوالہول ..." نوجوان نے ہکلا کر اپنے ساتھی سے کہا "وہ ... وہ اب بہت قریب آچکا ہے ... شاید ... شاید ہماری کار کے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی ... میں ... میں اب اُس کی مخصوص خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ تمھیں ... کیا تم بھی وہ ... اُس کی خوشبو تمھیں بھی محسوس ہو رہی ہے؟" وہ اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ اُس کی زبان سے صحیح جملے ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"ہاں ... ہاں مجھے بھی اس کی خوشبو آرہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے نوجوان کے ساتھی نے ایکسیلیٹر پر اپنے پیر کا دباؤ اور بڑھا دیا۔ رفتار بتانے والی سوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

مجھے پہلے یہ جاننے کی فکر تھی کہ انھوں نے کہیں ٹرانسمیٹر پر کوئی چور سے رابطہ قائم کر کے میرا پتا تو نہیں بتا دیا اور میں نے سب سے پہلے یہی بات معلوم کی۔ میں نے اسے اپنی خوش قسمتی ہی پر محمول کیا کہ ٹرانسمیٹر پاس ہونے کے باوجود بھی وہ کوئی چور سے رابطہ قائم نہ کر سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ٹرانسمیٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اب مجبوراً وہ براہ راست کوئی چور کو رپورٹ دینے جا رہے تھے جس نے آج ہی تین منزلہ ہوٹل کیو شیرٹن میں ایک کمرا حاصل کر لیا تھا۔ یہ ہوٹل دریائے نیل کے کنارے جیزا کی طرف دُقّی کے علاقے میں تھا۔ ان دونوں کے ذہن پڑھ کر مجھے کوئی چور کے متعلق کچھ اور باتوں کا بھی علم ہو گیا جو آئندہ میرے کام آسکتی تھیں۔
کار ڈرائیو کرنے والے کے لاش پر میری خوشبو کچھ زیادہ ہی مسلط ہو گئی تھی۔ وہ مجنونانہ انداز میں کار کی رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ اب رفتار

بنانے والی سوئی ایک سو تیس میل کے ہندسے کو چھو رہی تھی۔ کار کو اب قابو میں رکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ شاید وہ اچھا ڈرائیور نہیں تھا کار کی رفتار بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہی میں نے اپنی رفتار کچھ بڑھا دی تھی کار کو بے قابو ہوتے دیکھ کر اُس شخص کا نوجوان ساتھی چپ نہ رہ سکا۔ "کیا کر رہے ہو تم! ہم کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"خاموش بیٹھو!" کار ڈرائیور نے اپنے ساتھی کو ڈانٹ دیا "کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم اس کے پیچھے پڑ گئے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"لیکن تم تو خودکشی پر آمادہ ہو!" نوجوان کی آواز میں احتجاج تھا "کیا ہم اس کی جلا رفتاری کا مقابلہ کر سکتے ہیں! شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ وہ تین سو میل کی رفتار سے بھی دوڑ سکتا ہے۔"

ٹوئی چو نے یقیناً میرے بارے میں اپنے ساتھیوں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ غالباً اس لیے کہ لاعلمی میں کہیں وہ میرے ہاتھوں مارے نہ جائیں۔ "تو کیا میں جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں مارا جاؤں!" کار ڈرائیور غصے میں چیخ اٹھا اور اسی کے ساتھ کار سڑک پر لہرا سی گئی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کم از کم میرے لیے تو متوقع ہی تھا میں اسی لیے کار سے ایک دم دور ہٹ گیا تھا۔ بیلی کار ایک دم لہرا جانے کے سبب مخالف سمت سے آنے والی ایک ویگن سے ٹکرا گئی تھی ٹکراؤ اتنا زبردست تھا کہ مزید ایک کار اس ہولناک حادثے کی لپیٹ میں آ گئی۔ ذرا سی دیر میں سڑک پر ہر طرف شیشے ہی شیشے بکھر گئے جن کے درمیان خون بہہ رہا تھا۔ اس زبردست حادثے میں ٹوئی چو کے دونوں ساتھیوں کے علاوہ ویگن کا ڈرائیور بھی ہلاک ہو گیا۔ وہ کار جو اس حادثے کی لپیٹ میں آ گئی تھی اُسے ایک غیر ملکی عورت ڈرائیو کر رہی تھی وہ عورت بھی شدید زخمی ہوئی تھی۔ اُس کا سارا جسم لہولہان ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اُس کا بچنا بھی محال ہی تھا۔

مجھے ٹوئی چو کے ساتھیوں کی موت پر تو افسوس کم نہیں تھا البتہ ویگن کے ڈرائیور کی ہلاکت اور کار والی عورت کے شدید زخمی ہو جانے پر افسوس تھا ہر چند کہ بظاہر اس حادثے کا ذمہ دار ٹوئی چو کا ساتھی تھا، لیکن حقیقتاً میں اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ میری ہی وجہ سے وہ ہولناک حادثہ پیش آیا تھا۔ مگر ٹوئی چو کا ساتھی مجھ سے خوفزدہ ہو کر کار کی رفتار اس قدر بڑھا نہ دیتا تو شاید وہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔

ٹوئی چو کے ساتھیوں کی موت کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا۔ غالباً اُس خطرناک عورت کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میں کہاں اور کس حیثیت سے قیام پذیر ہوں۔ ہاں اُسے اتنا علم ضرور تھا کہ میں پرانے قاہرہ ہی میں کہیں مقیم ہوں۔ یہ بات بھی خود مجھ سے اُسے معلوم ہوئی تھی، لیکن پرانے قاہرہ میں کسی بے نام شخص کو ڈھونڈ نکالنا آسان نہیں تھا اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ وہ میرے موجودہ میک اپ سے بھی ناواقف تھی۔

ٹوئی چو کے ساتھیوں کی موت کا یقین ہو جانے کے بعد میں وہاں مزید نہیں رکا۔ میں نے وہ عجیب شئے بھی توڑ کر پھینک دی جس کے ذریعے وہاں تک پہنچا تھا اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں پرانے قاہرہ کی طرف لوٹنے کی بجائے جیزا کے لیے روانہ ہو گیا۔ مجھے اب کیرو شیرٹن پہنچنا تھا جس کی دسویں منزل کے ایک کمرے میں ٹوئی چو ٹھہری ہوئی تھی میں اسے ٹھکانے لگا دینے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ٹوئی چو پر بے خبری ہی میں حملہ کر کے قابو پایا جا سکتا ہے

وہ حادثہ شاہراہ اہرام کے تقریباً آخر ہی میں پیش آیا تھا۔ وہاں سے تحریر اسکوائر کا فاصلہ بمشکل ہفت میل تھا۔ جب میں اہرام کے قریب سے چلا تھا تو ٹوئی چو کے ساتھی شاہراہ اہرام پر کافی فاصلہ طے کر چکے تھے تقریباً نصف فاصلہ! بقیہ فاصلہ اُن کی کار نے میرے قریب پہنچنے اور حادثہ پیش آنے تک طے کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ دریائے نیل عبور کر کے مجھے جیزا پہنچنے میں صرف چند منٹ لگے۔ میرا وجود اب بھی نادیدہ ہی تھا جیزا پہنچنے تک بھی میں نے اپنی تیز رفتاری برقرار رکھی کیوں کہ میں جلد از جلد ٹوئی چو کو ٹھکانے لگا دینا چاہتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہ ہونے پر وہ چوکنا بھی ہو سکتی تھی اور راہِ فرار بھی اختیار کر سکتی تھی

ہوٹل شیرٹن کی تیس منزلہ عمارت میں داخل ہو کر میں ایک لفٹ کی طرف بڑھا۔ زینوں کے علاوہ آمد و رفت کے لیے وہاں کئی لفٹیں تھیں جن میں سے ایک ابھی ابھی نچلی منزل پر آ کر رکی تھی اور اس سے آٹھ دس مسافر نکلے تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ میرا رخ بھی لفٹ کے دروازے کی طرف ہی تھا۔ لفٹ کی طرف دوڑتے ہوئے بس اچانک ہی میرے قریب سے خوشبو کا ایک تیز جھونکا گزرا اور یہ خوشبو میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے اس عورت کو دیکھ لیا جو چہرے سے کسی مغربی ملک کی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ وہ بہت تیز رفتاری کے ساتھ ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گلابوں کی خوشبو میں نے اُسی وقت محسوس کی تھی جب وہ عورت میرے قریب سے گزر رہی تھی۔ میں پلٹ کر ایک ہی جست میں اُس تک پہنچ گیا۔ میرے خیال میں وہ ٹوئی چو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ میری ہی طرح کم از کم ایک بیلے کے لیے

گلابوں کی خوشبو اس کی پہچان اور کمزوری بن چکی تھی۔ اگر مجھے اس تک پہنچنے میں لمحہ بھر بھی دیر ہو جاتی تو وہ مجھ پر اپنا ہتھیار استعمال کر چکی ہوتی جو اُس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے پہلے اس سے وہی ہتھیار چھینا۔ میں اس سے بے خبر تھا کہ اس عجیب ہتھیار سے جو بنفشی شعاعیں نکلتی تھیں وہ ایک عام انسانی جسم پر کیا اثر کرتی ہیں۔ اگر مجھے پہلے سے یہ علم ہوتا تو شاید میں ٹوئی چو کو ان شعاعوں کا نشانہ کبھی نہ بناتا اور وہ دہشت ناک منظر نہ دیکھتا جو میری آنکھوں نے دیکھا۔

وہ ہتھیار ایک عام انسانی جسم کے لیے اتنا تباہ کن ہو گا۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بٹن دبتے ہی اس ہتھیار کی نال سے بنفشی روشنی کی ایک دھار سی نکلی اور ٹوئی چو کے جسم سے ٹکرائی۔ اُس سے پہلے میری نگاہ ٹوئی چو کے چہرے پر پڑی تھی۔ شاید اُسے علم تھا کہ وہ ہتھیار کتنا تباہ کن ہے اور اگلے ہی لمحے اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس قدر دہشت میں نے کبھی کسی چہرے پر نہیں دیکھی تھی، جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بس دو تین ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ٹوئی چو کا جسم کسی دہکتے ہوئے انگارے کی طرح سرخ ہو گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے جیسے پگھل کر زمین پر گرنے لگا جیسے پانی کی طرح بہنے لگا۔ وہ منظر بہت ہی ہولناک تھا جب ٹوئی چو کا جیتا جاگتا وجود گندے پانی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اس کا پورا جسم ایک بار سرخ ہو کر ایک دم یوں گر کر بہنے لگا تھا جیسے وہ گوشت پوست کی بجائے کسی رقیق مادے سے بنا ہو یا وہ انسان کی بجائے کوئی موم کا مجسمہ ہو۔ ذرا سی دیر میں وہاں بھیڑ لگ گئی۔ میری ہی طرح شاید اور لوگوں نے بھی وہ ہولناک منظر دیکھا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ منظر دیکھ کر اُن میں سے کوئی چیخا بھی ہو مگر میں نے کوئی چیخ نہیں سنی۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ منظر دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے تھے یا اس کی ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس منظر کو دیکھنے والے سکتے کے عالم میں رہ گئے ہوں اور چیخ ہی نہ سکے ہوں۔

ہر چند کہ ٹوئی چو میری دشمن تھی لیکن اس کے باوجود مجھے اس کے انجام پر بہت ملال تھا وہ بہرحال اتنی ہولناک موت کی مستحق نہیں تھی۔ اُس کا قصور صرف یہی تو تھا کہ وہ اپنے ملک کی وفادار تھی اور اپنے ملک ہی کی خاطر اس نے ایک خطرناک مشن پورا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گندے پانی کی طرح بہتے ہوئے ٹوئی چو کے جسم کی اطراف لوگوں کی بھیڑ ہو گئی تھی اس لیے میں فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا تھا اور وہ خطرناک ہتھیار بھی اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اب میں نے وہاں مزید رکنا فضول جان کر ہوٹل کے اندرونی دروازے کا رخ کیا۔ خطرہ ٹل چکا تھا اس لیے میں اپنے وجود کی تجسیم کر لینا چاہتا تھا۔

ہوٹل کے اندر پہنچ کر میں نے جلد ہی ٹوائلٹ تلاش کر لیے۔ کچھ دیر بعد ہی جب میں ایک ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا تو میرا وجود نادیدہ نہیں رہا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب میں ٹیکسی کے ذریعے پرانے قاہرہ واپس پہنچنا چاہتا تھا میری آنکھوں میں رہ رہ کر ٹوئی چو کی زندگی کے آخری لمحات گھوم رہے تھے۔ اگر مجھے ہوٹل پہنچنے میں تھوڑی سی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتی۔ غالباً وہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے ٹرانسمیٹر پر کوئی پیغام نہ ملنے کی وجہ سے چوکنا ہو گئی تھی اور اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا تھا کاش وہ کچھ پہلے یہ فیصلہ کر لیتی۔ میں نے افسردگی سے سوچا۔ اس میں شک نہیں کہ میں بھی اُسے زندہ نہ چھوڑتا لیکن شاید وہ اتنی بھیانک موت نہ ہوتی۔

کیرو شیرٹن سے نکل کر میں نے پرانے قاہرہ کے لیے ایک ٹیکسی کر لی اور دوبارہ ٹوئی چو کے تصور میں کھو گیا کچھ ہی دن کے لیے سہی مجھے اپنے ایک دشمن کی طرف سے سکون مل گیا تھا۔ فی الحال میرے مقابلے پر اب امریکی اور روسی ایجنٹ رہ گئے تھے۔ ٹوئی چو کے بارے میں سوچتے سوچتے میں تیسری ناٹ کے متعلق سوچنے لگا۔ معلوم نہیں وہ اور اُس کے ساتھی مجھے کہاں کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے؟

میں تمام راستے ٹوئی چو کے بارے میں سوچتا رہا۔ کل ہی رات میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی اور آج وہ میرے ہاتھوں سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئی تھی۔ میرا وجود جیسے دشمنوں کے لیے موت کا پیغام تھا۔ جو دشمن بھی قریب آ جاتا، وہ زندہ نہ بچتا۔ کل رات جب ٹوئی چو مجھ سے ملی تھی تو اُس نے شاید سوچا بھی نہ ہو گا۔ اُس کی زندگی کا بس ایک دن اور باقی رہ گیا ہے۔ وہ خوفناک ہتھیار شاید اُسی کے ملک کی ایجاد تھا جس نے اُسے موت کی تاریک وادی میں دھکیل دیا تھا۔ وہ ہتھیار ابھی تک میرے

کوٹ کی جیب میں موجود تھا۔

ٹیکسی جب پُرانے قاہرہ کی حدود میں داخل ہوئی تو میں اپنے خیالات کے بھنور سے نکل آیا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ میری نگاہ نادانستگی میں عقبی آئینے پر پڑ گئی۔ مجھے عقبی آئینے میں ایک سُرخ اسپورٹس کار نظر آئی۔ مجھے جانے کیوں یہ محسوس ہوا کہ اُس سرخ اسپورٹس کار پر پہلے بھی میری نگاہ پڑ چکی ہے۔ مگر اس وقت میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا۔ یہ میرے تعاقب میں نہیں ہو سکتی۔ میں نے سوچا۔ شاید پے در پے خطرناک واقعات پیش آنے کے سبب میں کچھ زیادہ ہی شکی ہو گیا تھا اس کے باوجود میں نے احتیاط ضروری سمجھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "عابدین پیلس کی طرف چلو!"

"مگر آپ نے تو کہا تھا جناب کہ مصرقدیہ جانا ہے!" ٹیکسی ڈرائیور نے اعتراض کیا۔

"مجھے ذرا ایک کام یاد آ گیا، پہلے تم اُدھر ہی چلو۔" میں نے اصرار کیا۔

"آپ وہاں زیادہ دیر تو نہیں رُکیں گے؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "بلکہ ممکن ہے، مجھے ٹیکسی سے بھی نہ اُترنا پڑے۔"

"لیکن جناب، میں دو گُنی فیس لوں گا، اتنا لمبا چکر کاٹنے کی۔"

"مجھے منظور ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے سر کو اثباتی انداز میں حرکت دی اور پھر کچھ فاصلہ طے کرتے ہی ٹیکسی کو دائیں جانب جانے والی ایک سڑک پر موڑنے لگا۔ اُس وقت بھی میری نگاہ عقبی آئینے پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیکسی کے ساتھ ساتھ ہی اُس سُرخ اسپورٹس کار کو بھی اسی سڑک پر مُڑتے دیکھا۔ میرا شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ وہ سُرخ اسپورٹس کار ٹیکسی ہی کا تعاقب کر رہی ہے۔ عابدین پیلس تک وہ سُرخ اسپورٹس، ٹیکسی کے پیچھے لگی رہی۔

"اب تم مصرقدیہ چلو۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ممکن ہے، ٹیکسی سے اُترنے کی نوبت ہی نہ آئے۔"

"بہتر ہے جناب!" ٹیکسی ڈرائیور کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہوا۔ اُس کی خوشی کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ اُسے "ویٹنگ" نہیں کرنا پڑی تھی۔ پھر جب ٹیکسی، عابدین پیلس سے مصرقدیہ کی طرف دوڑی، اُسے ڈرائیو کرنے والا صورت سے غیر ملکی ہی معلوم ہو رہا تھا، کسی مغربی ملک کا باشندہ! مگر اس کے چہرے پر میک اپ بھی ہو سکتا تھا۔ چہرے سے اس کی عمر پچاس سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ میں اپنے ذہن میں امریکی ایجنٹ ہیری ناٹ کا حلیہ دہرانے لگا۔ میں نے اس کے جسم کو غور سے دیکھا جو فربہی پر مائل تھا۔ یہ ہیری ناٹ نہیں ہو سکتا۔ میرے ذہن نے فیصلہ کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے والا تھا کہ اُس نے ڈیش بورڈ پر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹ حرکت کرنے لگے ڈیش بورڈ ہی پر لگا ہوا ایک سُرخ بلب روشن ہو گیا۔ بلب روشن ہوتے ہی ہمیں سے روانہ ہوئی تو پہلے میں نے اپنی قوتِ بصارت کا دائرہ وسیع کیا۔ میں اُس سرخ اسپورٹس والے کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں میری موجودہ شخصیت سے میرا کوئی دشمن آگاہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت اسی بات پر تھی کہ اس کے باوجود کوئی کس طرح میرے پیچھے لگ گیا۔ یہ بات تو تقریباً طے شُدہ تھی کہ وہ میرے دشمنوں ہی میں سے ہو سکتا تھا ورنہ کسی اور کو میرے تعاقب کی کیا ضرورت تھی!

ٹیکسی اور سُرخ اسپورٹس کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ تعاقب کرنے والا کوئی اناڑی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اُسے ٹیکسی کے اتنے قریب رہ کر تعاقب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بصارت کا دائرہ وسیع ہوتے ہی میں نے مُڑ کر سُرخ اسپورٹس کار کی طرف دیکھا۔

رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ٹرانسمیٹر پر کسی سے رابطہ قائم کر رہا ہے میں نے اُس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کی بجائے اپنی قوتِ سماعت کے دائرے کو بھی وسیع کر لیا تھا۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا اور جو لوگ میرے مقابلے پر تھے، انھوں نے مجھے بہت محتاط بنا دیا تھا۔ اب میں اپنے دشمنوں سے ذہنی رابطہ قائم کرنے سے حتی الامکان گریز کرنے لگا تھا۔

سماعت کا دائرہ وسیع ہوتے ہی مجھے اس شخص کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ اس کی آواز کسی قدر بھاری تھی اور وہ انگریزی ہی میں بات کر رہا تھا۔ "فورٹی ٹو کالنگ... فورٹی ٹو کالنگ ہیری ناٹ!... فورٹی ٹو کالنگ ہیری ناٹ!... اوور!"

میں یہ سُن کر چونک اُٹھا۔ اِن چند الفاظ کی ادائیگی ہی سے مجھے کم از کم دو باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ شخص ہیری ناٹ نہیں تھا، دوسرے یہ کہ وہ ہیری ناٹ ہی کا کوئی ساتھی تھا۔ اِسی کے ساتھ اُس کے لہجے سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ میک اپ میں ہے۔ اُس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی مغربی ملک کا باشندہ نہیں بلکہ عرب ہی ہے۔ اب مجھے اُس کا چہرہ دیکھنے کی مزید ضرورت نہیں تھی اس لیے میں مُڑ کر آرام سے بیٹھ گیا اور اپنی بصارت کے دائرے کو سمیٹ لیا کیوں کہ میرے لیے قوتِ سماعت کا پھیلاؤ بھی اِس وقت کافی تھا۔ میں ٹرانسمیٹر پر ہیری ناٹ سے ہونے والی گفتگو کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی تک رابطہ قائم نہیں ہوا تھا۔ میں یہ گفتگو اِس لیے بھی سُننا چاہتا تھا کہ ممکن ہے مجھے ہیری ناٹ کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہو جائے یا اُس کے کسی نئے منصوبے سے آگاہ ہو جاؤں۔

پھر مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد ہی ٹرانسمیٹر پر مجھے ہیری ناٹ کی آواز سُنائی دی۔ "ہیری ناٹ آن دی لائن کوڈ نمبر پلیز! اوور۔"

"فورٹی ٹو سر! اوور۔"

"گروپ؟ اوور!"

"فائیو سر! اوور۔"

"آل رائٹ! کیا بات ہے؟ اوور۔"

"سر! میں اس وقت ابوالہول کے تعاقب میں ہوں۔ اوور۔" اُس شخص کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"کیا!" ہیری ناٹ کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ "تم ہوش میں تو ہو! تفصیلی رپورٹ دو! اوور۔"

"سر! آپ کے علم میں ہے کہ ہمارا گروپ کیرو شیریٹن میں ہے۔ کچھ دیر پہلے، اب سے تقریباً نصف گھنٹے قبل میں اپنے گروپ انچارج سے اجازت لے کر دو گھنٹے کے لیے ہوٹل چھوڑ کر جا رہا تھا کہ ہوٹل کے صدر دروازے سے نکلتے ہوئے مجھے وہی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ ایک نوجوان تھا جو کچھ کھویا کھویا سا معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اُسی کے جسم سے وہ خوشبو اس وقت آتی محسوس ہوئی تھی جب میں اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی کے ذریعے پُرانے قاہرہ کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے ٹیکسی ڈرائیور سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ٹیکسی والے سے پُرانے قاہرہ چلنے کے لیے ہی کہا تھا۔ مجھے اُس وقت کسی پاس کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی جو خالی ہو، اسی لیے جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو میں تقریباً دوڑتا ہوا، ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں پہنچا۔ اُسے بہرحال پُرانے قاہرہ جانے کے لیے شاہراہِ اہرام سے گزرنا تھا میں نے سوچا کہ اگر اس کی ٹیکسی نے تیز رفتاری کا ثبوت بھی دیا تو میں اُسے شاہراہِ اہرام تک پکڑ ہی لوں گا مگر اس کی نوبت نہیں آئی نیل کا ایک پُل عبور کرتے ہی میں اس کی ٹیکسی کے پیچھے لگ گیا اُس کی ٹیکسی کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ بہرحال میں اس کی ٹیکسی کا تعاقب کرتا ہوا یہاں پُرانے قاہرہ تک آ گیا۔ اِس وقت اُس کی ٹیکسی عابدین پیلس کے علاقے میں ہے اور میں مسلسل اُس کا تعاقب کر رہا ہوں۔ مجھے بتائیں سر کہ میں اس کا تعاقب جاری رکھوں یا ترک کر دوں؟ یا میرے لیے کوئی اور حکم؟ اوور۔"

"پہلے تم اِس بات کا جواب دو کہ تمھیں پورا یقین ہے کہ وہ ابوالہول ہی ہے، کوئی اور نہیں؟ اوور۔" ہیری ناٹ کی آواز سنائی دی۔

"جی ہاں سر، مجھے پورا یقین ہے۔ میں نے بہت قریب سے اُس کی خوشبو محسوس کی تھی۔ اُس کے جسم سے تازہ کھلتے گلابوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اوور۔" اُس شخص نے ہیری ناٹ کو یقین دلایا۔

"اب یہ بتاؤ کہ تمھاری کار اور اس کی ٹیکسی کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ اوور۔"

"کافی... کافی فاصلہ ہے سر! اوور۔" ہیری ناٹ کے سوال پر وہ شخص یقیناً کچھ گڑبڑا گیا تھا۔ اُسے شاید اپنی غلطی کا احساس پہلی بار ہوا تھا۔

"تمھارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو!" ہیری ناٹ کی آواز میں سختی آ گئی۔ "تمھیں تمھارے گروپ انچارج نے شاید ابوالہول کے متعلق تفصیل سے نہیں بتایا ورنہ تم اس بات کا خیال رکھتے اور اس کے قریب جا کر اپنی موت کو دعوت نہ دیتے۔ میں اب یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ تم اس کی نظر میں آ چکے ہو یا نہیں لیکن اگر اُس نے یہ محسوس کر لیا کہ تم اس کا تعاقب کر رہے ہو تو پھر یقیناً دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مرنے سے نہیں بچا سکے گی۔ احمق آدمی! وہ دنیا کا حیرت انگیز وجود ہے، بے پناہ طاقتوں کا مالک! بہرحال میں تمھارے لیے دُعا ہی کر سکتا ہوں کہ اُس نے اب تک تمھیں دیکھا نہ ہو۔ اگر تمھاری کار کا فاصلہ اُس سے واقعی کم ہے جیسا کہ مجھے یقین ہے تو اُسے فوراً بڑھا لو۔ درمیانی فاصلہ اتنا رکھو کہ اسے شک نہ ہو۔

میری بات سمجھ گئے! اوور۔"

"یس سر!" وہ شخص خوفزدہ لہجے میں بولا۔ بھتری ناٹ سے میرے متعلق سن کر یقیناً اُس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ مزید بولا۔ "سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اُس کا تعاقب ترک کر دوں؟ اوور۔" "نہیں!" بھتری ناٹ نے سخت لہجے میں حکم دیا۔ "تم اُس کا تعاقب جاری رکھو اور مجھ سے بھی رابطہ منقطع نہ کرو۔ تم نے اچھا ہی کیا ______

کہ اپنی کار میں اُس کا تعاقب کیا ورنہ شاید تم مجھ سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم نہ کر پاتے۔ بہرحال مجھے ہر وقت اطلاع دیتے رہو کہ اس کی ٹیکسی کہاں کہاں سے گزر رہی ہے! جب تک وہ ٹیکسی سے اتر کر کہیں کسی گھر یا ہوٹل یا اور کسی جگہ نہ چلا جائے یا کہیں رک نہ جائے تم اس کا تعاقب کرتے رہو! تمہیں یہ خیال رکھنا ہے کہ وہ تمہاری نظر سے اوجھل نہ ہو اور یہ کہ اُسے تعاقب کا شبہ نہ ہو جائے۔ میں لائن پر موجود ہوں جب وہ عابدین پیلس کے علاقے سے کسی اور علاقے میں داخل ہو تو مجھے فوراً رپورٹ دو۔ اوور۔"

میرے ذہن نے اسی لمحے یہ فیصلہ کیا کہ بھتری ناٹ کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں پرانے قاہرہ ہی میں کہیں مقیم ہوں اِس طرح اس کی تلاش کا دائرہ محدود ہو سکتا تھا اور تمام تر توجہ کا مرکز پرانا قاہرہ بن سکتا تھا۔ میں نے اِسی لیے فوراً ہی اپنے تعاقب میں آنے والے کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹیکسی اب عابدین پیلس کے علاقے سے نکل کر پرانے قاہرہ ہی کے ایک اور علاقے میں داخل ہونے والی تھی۔

"ٹیکسی ڈرائیور!" میں نے فوراً ہی ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا، پھر بغیر رکے بولا "واپس قاہرہ چلو!"

"جی جناب؟" ٹیکسی ڈرائیور اِس طرح بولا جیسے اُسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔

"دراصل میں اپنے کچھ ضروری کاغذات وہیں ہوٹل کیرو شیریٹن میں بھول آیا ہوں" میں نے بات بنا دی۔

"مگر جناب...؟"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" میں اس کی بات کاٹ کر بول اُٹھا کیوں کہ اس کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ "ظاہر ہے کہ میں واپسی کا کرایہ بھی دوں گا۔" میں نے اُسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ پھر واپسی کا سفر شروع

ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کی دلچسپ گدگداتی ہوئی خود نوشت

بزدلیر

بے شمار سلسلے وار کہانیوں کے خالق

شمیم نوید کے ماحب ساحر قلم سے

تھکے ہوئے لمحات میں مسکراہٹیں بکھیر دینے والی
اے ڈی مہر کی تہقہہ بردوش روداد حیات۔
زندگی کی اکتا دینے والی یکسانی میں ایک خوشگوار
تغیر میں شگفتگی کی تازہ لہر
قبولیت عام کی سند حاصل کرنے والا کتابی سلسلہ

زیر طبع

قیمت
فی حصہ ۵۰ روپے

آج
ہی قریبی
بک سٹال
سے یا براہ راست
ہم سے
طلب کریں!

گل قریشی پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- مر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون: 7248599-7223762

ہو گیا۔ تعاقب کرنے والا ہر اُس علاقے کا نام بھتری ناٹ کو بتا رہا جس سے ٹیکسی گزرتی رہی۔ جب ٹیکسی پرانے قاہرہ کی حدود سے نکل کر اہرام کی طرف بڑھی اور اُس شخص نے بھتری ناٹ کو یہ بات ٹرانسمیٹر پر بتائی تو جواب میں بھتری ناٹ نے طویل سانس لیا، پھر افسردہ سے لہجے میں بولا۔ "افسوس کہ تمہاری حماقت رنگ لے آئی، تم یقیناً اُس کی نظر میں آ چکے ہو، فوراً لوٹ! ظاہر ہے کہ میں تمہاری موت پر افسوس کرنے کے سوا اور تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ اُس کا قاہرہ کی طرف واپسی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اُسے تعاقب کا یقین ہو چکا ہے۔ بہرحال جب تک تم زندہ ہو مجھ سے رابطہ قائم کیے رہو اور برابر رپورٹ دیتے رہو۔ ممکن ہے اِس طرح تمہاری موت کچھ آسان ہو جائے۔ اوور۔"

جواب میں وہ شخص تقریباً رو دیا، پھر وہ بھرائی ہوئی خوفزدہ آواز میں بولا۔ "سس... سر! لگ... کیا... کیا واقعی آپ... آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ اوور!"

"ہاں بھتری ناٹ کے اندازے نوّے فیصد درست ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اِس کا اندازہ ابھی تمہیں خود ہی ہو جائے گا۔ اوور۔" بھتری ناٹ پُریقین آواز میں بولا۔ اُس کی اِس بات کا گواہ مجھ سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ اُس کا قیاس سو فی صد درست تھا۔

بھتری ناٹ کی بات سن کر وہ شخص چیخ اٹھا۔ "نہیں!... نہیں سر!... ایسا... ایسا نہ کہیں! ابھی... ابھی تو میں نے اپنی بہن کی شادی بھی نہیں کی اور... اور..." اُس کا گلا رندھ سا گیا۔ مجھے اُس شخص پر ترس آنے لگا جو غالباً ہوسِ زر میں وطن فروشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔

ٹیکسی اب اہرام کے قریب سے گزر کر شاہراہِ اہرام پر آ چکی تھی۔ اُسی وقت جیسے میرے وجود میں کسی نے سرگوشی کی اور یہ سرگوشی میرے اپنے ضمیر کی تھی۔ "ابوالہول! تم صرف اپنی زندگی بچانے کی خاطر کتنے لوگوں کو ہلاک کرو گے؟ کتنے گھر اُجاڑو گے؟ کتنی بے گناہ عورتوں کا سہاگ لوٹو گے؟ کتنے بچوں کو یتیم کرو گے؟ آخر تمہاری خون کی پیاس کب بجھے گی؟"

"میں اپنے آپ کو نہیں بلکہ دنیا کو تباہی سے بچانا چاہتا ہوں اور ابھی کوئی بے گناہ شخص میرے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا!" میں نے اپنے ضمیر کو سمجھایا۔

"اُس شخص کے بارے میں تمہارے پاس کیا جواب ہے جو آج ہی صرف تمہاری وجہ سے موت کی نیند سو گیا؟ تو تونی پوسکے ساتھی تو خیر وطن دشمن تھے لیکن اُن کی کار جس شخص کی وین سے ٹکرا گئی تھی، وہ تو وطن دشمن نہیں تھا۔ اُس نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا! وہ تو بے گناہ تھا! کیا وہ صرف تمہاری وجہ سے نہیں مارا گیا؟ اور وہ غیر ملکی عورت بھی تو زندہ نہیں بچی ہو گی جو اُس حادثے میں شدید زخمی ہو گئی تھی! جواب دو ابوالہول کہ اس عورت نے کیا گناہ کیا تھا؟"

میرے ضمیر نے مجھے لاجواب کر دیا اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔

پھر اسی شرمندگی کا سبب تھا کہ میں نے اس شخص کو قتل نہ کرنے کا فیصلہ کیا جو میری ٹیکسی کے تعاقب میں تھا، لیکن اس کے ساتھ میری خواہش یہ بھی تھی کہ آئندہ بھتری ناٹ اس شخص کو میرے خلاف استعمال نہ کر سکے اگر میں اس کے ذہن کو بھتری ناٹ کی طرف سے پھیر دیتا یا بغاوت پر آمادہ کر دیتا تو بھی وہ زندہ نہ بچتا۔ امریکی ایجنٹ اپنے جرائم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے اُسے یقیناً خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتے۔ میں نے اسی لیے ایک اور راہ نکالی۔ اس طرح وہ امریکی ایجنٹوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بچ سکتا تھا۔ میں نے جو راہ نکالی تھی، وہ بھی اس شخص کے لیے بہت بڑی سزا تھی، لیکن یہ سزا بہرحال سزائے موت سے کم تھی۔ اس طرح کم از کم اُس کی زندگی تو بچ ہی جاتی۔

ایک فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اس شخص کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ مگر اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے اس کے ذہن کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ مجھے اُس کا ذہن پڑھ کر کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ مجھے اس کا ذہن پڑھ کر بہت کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی کام کی بات یہ تھی کہ قاہرہ کے تقریباً ہر بڑے ہوٹل میں بھتری ناٹ نے اپنے آدمیوں کا جال پھیلا رکھا تھا۔ اُس نے امریکی ایجنٹوں کے علاوہ مقامی جرائم پیشہ افراد کی ایک بڑی تعداد کو بھی میری تلاش پر لگا دیا تھا۔ میری پہچان وہی بتائی گئی تھی، میرے جسم سے اُٹھنے والی مخصوص خوشبو۔ جرائم پیشہ افراد کو میرے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں کی گئی تھیں البتہ مقامی امریکی ایجنٹوں کو سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ بھتری ناٹ نے میری تلاش کے لیے بارہ گروپ تشکیل دیے تھے جن میں سے زیادہ تر کا قیام شہر کے بڑے ہوٹلوں میں تھا۔ ہر گروپ میں پانچ پانچ افراد تھے۔ اُنہی میں سے ایک اُن کا انچارج ہوتا تھا جو کوئی مقامی ایجنٹ ہوتا تھا۔ ٹرانسمیٹر صرف امریکی ایجنٹوں کے پاس تھے اور وہی بھتری ناٹ سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ انہی میں سے ایک گروپ پرانے قاہرہ میں بھی تھا، لیکن اس شخص کو اس سلسلے میں مزید تفصیلات کا علم نہیں تھا کہ وہ گروپ پرانے قاہرہ کے کس علاقے میں تھا! اس کے علاوہ اپنے گروپ کے سوا اُسے بقیہ افراد کے

سیمیج شو کا فون کی خبر بھی نہیں تھی۔ ہاں اُسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ میری تلاش کے سلسلے میں تھری ناٹ، ہوٹلوں پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ خود تھری ناٹ کہاں مقیم تھا؟ اس سوال کا جواب بھی اس شخص کا ذہن نہ دے سکا۔ مجھے بھی اس سوال کا جواب ملنے کی کم ہی امید تھی، پھر بھی میں کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تمام باتیں معلوم کرنے کے بعد میں نے اُس شخص کے ذہن کو بالکل صاف کر دیا۔ کسی کورے کاغذ کے مانند! اب اُسے نہ یہ خبر تھی کہ وہ کون ہے، کیا ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے؟ اُس کے ذہن سے ماضی کا ہر نقش مٹ چکا تھا۔ اس کا ذہن اب بالکل خالی تھا۔

اور میں نے اُس کے لیے یہی سزا تجویز کی تھی، مگر ایسا کرنے سے پہلے میں اُس کی کار کو سڑک کے کنارے رکوا چکا تھا تاکہ وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے کیوں کہ اب وہ کار چلانا بھی بھول چکا تھا۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ٹرانسیٹر پر تھری ناٹ کی آواز ابھری: "ڈراپ ٹو! تم نے کافی دیر سے کوئی بات نہیں کی۔ کیا بات ہے؟ تم خیریت سے تو ہو؟ اوور۔"

"ڈ... ڈ... ڈو... کون؟" وہ بڑبڑانے لگا۔ "کیسی بات؟"

جب کچھ دیر "اوور" کہے بغیر وہ شخص کچھ اور نہ بولا تو تھری ناٹ نے اُسے پھر مخاطب کیا: "میں تھری ناٹ ہوں، میری بات کا جواب دو! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ تو تمہاری آواز سن کر مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو، لیکن تم مجھے اپنے حواس میں معلوم نہیں ہوتے۔ اگر تم نے اس بار بھی میری بات کا ٹھیک جواب نہ دیا تو میں تم سے رابطہ منقطع کر..."

تھری ناٹ کی آواز مدھم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی اور میں اس کا سبب بخوبی سمجھتا تھا۔ میں جس ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا، وہ اس سرخ اسپورٹس کار کو ایک میل سے زیادہ پیچھے چھوڑ آئی تھی جس میں ٹرانسیٹر پر تھری ناٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اسپورٹس کار رُکی ہوئی تھی اور ٹیکسی ہر لمحے اُس سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنے حیرت انگیز وجود میں چھپی ہوئی قوتوں کا پوری طرح ادراک تھا۔ میں صرف ایک میل تک اپنی سماعت کے دائرے کو پھیلا سکتا تھا اور یہ حد گزر چکی تھی۔ مجھے اسی لیے تھری ناٹ کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ تھری ناٹ جیسے چالاک اور عیار شخص نے یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اُس کا ساتھی میری نظر میں آ گیا ہے۔ ممکن ہے، تھری ناٹ یہ نہ سمجھ سکا ہو کہ اُس کے ساتھی پر کیا گزری ہے، مگر یہ کہ اُس وقت اُس کا ساتھی اپنے حواس میں نہیں، یہ قیاس تھری ناٹ کے لیے مشکل نہ رہا ہو گا۔ ایسی صورت میں اس کا فوری طور پر چوکنا ہو جانا لازمی امر تھا۔ وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ میں اُس کے ساتھی کا ذہن بھی پڑھ سکتا ہوں۔ نتیجتاً کم از کم کیرو شیرٹن میں مقیم اپنے آدمیوں کو اُس نے وہاں سے فوراً ہٹ جانے کا حکم دے دیا ہو گا۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بعید نہیں تھا کہ وقتی طور پر وہ شہر کے ہر بڑے ہوٹل میں مقیم ہر گروپ کو فوری طور پر ہوٹل چھوڑ دینے کے احکام صادر کر دیتا۔ وہ اب تک اتنا ہی محتاط اور چالاک ثابت ہوا تھا۔ ان حالات میں ہوٹل کیرو شیرٹن جا کر اس کے ساتھیوں کی تلاش عبث ہی تھی۔

میرا ذہن جب تک ایک نتیجے پر پہنچا، ٹیکسی نے شاہراہ اہرام پر کافی سفر طے کر لیا تھا۔ "سنو!" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"جی صاحب!"

"مجھے اب یاد آ گیا ہے کہ میں جن کاغذات کی تلاش میں کیرو شیرٹن جا رہا تھا کہ وہاں بھول آیا ہوں، وہ گھر سے لے کر ہی نہیں چلا تھا۔"

"جی!" ٹیکسی ڈرائیور کی "جی" بہت لمبی تھی۔

"معاف کرنا، میرا حافظہ ذرا کمزور ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "اب تم سیدھے معادی چلو۔ پھر بغیر رُکے مزید کرایہ جو تم مانگو گے، میں ادا کر دوں گا، کرائے کی فکر نہ کرو!"

"بہت بہتر ہے جناب!" ٹیکسی ڈرائیور کرائے کی مکمل چھوٹ کے بارے میں جان کر فوراً ہی سعادت مندی پر اتر آیا۔ وہ مجھے یقیناً کوئی سنکی اور بے وقوف ہی سمجھ رہا ہو گا، مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ پھر فوراً ہی واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ اب میں یمامہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اُس کے گھر سے غائب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور میں اُسے کوئی اطمینان بخش جواب بھی دے کر نہیں آیا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں اور واپسی کب ہو گی۔

یمامہ کے گھر تک پہنچتے پہنچتے شام کے پانچ بج گئے۔ میں نے یمامہ کے گھر کے سامنے اتر کر حسب وعدہ ٹیکسی والے کو منہ مانگا کرایہ ادا کیا اور پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ خلاف توقع مجھے اُس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہی ملا۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے یمامہ کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے چیخ کر کہہ رہی تھی: "تم ہرگز یہ نہ سمجھ لینا کہ میں بے سہارا ہوں اور تمہاری دھمکی میں آ جاؤں گی! شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ۔ تم سمجھ [illegible] ہو نا!" غصے میں بھی اُس کا تکیہ کلام نہیں چھوٹا تھا۔

"شرافت شریفوں سے برتی جاتی ہے، تم جیسے لوگوں سے نہیں!" یمامہ کے بعد ایک مرد کی بھاری سی آواز ابھری: "تم سیدھی طرح مان [illegible] جیسی رہیں تو میں بھی کیا کروں! میں تو تمہیں منہ مانگی رقم دینے پر [illegible]

ہو نا، بولو، کیا لو گی؟"

"بکواس بند کرو!" یمامہ کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے سے بے قابو ہو رہی ہے۔ میں وہیں رک کر اُن دونوں کی گفتگو سننے لگا تھا۔ وہ دونوں غالباً نشست گاہ میں تھے۔ "اگر تم میری بات کو بکواس سمجھ رہی ہو تو پھر مجبوری ہے۔" مرد کی آواز آئی۔ "میں زبردستی تمہاری لڑکی کو اٹھا لے جاؤں گا اور یہ تم بھی جان ہی گئی ہو کہ پولیس بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پرانے قاہرہ میں میرا سکہ چلتا ہے۔ بالفرض تم نے ہنگامہ کیا بھی تو کچھ نہیں ہو گا۔ محلے والے تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں، کوئی میری صورت دیکھنے کے بعد تمہارے پھٹے میں پاؤں نہیں پھنسائے گا!"

یمامہ اور اس اجنبی شخص کی باتیں سن کر میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ اجنبی پرانے قاہرہ کا کوئی مشہور جرائم پیشہ شخص ہی ہو سکتا تھا جو پولیس سے بھی ساز باز رکھتا ہو گا ورنہ یہ نہ کہتا کہ پولیس بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یقیناً یمامہ کی نوجوان بیٹی نبیلہ پر اُس شخص کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ وہ نبیلہ کے لیے یمامہ سے زبردستی کر رہا تھا۔ اس بھولی بھالی معصوم سی لڑکی کو جو اپنی ماں کے کردار سے ناواقف تھی اور اُس کی ماں اُسے وقت کی بے رحم اور تیز دھوپ سے بچاتے ہوئے تھی، میرے ہوتے ہوئے کوئی خراب نہیں کر سکتا تھا۔

میں تیزی سے صحن میں پہنچا اور پھر نشست گاہ کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔ یمامہ اور وہ اجنبی، دونوں ہی میری اچانک آمد پر چونک اُٹھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اجنبی نے مجھے تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھا، پھر یمامہ کی طرف پلٹ کر ہنستے ہوئے بولا: "تو آج کل اس چھوکرے کو پال رکھا ہے تم نے! اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا بھاؤ زیادہ گرا نہیں ہے!"

میں نے اُس شخص کو گھور کر دیکھا جو سیاہ فام اور گٹھیلے جسم کا مالک تھا۔ پھر میں سینہ تانے قدم قدم چلتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ ایک دم اچھلا اور صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کسی سانپ کی طرح پھنکارا: "تجھے شاید نہیں معلوم کہ میرا نام [illegible] ہے اور لوگ میرا نام سن کر ہی کانپنے لگتے ہیں۔ اگر تو نہیں چاہتا کہ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے تو خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جا اور ہمارے معاملے میں نہ پڑ! میں بے سبب کشت و خون سے گریز کرتا ہوں۔ [illegible] اور یمامہ کا معاملہ ہے تو مجھے اس سے نمٹ لینے دے!"

میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا تھا۔ میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا: "تم اپنے آپ کو مرد کہتے ہو اور ایک بے بس عورت کو دھمکیاں دے رہے ہو!"

"میں تجھ سے کہہ چکا ہوں لڑکے کہ تُو اس چکر میں نہ پڑ! مگر تُو شاید یوں نہیں مانے گا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ یمامہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ غالباً یہی سمجھی ہو گی کہ اب میری خیریت نہیں، لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنی دانست میں عجیب ہی منظر دیکھا ہو گا۔ عجیب اور ناقابلِ یقین! وہ اجنبی اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے زمین پر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ اُس نے جیسے ہی مجھ پر چھلانگ لگائی تھی، میں نے تیزی سے ایک طرف ہٹ کر اپنی دائیں ٹانگ آگے بڑھا دی تھی۔ میرے پیر کی بھرپور ضرب اُس کے پیٹ پر پڑی تھی اور وہ "اوغ" کر کے زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔

نئے عہد کی حیرت انگیز سرگزشت

ابوالہول

ادریس المہندس

پہلا حصہ اختتام کو پہنچا
اس سلسلے کے بقیہ واقعات دوسرے حصہ میں ملاحظہ کریں جو اس کے ساتھ ہی شائع کیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ شمیم نوید کا نیا سلسلہ طارنوش (دو حصوں میں) بھی شائع ہو گیا ہے۔

ایک تیس سالہ پُراسرار نوجوان کی سرگزشت
جس کی اصل عمر ایک سال تھی ۔
شمیم نوید
2

0312 7191853
0307 8144100

B
5

"اب اٹھو بھی میرے یار کہ اسی طرح عورتوں کی طرح پیٹ پکڑے بیٹھے رہو گے!" میں دانستہ بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنی دانست میں موقع دیکھتے ہی میری ٹانگ پکڑ کر پوری قوت سے کھینچی مگر میں پہلے ہی اس کے لیے تیار تھا۔ وہ مجھے میری جگہ سے ہلا بھی نہیں سکا۔

"زور لگاؤ تھوڑا سا!" میں نے اُسے چڑھایا۔ "تم عورتوں سے بھی گئے گزرے ہو!"

شاید اُسے کسی نے اتنا ذلیل نہیں کیا ہوگا۔ وہ بھی ایک عورت کے سامنے! غالباً اسی لیے وہ اپنے پیٹ کی تکلیف بھول کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہی اس نے ایک تیز دھار چاقو اپنی جیب سے نکال کر کھول لیا اور اسی کے ساتھ اچھل کر دو قدم پیچھے ہو گیا۔ اب وہ مخصوص انداز میں ذرا جھکا ہوا چاقو ہاتھ میں پکڑے مجھے گھور رہا تھا۔ "اگر میں نے تیری آنتیں باہر نہ نکال دیں تو میرا نام بھی اعشی نہیں۔" وہ چاقو والے ہاتھ کو لہرا کر غرایا۔ ظاہر ہے کہ میں اس کی احمقانہ بات پر ہنس ہی سکتا تھا، سو میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میری ہنسی نے اور بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کا سیاہ چہرہ غصے سے کچھ اور سیاہ نظر آنے لگا۔ اب تک یامہ خاموش رہی تھی مگر اس موقع پر وہ چپ نہ رہ سکی۔ شاید اس کے خیال میں معاملہ انتہائی نازک صورتِ حال اختیار کر چکا تھا اور خون خرابے کی نوبت آ گئی تھی۔ اس نے وحشی کی طرف دیکھ کر التجا آمیز لہجے میں کہا: "خدا کے لیے اعشی! چاقو جیب میں رکھ لو۔ اس اجنبی کو نہیں معلوم کہ تم کون ہو کیوں کہ یہ قاہرہ کا نہیں اسکندریہ کا رہنے والا ہے۔"

"اسے ہی تو بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں!" سیاہ فام اعشی نے میری طرف دیکھ کر دانت پیسے۔

"کیوں ڈراتے ہو یار! مجھے!" میں ہنس کر بولا۔ "اگر زیادہ ڈر گیا تو ناحق تمھاری کم بختی آ جائے گی! تمھیں تو معلوم ہی ہوگا کہ دبنے پر تو چیونٹی بھی کاٹ کھاتی ہے۔"

"میں تجھے چیونٹی ہی کی طرح تو مسل کر پھینکوں گا!" وہ غرایا۔

"تو پھر اتنی دیر سے دور کھڑے کیوں مینڈک کی طرح ٹرّاتے جا رہے ہو۔ مسل بھی چکو!"

جواب میں وہ گالیاں بکتا ہوا کسی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں یہی چاہتا بھی تھا کہ یہ قصہ جلدی ختم ہو۔ اس بار میں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ غالباً اُسے یہ توقع نہیں رہی ہوگی۔ اسی لیے قریب پہنچتے پہنچتے وہ جھجک سا گیا۔ جب اُس کا وہ ہاتھ بلند ہوا جس میں چاقو تھا لیکن اس کا ہاتھ نیچے نہ آ سکا۔ میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ میری گرفت اتنی ہی مضبوط تھی کہ دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا اور اسی کے ساتھ منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ "یہ کہو تو تمھاری کلائی کے دو کر دوں۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جن میں تکلیف کے آثار تھے۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا: "آج تک شاید تمھاری مڈبھیڑ کسی مرد سے نہیں ہوئی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کلائی پر کچھ اور دباؤ بڑھا دیا۔ اس کے لیے یہ ہلکا سا دباؤ بھی بہت تھا۔ وہ چیخ اٹھا۔ میں نے پھر کہا: "کیوں! آیا کچھ مزہ؟ بولو اُس بیلہ کو کہ تم اُسے زبردستی اٹھا لے جاؤ!" پھر تو پے در پے اُس کے منہ سے چیخیں نکلتی رہیں۔ میں نے اُس کی کلائی پر دباؤ ڈالتے ہوئے بہر حال یہ خیال رکھا تھا کہ کلائی کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ پھر کچھ دیر بعد میں نے اُس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ کلائی چھوٹتے ہی تیزی سے یوں پیچھے ہٹا جیسے ذرا سی بھی تاخیر ہو گئی تو میں دوبارہ اُس کی کلائی گرفت میں لے لوں گا۔ تکلیف کے ساتھ ہی اب اُس کے چہرے سے خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی سہلاتے ہوئے آہستہ

اعتراف سب سے بڑی بہادری ہے۔ میرا پہلا حکم تمہارے لیے یہ ہے کہ آئندہ کبھی کسی عورت کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھانا۔ اب تم یہاں سے جا سکتے ہو۔ ویسے تمہارا دل چاہے تو یامہ سے اپنے رویے کی معافی بھی مانگ سکتے ہو۔"

"مجھے معاف کر دو یامہ!" اُس نے فوراً ہی یامہ سے معافی مانگ لی، پھر بولا۔ "نبیلہ کو اب میں اپنی بیٹی کے برابر سمجھوں گا۔ اگر میرے سامنے اُسے کسی نے بُری نظر سے دیکھا تو میں اُس کی آنکھیں نکال لوں گا۔"

یامہ حیران حیران سی یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھی۔ اعشیٰ پھر اُسی وقت وہاں سے ٹلا جب زبان سے یامہ نے معافی کا اظہار کر دیا۔ جب اعشیٰ چلا گیا تو میں نے یامہ سے پوچھا۔ "نبیلہ کہاں ہے...؟"

"میں نے اُسے موقع پاتے ہی کمرے میں بند کر دیا تھا۔" یامہ نے بتایا۔

"چلو، کمرے میں چلتے ہیں۔ میں لباس تبدیل کر لوں۔ تم چائے بنا لاؤ میرے لیے۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"میں ابھی بنا کر لاتی ہوں منعم!" یامہ کے لہجے میں بے پناہ پیار تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر کمر سیدھی کرنے کے لیے مسہری پر دراز ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں یامہ نے بڑی اُچّی کا تمام سامان الماری میں رکھ دیا تھا اور دونوں خالی تھیلیاں ایک طرف سلیقے سے رکھ دی تھیں۔ یامہ جلدی چائے بنا کر لے آئی۔ میں نے کہا۔ "اپنے لیے نہیں لائیں؟" پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چائے کی پیالی اس سے لے لی۔

"جب اعشیٰ آیا تھا تو میں اور نبیلہ شام کی چائے پی کر فارغ ہوئے تھے۔" اُس نے جواب دیا اور پھر کرسی پر بیٹھنے کی بجائے میرے قریب ہی مسہری پر بیٹھ گئی۔ "مگر اسے جائز تو کر دو۔" میں نے چائے کی پیالی یامہ کی طرف بڑھائی۔

"جائز کر دوں!" اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں!" میں اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ "تم اس میں سے ایک گھونٹ چائے پی لو گی تو یہ چائے میرے لیے جائز ہو جائے گی!"

وہ میری بات سُن کر کھلکھلا اٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے دُور تک جلترنگ سے بجتے چلے گئے ہوں۔

"کیوں ہنس رہی ہو...؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری عجیب بات پر۔" اُس نے جواب دیا، پھر چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔ "ایسی عجیب بات آج تک مجھ سے

آہستہ کراہ رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں میری ہی طرف تھیں، شاید اس لیے کہ میں بے خبری میں اس پر حملہ نہ کر دوں۔

"ڈرو مت اعشیٰ!" میں نے اُسے تسلی دی۔ "میں تمہارے اُوپر حملہ نہیں کروں گا۔ چاقو اٹھا لو اپنا اور اسے بند کر کے جیب میں رکھ لو۔" میری بات سُن کر اس کے چہرے پر حیرت سی نظر آئی۔ جیسے اُسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔ میں نے دوبارہ اپنی بات دُہرائی تو وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھ آیا، لیکن اُس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ ابھی اُس نے شکست تسلیم نہیں کی۔ میں اسی لیے چوکنا رہا۔ پھر وہی ہوا۔ وہ زمین سے چاقو اٹھاتے ہی ایک دم سیدھا ہوا اور چاقو کو نوک کی طرف سے پکڑ کر تیزی سے مجھ پر کھینچ مارا۔ مجھے جھکنے میں لمحہ بھر بھی تاخیر ہو جاتی تو چاقو میری گردن میں پیوست ہو جاتا۔ چاقو میرے پیچھے دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گرا۔ اس کا نشانہ بُرا نہیں تھا۔

"دوبارہ کوشش کرو اعشیٰ! تمہارا نشانہ اچھا ہے۔" میں نے نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا بڑا سبب غالباً میرا رویہ تھا۔ یقیناً میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس قاتلانہ حملے سے بچنے کے بعد اعشیٰ کو ہرگز معاف نہ کرتا اور میں تو دوبارہ اُسے حملے پر اکسا رہا تھا۔

"تم... تم... وہ ہکلایا۔ "تم کیا... کیا بلا ہو؟ آج تک میری نگاہ سے کوئی... کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جو... جو میرے اس وار سے بچ سکا ہو!"

"اب تو دیکھ لیا تم نے ایسا شخص!" میں مسکرایا۔ "کیا دوبارہ مجھ پر حملہ نہیں کرو گے!"

"نہیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا، پھر آگے بڑھا، مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اُس نے دیوار کے قریب پڑا ہوا چاقو اٹھایا، اُسے بند کیا اور پھر میرے قریب آ کر چاقو کو میرے قدموں میں ڈال دیا۔

"اعشیٰ نے آج تک اپنے اُستاد کے سوا کسی کے قدموں میں اپنا چاقو نہیں پھینکا۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی سی عمر میں اُستادوں کے اُستاد بن چکے ہو۔ تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ کسی کے قدموں میں چاقو پھینک دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے! آج کے بعد تمہارا ہر حکم میرے لیے پتھر کی لکیر ہے۔ اگر تم مجھے یہ حکم بھی دو گے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لوں تو یقین کرو، میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"اپنا چاقو اٹھا لو اعشیٰ! تم یقیناً ایک بہادر شخص ہو۔ سچائی کا

کسی نے نہیں کی تھی۔" اُس کے نصف چہرے پر اب بھی باریک نقاب تھی۔ جب اُس نے نقاب اٹھا کر اپنے ہونٹ، چائے کی پیالی کی طرف بڑھائے تو پہلی بار بغیر نقاب کے میں نے گلاب کی پنکھڑیاں دیکھیں۔

"یامہ، تم بہت خوب صورت ہو۔" میں نے تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا۔

"منعم! کیا واقعی میں تمہیں خوب صورت نظر آتی ہوں...؟"

"تم مجھے جیسی نظر آتی ہو، کاش میں اس کا اظہار لفظوں کے ذریعے کر سکتا یامہ!" یہ کہہ کر میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نقاب رُخ ہٹا دی اور پھر [illegible] میری نظریں اُس کے حسین چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ اسی وقت کہیں دُور سے دروازہ پیٹے جانے کی آواز آئی اور جیسے وہ خواب بکھر گیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، پھر بولی۔ "میں بھی کیسی پاگل ہوں۔ نبیلہ کو کمرے میں بند کر کے بھول ہی گئی۔ وہی دروازہ پیٹ رہی ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم چائے پیو منعم، میں آتی ہوں ابھی، کمرے کا دروازہ کھول کر۔"

وہ چلی گئی اور میں نے جھک کر چائے کی پیالی اٹھا لی۔ اسی لمحے ایک سوال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا اور یہ سوال واقعی میرے لیے بہت ہولناک تھا کیوں کہ اس سوال کا تعلق میری اصل عمر سے تھا۔ میری اصل عمر کیا ہے...؟

"صرف ایک سال!" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

اور یامہ کی عمر کیا ہوگی؟ میرے ذہن میں دوسرا سوال اُبھرا۔

"وہ... وہ کم از کم پینتیس سال کی تو ضرور ہوگی۔" میں پھر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

تم نے اپنی ماں کی تصویر بھی دیکھی تھی، اس کی عمر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے ابوالہول؟ میرے ذہن نے مجھ سے ایک اور ہولناک سوال کیا۔

"اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔" میں نے اپنے ذہن کو جواب دیا مگر اس کے ساتھ میرے ہونٹ بھی حرکت میں تھے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یامہ، تمہاری ماں سے بھی عمر میں دس سال بڑی ہے... ہے نا!"

"ہاں وہ... وہ بہت بڑی ہے میری ماں سے، مگر... میں یہ سب کچھ کیوں... کیوں سوچ رہا ہوں... کیوں...؟"

"اس لیے کہ ایک سالہ بچے کو کسی پینتیس سالہ عورت سے عشق نہیں کرنا چاہیے۔ اُسے اپنا بھولپن، اپنی معصومیت نہیں کھونا چاہیے۔"

"میری عمر صرف... صرف ایک سال ہے... ایک سال... تو... تو پھر مجھ سے میرا بچپن کیوں چھین لیا گیا؟ مجھے... مجھے میری ماں کی آغوش سے کیوں محروم کر دیا گیا؟ یہ... یہ بھیانک جرم کس نے کیا؟... کس نے؟ اور کیوں؟..." میں اس وقت ایک عجیب سے عالم میں تھا۔ میرے ذہن پر تاریکی کی ایک چادر سی پھیلتی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب تک میں اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ نہ مجھے یہ ہوش تھا کہ میں کہاں ہوں، نہ یہ احساس تھا کہ اس وقت میری عمر کا کارواں بائیسویں منزل پہ کا جولاہے۔ میری آنکھوں میں میری ماں کا چہرہ گھوم رہا تھا، وہ چہرہ جو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا، وہ بھی ایک تصویر میں! میں نے اس چہرے میں زندگی کے آثار دیکھے، پھر وہ چہرہ جھکا اور ایک بچے کی پیشانی چوم لی۔ وہ بچہ، ایک سالہ بچہ ایک پالنے میں لیٹا ہوا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میں نے اس بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک سالہ بچہ میں تھا۔ یعنی ابوالہول! مگر نہیں! شاید اس وقت تک مجھے ابوالہول نہیں بنایا گیا تھا۔ وہ منظر میرے ابوالہول بننے سے پہلے کا تھا۔ پھر جانے اسی عالم میں کتنا وقت بیت گیا۔ وہ منظر جیسے میری آنکھوں میں جم سا گیا تھا۔ میں اپنی پیشانی پر اپنی ماں کے بوسے کی مہک محسوس کرتا رہا۔ پھر اسی عالم میں ایک چیخ سنائی دی۔ نسوانی چیخ! اور وہ منظر بدل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ چیخ میری ماں کی تھی۔

"تم ابوالہول ہو۔" ایک اجنبی صدا میرے پورے وجود نے سُنی۔

"ہاں میں ابوالہول ہوں۔" میرے پورے وجود نے جیسے یہ الفاظ دُہرائے۔

پھر مجھے ابوالہول کا مجسمہ نظر آنے لگا جسے میں نے اب تک ایک ہی بار دیکھا تھا۔ وہ خواب اور بیداری کی ملی جلی کیفیت تھی۔ کبھی مجھے وہ سب کچھ خواب سا لگتا اور کبھی حقیقت! ابوالہول کے مجسمے کے پُرہیبت نقوش اپنے وجود میں پیوست محسوس ہوتے تو میں ایک دم چیخ اٹھتا، مگر اس کے باوجود ابوالہول کا مجسمہ میری نظروں کے سامنے سے نہ ہٹا۔

"کیا ہوا؟... کیا ہوا؟" میں نے اپنے اطراف سے بیک وقت کئی صدائیں سنیں۔ پھر جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ کسی نے مجھے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تھا۔ "تم کیوں چیخ اُٹھے تھے... یہاں کھڑے کھڑے؟ کیا ہو گیا تمہیں؟" کوئی

مجھ سے چھوڑ رہا تھا۔

"میں... میں چیخ اٹھا تھا!" میں ابوالہول کے مجسمے پر نظر جمائے ہوئے یوں بولا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ابھی جاگا ہوں۔

"ہاں تم بہت دیر سے اس مجسمے کے سامنے کھڑے ہوئے بس اسے دیکھے جا رہے تھے اور پھر ایک دم ہی ہم نے تمہاری چیخ سنی تھی۔" بتایا گیا۔

مگر میں تو یامہ کے گھر پہنچ گیا تھا! میں نے کہنا چاہا، لیکن زبان تک یہ الفاظ آتے آتے رُک گئے۔ اُس وقت میں حقیقتاً ابوالہول کے مجسمے کے سامنے ہی کھڑا تھا اور یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ مجھے جھنجوڑنے والا ایک گائیڈ تھا جس کے ساتھ ایک غیر ملکی جوڑا تھا۔ سورج اب اہرامِ مصر کے آخری بوسے لے کر رخصت ہو رہا تھا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں خود پر قابو پا لیا اور گائیڈ کی بات کا جواب دیا: "میں یہاں سیر کرنے آیا تھا۔ اس مجسمے نے جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر اسے دیکھتے دیکھتے... اچانک مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔"

میری بات مکمل ہوتے ہی غیر ملکی عورت انگریزی میں گائیڈ سے پوچھنے لگی کہ میں نے کیا کہا ہے۔ گائیڈ اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور میرے کہے ہوئے عربی الفاظ کا انگریزی میں ترجمہ کرنے لگا۔ پھر میں وہاں رُکا نہیں اور اُن لوگوں نے بھی مجھے نہیں روکا۔ میں نے اپنی جیبیں دیکھیں تو خالی تھیں۔ میں وہی کپڑے پہنے ہوئے تھا جو بدل کر آرام کرنے لیٹا تھا۔ رقم کوٹ کی جیب میں تھی جو میں الماری کے اندر ایک ہینگر پر ٹانگ آیا تھا۔ ایک خالی ٹیکسی دیکھ کر میں اس کی طرف بڑھ گیا کیوں کہ کرایہ یامہ کے گھر پہنچ کر بھی ادا کیا جا سکتا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر مصر قدیمہ جاتے ہوئے میرا ذہن بے حد الجھا ہوا تھا۔ یہ میرے لیے دُوسرا تجربہ تھا کہ میں ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو گیا تھا۔ ابھی چند ہی دن پہلے میں ایک ایسے ہی تجربے سے گزر رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس تجربے کی تفصیلات تازہ ہو گئیں۔ اس وقت نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی اور میں اسرائیلی ایجنٹ میرا کو اعترافِ جرم کے لیے سی آئی ڈی آفس روانہ کر چکا تھا۔ میرا اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھی جس سفر کے بعد اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ پھر مجھے میرا کے بچے کا خیال آ گیا تھا جس کے ذکر پر وہ تڑپ اُٹھی تھی۔ اس کے بعد میں خود اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ میں بھی تو ایک بچہ ہی تھا۔ میرے وجود میں محرومیاں جاگ اُٹھیں۔ میں سوچنے لگا کہ کب تک یوں ہی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں بھاگتا رہوں گا؟ کیا کبھی مجھے ماں کی آغوش میسر نہیں آئے گی؟ پھر میری آنکھوں میں اپنی ماں کا چہرہ گھومنے لگا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تھا تو میں نے خود کو شاہ راہ شریف کی بجائے دریائے نیل پر بنے ہوئے ایک پُل کے کنارے اس کی ریلنگ پکڑے کھڑے دیکھا تھا۔ اس وقت میری نگاہیں دریا کی موجوں پر جمی ہوئی تھیں۔

اُس تجربے کے دوران میں بھی نہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہوا تھا اور نہ مقام کی تبدیلی کا کوئی احساس! میں جانے کب اور کیسے شاہ راہ شریف سے دریائے نیل پر بنے ہوئے اُس پُل تک جا پہنچا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں یامہ کے گھر سے اہرام تک پہنچ گیا تھا اور مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ ممکن ہے یامہ اس پر روشنی ڈال سکے۔ کیوں کہ پہلے تجربے کے دوران میں نادیدہ بھی تھا اور اکیلا بھی! مگر اس بار حالات ذرا مختلف تھے۔ ممکن ہے یامہ نے مجھے گھر سے نکلتے دیکھا ہو۔ پھر میں اُن کیفیات پر غور کرنے لگا جو دونوں تجربوں میں مشترک تھیں۔ بنیادی باتیں مجھے دو ہی نظر آئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ دونوں بار مجھ پر شدید مایوسی کا حملہ ہوا تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ میں نے اپنی ماں کا اور اپنا ایک سالم وجود دیکھا تھا۔ دونوں بار یہی دو باتیں مشترک تھیں۔

مجھے مایوس کن خیالات سے بچنا چاہیے، بس نے سوچا اور یہ بھی کہ اپنے ایک سالم وجود کے متعلق زیادہ نہیں سوچنا چاہیے۔ نہ ہی خود پر محویت کی کیفیت کو زیادہ دیر طاری رکھنا چاہیے۔ میرے لیے یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے دشمنوں کو اس کا علم تھا یا نہیں لیکن وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ اس کیفیت کے دوران مجھ پر قابو پا لینا اُن کے لیے بہت آسان ثابت ہوتا۔ میں اُنھی خیالوں میں کھویا ہوا مصر قدیمہ پہنچ گیا۔ ٹیکسی کو میں نے یامہ کے گھر کے دروازے پر رُکوایا اور اُتر گیا۔

"کرایہ جناب!" ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے ٹوکا۔

"ابھی لا کر دیتا ہوں۔ بس ایک منٹ رُک جاؤ!" میں نے نرمی سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ذرا جلدی کیجیے گا!" ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ میں نے جواب میں سر ہلا دیا اور گھنٹی کھٹکھٹانے لگا کیوں کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دروازہ کھولنے والی یامہ کی نوجوان بیٹی نبیلہ تھی۔ وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی شکایتی لہجے میں بولی۔ "کہاں چلے گئے تھے آپ؟ اتنا اچھا موقع تھا! ابی آدھے گھنٹے سے اندر ہی نہیں ہیں۔"

"ذرا کام سے گیا تھا!" میں دروازے سے اندر داخل ہو کر بولا۔ "ابھی ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ ذرا پہلے ٹیکسی والے کو کرایہ دے دوں!" یہ کہہ کر میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ نبیلہ میرے پیچھے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ دروازہ اُس نے لگا دیا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے جلدی سے الماری کھولی اور کوٹ کی اندرونی جیب بالکل خالی دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا۔ تمام رقم غائب تھی۔ بیاہ آخر ہاتھ دکھا ہی گئی تھی۔ "تمہارے پاس ایک گنی ہوگی نبیلہ!" میں نے خجل خجل سے لہجے میں نبیلہ سے کہا جو میرے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا کریں گے آپ ایک گنی کا...؟" اُس نے بالکل بچوں کی طرح سوال کیا۔

"کرایہ دوں گا ٹیکسی کا!" میں نے جواب دیا، مگر مجھے اس کی طرف نظر اُٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے آج تک کسی کے سامنے یوں ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔

"اُدھار دوں گی اور اس شرط پر کہ آپ اپنا وعدہ پورا کریں گے!"

"ہاں واپس کر دوں گا، اُدھار ہی دے دو!"

"اور میری شرط...؟"

"وہ بھی منظور ہے!"

"تو پھر میں آپ کو ایک کی بجائے دو گنی دے سکتی ہوں!" وہ خوش ہو کر بولی۔ "پتا ہے آپ کو میرے پاس پوری بیس گنیاں ہیں جو میں نے خود جمع کی ہیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں اُس وقت خود کو چور چور سا محسوس کر رہا تھا۔ میں دنیا کے بیشتر ممالک میں گھوما تھا مگر کبھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ میری جیب بالکل خالی ہو۔ یہ پہلا موقع تھا۔ لہٰذا اسی لیے کچھ جھنجلاہٹ سوار تھی اور کچھ شرمندگی بھی تھی۔ شاید یہی سبب تھا کہ نبیلہ کا انتظار مجھے گراں گزر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ واپسی میں اس نے بہت دیر کر دی ہے حالانکہ وہ بھاگتی ہوئی گئی تھی اور بھاگتی ہوئی واپس آئی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا سانس بے ترتیب تھا۔ "یہ... یہ لیں!" نبیلہ نے ہانپتے ہوئے تین نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ ایک نوٹ سو پیاسٹر کا تھا جو ایک گنی کے مساوی تھا اور دو نوٹ پچاس پچاس پیاسٹر کے تھے۔ وہ وعدے کے مطابق دو گنی کی رقم ہی لائی تھی۔

"یہ اپنے پاس ہی رکھو!" میں نے سو پیاسٹر کا نوٹ اسے واپس کر دیا اور پچاس پچاس کے دونوں نوٹ لے کر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے پچیس پیاسٹر کرایہ طے ہوا تھا مگر میں اسے ایک گنی دینا چاہتا تھا کیوں کہ اُسے کرائے کے لیے انتظار کرنا پڑا تھا۔ پچیس پیاسٹر زیادہ دے کر گویا میں اُس کا یہ احسان اُتارنا چاہتا تھا۔ میں دروازے تک پہنچا تو زور زور سے ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھول کر میں جیسے ہی باہر نکلا، ٹیکسی ڈرائیور مجھ پر برس پڑا: "کرایہ پاس نہیں ہوتا تو بیٹھتے کیوں ہو ٹیکسی میں! کب سے ہارن پر ہارن دے رہا ہوں مگر نواب صاحب نکلتے ہی نہیں! ارے بھئی ایسے رئیس کے جیسے پشتینی رئیس ہیں اور پھر ٹیکسیوں ہی میں بیٹھتے ہیں بلکہ پیدا بھی یہی...!"

"بس بس زیادہ بکواس نہیں!" میں اُس کے قریب پہنچ کر سخت لہجے میں بولا۔ "کرایہ لو اور چلتے پھرتے نظر آؤ!" میں نے دونوں نوٹ اُس کی طرف بڑھا دیے۔

اُس نے نوٹ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیے اور منہ بگاڑ کر کہا۔ "پچیس پیاسٹر واپس نہیں کروں گا!"

"وہ کیوں؟" مجھے اس پر غصہ آ گیا حالانکہ میں خود اُسے زیادہ کرایہ دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔

"اس لیے کہ اتنی دیر ویٹنگ تو کی ہے میں نے!" یہ کہتے ہی اُس نے تیزی کے ساتھ ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ اگر میں اُچھل کر پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو اُس کی لپیٹ میں آ گیا ہوتا۔ اُسے یقیناً یہ غلط فہمی تھی کہ میں اُسے نہیں پکڑ سکوں گا۔ ہر چند کہ مجھے یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ ایک معمولی ٹیکسی والے سے جھگڑا کرتا لیکن غصے میں آدمی ایسی باتیں بھول جاتا ہے۔ غصہ یوں بھی عقل خبط کر دیتا ہے۔ وہ میرے ساتھ اتنی بدتمیزی کر سکتا ہے اور زبردستی رقم چھین کر لے جا سکتا ہے تو کوئی غریب اور کمزور آدمی بھی اُس سے بے عزتی اور نقصان اُٹھا سکتا ہے۔ اُس وقت مجھے بس یہی خیال آیا تھا جو دوسرے ہی لمحے میں ٹیکسی کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

وہ اُس گلی سے نہیں نکل پایا تھا کہ میں اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ "تم شاید اس خیال میں ہو گے کہ پچیس پیاسٹر لے کر فرار ہو جاؤ گے!" میں نے ٹیکسی کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ ٹیکسی کی رفتار اس وقت چالیس میل سے کم نہیں تھی۔ مجھے اس رفتار سے دوڑتے دیکھ کر اُس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے، مگر اسی کے ساتھ اُس نے مزید رفتار بڑھا دی۔ رفتار بتانے والی سوئی پچاس سے اُوپر جانے لگی، لیکن ظاہر ہے کہ مجھ پر اس سے کیا فرق پڑتا۔ میں بدستور ٹیکسی کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ ٹیکسی اب گلی سے نکل کر سڑک پر مڑ گئی تھی۔ مڑتے ہوئے

اُس کے بریک زور سے چیخے تھے کیوں کہ اُس نے رفتار میں بس تھوڑی سی کمی کی تھی۔ وہ اب بار بار خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔

"میں جہنم تک تمھارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا احمق آدمی!" میں نے اُسے پھر مخاطب کیا۔ "خیریت چاہتے ہو تو ٹیکسی روک کر مجھ سے معافی مانگ لو اور پچیس پیاسٹر واپس کر دو۔"

سڑک پر پہنچتے ہی اُس نے رفتار میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ ٹیکسی کی رفتار اب ستر میل فی گھنٹا تک پہنچ گئی تھی۔ اتنی تیز رفتاری سے دوڑنا ظاہر ہے کہ کسی آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ غالباً ٹیکسی ڈرائیور اسی لیے منہ ہی منہ میں کوئی وظیفہ پڑھنے لگا تھا۔ شاید وہ مجھے کوئی بد روح سمجھ رہا تھا۔ "تم نہیں رُک رہے تو پھر یہ دیکھو میں کیسے روکتا ہوں تمھیں!" میں نے ذرا اور تیز قدم اُٹھائے، پھر ٹیکسی سے آگے نکل کر ایک دم مڑ گیا۔ ٹیکسی اپنی پوری رفتار سے میری طرف آ رہی تھی۔ اتنی تیز رفتاری میں یک لخت موت کو دعوت دینا ہوتا ہے، مگر اس سے یہ حماقت سرزد ہو ہی گئی۔ پورے بریک لگنے کے سبب ٹیکسی اُلٹنے ہی والی تھی کہ میں نے اُسے اُلٹنے سے بچا لیا۔ میں نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا بونٹ پکڑ لیا تھا۔ ٹیکسی کو ایک جھٹکا سا لگا اور پھر اُس کا انجن بند ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی سمجھ چکا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا ہے، مگر میں نے ٹیکسی کو اُلٹنے سے کس طرح بچا لیا تھا؟ یہ سمجھنا اُس کے لیے محال ہی تھا۔ وہ تو اس بانتہ سا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اب تک ٹیکسی کے سامنے کھڑا تھا اور وہ سہمی سہمی سی نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور پھر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے بولا: "اب پھر مجھے وہیں چھوڑ کر آؤ جہاں سے تم بھاگے تھے! اور ہاں تمھیں وہاں چل کر مجھ سے اپنی گستاخی کی معافی بھی مانگنا ہے، اس کے علاوہ بقیہ پچیس پیاسٹر بھی واپس کرنا ہیں!"

"تت... تم مجھ سے اپنی ساری رقم وا... واپس لے لو... با... با... بس میری جان چھوڑ دو۔ مم... میں سمجھ گیا... سمجھ گیا ہوں کہ... کہ تم پُر... پُراسرار قوتوں کے مالک ہو اور... اور یقیناً تمھارے قبضے میں کسی فر... فرعون کی رُوح ہے!" یہ الفاظ اُس نے ڈرتی ہوئی آواز میں رُک رُک کر ادا کیے اور پھر شاید ہمت کر کے تھوڑا سا مڑا اور میری طرف ایک ہاتھ بڑھا دیا جس میں دو نوٹ تھے۔

"ہرگز نہیں!" اول تمھیں مجھ کو وہاں جا کر... سے گھر چھوڑنا پڑے گا۔ پھر معافی مانگنے کے ساتھ ہی تو یہ بھی [illegible] کسی مسافر کے ساتھ گستاخی سے پیش نہ آؤ گے۔" وہ [illegible]

اس سے پہلے میں تمھاری جان بخشی نہیں کروں گا!" اُسے مجبوراً میرا حکم ماننا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں اُس کی ٹیکسی سے اُتر رہا تھا۔ اُسے معافی بھی مانگنا پڑی اور توبہ بھی کرنا پڑی۔ پھر جب میں چلنے لگا تو اُس نے مجھے نرمی سے آواز دی: "سنیے!"

"ہوں!" میں نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس کے ہاتھ میں پچیس پیاسٹر کا ایک نوٹ تھا۔

"یہ اپنے پچیس پیاسٹر تو لیتے جائیے جناب!" اُس نے کہا۔

"یہ دوبارہ مجھے یہاں چھوڑنے کا کرایہ ہے۔ رکھ لو!" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"حیرت ہے!" مجھے اُس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ "زندگی بھر شاید اس ٹیکسی ڈرائیور کو مجھ سا کوئی مسافر نہیں ملا ہوگا۔"

گھر کا دروازہ مجھے کھلا ہی ملا۔ میں دبے پاؤں اندر پہنچا تو یمامہ کی آواز سنائی دی۔ وہ نبیلہ سے میرے ہی بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ یمامہ کی آواز مخالف سمت کے کمرے سے آ رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے یمامہ کو آواز دی: "یمامہ! میں آ گیا ہوں۔ دروازہ بند کر دو جا کر!"

"اچھا آقا!" جواب میں بارعب آواز سے بولی۔ میں اس کمرے کے دروازے میں داخل ہو گیا جو تو یا کچھ دن کے لیے میرا کمرا ہو گیا تھا۔ میں مسہری پر نیم دراز ہو کر یمامہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کے سوا ظاہر ہے کون رقم غائب کر سکتا تھا! مجھے اُس کی یہ حرکت بڑی گھٹیا سی لگی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بدکردار ہونے کے علاوہ احسان فراموش بھی تھی۔ آج ہی میں نے اس پر ایک بڑا احسان کیا تھا۔ اس کی نوجوان بیٹی نبیلہ کی آبرو ایک غنڈے سے بچائی تھی اور اس واقعے کو زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی مگر یمامہ نے جیسے یہ بات بھلا دی تھی۔ میں بھی اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ کمرے میں آ گئی۔ اس کے چہرے پر اب نقاب نہیں تھی۔ آتے ہی اُس نے کہا: "نبیلہ کہہ رہی تھی کہ تم نے اُس سے کچھ رقم اُدھار لی ہے!"

"ہاں!" میں نے طویل سانس لیا، پھر بولا: "کیوں، کوئی اعتراض ہے تمھیں! میں واپس کر دوں گا!"

"نہیں، میں تو بس تصدیق چاہ رہی تھی۔ تم سمجھ رہے ہو نا!" وہ کرسی پر بیٹھ گئی، پھر بولی: "تم پہلے کہاں گئے تھے، خیر مجھے کیا..."

میں چونک کر سیدھا بیٹھا اور دانستہ سوال کیا: "کب؟"

"جانے سے پہلے اور کب!" اُس نے کہا۔ "میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر یہاں آئی تو تم غائب تھے یہاں سے۔" [illegible]

تو یمامہ نے مجھے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔" میں نے سوچا۔ یہی میں اس سے معلوم بھی کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی بات سے ہی مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکا تھا۔ میرا ذہن پھر اسی مسئلے میں اُلجھنے لگا۔ "کیا سوچنے لگے تم...؟" مجھے خاموش دیکھ کر یمامہ نے ٹوکا۔

"کچھ نہیں!" میں جلدی سے بولا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ موجودہ ذہنی اُلجھن سے نجات پانے کے لیے میں شراب کا سہارا کیوں نہ لوں! یہ سوچ کر میں نے اُسے مخاطب کیا: "یمامہ! تم بتا رہی تھیں کہ تمھارے پاس شراب کی چھ بوتلیں موجود ہیں۔"

"ہاں، کیوں...؟"

"تو پھر لے آؤ سب!" میں نے کہا۔ "اس وقت مجھے شراب کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔"

"معاف کرنا شیفو! میں لے تو آتی ہوں لیکن رقم تمھیں ابھی وقت ادا کرنا ہوگی۔ یہ حیثیت میری انھوں سے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!" [illegible] کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"یمامہ!" میں تلخ اور بلند آواز میں بولا: "میں سب کچھ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اور کسی قدر دانستہ نظر انداز کر رہا ہوں لیکن تمھیں بھی ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مہمانوں سے نہیں [illegible] کرتے! سمجھ رہی ہو نا! ایسے [illegible] سے ہمیشہ بچنا چاہیے جب کسی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے!"

"مم... میں سمجھی نہیں کہ تم... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو!" وہ بظاہر [illegible]

"سمجھ نہ پاتی ہو تو سمجھا بھی سکتا ہوں مگر بات نہ بڑھے تو اچھا ہے۔ [illegible] نہ کرو اور جا کر شراب کی بوتلیں لے آؤ! چلو اٹھو!"

میرے لہجے میں یقیناً کوئی ایسی ہی بات تھی کہ پھر یمامہ کچھ نہ بولی اور [illegible] کھڑی ہوئی۔ میں نے جان بوجھ کر اُس سے رقم کے بارے میں استفسار نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے وہ کبھی تسلیم نہ کرتی کہ اُسی نے [illegible] اس صورت میں مجھے مجبوراً اور بدلے احساس کرانا پڑتا۔ اس [illegible] بہت آسان تھا لیکن اس طرح وہ [illegible] عورت کی بے حرمتی کیسے برداشت کرتا جس کے بیٹے [illegible] کے خدمت پیدا ہو چکے تھے۔ اس سے گفتگو کرنے [illegible] سے تبدیلی آ گئی تھی۔ مجھے اس پر بھی ملال ہو رہا تھا مگر [illegible] وہ اس قدر نامعقول بنتی جا رہی تھی [illegible] کہ مجھے رقم بھی واپس لانے اور میرے

کی بے عزتی بھی نہ ہو۔ اس کے لیے مجھے بہ مجبوری اپنی قوت کو استعمال کرنا پڑا تھا۔ وہ قوت جو ہر شخص سے اپنی بات منوا لیتی تھی، لیکن میں نے اُسی وقت قوت کا استعمال ضروری نہ سمجھا۔

یمامہ جب ایک ٹوکری میں غیر ملکی شراب کی بوتلیں لے کر آئی تو اس کا چہرہ کچھ اُترا اُترا سا تھا۔ یقیناً میری تلخی نے اُسے اُداس کر دیا تھا۔ "مجھے معاف کر دو یمامہ!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "مجھے تم سے اونچی آواز میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی!" اُس نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور پھر ٹوکری میز پر رکھ کر بغیر کچھ کہے پلٹ گئی۔ "کہاں جا رہی ہو یمامہ...؟" میں نے اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"ابھی آتی ہوں!" اُس نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ کچھ دیر بعد لوٹ کر آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اُسے شراب نوشی کے آداب کا علم تھا۔ ایک ٹرے میں دو گلاس، پانی سے بھرا ہوا جگ اور ایک پلیٹ میں بھنے ہوئے چوزے تھے جن پر نمک لگا ہوا تھا۔ مصر میں خشک میوہ نہیں ہوتا، ولایت سے منگوایا جاتا ہے۔ خشک میوہ وہاں بہت مہنگا ہوتا ہے اسی لیے صرف صاحب حیثیت افراد ہی استعمال کرتے ہیں۔ اُس نے جھک کر ٹرے میز پر رکھ دی، پھر تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی: "اگر تم کہو تو میں تمھارے لیے گوشت بنا دوں! قیمہ موجود ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"تم کہاں پریشان ہوتی پھرو گی، چھوڑو!" میں نے کہا۔ "آؤ بیٹھ جاؤ یہاں آ کر!"

"کیوں؟ تو پھر کھانا تو ہے۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ بلکہ [illegible] نبیلہ کو بھی کوفتے بہت پسند ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا!" اُس کی نظریں اب بھی جھکی ہی تھیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم بنا لو کوفتے! جب تم کوفتے بنا لو گی تو اس کے بعد ہی میں بوتل کھولوں گا۔ تمھارے بغیر لطف بھی تو نہیں آئے گا پینے میں!"

اُس نے میرے آخری الفاظ سن کر بڑی قاتل نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر جانے کے لیے مڑ گئی۔ اُس کی ذرا سی حماقت نے میرے اُس کے درمیان خواہ مخواہ تلخی پیدا کر دی تھی۔ اُس کے رویے میں اب پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ وہ چور چور سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں پہلے جو بے ساختگی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس فضا کو ختم ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا یہ کشیدگی کچھ اچھی نہیں۔ یمامہ اُسی وقت نبیلہ کی طرف فطرتاً سلیقے تھی جب اُس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو۔

یہ سوچ کر میں نے اِس معاملے کو اُسی وقت ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے اِس کا ذہن میرے طاقت ور ذہن کی گرفت میں تھا۔

وہ تمہارا محسن ہے یمامہ! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں خاموشی کے ساتھ اُس کی رقم واپس کوٹ کی جیب میں رکھ دینا چاہیے جب میرا ذہن یمامہ کے ذہن کو یہ ترغیب دے رہا تھا تو وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گئی۔

"مگر میں تو وہ رقم پڑوس میں رکھوا آئی ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔

تو کیا ہوا لے آؤ واپس۔ میرے ذہن نے اُسے مشورہ دیا۔

"ہاں مجھے یہی کرنا چاہیے۔" وہ میرے ذہن کے زیر اثر بڑبڑائی۔ "میں نے رقم چرا کر اچھا نہیں کیا۔"

لیکن تم خاموشی سے رقم واپس رکھ دو گی تو اُسے کچھ بھی خبر نہ ہو گی، تمہاری عزت بچ جائے گی۔ تم یہ کیوں بھول گئیں کہ رقم چوری ہو جانے کے بعد وہ تمہی پر شبہ کرے گا کیونکہ تمہی رقم چرا سکتی ہو۔ تم یہ تو دیکھ ہی چکی ہو کہ وہ کس قدر طاقت ور ہے! وہ تمہیں اقبالِ جرم پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔

بس اتنا کافی تھا۔ یمامہ فوراً ہی جیلہ کو باورچی خانے کا کام سپرد کر کے پڑوس میں چلی گئی۔ رقم لانے میں اُسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ واپس آئی تو میں نے اُسے آواز دے لی۔ میں اب اُسے رقم واپس رکھنے کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ "ہاں کیا بات ہے؟" وہ کمرے میں داخل ہوئی مگر اُس وقت رقم اُس کے پاس نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ رقم وہ اپنے کمرے میں رکھ کر آئی تھی تاکہ موقع پاتے ہی اُسے میرے کوٹ کی جیب میں رکھ دے۔

"مجھے ذرا باتھ روم جانا ہے، کدھر ہے؟" میں مسہری سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"آؤ میں تمہیں دکھا دوں۔" اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔ اس کے چہرے سے میری بات سن کر دبے دبے جوش کا اظہار ہونے لگا تھا غالباً اس کا سبب یہی تھا کہ اُسے رقم واپس رکھنے کا فوراً ہی موقع مل گیا تھا۔ میں اُس کے ساتھ صحن سے گزر کر ایک طرف بنے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی مخالف سمت میں باورچی خانہ بنا ہوا تھا جہاں مجھے جیلہ نظر آ رہی تھی۔ پھر جب میں کچھ دیر بعد دوبارہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو یمامہ اور جیلہ دونوں ہی کوفتے بنانے کے لیے جلدی جلدی سیخیں صاف کر رہی تھیں۔ باورچی خانے کی کھلی کھڑکی سے وہ مجھے دونوں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ مصری، اُن کبابوں کو کوفتے کہتے ہیں جو قیمے سے بنتے ہیں اور سیخ پر سینکے جاتے ہیں۔ شیش کباب، تکوں کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں ہی اُدھ پکے رکھے جاتے ہیں۔ یہ وضاحت میں نے اس لیے کی کہ کچھ ممالک میں کبابوں کو کوفتے نہیں کہا جاتا اور وہاں کوفتے دوسری طرح بنائے جاتے ہیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے شراب کی بوتلوں کا جائزہ لیا۔ یمامہ نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے یہاں اچھی شراب رکھتی ہے۔ پھر یمامہ میری توقع سے کچھ پہلے ہی گرم گرم کوفتے لے آئی۔ اب مجھے اُس کے چہرے پر پہلی ایسی کیفیت نظر آ رہی تھی اور مجھے اس کا سبب معلوم تھا۔ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ اتار چکی تھی۔ اُس نے رقم میرے کوٹ کی جیب میں رکھ دی تھی۔ اس نے جب کوفتوں کی پلیٹیں میز پر رکھ دیں تو میں نے کہا۔ "اُسے جیلہ کو بھی یہیں بلا لو، وہ بھی ساتھ ہی کھا لے گی۔"

"نہیں!" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں اُسے دے آئی ہوں اور وہ اپنے کمرے میں کھانا کھا رہی ہے اور یوں بھی ہمیں شراب پینا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ اُس کا یہاں ہونا اچھا نہیں رہے گا۔"

"خیر تم نہیں چاہتیں تو نہ سہی ورنہ شراب کھانا کھانے کے بعد بھی پی جا سکتی تھی۔"

"ضیغم! معلوم ہوتا ہے، تم اناڑی ہی ہو اس معاملے میں؟" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "کھانے کے بعد شراب نہیں پیتے۔ تم سمجھ رہے ہو نا! اس سے عموماً قے ہو جاتی ہے۔" وہ مجھے بالکل بچوں کی طرح سمجھا رہی تھی۔

"اچھا!" میں بھی بچہ بن گیا۔

"تعجب ہے کہ تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ تم دعویٰ کر رہے تھے کہ ساری شراب...!"

"وہ دعویٰ اپنی جگہ ہے۔" میں اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "مگر ایک شرط ہے، اپنے ہاتھ سے پلاؤ گی تم!"

"وہ کیوں؟" وہ سب کچھ جان کر انجان بن گئی۔

"تاکہ کم شراب میں زیادہ نشہ ہو جائے۔" میں نے براہِ راست اُن چھیلی سی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ نظریں نیچی کا لینے کا وہ انداز بھی قیامت ہی تھا۔ میں مسہری سے اُٹھ کر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو اُس نے کہا۔ "ضیغم! اب بوتل کھولو نا! کوفتے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا!" سلا مقصد موضوعِ گفتگو بدلنا ہی تھا مگر میں اس کی سمجھ یہ انکار نہیں تھا۔ "تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا!" میں نے اُسے اور چھیڑا۔ "پلاؤ گی اپنے ہاتھ سے؟"

"اگر تم... تم کہتے ہو تو... تو پھر ماننا ہی پڑے گی تمہاری بات!" وہ رک رک کر بولی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹوکری سے ایک بوتل نکال لی اور اُس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ "شکریہ یمامہ! اب مجھے شراب کی کمی کا افسوس نہیں ہو گا۔" ڈھکنا کھول کر میں نے بوتل اُس کی طرف بڑھا دی۔ "لو تمہی جام بناؤ۔"

اُس نے میرے ہاتھ سے شراب کی بوتل لے لی اور میرے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں تھوڑی سی شراب انڈیل کر ہاتھ روک لیا۔ "یہ تم کیا مذاق کر رہی ہو یمامہ!" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیوں؟" اُس نے اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"میرا گلاس اس قدر خالی کیوں چھوڑ دیا تم نے؟ بھر دو اسے!"

"کیوں، کیا پانی نہیں ملاؤ گے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پھر شراب ہی پینے کی کیا ضرورت ہے، پانی کیوں نہ پی لیا جائے۔"

"مجھے تو پانی ملانے کے بعد بھی بہت کڑوی لگتی ہے۔"

"تمہیں نہیں روکوں گا پانی ملانے سے! مگر مجھے پانی ملانے کی ضرورت نہیں۔" پھر ہم دونوں پینے لگے۔ وہ تو بس برائے نام ساتھ دے رہی تھی۔ میں مخمور لہجے میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ کچھ دیر تک میری باتیں سنتی رہی۔ پھر اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔ "تم... تم مجھے... پھر ایسی باتیں کر کے پاگل... پاگل کر دو گے۔ مجھے... مجھے اس وقت... وہ بہت یاد آ رہا ہے۔ وہ... وہ ظالم بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہ... وہی جو مجھے تنہا چھوڑ گیا اور... اور اپنے سارے وعدے بھلا دیے... ساتھ مرنے اور ساتھ جینے کے وعدے!" اس کی آواز بھرانے لگی۔ میں سمجھا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کا ذکر کر رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "یمامہ! کیا تمہیں واقعی اُس سے محبت تھی؟"

"ہاں میں نے اُسے چاہا تھا، اپنے آپ سے بھی زیادہ!"

اُس کا کردار مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ مجھے اسی لیے حیرت تھی کہ وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کرنے کے باوجود اُس سے محبت کا دم کیسے بھر رہی ہے؟ یہ تضاد کیسا ہے؟ میں نے اُس سے پھر ایک سوال کیا۔ "کیا تمہارا شوہر بھی تمہیں چاہتا تھا؟"

"میرا شوہر!" وہ چونک اٹھی۔ "مگر... مگر میں اس وقت... اُس کا ذکر کب کر رہی تھی! میں تو... وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"تو پھر کیا وہ کوئی اور تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہ میرا شوہر نہیں، میرا محبوب تھا ظہیر نہیں ضیغم! تم سمجھ رہے ہو نا! اب اُس نے بڑی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا۔

"مگر تم نے کہا تھا کہ تم ضیغم سے محبت کرتی ہو۔" میں اُس کی الجھی ہوئی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے غلط نہیں کہا تھا کہ میں ضیغم سے محبت کرتی ہوں۔" وہ بولی اور پھر طویل سانس لیا۔ "میں نے تم سے ایک جھوٹ بول دیا تھا اور تمہی سے کیا، میں یہ جھوٹ سبھی سے بولتی آئی ہوں، اُن تمام لوگوں سے جو یہاں میرے مہمان رہے ہیں، مگر... مگر مجھے آج کیا ہو گیا ہے! میں یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں!" اس کا انداز خود کلامی کا سا ہو گیا۔ اچانک ہی اُس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "تم شراب پیو! میں بے سبب تمہیں اپنے دکھ سنانے بیٹھ گئی، مگر نہیں بے سبب کیوں، تمہی نے تو اُس کی سی باتیں شروع کر دی تھیں، ضیغم کی سی باتیں!" یہ کہتے ہوئے اُس نے بوتل اُٹھالی، پھر بولی۔ "تم اسکندریہ سے یہاں کچھ خوشگوار وقت گزارنے آئے ہو، میں اب کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی کہ تم بھی میرے دکھ سن کر اور جان کر ملول ہو جاؤ۔" اُس نے میرے گلاس میں شراب انڈیلی، پھر گلاس اٹھا کر میرے ہونٹوں کی طرف بڑھانے لگی۔ "لو پیو اور بھول جاؤ کہ میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔"

"میں خود غرض نہیں ہوں یمامہ!" میں نے اُس کے اداس چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اپنے رنج سنا کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے تم نے آج تک اپنے دکھ کسی سے نہیں کہے اور تنہا اندر ہی اندر دکھوں کی آگ میں سلگتی رہی ہو۔ میں اُس وقت تک نہیں پیوں گا جب تک تم مجھ سے اپنے دکھ نہیں کہہ دو گی؟"

"کیا کرو گے سن کر؟" اُس کے لہجے میں بے بسی سی تھی۔ "تم... تم سمجھ رہے ہو نا!"

"یمامہ! میں شاید تمہارے دکھوں کا مداوا تو نہ کر سکوں گا... لیکن... لیکن اُنہیں محسوس ضرور کر سکتا ہوں۔" میں بھی جذباتی ہو گیا۔

"اگر... اگر تم نے میرے دکھوں کو محسوس بھی کر لیا تو... تو اس سے کیا ہو گا!"

"اس سے تمہارے سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا یمامہ! کہہ دو، آج سب کچھ کہہ دو جو تم نے کسی سے نہیں کہا۔" میری بات سن کر اُس

نے خلافِ توقع اپنے سامنے رکھا ہوا شراب کا گلاس اٹھالیا اور پھر اُسے خالی کرکے ہی میز پر رکھا۔ اس کے بعد وہ بھرّائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "مجھے... مجھے تھوڑی سی پی لینے دو۔ پھر شاید... شاید مجھ میں ہمت پیدا ہوجائے اور... اور میں سچ بول سکوں۔"

"ٹھیک ہے، پیو۔" میں نے اُسے فوراً ہی سب کچھ کہہ دینے پر مجبور نہیں کیا۔ "دوسرا پیگ بنالو اپنے لیے! میں اپنا گلاس بھی خالی کر دیتا ہوں۔" اس نے میرے کہنے پر اپنے لیے دوسرا پیگ بنالیا اور میں نے دوسرا گلاس خالی کرکے اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تم... تم واقعی بہت پیتے ہو اور بہت تیزی کے ساتھ!" اس نے میرے خالی گلاس میں بوتل کی بقیہ شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ "یہ کوفتے بھی تو کھاؤ!"

"وہ تو کھاؤں گا، مگر میرا گلاس اب بھی خالی ہے، دوسری بوتل کھول لو۔" میں نے کوفتوں کی پلیٹ اپنی طرف سرکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی اُداسی تھی۔ اس نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر دوسری بوتل کھول لی اور میرا گلاس بھر دیا۔ پھر جب یامر نے دوسرا پیگ ختم کر دیا اور میں نے دوسری بوتل خالی کر دی۔ تو میں نے کہا۔ "اب تمہاری حسین نیلی آنکھوں میں ہلکے ہلکے سرخ ڈورے تیرنے لگے ہیں، میرا خیال ہے کہ اب تم سچ بول سکتی ہو! کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

"ہاں اب میں خود کو پہلے سے بہت بہتر محسوس کررہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ شراب کی حدت نے اس کے سرخ رخساروں کو مزید سرخ کر دیا تھا۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئی، پھر طویل سانس لے کر کہا۔ "سب سے پہلے تو میں تم سے یہ وضاحت کردینا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کا نام ضیغم نہیں ظہیر تھا۔ تم سمجھ رہے ہونا؟"

"لیکن تم نے تو ضیغم ہی بتایا تھا۔" میں نے شراب کا گھونٹ لیا اور گلاس خالی کر دیا۔

"جھوٹ بولا تھا میں نے!" اس نے اعتراف کیا۔ "تم سمجھ رہے ہونا!"

"اور یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔" میں نے کہا، پھر خود ہی جھک کر قریب رکھی ہوئی ٹوکری سے شراب کی تیسری بوتل نکال لی۔

"اس کی وجہ تم ضیغم سے میری محبت سمجھ سکتے ہو۔"

"تو ضیغم تمہارا شوہر نہیں محبوب تھا؟" میں نے بات کو واضح کرنے کی خاطر پوچھا۔

"ہاں وہ میرا محبوب تھا!" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"تو گویا 'تھا' سے یہی مطلب ہے کہ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں۔"

"ہاں اُسے اس کے ایک خواب نے قتل کر دیا تم سمجھ...؟"

"خواب نے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے کہا۔

"اُسے بڑے عجیب خواب نظر آتے تھے، ہمیشہ ہی سے! اور اسی لیے ہماری محبت بھی ایک خواب بن گئی، تم سمجھ رہے ہونا!" اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی، پھر خود ہی بولی۔ "مگر نہیں، تم اس طرح کچھ نہیں سمجھ پاؤ گے۔ اگر تم کہو تو میں ابتدا سے اپنی داستان بیان کر دوں تاکہ تم ہر بات کو اس کے پس منظر میں اچھی طرح سمجھ سکو!"

"مجھے خوشی ہوگی، اگر تم اپنے بارے میں مجھے ابتدا سے سب کچھ بتادو۔" میں بولا اور تیسری بوتل کا ڈھکن کھول کر اپنے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا، پھر اس سے کہا۔ "کہو تو تمہارے گلاس میں بھی تھوڑی سی شراب ڈال دوں، یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا کہ تمہارا گلاس خالی ہے تم آہستہ آہستہ میرا ساتھ دیتی رہو۔"

"ہاں ڈال دو۔" اس نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ غالباً اس کا ذہن ماضی کی یادوں میں گم ہوتا جارہا تھا۔ میں نے اس کے گلاس میں بھی کچھ شراب ڈال دی، پھر خود ہی پانی بھی ملایا اور بولا۔ "ایک گھونٹ لے لو اور پھر اپنی سرگزشت سنانے کا آغاز کر دو۔"

اس نے میرے کہنے پر ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھالیا اور ایک ہی گھونٹ میں نصف گلاس خالی کر دیا۔ غالباً اس کا سبب وہ بے چینی تھا جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ شراب کا گلاس میز پر رکھنے کے بعد اس نے اپنا گلا صاف کیا، پھر اپنے ماضی کے اوراق الٹنے لگی۔ "میں الاقصر کی رہنے والی ہوں۔ وہ الاقصر جس کی تاریخ قدیم اور عظیم ہے۔ تم سمجھ رہے ہونا؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ شہر قدیم شاہی مقبروں کے کھنڈرات کی وجہ سے مشہور ہے۔ مصر کے آثارِ قدیمہ میں ان کھنڈرات کا بھی شمار ہوتا ہے۔ یہی شہر کبھی 'ویلی آف کنگز' یعنی بادشاہوں کی وادی کہلاتا تھا۔ انگریز اسے لکسر کہتے اور لکھتے ہیں۔ یہی شہر شاہانِ مصر کا دارالخلافہ بھی رہ چکا ہے۔ یہاں قدیم تہذیبوں کے بہت آثار ہیں، قدیم مندر اور عبادت گاہیں۔" میں نے اپنے حافظے میں محفوظ اس شہر سے متعلق ساری باتیں بیان کر دیں پھر آخر میں کہا۔ "میں نے تمہارے شہر کے بارے میں کوئی اہم بات فراموش تو نہیں کی؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "تم نے صرف یہ نہیں کہا کہ وہ شہر بہت حسین ہے، بہت ہی خوب صورت!"

"بالکل تمہاری طرح! ہیں نا!" میں نے اس کی حسین آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ان آنکھوں میں اس وقت مجھے یادوں کا غبار سا اڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا، کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی وہ منظر نہیں دیکھتا جو نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ شاید یامر بھی اسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اس کا احساس مجھے یوں ہوا کہ تعریف سننے کا اس پر جو ردِعمل ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا۔

"ہاں تو میں تمہیں بتارہی تھی کہ الاقصر کی رہنے والی، میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کی نظریں اب بھی میری ہی طرف تھیں۔ "جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو میرے والدین اپنی عمر کی آخری منزلوں میں تھے کیونکہ میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب میری والدہ کی عمر چالیس سے تجاوز کرچکی تھی۔ میرے والد میری ماں سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے اس لیے وہ اور بھی کمزور و ضعیف تھے۔ میرے والدین اسی لیے یہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد میرے فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔ میرے والد اور والدہ دونوں ہی غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ساری زندگی انھوں نے غربت کا عذاب جھیلا تھا ان دونوں کی یہ خواہش تھی کہ ان کی اکلوتی بیٹی کو یہ عذاب نہ جھیلنا پڑے۔ تم سمجھ رہے ہونا!" یہ کہہ کر اس نے اپنا گلاس اٹھالیا۔

"غریب والدین کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی ہے۔" میں نے اس کی تائید میں کہا اور پھر اپنا گلاس بھی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

"ضیغم ہمارے ہی محلّے میں رہتا تھا اور وہ بھی میرے والدین کی طرح ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔ ہر چند کہ اس کی اور میری عمر میں خاصا فرق تھا ———— مگر اس کے باوجود میں اسے چاہنے لگی تھی، چپکے چپکے! نہ میں نے اس سے آج تک اظہارِ محبت کیا تھا، نہ اس نے! لیکن جب گھر میں ہر وقت میری شادی کے تذکرے ہونے لگے تو میں فکرمند سی رہنے لگی۔ اس فکرمندی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ضیغم غریب ہونے کی وجہ سے میرے والدین کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔" یامر اپنی داستانِ حیات بیان کرتی رہی اور میں توجہ سے سنتا رہا۔ "پھر مجھے ہی پہل کرنا پڑی۔ میں نے ضیغم سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، میں نے ضیغم سے اس وقت کہا تھا کہ اگر تم مجھے چاہتے ہو تو تمہیں میری خاطر بڑا آدمی بننا پڑے گا۔ اس وقت میری عمر سترہ سال تھی۔ میں نے ضیغم کو بتادیا تھا کہ میرے والدین کسی غریب آدمی سے میری شادی نہیں کریں گے۔ اس کے بعد سے ضیغم بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ سعودی عرب جارہا ہے تاکہ وہاں کوئی اچھی سی ملازمت حاصل کرکے خوب دولت کمانے کے بعد مصر لوٹے۔ اس کے کچھ دن بعد ہی وہ چلا گیا اور پھر بہت دن تک اس کی کچھ خبر نہ ملی۔ اسی دوران میں میرے والد کے ایک دوست نے اپنے بھتیجے کے لیے میرا پیغام دیا جو قاہرہ میں کسی بہتر ملازمت پر لگا ہوا تھا۔ انھوں نے میرے والد سے یہ بھی کہا کہ ان کا بھتیجا ظہیر، صاحبِ جائیداد، تعلیم یافتہ اور وکیل ہے۔ اگر میرے والد میری شادی اس سے کر دیں گے تو گویا میں شہزادی بن کر رہوں گی۔ میرے والد اور والدہ نے ظہیر کو دیکھے بغیر ہی یہ رشتہ منظور کر لیا اور یہی دن میری تباہی کا پہلا دن تھا۔ تم سمجھ رہے ہونا!" اس نے طویل سانس لیتے ہوئے پھر اپنا گلاس اٹھایا اور اسے خالی کرکے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کا مطلب سمجھ کر گلاس میں شراب انڈیل دی اور بولا "یہ چوتھا گلاس ہے اور تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم چار پیگ سے زیادہ کبھی نہیں پیتیں۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "مگر آج جانے کیوں بالکل نشہ نہیں ہورہا!"

"مگر تم یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ میرے ہاتھ سے پی کر تمہیں زیادہ نشہ ہوجائے گا۔" میں نے اسے چھیڑا تاکہ افسردگی کی فضا کچھ ختم ہو۔ میری توقع پوری ہوئی کیونکہ اس کے حسین ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ایک ہی گھونٹ تو پی تھی تمہارے ہاتھ سے!" وہ بولی۔

"تو اور پلا دوں؟"

"نہیں رہنے دو۔" یہ کہہ کر اس نے خود ہی اپنا گلاس اٹھاکر ایک گھونٹ لیا اور پھر اُسے میز پر رکھ دیا۔

"ہاں تم یہ کہہ رہی تھیں کہ تمہارے والدین نے ظہیر کو دیکھے بغیر رشتہ منظور کر لیا۔" میں نے اُسے دیکھ کر یاد دہانی کرائی۔

"مجھے یاد ہے کہ میں نے بات کہاں چھوڑی تھی۔" یہ کہہ کر یامر خلا میں گھورنے لگی۔ چند لمحے خاموشی کے بعد اس کی آواز پھر سنائی دی۔ "ضیغم کو سعودی عرب گئے ایک سال کے قریب ہوگیا تھا، لیکن اس نے اپنے گھر والوں کو بھی کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ یہی کیا، اس کے والدین بھی اس کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے۔ ممکن ہے ضیغم الاقصر میں ہوتا تو میں اپنے والدین سے اپنی ضد پوری کرالیتی کیونکہ وہ دونوں ہی مجھے

بہت چاہتے تھے۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ ضیغم جانے کب لوٹے اور لوٹے بھی یا نہیں؟ میں نے اپنے دل کی بات اپنی بوڑھی ماں سے کہہ دی اور پھر بہت پچھتائی۔ اس پچھتاوے کا سبب یہ تھا کہ میری ماں میری خوشی کی خاطر ضیغم سے میری شادی پر رضامند ہو گئی تھی۔ میری ماں نے ہی والد کو بھی ہموار کر لیا۔ انھوں نے اپنے دوست سے کچھ دنوں کی مہلت مانگ لی۔ پھر مہلت کے دن بڑھتے گئے۔ پانچ مہینے گزر گئے۔ انتظار کے تکلیف دہ اور روح فرسا پانچ ماہ، مگر ضیغم نہیں آیا۔ میرے والدین نے کہا تھا کہ ضیغم کے آتے ہی وہ میری شادی اُس سے کر دیں گے۔ پھر چھٹا مہینا شروع ہوا اور دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ اُدھر میرے والد شدید بیمار ہو گئے، اُدھر ان کے دوست نے اُن سے دو ٹوک جواب مانگا کہ وہ کب شادی کر دیں گے؟ کاش میں نے ضیغم سے بڑا آدمی بننے کے لیے نہ کہا ہوتا اور کاش میں نے پہلے ہی اپنے دل کی بات اپنے والدین کو بتا دی ہوتی۔ شدید بیماری؛ اُس پر ذہنی دباؤ۔ میرے والد نے ایک صبح مجھے اپنے پاس بلایا اور بولے کہ یمامہ! تو کب تک اُس کا انتظار کرے گی؟ اور وہ جو اپنے ماں باپ کو بھی بھول گیا۔ لوٹ کر اُن کی خبر نہ لی۔ کیا اُس نے تجھے بھی نہ بھلا دیا ہو گا؟ یہ میرا آخری وقت ہے میری بیٹی! میں چاہتا ہوں کہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنی بیٹی کا گھر بسا دوں۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ کیا تو اپنے بوڑھے باپ کی یہ آخری خواہش پوری نہیں کرے گی؟ اور پھر... پھر میں انکار نہ کر سکی۔ دو ہی ہفتے میں میری شادی ہو گئی۔ اس کے ایک ماہ بعد جب میں کچھ دن کے لیے اپنے والدین سے ملنے الاقصر آئی تو... تو مجھے ضیغم کی ماں نے ایک بند لفافہ دیا۔ میرا شوہر ظہیر بھی قاہرہ سے میرے ساتھ ہی الاقصر آیا تھا۔ میں نے ظہیر کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو مجھے ضیغم نے سعودی عرب کے شہر جدہ سے لکھا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد یہ اُس کا پہلا خط تھا۔ اس خط کے ساتھ ضیغم نے اپنی ایک تصویر بھی بھیجی تھی۔ مگر اس تصویر میں وہ اکیلا نہیں تھا اور اس کا سبب بھی اُس نے خط میں لکھا تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر وہ تصویر بھیجی تھی تاکہ میں اُس بچے کو دیکھ لوں جس کا ذکر اُس نے اپنے خط میں کیا تھا۔ تصویر میں اُس بچے کے والدین سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ضیغم اُس بچے کو گود میں اٹھائے ان دونوں کے درمیان کرسیوں کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ ٹھہرو! میں ابھی آئی۔" یمامہ بات کرتے کرتے ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہی تصویر لینے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔ "وہ... وہ میرے ضیغم کی یادگار ہے۔ اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں... کچھ... بھی نہیں... اس کے خط اور تصویر..." اس کی آواز بھرّا گئی۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ رو پڑے گی اسی لیے جلدی سے بولا "لے آؤ وہ تصویر اور وہ خط بھی جو تمھارے محبوب نے تمھیں لکھا تھا۔" وہ بغیر کوئی جواب دیے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے نہ وہ تصویر دیکھنے کی خواہش تھی نہ اس کے محبوب ضیغم کا خط پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے محض یمامہ کی دلجوئی کے لیے اس سے تصویر اور خط لانے کو کہہ دیا تھا۔ یمامہ کو لوٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک البم تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی وہ البم کے صفحات الٹنے لگی۔ پھر اس نے ایک صفحہ کھول کر البم میری طرف بڑھا دی۔ "یہ ہے وہ تصویر!"

"وہ خط نہیں لائیں؟" میں نے اس سے البم لیتے ہوئے پوچھ لیا۔

"جلدی میں مل نہیں رہا، ہو گا اُسی میں۔" اُس نے جواب دیا۔ "ذرا اطمینان سے تلاش کروں گی تو مل جائے گا۔"

میں نے اُس تصویر پر نگاہ ڈالی جو میرے سامنے تھی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ کمرہ ہی نہیں خود میرا وجود بھی اُس کے ساتھ تیزی سے گردش کرنے لگا ہے۔ تصویر میں وہ نوجوان عورت جو کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی، میری ماں تھی اور اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھا ہوا وجیہ شخص میرا باپ ہی ہو سکتا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان کرسیوں کے پیچھے جس بچے کو ایک شخص گود میں اٹھائے کھڑا تھا، وہ بچہ میں تھا۔

مجھے خود میرے ہی وجود کی حیرت سامانیاں ہلکان کیے ہوئے تھیں۔ یمامہ کے گھر میں میرا قیام محض ایک اتفاقی امر تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہاں کوئی ایسی تصویر ہو گی جس سے میرے ماضی کا کوئی رشتہ ہو گا۔ وہ تصویر دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں بیک وقت بہت سے

متضاد خیالات کا ہجوم تھا جو خود مجھ پر بھی پوری طرح واضح نہیں تھے۔ اچانک غیر متوقع طور پر جب کوئی ایسی بات سامنے آ جاتی ہے جو امکان میں نہ ہو تو کسی فیصلے تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ میری نظریں اس تصویر پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ اپنے والد کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اُن

کی چوڑی پیشانی اور چہرے کے نقوش سے ذہانت کا اظہار ہو رہا تھا۔ تصویر واضح اور صاف تھی۔ یمامہ نے اُسے یقیناً بہت احتیاط سے اور سنبھال کر رکھا تھا۔ پھر اگر یمامہ مجھے نہ ٹوکتی تو جانے کب تک میں یونہی اُس تصویر کو دیکھے جاتا۔ اُس نے شاید میرے چہرے سے میری بدلی ہوئی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"ضیغم!" اُس نے مجھے پکارا۔

"ہوں۔" میں چونک کر بولا۔

"کیا ہوا؟ تم اس تصویر کو کیوں مسلسل دیکھے جا رہے ہو؟"

"میں..." میں نے تصویر سے نظر ہٹا لی اور پھر اسی کے ساتھ مجھے صورتِ حال کا احساس ہو گیا۔ میں نے خود پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل تمھارے... تمھارے محبوب کو... تمھارے انتخاب کو دیکھ رہا تھا۔"

"تو پھر تمھیں کیسا لگا... کیسا لگا میرا انتخاب؟" اُس نے جذباتی لہجے میں سوال کیا۔ غالباً اُسے میری بات پر یقین آ گیا تھا۔

"یہ... یہ تصویر..." میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ دراصل ابھی خود میرا سوال مجھ ہی پر واضح نہیں تھا۔ میرا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ میں نے اُس کے سوال کو بھی نظر انداز کر دیا۔ پھر اُس سے پہلے کہ یمامہ کچھ کہتی میں دوبارہ بول اُٹھا۔ "تمھارا انتخاب یقیناً بہترین تھا، مگر... مگر تم نے شاید کہا تھا کہ یہ تصویر تمھاری شادی کے فوراً بعد ہی تمھیں ملی تھی!" میرا انداز تصدیق طلب تھا۔

"ہاں تقریباً شادی کے ایک ماہ بعد۔" اُس نے تائید کی۔ "میں اپنے شوہر ظہیر کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے الاقصر گئی تھی۔ یہ اب سے اٹھارہ انیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے!" یہ کہہ کر اُس نے طویل سانس لیا۔

"اٹھارہ انیس سال!" میں بڑبڑایا۔ یہ بات میرے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں تھی۔ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مجھے اُس خط کا خیال آیا جو اُس تصویر کے متعلق یمامہ کے محبوب ضیغم نے اُسے لکھا تھا۔ وہ خط یقیناً بہت اہم تھا۔ یمامہ نے بتایا تھا کہ اُس خط میں بہ طورِ خاص ضیغم نے میرا ذکر کیا تھا اور اسی لیے تصویر بھیجی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے یمامہ سے وہ خط دیکھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے وہ خط اپنی الماری کی سیف میں سنبھال کر رکھا تھا۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "وہاں نہیں ہے تو پھر..." وہ کچھ سوچنے لگی۔

"تو سیف میں نہیں ملا تمھیں وہ خط؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے جواب دیا۔ "دراصل میں اُسے نکال کر اکثر پڑھتی رہتی ہوں۔ شاید پچھلے ہی ہفتے سیف سے نکالا تھا اور... اور جب میں وہ خط پڑھ رہی تھی تو نبیلہ آ گئی تھی کمرے میں! ہاں یاد آ گیا... میں نے یقیناً اُس وقت وہ خط اپنے صندوق میں چھپا دیا تھا۔ ابھی دیکھتی ہوں جا کر۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

یمامہ کمرے سے چلی گئی تو میرا ذہن پھر اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ تصویر اب سے تقریباً انیس سال پہلے کی تھی۔ یقیناً اُس وقت تک مجھے اغوا نہیں کیا گیا تھا۔ ان انیس سالوں میں سے تقریباً چھ سال ایسے تھے جو میں نے پوری طرح ہوش و حواس میں گزارے تھے۔ مجھے فرار ہوئے تقریباً اتنا ہی عرصہ ہوا تھا اور یہ سارا عرصہ میں نے اپنے دشمنوں سے نبرد آزمائی میں گزارا تھا۔ میری زندگی کے تیرہ سال کہاں اور کس حال میں گزرے، اُس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔ انھی تیرہ برسوں کے دوران میں یقیناً میرے وجود کو ناقابلِ تسخیر بنایا گیا ہو گا۔ پہلے مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ میں اتنے طویل عرصے ہوش و بے ہوشی کی ملی جلی کیفیت سے دوچار رہا ہوں گا۔ یہ بات بھی سامنے کی تھی کہ اسی کے بعد ہی میرے والدین اور میرے بھائی کو اغوا کیا گیا ہو گا۔ اس وقت میرے بھائی کی عمر سات سال تھی، گویا جب اُسے اغوا کیا گیا تو وہ بھی تقریباً سال بھر کا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے بارہ سال چھوٹا تھا۔ میرا ذہن بہت سے نتائج اخذ کر رہا تھا۔ نتائج اخذ کرتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں سوچنے لگا کہ کاش ضیغم نے اپنے خط میں میرے والدین کے متعلق تفصیل سے لکھا ہو۔ میں اس طرح بہ آسانی اپنے گم شدہ ماضی کا سراغ لگا سکتا تھا۔ یمامہ کی واپسی تک میں انھی خیالات کے بھنور میں چکراتا رہا۔

یمامہ کامیاب لوٹی۔ اُسے وہ خط مل گیا تھا۔ میں نے بے تابی سے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ کاغذ بہت بوسیدہ تھا۔ میں نے احتیاط سے اُسے ہاتھ میں لیا۔ عبارت کی سیاہی بھی جگہ جگہ سے پھیکی پڑ گئی تھی اور کچھ لفظ تو بالکل ہی مٹ گئے تھے، لیکن مجموعی طور پر اُس عبارت کو پڑھنا ممکن تھا۔

خط کی عبارت عربی میں تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ عبارت پڑھنے لگا۔ "یمامہ میری زندگی! سلامت رہو! ایک طویل عرصے

کے بعد میرا خط پا کر تمہیں یقیناً حیرت ہوگی، مگر جانِ عزیز! اس کا ایک سبب تھا جو میں نے اب سے پہلے تمہیں خط نہیں لکھا۔ وہ سبب میرا عہد تھا جو میں نے خود اپنی روح سے کیا تھا۔ کہ جب تک کسی قابل نہیں ہو جاؤں گا یا کامیابی کے امکانات بالکل واضح نظر نہیں آنے لگیں گے، تمہیں یا کسی کو بھی خط نہیں لکھوں گا۔ نوید ہو تمہیں کہ بالآخر ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے بعد مجھے میری منزل ملنے والی ہے۔ اب ہمارے خواب پورے ہو جائیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا! بس اچانک ہو گیا ورنہ اب سے ایک ماہ پہلے تک میں اپنے مستقبل سے قطعی ناامید تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو کبھی الاقصر نہیں لوٹوں گا۔

میں نے یہاں اپنا مستقبل بنانے کے لیے جو طویل جدوجہد کی اور جو پریشانیاں اُٹھائیں... لکھ کر تمہیں پریشان... نہیں کرنا چاہتا۔ مختصراً اتنا لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک ماہ پہلے تک اپنے اخراجات پورے کرنے کے بعد میں صرف چار ہزار ریال جمع کر سکا تھا... جو... ہے کہ میرے اور تمہارے خوابوں کی تعبیر نہیں کہے جا سکتے۔ دو ماہ قبل اپنے ایک مقامی دوست کے توسط سے مجھے ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ بہت معقول تھی۔ اس تنخواہ میں زیادہ رقم بچا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اب طعام و قیام کا مناسب بندوبست بھی نوکری ہی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ مجھے گھریلو ملازم کی حیثیت سے جن لوگوں کے یہاں نوکری ملی ہے، وہ لوگ حال ہی میں ہندوستان سے سعودی عرب آئے ہیں۔ انھیں یہاں آئے صرف ڈیڑھ ماہ ہوا ہے۔ وہ ہماری ہی طرح ع... ہیں۔ میرے آقا کا نا... ہے اور وہ یہاں... کی طرف سے... ہیں۔ پہلے وہ اپنے ملک کی جانب سے ہندوستان میں یہی خدمات انجام دے رہے تھے اور اب اُن کا تبادلہ یہاں جدّہ... میں ہو گیا ہے۔ خیر اُن کا ذکر چھوڑو، مجھے تو دراصل اُن کے ایک سالہ بچّے کی بات کرنا ہے جو میرے لیے خوشیوں کا پیغام بن گیا ہے۔ اسی بچّے کی وجہ سے میں چند روز بعد ایک بڑی دولت کا مالک بننے والا ہوں۔ تمہیں تو خبر ہی ہے کہ میں بچپن سے ہمیشہ اچھے خواب دیکھتا آ... ہوں، مگر گزشتہ کچھ دن سے مجھے عجیب خواب نظر آ رہے ہیں۔ پہلے میں نے ان خوابوں کو محض خواب ہی سمجھا تھا لیکن اب مجھے ان کی حقیقت پر اسی طرح یقین آ گیا ہے جس طرح خود پر، تم پر اور اپنی محبت پر یقین ہے۔ کیا تم یقین کرو گی کہ گزشتہ بیس دن کے دوران میں انھی خوابوں نے مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ ان خوابوں کی تفصیل تو میں تمہیں ملاقات ہونے ہی پر بتاؤں گا، فی الحال وہ خواب سن لو جو میں گزشتہ سات دن سے مسلسل دیکھ رہا ہوں۔ مجھے خواب میں ایک صدا سنائی دیتی ہے کہ اگر میں اپنے خوابوں کو حقیقت بنانا چاہتا ہوں تو خواب میں دی جانے والی ہدایت پر عمل کروں۔ خواب میں مجھے اسی آشنا صدا نے ہدایت دی ہے کہ اب جو چاند کی سات تاریخ آئے، میں اپنے آقا کے ایک سالہ بچّے کو رات کے کسی بھی حصے میں گھر سے لے جا کر شہر سے سات میل دور چھوڑ آؤں۔ پھر جب میں ایسا کر کے لوٹوں گا تو مجھے اپنے آقا کے گھر سے سات گز پہلے ابوالہول کا ایک مجسمہ ملے گا۔ وہ مجسمہ ٹھوس اور اصلی سونے... ہو گا اور اُس کا وزن سات سیر ہو گا۔

اس خواب سے پہلے مجھے جو خواب نظر آتے رہے ہیں، اُن میں بھی مختلف ہدایات دی جاتی رہی ہیں جن پر عمل کر کے میرے دن پھر گئے ہیں۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ انھی خوابوں کی... پر عمل کر کے میں اب تک تقریباً پندرہ ہزار ریال کا مالک بن چکا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ مجھے اپنے اِس آخری خواب پر بھی پورا یقین ہے جو مجھے سات دن سے متواتر نظر آ رہا ہے۔ اگر میں نے خواب میں دی جانے والی ہدایت پر عمل کیا تو یقیناً مجھے سونے کا وہ مجسمہ مل جائے گا جس کا وزن سات سیر ہو گا۔ اپنا یہ خواب پورا ہونے کے بعد میں فوراً سعودی عرب سے مصر کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ میرا انتظار کرو یمامہ، میں بہت جلد آ رہا ہوں۔ تمہارا... ضیغم۔"

خط کی عبارت کے جو الفاظ یا حروف مٹ گئے تھے، میں نے اُن کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ وہ خط میں نے ایک بار پڑھ کر دوبارہ پڑھا اور جو الفاظ مٹ گئے تھے، اُن کے متعلق غور کرنے لگا۔ اُس خط نے میرے وجود میں ہیجان سا برپا کر دیا تھا اس لیے کئی مٹے ہوئے الفاظ کے نعم البدل تلاش نہ کر سکا۔ مجھے اپنے والد کے بارے میں جو چند اہم باتیں معلوم ہو سکتی تھیں، وہ بھی لفظ مٹنے کے سبب معلوم نہ ہو سکیں، مثلاً اُن کا نام اور یہ کہ وہ اپنے ملک کی جانب سے کس حیثیت میں ہندوستان گئے تھے اور یہ کہ سعودی عرب میں اُن کی کیا حیثیت تھی۔ ضیغم نے یقیناً اپنے خط میں یہ دونوں باتیں لکھی تھیں مگر لفظ مٹ جانے کی وجہ سے یہ باتیں راز ہی رہیں۔ میں صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ میرے والد کا تعلق کسی عرب ملک سے تھا اور یہ کہ وہ اس ملک کی سرکاری ملازمت میں تھے۔ لفظ "تبادلہ" اس طرف واضح اشارہ کرتا تھا۔

معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ یمامہ نے یہ خط سیکڑوں بار پڑھا ہے۔ جو حروف اور الفاظ مٹ گئے ہیں، وہ اُن کے بارے میں بتا سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے یمامہ کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ وہ میری ہی طرف متوجہ تھی۔ میں نے اُسے مخاطب کیا: "یمامہ! یہ... یہ اس خط میں جو الفاظ بالکل مٹ گئے ہیں، کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کیا تھے؟" یہ

کہتے ہوئے میں نے وہ بوسیدہ خط اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"دکھاؤ، شاید میں بتا سکوں۔" اُس نے احتیاط کے ساتھ خط میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اُس کا جواب سن کر مجھے کچھ امید بندھی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یمامہ نے عبارت پر نگاہ جما دی، پھر اُسے پڑھنے لگی۔ میں نے اُس سے کہا: "ذرا مجھے بھی سناتی جاؤ دوبارہ۔ ممکن ہے جو لفظ پڑھے نہیں جا رہے، اس طرح سمجھ میں آ جائیں۔"

وہ میری ہدایت پر عمل کرنے لگی اور پھر چند سطریں پڑھنے کے بعد بولی: "ہاں یہاں... روشنائی اُتر گئی ہے، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بات تو واضح ہے۔ غالباً یہاں لفظ 'انھیں' لکھا ہو گا۔ سمجھ رہے ہو نا تم! یعنی جو پریشانیاں اُٹھائیں انھیں لکھ کر تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ اس میں کون سی مشکل ہے!" اُس نے میری جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"آگے تو پڑھو!" میں جلدی سے بولا۔ "وہ حصہ جہاں ضیغم نے اپنے آقا کا ذکر کیا ہے۔"

"ہاں وہ... وہ یہ... یہاں ہے۔" یمامہ خط کی عبارت پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ پھر وہ خط کی عبارت پڑھنے لگی۔ "وہ ہماری ہی طرح... یہاں یقیناً 'ب' مٹ گیا ہے۔ ضیغم نے لکھا تھا کہ وہ ہماری ہی طرح عرب ہیں۔ پھر اُس نے لکھا ہے۔ میرے آقا کا نا..." وہ کچھ سوچنے لگی، پھر بڑبڑانے لگی: "یہاں کوئی نام تو تھا، مگر یاد نہیں آ رہا۔"

"ذہن پر زور دو یمامہ، شاید یاد آ جائے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ مگر کافی دیر سوچنے اور یاد کرنے کے باوجود بھی یمامہ کچھ نہ بتا سکی۔ میرے بار بار اصرار پر وہ کسی قدر اُلجھی اُلجھی سی نظر آنے لگی۔ آخر وہ بیزار سے لہجے میں بولی: "ہو گا کچھ! چھوڑو نا! تمھیں کیا!"

"اچھا خیر چھوڑو۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "تم کہہ رہی تھیں کہ ضیغم کو اُس کے خواب نے قتل کر دیا۔ کیا یہ خط لکھنے کے بعد وہ تم سے ملا تھا؟"

"ہاں ملا تھا اور... اور وہ آخری ملاقات تھی ہماری!" یمامہ اُداس ہو گئی۔

"ذرا تفصیل سے بتاؤ، یہ ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"

"میں ہفتہ بھر الاقصر رہ کر اپنے شوہر خبیر کے ساتھ واپس قاہرہ آ گئی۔" یمامہ بقیہ واقعات بیان کرنے لگی۔ "مجھے قاہرہ پہنچے تین چار دن ہی ہوئے تھے کہ ضیغم مجھے ڈھونڈتا ہوا قاہرہ آ گیا۔ اُس وقت خبیر گھر پر نہیں تھا۔ میں ضیغم کی اچانک آمد سے گھبرا گئی۔ اُسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا، مگر اس کے باوجود وہ مجھے اب بھی قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ اُس نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں خبیر سے طلاق لے لوں اور میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس کی تجویز مان لی، لیکن وہ فوری طور پر ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ قاہرہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس ملاقات میں ضیغم نے مجھے بہت سی عجیب باتیں بتائیں جو میرے لیے ناقابلِ یقین سی تھیں، وہی خوابوں کی باتیں جن کا ذکر اُس نے اپنے خط میں بھی کیا تھا۔ اُس کے قاہرہ آنے کا سبب میرے علاوہ ابوالہول بھی تھا۔ اُس نے..."

"ابوالہول!" میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے اسی لیے اُس سے وضاحت چاہی۔

"شاید اس طرح تم کچھ نہ سمجھ سکو۔ میں ابتدا سے بتاتی ہوں، وہ ساری باتیں جو مجھے ضیغم سے معلوم ہوئیں۔" یمامہ نے کہا۔ "مجھے خط لکھنے کے بعد اُسے جو عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے، اُس نے تفصیل کے ساتھ مجھ سے بیان کیے تھے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"ہاں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم کہتی رہو۔"

پھر یمامہ مجھے تفصیل کے ساتھ وہ تمام واقعات بتانے لگی جو اُسے ضیغم سے معلوم ہوئے تھے۔ ضیغم کو علم تھا کہ وہ خواب میں دی جانے والی ہدایت پر عمل کرنے کے بعد خطرے سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس کا سعودی عرب میں قیام ممکن نہیں ہو گا۔ اُس بچّے، یعنی میری گمشدگی کے بعد اُسی پر شبہ کیا جاتا۔ ضیغم نے اسی لیے پہلے سے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور سعودی عرب سے روانگی کے متعلق اُس نے ضروری کاغذات پہلے ہی تیار کرا لیے تھے۔ ہوائی جہاز سے مصر جانے کے لیے اُس کی سیٹ بھی ریزرو ہو گئی تھی۔ وہ اُسی شب سعودی عرب چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

مقررہ شب اُس نے بہت ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ اُس نے اپنے آقا یعنی میرے والد اور میری والدہ کو بے ہوشی کی دوا سنگھا دی، پھر مجھے گود میں اُٹھا کر خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ اُس وقت نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جدّہ کے گلی کوچے اُس کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ اسی لیے بغیر کسی دقت کے شہر سے باہر نکل گیا۔ ساتویں سنگِ میل کے قریب پہنچ کر اُس نے مجھے سڑک سے کچھ فاصلے پر کپڑا بچھا کر لٹا دیا۔ مجھے بھی اُس نے بے ہوشی کی دوا سنگھا رکھی تھی تاکہ میں جاگ کر رونے نہ لگوں۔ اس کے بعد وہ اپنے آقا کے گھر کی طرف لوٹ گیا۔ واپس آنے کے بعد گھر سے سات گز پہلے ہی وہ رُک گیا، مگر خلافِ توقع اُسے ابوالہول کا وہ مجسمہ نہ ملا جس کی اُسے توقع تھی۔ قریب و دُور سونے کا وہ مجسمہ اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ اُس نے سامنے مکان کا چکر لگایا مگر ناکام رہا۔ اب صبح ہونے

میں صرف گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا اور ماس کی خلاصی کا وقت بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ شاید خواب میں دی جانے والی ہدایت پر عمل کرنے میں اُس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے یا پھر وہ خواب ہی سچا نہیں تھا۔ وہ مجھے شہر سے سات میل دور چھوڑ آیا تھا اور اب یہ ممکن نہیں تھا کہ صبح ہونے سے پہلے دوبارہ مجھے وہاں سے اُٹھا لاتا۔ جو کچھ ہو چکا تھا، اُس کا تدارک اب ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً ضیغم اپنے آقا کے گھر سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔

سعودی عرب کے شہر جدہ سے الاقصر پہنچ کر ضیغم کو یمامہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ پھر جب اُس شب وہ سویا تو خواب میں اُسے وہی آشنا صدا سنائی دی۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس نے خواب میں دی جانے والی ہدایات پر مکمل عمل نہیں کیا اسی لیے اُسے ابوالہول کا وہ مجسمہ نہیں ملا جس کا وزن سات سیر تھا اور جو خالص سونے کا تھا۔ اُس سے کیا غلطی ہوئی تھی، اُس کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ اُس سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنی غلطی کا تدارک چاہتا ہے تو نئی ہدایات پر عمل کرے، اُسے سونے کا مجسمہ مل جائے گا۔ اُس کے بعد ضیغم کو جو ہدایات دی گئیں وہ یہ تھیں کہ وہ فوراً الاقصر سے قاہرہ روانہ ہو جائے۔ قاہرہ پہنچنے کے بعد سات دن تک روزانہ اُسے ٹھیک سات بجے شام ابوالہول کے مجسمے سے سات قدم دور کھڑا ہونا تھا۔ اُسے مجسمے کے سامنے روزانہ سات گھنٹے کھڑا رہنے کی ہدایت ملی تھی۔ اس دوران میں اُسے وہاں سے نہیں ہٹنا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ اگر اُس نے ہدایات پر مکمل عمل کیا تو کسی بھی روز سونے کا مجسمہ مل جائے گا۔

ضیغم، خواب میں دی جانے والی ہدایت کے مطابق فوراً ہی الاقصر سے قاہرہ روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر یمامہ سے ملا۔ یمامہ کا پتا اُس نے الاقصر ہی میں یمامہ کے والدین سے حاصل کر لیا تھا۔ اُس کے سر سے ابھی تک عشق کا بھوت نہیں اُترا تھا۔ وہ ہر قیمت پر یمامہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اسی لیے یمامہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔ یمامہ بھی اُسے اب تک نہ بھول سکی تھی، اسی لیے فوراً اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے راضی ہو گئی۔

ضیغم نے اوّل تا آخر یمامہ کو تمام واقعات سے آگاہ کر دیا اور کہا کہ سونے کا مجسمہ حاصل کرنے کے بعد ہی تجویز پر عمل کیا جائے گا۔ ضیغم نے وہ پورا ہفتہ وہیں قاہرہ میں گزارا۔ اس دوران میں وہ برابر یمامہ سے ملتا رہا اور خواب میں دی جانے والی ہدایت پر بھی عمل کرتا رہا۔ پھر ساتواں دن آ گیا۔ اُس دن ضیغم آخری بار یمامہ سے ملا۔ پھر ان دونوں

کی ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس کے بعد ضیغم زندہ نہیں رہا تھا لیکن یمامہ کو اُس کے مرنے کی خبر کئی دن بعد مل سکی تھی۔

ضیغم کی لاش، ابوالہول کے مجسمے کے سامنے ساتویں شب کی صبح اس حالت میں پائی گئی تھی کہ اُس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ اُس کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی تھی اور وہی اُس کی موت کا سبب بنی تھی۔ جن لوگوں نے ضیغم کی لاش دیکھی تھی، انھوں نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ ضیغم کے لباس کی جیبوں سے جو کاغذات پولیس کو ملے، اُن سے سراغ ملا کہ ضیغم کسی ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ پولیس اُس ہوٹل تک پہنچ گئی۔ ضیغم نے جانے کس مصلحت سے ہوٹل میں اپنا نام غلط لکھا دیا تھا اور پھر وہ پتا بھی غلط ہی ثابت ہوا جو ہوٹل کے رجسٹر میں لکھا گیا تھا۔ ضیغم نے خود کو اسماعیلیہ کا باشندہ ظاہر کیا تھا۔ مصر کا یہ شہر پورٹ سعید اور سوئز کے درمیان واقع ہے۔ پولیس نے اُس پتے پر رابطہ قائم کیا تو وہ غلط نکلا۔ کیس الجھ گیا تو پولیس نے مزید چھان بین کی۔ پولیس، ضیغم کی لاش کو بہرحال اُس کے وارثوں تک پہنچانا چاہتی تھی۔ اسی دوران میں پولیس کو ضیغم کے سامان میں سے یمامہ کا پتا مل گیا اور یوں یمامہ کو ضیغم کے انتقال کی اطلاع ہوئی۔ یمامہ نے ضیغم کی لاش کو شناخت کر دیا جو سرد خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ یمامہ نے اپنے شوہر ظہیر کو صرف اتنا بتایا کہ ضیغم اُس کا ہم وطن تھا اور پردیس میں رہتا تھا۔ وہ کیوں قاہرہ آیا تھا اور اُس کے پاس یمامہ کا پتا کیوں تھا؟ اس سلسلے میں یمامہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ضیغم کے والدین کو مطلع کر دیا گیا اور وہ ضیغم کی لاش الاقصر لے گئے۔

یمامہ سے پورے واقعات سننے کے بعد بھی، میرا تجسس اپنی جگہ برقرار تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے یمامہ کو پھر کریدا۔

"ضیغم تم سے پورے ایک ماہ ملتا رہا تھا۔ کیا اُس نے اس دوران میں کبھی اپنے آقا کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

میرے اس سوال پر یمامہ کچھ حیران سی ہوئی۔ اُسے غالباً اِس پُراسرار واقعے کے پس منظر میں یہ بات بہت معمولی اور غیر اہم معلوم ہوئی تھی حالانکہ یہی بات میرے لیے انتہائی اہم تھی۔ یمامہ کو شاید مجھ سے یہ اُمید تھی کہ میں اُس کے محبوب کی پُراسرار موت پر حیرت اور افسوس کا اظہار کروں گا مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کچھ توقف اور میرے دوبارہ سوال کرنے کے بعد اُس نے جواب دیا۔ "اوّل تو یہ اتنی اہم بات نہیں تھی کہ میں اُس سے اِس سلسلے میں کچھ پوچھتی۔ دوم یہ کہ اُس نے کچھ کہا بھی ہوگا تو مجھے یاد نہیں۔"

"کیا تمھاری نظر میں یہ کوئی اہم بات نہیں کہ ایک بچے کو یوں اغوا کر کے آبادی سے دُور پھینک دیا گیا؟" میں نے کہا۔

"لیکن تم تو اُس بچے کے والدین۔۔۔"

"ہاں کیوں نہیں!" میں اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کیا وہ قابلِ رحم نہیں؟ اُن پر کیا گزر رہی ہوگی!"

وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ضیغم نے واقعی دولت کے لالچ میں غلط قدم اُٹھایا تھا مگر۔۔۔ مگر وہ خود۔۔۔ خود بھی تو جان سے گزر گیا اور۔۔۔ اور شاید یہ قدرت کا انتقام تھا۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ یمامہ مجھے جو کچھ بتا چکی ہے، اُس کے سوا کچھ اور نہیں بتا سکے گی۔ میں نے اسی لیے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اب میں تنہائی میں اِن واقعات پر غور کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے یمامہ سے کہا۔ "وقت بہت ہو گیا ہے، اب تم جا کر سو جاؤ۔ میں بھی اب سوؤں گا۔"

میری بات سُن کر اُس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہونے لگا۔ وہ میری طرف اپنی نیلی نیلی خمار آلود آنکھیں اُٹھا کر ناقابلِ یقین سے لہجے میں بولی۔ "کیا واقعی میں۔۔۔ میں چلی جاؤں؟"

"ہاں۔" میں نے اُس سے نظر چراتے ہوئے جواب دیا حالانکہ اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ پھر میں نے موضوعِ گفتگو بدلنے کی خاطر کہا۔ "ہاں کل کے لیے شراب کا بندوبست بھی کر لینا۔ دو چار کریٹ اکٹھے منگوا لو تاکہ روزانہ۔۔۔"

"مگر وہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

میں اُس کے لہجے سے سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں اسی لیے اُٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ کوٹ کی جیب سے میں نے خاصی بڑی رقم نکال کر اُس کے حوالے کر دی۔

"اب ٹھیک ہے، میں کل ہی منگوا لوں گی۔" نوٹ گن کر اُس نے اپنے گریبان میں رکھتے ہوئے کہا اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس شب مجھ پر یقیناً یمامہ کے حسن کا جادو چل جاتا اگر اُس نے وہ تصویر مجھے نہ دکھائی ہوتی۔ اُس تصویر کو دیکھ کر اور پھر بقیہ واقعات جاننے کے بعد میرے تمام رومانی جذبات سرد پڑ گئے تھے۔ میں اب تنہائی چاہتا تھا مگر یمامہ میرے اندر کی پکار سے ناآشنا تھی، غالباً اسی لیے وہ حیرت زدہ تھی۔ اب تک یمامہ کے یہاں قیام کرنے والوں میں سے کسی نے شاید یوں ٹھکرانے کی ہمت نہیں کی ہوگی۔ یمامہ نے جاتے جاتے کئی بار میری طرف مُڑ کر دیکھا کہ شاید میں اُسے روک لوں، لیکن میں تو کہیں اور ہی پہنچ چکا تھا۔ میں وہاں تھا ہی کب جو اُسے روکتا۔ آخر کار وہ چلی ہی گئی۔

یمامہ سے اپنے اغوا کے متعلق مجھے جو واقعات معلوم ہوئے تھے، اُن کی روشنی میں میرے لیے یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں تھا کہ ضیغم کو آلۂ کار بنایا گیا تھا۔ پھر جب مجھے اغوا کرانے والوں کا مقصد حل ہو گیا تو انھوں نے ضیغم کو بھی راستے سے ہٹا دیا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً اُن واقعات کو پُراسرار ہی سمجھتا، لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میں تو خود حیرت انگیز اور پُراسرار قوتوں کا مالک تھا اور ان قوتوں کا استعمال بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ جن دنوں ضیغم کو وہ خواب نظر آتے رہے، یقیناً وہ کسی طاقت ور ذہن کے زیرِ اثر ہوگا۔ ہر ہدایت میں سات کے ہندسے کی تکرار اُن خوابوں کو پُراسرار ثابت کرنے کے لیے ہی ہو سکتی تھی۔ ضیغم کی موت بہ ظاہر دماغ کی نس پھٹ جانے سے واقع ہوئی تھی، لیکن میں خود ایک امریکی ایجنٹ کو اسی طرح قتل کر چکا تھا۔ ضیغم جس طاقت ور ذہن کے زیرِ اثر ہوگا، اُس نے ضیغم کے ذہن کو زبردست جھٹکا دیا ہوگا۔ ضیغم کو ہلاک کرنے کا مقصد میرے اغوا پر پردہ ڈالنے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ ضیغم یقیناً اپنی موت نہیں مرا بلکہ اُسے قتل کیا گیا تھا۔ وہ جس نے خود میرے وجود میں اتنی حیرت انگیز قوتیں بیدار کر دی تھیں، اُس کے لیے یہ سب کچھ کرنا یقیناً آسان ہی رہا ہوگا۔

میرے ذہن نے بہت جلد مطلوبہ نتائج اخذ کر لیے مگر اس معاملے میں ابوالہول کا ذکر مجھے عجیب سا لگا۔ ضیغم کو کہیں بھی قتل کیا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ وہ ابوالہول کے مجسمے کے سامنے ہی قتل کیا جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس معاملے کو مزید پُراسرار بنانے کے لیے ایسا کیا گیا ہو۔ میں نے اِس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

وہ تصویر جس میں اپنی ماں کی گود میں تھا اور جو مجھے ایک

امریکی ایجنسی نے بھیجی تھی، وہ ہندوستان کے شہر دہلی کی تھی اور وہیں کھینچی گئی تھی۔ بنیامین نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ حال ہی میں میرے والدین ہندوستان سے سوڈان عرب پہنچے تھے، اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے اغوا کرانے والے پہلے ہی سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں شاید انھیں موقع نہیں ملا تھا کہ مجھے اغوا کر سکتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب انھوں نے میرے والدین کو اغوا کیا ہو تو ان کے پاس سے انھیں یہ دو تصویریں ملی ہوں۔

میں کافی دیر انھی خیالات پر غور کرتا رہا، جو لفیہ شراب تھی وہ بھی اسی دوران میں ختم ہو گئی۔ یاسمہ کے البم میں وہ تصویر دیکھ کر مجھے جو امید بندھی تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ میں اپنے ماضی کے بارے میں یہ دستاویز تاریکی میں تھا۔ مجھے صرف اتنا علم ہو سکا تھا کہ کب، کہاں اور کس نے مجھے اغوا کیا! لیکن یہ جان کر بھی میری بے چینی کم نہیں ہوئی۔ اپنے گم شدہ ماضی کی تلاش کا آغاز میں ہندوستان ہی سے کرنا چاہتا تھا۔ وہیں سے مجھے کچھ سراغ مل سکتا تھا، لیکن پہلے ابوالہول کا معما حل کرنا ضروری تھا۔ یہ معما حل کرنے کے لیے قاہرہ میں میرا قیام ناگزیر تھا۔

سوچتے سوچتے میرا ذہن اپنے دشمنوں کی طرف چلا گیا جو قاہرہ میں میرے قیام کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ اب ان میں سے صرف دو خطرناک ایجنٹ میرے مقابل تھے۔ ایک وہ گم نام لڑکی جو روسی ایجنٹ ہو سکتی تھی اور دوسرا تھیوڈ نکلس۔ ان دونوں ہی سے میں نبرد آزما ہو چکا تھا۔ دونوں ہی انتہائی چالاک اور ذہین تھے لیکن مجھے زیادہ خطرہ اس لڑکی کی جانب سے تھا جس نے دعویٰ عشق کیا تھا۔ اب تک جن خطرناک ایجنٹوں سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا، ان میں وہی ایسی تھی کہ مجھے اس سے بچنے کے لیے راہ فرار اختیار کرنا پڑی تھی۔ میں اسی پر بھی حیران تھا کہ اس نے مجھے کس طرح تلاش کیا۔

حالات پر غور کرتے کرتے میرا ذہن تھک گیا تو میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔ میں اٹھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، پھر بجلی بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی مجھے بستر پر دراز ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک میرے ذہن میں سنسناہٹ ہونے لگی اور میں چونک اٹھا۔ چند ہی لمحوں میں یہ سنسناہٹ اتنی بڑھ گئی کہ سر میں درد محسوس ہونے لگا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک بار بالکل ایسی کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ اس وقت جب میرے خالق پروفیسر نے مجھ سے رابطہ ذہنی قائم کیا تھا۔ کیا پروفیسر میرے ذہن سے پھر رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے؟ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے ہوں۔ اس کے ساتھ مجھے

وقت کرے ہے جنبش مزید

ہزاروں قارئین کے پسندیدہ قلم کار اور سینکڑوں خوبصورت تحریروں کے خالق ایم اقبال کا ایک اور تحفہ

ایک انمول شاہکار

جرزادے

مرد آید کہ ہر اساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

وقت اور حالات کے شعلے اپنی نمود نہاں نہیں لیے ہر وقت شکار کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے والا ہر شخص ان شعلوں کی لپیٹ میں آتا ہے۔ بعض لوگ ان شعلوں میں جل کر کندن ہو جاتے ہیں اور کچھ ان کی تپش سے جھلس جاتے ہیں

ماضی، حال اور مستقبل کی ایسی داستانِ مسلسل جس میں بہت سے شناسا چہرے نظر آئیں گے

آج ہی ایک خط لکھ کر طلب فرمائیں

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

فون: 7229762-7248599

ایک تیز گونج سی سنائی دینے لگی اور سر کا درد بڑھ گیا۔ مجھے انتہائی تکلیف محسوس ہو رہی تھی اور اب یقین ہو گیا تھا کہ پروفیسر میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے والا ہے۔ تمام علامات بالکل وہی تھیں، پھر وہ سنسناہٹ اور گونج میری توقع کے عین مطابق ختم ہو گئی اور ہلکی ہلکی ٹک ٹک کی سی آواز آنے لگی۔ چند لمحے بعد جب یہ ٹک ٹک ختم ہوئی تو پہلے ہی کی طرح میرے ذہن پر روشن حروف ابھرنے شروع ہو گئے۔ ان حروف سے میرے ذہن میں کچھ الفاظ بن رہے تھے۔ میں نے وہ روشن الفاظ پڑھنے کے لیے اور انھی پر اپنی توجہ مبذول رکھنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میں بند آنکھوں سے وہ روشن عبارت پڑھنے لگا جو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

اے میرے بچے! اے ابوالہول!

آخر تو اپنی ضد کب چھوڑے گا! تو کیوں چاہتا ہے کہ تیرے ماں باپ تیری خاطر تڑپا تڑپا کر مار دیے جائیں! کیا تجھے ان بے گناہوں پر بالکل ترس نہیں آتا! کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے یقین نہ ہو کہ وہ شدید دکھ میں ہیں! تجھے میں نے بتایا تھا کہ تیرا باپ چینیوں کی قید میں ہے۔ میں اس وقت تجھے اسی کا حال دکھانا چاہتا ہوں۔ مجھے آج ہی یہ فلم ملی ہے جو میں تیرے پردۂ ذہن پر منتقل کرنے والا ہوں۔ تو جب اس کی حالت دیکھے گا تو میرے کہے پر تجھے یقین آ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنی قسمت کا فیصلہ ابھی سے اور ضد چھوڑ دے۔ اسی میں تیری بہتری ہے اور تیرے والدین کی بھی بھلائی اسی میں ہے۔ تو نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا، پر میں نے اسے دیکھا ہے۔ تو اگر چاہے گا تو اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا جائے گا کہ وہ تیرا ہی باپ ہے جسے تو اس فلم میں دیکھے گا۔ اب تو وہ فلم دیکھ جسے دیکھ کر شاید تیرا دل پسیج جائے اور تو بغاوت سے باز آ جائے۔ تیرا خالق، تیرا پروفیسر

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ سارے روشن الفاظ محو ہو گئے اور چند لمحے کو میرے ذہن پر تاریکی سی چھا گئی۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور اس کے ساتھ ایک منظر میرے پردۂ ذہن پر نمودار ہو گیا۔

وہ ایک نیم تاریک سی تنگ کوٹھری تھی جس کے دروازے کی آہنی سلاخیں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ دروازے کے باہر دو مسلح فوجی رائفلیں کاندھوں پر رکھے پہرا دے رہے تھے۔ میں ان کے بھاری قدموں کی چاپ بھی سن رہا تھا۔ انھی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے کبھی کبھی کراہیں ابھر رہی تھیں۔ کراہنے کی آوازیں اسی کوٹھری سے آ رہی تھیں۔ میں نے ان مسلح فوجیوں کے چہرے غور سے دیکھے۔ وہ چینی ہی تھے۔ تجسس کا اظہار ان کے چہروں کے نقوش سے ہو رہا تھا۔ منظر بدل گیا اور سامنے سے تین باوردی فوجی آتے دکھائی دیے۔ ان سب کے چہروں سے سفاکی اور خشونت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اسی کوٹھری کے سامنے آ کر رک گئے۔ مسلح فوجیوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ آنے والوں میں سے ایک نے مسلح فوجیوں سے کوٹھری کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ دونوں پہرے داروں میں سے ایک نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔

پھر کوٹھری کا دروازہ کھلتے ہی کوٹھری کے فرش پر پڑا ہوا قیدی چیخ اٹھا۔ "نہیں... خدا کے لیے نہیں!" یہ الفاظ اس نے عربی زبان میں ادا کیے تھے۔ پھر یہی الفاظ وہ دنیا کی کئی اور زبانوں میں بھی دہرانے لگا۔ مختلف زبانوں میں اپنی بات دہرانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ اس کی بات کسی نہ کسی طرح سمجھ لی جائے۔ اس قیدی کی چیخیں سن کر کوٹھری میں داخل ہونے والے فوجی بے رحمی سے ہنسنے لگے۔ میں نے قیدی کے چہرے کو بہ غور دیکھا۔ اس پر جو کرب تھا، مجھے اس چہرے کو پہچانتے ہی کسی قدر دقت تو ہوئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے باپ ہی کا چہرہ ہو سکتا تھا۔ چہرے کی بناوٹ اور نقوش وہی تھے جو میں نے اس تصویر میں دیکھے تھے جسے یاسمہ نے مجھے دکھایا تھا۔ چوڑی پیشانی، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور کتابی چہرہ! چہرے کے بعد میری نگاہیں اس کے دونوں ہاتھوں پر پڑیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر کپڑے تک پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ شاید اس کے ہاتھ زخمی تھے۔

تینوں فوجیوں میں سے ایک نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر انھیں کوئی اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں فوجی میرے والد کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے میرے والد کے دونوں بازوؤں میں ہاتھ ڈال دیے اور انھیں سیدھا کھڑا کر دیا۔

"نہیں، میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتا! مجھے... مجھے قتل کر دو... گولی مار دو مجھے!" میرے والد پھر چیخنے لگے۔ ان کی چیخ پکار کا فوجیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ انھیں مضبوطی سے پکڑے ہوئے کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ تیسرا فوجی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کوٹھری سے نکل کر وہ ایک راہداری میں آ گئے۔ پھر وہ فوجی میرے والد کو ایک ایسے کمرے میں لے گئے جو شاید نت نئی اذیتیں دینے ہی کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک اور شخص موجود تھا جس کے جسم پر سادہ لباس تھا۔ میرے والد کے دونوں ہاتھ ایک آہنی شکنجے میں کس دیے گئے۔ پھر وہ سادہ لباس شخص ان کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی پٹیاں کھولنے لگا۔ وہ اب اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے سے قاصر تھے۔ ان کے دونوں ہاتھوں کی کہنیاں شکنجوں میں پھنسی ہوئی تھیں اور ہاتھ بالکل سیدھے اٹھے

ہوئے تھے۔ اس طرح ہاتھوں کو شکنجوں میں کسنے کا کیا مقصد تھا، یہ کچھ دیر بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا۔

سادہ لباس شخص نے دونوں ہاتھوں کی پٹیاں کھول دیں تو میں یہ دیکھ کر کانپ اٹھا کہ اُن کے ہاتھوں کا گوشت جگہ جگہ سے نُچا ہوا تھا۔ اُن کے ہاتھوں پر جگہ جگہ گہرے زخم تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر نہ تو کھال تھی نہ گوشت، ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہتھیلیوں کا گوشت بھی بڑی حد تک غائب تھا۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوتا تو شاید آنکھیں بند کر لیتا، لیکن یہ سب کچھ تو مجھے آنکھیں بند کرنے کے باوجود نظر آ رہا تھا۔ خواب بھی تو اسی طرح نظر آتے ہیں، آنکھیں بند کرنے کے بعد! مگر وہ کوئی خواب نہیں تھا۔

اُسی اذیت خانے میں ایک جانب اونچا سا اسٹول رکھا ہوا تھا۔ سادہ لباس شخص، پٹیاں کھول کر الگ ہٹ گیا تو ایک فوجی نے وہ اسٹول لا کر شکنجے کے بالکل سامنے رکھ دیا۔ اُس اسٹول کی اونچائی اتنی ہی تھی جس قدر میرے والد کے ہاتھ بلند تھے۔ اسٹول کی سطح میرے والد کی استخوانی انگلیوں سے مس ہو رہی تھی۔ اس منظر کو میں بڑے انہماک اور تجسس سے دیکھ رہا تھا، ہر چند کہ ابھی اس کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ اسی کمرے میں ایک جانب بڑی سی میز پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سادہ لباس والے کو اُس میز کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اُس میز پر عجیب عجیب سے آلات، شیشیاں، بوتلیں اور جانے کیا کیا سامان رکھا ہوا تھا۔ دائیں جانب میں نے ایک پنجرا بھی رکھا ہوا دیکھا۔ اُس پنجرے میں سات آٹھ چوہے دوڑتے پھرتے تھے۔ پنجرے کا دروازہ عجیب سا تھا اور خلافِ معمول بڑا بھی۔ دروازے کی دونوں جانب نیچے کی طرف دو گول آہنی پلیٹیں جڑی ہوئی تھیں۔ سادہ لباس والے نے وہ پنجرا اٹھایا اور اسٹول کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں فوجی اسٹول کے اِدھر اُدھر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

سادہ لباس والے نے وہ پنجرا لا کر اسٹول پر رکھ دیا۔ فوجیوں نے پنجرے کو میرے والد کے ہاتھوں کی بالکل سیدھ میں رکھا اور پھر اسٹول کو آہستہ آہستہ قریب کرنے لگے۔ میں نے اپنے والد کے چہرے پر انتہائی خوف کے آثار دیکھے۔ اُن کے دونوں اٹھے ہوئے ہاتھ اب پنجرے کی آہنی پلیٹوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ دونوں گول پلیٹیں، میرے والد کے ہاتھوں کے دباؤ سے اندر کی جانب کھسکنے لگیں۔ میرے والد کے دونوں ہاتھ ان سوراخوں میں داخل ہونے لگے جو آہنی پلیٹیں کھسکنے سے پیدا ہو گئے تھے۔ پنجرے میں جو چوہے تھے وہ میرے والد کے ہاتھوں پر ٹوٹ پڑنے لگے، مگر ابھی وہ صرف انگلیوں کی ہڈیوں ہی پر اپنے دانت گاڑ رہے تھے، کیوں کہ ابھی ہاتھوں کی انگلیاں ہی پنجرے میں داخل ہو سکی تھیں۔ پھر کچھ ہی دیر میں اُن دونوں گول سوراخوں سے میرے والد کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک پنجرے میں داخل ہو گئے۔ اُس کے بعد میں نے جو ہولناک منظر دیکھا وہ میرے لیے روح فرسا تھا۔ اُن چوہوں کو یقیناً انسانی گوشت کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ میرے والد کے منہ سے چیخیں نکلتی رہیں اور وہ آدم خور چوہے اُن کے ہاتھوں سے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے، یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔

بے ہوش ہونے کے بعد میرے والد کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تو وہ خوفناک کھیل ختم کر دیا گیا۔ سادہ لباس والے نے اُن کے دونوں بازوؤں میں انجکشن لگائے اور پھر ہاتھوں پر دوبارہ کوئی دوا لگا کر پٹیاں باندھ دیں۔ اُس دوا کے سبب زخموں سے بہنے والا خون رک گیا تھا۔ اُس کے بعد بے ہوشی ہی کی حالت میں میرے والد کو وہ فوجی اسی تنگ و تاریک سی کوٹھری میں پھینک آئے۔

اس کے بعد منظر بدل گیا اور مجھے اُنہی فوجیوں میں سے ایک کا چہرہ نظر آیا۔ وہ جیسے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اُس کی کرخت آواز سنی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ "اے ابوالہول! تو نے دیکھ لیا اپنے باپ کا حشر! اگر اب بھی تو نے خود کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم تیرے باپ کو ان آدم خور چوہوں کی خوراک بنا دیں گے، مگر ایک دم نہیں، اسی طرح آہستہ آہستہ!" ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی روشنی بجھ گئی اور وہ منظر غائب ہو گیا۔ چند لمحے میرے ذہن پر تاریکی پھیلی رہی اور پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب میرا ذہن معمول پر آ چکا تھا، نہ سنسناہٹ تھی اور نہ گونج۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پروفیسر سے میرے ذہن کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا اور کچھ دیر پہلے تک جو ہولناک منظر دیکھا تھا اُسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

اگر میں نے آج ہی اپنے والد کی تصویر نہ دیکھی ہوتی تو شاید اُسے بھی اپنے دشمنوں کا فریب ہی سمجھتا۔ وہ مجھے دھوکا دینے اور اپنی بات منوانے کی خاطر کسی بھی بے گناہ شخص کو زندگی کا تماشا بنا سکتے تھے، لیکن تصویر دیکھنے کے بعد حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ پھر خود پروفیسر نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر میں چاہوں گا تو اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا جائے گا۔

اس سے پہلے میری ماں کے سلسلے میں مجھے امریکی ایجنٹوں نے بلیک میل کرنا چاہا تھا، مگر چینی یا روسی ایجنٹوں نے ایسا نہیں کیا تھا، حالانکہ ان دونوں کے پاس بھی میری دُکھتی رگیں موجود تھیں۔ غالباً وہ آخری

حربے کے طور پر اپنی اس برتری کا اظہار کرنا چاہتے تھے، لیکن اب چین نے بھی یہ آخری حربہ آزما لیا تھا۔ مجھے دھمکی دی جا چکی تھی اور یہ دھمکی دینے کے لیے چینیوں نے پروفیسر کو ذریعہ بنایا تھا۔ انہوں نے مجھے جس طرح اور جس انداز میں متاثر کرنے کی کوشش کی تھی، بلاشبہ وہ اس میں کامیاب تھے۔ مجھ پر امریکی ایجنٹوں کی دھمکیوں کا اتنا اثر نہیں ہوا تھا جتنا اثر، اس بار چینیوں کی دھمکی کا ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے سب کچھ خود دیکھا تھا۔

اُس رات میرے وجود میں بڑی پکار رہی اور نیند میری آنکھوں سے روٹھی رہی۔

میری شخصیت کی تعمیر میں ساری دُنیا کے قدیم و جدید علوم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ انسان اور انسانیت کی فلاح کے لیے اب تک جتنے مذاہب آئے تھے، اُن سب کی تعلیمات میرے حافظے میں زندہ تھیں۔ انسان کو انسان بنانے کی خاطر جتنے نظام خود انسانوں نے تشکیل دیے تھے، اُن کا بھی علم تھا۔ اُنہی علوم نے میرے وجود میں وہ گداز پیدا کر دیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں اور انسانیت کے دشمنوں کو ٹھکانے لگاتے ہوئے اندر سے رونے لگتا تھا۔ انسان کی شکل میں بھیڑیوں کو قتل کرتے ہوئے بھی میں کانپ اٹھتا تھا۔ میں نے جو بغاوت کی تھی، وہ بھی اُنہی علوم کا ردِ عمل تھا۔ میرے حافظے میں تمام دُنیا کے قدیم و جدید علوم کو محفوظ کرنے والے نے یہ نہیں سوچا تھا شاید کہ اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ میرے خالق کا مقصد ایک غیر معمولی انسان کی تخلیق تھا اور وہ غالباً کسی بھی پہلو سے اپنی تخلیق میں کوئی کمی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے اگر یہ علم ہوتا کہ یہ علوم مجھ میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیں گے تو شاید وہ ایسا نہ کرتا۔ وہ میرے حافظے کو علوم سے محروم رکھتا۔

وہ پکار جو اُس شب میرے وجود میں ہوئی، انسانیت کا تقاضا تھی اور بالکل فطری تھی۔ آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چند انسانوں کی زندگی بچانے کی خاطر پوری انسانیت کے مستقبل کو تاریک نہیں کیا جا سکتا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو شاید یہ فیصلہ نہ کرتا اور خود غرضی اُس کے آڑے آ جاتی۔ اپنے والدین اور بھائی کی زندگی بچانے کے لیے وہ ہرگز یہ نہ سوچتا کہ دوسرے انسانوں پر کیا گزرے گی۔ عموماً انسان اسی طرح سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ انسان اپنی بقا کی خاطر ہمیشہ ہی سے دوسرے انسانوں کے سروں کے مینار بناتا آیا ہے۔ خود غرضی اُس کی فطرت ہے اور دُنیا کے تمام علوم، انسان کی اس فطرت سے جنگ کرتے آئے ہیں۔

اگر میری شکست سے دوسرے انسانوں کو ضرر نہ پہنچتا، اُن کی تباہی و بربادی کا سامان نہ ہوتا تو میں اُسے قبول کر لیتا، لیکن مجھے اپنی شکست کا مطلب معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کسی بھی قیمت پر اپنی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں شکست تسلیم نہ کرنے کی قیمت ادا کرنے پر بھی اب راضی ہو گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ وہ میرے والدین کو تڑپا تڑپا کر ہلاک کر دیتے، میرے معصوم اور بے گناہ بھائی کو مار ڈالتے۔ اُن تین افراد کی زندگی، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگی سے بہرحال قیمتی نہیں تھی۔ انسان اور انسانیت کے نام پر میں قربانی دے سکتا تھا اور میں اپنے اس فیصلے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں تھا۔ میں چاہتا تو اس کے برعکس فیصلہ بھی کر سکتا تھا، لیکن ایسا ہو جاتا تو انسانیت دَم توڑ دیتی، سارے علوم جھوٹے ثابت ہو جاتے، میری شخصیت کی نفی ہو جاتی۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں جس کرب سے گزرا، اُسے میں ہی جانتا ہوں۔ بااختیار ہو کر بھی اختیار کو استعمال نہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی، اس کے لیے بڑے دُکھ سے گزرنا پڑتا ہے، بلا کے صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے، اپنے اندر چھپے ہوئے شیطان کا سر کچلنا پڑتا ہے، اپنی فطرت سے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ انسانوں کے اندر عموماً یہ جنگ ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی ہے تو فیصلہ فطرت کے حق میں ہوتا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے اور یوں انسانیت کی سطح سے گر جاتا ہے۔

صبح مجھے آٹھ بجے کے قریب یاسمہ نے جگا دیا۔ وہ میرے ساتھ ہی ناشتا کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہا کر آئی تھی اور اُس کے دراز گیسو شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا تو اُس نے مجھے بڑی قاتل نظروں سے دیکھا، پھر بولی۔ "اس گھر میں تمہاری یہ پہلی رات تھی، نیند تو آرام سے آئی؟ کوئی کمی تو محسوس نہیں ہوئی تمہیں؟"

میں اُس کی بات کا مطلب خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ کس کمی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر میں نے کہا۔ "یاسمہ! کچھ پا لینے کی تمنا، پا لینے سے زیادہ جینے پر اُکساتی ہے۔ وہ جو ایک خلش سی، ایک پھانس سی سینے میں چبھتی رہتی ہے، اگر وہی پھانس نکل جائے اور وہی خلش ختم ہو جائے تو پھر زندگی میں کیا رہ گیا!"

"تم بڑی عجیب باتیں کرتے ہو ضیغم!" وہ اٹھلا کر بولی۔ "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ پیاس لگ رہی ہو اور آدمی پانی نہ پیے۔"

"تشنگی کی بھی تو اپنی ایک الگ لذت ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔ آدمی خوابوں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"اور خواب ہی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتے ہیں یاسمہ!"

کاش تم نے بھی خواب دیکھے ہوتے!"

"خواب تو میں نے بھی دیکھے تھے منیم!" اُس نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مگر... مگر وہ خواب بکھر گئے۔ پھر... پھر میں نے خوابوں سے توبہ کرلی۔ میں اپنے اندر اتنا حوصلہ نہیں پاتی کہ خوابوں کے بکھرنے کا تماشا کر سکوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا! میں کیا کہہ رہی ہوں!"

"ہاں سمجھ رہا ہوں یمامہ! اور اسی لیے تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ آنکھیں ہیں تو خوابوں کی تمنا بھی کیا کرو۔ شاید تمہیں کسی آواز کی خوشبو نظر آجائے۔"

"اب کسی آواز کی خوشبو میرے وجود کو نہیں مہکا سکتی منیم!" اُس کی آواز میں بلا کا دکھ تھا۔ "میرے اندر ایک عمر سے خاک اُڑ رہی ہے۔ میرے اندر تو ایک دشت آباد ہے۔ خزاں کا موسم ہے۔ مدتیں گزریں کہ مجھ میں کوئی وصال نہیں، کسی خوشبو نے مجھے آواز نہیں دی۔ کسی خواب نے میری آنکھوں میں کروٹ نہیں لی۔" وہ اُداس ہوگئی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ اُس کے اندر کی آواز تھی۔ زندگی سے مصالحت کرنے کے باوجود وہ اندر سے بالکل ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُس کی نیلی روشن آنکھیں اس وقت بالکل بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں۔ میں نے اسی لیے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور ہنس کر بولا۔ "تم تو ایک دم سنجیدہ ہوگئیں۔ سارے میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔"

"تم مجھے چھیڑ رہے تھے یا میرے دل کے تاروں کو!" اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"میرا مقصد تو صرف تمہیں چھیڑنا تھا، اگر بھولے سے تمہارے دل کے تار بھی چھیڑ دیے تو معاف کر دینا۔ میں تمہیں بہرحال اُداس نہیں دیکھ سکتا۔" آخری جملہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

"میں اُداس کب ہوں منیم! دیکھو میں مسکرا رہی ہوں۔" اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ وہ عورت اندر سے اتنی بُری نہیں تھی۔ اُس کے دل کا گداز ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی مکمل طور پر اپنے اندر کی اُس عورت کو نہیں مار سکی تھی جو کسی کی محبوبہ تھی اور جس نے کبھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اُس نے زندگی سے جو مصالحت کر لی تھی، اُس پر وہ اندر سے خوش نہیں تھی۔ کیا خبر یہ مصالحت اُس نے اپنی بیٹی کی خاطر کی ہو! اسی کے ساتھ مجھے یمامہ کی نوجوان بیٹی نبیلہ یاد آگئی جس

آزادیِ وطن کے جذبے سے سرشار
سلسلہ جس کے دشمن زمین و آسماں تھے
ان نوجوانوں کی داستان
غیرت کے سوداگر
تحریر: ایم اے راجہ
وطنِ عزیز کے حصول کے لئے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہولہو ہوئے۔ تب عروسِ وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن دشمنانِ وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
ہزاروں قارئین کی دل پسند تحریر
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
شائع ہوگیا ہے
قیمت فی حصہ ۲۵ روپے
علاوہ محصول ڈاک
فون: 7229762-7248559

سے میں نے کوئی وعدہ کیا تھا۔ میں اُس کی محرومیاں سمجھتا تھا اور اُس کی مجبوریاں بھی! اسی لیے غیر ارادی طور پر میری زبان پر اُس کا نام آگیا اور میں نے یمامہ سے اُس کے بارے میں پوچھ لیا۔

"وہ نبیلہ!" یمامہ چونک کر بولی۔ "وہ... وہ ٹھیک ہے منیم! تمہیں... تمہیں اُس کا خیال کیسے..."

"بس یوں ہی۔" میں، یمامہ کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ مجھے احساس ہوگیا کہ یمامہ سے نبیلہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ نبیلہ کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ میں نے اس لیے بات بنائی۔ "میں اس کے بارے میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ کل تم نے اُسے منع کر دیا تھا کہ وہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ وہ اُداس ہے۔"

"نہیں، اب وہ ٹھیک ہے۔" یمامہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے اُسے عادی بنا دیا ہے اس کا! تم سمجھ رہے ہو نا!"

یمامہ یقیناً غلط فہمی کا شکار تھی کہ اُس نے اپنی بیٹی کو تنہائی کا عادی بنا دیا ہے یا پھر وہ دانستہ اس فریب میں مبتلا رہنا چاہتی تھی، مگر میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ اگر میں اُسے بتا دیتا کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہے تو اس سے اُسے رنج ہوتا۔ سکون سے جینے کے لیے کبھی کبھی غلط فہمیاں بھی ضروری ہوتی ہیں۔ اگر انسان پر ہر حقیقت منکشف ہو جائے تو شاید وہ جی نہ سکے۔ میں، یمامہ کو بے سکون نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے اس باب میں میری خاموشی ضروری تھی۔ یمامہ شعوری طور پر کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اُس کا کوئی بھی مہمان اُس کی نوجوان بیٹی میں دلچسپی لے۔ وہ جس آہنی جال میں تھی، اپنی بیٹی کو اس سے بچانا چاہتی تھی اور اب تک اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ نبیلہ کے معاملے میں اُس کا رویہ میرے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں تھا، لیکن اس سلسلے میں اُسے کچھ سمجھانے کا مطلب مجھے معلوم تھا۔ وہ مجھ پر شک کرنے لگتی۔ وہ یہی سمجھتی کہ میں اُس کی بجائے نبیلہ کا خواہشمند ہوں حالانکہ میرے ذہن میں ایسا خیال بھی نہیں تھا۔

ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے یمامہ کے ساتھ ناشتا کیا اور اسی دوران میں مجھے خیال آیا کہ اپنے دشمنوں کی طرف سے یوں غافل اور مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ رہنا چاہیے۔ میں کم از کم امریکی ایجنٹ گلوریا سے مل کر یہ تو معلوم کر ہی سکتا تھا کہ اب تک جفری ناٹ اُس سے ملا یا نہیں! یہ امکان بھی بہرحال تھا کہ وہ عنقریب گلوریا سے ملنے کا وعدہ کر چکا ہو۔ گلوریا سے اُس کے تعلقات کی نوعیت کا علم مجھے ہو چکا تھا۔ جفری ناٹ کا سراغ لگانے کے لیے میرے سامنے صرف وہی ایک ذریعہ تھی اور میں نے اُسے اسی لیے زندہ چھوڑ دیا تھا۔

گلوریا، جدید قاہرہ کے ایک محلے مُہندسین میں سکونت پذیر تھی۔ مجھے اُس کا پتا معلوم تھا۔ میں اسی لیے ناشتا کرتے ہی لباس تبدیل کرنے کے بعد یمامہ سے دوپہر تک واپس آنے کے لیے کہہ کر روانہ ہوگیا۔ گھر سے نکلتے ہی مجھے اپنے کوٹ کی جیب میں اُس خطرناک ہتھیار کی موجودگی کا احساس ہوا جسے میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ وہی جدید اور خطرناک ہتھیار تھا جو چینی ایجنٹ لوئی چو کی ہلاکت کا سبب بنا تھا۔ یہ ہتھیار میں نے اُسی سے چھینا تھا۔ میں نے اب تک اُس ہتھیار کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اُسے اپنی جیب سے نکال لیا۔ میرا ارادہ اُسے اپنے پاس رکھنے کا نہیں تھا۔ وہ کسی بھی ہاتھ میں پڑ کر کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا کر سکتا تھا، اُسے ضائع کر دینا ہی مناسب تھا مگر اس سے پہلے میں اُسے تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا۔ بہرحال وہ عجیب شے تھی جس سے بنفشی شعاعیں نکلتی تھیں۔ یہ خطرناک بنفشی شعاعیں انسانی جسم کو موم کی طرح پگھلا سکتی تھیں۔ اس کا تجربہ مجھے خود ہو چکا تھا۔ یہ خطرناک ہتھیار نادانستگی میں کسی کی بھی ہلاکت کا سبب بن سکتا تھا۔ مجھے مُہندسین جانا تھا اور وہاں سے دریائے نیل تین سوا تین میل سے زیادہ نہیں تھا۔ میں واپسی میں یا وہاں جانے سے پہلے اس ہتھیار کو دریا بُرد کر سکتا تھا۔

گھر میں مجھے اُس ہتھیار کو دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب وہ ہتھیار میرے ہاتھ میں تھا۔ چھوٹا سا ہونے کے باوجود اُس میں خاصا وزن تھا۔ خصوصاً دستے کی طرف سے وہ کافی بھاری تھا۔ میں نے اُسے اُلٹ پلٹ کر توجہ سے دیکھا۔ دستے کے نچلے حصے میں مجھے ایک چھوٹا سا سفید بٹن نظر آیا جو پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ لبلبی کی جگہ جو سُرخ بٹن تھا، اُس کے دبانے سے بنفشی شعاعیں خارج ہوتی تھیں۔ لیکن اس چھوٹے سے سفید بٹن کی کارکردگی سے میں ناواقف تھا۔ اُس بٹن کو دبانے سے بھی یقیناً کچھ نہ کچھ ہوتا ہوگا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اُسے دبا کر دیکھنے سے فائدہ بھی کیا، مگر پھر میں اپنے تجسس کو نہ دبا سکا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ وہ ہتھیار انتہائی خطرناک ہے، میں اپنے ارادے سے باز نہ رہ سکا۔ میں اُس وقت ایک میدان سے گزر رہا تھا اور آس پاس کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اُس ہتھیار کی نال کا رُخ زمین کی طرف کر دیا۔ اس طرح وہ سفید بٹن بھی اوپر ہوگیا۔ پھر میں نے وہ بٹن دبا دیا۔ مجھے توقع تھی کہ بٹن دبتے ہی اُس ہتھیار کی نال سے کی

اور رنگ کی کوئی شعاع نکلے گی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ بٹن دبتے ہی ہلکی سی کلک کی آواز ہوئی اور دستے کے بائیں جانب ایک ڈھکنا سا اوپر ہوگیا۔ پھر میں نے ہتھیار کو احتیاط سے اوپر اٹھایا۔ اس آہنی ڈھکنے کے اٹھتے ہی مجھے دستے میں ایک ڈائل نظر آیا جس پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ شیشے کے ڈائل کے نیچے دو سوئیاں، دو ہندسوں پر رُکی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر سوچ کر اس ڈائل پر نظر جمائے ہوئے چند قدم آگے بڑھا۔ اُن دونوں سوئیوں میں سے ایک سوئی نے اپنی جگہ سے بہت خفیف سی حرکت کی۔ پھر میں رُک گیا تو وہ سوئی بھی رُک گئی۔

اس ڈائل کو دیکھ کر چونک اٹھنے کا سبب یہ تھا کہ وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ اُن دونوں سوئیوں میں سے ایک فاصلہ بتانے والی تھی اور دوسری سمت۔ اس پر ہندسے اور حروف چینی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ ایسے ہی ایک ڈائل سے پہلے بھی میرا سابقہ پڑ چکا تھا۔ میں اُس کے ذریعے دو مقامی چینی ایجنٹوں تک پہنچ گیا تھا۔ یہ خطرناک ہتھیار میں نے لونی چو سے چھینا تھا اور وہ میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکی تھی۔ مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ دنیا میں ایک اور ہتھیار کسی دوسرے شخص کے پاس بھی ہوگا ورنہ وہ سوئیاں حرکت نہ کرتیں۔ میرے آگے قدم بڑھانے پر فاصلہ بتانے والی سوئی میں حرکت ہوئی اور میں رُک گیا تو سوئی بھی رُک گئی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اسی طرح کا دوسرا ہتھیار جس شخص کے پاس بھی ہے، وہ کہیں رُکا ہوا ہے یا پھر اُس نے وہ ہتھیار کہیں رکھ دیا ہے۔ اگر وہ شخص حرکت میں ہوتا تو میں چاہے رُکا رہتا، سوئیاں ضرور حرکت کرتیں۔

اگر مجھے علم ہوتا کہ اس خطرناک ہتھیار میں کوئی ایسی خفیہ شے بھی پوشیدہ ہے تو میں ہرگز اُسے اپنے ساتھ نہ رکھتا۔ اس امکان کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ لونی چو اور ہوزون فائے کے علاوہ بھی کوئی اور چینی ایجنٹ قاہرہ میں موجود ہو۔ اس نامعلوم چینی ایجنٹ کو اس عجیب ہتھیار کے ذریعے میری موجودہ قیام گاہ کا علم ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ پہلے بھی مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ایک ایجنٹ اپنے بعد آنے والے کے لیے کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ دیتا تھا، یہ سوچ کر کہ اگر وہ میرے ہاتھوں مارا جائے تو بعد میں انہی خطوط پر دوسرا ایجنٹ آگے بڑھ سکے۔

میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوا کہ میں نے اس خطرناک ہتھیار کو ضائع کرنے سے پہلے اس کا جائزہ لے لیا۔ اب میں اس کے ذریعے، وہاں تک پہنچ سکتا تھا جہاں ایسا ہی دوسرا خطرناک ہتھیار موجود تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو میرے اس احساس کا سبب تھی۔ میں نے غور کیا اور ذہن پر زور ڈالا تو وہ سبب مجھ پر واضح ہوگیا۔ اس ہتھیار میں لگے ہوئے اس ڈائل کا مقصد یہی تو تھا کہ اس کے ذریعے دشمنوں کو میری سکونت کا علم ہو جائے اور یہ جاننے کے لیے انھیں کافی وقت ملا تھا۔ گذشتہ روز سے وہ ہتھیار میرے پاس تھا۔ میرے دشمن اس دوران میں بہ آسانی ویسے ہی دوسرے ہتھیار کی مدد سے میری قیام گاہ کا سراغ لگا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے پاس کوئی ایسی شے کیوں رکھتے جس کے ذریعے میں اُن تک پہنچ جاتا! مقصد پورا ہو جانے کے بعد وہ اس ہتھیار کو خود سے جدا بھی کر سکتے تھے اور ضائع بھی کر سکتے تھے۔ وہ ہتھیار ضائع نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اگر اُسے ضائع کر دیا گیا ہوتا تو کوئی بھی سوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتی لیکن یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ اُسے ضائع کیوں نہیں کیا گیا؟ ممکن ہے کہ اب تک کسی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے ہوں یا انھیں مجھ سے یہ توقع نہ ہو کہ میں اس عجیب ڈائل کا سراغ لگا سکوں گا۔ اسی ایک موہوم سی امید پر میں نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈائل جہاں تک میری رہنمائی کرے گا، میں وہاں تک ضرور جاؤں گا۔

وہ میدان عبور کر کے میں ایک سڑک تک پہنچ گیا۔ اس خطرناک ہتھیار کو میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ سمت بتانے والی سوئی جدید قاہرہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ فاصلہ بتانے والی سوئی اکیس کے ہندسے سے ذرا پہلے رُکی ہوئی تھی۔ سمت اور فاصلے سے میں نے اندازہ لگایا کہ میری منزل جدید قاہرہ کی کوئی آخری آبادی ہو سکتی ہے، لیکن یقینی طور پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہاں سے تحریر اسکوائر کا فاصلہ بھی کم و بیش اتنا ہی تھا اور وہاں کئی بڑے ہوٹل بھی تھے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ عموماً بڑے ہوٹل ہی غیرملکی ایجنٹوں کی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے پہلے وہیں چلنے کا فیصلہ کیا۔ ٹیکسی میں وہاں تک پہنچنے کے بعد میں اس خطرناک ہتھیار میں لگے ہوئے ڈائل کو دیکھ کر اپنی منزل کا تعین کر سکتا تھا۔

مجھے جلد ہی ٹیکسی مل گئی اور میں تحریر اسکوائر کے لیے روانہ ہوگیا۔ راستے قاہرہ کی حدود سے نکلتے ہی میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ ہتھیار نکال لیا۔ اس ہتھیار میں لگے ہوئے ڈائل کو چھپانے کے لیے وہ ڈھکنا کس طرح بند ہوتا تھا، میں اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ دستے کے پیچھے لگے ہوئے سفید بٹن پر میں نے دوبارہ دباؤ ڈالا تھا تو وہ آہنی

ڈھکنا دوبارہ اپنی جگہ آگیا تھا۔ میں اسے اپنی جیب میں رکھنے سے پہلے بند کر چکا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے بٹن دبا کر ڈائل کو پھر کھول لیا۔ اب فاصلہ بتانے والی سوئی حرکت میں تھی۔ فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ سمت بتانے والی سوئی کا رُخ بھی اب بدل چکا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میرا سفر صحیح سمت میں تھا۔ ٹیکسی جب تحریر اسکوائر کے علاقے میں داخل ہوئی تو فاصلہ بتانے والی سوئی ایک کے ہندسے کو بھی عبور کر چکی تھی، گویا اب میری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔

تحریر اسکوائر کے آخری حصے تک پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ وہ خطرناک ہتھیار زیادہ بڑا نہیں تھا، اسے میں نے ہاتھ ہی میں رکھا۔ اُسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ اتنی خطرناک شے ہوگی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ عجیب شے کسی بڑے ہوٹل کی نشاندہی کرے گی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ سمت بتانے والی سوئی نے جب دریائے نیل کی طرف اشارہ کیا تو مجھے یاد آیا کہ دریائے نیل ہی کے کنارے جزیرہ میں ہوٹل گیزہ شیرٹن بھی ہے۔ گیزہ شیرٹن ہی میں چینی ایجنٹ لونی چو بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ میں جس شخص کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا، اس کا قیام بھی گیزہ شیرٹن ہی میں ہو سکتا تھا۔

نیل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے میں پیدل ہی اس کے ایک پل کی طرف بڑھ گیا۔ اس پل کو عبور کرنے کے بعد ہی میں جزیرہ کے علاقے میں داخل ہو جاتا۔ وہاں سے گیزہ شیرٹن کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پل کے قریب پہنچتے ہی میں نے پھر ڈائل پر نگاہ ڈالی اور چونک اٹھا۔ سمت بتانے والی سوئی اس پل کی بجائے بائیں جانب اشارہ کر رہی تھی، گویا میں غلط سمت میں جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اس پل سے دریا عبور کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر میں بائیں جانب بڑھتا چلا گیا۔ گیزہ شیرٹن کی تیس منزلہ عمارت گویا اب پیچھے رہ گئی تھی۔ میرا یہ قیاس بھی غلط ہی ثابت ہوا تھا کہ مطلوبہ شخص گیزہ شیرٹن میں سکونت پذیر ہوگا۔

مزید دو پل عبور کرنے کے بعد تیسرے پل تک پہنچتے پہنچتے سمت بتانے والی سوئی کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ فاصلہ بتانے والی سوئی بھی اب صفر کے قریب پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ میں اس پل کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نصف پل ہی عبور کر سکا تھا کہ سمت کی سوئی تیزی سے مخالف سمت میں گھوم گئی، گویا میں اس مقام سے آگے بڑھ گیا تھا جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ میں ڈائل پر نظر جمائے ہوئے مڑا۔ سمت کی سوئی پھر حرکت میں آ گئی۔ کچھ دور چل کر ہی اس کا رُخ بالکل نیچے کی طرف ہوگیا۔ میں اس جگہ رُک گیا۔ فاصلہ بتانے والی سوئی تقریباً صفر کو چھو رہی تھی۔ جیسے ٹھیک میرے نیچے پل تھا اور اس کے نیچے دریائے نیل۔ میں نے پل کی ریلنگ پکڑی اور نیچے جھانکنے لگا۔ وہاں اُس وقت نہ کوئی کشتی تھی نہ موٹر بوٹ اور نہ کوئی لانچ تھا۔ ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ میں نے بھی تو اس ہتھیار کو دریا برد ہی کرنے کا فیصلہ کیا تھا، تو پھر کیا میرے دشمن اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہتھیار یقیناً پل سے دریا میں پھینکا گیا تھا اور وہیں دریا کی تہ میں پڑا ہوا تھا۔ سمت بتانے والی سوئی اسی لیے دریا کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ ہتھیار یقیناً واٹرپروف ہوگا ورنہ پانی میں گرنے کے بعد اُس کی کارکردگی ضرور متاثر ہوتی۔

اب وہاں مزید وقت ضائع کرنا لاحاصل تھا، یہ سوچ کر میں نے اس خطرناک ہتھیار کو بھی دریا میں پھینک دیا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ میرا اندیشہ ٹھیک ہی ثابت ہوا تھا۔ مجھے بہرحال کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ لونی چو اپنی زندگی میں میرا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی لیکن وہ اپنے ساتھیوں کے لیے سراغ چھوڑ گئی تھی۔ ان حالات میں یمامہ کے یہاں میرا مزید قیام خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس طرح میرے دشمنوں کو بھی میرے سامنے آنا پڑتا۔ اپنے دشمنوں کی نگاہ سے چھپ کر مجھے صرف یہی فائدہ تھا کہ میں اُن کے حملوں سے محفوظ رہتا، مگر اس طرح وہ بھی میری نظر میں نہ آ سکتے۔ انھیں ٹھکانے لگانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں ان کو خود پر حملہ کرنے کا موقع فراہم کرتا۔ اس صورت میں مجھے ہر وقت چوکنا تو رہنا پڑتا، مگر میں انھیں ٹھکانے لگانے میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ بغداد کے دوران قیام میں بھی میں، روسی ایجنٹ مینی میں کو سامنے لانے کے لیے یہی حربہ استعمال کر چکا تھا لیکن وہ عیار شخص اس وقت میرے حربے سے بچ گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی بار میں یہ حربہ آزما چکا تھا اور ہر مرتبہ مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ میں یہ سوچتا ہوا پیدل ہی پل کے پار راستے پر آگے بڑھتا رہا۔ میں نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی موجودہ سکونت ترک نہیں کرنا چاہیے، خواہ اس کا علم میرے دشمنوں کو ہو یا نہ ہو۔ یوں میں اپنے دشمنوں سے چھپ کر انھیں ہرگز ٹھکانے نہیں لگا سکتا تھا۔ میرے ذہن کو یہ فیصلہ کر کے کچھ اطمینان سا ہوگیا اور پھر میری نگاہیں ٹیکسی کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ اب میں مہندسین پہنچنا چاہتا تھا۔

میں ابھی پل عبور نہ کر پایا تھا کہ ایک خالی ٹیکسی نظر آگئی۔ میں نے اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے مہندسین کا علاقہ تقریباً تین میل تھا

ٹیکسی کو وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا تھا۔ یہ علاقہ صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ اس علاقے کا شمار بھی قاہرہ کی جدید اور اعلیٰ درجے کی آبادیوں میں ہوتا تھا۔ یہاں تقریباً سو گز یا دیگر علاقوں کی طرح بلند عمارتیں تو نہیں تھیں، لیکن ان علاقوں کا طرز تعمیر انتہائی جدید اور جداگانہ تھا۔ ہر عمارت اپنی تعمیر میں منفرد اور خوب صورت تھی۔ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ گوریا کا پورا پتا میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ نمبروں کی مدد سے بہ آسانی اس کا مکان تلاش کیا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر یوں بھی کسی کا گھر تلاش کیا جائے تو ٹیکسی ڈرائیور جھنجلا جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ میں اس علاقے کی سیر بھی کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے پیدل ہی چلنے کو ترجیح دی۔

تقریباً ہر بنگلے پر تختی لگی ہوئی تھی جس پر مالک مکان کے نام کے ساتھ ہی پورا پتا بھی لکھا ہوا تھا۔ مجھے گوریا کے بنگلے کو تلاش کرنے کے لیے کسی کی رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ٹیکسی سے اتر کر تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں اس کے بنگلے تک پہنچ گیا۔ وہ خوب صورت اور جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ بنگلے کا پھاٹک کھلا ہوا تھا، مگر میں اس میں داخل نہیں ہوا اور سیدھا اس کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ اب میں اپنے وجود کو نادیدہ بنانا چاہتا تھا تاکہ بہ آسانی وہاں پہنچ سکوں۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑتی اور میں اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیتا۔ مجھے اس کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑا اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے ایک ٹرک، ایک بنگلے کی دیوار کے قریب کھڑا ہوا دیکھا۔ اس ٹرک اور بنگلے کی دیوار کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر ٹرک اور بنگلے کی دیوار کے درمیان داخل ہو گیا۔ اور پھر میں نے دیر نہیں کی۔ میں اس خلا سے دوسری طرف نکلا تو میرا وجود نادیدہ بن چکا تھا۔

جیسے میں دوبارہ گوریا کے بنگلے کی طرف واپس جا رہا تھا تو میری آنکھوں میں اس کا حسین سراپا گھوم رہا تھا۔ میں اسے پہلے دو بار دیکھ چکا تھا۔ پہلی بار میں نے گوریا کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ ہوٹل کے بار میں لیزا نکلسن سے تفری ناٹ کا پیغام لے کر آئی تھی۔ دوسری بار اس سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ تفری ناٹ کے ایک منصوبے پر عمل کر کے مجھے اغوا کرنا چاہتی تھی اور خود مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اگر اس وقت میں اس کی مدد نہ کرتا تو یقیناً وہ پولیس کے ہتھے

ایک پر تحیر سنسنی خیز، اور دلچسپ
چاند کے قیدی
نسل در نسل چلنے والے انتقام کی روداد
2 جلدوں میں مکمل
شائع ہو گیا ہے
قیمت فی حصہ 25 روپے

جرم و لہو

چڑھ جاتی۔ یہ الگ بات کہ اس میں میری خود غرضی کو بھی دخل تھا۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتی تو پھر اس کے توسط سے تفری ناٹ تک پہنچنے کے متعلق میرا پلان اور یوں تفری ناٹ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ بھی ختم ہو جاتا۔

پھر دیر بعد ہی میں گوریا کے بنگلے تک پہنچ گیا۔ میں نے کھلے ہوئے پھاٹک میں داخل ہو کر اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں سکوت اور خاموشی تھی۔ دائیں جانب سرسبز لان نظر آ رہا تھا اور بائیں جانب [illegible] تھی۔ میں عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بند تھا۔ دروازے کی ایک جانب مجھے ڈور بیل کا بٹن نظر آیا۔ معلوم نہیں پھاٹک کی بجائے وہاں کال بیل کا بٹن کیوں لگایا گیا تھا۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ عمارت کے اندر کہیں کال بیل گنگنا اٹھی۔ چند لمحے بعد ہی میں نے بٹن سے انگلی ہٹائی اور دروازہ کھولے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر کافی دیر بعد دروازے کے عقب میں مجھے قدموں کی بہت مدھم سی چاپ سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی دانستہ یہ کوشش کر رہا ہو کہ قدموں کی چاپ نہ ابھرے۔ میں دروازہ کھلنے کا منتظر رہا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ دروازے کے پیچھے یقیناً کوئی موجود تھا مگر دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔ میں اس وقت دروازے ہی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بس اچانک ہی میری نگاہ دروازے کے اس حصے پر پڑ گئی جہاں ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سوراخ کو اور غور سے دیکھا تو اس پر مجھے چھوٹا سا گول شیشہ لگا ہوا نظر آیا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ کال بیل کا بٹن پھاٹک کی بجائے وہاں کیوں لگایا گیا تھا۔ اس چھوٹے سے گول شیشے کے ذریعے دروازہ کھولے بغیر اندر ہی سے باہر کا پورا منظر واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس شیشے کی مدد سے یہ جاننا بہت آسان تھا کہ دروازے کی دوسری طرف کون ہے اور کس نے کال بیل کا بٹن دبایا ہے۔ گوریا نے یقیناً اسی سے باہر کا منظر دیکھا ہوگا اور اسی لیے وہاں کسی کو موجود نہ پا کر دروازہ نہیں کھولا ہوگا۔

اس شیشے سے چونکہ اندر دیکھنا ممکن نہ تھا، اس لیے میں نے یہ جاننے کے لیے کہ وہ گوریا ہی ہے یا کوئی اور، اس کے ذہن سے رابطہ قائم کیا۔ وہ گوریا ہی تھی اور سخت حیران تھی کہ کال بیل کا بٹن کس نے دبایا۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ شاید کال بیل کا بٹن دبا کر وہ شخص واپس جا چکا ہے کیونکہ اسے دروازے تک پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔

"ہوگا کوئی!" یہ سوچ کر وہ مڑنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔

"دروازہ کھول دو!" میرے ذہن نے اسے حکم دیا۔

گوریا نے فوراً ہی اس حکم کی تعمیل کی اور دروازہ کھل گیا۔ میں آہستگی سے اندر داخل ہو گیا تو اسے دوبارہ دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اس نے پھر میرے حکم پر عمل کیا۔ میں نے اس کے ذہن کا مطالعہ کر کے پہلے تو یہ معلوم کیا کہ وہ گھر پر تنہا ہے یا نہیں! اس وقت وہ گھر میں تنہا ہی تھی۔ یہ جاننے کے بعد میں نے اسے اندر چلنے کا حکم دیا۔ میرا حکم پاتے ہی کسی معمول کی طرح سر جھکائے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے اس کے حسین سراپے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ اس وقت میرے طاقت ور ذہن کے زیر اثر تھی، اس لیے اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر میرے حکم کے مطابق دوبارہ اسی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی جس پر میرے آنے سے قبل نیم دراز تھی۔ پھر میں نے اس کے ذہن کو آزاد کر دیا۔ اس سے پہلے میں اس کے ذہن سے یہ محو کر چکا تھا کہ وہ کال بیل کی آواز سن کر وہاں سے اٹھی بھی تھی۔ اب اس کے ذہن میں صرف یہی تھا کہ وہ بدستور اسی رسالے کا مطالعہ کر رہی تھی جو قریب ہی ایک میز پر کھلا ہوا رکھا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی دوبارہ وہ رسالہ اٹھایا اور اسے پڑھنے لگی۔

گوریا رسالہ پڑھنے میں محو تھی اور میں دانستہ اس سے دور کھڑا ہوا تھا۔ قریب جاتا تو وہ میرے جسم سے اٹھنے والی خوشبو محسوس کر سکتی تھی۔ کسی عام شخص کے لیے میرے جسم سے اٹھنے والی خوشبو کوئی خاص معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر بھی اس خوشبو کو نظر انداز کر سکتا تھا کہ میں کوئی سینٹ یا عطر لگائے ہوئے ہوں، مگر میرے دشمنوں کے لیے یہی خوشبو میری پہچان تھی۔ وہ فوراً چوکنا ہو جاتے تھے۔

گوریا کے پرکشش سراپا کو دیکھ کر وقتی طور پر میں وہ بات بھول ہی گیا جس کے لیے یہاں تک آیا تھا۔ مجھے خود اپنی اس کیفیت پر حیرت تھی۔ کچھ دنوں سے جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے ہر حسین وجود متاثر کرنے لگا تھا۔ صالحہ وہ پہلی لڑکی تھی جس نے پہلی بار میرے اندر یہ جذبات بیدار کیے تھے۔ یہ واقعہ بغداد کے دوران قیام کا تھا۔ میں اب تک اس قیامت خیز دوشیزہ کو نہیں بھول سکا تھا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ صالحہ کا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ عشق اور ہوس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور میں یہ فرق جانتا تھا۔ لونی جوزیامہ اور گوریا کو دیکھ کر میری جذباتی کیفیت یقیناً مختلف

ہوتی تھی۔ اب تک میں نے اس انداز میں نہیں سوچا تھا اور نہ مجھے کسی کے قرب کی ضرورت محسوس ہوئی تھی، لیکن ان دنوں ایسا نہیں تھا۔ میرے وجود میں کہیں کوئی ایسا خلا پیدا ہو گیا تھا جسے پُر کرنا ضروری تھا اور یہ خلا کسی کا قرب ہی پُر کر سکتا تھا۔ شاید میں اسی لیے لوئیسا کی طرف جھکا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ یمامہ مجھے اپنی تمام پُرکاری کے باوجود اچھی لگی تھی اور اب میں گوریا کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔

میں جانے کتنی دیر یونہی گوریا کو دور کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر جانے کب اور کیسے مجھے خیال آیا کہ میں وہاں کیوں آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے گوریا کے ذہن کو ٹٹولنے میں دیر نہیں کی۔ ہتھری ناٹ سے ملنے کے لیے وہ اب تک بے چین تھی۔ گذشتہ شب ہتھری ناٹ اس سے ملنے آیا بھی تھا مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔ ہتھری ناٹ اس کے لیے ایک پیغام چھوڑ گیا تھا۔ وہ پیغام گوریا کے ذہن میں ابھی تک محفوظ تھا۔ ہتھری ناٹ نے اپنے پیغام میں لکھا تھا کہ وہ کسی بھی وقت گوریا کو پہلے سے مطلع کیے بغیر آئے گا۔ گوریا کو اپنی آمد سے مطلع نہ کرنے کا سبب اس نے نہیں لکھا تھا مگر گوریا اس کی وجہ جانتی تھی۔ کسی بھی مشن کے دوران میں ہتھری ناٹ اپنے متعلق کہیں کوئی ایسا سراغ نہیں چھوڑتا تھا جس سے معلوم ہو سکے کہ کسی وقت وہ کہاں ہو گا۔ گوریا اس کی اس احتیاط پسندی سے واقف تھی۔ گوریا سے ملنے کے بعد کم از کم مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہتھری ناٹ، گوریا سے ملنے آیا تھا اور اب بھی یہ امید باقی تھی کہ وہ پھر آئے گا۔ ہتھری ناٹ کی حد سے زیادہ احتیاط پسندی ہی اسے اب تک میری زد سے بچائے ہوئے تھی۔ گوریا کے ذہن کا مطالعہ کر کے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خود بھی ہتھری ناٹ کی تلاش میں تھی۔ اس سلسلے میں وہ کل صبح ایک مقامی ایجنٹ سے بھی ملی تھی۔ اس مقامی ایجنٹ کی گفتگو سے گوریا نے اندازہ لگایا تھا کہ کل کسی وقت ہتھری ناٹ اس ایجنٹ سے مل سکتا ہے۔ گوریا نے اس ایجنٹ کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ کل پورا دن وہ اس کے گھر رہے گی۔ مقامی ایجنٹ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل صبح ہی اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ گوریا نے اس ایجنٹ کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ اب تک گوریا اس سے ٹرانسمیٹر اور ٹیلی فون ہی پر رابطہ قائم کرتی رہی تھی۔ گوریا تو صرف گھر کے پتے پر راضی تھی مگر وہ ایجنٹ، اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گوریا کو اس کا گھر تلاش کرنے میں پریشانی ہو۔

گوریا، ہتھری ناٹ کو تلاش کر لیتی یا ہتھری ناٹ خود اس سے مل لیتا، بات ایک ہی تھی۔ میرا مقصد دونوں ہی صورتوں میں پورا ہو جاتا۔ گوریا سے میری ملاقات رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اگر میں اس سے آج ہی نہ مل لیتا تو شاید یہ موقع مجھے نہ ملتا۔ اب تک گوریا اسی طرح رسالہ پڑھنے میں محو تھی۔ میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے گوریا کے ذہن کو ایک بار پھر اپنا مطیع کر لیا۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ کسی شبہے میں بھی پڑ سکتی تھی۔ پھر گوریا نے میرے لیے دروازہ کھول دیا اور جب میں باہر نکل گیا تو دروازہ بند بھی کر لیا۔

"اب تم اپنے کمرے میں جا کر اسی طرح رسالہ پڑھنے لگو گی اور تمہیں کچھ یاد نہیں رہے گا کہ تم دروازے تک آئی تھیں۔" میرے ذہن نے گوریا کو آخری حکم دیا اور پھر اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ گوریا نے وہی کیا ہو گا جو اسے حکم دیا گیا ہے۔ جب میں گوریا کے بنگلے سے نکلا تو میرا وجود نادیدہ نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دور تک پیدل ہی چلتا رہا، پھر مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ دوپہر ہونے سے کچھ پہلے ہی میں، یمامہ کے گھر واپس پہنچ گیا۔

خلافِ توقع دروازہ یمامہ کی نوجوان بیٹی نبیلہ نے کھولا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ "کیا تمہاری امی نہیں ہیں گھر پر؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"وہ اندر کمرے میں کپڑے بدل رہی ہیں اس لیے موقع دیکھ کر میں دروازہ کھولنے آ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ہی ہوں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ بند کرنے لگی۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ میری طرف مڑی اور بولی۔ "دراصل مجھے آپ کو وہ وعدہ بھی یاد دلانا تھا جو کل آپ نے مجھ سے کیا تھا۔"

"یاد ہے مجھے اپنا وعدہ!" میں نے کہا۔ "وہ وعدہ آج ہی پورا ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔"

"مگر امی تو گھر میں ہیں پھر کیسے؟"

"میں نے کہا تھا نا تم سے کہ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

"نبیلہ! اے نبیلہ! کہاں ہو تم؟ کیا کوئی آیا ہے؟" دفعتاً یمامہ کی مضطرب سی آواز سنائی دی اور میں اس اضطراب کا سبب سمجھتا تھا۔

"مہمان ہیں امی!" نبیلہ وہیں سے پکار اٹھی۔ "دروازہ کھولنے آئی تھی میں!" یہ کہتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے دالان عبور

کر کے صحن میں پہنچ گئی۔ شاید اس کا سبب اس کے دل کا چور تھا ورنہ وہ اتنی تیزی نہ دکھاتی۔ وہ غالباً یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

میں دانستہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا صحن تک پہنچا۔ اس وقت تک نبیلہ، صحن سے غائب ہو چکی تھی اور میرے کمرے کے سامنے یمامہ کھڑی ہوئی تھی۔ "کیسی لگ رہی ہوں میں تمہیں، ان کپڑوں میں؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا، پھر بغیر توقف بولی۔ "آج ہی سل کر آئے ہیں۔ میں ذرا انہیں پہن کر دیکھ رہی تھی کہ ٹھیک بھی سلے ہیں یا نہیں۔"

"جسم متناسب اور خوب صورت ہو تو اس پر ہر کپڑا اچھا لگتا ہے۔" میں نے کپڑوں سے زیادہ یمامہ کی تعریف کی جس پر وہ کھل اٹھی۔ شاید ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے حسن کی تعریف کی جائے اور یمامہ تو واقعی تھی بھی بلا کی حسین۔ نہ جانے عین عالمِ شباب میں اس کا کیا حال ہو گا!

میں اپنے کمرے میں داخل ہونے لگا تو وہ بھی ساتھ اندر آ گئی۔ "کہاں گئے تھے تم؟" یمامہ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف اور شوخ دکھائی دے رہی تھی۔

"کیوں، تم کس لیے پوچھ رہی ہو؟" میں نے جھک کر اپنے پیروں سے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بغیر دل نہیں لگ رہا تھا گھر میں! معلوم نہیں، کیا جادو کر دیا ہے تم نے مجھ پر!" میری طرف سے پہل نہ دیکھ کر وہ خود اظہارِ جذبات پر اتر آئی تھی۔

"جادو!" میں ہنس پڑا۔ "جادو تو تم ایسی حسین عورتیں کرتی ہیں مردوں پر! مردوں کو یہ ہنر نہیں آتا۔"

"کسی اور کو یہ ہنر آتا ہو یا نہ آتا ہو، مگر تمہیں یہ ہنر ضرور آتا ہے منیم!" اس کی آواز بھاری سی ہو گئی۔ "تم سمجھ رہے ہو نا!"

پھر یمامہ مجھ سے کافی دیر ایسی ہی بہکانے والی باتیں کرتی رہی۔ اسے شاید یہ شک ہو گیا تھا کہ وہ مجھے متاثر نہیں کر سکی، ورنہ اب تک

جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کرتے تھے

اندھیرے کا تیر

ایم۔ اے راحت

○ انگلینڈ کے ایک مارشل آرٹس ماسٹر کی تربیت یافتہ۔ اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش میں سرگرداں لیکن اژدہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

○ اسے پناہ ملی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ایسی جگہ جہاں وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ شیدے۔ کالے بدنما چہرے والا فرشتہ۔ جو اس کی ڈھال بنا معاشرے کے تلخ پہلو اجاگر کرتی ہوئی سنسنی خیز داستان۔

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہو گا

ایک جلد میں | قیمت فی جلد / روپے | ڈاک / روپے

ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہو گی!

کل قریش پبلیکیشنز اینڈ لائبریری، 11 ○ نمبر روڈ اسلام پورہ لاہور

فون: 7229762 - 7248599

میں اس سے گریزاں گریزاں نظر آتا۔ وہ میرے رویے کو اپنے غیر معمولی حسن کی ہتک تصور کر رہی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میں نے حتی الامکان اپنی گفتگو سے اسے یہ یقین دلایا کہ وہ غلط سمجھ رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مطمئن ہوئی یا نہیں، ہاں بظاہر اس نے اطمینان ہی کا اظہار کیا اور پھر میرے لیے کھانا لینے چلی گئی۔

کھانے سے فراغت پا کر میں نے دانستہ یمامہ سے سونے کا بہانہ کیا۔ "میں سُلا دوں تمہیں!" اس نے خواب ناک سے لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے؟" میں بستر پر دراز ہو گیا۔

"تمہارا سر دبا دیتی ہوں، تمہیں نیند آ جائے گی تو میں چلی جاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ سرہانے کی جانب کھسک آئی۔

"گویا تم یہ نہیں چاہتیں کہ میں سو جاؤں!"

"کیوں؟" اس نے ایک ادا سے کہا۔

"میں سوؤں گا یا تمہیں دیکھوں گا!"

"مجھے کیوں دیکھو گے؟" وہ جان کر انجان بن گئی۔

"اس لیے کہ تم دیکھنے کی چیز ہو۔"

"صرف دیکھنے کی چیز؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نیلی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میں جانتا تھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا ہے اور اس کے جواب میں وہ کیا سننا چاہتی ہے۔ میں نے کہا: "تم دیکھنے کی چیز بھی ہو اور... اور قریب سے محسوس کرنے کی بھی!"

"کتنے قریب سے ضیغم!" یمامہ شاید اسی وقت تمام حدیں پھلانگ جانا چاہتی تھی۔ اس کی آواز میں جذبات کی شدت کے سبب ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔ اسی وقت میں نے اس کی انگلیوں کا لمس بھی اپنے ماتھے پر محسوس کیا۔

"یمامہ!" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ دن کا وقت ہے اور نبیلہ بھی..."

"جب میں کسی مہمان کے پاس اکیلی ہوتی ہوں تو... تو وہ کبھی مداخلت نہیں کرتی۔ بچپن ہی سے میں نے اسے یہ تربیت دی ہے، تم اس کی فکر نہ کرو ضیغم! تم سمجھ رہے ہو نا!" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"مگر اس وقت مجھے واقعی نیند آ رہی ہے یمامہ! رات کو میں دیر تک سو نہیں سکا، تمہیں علم ہی ہے۔ پھر آج رات بھی تو ضروری نہیں کہ ہم جلدی سو جائیں!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا، پھر مجھے گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے ایک اور بات یاد آ گئی۔ "وہ تم نے شراب

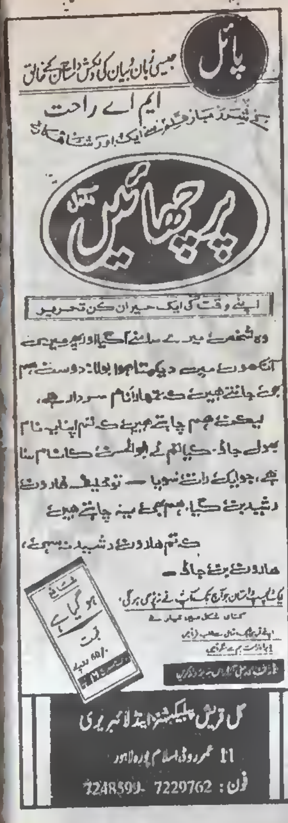

کا بندوبست کر لیا؟"

"ہاں بندوبست ہو گیا ہے۔ شام تک آ جائے گی شراب!" اس نے جواب دیا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غالباً سمجھ گئی تھی کہ اس وقت مجھے رام نہ کر سکے گی۔ "اچھا تو تم سو جاؤ، میں چلتی ہوں۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی، یوں جیسے کوئی اپنی شکست کا اعتراف کر رہا ہو۔

اگر مجھے نبیلہ سے کیے ہوئے وعدے کا خیال نہ ہوتا تو میں خود پر اور یمامہ پر اتنا جبر نہ کرتا، مجھے بھی اپنے جذبات پر قابو پانے میں کافی دشواری پیش آئی تھی۔ بہرحال تقریباً چار پانچ منٹ میں اسی طرح لیٹا رہا اور اس کے بعد پہلے سے طے شدہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مجبوراً مجھے اپنی پُراسرار قوتوں کو استعمال کرنا پڑا کیونکہ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی۔ میں نے یمامہ کے ذہن سے رابطہ قائم کر کے اسے سونے کی ترغیب دی۔ وہ اس وقت پڑوس میں جانے کے متعلق سوچ رہی تھی، مگر میری ذہنی ترغیب کے بعد اس نے اپنا ارادہ موقوف کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں سونے چلی گئی، نبیلہ بھی کمرے ہی میں تھی۔ نبیلہ کو کمرے سے باہر نہ جانے کی تاکید کر کے وہ بستر پر دراز ہو گئی اور پھر چند ہی لمحے بعد گہری نیند سو گئی۔

یمامہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اپنے کمرے سے نکل کر اطمینان سے صحن عبور کیا اور مخالف سمت میں واقع اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا جو کھلا ہوا تھا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نبیلہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔ اس کے خوف کا سبب یقیناً یمامہ تھی جو اسی کمرے میں ایک جانب بچھی ہوئی مسہری پر سو رہی تھی۔ میں واقف تھا کہ یمامہ اتنی گہری نیند سو رہی ہے کہ وہاں گفتگو بھی کی جائے تو اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ "تم اتنی ڈری کیوں رہی ہو نبیلہ؟" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جواب میں نبیلہ کا منہ تو کھلا مگر کوئی آواز نہ نکل سکی۔ اس کا سبب خوف بھی تھا اور شاید یہ بھی کہ کہیں یمامہ کی آنکھ نہ کھل جائے۔ میں اس کی کیفیت سمجھ گیا۔ نبیلہ اس وقت ایک لکڑی کی الماری کے قریب کھڑی ہوئی تھی، جس کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ اس نے یا تو الماری میں کچھ رکھا تھا یا پھر کچھ نکالنے والی تھی، مگر میرے قدموں کی چاپ سن کر اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

"اگر تمہیں یہاں خوف محسوس ہو رہا ہے تو میرے کمرے میں چلو۔"

میں نے اُس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا، پھر اُسے مطمئن کرنے کی خاطر بولا۔ "ڈونٹ مائنڈ، تمھاری والدہ گہری نیند سو رہی ہیں۔"

"مگر... مگر وہ..." اُس کی آواز جیسے حلق ہی میں پھنس گئی۔ وہ غالباً بہت ہمت کر کے یہ چند الفاظ کہنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ بھی اس قدر مدھم آواز میں کہ اگر میں اُس کے اتنے قریب نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ سمجھ پاتا۔

"الماری بند کر دو اور میرے ساتھ چلو!" میں نے اُس سے کہا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

کچھ کہے بغیر اُس نے بہت آہستگی سے الماری کے دونوں پٹ بند کیے اور پھر خوف زدہ سی نظروں سے مسہری کی طرف دیکھا۔ یمامہ دیوار کی جانب کروٹ لیے سو رہی تھی۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جب وہ میرے ساتھ چلی تو میں نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کہ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گھر میں اپنی ماں کی موجودگی کے باوجود کسی سے چھپ کر مل رہی تھی۔ وہ اسی لیے اتنی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا، مگر اس کا خوف کم نہ ہوا۔ وہ اس کرسی پر ڈھیر سی ہو گئی جس پر میں نے اسے بٹھایا تھا۔ اُس کے سانس یوں بے ترتیب تھے جیسے وہ بہت طویل سفر طے کر کے آئی ہو اور شاید یہ غلط بھی نہیں تھا۔ اُس نے آج واقعی ایک طویل سفر طے کیا تھا اور اس عجیب سفر کا تعلق فاصلے سے نہیں مدت سے تھا۔ بچپن سے اب تک اُسے جس طرح پہروں میں رکھا گیا تھا، آج پہلی بار اُس نے وہ سارے پہرے توڑ دیے تھے۔

میں کچھ دیر اُس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھا ہوا اُس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ خوف کے باوجود اُس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ میں نے آج پہلی بار اُسے غور سے دیکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی ایسی بند کلی کا تصور اُبھرتا تھا جو ابھی اپنی خوشبو اپنے ہی وجود میں سمیٹے ہو، جسے ابھی شبنم کے قطروں نے بھی نہ چھوا ہو۔ اُس کی آنکھیں یمامہ کی طرح نیلی تو نہیں تھیں اور نہ اتنی بڑی تھیں، مگر کم حسین نہیں تھیں۔ اُس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی اور جسم کی رنگت ماں ہی کی طرح سرخ و سفید تھی۔

"وہ... وہ اگر جاگ اُٹھیں تو... تو مجھ پر بہت خفا ہوں گی۔" معاً اُس کے یاقوتی لبوں نے حرکت کی۔ "مجھے... مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"تمھیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا نبیلہ!" میں نے نرمی سے کہا۔ "یقین کرو کہ وہ شام سے پہلے نہیں اُٹھیں گی۔"

"مگر... مگر آپ کو کیسے معلوم ہے کہ... کہ وہ سوتی ہی رہیں گی۔" اُس نے بھول پن سے سوال کیا اور جھکی ہوئی نظریں میری طرف اُٹھائیں۔

"انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا۔" میں نے بات بنائی۔ "دراصل وہ رات بھر کی جاگی ہوئی ہیں۔"

"پھر... پھر تو ٹھیک ہے۔" خلاف توقع وہ کسی قدر مطمئن نظر آنے لگی۔ "جب وہ رات کو جاگتی ہیں تو پھر دن بھر سوتی رہتی ہیں، لیکن... لیکن آپ لوگ انھیں کیوں جگاتے ہیں آخر؟" اُس نے عجیب سا سوال کیا۔

"آپ لوگ سے کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں جانتا تھا کہ کسی بھلے وہ لوگ ہوں ورنہ اُس کے سوال کا مطلب بڑی حد تک مجھ پر واضح تھا۔

"جن دنوں بھی ہمارے یہاں مہمان رہتے ہیں، اکثر امی کو رات رات بھر جاگنا پڑتا ہے۔ امی کہتی ہیں کہ وہ اگر مہمانوں کی اتنی خدمت نہ کریں تو وہ اس قدر کرایہ نہ دیں۔"

"ابھی تم بہت چھوٹی ہو، جب بڑی ہو جاؤ گی تو یہ باتیں تمھاری سمجھ میں خود بہ خود آ جائیں گی۔"

"تو کیا میں ابھی بڑی نہیں ہوئی!"

"ہاں تم ابھی بہت بھولی بھالی اور ننھی منی سی ہو۔"

"اب میں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں بے اختیار بول اٹھا۔

"میں نے کئی بار چھپ کر دیکھا ہے سب کچھ، مگر امی کو نہیں بتایا۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

میں اُس کی بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ اگر یمامہ کو یہ بات معلوم ہو جاتی تو شاید وہ خودکشی کر لیتی۔ وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اُس کی نوجوان بیٹی کو کچھ خبر نہیں کہ راتوں کو وہاں کیا ہوتا ہے! پھر میں اس وقت اور بھی چکرا کر رہ گیا جب نبیلہ نے خود سے وہ باتیں پوچھنا شروع کیں جو اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھیں۔

"دیکھو! اچھے بچے کبھی اس طرح تاک جھانک نہیں کرتے اور نہ بڑوں کی باتیں سنتے ہیں۔" میں نے اُس کے سوالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اُسے سمجھایا۔

"اب نہیں کروں گی ایسا۔ ٹھیک ہے!" وہ میری طرف نگاہ

اُٹھا کر بولی، پھر کہا۔ "مگر آپ وہ بات تو بتا دیں جو میں نے پوچھی ہے۔"

"خاک ڈالو اس بات پر، اور یہ بتاؤ کبھی تم اہرام دیکھنے بھی گئی ہو؟" میں نے اُس کی توجہ بدلنے کے لیے کہا۔

"بہت چھوٹی سی تھی میں، جب گئی تھی۔ کچھ کچھ یاد ہے۔ امی لے کر ہی نہیں جاتیں، میں اُن سے کئی بار کہہ چکی ہوں۔" میری ترکیب کارگر ہوئی۔ وہ میری باتوں میں آ گئی تھی اور اب اپنی ماں کی شکایتیں کر رہی تھی کہ وہ اسے کہیں لے کر ہی نہیں جاتی۔ آخر وہ بالکل بچوں کی طرح پُراشتیاق لہجے میں بولی۔ "آپ مجھے لے چلیں گے وہاں؟"

"کہو تو آج ہی چلیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"آج!" وہ حیرت سے بولی۔ شاید یقیناً میری بات سن کر حیرت ہوئی تھی جس کا اظہار اُس کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔

"ہاں ہاں، آج!" میں پُرعزم لہجے میں بولا۔ "تمھیں یقین کیوں نہیں آ رہا!"

"آپ بہت اچھے ہیں مجھے۔" اُس نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔ "یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"کیوں نہیں ہو سکتا! اگر تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"میں... میں اگر چاہوں!"

"ہاں تمھیں ہمت کرنا پڑے گی اس کے لیے اور مجھ پر بھروسا کرنا پڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر امی کا کیا ہو گا؟" اُس کے لہجے میں اب بھی بے اعتباری تھی۔

"تمھاری امی کی علاج میرے پاس ہے، بس تم تیار ہو جاؤ۔" میں اس دوران میں یہ سوچ چکا تھا کہ اس بھولی لڑکی کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے۔

"میں تو چلنے کو تیار ہوں، میں امی سے ڈرتی ہوں۔ آپ... آپ کیا کہتے تھے ابھی کہ علاج ہے اس کا؟"

"میرے پاس ایک ایسی دوا ہے کہ وہ انھیں سنگھا دی جائے تو وہ پھر شام ہونے سے پہلے کسی صورت نہیں جاگ سکیں گی۔" میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔ میں اب واقعی اُسے اہرام کی سیر کرانے لے جانا چاہتا تھا۔

"پھر تو... پھر تو بہت اچھا ہے۔" نبیلہ میری بات سن کر بالکل بچوں کی طرح کھل اٹھی۔ "چلیں پھر جلدی سے نکالیں وہ دوا۔"

میری اٹیچی میں میک اپ کا سامان موجود تھا اور اُس میں کئی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔ میں نے اٹیچی سے ایک شیشی نکال لی اور سیدھا ہو کر بولا۔ "چلو!"

"یہی وہ دوا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"آپ... آپ خود ہی چلے جائیں، میں یہیں کھڑی ہوں۔" وہ کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے، تم یہیں رکو، میں آتا ہوں ابھی۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا، پھر مجھے خیال آیا کہ تالا بھی چاہیے۔ میں رک کر اُس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "کوئی تالا ہے؟"

"کس لیے؟" اُس نے پوچھا۔

"گھر کو یوں کھلا چھوڑ کر تو نہیں جا سکتے! باہر سے تالا ڈال جائیں گے۔" میں نے بتایا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تالا لگا جائیں گے۔" اُس کی حالت ایسے بچوں کی سی تھی جو چوری چھپے کوئی شرارت کرنے ہوتے ہیں، بات بے بات کبھی خوش نظر آنے لگتے ہیں اور کبھی ایک دم ڈر جاتے ہیں۔ "تالا دوسرے کمرے میں ہے مگر پہلے آپ دوا سنگھا آئیں امی کو، پھر میں لے آؤں گی جا کر۔"

میں نے یمامہ کے کمرے میں جا کر صرف یہ کیا کہ اُس کی نیند مزید گہری کر دی۔ اب وہ اس قدر گہری نیند سو چکی تھی کہ کوئی اُسے جھنجھوڑ کر بھی جگاتا تو وہ مشکل ہی سے بیدار ہوتی۔ اُس کے بعد میں نے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر نبیلہ کو زور سے آواز دی۔ "اب آ جاؤ۔" میں نے دوا سنگھا دی۔" دراصل اُسے وہاں بلانے کا مقصد یہ تھا کہ اُس کے دل سے خوف نکل جائے۔ اُسے یہ اطمینان ہو جائے کہ واقعی اُس کی ماں بہت گہری نیند سو چکی ہے۔ میرے آواز دینے پر وہ کچھ ڈرتی جھجکتی ہوئی آگے بڑھ آئی۔ پھر کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے

ہے خبر سوتی ہوئی پیامہ کی طرف دیکھا اور رُک گئی۔

"اب جلدی کرو، یا سارا وقت یہیں ضائع کر دو گی! جلدی سے تالا دیکھو! کہاں ہے!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "ادھر آؤ، تمہیں اطمینان تو ہو جائے کسی طرح!" یہ کہہ کر میں مسہری کی طرف بڑھا۔ مسہری کے قریب پہنچ کر میں جھکا اور پیامہ کو کروٹ دلا دی۔

"دیکھا تم نے!"

"امی تو... یہ تو واقعی بالکل بے ہوش سی لگ رہی ہیں۔"

اُس نے مدھم آواز میں حیرت سے کہا۔ اس کے باوجود بھی وہ مجھ سے کچھ فاصلے ہی پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ اب نبیلہ کے چہرے سے بڑی حد تک اطمینان جھلکنے لگا تھا، پھر بھی جب تک وہ کمرے سے تالا لے کر میرے ساتھ نکل نہ آئی کچھ سہمی سہمی سی رہی۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں آ کر کوٹ پہنا جو کھانا کھانے سے پہلے اتار کر ایک کرسی کے ہتھے پر ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد نبیلہ کو ساتھ لیے کمرے سے نکل آیا۔ جب میں گھر میں تالا ڈال کر چابی اپنے کوٹ کی جیب کے اندر رکھ رہا تھا تو نبیلہ نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں کئی سال بعد گھر سے باہر قدم رکھ رہی ہوں۔" اُس کے لہجے میں خوشی بھی تھی اور دُکھ کی ہلکی سی آنچ بھی۔

مجھے نبیلہ کی بات سُن کر عجیب سا احساس ہوا۔ اس زمانے میں یہ بات ناقابلِ یقین سی تھی کہ ایک لڑکی کئی سال بعد اپنے گھر سے نکلی تھی۔ میں نے اُسے خوش کرنے کی خاطر کہا۔ "اب تم بالکل پروا نہ کرو، ہم اسی طرح سیر کرتے چلا کریں گے۔" میری توقع کے مطابق وہ خوش ہو گئی۔ پھر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک دم خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔ میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولی۔ "کہیں کسی نے ہمیں دیکھ نہ لیا ہو!" یہ کہتے ہوئے وہ سہمے سہمے سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"اوّل تو اس وقت گلی میں کوئی ہے نہیں، پھر یہ کہ تمہیں پہچانتا کون ہوگا جب تم گھر سے نکلتی ہی نہیں!" میں نے اُسے تسلی دی۔

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

میں اس کی سادگی اور بھولپن پر مسکرا دیا۔ واقعی وہ بہت سیدھی تھی اور اس زمانے کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پیامہ نے اُسے باہر کی ہوا ہی نہیں لگنے دی تھی۔ جلد ہی ہم دونوں سڑک تک پہنچ گئے اور وہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ راستے میں اُس نے کوئی بات نہیں کی اور میں بھی دانستہ خاموش ہی رہا۔ میں ٹیکسی ڈرائیور پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ نبیلہ چوری چھپے میرے ساتھ جا رہی ہے۔

اہرام پہنچ کر میں نے نبیلہ کو سمجھایا کہ وہ اس طرح سہمی سہمی نہ رہے۔ کچھ میرے سمجھانے سے اور کچھ وہاں کی چہل پہل سے نبیلہ کا دل بہل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چہکنے لگی۔ میں نبیلہ کو فرعون خوفو کے مقبرے کے اندر بھی لے گیا۔ خود میں نے بھی پہلی بار اس مقبرے کو اندر سے دیکھا تھا۔ مقبرے کے اندر نبیلہ ہی کو نہیں، مجھے بھی عجیب سی وحشت کا احساس ہوا اور ہم دونوں جلد ہی اُس سے باہر نکل آئے۔ فرعون خفرع کے مقبرے میں بھی اندر جانے کا راستہ تھا مگر ہم اُس کے اندر نہیں گئے۔ اُس کے بعد جیسے مجھے خود بہ خود ابوالہول کے مجسمے نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں نبیلہ کو ساتھ لیے اُس طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ تیسرا موقع تھا کہ ایک ابوالہول، دوسرے ابوالہول کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ پہلی بار مجھے پائی وہاں لے کر آئی تھی۔ دوسری بار مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا تھا اور تیسرا موقع یہ تھا کہ میں، نبیلہ کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ابوالہول کے چالیس فٹ بلند مجسمے کے سامنے مجھے اپنا وجود بہت حقیر سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس معمے کو اب تک حل نہیں کر سکا تھا کہ میرے دشمن مجھے ابوالہول کیوں کہتے ہیں؟ ابوالہول سے آخر میرا کیا تعلق ہے؟ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی سوالات گردش کر رہے تھے۔

"اب واپس چلنا چاہیے، بہت دیر ہو گئی ہے ہمیں! امی کہیں جاگ نہ گئی ہوں!"

نبیلہ کی آواز سُن کر میں چونک اُٹھا۔ "آں... ہاں... ٹھیک... ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔" میں نے اُسے جواب دیا اور اُسی وقت تقریباً اچھل پڑا۔ واضح طور پر کسی خیال کی لہر میرے ذہن کی سطح کو چھوتی ہوئی تیزی سے گزر گئی تھی۔ اطراف میں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ فوری طور پر یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ ایسا اُن میں سے کس نے کیا تھا اور کیوں؟ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح غیر معمولی ذہن کا مالک تھا، لیکن اس حرکت سے اُس کا کیا مقصد تھا؟ کہیں قریب ہی میرا کوئی دشمن تو موجود نہیں؟ میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ اگر اس کا تعلق میرے دشمنوں ہی سے تھا تو یہ حرکت دو آدمیوں کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح غالباً وہ یہ تصدیق کرنا چاہتا ہوگا کہ میں ابوالہول ہی ہوں! میرے دشمنوں میں سے وہ پیٹری ناٹ ہو سکتا تھا یا پھر وہ روسی ایجنٹ لڑکی جو خود کو میری محبوبہ کہتی تھی۔

اس کے باوجود کہ مجھے اپنی کامیابی کی توقع کم ہی تھی، میں نے اپنے طاقت ور ذہن کی لہروں کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ اُس عورت کے کاندھے سے کیمرا لٹک رہا تھا اور وہ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی اور اپنے حلیے سے وہ کوئی مغربی سیاح معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا اور میرا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا، مگر میری قوتِ بصارت اُسے قریب کھینچ لائی۔ یہی وہ عورت تھی جس کے ذہن سے ٹکرا کر میرے ذہن کی طاقت ور لہریں لوٹ آئی تھیں۔ میں اُس کے ذہن کو نہ ٹٹول سکا۔ اُس کا رُخ فرعون منقرع کے مقبرے کی طرف تھا۔ یہی وہ عورت ہو سکتی تھی جس کے خیال کی لہر نے میرے ذہن کی سطح کو چھوا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی کہ کسی کے خیال کی لہر میرے ذہن کی سطح سے ٹکرائی اور اُس عورت کو تلاش کر لینے میں مجھے مشکل سے چند لمحے لگے ہوں گے۔ وہ اسی لیے زیادہ دُور نہ جا سکی تھی اور میں نے اُسے تلاش کر لیا تھا۔

پھر جیسے میں سب کچھ بھول گیا، نہ مجھے یہ یاد رہا کہ میں کہاں ہوں اور نہ یہ کہ میرے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اپنی جگہ سے جست بھری۔ اُس عورت کو میں اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھا جو اب تیز تیز چلتے ہوئے تقریباً دوڑنے لگی تھی۔ اُسے یقیناً خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ اُس عورت کو مجھے یوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر لوگ چیخ اُٹھے، مگر کم از کم مجھے لوگوں کی پروا نہیں تھی۔ میں نے جب اُس عورت پر چھلانگ لگائی تو اُس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ میں اُسے لیتا ہوا زمین پر آ رہا، مگر زمین پر گرتے ہی میں حیران رہ گیا۔ میرے دونوں بازو خالی تھے۔ وہ میرے بازوؤں کے درمیان سے کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گئی تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک ایسی بات محسوس کی کہ لمحے بھر کو میرا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ میں اگر اُس کے اتنے قریب نہ چلا گیا ہوتا تو شاید گلابوں کی اُس خوشبو کو محسوس نہ کر پاتا جو اُس کے جسم سے آ رہی تھی۔

"ارے اسے پکڑو... وہ دیوانہ ایک عورت پر دست درازی کر رہا ہے!" کوئی چیخا اور اس کے ساتھ بہت سے لوگ اُس عورت کے اور میرے درمیان آ گئے جو میری گرفت سے نکلتے ہی پھر بھاگنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اُٹھا پاتا، میں ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے لوگوں کی نگاہوں سے میرا وجود اوجھل ہو

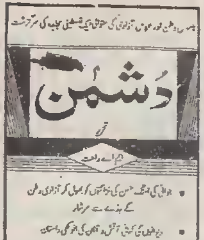

چکا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہاں کچھ ہی دیر میں لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ یوں بھی دن کا وقت تھا اور لوگوں نے مجھے اُس عورت پر حملہ آور ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے اُسی ہجوم ہی کے سبب وہاں سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اگر میں چاہتا تو لوگوں کو روندتا اور کچلتا ہوا نکل جاتا، مگر میں اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ بے گناہ لوگوں کو ناحق تکلیف پہنچانا میرے نزدیک ناقابلِ معافی جرم ہے۔

اگر میرے اور اُس عورت کے درمیان ہجوم نہ آ گیا ہوتا تو شاید میں اُسے بچ کر نہ جانے دیتا۔ میں ہجوم سے نکلا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ میں نے بہ یک وقت اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا کر اُسے تلاش کرنا چاہا، مگر ناکام رہا۔ مجبوراً میں نے اپنی بصارت کے پھیلاؤ کو بھی سمیٹ لیا اور اپنے ذہن کی طاقت ور لہروں کے جال کی ڈوریاں بھی کھینچ لیں۔ اُس عورت نے فرار ہونے میں یقیناً انتہائی تیزی کا ثبوت دیا تھا۔

اُس عورت کے جسم سے میری ہی طرح گلابوں کی خوشبو کیوں آ رہی تھی؟ اس سوال نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اب تک صرف ایک ہی ایسی عورت سے واقف تھا جس کے جسم سے ایسی مخصوص خوشبو آتی تھی اور وہ عورت میرے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔ اگر میرے ہاتھوں قتل ہونے والی چینی ایجنٹ لوئی جو نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ اور پھر اُس کے پاس وہ خطرناک ہتھیار کیسے تھا جو میں نے لوئی جو کے پاس دیکھا تھا؟ میرے ذہن میں پے در پے سوال

ابھرنے لگے۔ اگر وہ چڑیل تھی تو یہ عورت کون تھی جو اِس وقت مجھ سے ٹکرائی تھی؟ اس کے جسم سے گلابوں کی خوشبو کیسے آ رہی تھی؟ میں اُس وقت اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب نہ دے سکا۔ میں نے اپنے ذہن کو یہ سوچ کر اطمینان دلا دیا کہ وہ کوئی چڑیل ہو یا کوئی اور عورت بہر حال اس کا تعلق میرے دشمنوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ وہ ایک بار سامنے آئی ہے تو دوبارہ بھی اُس سے مڈبھیڑ ہوگی۔ اُس سے دوبارہ ٹکراؤ کی یہی صورت تھی کہ میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھتا۔

میں جس جگہ کھڑا ہوا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا، وہاں لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی ورنہ کوئی نہ کوئی آتا جاتا شخص مجھ سے ٹکرا گیا ہوتا۔ میرا ذہن ایک فیصلہ کر کے جب کسی قدر پُرسکون ہو گیا تو مجھے ایک دم نبیلہ یاد آ گئی جسے میں تنہا ہی چھوڑ کر بھاگ اٹھا تھا۔ نبیلہ کا خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ جانے وہ اب تک وہاں ہوگی بھی یا نہیں جہاں میں نے اُسے چھوڑا تھا! جو واقعہ ابھی کچھ دیر پہلے گزر چکا تھا اُس کے بعد میں اپنے وجود کی تجسیم نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بہت سے لوگوں نے اُس عورت پر جھپٹتے اور پھر پُراسرار طور پر غائب ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اتنی جلدی میرا چہرہ نہیں بھول سکتے تھے۔ میں اِس لیے فی الحال نادیدہ رہنے پر مجبور تھا۔ میں اسی حالت میں تیز قدمی کے ساتھ ابوالہول کے مجسمے کی طرف بڑھا۔

میں جب اُس جگہ پہنچا جہاں نبیلہ کو چھوڑ گیا تھا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ وہ وہاں نہیں تھی۔ کیا وہ کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر واپس چلی گئی ہے؟ میں نے سوچا۔ مگر اُس کے پاس تو شاید گھر واپس جانے کے لیے کرایہ بھی نہیں ہوگا۔ پھر یہ کہ اُسے معلوم تھا، گھر میں تالا لگا ہوا ہے اور اُس تالے کی چابی میرے پاس ہے۔ ایسی صورت میں اُس کی گھر واپسی ناممکن ہی تھی۔ یہی ممکن ہے کہ وہ مجھے کہیں تلاش کرتی پھر رہی ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں اُس کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔

پھر نبیلہ مجھے لوگوں کے اُس ہجوم میں ملی جو ابھی تک میرے ہی متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ ابوالہول کے مجسمے کی طرف لوٹتے ہوئے میں دانستہ اُس ہجوم سے بچ کر نکل گیا تھا۔ نبیلہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی اور اب تک میری تلاش میں تھی۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ تقریباً روہانسی ہو رہی تھی۔ میرے نادیدہ ہونے کی وجہ سے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اپنی پُراسرار قوتوں کو استعمال کر کے نبیلہ کو اُس ہجوم سے نکال لے چلتا۔ پھر میں نے یہی کیا۔ نبیلہ کا ذہن اب میرے قابو میں تھا اور وہ میرے ساتھ ساتھ اُس طرف بڑھ رہی تھی جہاں سے کوئی ٹیکسی مل سکتی تھی۔ اب میں وہاں مزید رُکنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اہرام کی طرف آنے والے زیادہ تھے اور جانے والے کم۔ خالی ٹیکسی ملنے میں اِسی لیے دیر نہیں لگی۔ میرے ہی ایما پر نبیلہ نے ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی: "مصر قدیم چلنا ہے، چلو گے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے نبیلہ کو تنہا دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا، پھر بولا: "اکیلی ہی ہو؟"

"ہاں!" نبیلہ نے جواب دیا۔ "مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" نبیلہ کا ذہن اِس وقت میرے ذہن کے تابع تھا اور وہ ہر بات میری ہی مرضی سے کر رہی تھی۔

"ارے تم تو خفا ہونے لگیں، میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا!" ٹیکسی والا عیاری سے بولا۔ نبیلہ کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں شیطانی چمک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا: "آؤ بیٹھ جاؤ، پہنچا دیتا ہوں۔" قریب ہی ایک اور خالی ٹیکسی کھڑی تھی اور اُس کا ٹیکسی ڈرائیور بھی یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اُس کے کان غالباً اُدھر ہی لگے ہوئے تھے۔ پہلے ٹیکسی ڈرائیور سے شاید اُس کی کچھ دید شنید تھی۔ وہ اسی لیے درمیان میں بول اٹھا: "استاد! اگر کہو تو میں چھوڑ آؤں لونڈیا کو!" اُس کا انداز بیہودہ پن تھا۔

"واہ جی، منہ کر آیا، جانے دے!" پہلا ٹیکسی ڈرائیور دوسرے سے بولا، پھر نبیلہ سے مخاطب ہوا: "تم بیٹھو ناٹیکسی میں!"

"مگر کرایہ تو تم نے بتایا ہی نہیں!" نبیلہ بولی۔ وہ بے تکلف بات کر رہی تھی اور اِس کا سبب میں تھا۔

"جو بھی جی میں آئے دے دینا۔ تم بیٹھو تو سہی!" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ نبیلہ کچھ کہے بغیر فوراً ہی آگے بڑھی اور ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر دیتی، میں بھی لپک کر اُس کے قریب جا بیٹھا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر رونق آ گئی ہے۔ اُس نے ٹیکسی اسٹارٹ کرنے میں دیر نہیں کی۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اُس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں، لیکن مجھے اِس کی فکر پیدا نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اُس پر عمل کرنے کی خاطر میں نے پہلے نبیلہ کے ذہن سے اُس واقعے کا ہر

نقش مٹا دیا جو اہرام میں اُس کے سامنے پیش آیا تھا۔ اب اُس کے ذہن میں صرف یہ تھا کہ ہم اہرام کی سیر کرنے گئے تھے اور سیر کرنے کے بعد اب گھر لوٹ رہے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی کہ میں اُس کے ساتھ ساتھ ہوں۔ میں اِس دوران میں یہ بھی محسوس کر چکا تھا کہ ٹیکسی کا رُخ پُرانے قاہرہ کی بجائے جدید قاہرہ کی طرف ہے، مگر ابھی میں خاموش ہی رہنا چاہتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی بدنیتی ظاہر ہو چکی تھی۔ نبیلہ کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی میں نے اپنے وجود کی تجسیم میں دیر نہیں کی اور پھر اُس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

"سچ بہت ہی مزہ آیا اہرام کی سیر میں!" نبیلہ پُرمسرت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا؟" ٹیکسی ڈرائیور اُس کی آواز سن کر چونک اٹھا اور پھر عقبی آئینے کا رُخ درست کر کے اُس نے جیسے ہی مجھے نبیلہ کے ساتھ بیٹھے دیکھا ٹیکسی لہرا کر رہ گئی۔ "ذرا ہوش میں رہ کر چلاؤ ٹیکسی!" میں نے اُسے سخت لہجے میں ڈانٹا۔ "کیا ٹکراؤ گے کسی اور گاڑی سے!"

"تم... تم کک... کون ہو؟" ٹیکسی ڈرائیور ہکلانے لگا۔ اُس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔

"میں فرعون خوفو کی روح ہوں۔" میں یہ کہہ کر ایک دم ہنس پڑا، پھر بولا: "میں ایسے ہی موقعوں پر عموماً نمودار ہو جاتا ہوں جب کسی کے دل سے خوفِ خدا نکل جاتا ہے۔"

"نن... نہیں! تم... تم جھوٹ بول رہے ہو... تم فر... فرعون کی روح نہیں ہو سکتے!" ٹیکسی ڈرائیور خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"اگر ایسا ہی ہے چاہتے، تو پھر ٹیکسی کا رُخ تبدیل کر لو اور پُرانے قاہرہ کی طرف چلو۔ تم بے سبب کافی پیٹرول پھونک چکے ہو۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا ہے آپ ڈرائیور سے یہ... یہ کیا باتیں کر رہے ہیں؟" نبیلہ جو اب تک خاموشی سے میری اور ڈرائیور کی گفتگو سن رہی تھی، بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"تم خاموشی سے بیٹھی رہو، فکر کی کوئی بات نہیں!" میں نے نرم آواز میں نبیلہ کو سمجھایا۔ "ذرا یہ حضرت راستہ بھول گئے تھے، میں انھیں گھر کا راستہ بتا رہا ہوں۔"

اس دوران میں ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی کو سڑک کی ایک جانب روک چکا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟ ٹیکسی کیوں روک دی تم نے؟" میں اُس سے مخاطب ہوا۔

"خدا کے لیے تم دونوں میری ٹیکسی سے اُتر جاؤ۔" وہ مرنگر خوفزدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: "مجھے... نہیں... مجھے نہیں جانا پُرانے قاہرہ!"

"سوچ لو! میں فرعون خوفو کی روح ہوں۔ مجھ سے جھگڑا کر کے تم مصیبت ہی میں رہو گے۔ میں تمھیں بھی اپنے ساتھ مقبرے میں کھینچ لے جاؤں گا!"

"ایسی... ایسی باتیں نہ کرو اور... اور خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو تم لوگ! میں... میں بیوی بال بچوں والا آدمی ہوں۔" وہ گھگھیانے لگا۔

"اور ابھی جو کچھ دیر پہلے تمھارے دل میں شیطان سما گیا تھا،"

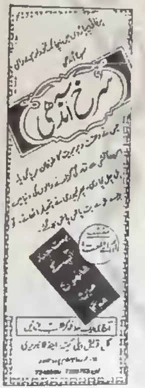

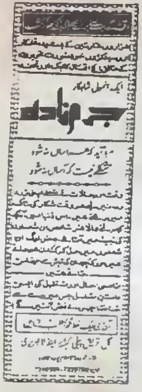

اُس وقت تمھیں بوری بیچے یاد نہیں آئے تھے!"
میری بات سن کر وہ اور بھی خوف زدہ نظر آنے لگا۔ "اب... اب مجھ سے کبھی... کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی... خدا کے لیے معاف کر دو!"
اُس ٹیکسی ڈرائیور کے لیے اتنی ہی سزا کافی تھی، یوں بھی اُس کی ٹیکسی میں سفر کرنا خطرناک ہی تھا۔ وہ خوف اور گھبراہٹ میں کہیں بھی ٹیکسی ٹکرا سکتا تھا۔ فرعون خوفو کی روح کے ڈرامے سے وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گیا تھا حالانکہ یہ بات میں نے صرف لطف لینے کے لیے کہی تھی۔
"اچھا جاؤ، معاف کیا، آئندہ کبھی کسی لڑکی کو تنہا دیکھ کر ایسی حرکت نہ کرنا!" میں نے اُس سے تنبیہی لہجے میں کہا، پھر جمیلہ سے بولا۔ "چلو اترو۔"
"مگر ہم گھر کیسے جائیں گے؟" جمیلہ حیرت سے بولی۔
"یہاں سے دوسری ٹیکسی کرلیں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے اتر گیا، میرے فوراً بعد ہی جمیلہ بھی اتر آئی۔ ٹیکسی والا اس طرح ٹیکسی اسٹارٹ کرکے بھاگا جیسے موت کا فرشتہ اُس کے تعاقب میں ہو۔
"آپ اُس ٹیکسی سے اتر کیوں گئے؟" جمیلہ نے مجھ سے پوچھا۔ "اور آپ نے اُس سے یہ کیا کہہ دیا تھا کہ فرعون خوفو کی روح ہیں۔"
ٹیکسی ڈرائیور کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا اس لیے وہ کہیں نہ کہیں ٹیکسی ٹکرا دیتا۔ میں نے خود کو فرعون خوفو کی روح ظاہر کرکے ہی تو اُس سے ٹیکسی رکوائی تھی ورنہ وہ ہمیں کبھی اتارنے پر راضی نہ ہوتا۔" میں نے جمیلہ کو اس طرح سمجھایا جیسے بچوں کو سمجھاتے ہیں۔
"پھر تو آپ نے بہت اچھا کیا۔" جمیلہ مطمئن ہوگئی۔ "وہ اسی لیے آپ سے ڈر کر معافی مانگ رہا تھا۔"
"ہاں اور کیا!" میں نے اُس کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت میری نگاہ ایک خالی ٹیکسی پر پڑی جو اہرام کی طرف سے آرہی تھی۔ وہ پرانے قاہرہ کی طرف دوبارہ واپس جانے پر راضی نہیں تھا، مگر میں نے زیادہ کرائے کا لالچ دیا تو مان گیا۔ کچھ دیر بعد جب ٹیکسی اہرام کے قریب پہنچی تو مجھے پھر اپنے دشمنوں کا خیال آگیا۔ میں اُس عورت کے متعلق سوچنے لگا جو مجھے چکمہ دے کر نکل گئی تھی۔ اب تک میں نے اپنے دشمنوں سے بچنے کی حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ یہی سبب تھا کہ مجھے جلدی جلدی نئی نئی شخصیتیں بھی اختیار کرنی پڑتی تھیں اور اپنے ٹھکانے بھی بدلنے پڑتے تھے، لیکن اب میں اس حکمت عملی کو بدلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب کسی کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ میں کوئی نئی شخصیت اختیار کرتا یا یامہ کے گھر سے کہیں اور فرار ہو جاتا۔ اس میں اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ میری موجودہ شخصیت دشمنوں کی نظر میں آچکی تھی۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ میری سکونت سے بھی واقف ہو چکے ہوں۔ ایسی صورت میں وہ یقیناً مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے اور یوں میرا اور اُن کا ٹکراؤ ناگزیر ہو جاتا۔ انھیں ٹھکانے لگانا اسی وقت ممکن تھا کہ میں اُن کو خود پر حملہ کرنے کا موقع دیتا۔ اسی لیے میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ زندگی اور موت کی یہ جنگ تو ایک عرصے سے جاری تھی اور میں چاہتا بھی تو اس جنگ کو نہیں روک سکتا تھا۔ ہر چند کہ میری دلی خواہش یہی تھی کہ میرے ہاتھوں مزید انسان قتل نہ ہوں، مگر صرف میری خواہش سے کیا ہو سکتا تھا۔ وہ جن کی قضا میرے ہاتھوں لکھی تھی، وہ خود مجھ سے آکر ٹکرا جاتے تھے۔ اب تک اس ٹکراؤ کا ایک ہی نتیجہ نکلتا رہا تھا لیکن میں دوسرا نتیجہ نکلنے سے بھی نہیں گھبراتا تھا۔ جنگ میں یہی ہوتا بھی ہے ایک کی ہار ہوتی ہے اور دوسرے کی جیت۔ میں یہ تو قبول کر سکتا تھا کہ اپنے دشمنوں سے ٹکراؤ کے نتیجے میں خود میرا وجود فنا ہو جائے مگر میرے لیے یہ کسی طور قابل برداشت نہیں تھا کہ میرے دشمن مجھ پر غالب آجائیں۔ اگر کبھی اس جنگ کا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد ہوتا تو وہ یہی ہو سکتا تھا۔ میں یہ جنگ اپنے وجود کی بقا کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی بقا کے لیے لڑ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب تک میں نے ہار نہیں مانی تھی اور ہمیشہ فتح یاب ہی رہا تھا اور یہ فتح میرے لیے بہت عجیب تھی۔ اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دینے کے بعد مجھے دکھ ہوتا تھا۔ اپنی فتح پر میرا دل روتا تھا۔ میں ہر امکانی کوشش کے باوجود اس کرب سے نہیں بچ پاتا تھا۔ میں تمام راستے انھی خیالوں کے بھنور میں چکراتا رہا اور چونکا اُس وقت جب ٹیکسی، مصر قدیمہ کے علاقے میں داخل ہوگئی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی رہنمائی کی اور پھر کچھ دیر بعد یامہ کے گھر کے سامنے ٹیکسی رکوالی۔
ابھی وہ ٹیکسی گئی ہی تھی اور میں گھر کا تالا کھول ہی رہا تھا کہ مخالف سمت سے ایک اور ٹیکسی وہاں آکر رک گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو چونک اُٹھا۔ اُس ٹیکسی سے اُترنے والا اعشی تھا۔ سیاہ فام اعشی، وہی جس سے یامہ کے گھر میں میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا اور جس نے میرے قدموں میں اپنا چاقو ڈال کر گویا مجھے اپنا اُستاد تسلیم کر لیا تھا۔ وہ اب ٹیکسی سے اُتر کر کرایہ ادا کر رہا تھا۔ جمیلہ خلاف توقع اُسے دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ اُس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنے دانتوں کی نمائش کی اور پھر ہاتھ ہلا دیا۔ اسی وقت اُس کی نگاہ جمیلہ پر پڑی اور میں نے اُس کے

چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے۔ مجھے اُس کی حیرت کا سبب معلوم تھا۔ یقیناً وہ جمیلہ کو میرے ساتھ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی حیرت کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ گھر میں تالا لگا ہوا تھا اور اُس نے مجھے تالا کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر میں نے اُسے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے تین بڑے بڑے کریٹ اُتارتے ہوئے دیکھا۔ میں اس دوران میں تالا کھول کر جمیلہ کو دے چکا تھا۔ جمیلہ مجھ سے تقریباً چپکی ہوئی کھڑی تھی۔
"اب کیا ہوگا؟" مجھے جمیلہ کی سرگوشی سنائی دی۔
"کچھ نہیں ہوگا، تم فکر نہ کرو اور اندر جاؤ۔" میں نے اُس سے کہا۔
"اور... اور اگر اندر امی جاگ چکی ہوں تو... تو..."
"نہیں جاگی ہوں گی، تم جاؤ تو سہی!" میں اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ جمیلہ گھر کے اندر چلی گئی اور میں اعشی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس نے ٹیکسی سے وہ تینوں کریٹ اتار کر دروازے کے قریب رکھ دیے تھے۔ جمیلہ کے اندر جاتے ہی اعشی مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟ یامہ کہاں ہے؟ اور... اور آپ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"وہ اندر ہے گھر میں! اور کہاں ہوتی!" میں نے جواب دیا اور پھر اُس کے مزید کسی سوال سے بچنے کی خاطر جلدی سے بولا۔ "یہ تم کیا لے کر آئے ہو؟"
"شراب کے کریٹ ہیں۔" اعشی نے بتایا۔ "مجھے یامہ کا پیغام مل گیا تھا اور میں نے اُس سے کہلوایا تھا کہ شام کو شراب پہنچا دوں گا۔"
"ہوں!" میں نے معاملے کو سمجھ کر طویل سانس لیا۔ پھر اُن کریٹوں کی طرف بڑھا۔ "ارے ارے میں انھیں اٹھا لوں گا۔ آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں!" اعشی میرا ارادہ بھانپ کر جلدی سے بولا۔
"تمھیں دیر لگے گی۔" یہ کہتے ہوئے میں جھکا اور ایک کے اوپر ایک کریٹ رکھنے لگا۔
"یہ کیا کر رہے ہیں آپ! بہت وزن ہو جائے گا۔ تینوں ایک ساتھ نہیں اُٹھائے جا سکتے۔ میں باری باری اندر پہنچا دوں گا۔" اعشی کی بات پوری ہوئی، اُدھر میں نے وہ تینوں کریٹ ایک ساتھ اٹھا لیے اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اعشی حیرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ اُس غریب کو کیا خبر تھی کہ میرے لیے اُس سے چوگنا وزن بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور میں اتنا وزن صرف ایک ہاتھ سے بھی اُٹھا سکتا ہوں۔ میں صحن میں پہنچا اور پھر اپنے کمرے میں داخل ہو کر تینوں کریٹ ایک طرف دیوار سے لگا کے رکھ دیے۔ اعشی میرے ساتھ ساتھ تھا۔
"آپ بھی کمال آدمی ہیں!" اعشی نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔" میں اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اعشی میری طرف بڑھا اور اسی وقت میں نے اُس کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ اعشی! میرے ذہن نے اُس کے ذہن کو مخاطب کیا۔ تم یہ بھول جاؤ گے کہ میرے ساتھ جمیلہ کو کہیں سے آتے ہوئے دیکھ چکے ہو اور تمھیں یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ اُس وقت گھر میں تالا پڑا ہوا تھا۔ تمھیں صرف یہ معلوم ہے کہ تم نے دروازے پر دستک دی، میں نے تمھارے لیے دروازہ کھولا اور پھر تم شراب کے کریٹ اندر لے آئے۔ اس کے سوا تمھیں کچھ خبر نہیں۔
"ہاں مجھے بس یہی معلوم ہے۔" اعشی میرے ذہن کے زیر اثر بڑبڑایا اور پھر میں نے اُس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ یامہ کو اس بارے میں کچھ معلوم ہو۔ اعشی کے ذہن سے وہ تمام باتیں محو ہو چکی تھیں جو کچھ دیر پہلے میرے اور اُس کے درمیان ہوئی تھیں۔ اسی لیے اُس نے ایک بار پھر یامہ کے متعلق پوچھا۔
"وہ خالہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں؟ مجھے ٹھیک سے خبر نہیں۔ میں تو بس تمھارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی جاگا ہوں۔ میں بھی دوپہر کے

غالب بھوپالی سے خبر کلو پر بریگیڈیئر فروشوں کی لرزہ خیز داستان
اپنے وقت کا مقبول ترین سلسلہ
جانباز
(۳ حصے)
تحریر: ایم۔ اے۔ راحت
○ سازشوں اور اسلام دشمن گروہوں کے انکشاف سے پر ایک انوکھی دستاویز
○ قل ابیب سے تربیت یافتہ موساد کے ایجنٹوں کے بیانکس روپ
قیمت: 40 روپے ڈاک خرچ: 15 روپے
ملنے کا پتہ: ناشر
گل قریشی لائبریری، 14- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔
فون: 7229762-7248599

کھانا کھا کے سو گیا تھا۔" میں نے اُس کی بات کا جواب دیا، پھر بولا۔ "تم شاید شراب کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہو گے!"

"نہیں، رقم اُس نے بھجوا دی تھی، صبح ہی!" اشنی نے بتایا۔

"کس کے ہاتھ؟" میں نے سوال کیا۔

"ضرورت پڑنے پر میرے ساتھ وہ ہمیشہ اُسی نوجوان کو بھیجتی ہے جو پڑوس میں رہتا ہے۔ میں صورت سے جانتا ہوں، اُسے نام معلوم نہیں۔"

"کیا وہ اکیلا رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! اُس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی رہتی ہے جسے وہ اپنی خالہ بتاتا ہے۔ یمامہ کو تو خیر یہ غلط فہمی ہے کہ وہ نوجوان اُس کی خاطر بیقرار رہتا ہے۔ لیکن میری اطلاع کے مطابق اُس نوجوان کو نبیلہ سے دلچسپی ہے۔ ویسے میں نے اس سلسلے میں یمامہ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرا اور یمامہ کا تعلق کاروباری نوعیت کا ہے اور میں اسے اسی حد تک رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ کبھی کوئی اور تعلق نہیں رہا تمہارا یمامہ سے؟" میں نے یوں ہی اُسے چھیڑنے کی خاطر پوچھ لیا۔

"یہ بہت عرصے پہلے کی بات ہے، برس گزر گئے اس بات کو، اُس وقت میں بھی جوان تھا اور وہ بھی! بس پاگل بنا دیا تھا اُس نے۔"

"کیوں! اب کیا ہو گیا ہے؟"

"اب۔" اُس نے طویل سانس لیا۔ "وہ اب بہت کاروباری ہو گئی ہے۔ اب اُس میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ بڑی لالچی ہو گئی ہے وہ! اُس کے ذہن پر ہر وقت نوٹ سوار رہتے ہیں اور یوں بھی اب..."

"رُک کیوں گئے، کہو نا کیا کہہ رہے تھے!" میں نے اُسے ٹوکا۔

"آدمی کا ذوق بھی تو بدلتا رہتا ہے۔" وہ کچھ خجل سا ہو کر بولا۔

میں اُس کی خجالت کا سبب سمجھ گیا۔ اُس کا ذوق بدل گیا تھا۔ وہ یقیناً اسی لیے یمامہ کو نبیلہ کے حصول کی خاطر مجبور کر رہا تھا۔ اُس کی خجالت کی وجہ بھی یہی ہو سکتی تھی۔ اُسے وہ واقعہ یاد آ گیا ہوگا۔ پھر اُس نے مجھ سے رخصت کی اجازت چاہی تو میں نے اُسے مزید نہیں روکا۔ یوں بھی مجھے نبیلہ کا خیال تھا جس کے ذہن میں جانے کیا کیا وسوسے اور خدشے جنم لے رہے ہوں گے۔ میں اشنی کے ساتھ ہی اُٹھا اور پھر وہ چلا گیا تو گھر کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں واپس جانے کی بجائے یمامہ کے کمرے کا رُخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ یمامہ اب تک بیدار نہیں ہوئی ہوگی۔ بس کچھ دیر بعد ہی جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میرے خیال کی تائید ہو گئی۔ نبیلہ سہمی ہوئی سی اُس پلنگ پر بیٹھی تھی جو مسہری کی مخالف سمت بچھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"گھبراؤ مت، بیٹھ جاؤ۔" میں اُس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں نے اُسے سمجھا دیا ہے، وہ تمہاری ماں کو کچھ نہیں بتلائے گا۔"

"لیکن... لیکن اُس نے بتا دیا تو... تو کیا ہوگا؟" اُس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"نہیں بتلائے گا نا!" میں اُس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اُس کے بعد میں بھی قریب بیٹھ گیا۔ "دیکھو تم اپنی ماں کے سامنے ذرا سی گھبراہٹ کا بھی اظہار نہیں کرو گی۔ تم دیکھ ہی رہی ہو کہ وہ اب تک سو رہی ہیں اور اُنھیں کچھ خبر نہیں کہ تم میرے ساتھ کہیں گئی تھیں۔" میں اُسے سمجھانے لگا۔ "اگر تمہاری ماں کو تمہارے رویے سے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو تمہیں معلوم ہے کہ پھر میں یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ پھر تم خود سوچو کہ میں چلا گیا تو تمہیں سیر کرانے کون لے جائے گا! تم دوبارہ گھر میں قید ہو جاؤ گی۔ اب ہنسو! ہنسو نا!" یہ کہتے ہی میں نے اُس کے گدگدی کر دی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو میں بولا۔ "اب ہوئی نا بات!" پھر میں نبیلہ کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ یمامہ کو میں نے اتنی گہری نیند سلا دیا تھا کہ وہ دوسرے دن صبح تک سوتی رہتی۔ میں نے اسی لیے اُسے جگانا ضروری سمجھا۔ میں نے اُس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں کی۔ نبیلہ کو میں بتا آیا تھا کہ اب سُنگھائی جانے والی دوا کا اثر ختم ہونے والا ہے اور اُس کی ماں جلد ہی بیدار ہو جائے گی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی یمامہ میرے کمرے میں آ گئی اور آتے ہی بولی۔ "آج تو حد ہو گئی۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"کیا؟" میں انجان بن کر بولا۔

"اتنی گہری نیند آئی کہ سوتے سوتے شام ہو گئی۔" اُس نے کہا اور پھر اُس کی نگاہ کربوں پر پڑی۔ "ارے کیا اشنی یہ دے گیا؟"

"ہاں ابھی کچھ دیر پہلے دے کر گیا ہے وہ۔" میں نے اُسے بتایا۔

"دروازہ کس نے کھولا تھا اُس کے لیے؟" اپنی تجسس فطرت کے پیشِ نظر اُس نے سوال کیا اور میرے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔

"میں نے کھولا تھا دروازہ، کیوں؟"

"میں سمجھ رہی تھی کہ شاید نبیلہ گئی ہو دروازہ کھولنے!" اُس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا، یوں جیسے اُس کے ذہن سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔ پھر اُس نے وضاحت بھی کی۔ "تمہیں تو خبر ہی ہے کہ وہ بڑا بدنظر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ نبیلہ اب کبھی اُس کے سامنے پڑے! تم سمجھ

رہے ہو نا!"

"اب وہ کبھی نبیلہ کی طرف بُری نظر نہیں اُٹھائے گا۔"

"تم نہیں جانتے ضیغم کہ ان لوگوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔"

"پھر بھی بُرے لوگوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔"

"خیر بہت ہو چکا، اُٹھو! میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

مجھے اُس وقت گمان بھی نہیں تھا کہ وہ دن ایک ہنستی کھیلتی زندگی کا آخری دن ہوگا اور یہ اچھا ہی ہے کہ وقت سے پہلے آدمی کو اپنی موت کی خبر نہیں ہوتی۔ آخری وقت تک وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ ابھی تو ہرگز اُس کی باری نہیں آئی۔ وہ جنھیں کسی جرم میں سزائے قید ہو جاتی ہے۔ جنھیں اپنی موت کے دن اور وقت کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے وہ یقیناً وقت سے پہلے ہی مر جاتے ہوں گے۔ میں نے ایران کے دوران قیام میں ایک ایسے بدنصیب شخص کو دیکھا تھا جسے پھانسی ہونے والی تھی۔ میں دراصل یہی مشاہدہ کرنا چاہتا تھا کہ اگر آدمی کو اپنی موت کے وقت کی خبر ہو جائے تو اُس پر کیا گزرتی ہے اور کیا عالم ہوتا ہے اُس کا۔

صبح اُسے پھانسی پر چڑھایا جانے والا تھا۔ رات کو اُس کی کوٹھری میں محافظوں نے ایک بڑے ڈرم میں پانی رکھ دیا اور اُس سے کہا کہ وہ غسل کر کے اپنے عقائد کے مطابق عبادت کر لے۔ یہ بات میرے لیے واقعی عجیب ہی سی تھی کہ اُس شخص نے نہ تو غسل کیا اور نہ عبادت کی۔ وہ تمام رات جاگتا رہا، اور اسی دوران میں اُس نے سارا ڈرم خالی کر دیا۔ وہ ڈرم کا سارا پانی پی گیا۔ پھر صبح وہ "پانی پانی" چلا رہا تھا۔ یقیناً موت کی دہشت سے اُس کے جسم کا سارا پانی سوکھ گیا تھا۔ صبح جب پھانسی پر چڑھانے کے لیے اُسے کوٹھری سے نکالا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔ اُسے دو محافظ تقریباً گھسیٹتے ہوئے پھانسی کے چبوترے تک لے گئے تھے۔ اُس کے جسم میں گویا جان ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی موت سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ پھر مقررہ جگہ کھڑا کرنے کے بعد اُس سے اُس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو بھی اُس نے پانی ہی مانگا۔ پانی پیتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس کے بعد دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ پھر دونوں پیروں کو بھی باندھ دیا گیا۔ اُسے ایک سیاہ نقاب پہنا دی گئی جس سے اُس کا چہرہ چھپ گیا۔ اسی کے ساتھ جلاد نے اُس کی گردن میں پھندا ڈال دیا۔ پھر ایک ہاتھ بلند ہوا، ایک رومال ہوا میں لہرایا اور ایک چراغ بجھ گیا۔ مجھے "چھپاک" کی سی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی وزنی شے پانی میں گری ہو، مگر وہ اُس بدنصیب شخص کی گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز تھی۔ میں نے اُسے پھانسی دیے جانے کے بعد بھی دیکھا تھا جب ڈاکٹر ایک تیز نشتر سے اُس کی کونچیں کاٹ رہا تھا تاکہ اگر اُس میں زندگی کی ذرا سی رمق باقی ہو تو وہ بھی ختم ہو جائے۔ اُس کی گردن کھنچ کر بہت لمبی ہو گئی تھی، زبان منہ سے باہر آ گئی تھی، چہرہ پھول سا گیا تھا اور دونوں آنکھوں کے ڈھیلے جیسے باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ اتنا بھیانک چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ موت کو کسی پر رحم نہیں آتا، چاہے وہ حسین ہو کہ بدصورت، بادشاہ ہو یا فقیر۔

یمامہ، شام ہی سے اخلاقی اخلاقی سی پھر رہی تھی۔ میری ظاہری عمر اور اُس کی عمر میں بہرحال بہت فرق تھا۔ وہ مجھے پانے کی آرزومند تھی۔ اُسے صرف یہ خبر تھی کہ آج کی شب وہ ایک نئے دیارِ لذت میں قدم رکھنے والی ہے۔ ابھی رات کے آٹھ بھی نہیں بجے تھے کہ وہ ایک بار پھر میرے کمرے میں آ گئی۔ "تمہیں معلوم ہے ضیغم کہ میں نے یہ نیا جوڑا کیوں نہیں اُتارا؟" وہ آتے ہی چہکی۔

"کیوں؟" میں نے دانستہ انجان بن کر پوچھا۔

"اس لیے ضیغم کہ آج..." اُس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا، پھر جلدی سے بولی۔ "تم سمجھ رہے ہو نا!" میں سب کچھ سمجھ رہا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میری رگوں میں لہو سنسنانے لگا تھا۔ پھر اُس نے مجھ سے کھانا اور شراب لانے کے لیے پوچھا۔ میں بولا۔ "شراب تو یہیں موجود ہے، ہاں کھانا لے آؤ اور گلاس وغیرہ بھی، لیکن اتنی جلدی کیا ہے!"

"میرے پاس عمدہ شراب کی ایک بوتل اور نکل آئی ہے، میں اُس کے لیے کہہ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں الماری درست کر رہی تھی تو مجھے وہ بوتل مل گئی۔ تمہیں تو خبر ہی ہوگی کہ شراب جتنی پُرانی ہو اُتنا ہی مزہ دیتی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"

"مگر کل تو تم کہہ رہی تھیں کہ صرف..."

"میں نے کہا نا کہ رکھ کر بھول گئی تھی، وہ بوتل۔" اُس نے میری بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ "تم سمجھ رہے ہو نا!"

"اچھا تو پھر لے ہی آؤ، لیکن شرط وہی ہے کہ آج بھی تم اپنے ہاتھ سے پلاؤ گی۔"

"مجھے منظور ہے، مگر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"بولو!"

"میں نہیں پیوں گی آج!"

"وہ کیوں؟"

"بس آج کچھ دل نہیں چاہ رہا۔ تم سمجھ رہے ہو نا! کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ کسی چیز کو دل نہ چاہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں نے کہا۔ "پھر کیا خاک لطف آئے گا پینے میں!" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آج شراب پینے سے کیوں گریز کر رہی ہے۔

"کیا تم میری اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتے منیم!" اس نے اپنی قاتل نگاہیں میری طرف اٹھائیں۔

"ایسی نظروں سے نہ دیکھو یمامہ! ورنہ واقعی میں تمھاری بات مان لوں گا۔"

"تمھیں ماننی ہی پڑے گی میری بات! تم سمجھ رہے ہو نا!" وہ بڑے ناز سے بولی۔ اور پھر واقعی میں نے اس کی بات مان لی۔ وہ اُن لمحوں میں مجھ سے اپنی ہر بات منوا سکتی تھی۔ پھر جلد ہی یمامہ کھانا لے آئی اور شراب کی وہ بوتل بھی جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔

"اس ایک بوتل سے کیا ہوگا اور نکال لو۔" میں نے اس سے کہا۔

"اور بھی نکال لوں گی۔ یہ تو پی لو پہلے!" وہ مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے پہلے اسے ہی ختم کر لیتا ہوں۔ کھولو! اور ہاں نبیلہ کہاں ہے؟"

"کمرے میں کھانا کھا رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر بھی یہ کرو کہ دروازہ بند کر دو۔"

"ابھی سے؟" اس نے نگاہوں کے تیر چلائے۔

"ہاں تمھیں احتیاط برتنی چاہیے۔"

"میں نے تمھیں بتایا تو تھا کہ وہ مہمانوں کی موجودگی میں اِدھر نہیں آتی۔ پھر بھی تم کہتے ہو تو بند کیے دیتی ہوں دروازہ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپہر کو نبیلہ نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، اگر میں یمامہ کو بتا دیتا تو اس کی ساری خوش فہمی دور ہو جاتی۔ وہ اسی خیال میں تھی کہ اس کی نوجوان بیٹی اس کے حکم سے روگردانی نہیں کر سکتی اور اُسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ بچوں میں بڑوں سے زیادہ تجسس کا جذبہ ہوتا ہے۔

دروازہ بند کر کے یمامہ پھر میرے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی اور اس نے کرسی ہی کے قریب رکھی ہوئی شراب کی بوتل اٹھالی۔ اُسے کھولنے لگی۔ "آخر تم باز نہیں آئیں! ایک ہی گلاس لے کر" میں نے مسکرا کر کہا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولی اور خود بھی مسکرا دی گئی۔ اس وقت وہ واقعی بہت حسین نظر آ رہی تھی۔ لیکن ایک تبدیلی میں نے اور بھی محسوس کی کہ وہ اس وقت خوشبو بھی لگا کر آئی تھی۔ "یمامہ تو خود ایک مہکتا ہوا پھول ہو تمھیں خوشبو لگانے کی کیا ضرورت تھی" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تو ہر وقت مہکتے رہتے ہو منیم!" وہ گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے بولی۔ "تم بڑی مست کر دینے والی خوشبو استعمال کرتے ہو۔ تم شاید کوئی عطر لگاتے ہو!"

"ہاں!" میں نے چونکے بغیر اس کی تائید میں کہا کیونکہ یہ بات میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ کئی بار میرے اتنے قریب آ چکی تھی کہ میرے جسم کی خوشبو محسوس کر سکتی تھی۔ یمامہ نے گلاس میں شراب انڈیلنے کے بعد اسے میرے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی میری طرف اٹھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور گلاس سے ہونٹ لگا دیے۔ پھر میں نے اسی وقت گلاس سے ہونٹ ہٹائے جب شراب ختم ہو گئی۔ یمامہ کی آنکھوں میں بھی ساری مستی شراب کی سی تھی۔ مجھے دھیرے دھیرے نشہ ہونے لگا۔ پھر وہ بوتل ختم ہونے تک میں بہک ہی گیا۔ میرے بہکنے میں کچھ ہاتھ یمامہ کا بھی تھا۔ اس وقت مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں رہا تھا، میں کون ہوں؟ میری اصل عمر کیا ہے؟ میں کن حالات کا شکار ہوں؟ میں پہلی بار بہک رہا تھا۔ مجھے پہلی بار نشہ ہوا تھا۔ جب آدمی پہلی بار بہکتا ہے۔ تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ اُسے کچھ ہوش نہیں رہتی۔ شاید اسی لیے مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں کہ ابتدا کیسے اور کیسے ہوئی، وہ لمحات کس طرح گزر گئے! بس ایک تیز آگ سی تھی جو میرے سارے وجود میں گردش کر رہی تھی، لہو کی ایک ترنگ تھی جو مجھے اپنے ساتھ انجانے جہانوں میں لیے جا رہی تھی۔ وہاں ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے، رنگ اور خوشبو! خوشبو کی برسات اور میں! میری آنکھیں تیز نشے سے بوجھل ہو کر دھندلانے لگیں اور پھر جیسے ہر طرف تیز ہوائیں سنسنانے لگیں۔ جیسے آندھیاں چلنے لگیں۔ پھر طوفان کی شدت بڑھ گئی۔ ہوائیں جیسے پاگل ہو گئی تھیں۔ شاید مجھے اسی لیے ہواؤں کے شور میں وہ احتجاجی صدائیں سنائی نہیں دی تھیں جو کچھ ہی دیر بعد چیخوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ طوفان کے دوران کچھ سنائی ہی کب دیتا ہے۔ سو میں نے بھی کچھ نہ سنا۔ کاش میں اس قدر نہ بہک گیا ہوتا

اور کاش میری سماعت مفلوج نہ ہو گئی ہوتی تو شاید میں وہ ہولناک منظر نہ دیکھتا جو مجھے طوفان گزر جانے کے بعد نظر آیا۔

میں کچھ دیر اس منظر کو پتھر سا بنا ہوا دیکھتا رہا، یوں جیسے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر اچانک ہی کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ دروازے پر دستک دینے والی نبیلہ ہی ہو سکتی تھی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے فوراً ہی نبیلہ کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "تم نے کچھ نہیں سنا! تم نے کسی کی چیخیں نہیں سنیں۔ جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔ تمھیں نیند آ رہی ہے، بہت ہی گہری نیند!" نبیلہ نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی۔ اس کا احساس مجھے اس کے دور ہوتے قدموں کی چاپ سے ہوا۔

وہ ناقابلِ یقین صورت حال اب پوری طرح میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ سب کچھ اسی طوفان کا اثر تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ سب کچھ ان طوفانی شدتوں کا نتیجہ تھا جنھوں نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا ورنہ وہ خوب صورت کھلونا اس لیے نہیں تھا کہ توڑ دیا جاتا۔ اس کی نیلی آنکھیں ایک دہشت کے عالم میں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں جن میں بجلیاں سی کوندتی تھیں اب بے نور ہو چکی تھیں۔ اسے دیکھ کر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کو کسی درندے نے بھنبھوڑ ڈالا ہو، روند دیا ہو اُسے! میں نے آگے بڑھ کر اس کے اوپر چادر ڈال دی۔ مجھ میں وہ ہولناک نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

"یہ ... یہ کیا ہو گیا؟ ... کیا کر دیا میں نے!" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ میرا دل رونے لگا۔ آج تک میرے ہاتھوں صرف میرے دشمن ہی ہلاک ہوئے تھے، مگر یمامہ تو میری دشمن نہیں تھی، وہ میرے ہاتھوں کیوں ماری گئی؟ زندگی میں پہلی بار مجھے گناہ کا شدید احساس ہوا۔ مجھ سے واقعی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ میں سوچنے لگا، اس گناہ کا تدارک بھی ممکن نہیں! اب نبیلہ کا کیا ہوگا؟ اُسے تو میں نے بالکل بے سایہ کر دیا ہے۔ اس کا کیا مستقبل ہوگا؟ کیا یہ دنیا اُسے عزت و آبرو سے جینے دے گی؟ اس کی ماں جیسی بھی تھی، اس کے لیے تو شجر سایہ دار تھی۔ میری روح جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹتی رہی اور مجھے نہیں معلوم کہ کب ان دہکتے ہوئے انگاروں کو سرد کرنے کے لیے میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ میں جانے کب تک یونہی روتا رہتا کہ اچانک ہی مجھے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ میں چونک اٹھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے! میں نے اپنے ذہن کو قابو میں کرنا چاہا، مگر ناکام رہا۔ مجھے اپنا دل بھی بیٹھتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اس کیفیت سے میں صرف ایک بار ہی دوچار ہوا تھا۔ اس وقت جب روسی ایجنٹ میخائیل نے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی اور میں وہ شراب پی گیا تھا۔ یہ واقعہ مجھے بغداد کے دوران قیام میں پیش آیا تھا۔ اگر میں پہلے بھی ایسی ہی کیفیت سے نہ گزر چکا ہوتا تو یقیناً دھوکا کھا جاتا۔ میں نے صرف ایک ہی بوتل شراب پی تھی۔ اس سے میری یہ حالت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً شراب میں بے ہوشی کی دوا ملائی گئی تھی۔ ایسا کس نے کیا تھا اور کیوں؟ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اب کسی بھی لمحے ہوش و حواس کھو سکتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ ہوش کھو بیٹھتا، میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا۔ میرے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔

شراب میں یقیناً بے ہوشی کی دوا خاصی مقدار میں ملائی گئی تھی۔ میں نصف شب گزرنے کے بعد ہی ہوش میں آ سکا۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے۔ ہوش میں آ کر میں نے خود کو اسی کمرے میں پایا۔ یمامہ کی لاش اسی طرح اب تک بستر پر پڑی تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دروازہ بھی بدستور بند ہی تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میرے دشمن وہاں تک نہیں پہنچ سکے تھے یا پھر خود نہیں آئے تھے۔ پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہا تھا کہ میرے دشمنوں نے مجھے زیرِ دام لانے کی خاطر یمامہ کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ شراب کی وہ بوتل یقیناً انھوں نے یمامہ کو دی ہوگی اور اس کے عوض اسے بھاری معاوضہ دیا ہوگا۔ اب اسی وقت ہو سکتا تھا جب میں گھر سے نکلا تھا۔ اس دوران میں کوئی نہ کوئی یمامہ سے ملا ہوگا۔ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے میں نے فوراً ہی نبیلہ کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ وہ گہری نیند میں تھی اور اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یمامہ سے ملنے کوئی آیا تھا یا نہیں۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یمامہ سے ملنے والی ایک غیر ملکی عورت تھی، مگر وہ زیادہ دیر نہیں رکی تھی۔ نبیلہ نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ اس وقت جب یمامہ اس عورت کو رخصت کرنے جا رہی تھی۔ نبیلہ نے اس عورت اور اپنی ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی، ہاں اس نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ جب وہ عورت چلی گئی تھی تو یمامہ نے بڑے نوٹوں کی کئی گڈیاں الماری میں رکھی تھیں، اور ایک بوتل بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس بوتل کو بھی یمامہ نے الماری میں رکھ دیا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی جان لینا کافی تھا۔ میں نے نبیلہ کے ذہن سے رابطہ منقطع کر لیا۔ میرا قیاس سو فی صد درست ثابت ہوا تھا۔

آج دن کے وقت ابرام میں بھی مجھ سے ایک عورت ہی ٹکرائی تھی اور یمامہ سے بھی ایک عورت ہی ملی تھی۔ یہ تو مجھے یقین تھا وہ عورت روسی ایجنٹ ہرگز نہیں ہو سکتی، وہی روسی ایجنٹ جسے میں [illegible] کہتا تھا۔ اگر وہ ہوتی تو اتنی جلدی میرے مقابلے سے نہ بھاگ گئی ہوتی۔ اُس کے پاس مجھ سے نمٹنے اور مجھے زیر کرنے کے بہت سے حربے تھے جن کا میں تجربہ کر چکا تھا۔ پھر یہ کہ اُس کے جسم سے گلابوں کی خوشبو بھی نہیں آتی تھی۔ میں اُس کے قریب جا چکا تھا۔ میں جلد ہی اس نتیجے تک پہنچ گیا کہ اُس عورت کا تعلق چین ہی سے ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ مجھے چینی ایجنٹ لوئی چو یاد آگئی جسے میں قتل کر چکا تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مجھے اپنے دشمنوں کی تعداد کا علم تھا۔ ان کا تعلق تین ملکوں سے ہو سکتا تھا، روس، امریکہ اور چین سے! تھری ناٹ جیسے عیار اور خطرناک ایجنٹ کی موجودگی میں کسی اور امریکی ایجنٹ کی آمد کا سوال ہی نہیں تھا۔ میرے ہاتھوں اُس کی ہلاکت کا یقین ہو جانے کے بعد ہی امریکہ اپنے کسی نئے خطرناک ایجنٹ کو بھیجتا۔ رہا روس تو روس کی ایجنٹ میرے لیے تھری ناٹ سے بھی زیادہ خطرناک

ثابت ہوئی تھی۔ تاہم روس میں اُس کے ہوتے ہوئے کسی اور روسی ایجنٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ کم از کم اب روس اور امریکہ میرے پیچھے ایک سے زیادہ ایجنٹوں کو نہیں لگاتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اب تک اُن کے متعدد بہترین ایجنٹ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ اُن کی زیادہ تعداد سے اب تک انہیں ہی نقصان ہوتا رہا تھا اس لیے انھوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر دی تھی۔ جو ایجنٹ بھی جب بھی روس اور امریکہ کی طرف سے میری تلاش میں بھیجا جاتا تھا، وہ مقامی ایجنٹوں ہی سے کام چلانے کی کوشش کرتا تھا۔ ہاں چین کا رویہ اس سلسلے میں ابھی نہیں بدلا تھا، لیکن جوزف خا اور لوئی چو کی ہلاکت کے بعد اتنی جلدی دوسرے چینی ایجنٹ، قاہرہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا نکتہ تھا جس پر میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ پھر یہ چینی عورت کون ہو سکتی ہے؟ بار بار یہ ایک ہی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔

میرے ہاتھوں کیرو شیرٹن میں ہلاک ہونے والی لوئی چو ہی تھی، اس کے میرے پاس صرف دو واضح ثبوت تھے، ایک تو اُس عورت کے جسم سے آنے والی گلابوں کی خوشبو اور دوسرا ثبوت وہ خطرناک ہتھیار! لوئی چو مجھے اپنی موت کا فریب بھی تو دے سکتی ہے تاکہ میں اُس کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں اور اس دوران میں وہ بہت سکون و اطمینان کے ساتھ میرے اوپر حملے کی تیاریاں کر سکے۔ معاً میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ مجھے علم تھا کہ اُس کے پاس ایسا محلول موجود تھا جسے ایک بار جسم پر اسپرے کرنے کے بعد پورے ایک مہینے جسم سے گلابوں کی خوشبو آسکتی تھی۔ کیا وہ مجھے فریب دینے کے لیے کسی مقامی ایجنٹ کے جسم پر اسپرے نہیں کر سکتی تھی؟ اس سوال کا جواب اثبات ہی میں ہو سکتا

تھا۔ پھر اپنے فریب کو یقینی بنانے کی خاطر لوئی چو نے اُس مقامی ایجنٹ کو وہ خطرناک ہتھیار بھی دے دیا۔ میرا ذہن ایک کہانی ترتیب دینے لگا۔ ایسا اُس نے اُسی وقت کیا ہو گا جب میری قیام گاہ کی تلاش میں بھیجے جانے والے مقامی چینی ایجنٹوں سے ٹرانسمیٹر پر اُس کا رابطہ قائم نہیں ہوا ہو گا۔ لوئی چو اس سے کھٹک گئی ہو گی۔ اُس نے یقین کر لیا ہو گا کہ دونوں مقامی ایجنٹ میرے ہتھے چڑھ گئے ہیں اور ان سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد میں یقیناً کیرو شیرٹن کا رُخ کروں گا۔ پھر اُس نے ایک ہی تیر سے دو شکار کیے۔ ایک طرف تو اُس نے مجھے اپنی موت کا فریب دیا اور دوسری طرف اُس خطرناک ہتھیار کے اند[ر]

پوشیدہ عجیب شے کے ذریعے میری سکونت کا سراغ لگا[یا]۔ اس کامیابی کے بعد لوئی چو نے اپنے پاس موجود دوسرے

دوسرے ہتھیار کو دریائے نیل میں پھینک دیا تاکہ میں ہتھیار میں پوشیدہ عجیب شے کو تلاش بھی کر لوں تو اُس کی مدد سے لوئی چو تک نہ پہنچ سکوں۔ صحیح اندازے اور بروقت درست نتائج ہی ایسے خطرناک حالات میں سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ لوئی چو نے یقیناً صحیح اندازے لگائے تھے اور درست نتائج اخذ کیے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے اتنی جلدی تلاش کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتی۔

لوئی چو زندہ ہے اور اُس نے مجھے اپنی موت کا فریب دیا ہے

اس خیال نے میری کئی اُلجھنیں رفع کر دیں۔ یمامہ کو آلۂ کار بنانے والی وہی ہو سکتی تھی، لیکن وہ آئی کیوں نہیں؟ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ جو اس سوال کا کوئی قطعی جواب دے سکتی تھی موت کی نیند سو چکی تھی یعنی یمامہ! اب میں صرف قیاس ہی کر سکتا تھا

کہ لوئی چو اپنی کامیابی کا یقین ہونے کے باوجود وہاں آئی کیوں نہیں۔ اگر وہ آئی بھی تھی تو گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ وہ غیر معمولی ذہن کی مالک تھی اور اس کے لیے کسی دوسرے ذہن سے رابطہ قائم کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا، اس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اُس نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے یمامہ کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا چاہا ہو۔ یمامہ سے وہ ذہنی رابطہ قائم نہ کر سکی ہو گی تو اُس نے یقین کر لیا ہو گا کہ راز کھل چکا ہے اور میں یمامہ کو ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ اس کے بعد وہ نہیں رُکی ہو گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ لوئی چو نے یمامہ کو کوئی ایسی ہدایت دی ہو جس پر وہ اپنی غیر متوقع موت کے سبب عمل نہ کر سکی ہو۔ لوئی چو اس طرح بھی چوکنا ہو سکتی تھی، کیونکہ یمامہ میرے بے ہوش ہونے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔

لوئی چو کے متعلق سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر موجودہ صورت حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ خیال نبیلہ کا تھا۔ اُس کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا اور اس کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ مجھے یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی ہے یا نہیں! کچھ بھی ہو، میں اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کو یوں بے سہارا نہیں چھوڑوں گا۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے اُس پردیسی نوجوان کا خیال آیا جس کا ذکر اختر نے کیا تھا کہ وہ نبیلہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس دلچسپی کو محبت میں بھی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح نبیلہ کو تحفظ مل سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل ہی دوبارہ وہاں آ کر یہ مسئلہ حل کر دوں گا۔ میں ایک دن بھی نبیلہ کو بے سہارا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مگر فی الحال پہلی ضرورت یہ تھی کہ میں اس گھر سے فرار ہو جاتا ورنہ یمامہ کے قتل کا الزام مجھ پر آتا۔ ایسی صورت میں مجھے دوسرے میک اپ کی بھی ضرورت تھی اور کسی نئے ٹھکانے کی بھی! اور ظاہر ہے کہ وہ نیا ٹھکانا کوئی ہوٹل ہی ہو سکتا تھا۔ کیوں نہ میں اس بار کیرو شیرٹن ہی میں ٹھہروں؟ میں نے سوچا۔ میرے یہ سوچنے کا سبب بھی لوئی چو تھی۔ اس امکان کو بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اب وہ وہیں ہو۔ اُسے بہرحال یہ اطمینان حاصل تھا کہ وہ مجھے فریب دینے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ پھر اُسے اپنی سکونت تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی! لیکن احتیاطاً وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ایک موہوم سی اُمید پر وہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میں اطمینان سے میک اپ کرنے بیٹھ گیا۔ میں اس سے قبل اپنے وجود کی تجسیم کر چکا تھا۔ میک اپ سے فارغ ہونے

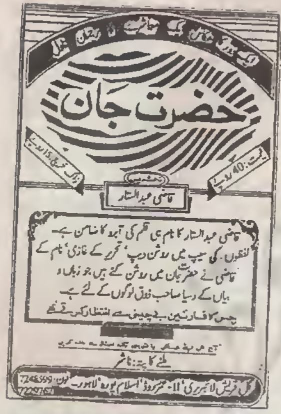

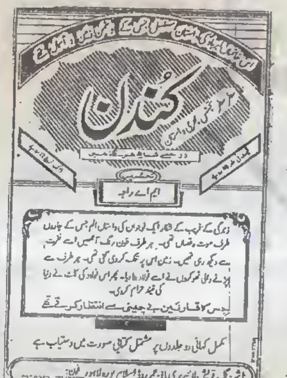

کے بعد میں نے اپنا تمام سامان سمیٹا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ یمامہ کا گھر بھی مجھ سے بہت جلد چھوٹ گیا تھا۔ میرے دشمن مجھے قاہرہ میں کہیں قرار نہیں لینے دے رہے تھے۔ اب میرے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر عرب کا میک اپ تھا۔ روانگی سے قبل مجھے ایک اور خیال آیا۔ یمامہ کے قتل کو چھپایا بھی جا سکتا ہے۔ اِس واقعے کو ایک اور رنگ بھی دیا جانا ممکن ہے۔ اس طرح کم از کم نبیلہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتی کہ اُس کی ماں زندہ ہے اور اُس کے دل کو فوری طور پر شدید صدمہ نہ پہنچتا۔

جو نیا خیال میرے ذہن میں آیا تھا، اس پر عمل کرنے میں یقیناً مجھے دشواری تو اُٹھانی پڑتی، لیکن ابھی بہت وقت تھا۔ میں اس وقت سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ میں نے یمامہ کو قبر کی آغوش میں سُلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یمامہ اور میرے غائب ہونے کے بعد یقیناً یہی سمجھا جاتا کہ وہ میرے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ یمامہ بہرحال ایک بدنام عورت تھی، اُس سے ایسی حرکت کی توقع ممکن تھی۔ اِس سلسلے میں میرے سامنے پہلا مسئلہ کسی ایسی شے کے حصول کا تھا جس سے میں، یمامہ کے لیے قبر کھود سکتا۔

پھر میں نے یمامہ کا سارا گھر دیکھ ڈالا مگر مجھے کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے زمین کھودی جا سکتی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجھے مجبوراً گھر سے نکلنا پڑا۔ گھر سے نکلتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا تھا۔ مجھے اب کسی ایسے بڑے گھر کی تلاش تھی جس کے احاطے میں پھول پودے لگے ہوں۔ وہیں مجھے زمین کھودنے کے لیے کوئی چیز مل سکتی تھی۔ مجھے کوئی ایسا گھر تلاش کرنے میں کافی دقت پیش آئی۔ بڑی تلاش کے بعد مجھے ایسا ایک گھر نظر آیا۔ میں آہنی پھاٹک پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ وہ گھر بھی قدیم طرز ہی کا بنا ہوا تھا مگر شاید اُس کا مالک اُسے جدید بنانا چاہتا تھا۔ گھر کا کچھ حصہ زیرِ تعمیر تھا جس سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ وہاں پودے بس برائے نام تھے ممکن ہے کہ وہ گھر زیرِ تعمیر ہوتا تو مجھے وہاں بھی پھاوڑا نہ ملتا۔

پھاوڑا حاصل کرنے کے بعد میں انتہائی تیزی کے ساتھ دوبارہ یمامہ کے گھر پہنچ گیا کیونکہ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے وہاں سے میرا فرار ہو جانا ضروری تھا۔ یمامہ کو اُس کے گھر ہی میں دفن کرنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے اُس کی لاش کو ایک چادر میں باندھ لیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرا وجود ابھی تک نادیدہ ہی تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں پھاوڑا تھا، دوسرے میں چادر کے اندر بندھی ہوئی یمامہ کی لاش تھی۔ میں کافی تیزی سے دوڑ رہا تھا اسی لیے بہت جلد آبادی کی حدود سے نکل گیا۔ راستے میں مجھے ایک آوارہ

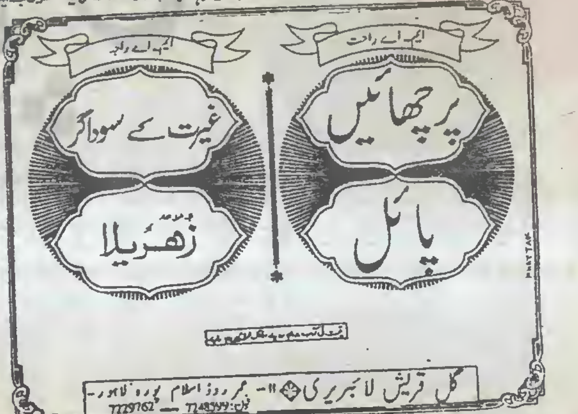

بار چھینا بھی پڑا، چھینے کا سبب یمامہ کی لاش اور پھاوڑا تھا۔ میرا وجود تو نادیدہ تھا مگر یمامہ کی لاش اور پھاوڑا نادیدہ نہیں تھا۔ میں نے دانستہ اُن راستوں کا انتخاب کیا تھا جو سونے پڑے تھے۔ پھر بھی رات کو پہرا دینے والے چوکیداروں سے دو بار میری مڈبھیڑ ہوتے ہوتے بچی۔

آبادی سے کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے یمامہ کی قبر کھودنے کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا وہاں مکمل تاریکی تھی، مگر اندھیرے میں بھی روشنی کی طرح دیکھ لینے کی قوت میرے اندر موجود تھی۔ تاریکی میرے کام میں حارج نہیں ہو سکتی تھی۔ زمین بہت سخت اور پتھریلی تھی، لیکن میں نے چند ہی منٹ میں یمامہ کی قبر کھود لی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اُسے یقیناً اس کام میں بہت دیر لگتی۔ کچھ دیر بعد ہی میں اپنے پہلے گناہ کو زمین کے سینے میں اتار رہا تھا۔ یمامہ کو قبر میں اتارتے ہوئے میری پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ پھر ایک بار پھر احساسِ گناہ حاوی ہو گیا تھا۔ یمامہ کی موت پر میرے سوا رونے والا اور تھا بھی کون! نہ اُس نے کفن پہنا تھا، نہ اُس کے جنازے کو کسی نے کاندھا دیا تھا اور نہ میرے سوا اُس کی لاش پر کوئی رو دیا تھا۔ اُس مٹی میں میرے آنسو بھی جذب تھے جس نے یمامہ کے جسم کو پناہ دی تھی۔

زمین اچھی طرح ہموار کرنے کے بعد میں نے اپنے کپڑے جھاڑے اور پھر چند لمحے وہاں خاموش کھڑا رہا۔ میری آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ ہر چند کہ مجھ سے یہ گناہ نادانستگی میں

سرزد ہوا تھا اور خود یمامہ بھی اِس میں برابر کی شریک تھی، مگر پھر بھی مجھے شدید احساسِ پشیمانی تھا۔ پھر وقت گزرنے کا احساس ہوتے ہی میں نے آبادی کا رُخ کیا۔ پھاوڑا میں نے وہاں نہیں چھوڑا تھا۔ جب میں آبادی کی حدود میں داخل ہوا تو اُس پھاوڑے کو ایک گھر کے پچھواڑے پھینک دیا۔

یمامہ کے گھر واپس آ کر میں نے ہاتھ پیر دھوئے، جوتے صاف کیے، اپنا حلیہ درست کیا اور پھر اپنے کمرے سے دونوں اٹیچیاں اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ میں نے اب اپنے وجود کی تجسیم بھی کر لی تھی۔ یمامہ کے گھر سے نکل کر میں نے دروازے کو بھیڑ دیا۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں گلیوں سے گزر کر ایک سڑک پر پہنچ گیا مگر مجھے وہاں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکی۔ کافی فاصلہ میں نے پیدل چل کر ہی طے کیا۔ مجھے ایک خالی ٹیکسی ملی بھی تو ٹیکسی ڈرائیور، جیزہ چلنے پر آمادہ نہیں ہوا، لیکن شاید اُسے علم نہیں تھا کہ اُس کا سابقہ کسی عام آدمی سے نہیں ہے۔ چنانچہ اُسے آمادہ ہونا ہی پڑا۔

پُرانے قاہرہ سے ٹیکسی، جیزہ کے لیے روانہ ہو گئی۔ اُس وقت بھی میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ یمامہ کی موت نے میرے احساس پر بڑی شدید ضرب لگائی تھی۔ کاش وہ مجھے پسند نہ آ گئی ہوتی! لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت گزر چکا تھا اور میرے دل پر ایک زخم چھوڑ گیا تھا۔ ابھی میں نے اپنے مستقل قیام کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ کیروشیرٹن میں قیام کا فیصلہ میں نے صرف ٹوٹی جو کی خاطر کیا تھا۔

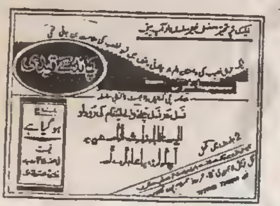

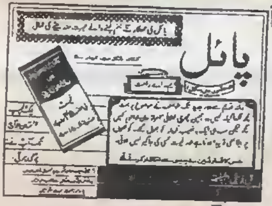

جب تک ٹیکسی، وہیلے نیل کا ایک پل عبور کر کے جیزا کے علاقے میں داخل نہیں ہو گئی، میں اپنے خیالات ہی کا اسیر رہا۔ دریائے نیل کے کنارے بنی ہوئی کیروشیرٹن کی تیس منزلہ عمارت دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ اب صبح ہو چکی تھی اور کسی قدر چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ یوں بھی دُقی کا علاقہ جیزا کے معروف اور جدید علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ دُقی ہی میں اب مختلف ممالک کے سفارت خانے تھے۔ سفارت خانے پہلے جیزا ہی کے ایک علاقے زمالک میں تھے، مگر اب تمام ہی سفارت خانے دُقی میں آگئے تھے۔ دُقی ہی میں ایک بہت بڑا چڑیا گھر بھی تھا۔ تحریر اسکوائر سے دُقی کا فاصلہ صرف ایک میل تھا۔

مجھے بہ آسانی کیروشیرٹن کی چوتھی منزل پر ایک کمرہ مل گیا۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے امریکی ایجنٹ گلوریا کی قیام گاہ پر مُہندسین پہنچنا تھا اس لیے میں نے سونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ غسل کر کے میں نے ناشتا کیا، پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد مجھے لُوئی جو کا خیال آیا چونکہ مجھے تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے روانہ ہونا تھا اس لیے فی الحال میں نے لُوئی جو کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں واپس آکر بھی اُسے تلاش کر سکتا تھا۔

مقامی امریکی ایجنٹ کو گلوریا کی قیام گاہ پر ٹھیک نو بجے پہنچنا تھا اور اس وقت صبح کے آٹھ بجنے والے تھے۔ گلوریا کا ذہن پڑھ کر میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ اُسے مقامی ایجنٹ سے تھری ناٹ کے ملنے کا یقین کیوں تھا۔ وہ کافی عرصے تھری ناٹ کے ساتھ کام کر چکی تھی اس لیے اُس کی تمام عادات سے اچھی طرح واقف تھی۔ تھری ناٹ کو اگر کسی ایجنٹ پر یہ شبہ ہو جاتا تھا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے لیے بھی کام کر رہا ہے تو وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑتا تھا، مگر اس سے پہلے وہ اُس ایجنٹ کو صفائی کا موقع ضرور دیتا تھا۔ وہ بذاتِ خود ایسے ایجنٹوں سے ملتا تھا تاکہ اپنی غیر معمولی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لا کر جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کر سکے۔

تھری ناٹ نے اُس مقامی امریکی ایجنٹ کو گزشتہ روز ہی یہ حکم دیا تھا کہ وہ تمام ضروری کاغذات اور ٹرانسمیٹر اُس دوسرے مقامی ایجنٹ کے حوالے کر دے جو دوسرے دن صبح ہی صبح اُس سے ملنے والا تھا۔ گلوریا نے ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ آئندہ روز یقیناً کسی وقت تھری ناٹ اس مقامی ایجنٹ سے ضرور ملے گا۔ اگر گلوریا، تھری ناٹ کے طریقِ کار سے واقف نہ ہوتی تو کبھی اتنا درست اندازہ نہ لگا سکتی۔ اُس کا یہی درست اندازہ میرے لیے تھری ناٹ تک پہنچنے کا ذریعہ بن گیا تھا۔

میں احتیاطاً نو بجے سے کچھ پہلے ہی گلوریا کی قیام گاہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا، اسی لیے آٹھ بجے اپنے کمرے سے نکل گیا۔ ہوٹل کی عمارت سے نکلتے ہی مجھے ٹیکسی مل گئی اور میں مُہندسین روانہ ہو گیا۔ وہاں تک پہنچنے میں مجھے دس پندرہ منٹ لگے۔ گلوریا کے بنگلے سے پہلے ہی میں نے ٹیکسی ایک عمارت کے سامنے رکوائی اور کرایہ ادا کر کے اُتر گیا۔ وہ عمارت دو منزلہ تھی اور اس کی پہلی منزل پر ایک بار کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ اتنی صبح بار کھلنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچ کر دانستہ وہیں ٹیکسی رکوائی تھی۔ میں اُس عمارت کی طرف بڑھ گیا جس کی نچلی منزل پر دکانیں تھیں۔ دکانوں کے درمیان ہی سے ایک زینہ اوپر جا رہا تھا۔ اپنے وجود کو نادیدہ بنانے کے لیے میں اُس زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ توقع کے مطابق زینے میں کوئی نہیں تھا۔ نصف زینہ عبور کرتے ہی میں اپنے وجود کو نادیدہ بنا چکا تھا۔ اگر زینے پر چڑھتے ہوئے کسی کی نظر مجھ پر پڑی بھی ہو گی تو وہ یہی سمجھا ہو گا کہ میں دوسری منزل پر واقع فلیٹ میں مقیم افراد سے ملنے جا رہا ہوں۔

میرے اندازے کے مطابق وہاں سے گلوریا کا مکان زیادہ دُور نہیں تھا۔ گزشتہ روز راستے کی تفصیلات کو میں نے اپنے ذہن میں رکھا تھا۔ مقررہ وقت سے کافی پہلے میں گلوریا کے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ اُس وقت ساڑھے آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ پھاٹک مجھے کھلا ہوا ہی ملا مگر گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے فوراً ہی گلوریا کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ وہ اُس وقت باتھ روم میں تھی، اسی لیے میں نے اُسے کوئی حکم نہیں دیا۔ ذہنی رابطہ قائم کرتے ہی مجھے یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تو وہ اُسی حالت میں باتھ روم سے نکل کر میرے لیے دروازہ کھول سکتی تھی، لیکن جلدی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں باتھ روم سے اُس کے نکلنے کا انتظار بھی کر سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

جب میں نے کچھ دیر بعد گلوریا کے ذہن سے دوبارہ رابطہ قائم کیا تو وہ باتھ روم سے نکل کر اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اُس کے لیے دروازہ کھول دینا چاہیے تاکہ اُسے دروازہ کھولے جانے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ گلوریا کی دانست میں یہ خیال خود ہی اُس کے ذہن میں آیا تھا، مگر حقیقت میں یہ بات نہیں تھی۔ اُسے یہ ترغیب میرے ذہن نے دی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے میں جاتے جاتے مڑی اور اُس راہ داری کا رُخ کیا جو گھر کے دروازے تک آتی تھی۔ میں نے کچھ ہی دیر بعد اُس کے قدموں کی چاپ سُنی اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دروازے کے پٹ اُس نے بھڑے ہوئے رہنے دیے تھے۔ قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا جو اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے دوبارہ دونوں پٹ بھیڑ دیے اور آگے بڑھ گیا۔

گلوریا کے کمرے میں قدم رکھتے ہی میں جھجک کر رُک گیا۔ وہ اپنے جسم پر ایک بڑا سا تولیا لپیٹے ہوئے تھی۔

میں دانستہ گلوریا سے کافی فاصلے پر کھڑا ہوا تھا کہ کہیں وہ میرے جسم کی خوشبو محسوس نہ کر لے۔ ویسے میرے بس میں یہ بھی تھا کہ اُسے خوشبو کا احساس ہی نہ ہونے دیتا، لیکن میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد جب سنگھار میز کے سامنے جا بیٹھی تو میں مخالف سمت کی دیوار سے لگی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ میک اَپ کرتے میں اُس نے کافی وقت ضائع کیا۔ ناشتا غالباً وہ نہانے سے پہلے ہی کر چکی تھی۔ جب وہ بالکل تیار ہو گئی تو اُس نے اپنا دستی بیگ الماری سے نکالا اور اُسے کھول کر کچھ دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے دستی بیگ سے ایک چھوٹا سا ریوالور نکال کر اُس کا چیمبر دیکھا اور بڑا اطمینان انداز میں سر ہلا کر دوبارہ اُسے دستی بیگ میں رکھ لیا۔ اب نو بجنے میں صرف چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اب مقامی ایجنٹ کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ گلوریا وقت پر تیار ہو چکی تھی۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ صحن میں لگی ہوئی کال بیل بج اٹھی۔ "عجیب آدمی ہے!" گلوریا ناگواری سے بڑبڑائی۔ "میں اُس کے لیے دروازہ کھول آئی ہوں اور وہ کال بیل بجا رہا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اپنا دستی بیگ بھی وہ ساتھ ہی لے گئی تھی۔ اُس کا ارادہ غالباً اُس مقامی ایجنٹ کو وہاں بٹھانے کا نہیں تھا۔

وہ کمرے سے نکل گئی تو میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب میں نے راہ داری میں قدم رکھا تو وہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ اُس نے جب دروازہ کھولا تو اُس کی پُشت میری طرف تھی، اسی لیے میں اُس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات نہیں دیکھ سکا، لیکن مجھے اُس کی آواز ضرور سُنائی دی جس سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "جی فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟" اِس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اَدھیڑ عمر کا چینی جو دروازے کے سامنے کھڑا تھا، گلوریا کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

"مجھے آپ ہی سے ملنا ہے خاتون!" چینی نے انگریزی ہی میں جواب دیا، لیکن اُس کا لہجہ چینیوں ہی کا تھا۔

"مگر میں... میں تو آپ کو نہیں جانتی۔" گلوریا نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔

"دراصل میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ آپ کو جس شخص کا انتظار ہے، وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔" چینی افسردہ لہجے میں بولا۔

"کیوں؟" گلوریا غالباً جھونک میں کہہ گئی۔ پھر شاید اُسے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہو گیا اور وہ جلدی سے بولی۔ "مگر تم اُسے کس طرح..."

"میں اُسے بھی اِسی طرح جانتا ہوں جس طرح آپ سے واقف ہوں۔" چینی نے گلوریا کی بات کاٹ کر کہا، پھر بولا۔ "میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا تھا کہ اُسے تھری ناٹ نے قتل کر دیا ہے کیونکہ وہ..."

"کون ہو تم؟" گلوریا کے لہجے میں ایک دم سختی آگئی اور اِسی کے ساتھ اُس نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیتے ہوئے دستی بیگ کھول کر ریوالور نکال لیا۔

"اور اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ کون ہوں تو؟"

"تو میں تمہیں گولی مار دوں گی!"

"اور پھر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔" چینی کی آواز معاً بدل گئی۔

"ارے تم!" گلوریا تقریباً چیخ اٹھی اور اُس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

"ریوالور اٹھاؤ اور اندر چلو۔" چینی آگے بڑھتا ہوا بولا۔ گلوریا نے جھک کر ریوالور اٹھا لیا اور اُسے اپنے دستی بیگ میں رکھنے لگی۔ اس دوران میں وہ اندر آچکا تھا۔ اُس کی آواز بدلتے ہی میں بھی چونک اٹھا تھا۔ یقیناً وہ آواز بدل کر بول رہا تھا اور چینی بھی نہیں تھا۔ میں نے

اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس کے باوجود جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ گوریا یقیناً اُسے اُس کی آواز سے پہچان چکی تھی۔ اب گوریا دروازہ بند کر کے اُس شخص کے ساتھ واپس آ رہی تھی۔ میں راہداری سے ہٹ کر دور کھڑا ہو گیا۔ اب اُس شخص کے کاندھے ڈھلکے ہوئے سے نظر نہیں آ رہے تھے۔

"میں دراصل اپنا امتحان لینا چاہتا تھا۔" وہ شخص گوریا سے کہہ رہا تھا۔ "میں جاننا چاہ رہا تھا کہ جو عورت کئی برس میرے ساتھ رہ چکی ہے، وہ بھی مجھے پہچان سکتی ہے یا نہیں!"

"تم نے بھی تو غضب کا میک اپ کیا ہے! پھر اپنے جسم کو بھی تم نے اُس وقت بالکل بوڑھوں کی طرح ڈھیلا ڈھیلا سا چھوڑ رکھا تھا، میں پہچانتی کیسے! مختلف ملکوں کے لہجوں اور مختلف آوازوں کے تو خیر تم ماہر ہو ہی!" وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اب راہداری سے نکل آئے تھے۔

"میری تعریف کر کے اپنی کمزوری پر پردہ ڈال رہی ہو!" وہ ہنس کر بولا۔

"خیر یہ بتاؤ کیا وہ شخص واقعی کسی اور ملک کے لیے بھی کام کر رہا تھا؟" گوریا نے اُس کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں وہ دونوں ہی سے مل گیا تھا۔ تم نے بالکل صحیح تجزیہ کیا۔ یقیناً تمہیں اسی نے بتایا ہوگا کہ تھری ناٹ اُس سے تمام معلومات اور ٹرانسمیٹر واپس لینے والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس شخص نے گوریا کے کمرے میں قدم رکھا۔

میں جہاں کھڑا ہوا تھا، وہیں کھڑا رہا، ہاں اپنی قوتِ سماعت کا دائرہ ضرور وسیع کر لیا۔ میں اُن دونوں کے قریب پہنچ کر انہیں چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں اب کمرے میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے، مگر میں اُن کی آوازیں بالکل واضح طور پر سُن رہا تھا۔

اُس شخص نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "دراصل روسی ایجنٹ بیلا بھی قاہرہ پہنچ چکی ہے۔ تم جانتی ہو کہ وہ کتنی خطرناک چیز ہے! یہ چکر اُسی کا چلایا ہوا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ ابوالہول کی تلاش میں جو قدم اُٹھائیں، اُسے بھی اُس کا علم ہوتا رہے۔"

میں تقریباً سمجھ تو گیا تھا کہ وہ شخص کون ہو سکتا ہے، اور اسی لیے میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو چکا تھا، پھر بھی میں اپنے خیال کی تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے اُس خطرناک شخص کے ذہن کو چھیڑے بغیر گوریا کے ذہن کو ٹٹولا۔

"تھری ناٹ!" مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔

"بیلا یہاں... یہاں قاہرہ میں ہے!" گوریا کی آواز سنائی دی، جس سے کسی قدر خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں کیوں، ڈر گئیں کیا؟" تھری ناٹ کی آواز آئی۔

"تم بھی یہاں ہو تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تمہارے خوف کا سبب! تمہیں نیوزی لینڈ میں پیش آنے والا وہ واقعہ یاد آ گیا ہوگا جب تم اُس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچی تھیں اور میں بروقت پہنچ گیا تھا۔"

"خیر اب تو اس سے ہمارا براہِ راست ٹکراؤ نہیں ہے نا!" گوریا کے لہجے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ خود کو مطمئن کرنا چاہتی ہے۔

"ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔" تھری ناٹ طویل سانس لے کر بولا۔ "وہ اس لیے کہ اُس کا اور ہمارا مقصد ایک ہی ہے اور اس مقصد کے حصول میں ٹکراؤ کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے بلکہ ہو ہی گیا، ہمارا ٹکراؤ تو چینی ایجنٹ لوئی چو سے بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا ایک بار ہو بھی چکا ہے، تمہیں معلوم ہی ہے۔ ہاں وہ خود سامنے نہیں آئی تھی، اُس وقت! اُس کے آدمی اُس کمرے کی نگرانی کر رہے تھے جس میں ابوالہول موجود تھا۔"

"خیر اُس کی مجھے زیادہ پروا نہیں۔" گوریا نے کہا۔

"اس کا سبب یہ ہے کہ تم اُسے جانتی نہیں ہو ورنہ ایسا نہ کہتیں۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ وقت اِن باتوں کا نہیں ہے، ہم برسوں بعد ملے ہیں اور مجھے تم سے ابھی بہت شکایتیں کرنی ہیں۔"

"میں اسی لیے آیا ہوں کہ تمہاری ساری شکایتیں دور کر دوں۔"

اب وہ دونوں گفتگو کے جس موڑ پر آ گئے تھے، وہ گفتگو میرے لیے قطعی بیکار تھی۔ میں نے جلد بازی سے کام نہ لے کر اچھا ہی کیا تھا۔ مجھے تھری ناٹ کی گفتگو سے کئی کام کی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ اب مجھے اُس خطرناک لڑکی کا نام بھی معلوم ہو چکا تھا جو یقیناً روسی ایجنٹ ہی تھی۔ اس کے علاوہ چینی ایجنٹ لوئی چو کے متعلق میرا یہ قیاس یقین میں بدل گیا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوئی، ابھی زندہ ہے ورنہ تھری ناٹ کے علم میں یہ بات ضرور ہوتی۔ تینوں ملکوں کے ایجنٹ عموماً ایک دوسرے کی طرف سے پوری طرح باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ بات ہمیشہ میرے حق میں سودمند ہی ثابت ہوتی تھی۔ یہ کہنا

بھی میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ تھری ناٹ کو اُس مقامی ایجنٹ کے وہاں آنے کی خبر کیسے ہو گئی تھی۔ تھری ناٹ نے یقیناً اس مقامی ایجنٹ کو قتل کرنے سے پہلے اُس کے ذہن کا تفصیلی مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ اسی لیے اُسے ٹھکانے لگا کر سیدھا گوریا کے پاس آ گیا تھا۔ اُسے گمان بھی نہ ہوگا کہ میں وہاں موجود ہوں گا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ گوریا کے کمرے میں جو ایک کھڑکی تھی، اُس پر آہنی جنگلا تھا۔ اُس کمرے سے تھری ناٹ کسی صورت فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اُس وقت تاریخ کے کئی ایسے جری مَردوں کے واقعات یاد آ رہے تھے جو عورتوں کی وجہ سے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کچھ ایسا ہی واقعہ امریکہ کے اُس ذہین، نڈر اور عیار ایجنٹ کو پیش آنے والا تھا۔ اگر وہ اس وقت گوریا سے ملنے نہ آیا ہوتا تو شاید جانے اور کتنے دن مجھے اُس کی تلاش میں بھٹکنا پڑتا۔

گوریا کے کمرے کا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا، میں کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس دوران میں اُن دونوں کی گفتگو سے مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ تھری ناٹ اپنا میک اپ ختم کر چکا ہے۔ اُس نے ایسا گوریا ہی کی خواہش پر کیا تھا۔ قرب کے لمحات میں گوریا یقیناً اپنے روبرو ایک بوڑھا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی ہوگی۔

میں اب اس خوف کے بغیر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ تھری ناٹ میرے قدموں کی چاپ سُن کر چوکنا ہو جائے گا۔ اگر اب وہ چوکنا ہو بھی جاتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ تھری ناٹ اس وقت ہر طرف سے غافل ہو کر صرف گوریا کی جانب متوجہ تھا جو اُس کے پہلو میں تھی۔ ابھی میں نے نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ تھری ناٹ ایک دم چونک اُٹھا اور پھر اُس نے فوراً ہی نتھنے سکیڑ کر گہرا سانس لیا۔

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے تھری ناٹ!" میں اچانک بول اُٹھا اور اسی کے ساتھ اپنے وجود کی تجسیم کر لی، کیونکہ اب نادیدہ رہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"اب وقت گزر چکا ہے، کوئی فائدہ نہیں! تم فرار نہیں ہو سکتے!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُس کا چہرہ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ اب اُس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ اچانک ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا چاہتے ہو تم؟ کیا مجھے قتل کرنے کا ارادہ ہے؟ جہاں تک مجھے علم ہے، تم اتنے سفاک نہیں ہو سکتے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اُس کی آواز میں اعتماد تھا۔ اُسے یقیناً میرے بارے میں سب کچھ خبر تھی۔

"اگر تم مجھے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤ کہ فوراً امریکہ واپس چلے جاؤ گے تو شاید میں تمہارے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کروں۔" میں نے اُس کی بات کا جواب دیا اور گوریا کی طرف دیکھا جو ابھی تک مسہری پر اُسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"میں اگر اس پر راضی ہو گیا تو میری جگہ کسی اور کو بھیج دیا جائے گا۔ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا ابوالہول؟" تھری ناٹ بڑی بے خوفی سے بات کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی کسی ایجنٹ نے اپنی شکست کا یقین ہو جانے کے بعد مجھ سے اس طرح گفتگو نہیں کی تھی۔

"اس سے مجھے نہیں تمہیں یہ فائدہ ہوگا کہ تمہاری زندگی بچ جائے گی۔"

"اور میں انکار کر دوں تو؟"

"تو پھر اپنی موت کے ذمہ دار تم خود ہو گے!" میری آواز میں سختی آ گئی۔

وہ ایک دم مسہری سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی سیدھی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور چہرے پر خوف نظر آنے لگا تھا۔

"تمہیں شاید یہ نہیں معلوم ابوالہول کہ میری موت تمہارے لیے کتنی تباہ کن ثابت ہوگی۔ یہ کوئی دھمکی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میں تمہیں اپنی حکومت کے اگلے قدم سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اِس کا مقصد ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی موت سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں ہر فیصلے کا اختیار ہوگا۔ اگر تم اجازت دو تو میں وہ بات

کہہ دوں!"

"کہو، میں سن رہا ہوں، لیکن کسی خوف کے سبب نہیں، صرف اس لیے کہ تمھیں یہ گلہ نہ ہو کہ میں نے تمھاری بات نہیں سنی!" میں نے جواباً کہا۔

"اب تک میری حکومت تمھارے ہاتھوں اپنے بہت سے قیمتی ایجنٹ ہلاک کرا چکی ہے۔ تمھیں علم ہی ہوگا کہ کوئی بھی ذہین ایجنٹ اپنے ملک و قوم کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے میری خود ستائی نہ سمجھو تو اپنے ملک کے لیے میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہوں۔ حالات کے پیشِ نظر میری حکومت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اگر میں بھی تمھارے ہاتھوں مارا جاؤں تو تمھاری ماں کو قتل کر دیا جائے۔" تھری ناٹ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"اسی طرح جیسے تم پہلے میری ماں کو قتل کر چکے ہو!" میرے لہجے میں چبھن تھی۔

"وہ میری مجبوری تھی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "تمھیں سامنے لانے کے لیے اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔"

"تمھیں خبر ہے کہ اس جھوٹی خبر سے مجھ پر کیا گزر گئی تھی! میں کتنے کرب میں مبتلا ہو گیا تھا!"

"پھر خود ہی سوچو ابوالہول کہ اگر واقعی تمھاری ماں کو قتل کر دیا گیا تو تمھارا کیا حال ہوگا۔"

"میں صرف اپنی ماں کی زندگی بچانے کے لیے پوری انسانیت کے مستقبل کو تاریک نہیں کر سکتا! سمجھ گئے تم!" مجھے غصہ آگیا اور میں تقریباً چیخ اٹھا۔

"ارے تم تو ناراض ہو گئے!" تھری ناٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اپنی موت کو سامنے پا کر بھی اس شخص میں مسکرانے کا حوصلہ تھا۔

"مجھے اعتراف ہے تھری ناٹ کہ تم واقعی آہنی اعصاب کے مالک ہو اور میں تم ایسے ذہین اور بہادر افراد کو پسند کرتا ہوں، لیکن تمھاری ذہانت اور بہادری، تخریب کے لیے ہے، تعمیر کی خاطر نہیں! تمھارا ملک جو خواب دیکھ رہا ہے، وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ چنگیز اور ہٹلر نے بھی اپنے اپنے زمانوں میں ایسے ہی خواب دیکھے تھے اور وہ اپنے خوابوں سمیت فنا ہو گئے۔ تمھاری قوم جو آج دنیا کی دو عظیم طاقتوں میں سے ایک کہلاتی ہے، یہ بھی..." ابھی میرا جملہ مکمل نہیں ہو سکا تھا کہ میں نے تھری ناٹ کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کی نگاہیں میرے عقب میں جمی ہوئی تھیں، مگر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہ اس کا فریب بھی ہو سکتا تھا۔

پھر اچانک کئی باتیں ایک ساتھ ہو گئیں۔ میرے قریب ہی ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور ایک دم دھواں پھیلنے لگا۔ اسی کے ساتھ تھری ناٹ چیخا: "بیلیا! قتل نہ کرنا ابوالہول کو! یہ بہت قیمتی ہے۔" بیلیا اسی خطرناک لڑکی کا نام تھا جو روسی ایجنٹ تھی۔ یہ نام میں نے آج ہی تھری ناٹ سے سنا تھا۔ تھری ناٹ نے یقیناً کوئی ایسا ہی منظر دیکھا تھا کہ وہ چیخ اٹھا تھا۔ وہ دھماکا اچانک ہوا تھا اور دھواں بھی فوراً پھیلنے لگا تھا اس لیے میں اپنا سانس فوری طور پر نہیں روک سکا۔ وہ دھواں میرے سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں بھی پہنچ گیا جس سے میرا دم گھٹنے لگا۔ ابھی میں سنبھل نہ پایا تھا کہ میری پشت میں ایک ساتھ متعدد سوئیاں اتر گئیں۔ دوسرے ہی لمحے میرے ذہن پر تاریکی کی چادر سی پھیل گئی۔ میں خواہش اور کوشش کے باوجود اپنی کسی ذہنی قوت کو بروئے کار نہیں لا سکا۔ میری تمام قوتیں جیسے کسی نے سلب کر لی تھیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرا آخری احساس یہ تھا کہ میرے دشمن آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ایم اے راحت

غیرت کے سوداگر

زہریلا

جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
ایم۔ اے راحت
اندھیرے کا تیر
○ انگلینڈ کے ایک مارشل آرٹس ماسٹر کی تربیت یافتہ۔ اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش میں سرگرداں لیکن اژدہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔
○ اسے پناہ ملی..... تو ایسی جگہ جہاں وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ شیدے۔ کالے بدنما چہرے والا فرشتہ۔ جو اس کی ڈھال بنا معاشرے کے تلخ پہلو اجاگر کرتی ہوئی سنسنی خیز داستان۔
بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا
ایک جلد میں | قیمت فی جلد روپے | ڈاک روپے
ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!
فون: 7248509- 7229762

کامیابی اور ناکامی کا انحصار اپنی صلاحیت پر بھی ہوتا ہے اور دشمن کی قوت پر بھی۔ حالات کی نوعیت بھی اس میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور غیر متوقع پیش آنے والے واقعات بھی نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی کچھ یہی ہوا۔ فرش پر گرتے گرتے اور ہوش کھوتے کھوتے میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور میں سنبھل گیا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا تھری ناٹ! ابوالہول اب تمھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" بیلیا کی تیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور اسی کے ساتھ پھر ایک دھماکا ہوا۔ اسی لمحے میں نے کسی کو اپنے قریب سے تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے محسوس کیا۔

"رک جاؤ بیلیا ورنہ ماری جاؤ گی!" تھری ناٹ چیخا اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سارے جسم میں اب تک سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میرا شعور ابھی نیم غنودہ تھا۔ میری حالت اُس شخص کی سی تھی جو گہری نیند سے اٹھا ہو۔ مجھے اپنے سینے میں شدید جلن محسوس ہوئی تو سانس روک لیا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ابھی میں دھوئیں کے حصار ہی میں تھا کہ اچانک یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے۔ بیلیا اور تھری ناٹ میں یقیناً ٹھن گئی تھی۔ میں سب کچھ دیکھنے، محسوس کرنے اور سمجھنے کے باوجود ابھی تیزی سے حرکت کرنے پر قادر نہیں تھا۔ ابھی تک میرے وجود میں چھپی ہوئی حیرت انگیز قوتیں بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ میں بمشکل لڑکھڑاتا ہوا دھوئیں کے اس حصار سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ میرا رخ کمرے کے دروازے کی طرف تھا۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے میں ایک بار پھر اپنا جسمانی توازن کھو بیٹھا اور گرنے سے بچنے کے لیے میں نے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ مجھے اپنی پشت پر اب بھی تپش سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جانے کتنی دیر وہیں سانس روکے کھڑا رہا۔ سینے میں جلن بدستور تھی اور اس جلن سے نجات پانے کے لیے کھلی فضا میں سانس لینا ضروری تھا۔ اس دوران کمرے کے اندر بھرا ہوا دھواں بڑی حد تک منتشر ہو چکا تھا۔ میں اسی کیفیت سے دوچار تھا کہ اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں چوکنا ہو گیا۔ آوازیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ میرے دونوں خطرناک دشمنوں میں سے کوئی ایک واپس بھی آ سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ یہ خیال میرے لیے بڑا سوہانِ روح تھا۔ میں اپنی موجودہ حالت میں اپنے دشمنوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا کہ اپنے دشمنوں کے مقابل میں نے خود کو اتنا بے بس محسوس کیا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری تمام تر قوتیں سلب کر لی گئی ہوں؟ مجھے خیال آیا۔ میرا خالق مجھے یہ دھمکی دے چکا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اس دھمکی پر عمل کر سکتا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کمرے میں اب برائے نام دھواں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے طویل سانس لیا۔ سینے کی جلن کم ہوئی اور مجھے سکون سا محسوس ہوا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب بہت قریب آ چکی تھیں۔ دفعتاً مجھے اپنے جسم میں ایک تیز برقی رو سی دوڑتی محسوس ہوئی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھ میں جیسے زندگی لوٹ آئی۔ میری تمام قوتیں بحال ہو گئیں اور میں ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔

"اس بوڑھے کو پکڑ لو!" کوئی چیخا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی وقت باوردی پولیس والوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس گھر میں ہونے والے دھماکوں ہی نے پولیس کو اس طرف متوجہ کیا ہوگا۔

"کون ہو تم؟" ایک پولیس والے نے مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ اپنی وردی سے کوئی پولیس افسر معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی خود نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔" میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ میرا جواب غلط نہیں تھا مگر وہ برہم ہو گیا۔

"سس... سر... وہ... وہ لاش!" ایک پولیس والا ہکلایا۔

"کہاں؟" پولیس افسر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں بھی مڑا اور اس مسہری کی طرف دیکھا جس پر گلوریا دراز تھی۔ وہ منظر واقعی ایسا تھا کہ مجھے بھی جھرجھری آ گئی۔ مسہری پر ایک عورت کا جسم پڑا تھا اور اس کا سر غائب تھا۔ دائیں جانب اور سامنے دیوار پر گوشت کے لوتھڑے چپکے ہوئے تھے۔ خون کے چھینٹے بھی ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ مجھے وہ دھماکا یاد آیا جو اس وقت سنائی دیا تھا جب بیلیا فرار ہو رہی تھی۔ مرنے والی گلوریا ہی ہو سکتی تھی۔ بیلیا، تھری ناٹ کو نشانہ بنانا چاہتی ہوگی۔ مگر زد میں گلوریا آ گئی تھی۔ تھری ناٹ یقیناً سامنے سے ہٹ گیا تھا اور بیلیا کا پھینکا ہوا ہینڈ گرینیڈ گلوریا کے چہرے پر پڑا تھا۔ شواہد سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

مجھے امید تو نہیں تھی کہ تھری ناٹ اور بیلیا اب تک اسی علاقے میں ہوں گے کیونکہ ان دونوں کو فرار کے لیے خاصا وقت مل گیا تھا، پھر بھی اب میرا وہاں مزید رکنا لاحاصل تھا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں نہ تھری ناٹ تھا نہ بیلیا! گلوریا میری نظر میں پہلے بھی اہم نہیں تھی اور اب تو وہ اہم اور غیر اہم کی منزلوں سے آگے نکل چکی تھی۔ پولیس یقیناً مجھے اس کے قتل میں ملوث کرتی۔ ہر چند کہ مجھے اس کی پروا نہیں تھی لیکن میں بے سبب وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"اس بوڑھے پر کڑی نظر رکھو!" پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا اور مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ میرے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر عرب کا میک اپ تھا اسی لیے وہ مجھے بوڑھا ہی سمجھ رہا تھا۔ تمام

لوگوں کے درمیان میں اپنی حیرت انگیز قوتوں کے اظہار سے گریز کرتا تھا لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ مجھے پولیس والوں کی نظروں سے مجبوراً اوجھل ہونا پڑا۔ دیکھتے دیکھتے اُن کے سامنے سے ایک شخص غائب ہو گیا تھا اسی لیے انھیں سکتہ ہو گیا۔ میں اُن کے درمیان سے نکل آیا۔ پھر میں پولیس والوں کا ردعمل دیکھنے مزید وہاں نہیں رکا کہ انھوں نے حواس بحال ہونے کے بعد مجھے تلاش کیا یا نہیں۔ میں گلوریا کے گھر سے نکل آیا اور ایک موہوم سی امید پر اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارا مگر تھری ناٹ اور بیلیا کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ مجھے حیرت بیلیا پر تھی کہ وہ میری جستجو میں گلوریا کے گھر تک کیسے آ گئی؟ پہلی بار بھی وہ بس اچانک ہی سامنے آ گئی تھی۔ دونوں بار وہ مجھ تک کیسے پہنچ گئی؟ یہ وہ سوال تھا جو میرے ذہن کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ تھری ناٹ نے مجھے تلاش کرنے کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا، وہ ظاہر ہو چکا تھا لیکن بیلیا کو میرا سراغ کیسے مل گیا، میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے اور انھیں سمجھنے سے پہلے میرے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس علاقے سے جلد از جلد نکل جاؤں۔ پولیس کو میرے سلسلے میں جو غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا، وہ ایسا نہیں تھا کہ میرا چہرہ بھلا دیا جاتا، یعنی ایک بوڑھے عرب کا چہرہ! اب تک میں اپنے دشمنوں کے شر سے بچنے کی خاطر مختلف چہرے بدلتا رہا تھا، مگر اس مرتبہ مجھے ایک ناکردہ جرم کے الزام سے بچنے کے لیے چہرہ بدلنا تھا۔ چہروں کے اس ہجوم میں کبھی کبھی میں اپنا چہرہ بھول جاتا تھا مگر میری تو قسمت ہی یہ تھی۔ میں اپنی قسمت سے بھاگ تو نہیں سکتا تھا۔

میں ایک خالی ٹیکسی دیکھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میرا وجود اب نادیدہ نہیں رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ پولیس اتنی جلدی میری تلاش شروع نہیں کرے گی۔ یوں بھی جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی روشنی میں پولیس والے مجھے کوئی بدروح ہی سمجھے ہوں گے۔ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر میں اندر بیٹھ گیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے ہوٹل کیرو شیرٹن چلنے کے لیے کہا۔ اس نے کرایہ بتایا اور میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ٹیکسی مہندسین کے علاقے سے روانہ ہو گئی۔

میرا ذہن ایک بار پھر گزرے ہوئے واقعات کی گتھی سلجھانے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بار بار بیلیا کا خیال آنے لگا۔ وہ لڑکی میرے لیے بہت خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ اس کا غیر متوقع حملہ اتنا بھرپور اور اچانک تھا کہ میرے لیے راہِ فرار نہیں رہی تھی۔ اس نے فرار ہونے سے قبل تھری ناٹ سے جو کچھ کہا تھا، وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اگر تھری ناٹ وہاں نہ ہوتا تو شاید بیلیا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ تھری ناٹ نے بھی یقیناً یہ اندازہ لگا لیا ہوگا۔ وہ مجھ ایسے قیمتی وجود کو ایک روسی ایجنٹ کے تصرف میں جاتے ہوئے کیسے دیکھ لیتا۔ وہ خود بھی غیر معمولی ذہن کا مالک تھا۔ اس نے عین وقت پر سارا کھیل بگاڑ دیا۔ میرے ذہن میں ہونے والا روشنی کا جھماکا تھری ناٹ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے بڑا خطرناک قدم اٹھایا تھا۔ بیلیا نے بھی اسے فوراً محسوس کر لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ راہِ فرار اختیار نہ کرتی۔ میرے حصول کی خاطر دو بڑی طاقتوں کے دو خطرناک ایجنٹ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور مجھے ان دونوں سے بچنے کا موقع مل گیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ میرے دونوں دشمن بچ کر نکل گئے تھے۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی ختم نہیں کر سکا۔ بیلیا مداخلت نہ کرتی تو کم از کم مجھے تھری ناٹ سے تو نجات مل ہی جاتی۔ گلوریا وہ آخری ذریعہ تھی کہ میں تھری ناٹ تک پہنچ جاتا مگر وہ بھی قتل کی جا چکی تھی۔ اب میں پھر تاریکی میں تھا۔ اس بار تینوں ہی بڑی طاقتوں کے جو ایجنٹ میرے مقابل تھے، وہ غیر معمولی ذہین اور چالاک تھے۔ انھیں ختم کرنا آسان نہیں تھا۔ تھری ناٹ، بیلیا اور ٹونی چو! تینوں ہی اپنے طور پر پے در پے مجھ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان تینوں کو قابو میں لانے یا ان تک پہنچنے کے لیے میں جو لائحہ عمل بھی طے کرتا اس پر قائم نہ رہ پاتا تھا۔ حالات کچھ ایسی نوعیت اختیار کر لیتے تھے کہ میں بے بس ہو کے رہ جاتا۔ پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ گلوریا کے گھر ہی سکونت برقرار رکھوں گا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی جو سامنے آ سکے اسے ٹھکانے لگا سکوں مگر مجھے گلوریا کے گھر سے نکلنا پڑا۔ ٹونی چو سے نمٹنے کی اب صرف یہی صورت رہ گئی تھی کہ میں اس کے غیر متوقع حملے

کا انتظار کرلے۔ موجودہ حالات میں یہ سوچنا بھی غلط ہی تھا کہ وہ اب تک ہوٹل کیرو شیرٹن میں قیام پذیر ہوگی، لیکن اس امکان کو میں نے قطعی مسترد نہیں کیا تھا۔ میں اسی لیے خود بھی اسی ہوٹل میں ٹھیرا تھا مگر ابھی مجھے لوئی چو کو تلاش کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ باری باری میں اپنے تینوں دشمنوں کے متعلق سوچتا رہا۔ تینوں ہی خطرناک تھے لیکن ان میں ، بیلیا سرِ فہرست تھی۔ انھی خیالوں میں سفر تمام ہوگیا۔

چوتھی منزل پر اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے چہرے پر نیا میک اَپ کیا۔ اب میں پھر نوجوان نظر آنے لگا تھا۔ اپنا سامان سمیٹ کر میں نے اٹیچیوں میں رکھا اور اٹیچیاں اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کا دروازہ میں نے مقفل نہیں کیا تھا۔ مجھے نئی حیثیت سے اسی ہوٹل میں ایک اور کمرہ حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مجھے اس بار ساتویں منزل پر ایک کمرہ مل گیا۔ اس تمام بھاگ دوڑ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا۔ اس دوران میں مجھے رہ رہ کر نبیلہ کا خیال آتا رہا۔ مجھے اب اس کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ میں اس کی طرف سے فکر مند تھا کہ اس تنہا اور بے سہارا لڑکی کا جانے کیا حال ہوگا۔ اپنی ماں کے اس طرح غائب ہوجانے پر نبیلہ یقیناً ہوش کھو بیٹھی ہوگی۔ اپنے دشمنوں سے تو میری جنگ ایک عرصے سے جاری تھی اور جانے کب تک یہی صورت رہتی، جب مجھے سکون کا سانس لینے کا نجانے کب موقع ملتا یا نہ ملتا، مگر نبیلہ کا معاملہ فوری توجہ چاہتا تھا۔ یہ میری ذمہ داری تھی اور مجھے یہ ذمہ داری بہ حال پوری کرنا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں لوئی چو کی تلاش کو پس پشت ڈال کر فوراً پرانے قاہرہ روانہ ہوگیا۔

پرانے قاہرہ کے علاقے مصر قدیمہ پہنچ کر جب میں نے یمامہ کے گھر سے کچھ پہلے ہی ٹیکسی چھوڑ دی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یمامہ کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا جسے میں نے گزشتہ رات ہی زمین کے سینے میں اتارا تھا۔ کیا میں اس گھر میں داخل ہوسکوں گا، جہاں کل تک یمامہ رہتی تھی؟ میں نے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا۔ کیا میں اس بھولی بھالی معصوم لڑکی کا سامنا کر سکوں گا جسے میں نے بے سہارا کر دیا ہے؟ میرے قدم جیسے خود بخود رکنے لگے۔ اسی گلی کے وسط میں یمامہ کا گھر تھا اور اب میں اس گھر کے لیے اجنبی ہوچکا تھا۔ یہاں آتے ہوئے یا یہاں آنے سے پہلے مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ کچھ سوچ سکتا۔ میں بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا کہ میرے قریب سے ایک ٹیکسی گزری۔ میں ایک طرف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ہی جب وہ ٹیکسی یمامہ کے گھر کے سامنے رکی تو میں چونکا۔ جب وہ ٹیکسی میرے قریب سے گزری تھی تو میں نے اس میں بیٹھے ہوئے افراد کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ وہ لوگ میرے لیے اجنبی بھی ہو سکتے تھے لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی۔ میں جہاں تھا، وہاں سے یمامہ کے گھر کا فاصلہ اتنا تھا کہ میں ٹیکسی سے اترنے والوں کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دو تھے اور ان میں سے ایک اب ٹیکسی کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے اپنی قوتِ بصارت کو متحرک کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں یمامہ کے گھر میں داخل ہوتے، میں ان کے چہرے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اعشیٰ کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ وہی ٹیکسی کا کرایہ ادا کرکے اب گھر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے آگے جو نوجوان نظر آرہا تھا، وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اجنبی نوجوان نے دروازے پر دستک دی اور کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ وہ بوڑھی عورت بھی میرے لیے اجنبی ہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اعشیٰ اور وہ اجنبی نوجوان دونوں گھر میں چلے گئے۔ دروازہ پھر بند ہوگیا۔ میں نے اپنی بصارت کے دائرے کو سمیٹ لیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

میں نبیلہ کے معاملے میں کوئی غیر محتاط قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گھر میرے دشمنوں کی نظر میں آچکا تھا۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں تھی، لیکن نبیلہ میری وجہ سے کسی مصیبت کا شکار ہوجائے، یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں اسی لیے عجلت سے کام نہیں لے رہا تھا اور اپنی حیرت انگیز قوتوں کے استعمال میں بھی بہت محتاط تھا۔ میرے لیے اعشیٰ کا ذہن پڑھ لینا مشکل نہیں تھا۔ مجھے اس طرح معلوم ہوجاتا کہ وہ کیوں آیا ہے اور اس کے ساتھ اجنبی نوجوان کون ہے؟ میں نے دانستہ ایسا کرنے سے گریز کیا۔ پہلے میں یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ آس پاس وہاں میرا کوئی دشمن تو موجود نہیں۔ لوئی چو کسی شخص کو بھی اپنا آلۂ کار بنا سکتی تھی۔ وہ بھی غیر معمولی ذہنی قوتوں کی مالک تھی۔ اس کے لیے یمامہ کے گھر میں داخل ہونا بھی آسان تھا اور اس گھر کی نگرانی کرانا بھی!

اس گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنانے میں دیر نہیں کی۔ پھر میں نے اطراف کی تمام گلیاں چھان ماریں اور مطمئن ہوگیا۔ آدمی سانپ سے ڈرتا ہے اور سانپ آدمی سے۔ یہی معاملہ میرا اور لوئی چو کا تھا۔ نہ وہ خود وہاں تھی، نہ اس کا کوئی آدمی۔ وہ یقیناً

میری طرف سے چوکنا ہو گئی تھی اور اسی لیے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے یہ جرأت کی بھی ہوگی تو وہ جا چکی تھی۔ نادیدہ ہونے کے بعد مجھے یہ فکر نہیں رہی تھی کہ میری بلا رفتاری کسی کو میری طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بہت کم وقت میں اطراف کی تمام گلیاں دیکھ لیں اور دوبارہ اسی گلی میں پہنچ گیا جہاں یمامہ کا گھر تھا۔ وہاں واپس آنے کے بعد بھی میں نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔ یمامہ کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں اس اجنبی نوجوان اور اجنبی بوڑھی عورت کے بارے میں جان لینا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کون ہیں اور یمامہ کے گھر کیوں آئے ہیں؟ میں نے احتیاطاً اعشیٰ کے ذہن سے رابطہ قائم کیا اور کچھ ہی دیر میں مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا کہ میرے بعد نبیلہ پر کیا بیتی۔

معذکی طرح نبیلہ سو کر اٹھی تو اس نے یمامہ کو کمرے میں نہیں پایا۔ وہ سمجھی کہ اس کی ماں اب تک مہمان کے کمرے میں ہوگی۔ وہ معمول کے مطابق گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ مہمان کے کمرے کی طرف بھی اٹھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نبیلہ کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ دور ہی دور رہی، لیکن جب کافی وقت گزر گیا تو اسے تشویش ہونے لگی۔ اس نے ہمت کرکے پہلی ماں کو آواز دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ ڈری ڈری سی اس کمرے کی طرف بڑھی اور باہر ہی سے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کمرہ خالی دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ پھر اس نے سارے گھر میں اپنی ماں اور نوجوان مہمان کو تلاش کیا اور مجبوراً گھر کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اس نے سوچا کہ اس کی ماں شاید پڑوس میں گئی ہے اور نوجوان مہمان صبح ہی صبح رخصت ہوچکا ہے یا پھر کسی کام سے گیا ہے۔ پڑوس میں پہنچ کر جب اسے یہ علم ہوا کہ اس کی ماں وہاں بھی نہیں تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ پڑوسی بوڑھی عورت اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت سے پیش آئی۔ گھر میں وہ نوجوان بھی موجود تھا جو نبیلہ میں دلچسپی رکھتا تھا اور یمامہ جس سے بیگار لیتی رہتی تھی۔ اس نوجوان نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں اعشیٰ سے مدد لی جائے۔ نبیلہ نے پہلے انکار کیا، پھر بہ مجبوری راضی ہوگئی۔ وہ نوجوان بمشکل اعشیٰ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوا کیونکہ اعشیٰ اپنے گھر پر نہیں تھا۔ اس نے اعشیٰ کو تمام حالات سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کر دیا۔ اعشیٰ یہ سب کچھ سن کر حیران رہ گیا۔ مہمان بھی غائب تھا اور یمامہ بھی!! اس سے وہ ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا، مگر اس کا دل یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ یمامہ ایسا کر سکتی ہے۔ وہ اسی لیے خود حقیقتِ حال جاننے کی خاطر وہاں آیا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ اس نوجوان نے یقیناً کوئی اہم بات نظر انداز کر دی ہے۔ اعشیٰ اس وقت نبیلہ سے خود تمام واقعات سن رہا تھا۔ نبیلہ کی حالت غیر تھی اور وہ بمشکل اعشیٰ کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ روتے روتے اس کا برا حال ہوگیا تھا۔ پڑوسی بوڑھی عورت اسے سنبھالے ہوئے تھی۔

اس اجنبی نوجوان اور اجنبی بوڑھی عورت کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اعشیٰ کے ذہن سے رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے یہ بھی علم ہوچکا تھا کہ دروازہ بھڑا ہوا ہے، اندر سے کنڈی نہیں لگائی گئی۔ اب میں بغیر کسی تشویش کے اس گھر میں داخل ہوسکتا تھا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا تو میں آہستگی سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر پہنچ کر میں نے دروازہ دوبارہ بھیڑ دیا۔

آگے بڑھتے ہوئے میں نے اس نوجوان کے ذہن سے رابطہ قائم کیا جس کا نام بھی مجھے ابھی معلوم نہیں تھا۔ اب میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں نبیلہ کے لیے اس نوجوان کے ذہن میں کیا ہے؟ اس نوجوان کا نام عابد تھا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ نبیلہ میں عابد کی دلچسپی عشق نہیں، ہوس کا نتیجہ تھی۔ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ یمامہ کی پراسرار گمشدگی نے اس کے لیے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اعشیٰ وہاں سے ٹل جائے اور اپنی اس حماقت پر بھی افسوس کر رہا تھا کہ اس نے اس معاملے میں اعشیٰ کو کیوں ملوث کیا۔ مجھے یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس بوڑھی عورت اور یمامہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میں معاملے کے ہر پہلو کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اب میں آنگن میں پہنچ چکا تھا اور وہ سب لوگ یمامہ کے کمرے میں تھے۔ میں آنگن میں پہنچ کر رک گیا۔ اب میں بوڑھی عورت کے ذہن کا مطالعہ کر رہا تھا جو عابد کی خالہ تھی۔ جلد ہی مجھے اس بوڑھی عورت اور یمامہ کے درمیان ایک قدرِ مشترک کا علم ہوگیا۔ وہ بوڑھی عورت بھی اپنی جوانی میں یمامہ سے کم نہیں تھی۔ اپنی جوانی

میں وہ خود انھی راہوں سے گزر چکی تھی۔ اُسے یمامہ کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ وہ یمامہ کو اپنے عہدِ جوانی کے قصے سنا سنا کر بیتے دنوں کی یاد تازہ کرتی رہتی تھی۔ یمامہ کو اس قدر لالچی اور خودغرض بنانے میں اُس عورت کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ بوڑھی عورت خود بھی لالچی تھی۔ وہ یمامہ کی گمشدگی سے فکرمند تو تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ یمامہ اب لوٹ کر نہ آئے تو اچھا ہے۔ وہ اپنے بھانجے عابد کے ذریعے یمامہ کے گھر پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ اعشیٰ کی طرح اُس نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ یمامہ، نوجوان مہمان کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ اُس عورت کو نبیلہ کے بارے میں بھی ہر بات کا علم تھا۔ وہ اسی لیے اپنے بھانجے عابد سے نبیلہ کو منسوب کرنے کی خواہش مند تھی اُسے خبر تھی کہ یمامہ نے اپنی بیٹی کو گناہ کی راہ پر نہیں چلنے دیا وہ بوڑھی لالچی عورت اپنی دانست میں یمامہ کے فرار سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ نبیلہ سے اسی لیے ہمدردی اور محبت کے ساتھ پیش آرہی تھی۔ اس معاملے میں اعشیٰ کا وجود اُسے بھی کھٹکنے لگا تھا کیونکہ اعشیٰ اس وقت نبیلہ سے اُس کے رشتہ داروں کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

نبیلہ کے علاوہ وہاں جو تین افراد موجود تھے، اُن کے ذہنوں کا مطالعہ کر کے مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ ان تینوں میں صرف اعشیٰ، نبیلہ کے لیے پُرخلوص تھا۔ میں نے یمامہ سے ایک بار کہا تھا کہ بُرے لوگوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں، اعشیٰ اس پر پورا اترا تھا۔ اُس نے نبیلہ کو بیٹی کہہ دیا تھا اور وہ اپنے الفاظ پر قائم تھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اب میرے لیے کوئی قدم اٹھانا آسان تھا۔ میں اُس کمرے میں پہنچ گیا جہاں وہ لوگ جمع تھے۔ نبیلہ پر نظر پڑتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اُس کا پھول سا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ نبیلہ کو وہ بوڑھی عورت سنبھالے ہوئے تھی۔ جس مسہری پر نبیلہ اور وہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی، اُس کے سامنے ایک مونڈھے پر اعشیٰ بیٹھا ہوا تھا۔ عابد مسہری کی پائنتی بیٹھا تھا اور بار بار گفتگو میں مداخلت کر رہا تھا۔

"تم نبیلہ کی کوئی فکر نہ کرو بیٹے! اس کے لیے ہم موجود ہیں۔" بوڑھی عورت نے اعشیٰ سے کہا۔ "اس وقت اس کی حالت ویسے بھی ٹھیک نہیں، تم شام کو آجانا۔ اس وقت تک یمامہ کو تلاش کرو۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ اپنے مہمان کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے گئی ہوگی اور شام تک لوٹ آئے گی۔"

"ہوں!" اعشیٰ نے ہنکارا بھرا اور بوڑھی عورت کو تیز نظروں سے دیکھا۔ بڑھیا سٹپٹا گئی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے، وہ آجائیں گی شام تک۔" عابد پھر بول اٹھا۔ "آپ پھر بھی اُنھیں جہاں تک ہو سکے تلاش کریں۔"

"تم لوگ مجھے بھی تو کچھ سوچنے دو۔" اعشیٰ کچھ جھنجلا گیا۔ "یمامہ کبھی اس طرح کسی کے ساتھ نہیں گئی۔ تم لوگوں سے زیادہ میں جانتا ہوں اُسے!"

"پھر کیا کیا جائے، تم ہی بتاؤ!" بوڑھی عورت عیاری سے بولی۔

"تمھیں علم ہے یمامہ کے کسی رشتہ دار کا؟" اعشیٰ نے پوچھا۔ "کبھی یمامہ نے کچھ بتایا ہو تمھیں!"

"نہیں۔" بوڑھی عورت نے انکار میں سر ہلایا پھر بولی "وہ تو بس مجھی کو سب کچھ سمجھتی تھی۔"

بڑھیا کا جواب سن کر اعشیٰ چپ ہو گیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنا تھی بیٹے!" بوڑھی عورت نے اعشیٰ کو مخاطب کیا۔ اعشیٰ نے نظر اٹھائی تو بوڑھی عورت نے کہا۔ "نبیلہ بیٹی کو لٹا کر میں آتی ابھی، تم چلو ذرا۔"

"کہاں؟" اعشیٰ حیرت سے بولا۔

"ذرا تنہائی میں کچھ کہنا ہے تم سے۔" بوڑھی عورت بولی، پھر نبیلہ سے کہا۔ "تم آرام سے لیٹ جاؤ بیٹی! میں آتی ابھی اِن سے بات کر کے، اور تم عابد، یہیں رہو بیٹے!"

نبیلہ لیٹنے پر تو راضی نہ ہوئی مگر مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر ضرور بیٹھ گئی۔ اعشیٰ مونڈھے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس کی نگاہ عابد پر تھی۔ عابد ابھی تک مسہری پر بیٹھا تھا۔ اعشیٰ نے اُس سے کہا۔ "تم یہاں مونڈھے پر بیٹھ جاؤ، میں ان سے بات کر کے آتا ہوں۔"

"کیوں؟ یہاں... یہاں کیا حرج ہے بیٹھنے میں؟" عابد کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں تم سے!" اعشیٰ سختی سے بولا۔

"ٹھیک... ٹھیک ہے۔ میں... میں بیٹھ جاتا ہوں۔" عابد گڑبڑا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ اعشیٰ کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"بڑوں کا کہنا مانتے ہیں عابد بیٹے!" بوڑھی عورت نے اپنے بھانجے کو نصیحت کی اور پھر اعشیٰ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی۔

عابد اُس مونڈھے پر بیٹھ گیا جس پر اعشیٰ بیٹھا تھا۔ اعشیٰ،

بوڑھی عورت کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ نبیلہ کو چپ سی لگ گئی تھی۔ ان دونوں کے کمرے سے جاتے ہی عابد نے نبیلہ کو مخاطب کیا۔ "یہ اچھا آدمی نہیں ہے نبیلہ! تم اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

نبیلہ کچھ نہیں بولی۔ وہ خاموشی سے آنسو بہائے جا رہی تھی۔ میں نے اپنی سماعت کا دائرہ وسیع کر لیا۔ اب میں اعشیٰ اور اُس بوڑھی عورت کے درمیان ہونے والی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ بوڑھی عورت اعشیٰ کو نشست گاہ میں لے گئی تھی۔ اس کا علم بھی مجھے بوڑھی عورت کی سرگوشی سے ہوا۔ وہ اعشیٰ سے بڑے رازدارانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔ "آؤ یہاں اس مونڈھے پر بیٹھ جاؤ بیٹے!" بوڑھی عورت کی آواز مجھے پھر سنائی دی۔ پھر ذرا وقفے سے اُسی کی آواز میں نے دوبارہ سنی۔ "میں وہاں جو کچھ کہہ رہی تھی اعشیٰ بیٹے، وہ نبیلہ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یمامہ کی واپسی کا یقین نہیں۔"

"وہ کیوں؟" اعشیٰ یقیناً خود اُس عورت کی زبان سے وہ بات کہلوانا چاہتا تھا جو اُس کے دل میں بھی تھی۔

"یمامہ ایسی عورتیں جب ایک بار گھر سے قدم نکال دیتی ہیں تو پھر کبھی نہیں لوٹا کرتیں۔" یہ کہہ کر اُس عورت نے اعشیٰ کو بتایا کہ وہ یمامہ کی محرمِ راز تھی اور اُس سے یمامہ کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔ پھر وہ مزید بولی۔ "ویسے یہ ہے حیرت کی بات! کبھی اُس نے مجھ سے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔"

"مگر یمامہ کو اس کی ضرورت کیا تھی؟" اعشیٰ کے لہجے میں تشویش تھی۔ "وہ اپنے معاملے میں سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اسے کیا ضرورت تھی کوئی ایسا قدم اٹھانے کی! یہ معاملہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ پھر یہ کہ وہ نبیلہ کو بے حد چاہتی تھی۔ وہ اس طرح نبیلہ کو چھوڑ کر چلی جائے گی، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا اور پھر وہ نوجوان بھی ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا۔"

"لیکن ہوا تو یہی ہے اعشیٰ بیٹے! جس طرح وہ گئی ہے، اُس سے تو یہی ظاہر ہے۔ حقیقت کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے! خیر خدا کرے وہ لوٹ آئے۔ تم سے میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم کوئی فکر نہ کرو۔ جب تک اُسے عقل نہیں آجاتی، وہ گھر لوٹ کر نہیں آتی، نبیلہ کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی۔"

"نہیں!" اعشیٰ نے صاف انکار کر دیا۔

"وہ کیوں بیٹے؟"

"اگر تمھارے گھر میں تمھارا نوجوان بھانجا نہ ہوتا تو میں یہ بات

اس خاندان برباد کی داستان مسلسل جس کے
دشمن زمین و آسماں تھے

گُمراں
۲۲ جنوری جلدی واپسی

ایم اے راجہ

ہزاروں قارئین کی ایل پسند تحریر
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے

(زیرِ طبع)
مکمل کہانی دو جلدوں پر مشتمل

زندگی کے فریب کے شکار ایک نوجوان کی داستانِ الم جس کے چاروں طرف موت رقصاں تھی۔ ہر طرف خون رنگ آنکھیں اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زمین اس پر تنگ کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سے پڑنے والی ٹھوکروں نے اسے فولاد بنا دیا۔ پھر اس فولاد کی کاٹ نے دنیا کی نیند حرام کر دی۔

کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہی ہے
قیمت فی حصہ ۲۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ایریا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔

فون: 7218500- 7220762

مان لیتا۔"

"پھر کیا چاہتے ہو تم؟" بوڑھی عورت کا لہجہ بدل گیا۔ "نبیلہ کو میں تمہارے حوالے تو نہیں کر سکتی!"

"کیا مطلب؟" اعشی کو غصہ آگیا۔ "تم کون ہوتی ہو نبیلہ پر حق جتانے والی؟"

"میں اس کی ماں کی جگہ ہوں سمجھے! وہ تو خود انکار کر رہی تھی تمہیں بُلانے سے۔"

"وہ کیا کہہ رہی تھی بکیا نہیں، مجھے نہیں سننا! میں اُسے اپنی بیٹی کہہ چکا ہوں۔ اُس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

ممکن ہے کہ بات اور بڑھ جاتی، اگر میں مداخلت نہ کرتا۔ مجھے باری باری اُن دونوں کے ذہنوں کو ہموار کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں فضا بالکل بدل چکی تھی۔ بوڑھی عورت، اعشی کے ساتھ یمامہ کے کمرے میں لوٹ آئی۔ نبیلہ کے آنسو رک گئے۔ اس معصوم لڑکی کے ذہن نے بڑی مزاحمت کی تھی اور یہ بات میرے لیے حیرت انگیز ہی تھی۔ اُس کے ذہن میں اپنی ماں کی محبت کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ میں نے اس محبت کو نفرت میں تو نہیں بدلا، ہاں اتنا کم تر ور کر دیا کہ وہ اپنی ماں کی جدائی برداشت کر سکے۔ عابر کے ذہن نے نبیلہ کی محبت کو فوراً قبول کر لیا تھا۔ عابر کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ اندازاً پچیس سال کا ہوگا۔ اس سے پہلے اس کی زندگی میں صرف ایک لڑکی آئی تھی اور وہ کردار کی اچھی نہیں تھی۔ اسی لیے وہ ہر لڑکی کو اسی طرح دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ نبیلہ کے ذہن میں بھی میں نے عابر کی محبت کا بیج بو دیا تھا۔ اعشی اور بوڑھی عورت کے درمیان تناؤ کی فضا ختم ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی دانست میں اس مسئلے کا جو حل تلاش کیا تھا، وہی تھا جو میری خواہش تھی۔ وہ دونوں ہی نبیلہ اور عابر کو ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

"تو پھر میں جاؤں، بندوبست کروں؟" اعشی معنی خیز لہجے میں بوڑھی عورت سے بولا۔

"ہاں تم جاؤ بیٹے، نیک کام میں دیر نہیں کرتے۔" بوڑھی عورت نے اعشی کو جانے کی اجازت دے دی۔ "یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔ میں اس دوران میں الگ الگ ان دونوں سے بھی بات کیے لیتی ہوں بلکہ ایسا کرو تم.... تم رُک جاؤ کچھ دیر.... ویسے تو مجھے یقین ہے کہ عابر میری بات نہیں ٹالے گا۔"

"کیا بات ہے خالہ؟" عابر نے پوچھا۔

برفانی پہاڑوں میں اچانک نمودار ہونے والی
سرخ آندھی
سرخ آندھی
جس نے وحشت و بربریت کا طوفان برپا کر دیا۔
امن و آشتی سے زندگی گزارنے والوں کی دنیا میں
ہل چل مچا دی۔ پھر مجبوری نے ہتھیار اٹھائے، تو
بڑے بڑے بت پاش پاش ہو گئے۔
مصنف
ایم اے راحت
آج ہی ایک خط لکھ کر طلب فرمائیں
گل قریشی پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- محمد روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون:7229762-7248599

"تم آؤ میرے ساتھ۔"

عابر اٹھ کر اپنی خالہ کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں اعشی اور نبیلہ رہ گئے۔ ظاہر ہے، اُن دونوں کو یہ خبر نہیں تھی کہ اُن کے سوا بھی کمرے میں کوئی اور ہے۔ اس کے باوجود وہ دونوں ہی خاموش رہے۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا یا جو کچھ ہونے والا تھا، میری خواہشات کے مطابق تھا۔ اب وہاں میری موجودگی ضروری نہیں تھی۔ نبیلہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میرا ذہن بہت ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ میں نے نبیلہ پر آخری نظر ڈالی، اور کمرے سے نکل آیا۔ صحن عبور کر کے میں صدر دروازے تک پہنچا تھا کہ میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ یقیناً کسی طاقتور ذہن کے خیال کی لہر نے میرے ذہن کی سطح کو چھوا تھا۔ ابھی میں سنبھل نہ سکا تھا کہ پھر جھٹکا سا لگا۔ اُسی لمحے میرے ذہن کا خود کار حفاظتی نظام حرکت میں آگیا۔ میرے ذہن پر سیاہ چادر سی پھیل گئی۔ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا کہیں قریب ہی تھا ورنہ میرے ذہن کو اتنے شدید جھٹکے نہ لگتے۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یمامہ کے گھر سے کچھ ہی دور مجھے ایک کار کھڑی ہوئی نظر آگئی۔ اس کار میں یقیناً میرا کوئی دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ اپنے ذہن کے حفاظتی نظام کو معطل کیے بغیر میں اپنی کسی بھی قوت کو متحرک نہیں کر سکتا تھا اور فی الحال یہ خطرہ مول لینا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں اسی لیے یمامہ کے گھر سے نکل کر دبے پاؤں اُس کار کی طرف بڑھا جس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ فاصلے کے سبب اُس عورت کے خدوخال واضح نہیں تھے۔ میں چند قدم اور بڑھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے اُس خطرناک عورت کو پہچان لیا تھا۔ یقیناً وہ بہت دیدہ دلیر تھی۔ اُس کے چہرے پر وہی میک اَپ تھا جس میں اُسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اُس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی ہو لیکن مجھے علم تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ اس طرح اپنی ذہنی قوتوں کو مجھ پر آزما رہی تھی یا تو اسے میرے ذہن کے خود کار حفاظتی نظام کا علم نہیں تھا یا علم تھا تو وہ تاریکی میں شگاف ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ آنکھیں کھول دیتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اُس نے اپنی کوشش ترک کر دی ہے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اُس کی محویت اور یکسوئی کو ختم کرنا ضروری تھا۔ زیادہ دیر تک اسی حالت میں رہنا میرے لیے بھی تکلیف دہ تھا۔ میرے ذہن کی حالت کسی ایسے بند کمرے کی سی تھی جس میں تیز ہوا گردش کر رہی ہو اور اُسے باہر نکلنے کا راستہ نہ مل رہا ہو۔ کچھ سوچ کر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ دوسرے ہی لمحے لپک کر میں نے زمین پر پڑا ہوا پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔ میرے اور اُس کے درمیان بہرحال اتنا فاصلہ تھا کہ وہ میرے جسم کی خوشبو محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ نادیدہ ہونے کے سبب میں اُسے نظر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں اسی صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اُس وقت اگر میرے پاس ریوالور ہوتا تو شاید میرا ایک دشمن کم ہو جاتا مگر اب سے پہلے میں نے کبھی ان خطوط پر سوچا ہی نہیں تھا۔ اب تک مجھے ان سہاروں کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے جیسے ہی کار کے ونڈ اسکرین پر پتھر مارا، اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ نہ جانے کیا سمجھی تھی۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتی، میں اُس تک پہنچ گیا۔ میں کار کا دروازہ کھول کر اُس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"ابوالہول!" وہ چیخی اور اسی کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے یقیناً میرے جسم کی مخصوص خوشبو محسوس کر لی تھی۔ اس بار پہلے ذہنی جھٹکے کے ساتھ ہی میرے ذہن کا حفاظتی نظام متحرک ہو گیا کیونکہ اب میں بے خبر نہیں تھا، اس میں میرے ارادے کو بھی دخل تھا۔ اُس نے جیسے ہی چیخ کر آنکھیں بند کی تھیں، میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

"آنکھیں کھول لو بیلا!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اُس کے دونوں شانے جھنجوڑ دیے۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں تو میں بولا۔ "تمہیں قتل کر کے مجھے افسوس ہوگا لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے ذہن کے حفاظتی نظام کو معطل کر دیا اور اپنے وجود کی تجسیم کر لی۔

"مگر... مگر میں... میں تمہیں قتل تو نہیں کرنا چاہتی۔" اُس نے رُک رُک کر خوف زدہ آواز میں کہا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اُس نے شاید ذہنی طور پر شکست قبول کر لی تھی اور اب میری فطرت

کی نیکی سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ یقیناً یہ سمجھ چکی تھی کہ اُس کا راز کھل چکا ہے اور میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ وہ روسی ایجنٹ ہے۔

"بیلیا! تم کیا چاہتی ہو؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور اسے میں قتل ہی کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں اُس کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ وہ مجھے غافل پا کر کسی بھی لمحے کوئی حربہ آزما سکتی تھی۔ "مرنے سے پہلے اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ اب تک کس طرح مجھے تلاش کرتی رہی ہو تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" میں نے اُس سے دریافت کیا۔

"مگر تمہاری اس شکر گزاری سے مجھے کیا حاصل ہوگا؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "بتاؤ نا ابوالہول!" اُس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ خود ہی پھر بول اٹھی۔ "مجھے مرنا ہی ہے تو پھر میں کیوں چھپاؤں کہ اس کے لیے میرے ملک نے پروفیسر کو، تمہارے خالق کو بڑی قیمت ادا کی ہے مگر اب یہ راز کھل چکا ہے۔ اس پر امریکہ نے سخت احتجاج کیا ہے۔"

"کس بات پر؟" میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ابوالہول!" اُس نے پُرسکون آواز میں کہا۔ "امریکی حکومت نے الزام لگایا ہے کہ پروفیسر کا جھکاؤ میرے ملک کی طرف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"پروفیسر اپنی عمر کا بقیہ حصہ بھی تجربات کی نذر کر دینا چاہتا ہے اور اُسے اس کے لیے سرمایہ چاہیے، خواہ وہ سرمایہ تینوں بڑی طاقتوں میں سے کوئی بھی فراہم کرے۔"

"تو پروفیسر نے میری تلاش میں تمہارے ملک کی مدد کی ہے! مگر کیسے؟" اب تک بیلیا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اُس کی طرف سے نظر ہٹانا چاہی، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"میں تمہیں یہی تو بتانے والی ہوں ابوالہول!" مجھے اُس کی آواز جیسے کہیں دور سے سنائی دی۔ "مگر تم تو ادھر رہے ہو!"

"نہیں!" میں چیخ اٹھا۔ مجھے خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ اس کی سحر انگیز آنکھوں کا سحر مجھے اپنی گرفت میں لینے والا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا اور اسی کے ساتھ بیلیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ذہنی جھٹکا اتنا ہی شدید تھا کہ میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا۔ میں ہوش کھو بیٹھا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں کار کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر لڑھک گیا تھا۔

مجھے دوبارہ ہوش آنے میں یقیناً زیادہ دیر نہیں لگی تھی ورنہ کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا جاتا۔ بے ہوش اور نادیدہ ہونے کی صورت میں کوئی ذی روح میرے قریب نہیں آ سکتا تھا۔ اگر کوئی یہ کوشش کرتا تو اس کا حشر چینی ایجنٹ ہوؤن جیسا ہوتا۔ وہ بے خبری میں میرے قریب آ گیا تھا اور اُس کے جسم کا سارا خون خشک ہو گیا تھا۔ میرے دشمن اس حالت میں اسی لیے مجھ سے دور ہی رہتے تھے۔ بیلیا میری ذرا سی غفلت سے بچ کر نکل گئی تھی اور مجھے اس کا افسوس تھا۔ میں اگر بیلیا کو گفتگو کا موقع نہ دیتا تو یقیناً اُسے ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔ تھری ناٹ کے ساتھ بھی تقریباً ایسا ہی ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بیلیا کی مداخلت نے اُس کی جان بچا لی تھی۔ مجھے اتنا موقع اُس وقت بھی ملا تھا کہ تھری ناٹ کو بآسانی ختم کر دیتا۔ پھر میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال گزشتہ چھ سال کے عرصے میں کئی بار میں اپنے آپ سے کر چکا ہوں۔ مجھے اپنی کمزوری کا بخوبی علم ہے۔ میں بمشکل اپنے آپ کو کسی کے قتل پر آمادہ کر پاتا ہوں۔ وقتی جوش اور غصے کی رو جب تک برقرار رہتی ہے، میں وہ قتل کر گزرتا ہوں جو شاید عام حالات میں میرے لیے کسی طرح ممکن نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چھ سال کے دوران متعدد بار میں نے اپنے دشمنوں کو نظر انداز کیا ہے، انھیں اپنی زندگی بچانے کا موقع دیا ہے۔ میری روح اس سفاکی کو ہزار دلائل کے باوجود قبول نہیں کرتی۔ لاشعوری طور پر شاید آخری لمحے تک میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ انتہائی قدم نہ اٹھانا پڑے۔ میرے اندر یہ گداز مختلف علوم اور مختلف مذاہب کی تعلیمات کا نتیجہ ہے جو میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ میں انھیں اپنے حافظے سے کھرچ کر نہیں پھینک سکتا اور اسی کے ساتھ یہ بھی میری مجبوری ہے کہ اپنے دشمنوں کے سامنے سپر بھی نہیں ڈال سکتا۔ میں اپنی تمام تر قوتوں اور تمام کمزوریوں کے باوجود انسان اور انسانیت پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نے انسانوں کے باطن میں جھانکا ہے، اُن میں اچھے بُرے سبھی ملے ہیں لیکن بُرے کیوں اچھے ہوتے ہیں، انھیں کون بُرا بننے پر مجبور کر دیتا ہے؟ مجھے یہ بھی معلوم ہے بنیادی طور پر تمام انسان ایک سے ہوتے ہیں، خیر اور شر کا مجموعہ۔ اُن میں سے کسی کو اشتی بنا دیا جاتا ہے اور کسی کو جیلہ، کوئی تھری ناٹ اور بیلیا بن جاتا ہے اور کوئی ابوالہول۔ روسی ایجنٹ بیلیا کے فرار نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور میں حالات کا

تجزیہ کرنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیلیا غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھی جو میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بچ نکلی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں کسی بھی طرح اپنے دشمنوں سے کمزور نہیں۔ وہ وقتی طور پر مجھے بے بس کرنے میں کامیاب تو ہو جاتے تھے، لیکن مکمل طور پر قابو میں نہیں کر پاتے تھے۔

بیلیا نے فرار سے قبل جو گفتگو کی تھی، اُس میں کسی حد تک سچائی ضرور تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے اتنی جلدی تلاش نہ کر لیتی۔ صرف چند ہی گھنٹے درمیان میں گزرے تھے اور یہ بات یقیناً تشویشناک تھی۔ موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے از سرِ نو کوئی لائحہ عمل مرتب کروں۔ اس کے لیے کچھ دن اپنے دشمنوں کی نظروں سے روپوش رہنا ضروری تھا۔ میں گزشتہ چھ سال سے جو حکمت عملی اختیار کیے ہوئے تھا، اُسے اب بدلنے کی ضرورت تھی۔ حالات اب بہت حد تک بدل چکے تھے۔ قاہرہ آنے کے بعد مجھے ذرا بھی سکون نہیں ملا تھا۔ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں مل تھی۔ پہلے امریکی ایجنٹ تھری ناٹ سے میرا ٹکراؤ ہوا، پھر روسی ایجنٹ بیلیا مجھ سے الجھ گئی۔ اسی دوران چینی ایجنٹ لوئی چو نے میرے اطراف جال بُننا شروع کیا۔ یہ تینوں ہی اپنے اپنے طور پر انتہائی خطرناک تھے مگر مجھ سے کم، ورنہ اب تک مجھے زیرِ دام لا چکے ہوتے۔ میں پے در پے ان تینوں کے غیر متوقع حملوں سے بچتا رہا۔ کبھی میں سوچتا کہ پہلے تھری ناٹ سے نمٹ لوں، کبھی لوئی چو کو ختم کرنے کے منصوبے بناتا اور کبھی بیلیا درمیان میں آ جاتی۔ میری توجہ اسی لیے مکمل طور پر کسی ایک کی طرف نہ رہتی۔ کبھی میں اپنے دشمنوں کی نظر میں رہنا چاہتا تاکہ وہ مجھ پر حملہ کریں اور میں انھیں ختم کر دوں، کبھی اُن سے چھپنے کا فیصلہ کرتا تاکہ اپنے ماضی کی اُلجھی ہوئی گتھی سلجھا سکوں۔ میں اسی لیے ہوٹلوں کے قیام ترک کر کے یامنہ کے گھر چلا گیا تھا مگر میرے دشمن یہاں بھی آ پہنچے تھے۔ میں انھی حالات پر غور کرتا ہوا پیدل ہی آگے بڑھتا رہا اور چونکا اُس وقت جب خود کو اہرام کے نزدیک پایا۔ میرا وجود اب تک نادیدہ تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر قدیم مصر کے مقابر نظر آ رہے تھے اور یہیں ابوالہول کا عظیم مجسمہ بھی تھا۔ میں بار بار یہاں کیوں آ جاتا ہوں؟ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔ کیا یہاں سے میرے ماضی کی کوئی یاد وابستہ ہے؟ اس سوال پر غور کرتے ہوئے میں اپنے ماضی کے متعلق سوچنے لگا۔ میرا ماضی اب میرے لیے کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس دوران مجھ پر بہت حقیقتیں منکشف ہو گئی تھیں۔ ان حقیقتوں میں سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ میری اصل عمر ایک سال بہرحال نہیں ہے۔ میں اپنی عمر کا حساب لگا سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اب سے تقریباً تیس سال پہلے جب میری عمر صرف ایک سال تھی، تو مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ گویا اب میری عمر بیس سال ہے، ایک سال نہیں۔ میں کوئی بچہ نہیں، بیس سالہ نوجوان ہوں۔ ہاں مجھے یہ دکھ ضرور ہے کہ میرا بچپن مجھ سے چھین لیا گیا۔ میرے سینے کا یہ خلا شاید کبھی پُر نہ ہو۔ اپنی عمر کے چھ سال میں نے عالمِ ہوش میں گزارے ہیں، صرف تیرہ سال ایسے ہیں جن کے متعلق مجھے فقط چند باتوں کا علم ہے۔ میں اپنی عمر کے کارواں کو چاہے ایک سال سے لے کر تیس سال تک کہیں بھی ٹھہرا لوں، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دراصل میری عمر بیس سال ہے۔ اگر مجھے یامنہ نہ ملتی تو شاید میں زندگی بھر خود کو بچہ ہی سمجھتا رہتا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ میرے اغوا میں کس کا ہاتھ تھا اور اس نے مجھے کیوں اغوا کیا تھا؟ یہ سوال کہ مجھے ہی کیوں اغوا کیا گیا، کسی اور بچے کو اغوا کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ممکن تھا کہ کسی اور بچے میں وہ خصوصیات نہ پائی گئی ہوں جو مجھ میں تھیں۔ میں اس پر بھی غور کر چکا تھا۔ یہ سب کچھ جان لینے کے باوجود ابھی مجھے بہت کچھ سوچنا سمجھنا تھا۔ مجھے اپنے وجود کی ایک ایک گرہ کھولنا تھی۔ میرا وجود اب تک میرے لیے ایک معما تھا۔ چھ سال کے عرصے میں، میں نے بہت کچھ سوچا تھا، لیکن خود کو سمجھنے کے لیے چھ سال بہت کم ہوتے ہیں، وہ بھی ہنگامہ خیز چھ سال۔ لوگ تو ساری زندگی خود کو نہیں سمجھ پاتے۔ اپنے ماضی کے بارے میں سوچتے ہوئے جب میرے صفحۂ ذہن پر اپنی ماں کا چہرہ اُبھرنے لگا اور میرے وجود میں محرومیاں جاگنے لگیں تو میں ایک دم چونک اٹھا۔

میں نے اپنے ذہن سے تمام خیالات جھٹک دیے۔ مجھے گزشتہ دو بار پیش آنے والے واقعات یاد آ گئے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ میں جن حالات سے دوچار تھا، ان میں ایسا کوئی واقعہ میرے لیے خطرے کا سبب بن سکتا تھا۔ خصوصاً بیلیا کی طرف سے سخت خطرہ تھا جو مجھے تلاش کرتی ہوئی کہیں بھی پہنچ سکتی تھی۔ میں ایسے عالم میں اُس کے لیے بہت آسان شکار ہوتا۔ محرومی کے احساسات غالب آ جانے کے بعد میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا

تھا۔ اس دوران میں مجھے کچھ علم نہ ہوتا تھا کہ کب، کہاں اور کیسے پہنچ گیا اور میں نے کیا کیا! اپنی توجہ مبذول کرنے کے لیے میں نے فوراً ہی یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے اور میں اپنے دشمنوں سے کس طرح نمٹ سکتا ہوں؟ میرے ذہن نے اس سوال کا وہی جواب دیا جو میں پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ کچھ دن کے لیے مجھے اپنے دشمنوں کی نظر سے روپوش رہنا چاہیے۔ فی الحال قاہرہ میں یہ ممکن نہیں رہا تھا جہاں مجھے صرف چند گھنٹوں میں تلاش کر لیا گیا ہو۔ وہاں مجھے کس طرح سکون سے کچھ سوچنے کا موقع ملتا۔ میں چند دن بعد دوبارہ بھی تو قاہرہ لوٹ کر آ سکتا ہوں، میں نے سوچا۔

سوچتے سوچتے اب میں اہرام سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اب میں شاہراہِ اہرام پر شالیمار نائٹ کلب کی دو منزلہ عمارت کے سامنے سے گزر رہا تھا جو بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر اس عمارت کے عقب سے نکلا تو میرا وجود نادیدہ نہیں رہا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے اچانک ظاہر ہوتے دیکھ لے۔ میں ایک فیصلے تک پہنچنے کے بعد اب اس پر فوراً عمل کرنا چاہتا تھا۔

مجھے وہاں زیادہ دیر ٹیکسی کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پک اپ ویگنوں اور بسوں میں سفر کرنے سے میں عموماً گریز کرتا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ کہ ٹیکسی آسانی سے مل جاتی تھی، دوسری وجہ یہ کہ میں بھیڑ بھاڑ سے بچتا تھا۔ میرے جسم سے اٹھنے والی مخصوص خوشبو خواہ مخواہ لوگوں کو میری طرف متوجہ کر دیتی تھی۔ میں ٹیکسی کے ذریعے ہوٹل کیرو شیرٹن کے لیے روانہ ہو گیا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ نبیلہ کا معاملہ نمٹانے کے بعد چینی ایجنٹ لوئی چو کو تلاش کروں گا۔ لیکن اب میرا ارادہ بدل چکا تھا۔ اگر لوئی چو کیرو شیرٹن میں تھی بھی تو اب میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ گزشتہ دو راتیں بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزری تھیں، مجھے بالکل آرام نہیں مل سکا تھا۔ پانچ منٹ کی گہری نیند بھی میرے لیے کافی تھی، اس کے بعد میں بالکل تازہ دم ہو جاتا۔ نیند اور بے ہوشی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، یہ سوچ کر میں نے اپنے وجود کو نادیدہ بنا لیا۔ اس دوران میں اگر کسی طرح بیلیا وہاں پہنچ بھی جاتی تو میرے قریب آنے کی ہمت نہ کرتی۔ میں مسہری پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں اپنے ذہن کو سونے کی ترغیب دے رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ میں نے آنکھ کھلتے ہی کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اپنے وجود کی تجسیم کر لی۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ کمرے میں فون موجود تھا۔ میں مسہری سے اتر کر اس میز کی طرف بڑھ گیا جس پر فون رکھا تھا۔ آپریٹر سے میں نے ایئرپورٹ انکوائری کا نمبر ملانے کے لیے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ چند ہی لمحے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی اور میں نے ریسیور دوبارہ اٹھا لیا۔ "سر! ایئرپورٹ انکوائری۔ بات کیجیے۔" آپریٹر کی آواز آئی۔

"یس ایئرپورٹ انکوائری۔" آپریٹر کی آواز کے بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"یہاں سے اسکندریہ جانے والی پروازوں کا وقت بتائیے۔" میں نے کہا۔

دوسری جانب سے مجھے اسکندریہ کے لیے اس دن روانہ ہونے والی پروازوں کے اوقات بتا دیے گئے۔ اس کے بعد میں نے زیادہ دیر نہیں کی۔ میں نے ایک پرواز کا ٹکٹ بک کرا لیا اور پھر دیگر تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ مجھے کیا کرنا ہے، میرے ذہن میں پوری طرح واضح تھا۔ میں سب کچھ سوچ چکا تھا اور اسی دوران میں اپنے آئندہ اقدام سے متعلق کچھ اہم فیصلے کیے تھے۔ میں نے جو کچھ سوچا اور فیصلہ کیا تھا، اس پر ابھی سے عمل پیرا ہونے کا قصد تھا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ میری اصل عمر تقریباً بیس سال ہے، میں عمر کی اس منزل پر قیام کرنا چاہتا تھا۔ یہ قیام مختصر بھی ہو سکتا تھا اور طویل بھی۔ اس کا انحصار حالات پر ہوتا کہ مجھے اپنے کاروانِ عمر کو کتنے عرصے کے لیے اس منزل پر ٹھیرانا ہے۔ میری اس خواہش میں فطری جذبات کو بھی دخل تھا کہ میں بہرحال ایک آدم زاد ہوں کوئی مشین نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ایک انسان ہونے کے باوجود عام انسانوں سے بہت مختلف تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک عام انسان اپنی عمر کو نہ گھٹا سکتا ہے نہ بڑھا سکتا ہے مگر میں اس پر قادر تھا۔ اس وقت میرے جسم کی عمر بائیس سال تھی، اپنی اصل عمر سے صرف دو سال زیادہ! یہ دو سال میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ میں بآسانی اپنے جسم کی عمر میں دو سال کی تخفیف کرنے کا اہل تھا۔ پہلے بھی میں کئی بار اپنی عمر میں تخفیف و اضافہ

کر چکا تھا۔ مجھے اپنا بیس سالہ چہرہ دیکھنے کی خواہش تھی، سو میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے پہلے اپنے چہرے سے میک اپ ختم کیا، پھر مسہری پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اب میں ایک پُراسرار اور حیرت خیز تجربے سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ بس چند لمحوں کی بات تھی۔ میرے خیال کی قوت سے میرے وجود میں پوشیدہ حیرت انگیز قوتیں متحرک ہو گئیں۔ میرے جسم کے اطراف دھند سی پھیل گئی۔ اس دھند میں میرا جسم غائب ہو گیا اور اس کے صرف خطوط باقی رہ گئے۔ یوں جیسے کوئی مصور کسی انسانی جسم کا خاکہ بنائے مگر خدوخال واضح نہ کرے اور صرف چند لکیریں بنا دے۔ یہی روشن لکیریں پھیلیں، پھر سمٹیں اور دوبارہ ایک جسم مسہری پر نظر آنے لگا۔ دھند بھی اسی کے ساتھ غائب ہو گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور چادر لپیٹ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آئینے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ سبز، سیاہ بال، چوڑی پیشانی، سرخ و سفید رنگت اور کھڑے کھڑے نقوش! میں کچھ دیر ایک محویت کے عالم میں خود کو دیکھتا رہا۔ مجھے اس وقت ایک عجیب سی مسرت محسوس ہو رہی تھی جیسے میں نے اس شخص کو شکست دے دی ہو جس نے مجھ سے میری عمر کے تیرہ سال چھین لیے تھے۔ وہ جس نے مجھے ایک عام انسان سے ایک حیرت انگیز وجود بنا دیا تھا، جس نے مجھ سے میری اصل عمر بھی راز رکھی تھی، آج میں نے اس کو ہرا دیا تھا۔ یہ اس کی شکست ہی تو تھی کہ میں نے اصل عمر معلوم کر لی اور عمر کی اسی منزل میں پہنچ گیا۔ میں نے اپنے پُراسرار وجود کے کم از کم ایک راز سے تو پردہ اٹھا ہی دیا تھا لیکن ابھی بہت سے پردے تھے اور میری خواہش تھی کہ ہر پردہ اٹھا دوں۔ اس کے لیے مجھے سکون اور طویل جدوجہد کی ضرورت تھی اور فی الحال مجھے اپنے دشمنوں سے نمٹنا تھا۔ یہی سوچتا ہوا میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ جوانی تک پہنچ کر دو سال کا فرق کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ جسم کے بڑھنے کی رفتار بچپن کی نسبت کم ہو جاتی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے لیے نئے لباس کا بندوبست نہیں کیا تھا۔ پھر میں نے لباس پہنا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کپڑے کسی قدر ڈھیلے ہو گئے تھے، مگر کام چل سکتا تھا۔ جوتے نے بھی پریشان نہیں کیا۔ میک اپ کا سامان سمیٹ کر میں نے ایک بیگ میں رکھ دیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اپنا اصل چہرہ چھپانے کا خواہش مند نہیں تھا۔ اب میرا جن لوگوں سے سابقہ

ایک حرماں نصیب کی داستانِ الم جو چاندنی راتوں میں قہر و غضب کی علامت بن جاتی تھی
دلچسپ کہانیوں کی مصنفہ
سیما غزل
کے سرِ تحریر قلم سے ماہنامہ جی کہانیاں ڈائجسٹ کا قسط وار سلسلہ
ایک بالا بُر تحیر، سنسنی خیز سلسلہ وار آپ بیتی
چاند کے قیدی
2 جلدوں میں مکمل
نسل در نسل چلنے والے انتقام کی رُوداد
قیمت فی حصہ 45 روپے
ڈاک خرچ 12 روپے
ملنے کا پتہ: ناشر
گل قریشی لائبریری 11- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7229762-7248599

زمانے کے ٹھکرائے ہوئے ایک زہریلے نوجوان کی داستان
ایک انمول شاہکار
زہریلا
ایم اے راحت
○ معاشرے کی ناانصافیوں کا شاخسانہ
○ حالات کی ستم ظریفی نے اس کے وجود میں اتنا زہر بھر دیا کہ اس کی ہر سانس مسموم ہو گئی
○ پھر لاتعداد انسان اس زہریلی فضا کے شکار ہو گئے
مکمل کہانی دو جلدوں پر مشتمل کتابی صورت میں
ناشر: گل قریشی لائبریری 11- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7229762-7248599

تھا، انھیں میک اپ سے زیادہ دیر تک بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا تھا۔

قاہرہ سے اسکندریہ جانے کا فیصلہ روا روی میں نہیں کیا گیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے تک پہنچا تھا۔ اسکندریہ، قاہرہ کی طرح شہروں کا شہر تو نہیں مگر اسے بہر حال کوئی چھوٹا شہر نہیں کہا جاسکتا۔ جس طرح ہندوستان میں کلکتہ اور بمبئی کے بعد دہلی یا پاکستان میں کراچی کے بعد لاہور کو سب سے بڑا شہر تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح اسکندریہ کو قاہرہ کے بعد مصر کا بڑا شہر سمجھا جاتا ہے۔ بالفرض میرے دشمن وہاں پہنچ بھی جاتے تو بیس لاکھ آبادی کے اس شہر میں مجھے آسانی سے تلاش نہ کر پاتے۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں اسکندریہ کے متعلق جو باتیں محفوظ تھیں، وہ بھی وہاں جانے کا سبب بنیں۔ مجھے سکون کی ضرورت تھی اور وہاں اس کے امکانات واضح تھے۔ یوں بھی میں اسکندریہ ہو کر ہی قاہرہ پہنچا تھا مگر میں وہاں رکا نہیں تھا۔ قاہرہ سے اس شہر کا فاصلہ بھی صرف دو سو بائیس میل ہے۔ ہوائی جہاز سے تقریباً ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ اسکندریہ سے قاہرہ جاتے ہوئے ہی میں نے پہلی بار لیلیٰ اور اس کے شوہر کو دیکھا تھا جو بعد میں اسرائیلی ایجنٹ اور یہودی ثابت ہوا تھا۔ وہی لیلیٰ جس نے مجھے اپنا بھائی ہارون سمجھا تھا۔ میں نے بھی اس بھولی بھالی لڑکی کو بہن ہی سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اسکندریہ جانے کی تیاریاں کرتے ہوئے شاید اسی لیے مجھے لیلیٰ کئی بار یاد آئی تھی۔ سفر کے دوران میں کبھی کبھی ایسے مسافر بھی تو مل جاتے ہیں جو بھلائے نہ بھلائے جاسکیں اور میں تو اس سفر کے بعد لیلیٰ کے ساتھ بھی رہا تھا۔ پھر اسے کیسے بھلا دیتا۔

مجھے ہوٹل کیرو شیرٹن سے سامان سمیت باہر نکلنے میں بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا پڑا کیونکہ میرے چہرے پر اب وہ میک اپ نہیں تھا جو پہلے تھا۔ اب میری شخصیت بالکل بدل چکی تھی۔ میں نے ہوٹل سے نکلنے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ایئرپورٹ روانہ ہونے میں انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔ کسی بھی لمحے میرا کوئی بھی دشمن میرے پیچھے لگ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں قاہرہ سے اسکندریہ جانا لاحاصل ہی ہوتا۔ میں نے ایئرپورٹ پہنچنے تک اپنی دانست میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی، پھر بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ مجھے روسی ایجنٹ بیلیا کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ کوئی چال نہ چل جائے۔ تین بار خلاف توقع اس نے میرے سامنے آکر مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔

میں فلائٹ کے وقت کو مدنظر رکھ کر دانستہ ٹھیک وقت پر ایئرپورٹ پہنچا تاکہ ایئرپورٹ پر زیادہ رکنا نہ پڑے۔ جہاز روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ پھر مجھے اسی وقت کسی قدر اطمینان ہوا جب جہاز قاہرہ ایئرپورٹ سے اسکندریہ کے لیے فضا میں بلند ہوا۔

سفر کے دوران بھی میں چوکنا رہا۔ میری شخصیت جعلی ضرور تھی مگر کوئی مجھ پر کسی طرح کا شک نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے چہرے مہرے اور لباس سے میں کسی اعلیٰ اور باعزت خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ میں ایک حیرت انگیز وجود ہوں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسکندریہ ایئرپورٹ ہی پر کئی اچھے ہوٹلوں کے نمائندوں نے مجھے اپنے اپنے ہوٹلوں میں قیام کے لیے متوجہ کیا مگر مجھے یہاں کسی ہوٹل میں قیام نہیں کرنا تھا۔ مجھے جس شخص کی تلاش تھی، وہ بھی جلد ہی مجھ تک پہنچ گیا۔ ہوٹلوں کے نمائندے مجھ سے مایوس ہو کر دوسرے مسافروں کی طرف چلے گئے اور میں اس ادھیڑ عمر شخص سے بات کرنے لگا۔ میں نے اس شخص کی پیشکش کے جواب میں کہا۔ "میں تمھارے ساتھ چلنے پر راضی ہوں لیکن فیصلہ مکان دیکھ کر ہوگا۔"

"بالکل جناب!" وہ جلدی سے سر ہلا کر بولا۔ "آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ کہیں گے تو ملازمین کا بندوبست بھی...."

"وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

پھر وہی شخص ایک ٹیکسی لے آیا اور میرا سامان ٹیکسی کی ڈکی میں رکھوا دیا جو صرف دو اٹیچیوں پر مشتمل تھا۔ اسی نے میرے لیے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔ وہ آگے ٹیکسی ڈرائیور کی نشست کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

سمندر کے قریب ساحل ابجمی کا وہ پورا علاقہ مجھے خوبصورت معلوم ہوا۔ اسی ادھیڑ عمر شخص نے اسکندریہ کے اسی علاقے میں ایک جدید طرز تعمیر کے مکان کی پیشکش کی تھی۔ جو لوگ مصر کے مختلف علاقوں سے بغرض تفریح اسکندریہ آتے ہیں عموماً اسی علاقے میں ٹھہرتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں تو یہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے کیونکہ گرمیوں میں اسکندریہ کا موسم بہت اچھا رہتا ہے۔ لوگ گرمیاں گزارنے یہاں آتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے بھی یہ علاقہ پرکشش اور پرفضا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں جن لوگوں نے مکانات تعمیر کیے ہیں، وہ عموماً انھیں کرائے پر اٹھا کر مالی منفعت

حاصل کرتے ہیں۔ اسکندریہ روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے اس علاقے میں سکونت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے حافظے میں اسکندریہ کے متعلق جو تفصیلات محفوظ تھیں، وہ اس سلسلے میں کام آئی تھیں۔ مجھے اس شہر کی تاریخی حیثیت کا بھی علم تھا۔ اس شہر میں میرے کچھ دن سکون سے گزر سکتے تھے۔

ادھیڑ عمر شخص نے غلط نہیں کہا تھا۔ جدید طرز پر بنا ہوا وہ مکان مجھے پسند آیا۔ مکان کی چابیاں اس شخص کے پاس تھیں۔ اس نے مجھے ایک ایک کمرہ دکھایا۔ نچلی منزل پر تین کمرے تھے اور اوپری منزل پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کے سامنے چھت تھی۔ منڈیروں کے قریب گملے رکھے تھے اور ان میں پھولوں کے پودے لگے تھے۔ اس شخص نے پورے مکان میں روشنی کر دی تھی۔ مکان صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ فرنیچر وغیرہ ضروری ساز و سامان سبھی کچھ تھا۔ میں نے اسی لیے اپنی آمادگی ظاہر کر دی اور اس شخص کا کمیشن اسے دے دیا۔

"آپ یہاں آرام کریں، میں مالک مکان کو بلا کر لاتا ہوں۔ اس وقت تک کوئی ضرورت ہو تو چوکیدار کو بلا لیجیے گا۔ میں اس سے کہہ جاؤں گا۔ گیٹ کے پاس ہی جو کوٹھری آپ نے دیکھی ہوگی، وہ اسی میں رہتا ہے۔" اس شخص نے مجھ سے کہا اور اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت میں نچلی منزل کے ایک کمرے میں تھا جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میری دونوں اٹیچیاں بھی ابھی وہیں رکھی تھیں۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور اس شخص کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے چلتے چلتے مجھے بتایا کہ مالک مکان بھی اسی علاقے میں رہتا ہے اس لیے اسے لے کر آنے میں دیر نہیں ہوگی۔

تمام معاملات جلد ہی طے ہو گئے۔ مالک مکان مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا کیونکہ میں نے منہ مانگا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ ایک ماہ کا پیشگی کرایہ کم نہیں تھا۔ اسی سے میں نے ایک نوکر کا بندوبست کرنے کے لیے بھی کہہ دیا۔ وہ بولا کہ کل صبح تک نوکر آجائے گا۔ کمیشن ایجنٹ بھی مالک مکان کے ساتھ رخصت ہو رہا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ قاہرہ سے میں کھانا کھا کر چلا تھا۔ اس وقت کچھ کھانے کی خواہش تو نہیں ہو رہی تھی البتہ میں شراب کی حاجت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس کمیشن ایجنٹ کو اسی لیے روکا تھا۔

"یہاں کسی اچھی شراب کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے؟" میں نے اس سے کہا۔

"کیوں نہیں جناب!" وہ فوراً بولا۔ "یہاں اچھے سے اچھے بار ہیں اور...."

"نہیں، میں وہاں جا کر پینا نہیں چاہتا۔"

"یہاں بھی آسکتی ہے شراب، بولیں کون سی پیتے ہیں آپ؟ میں لا کر دے دوں گا۔"

"کوئی بھی اچھی شراب لے آؤ، لیکن تمھیں زحمت ضرور ہو گی کیونکہ فی الحال مجھے کم از کم چار بوتلیں چاہئیں۔" میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"زحمت کی کوئی بات نہیں جناب! آپ تو مہمان ہیں ہمارے۔"

"تو پھر یہ لو۔" میں نے جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے سو گنی کا نوٹ کھینچ لیا۔ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں بولا۔ "بس ذرا دیر نہ لگانا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ لے لیا اور بولا۔ "ویسے جناب! مجھے تو قلوپطرہ اور عمر خیام، ان دونوں شرابوں سے اچھی کوئی شراب معلوم نہیں ہوتی۔ یوں آپ کہیں تو باہر کی لے آؤں۔" اس نے اپنی پسند کا اظہار کیا۔ "بہت تیز ہیں دونوں، ایک دم چڑھتی ہیں۔"

"چلو آج یہی سہی۔ میں نے پہلے یہ شرابیں پی تو نہیں لیکن تم کہہ رہے ہو تو...."

"ارے صاحب لطف آجائے گا آپ کو۔" وہ ہنس کر کھڑا ہوا۔ "میں لے کر آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا تو میں صوفے سے اٹھ کر اس کے انتظار میں ٹہلنے لگا۔ ڈرائنگ روم، بیڈ روم سے ملحق تھا۔ اس وقت بھی میں اسی میں تھا۔ میری دونوں اٹیچیاں بیڈ روم میں پہنچا دی گئی تھیں۔ میں ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ میں نے سوٹ اتار کر سونے کا لباس پہن لیا کیونکہ اب مجھے کہیں نہیں جانا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ اس شخص کو لوٹ کر آنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اس نے وہ ڈبا میز پر رکھ دیا جس میں بوتلیں تھیں پھر میری طرف مڑ کر بولا۔

"قلوپطرہ [illegible] جناب، چار بوتلیں۔"

"بہت بہت شکریہ! اب تم جاؤ۔"

"یہ بقیہ رقم لے لیں۔" وہ میری جانب بڑھا تو میں نے اس

سے نوٹ لے کر بغیر گنے جیب میں رکھ لیے۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اپنا "کمیشن" خود ہی لے لیا ہوگا۔

"میں کل کسی وقت ادھر چکر لگاؤں گا، کوئی اور خدمت ہو تو بتا دیجیے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

کچن میں شیشے کے کچھ برتن موجود تھے، میں ایک گلاس دھو کر لے آیا اور وہیں ڈرائنگ روم میں پینے بیٹھ گیا۔ شراب سستا ترین تھی لیکن پہلی بوتل ختم کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ بالکل ہی گھٹیا نہیں جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا۔ ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی، نو ہی بجے تھے۔ تیسری بوتل ختم کر کے میں کچھ دیر رک گیا۔ اب ہلکا ہلکا سرور ہونے لگا تھا۔ کسی شرابی کو میری یہ بات عجیب اور ناقابل یقین ہی معلوم ہوگی کہ شراب کی تین بوتلوں سے مجھے ہلکا سا سرور ہوا مگر میرے لیے اب یہ عادت بن گئی ہے۔ مجھے اب ایسی باتوں پر قطعی حیرت نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے ذہن کو یہ سوچ کر مطمئن کر لیا ہے کہ میں بہر حال ایک غیر معمولی انسان ہوں۔ اگر مجھے پوری ایک بوتل سے ایک پیگ کا نشہ ہوتا ہے تو یہ میری مجبوری ہے۔ میری ذہنی ساخت ہی ایسی ہے کہ میرا ذہن نشے کو کم قبول کرتا ہے۔ میں اسی لیے پانی یا سوڈا ملا کر نہیں پیتا۔ چوتھی بوتل ختم کرتے ہوئے مجھے کچھ سکون و اطمینان کا احساس ہوا۔ قاہرہ میں ہنگامہ خیز دن گزار کر اسکندریہ کا پُرسکون ماحول مجھے اچھا لگا۔ فی الحال مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بقیہ دو بوتلیں میں نے دوسرے دن کے لیے اٹھا کر رکھ دیں۔

وہ شب آرام سے گزری۔ میں بے فکر ہو کر سویا۔ صبح بٹلر بھی آ گیا اور میں نے اسے اس کے فرائض سمجھا دیے۔ کچھ زیادہ رقم لے کر وہ گھر کی صفائی اور بقیہ کام پر بھی راضی ہو گیا۔ میں نے اسے ایک ماہ کے لیے ملازم رکھا تھا اور کہہ دیا تھا کہ مزید قیام رہا تو اور رقم دے دوں گا۔ وہ غریب آدمی تھا، خوش ہو گیا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی کہ وہ فرماں بردار اور باادب تھا۔ میں ملازمین کی بھیڑ سے بچنا چاہتا تھا اس لیے ایک ہی آدمی کو سارے کام سپرد کر دیے تھے۔ وہ مجھ سے پچیس گنی کا ایک نوٹ لے کر کچن کے لیے سودا سلف لینے چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے مجھے ناشتا کرایا اور میں ناشتا کر چکا تو برتن لے گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور ان باتوں پر مزید غور و فکر کرنے لگا جو قاہرہ ہی میں سوچ چکا تھا۔

اپنی اصل شکل لوٹ آنے کے بعد مجھے طمانیت سی مل گئی تھی۔ باتیں پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں اب انہیں میں سمجھنے لگا تھا۔ بیس سالہ نوجوان کے لیے حسن سے متاثر ہونا فطری سی بات ہے۔ چھ سال پہلے میری اصل عمر بہر حال اتنی نہیں تھی کہ میں حسین سے متاثر ہوتا۔ اگر اب ایسا ہونے لگا تھا تو یہ بڑی خوشی آئند تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میرا جسم فطرت کے تقاضوں کے خلاف پروان چڑھنے کے باوجود قطعی طور پر فطری تقاضوں سے آزاد نہیں ہوا۔ گرکی مختلف منازل کا سفر کرنے کے فطری تقاضے بدستور ہیں۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد میں فیصلہ کیا کہ حتی الامکان اب اپنی پُراسرار قوتوں کے استعمال سے گریز کروں گا اور ایک عام انسان کی حیثیت سے ایک حقیقی زندگی گزارنے کی کوشش کروں گا جو فطرت کے تقاضوں سے قریب ہو۔ اسکندریہ کے دورانِ قیام میں ایسا ممکن تھا۔ میں نے سوچا اگر مجھ سے میرا بچپن چھین لیا گیا ہے تو کم از کم جوانی تو ضائع نہ کروں۔ اس کے عذاب و ثواب سے تو میں جس حد تک ممکن ہو گزر رہی ہوں۔ کیا خبر کب کھیل ختم ہو جائے۔ میرے دشمن کب مجھ پر قابو پا لیں یا پھر ان کے قبضے میں جانے سے پہلے میں خود کو ختم کر لوں۔ یہ مایوس کن خیالات نہیں تھے بلکہ حقائق کو صحیح انداز میں سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ میں فطری زندگی گزارنے کا آرزو مند تھا۔ مسئلہ صرف میرے دشمن تھے جو مجھے کہیں چین نہیں لینے دیتے تھے۔ انھی سے نمٹنے کے لیے مجھے مجبوراً اپنی پُراسرار قوتیں استعمال کرنا پڑتی تھیں۔ اس کا امکان آئندہ بھی تھا۔ مجھے کچھ گمان سا تھا کہ ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارنا میرے لیے سود مند ثابت ہوگا۔ اس سے وہ خلا پُر ہو جائے گا جو میرے اور عام انسانوں کے درمیان ہے۔ مگر شاید میں خود کو اس قدر تنہا محسوس نہ کروں۔ مگر دو میاں میرے بیٹے یوں نہ جائیں کہ میں اپنے سائے سے بھی چونک اٹھوں۔

"میں جو کچھ بن گیا ہوں، اس میں میرا قصور ہی کب ہے۔" میں سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگا۔ اسی وقت دروازے کی جانب میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں چونک سا ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ جاتے ہوئے بٹلر دروازے کو بھیڑ گیا تھا۔ دراصل قاہرہ کے دورانِ قیام میں ہر لمحہ مجھے چوکنا رہنا پڑا تھا۔ وہاں سے میں کل ہی اسکندریہ آیا تھا۔ ایک ہی رات تو سکون سے گزری تھی، وہ بھی کافی دن بعد۔ اس لیے میرا چونکنا ہونا فطری

تھا لیکن بہت جلد میں نے خود پر قابو پا لیا اور آرام کرسی پر اسی طرح دراز رہا۔ دروازہ بٹلر نے کھولا اور اندر آ کر ادب سے بولا۔

"پڑوسی آپ سے ملنے آئے ہیں جناب!"

"پڑوسی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں جناب، انھوں نے یہی بتایا ہے۔ میں نے ان دونوں کو نشست گاہ میں بٹھا دیا ہے۔" بٹلر نے بتایا۔

"اچھا ان سے کہو میں آتا ہوں.... اور سنو چائے بھی بنا لینا ان کے لیے۔"

"بہتر ہے۔" وہ ادب سے ذرا سا جھکا پھر لوٹ گیا۔

کچھ دیر بعد میں لباس تبدیل کر کے نشست گاہ میں پہنچا تو وہ دونوں مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نوجوان لڑکی تھی اور ایک بوڑھا۔ میں نے ان سے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود بھی ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے بوڑھے نے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے ہارڈی کہتے ہیں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "اور یہ میری بیٹی ایلس ہے۔" میں نے باری باری ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے بھی بوڑھے کی طرح انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔

"دراصل ہمیں آج صبح ہی معلوم ہوا کہ اس مکان میں بھی کوئی آ گیا ہے، ہم نے سوچا، مل لیں۔" بوڑھا بولا۔

"اچھا کیا آپ نے!" میں نے بوڑھے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ پرانے طرز کا سرمئی سوٹ پہنے ہوئے تھا، جسم بھاری اور چہرے پر داڑھی تھی۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "آپ لوگ غالباً سیاحت کی غرض سے آئے ہیں یہاں؟"

"جی.... کم از کم ایلس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔" اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انھی کے متعلق کیوں؟"

"میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں دراصل تحقیق کا آدمی ہوں۔ میرا موضوع آثارِ قدیمہ ہے۔ میں اسی لیے امریکہ سے مصر آیا ہوں۔ ایلس بولی کہ میں بھی چلوں گی تو اسے بھی میں ساتھ لے آیا۔"

بوڑھے ہارڈی نے تفصیل کے ساتھ میری بات کا جواب دیا۔ ایلس اب تک کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے پہلی بار میری طرف براہِ راست نظر اٹھائی اور بولی۔ "آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟"

- غاصب یہودیوں سے ہر محاذ پر برسرِ پیکار -
سرفروشوں کی لہو رنگ داستان
جانباز
تحریر
ایم اے راحت
مکمل کہانی 2 جلدوں پر مشتمل
منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
جانباز
سازشوں اور اسلام دشمن کلوشوں کے
انکشاف سے پُر ایک انوکھی دستاویز
تل ابیب سے تربیت یافتہ
موساد کے بھیانک روپ
(زیرِ طبع)
قیمت فی حصہ ۲۵ روپے، محصول ڈاک 16 روپے
آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب کریں۔

"میرا کیا تعارف؟" میں مسکرایا۔ ذہنی طور پر اس کے لیے میں پہلے ہی تیار تھا۔ "ویسے میرا نام شارب بن سلمان ہے اور میں قاہرہ سے آیا ہوں۔"

"سیر و تفریح کے لیے؟" ایلس نے پوچھا۔

"جی ہاں، اسکندریہ دیکھا نہیں تھا پہلے، سوچا کچھ دن یہاں گھوم لوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ایلس کو غور سے دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔ اکہرے بدن والی وہ لڑکی خوب صورت تھی۔ سفید اسکرٹ اس پر بھلا لگ رہا تھا۔

"آپ کو ہمارے یہاں آنے سے کوئی زحمت تو نہیں ہوئی؟" بوڑھے ہارڈی نے کہا۔

"نہیں جناب، زحمت کی کوئی بات نہیں۔" میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا حالانکہ اُن لوگوں کے آنے سے مجھے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے میری خلوت ختم کر دی تھی اور میں سکون کے ساتھ ابھی بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

"شام کو ہم شاہ فاروق کا محل دیکھنے جائیں گے۔ آپ کہیں تو ہم آپ کو بھی ساتھ لے لیں۔" بوڑھا ہارڈی اپنی داڑھی کے بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگ دیکھ آئیں۔" میں نے ہارڈی کی بات کا جواب دیا۔ "میں ضرور چلتا آپ کے ساتھ، مگر آج فوراً آرام کرنے کا خیال ہے۔ میں پھر کسی دن دیکھ آؤں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ اچھا اب اجازت دیں۔"

"کم از کم چائے تو پی کر جائیں، ویسے ہی رہا ہوگا ابھی۔"

"یہ چائے کے لیے آپ نے کب کہہ دیا مسٹر شارب؟" ایلس پھر بول اٹھی۔

"اُسی وقت جب آپ لوگوں کی آمد کے بارے میں بٹلر نے مجھے اطلاع دی تھی۔"

"میں نے تمھیں بتایا تھا نا ایلس کہ عرب بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔" ہارڈی نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس نے تصدیق میں سر ہلا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد بٹلر چائے لے آیا اور ٹرے درمیانی میز پر رکھ دی۔ وہ تین پیالیاں لایا تھا۔ وہ میرے سامنے بھی پیالی رکھنے لگا تو میں نے منع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ایلس بولی۔ "کیوں آپ نہیں پئیں گے مسٹر شارب؟"

"ابھی ناشتا کیا ہے میں نے، زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ آپ پئیں۔" میں نے کہا۔

بٹلر نے کیتلی سے پیالیوں میں چائے انڈیلنا چاہی تو ایلس اُس سے بولی۔ "تم جتنے دو، چائے میں بناؤں گی۔" ایلس نے بٹلر سے کیتلی لے لی اور ذرا سی آگے کھسک آئی۔ ٹرے سے اُس نے تیسرا خالی کپ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "آدھا کپ تو پی ہی لیں آپ ہمارے ساتھ۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے بڑے دل آویز انداز میں نگاہ اٹھائی۔

"آپ کہتی ہیں تو پینا ہی پڑے گی۔" میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "نہیں پیوں گا تو بداخلاق سمجھیں گی آپ!"

"شکریہ!" یہ کہہ کر ایلس نے پہلے میرے ہی سامنے رکھے ہوئے کپ میں چائے انڈیلی۔ میں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ مجھے بھی وہ اچھی لگ رہی تھی مگر جانے کیوں اُن دونوں باپ بیٹی کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انھوں نے اپنے متعلق جو کچھ بتایا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ ایلس، اس بوڑھے کی بیٹی بھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ ان دونوں میں ذرا بھی شباہت نہیں تھی۔ چائے پینے کے دوران اُن سے گفتگو کرتے ہوئے بھی میں رہ رہ کر اسی بات پر غور کرتا رہا اور اُن دونوں کو بغور دیکھتا رہا۔ بوڑھے ہارڈی کا لہجہ کھُردرا سا تھا اور ایلس کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ ہارڈی کے چہرے سے سخت گیری کا اظہار ہوتا تھا، مگر ایلس کے چہرے پر نرمی تھی۔ ہارڈی کے نقوش بھی اچھے نہیں تھے جب کہ ایلس جاذبِ نظر تھی۔ یہ اُن دونوں کی عمروں کا فرق بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا مگر کوئی بات ایسی ضرور تھی جو مجھے اُن کا بیان غلط معلوم ہو رہا تھا۔ میں اُن دونوں کے ذہنوں کا مطالعہ کر کے بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا تھا لیکن میں نے اس سے اجتناب کیا۔ لوگوں کے چہروں پر بھی بہت کچھ لکھا ہوتا ہے، اُن کی حرکات و سکنات، گفتگو اور رویے سے بھی تو اندازے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے یہی سوچ کر اپنی حیرت انگیز قوتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یوں بھی میں اِن قوتوں سے کم سے کم استعمال کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چائے پینے کے بعد ایلس نے مجھے اپنے یہاں آنے کے لیے مدعو کیا اور اُس کے باپ ہارڈی نے بھی اصرار کیا۔ "میں ضرور آؤں گا کسی دن۔" میں نے جواب میں کہا۔

"دیکھیے مسٹر شارب، آپ نہیں آئے تو ڈیڈی یہاں آئیں نہ آئیں، میں آ کر آپ کو ضرور پریشان کروں گی۔"

"ضرور آئیں آپ، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جب دل چاہے آ جایا کریں!"

"یہاں دل نہیں لگتا اکیلے۔" اُس نے بڑی ادا سے کہا۔

"کیوں، کیا آپ کے ڈیڈی ساتھ نہیں لے جاتے۔ ابھی تو یہ کہہ رہے تھے کہ شام کو..."

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "باہر گھومنے میں تو جی لگ جاتا ہے مگر گھر آ کے ڈیڈی یا تو لکھتے رہتے ہیں یا پھر مطالعہ کرتے ہیں۔"

"آپ بھی پڑھا کریں۔" میں نے اُسے مشورہ دیا۔

"ایلس کو سیر و تفریح سے تو دلچسپی ہے مگر میری کتابیں اسے بور لگتی ہیں۔" ہارڈی بول اٹھا۔ "میرے پاس زیادہ تر کتابیں آثارِ قدیمہ سے متعلق ہیں اور میں اُنھی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ آج کل مصر کے متعلق ایک تھیسس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ بات در اصل یہ ہے کہ آدمی کا جی اپنے ہم عمروں ہی میں لگتا ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا چلتے ہوئے مگر یہ اُس وقت نہیں مانی اور ضد کر کے ساتھ آ گئی۔"

"کتنے دن ہو گئے آپ کو امریکہ سے یہاں آئے ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"اسکندریہ آئے تو بس ہفتہ بھر ہوا ہے۔" ہارڈی نے جواب دیا۔ "ہاں اس سے پہلے مصر ہی میں تین مہینے اور گزر چکے ہیں اسی لیے تو ایلس بور ہو گئی ہے۔"

"کہاں کہاں گئے آپ؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔ میرا مقصد اُس کے لہجے سے جھوٹ اور سچ کا اندازہ کرنا تھا۔

"پہلے قاہرہ میں رہے، پھر سقارہ چلے گئے، اس کے بعد لکسر اور لکسر سے یہاں آ گئے۔" اُس کی بات سن کر میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ مجھے یمامہ یاد آ گئی تھی۔ یمامہ اسی شہر کی تھی۔

"لکسر وہی نا جو کبھی ویلی آف کنگز کہلاتا تھا؟"

"جی ہاں وہی! یہ شاہانِ مصر کا دار الخلافہ بھی رہ چکا ہے اسی لیے اسے پہلے ویلی آف کنگز کہا جاتا تھا۔" ہارڈی کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ "وہاں بڑے قدیم مندر ہیں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ لوگ اُسے الاقصر کہتے ہیں۔"

"آپ کا دورہ تو خاصا طویل معلوم ہوتا ہے۔ اور کتنے دن مصر میں رہیں گے؟"

"ایلس پر منحصر ہے۔ اس نے میرے ساتھ آ کر غلطی کی اب پچھتاتی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "جب تک یہ میرے ساتھ آئندہ کہیں جانے سے توبہ نہیں کر لے گی، میں امریکہ واپس نہیں جاؤں گا۔ اسے ضد کرنے کی سزا تو ملنا چاہیے نا مسٹر شارب!"

"جی نہیں۔" ایلس نے کہا۔ "یہاں بور نہیں ہوں گی میں! مسٹر شارب کے پاس آ جایا کروں گی۔"

"لیکن یہ بھی تو یہاں گھومنے کی غرض سے آئے ہیں، تھوڑی تو نہیں کہ تمھیں ہر وقت گھر پر مل جائیں۔" ہارڈی بولا۔

"تو کیا ہوا، میں بھی ان کے ساتھ گھومنے چلی جایا کروں گی۔" وہ زبردستی میرے گلے پڑ رہی تھی اور یہ بات بھی کھٹکا دینے والی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دونوں کسی خاص مقصد کے تحت آپس میں اس طرح کی باتیں کر رہے تھے ورنہ پہلی ہی ملاقات میں ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ میں خاموش رہا تو ایلس نے مجھے مخاطب کر لیا۔ "کیوں مسٹر شارب، آپ مجھے اپنے ساتھ لے جایا کریں گے نا؟"

مجھے مجبوراً آمادگی کا اظہار کرنا پڑا۔ پھر مزید کچھ دیر بیٹھ کر وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایلس نے چلتے وقت مجھ سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ہارڈی میں وہ گرم جوشی مفقود تھی۔ میں اخلاقاً اُن دونوں کو پھاٹک تک چھوڑنے گیا اور پھر دوبارہ خواب گاہ میں آ گیا۔ اُن دونوں کی آمد سے پہلے میں لیٹا تھا۔ کچھ دیر میں اُنھی دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ لڑکی کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے قریب آنا چاہتی ہے اور اُس کے باپ کی خواہش بھی یہی ہے۔ وہ دونوں ایسا کیوں چاہتے تھے؟ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور تھا۔ وہ مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کو اپنے قریب آنے کا موقع ضرور دوں گا۔ میرے اور اُس کے درمیان ایک قدرِ مشترک بھی تھی۔ اُس کی پتلیوں کا رنگ بھی میری طرح سبز تھا۔ اکثر غیر ملکی یعنی مغربی لڑکیوں کا رنگ گورا ہونے کے باوجود پھیکا پھیکا سا ہوتا ہے اور جلد بے داغ نہیں ہوتی، چہرے میں کشش نہیں ہوتی مگر ایلس کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ نہ اُس کی جلد خشک تھی، نہ سرخ تلوں سے داغ دار۔ البتہ دہانہ ذرا چوڑا تھا۔ ہونٹ بھی کسی قدر پتلے تھے۔ اگر دہانہ کسی قدر

عیب نہ ہوتے تو یقیناً وہ اور بھی خوب صورت نظر آتی لیکن مجموعی طور پر اُسے پُرکشش ہی کہا جا سکتا تھا۔ خصوصاً اُس کا جسم بڑا نازک سا تھا۔ یوں جیسے شیشے کا بنا ہوا، ذرا ٹھیس لگی اور بکھر گیا۔ کم از کم میں نے یہی محسوس کیا تھا۔ وہ بہت احتیاط، سلیقے اور نزاکت سے برتے جانے کے قابل تھی۔ اُس کی اور میری عمر میں فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ میری ہم عمر ہی لگتی تھی۔ اُس کے ترشے ہوئے بالوں نے حسن کو اور بھی بگاڑ دیا تھا۔ لباس اور بالوں کی تراش خراش شخصیت پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اُسے شاید یہ بات معلوم نہیں تھی یا معلوم تھی تو اس نے عمل نہیں کیا تھا۔ لڑکوں ایسے بال ممکن ہے کہ خود اُسے اچھے لگتے ہوں لیکن مجھے اچھے نہیں لگے تھے۔ اُس حسین لڑکی ایلس اور اُس کے باپ ہارڈی کے متعلق سوچتے ہوئے میرا ذہن اپنے دشمنوں کی طرف چلا گیا۔ ان دونوں کا تعلق میرے دشمنوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے دشمنوں کو تو میں قاہرہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اُن دونوں کا کوئی اور ہی مقصد تھا۔ کیا؟ مجھے یہی معلوم کرنا تھا مگر یہ معلوم کرنے کے لیے میں اپنی غیر معمولی قوتوں کو حرکت میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنے دشمنوں کا خیال آیا تو تین چہرے میری چشمِ تصور میں گھوم گئے۔ ہنری ناٹ، لوئی چو اور بیلیا کے چہرے! تین بڑی طاقتوں کے تین خطرناک ایجنٹ جو اب تک میرے قابو میں نہیں آ سکے تھے۔ یہ تینوں ہی میرے ہاتھوں مرتے مرتے بچے تھے۔ اپنی حیرت انگیز قوتوں کے باوجود بھی میں انھیں ٹھکانے نہیں لگا سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ کہ ان تینوں ہی میں کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ میں باری باری تینوں کے بارے میں غور کرنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے ہنری ناٹ کی خصوصیات پر غور کیا۔

ہنری ناٹ مجھ سے اب تک صرف اسی لیے بچتا رہا تھا کہ وہ اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی نظر میں بھی وہ بڑا پُراسرار تھا۔ اُس میں بڑی سرعت سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی وہ مسکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ انتہائی چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ غیر معمولی ذہن کا مالک تھا۔ اپنی ذہنی قوتوں سے اُسے زیر کر لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اُس سے نمٹنے کی بس ایک ہی صورت تھی۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہوں اور وہ میرے قریب ہو۔ پھر اُس کا مجھ سے بچنا محال ہو جاتا۔ میں اُسے کسی چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک دیتا۔ اپنے جسم کی غیر معمولی قوت استعمال نہ کرنے کی صورت میں ہنری ناٹ کو گولی کا نشانہ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ اُس کے سینے میں خنجر اتارنا بھی ممکن تھا۔ مجھے اُس پر بہر حال یہ برتری حاصل تھی کہ وہ مجھے قتل کرنے سے گریزاں رہتا اور میں اُسے ٹھکانے لگانے میں تامل نہ کرتا۔ مسئلہ اُسے تلاش کرنا تھا کیونکہ وہ دور دور تک جال پھیلاتا تھا۔ جب تک اُسے یقین نہ ہو جاتا کہ میں پوری طرح پھنس چکا ہوں، وہ میرے قریب نہ آتا۔ اُس کی فطرت میں فریب تھا اور اُسے فریب دے کر ہی ختم کیا جا سکتا تھا۔ ہنری ناٹ کے بارے میں ایک فیصلے تک پہنچنے کے بعد میرا ذہن لوئی چو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لوئی چو کے ذہن کی ایک خصوصیت بہت خطرناک تھی۔ اُس سے ذہنی رابطہ قائم کرنا میرے حق میں بہتر نہیں تھا۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے پر قادر تھی۔ اُس کا ذہن پڑھ کر میرے لیے حقیقت تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ ذہنی رابطہ قائم ہو جانے کی صورت میں وہ مجھ پر غالب بھی آ سکتی تھی۔ وہ میری ذہنی قوتوں کو وقتی طور پر ہی سہی، معطل کر سکتی تھی۔ مجھے ہوٹل کیرو شیرٹن میں پیش آنے والا وہ واقعہ بھولا نہیں تھا جب میرے ذہن میں دھواں سا بھرنے لگا تھا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ اپنی اس ذہنی قوت کا استعمال وہ اُسی وقت کر سکتی تھی جب خود میں اُس سے ذہنی رابطہ قائم کرتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اب تک مجھ پر قابو پا چکی ہوتی۔ ہنری ناٹ کی طرح اُس سے بھی دو بدو نمٹنا ممکن تھا۔

تیسری بیلیا تھی جو ہنری ناٹ اور لوئی چو سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے اُس کے بارے میں کافی دیر سوچنے کے بعد ایک نتیجہ اخذ کیا۔ بیلیا کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے پہلے اِس اہم نکتے پر غور کیا کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچنے کے باوجود میرے دشمن مجھے کس طرح تلاش کر لیتے ہیں؟ میں کہیں بھی چلا جاؤں جلد یا بدیر وہ مجھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اِس کا سبب کیا ہے؟ یہ وہ سوال تھا جو بہت دنوں سے میرے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا مگر مجھے سکون و اطمینان کے ساتھ اس پر غور کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اِس سلسلے میں اب تک میں نے صرف اتنا معلوم کیا تھا کہ تینوں بڑی طاقتوں کے ایجنٹوں کو اپنی اپنی حکومتوں کے اعلیٰ افسران سے اطلاعات ملتی تھیں۔ اب میں نے یہ سوچا کہ اُن اعلیٰ افسران کی معلومات کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟

اُنھیں یہ خبر کیسے ہو جاتی ہے کہ میں دُنیا کے کس ملک اور کس شہر میں ہوں؟ یہ سوال بہت اہم تھے۔ اِن سوالوں کا ایک ہی ممکنہ جواب تھا کہ تینوں بڑی طاقتیں میری تلاش کے سلسلے میں پروفیسر سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ وہی پروفیسر، وہی میرا خالق جس نے مجھے غیر معمولی بنا دیا تھا اور میں عام انسانوں سے مختلف ہو گیا تھا۔ پروفیسر بہر حال کوئی معمولی شخصیت نہیں تھا۔ وہ شخص معمولی ہوتا بھی کیسے جس نے میری تخلیق کی تھی۔ اُس نے اپنی تمام زندگی تجربات میں گزار دی تھی۔ یہ الگ بات کہ میرے خیال میں اُس کے تجربات مثبت نہیں منفی تھے۔ میں نے، اُس کی تخلیق نے اسی لیے اُس سے بغاوت کر دی تھی۔ اُس نے مجھے بے پناہ قوتوں کا مالک بناتے ہوئے شاید یہ نہیں سوچا تھا کہ اِس طرح وہ دُنیا کی تباہی و بربادی کا سامان کر رہا ہے۔ ایٹم بم بنانے والے نے بھی شاید یہ نہ سوچا ہو گا کہ اِس سے دُنیا کے لیے کتنا خطرہ پیدا ہو جائے گا! کاش یہ بڑے ذہن، یہ بڑے سائنس داں، تخریب کی بجائے تعمیر کے لیے سوچتے اور کام کرتے۔

میری دانست میں پروفیسر بھی سائنس دانوں کے ایسے ہی گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو صرف اپنے تجربات سے اور اپنی ایجادات سے مخلص ہوتے ہیں۔ انھیں انسان اور انسانیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اُن کی خطرناک ایجادات دُنیا پر کیا تباہی لائیں گی۔ یہ اُن کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ اپنی تلاش کے سلسلے میں مجھے پروفیسر کا کردار بہت اہم معلوم ہوا۔ اِس نتیجے تک پہنچنے کے بعد کہ پروفیسر ہی میری تلاش کا ذریعہ ہو سکتا ہے، میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی، اور میں قیاسات کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ خود پروفیسر دو بار مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر چکا تھا۔ نہ معلوم وہ کہاں تھا اور مجھ سے اُس کا فاصلہ کتنا تھا، لیکن اُس نے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا۔ میرے اور اُس کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا تعلق ضرور قائم تھا کہ اُس نے انتہائی عجیب انداز میں مجھ تک اپنی بات پہنچا دی۔ اِس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پروفیسر کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کم عرصے یا زیادہ عرصے میں بہر حال یہ سراغ لگا لے کہ میں کہاں ہوں! اب تک میں جن حالات سے گزرا تھا، اُن کی روشنی میں بہ آسانی یہ سمجھنے کا اہل تھا کہ پروفیسر کسی سبب ایک محدود علاقے کی نشان دہی کرتا ہو گا۔ وہ علاقہ یا وہ شہر جہاں میں ہو سکتا ہوں۔ پھر تینوں بڑی طاقتوں کے ایجنٹ یکے بعد دیگرے یا ایک ساتھ وہاں پہنچ جاتے ہوں گے۔ سوچتے سوچتے میرا یہ قیاس یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ اِس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ دُنیا کی بھیڑ میں کسی اور طرح مجھے تلاش کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ معمّا میں نے تقریباً حل کر لیا جو طویل عرصے سے میرے لیے عذابِ جاں بنا ہوا تھا۔ اِسی حوالے سے میں نے روسی ایجنٹ بیلیا کی اُس گفتگو پر غور کیا جو میرے اور اُس کے درمیان ہوئی تھی۔ بیلیا نے بھی یہی بتایا تھا کہ پروفیسر میری تلاش کے سلسلے میں روسی حکومت کی مدد کر رہا تھا جس پر امریکہ نے احتجاج کیا۔ احتجاج اُسی وقت کیا جاتا ہے جب مساویانہ سلوک نہ کیا جائے۔ پروفیسر، روسی حکومت سے تعاون کرنے میں یقیناً کچھ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ بیلیا نے مجھے اِس کا سبب بھی بتایا تھا: "اِس کے لیے میرے ملک نے پروفیسر کو، تمھارے خالق کو بڑی قیمت ادا کی ہے۔" میرے ذہن میں بیلیا کے جملے گونجنے لگے: "پروفیسر اپنی عمر کا بقیہ حصہ بھی تجربات کی نذر کر دینا چاہتا ہے اور اُسے اِس کے لیے سرمایہ چاہیے، خواہ وہ سرمایہ تینوں بڑی طاقتوں میں سے کوئی بھی فراہم کرے۔"

یہ قدم ایک مخصوص علاقے کی نشاندہی سے آگے کا قدم تھا۔ پروفیسر نے روسی حکومت کو کوئی نہ کوئی ایسی شے فراہم کی تھی جو اُس مخصوص علاقے میں براہِ راست میری نشان دہی کر سکے۔ اعلیٰ روسی حکام کے توسط سے وہ شے بیلیا تک پہنچ گئی تھی، تاکہ وہ مجھے آسانی سے تلاش کر لے۔ وہ کوئی حیرت انگیز مشین ہی ہو سکتی تھی۔ اُسی شے سے ملتی جلتی جو میری تلاش میں پہلی بار لوئی چو نے استعمال کی تھی۔ اِن اشیاء میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ اِن میں سے ایک شے سے میں نجات پا سکتا تھا، جیسا کہ میں نے کیا۔ میں نے اُس شے کو کہ جس کا کوئی نام اب تک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا، دریا بُرد کر دیا۔ یوں میں چینی ایجنٹ لوئی چو سے بچ گیا مگر بیلیا کے پاس جو شے ہو سکتی تھی، اُسے میں اپنے لیے سخت خطرہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ اُس شے کا تعلق یقیناً میرے حیرت انگیز وجود سے تھا۔ وہ شے کسی بڑی طاقت کی نہیں، پروفیسر کی ایجاد تھی۔

پروفیسر نے میری تلاش میں اب سے پہلے یہ قدم کیوں نہیں اٹھایا؟ اِس کے کئی اسباب ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اِس شے کی ایجاد میں کافی وقت لگا ہو۔ اِس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اب سے پہلے تینوں بڑی طاقتوں نے میرے سامنے خود کو اتنا مجبور نہ محسوس کیا ہو۔ اِس کا ایک سبب یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا

کہ اس شے کی ایجاد میں کوئی دقت رہی ہو جس پر پروفیسر نے بعد میں قابو پالیا۔ جو بات اسرار کی دھند میں ہو، اُس کے بارے میں مفروضے ہی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ یہ مفروضات درست بھی ثابت ہوسکتے ہیں اور غلط بھی، لیکن شواہد سے یہی ظاہر ہو رہا تھا جو میں نے سوچا۔ بہرحال اب میرے لیے پہلے کی نسبت خطرہ بڑھ چکا تھا اور مجھے اس خطرے کا تدارک کرنا تھا۔ امریکی حکومت کے احتجاج کے بعد دو ہی امکانی صورتیں تھیں۔ یا تو پروفیسر مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لیے تینوں ہی بڑی طاقتوں کو اپنی وہ ایجاد فراہم کر دیتا یا پھر کسی وجہ سے ایسا نہ کرتا۔ احتجاج سے کوئی بھی نئی صورتِ حال پیدا ہوسکتی تھی۔ اُس نئی ایجاد کی تیاری میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے، یہ بھی مجھے علم نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر اس میں زیادہ وقت کی ضرورت تھی تو پروفیسر فوری طور پر تینوں بڑی طاقتوں سے سودے بازی نہ کرتا اور امریکی احتجاج کے بعد اس مسئلے کو ختم کر دیتا، لیکن روسی حکومت کو بقیہ دو بڑی طاقتوں پر برتری حاصل رہتی۔

میں نے اپنی سہولت کی خاطر اُس ایجاد کا ایک نام فرض کر لیا۔ کئی نام سوچنے کے بعد مجھے ایک نام پسند آیا، نشان پیما! یعنی وہ جو میری نشان دہی کرسکے۔ میں نے "نشان پیما" کے یہی معنی فرض کیے۔ اس کے بعد میں یہ سوچنے لگا کہ جب بیلیا کے پاس نشان پیما موجود تھا تو پھر وہ چند دن کے لیے کہاں اور کیوں غائب ہوگئی تھی؟ اِس دوران میں نشان پیما میں کوئی خرابی پیدا ہوسکتی تھی۔ یہ میں نے اس لیے سوچا کہ بیلیا کو مجھ سے دو بہ دو بھی لڑنا پڑا تھا۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ وہ نشان پیما کو اپنے ساتھ ہی رکھتی ہوگی۔ مجھ سے نبرد آزمائی کے دوران میں نشان پیما کو کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ جتنے دن وہ غائب رہی، اس کا یہی جواز ممکن تھا یا اگر کوئی اور وجہ تھی تو میں اُس سے بے خبر تھا۔

اپنے تینوں دشمنوں کے متعلق اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد میں نے بیلیا کے وجود کو اپنے لیے سب سے خطرناک پایا اگر واقعی اُس کے پاس نشان پیما ایسی کوئی خطرناک شے تھی جو میری نشان دہی کرسکتی ہو تو پہلے اُسی کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد لوئی جو تھی اور پھر تھری ناٹ! مجھے اپنے دشمنوں کی قوت و طاقت اور مختلف خصوصیات کا پورا اندازہ ہو چکا تھا۔ بیلیا سے بھی اسی طرح نمٹا جاسکتا تھا کہ میں اپنی ذہنی قوتیں استعمال کرنے کی بجائے جسمانی قوت و طاقت کا سہارا لیتا۔

حالات کے تجزیے سے میں ایک اور نتیجے تک بھی پہنچا کہ اپنی حیرت انگیز قوتوں کے استعمال سے حتی الامکان گریز میرے لیے سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ شاید اسی طرح وہ رابطہ کمزور پڑ جائے جو میرے اور پروفیسر کے درمیان قائم ہے اور اسی کے سبب میرے دشمن بالآخر مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب مجھے صرف اپنی غیر معمولی قوتوں پر تکیہ نہیں کرنا تھا۔ دشمنوں نے بڑی حد تک اِن سے بچنے کے راستے تلاش کر لیے تھے۔ حیرت انگیز اور غیر معمولی قوتیں رکھنے کے باوجود مجھے ایک عام آدمی کی حیثیت سے بھی اپنے دفاع کا خیال رکھنا تھا۔ اگر پہلے میں اِس نتیجے تک پہنچ جاتا تو نہ تھری ناٹ اِس وقت زندہ ہوتا نہ بیلیا۔ میں انھیں دُور ہی سے نشانہ بنا دیتا۔ اِن حالات میں میرے پاس ہتھیار ہونا ضروری تھے۔ ضروری ہتھیاروں سے لیس ہوکر ہی میں اب اپنے دشمنوں کے مقابل آنا چاہتا تھا۔

مجھے حالات پر غور کرتے ہوئے صبح سے شام ہوگئی۔ میں نے اِس دوران میں کھانا بھی کھایا، آرام بھی کیا اور ٹہلا بھی لیکن میرا ذہن اِسی طرف لگا رہا۔ شام کو جب میں چائے پی رہا تھا تو ایلس آگئی۔ اُسے تنہا دیکھ کر میں نے اُس کے باپ ہارڈی کے بارے میں پوچھا۔

"ڈیڈی اپنے پروگرام کے مطابق شاہ فاروق کا محل دیکھنے گئے ہیں۔" اُس نے صوفے پر میرے قریب بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کیوں نہیں گئیں اُن کے ساتھ؟" میں نے چائے کی پیالی، میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اُس وقت میں ڈرائنگ روم میں تھا۔

"میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا کہ جس دن مسٹر شارب وہاں جائیں گے، اُن کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے ترشے ہوئے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں کچھ نہ بولا تو وہ پھر بول اٹھی: "دراصل ڈیڈی کے ساتھ مزہ نہیں آتا گھومنے میں! وہ معمولی پتھروں کو بھی دیر تک کھڑے دیکھتے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا دیکھتے ہیں!"

"آپ کو زیادہ دلچسپی معلوم نہیں ہوتی، اُن کے موضوع سے؟"

"زیادہ کیا، بالکل نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، پھر فوراً توقف سے بولی۔ "میں تو پھنس گئی ڈیڈی کے ساتھ آکر۔"

"چائے منگواتا ہوں آپ کے لیے!"

"جی نہیں، ابھی پی کر آئی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی، پھر کہا: "اِس وقت تو سمندر کی سیر کو جی چاہ رہا تھا، اِس لیے آپ کے پاس چلی آئی۔"

"میرے پاس کیوں؟" میں دانستہ انجان بن گیا۔

"آپ کے ساتھ چلوں گی گھومنے!" وہ بڑے اعتماد سے بولی جیسے میں انکار نہیں کرسکوں گا۔ میں اُس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اُسے قریب آنے کا موقع دوں گا۔ اسی لیے اُس کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔ چائے ختم کرکے میں نے لباس تبدیل کیا اور اُس کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔

"آج مجھے ایک عرصے کے بعد عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا ہے مسٹر شارب!" ایلس میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگی۔

"وہ کیوں؟"

"آپ جو میرے ساتھ ہیں۔" اُس نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ "میرا جی تو اپنے ہم عمروں ہی میں لگتا ہے۔"

"تین مہینے سے زیادہ ہوگئے آپ کو مصر آئے، کیا اِس دوران میں کوئی ہم عمر نہیں ملا؟"

"صرف ملنے سے کیا ہوتا ہے مسٹر شارب! کسی سے دل بھی مل جائے جب ہے نا! لوگوں کے ہاتھ تو مل جاتے ہیں آپس میں مگر دل نہیں ملتے اور مجھے یہ بناوٹ قطعی پسند نہیں۔ میں تو اپنی پسند اور ناپسند کا فوراً اظہار کر دیتی ہوں، چاہے کوئی بُرا مانے کہ بھلا! دیکھیے نا جو دل میں ہو، وہی زبان پر بھی ہونا چاہیے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مس ایلس! مگر آجکل..."

"مجھے آپ صرف ایلس نہیں کہہ سکتے مسٹر شارب!" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"کیوں نہیں!" میں نے کہا۔ "لیکن آپ بھی تو تکلف سے کام لے رہی ہیں، مجھے مسٹر شارب کہہ کر!"

"چلیں ہم دونوں ہی تکلف چھوڑ دیتے ہیں۔" وہ ہنس دی۔ "میں بھی اب آپ کو صرف شارب کہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ بولی۔ "ویسے آپ نے اپنا مکمل تعارف نہیں کرایا ابھی تک۔"

"مکمل تعارف سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"یہی کہ قاہرہ میں آپ کہاں رہتے ہیں؟ آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟ اور... اور معاف کیجیے گا خود آپ کا کیا مشغلہ ہے؟"

"میرا مشغلہ سیر و تفریح اور حصولِ علم سمجھ لیں، طالب علم ہوں ابھی۔ جیزا گئی ہیں آپ؟" اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں نے اُسے بتایا: "وہیں زمالک میں رہتا ہوں۔ ٹرم سیس اسکوائر میں والد کا ایک جنرل اسٹور ہے۔ بس کسی طرح گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہ سب کچھ معلوم کر رہی ہے مگر میں نے اُسے یہ احساس نہیں ہونے دیا۔ میں اُس کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔ سمندر کے کنارے پہنچنے تک وہ اپنی دانست میں میرے متعلق بہت کچھ معلوم کرچکی تھی، لیکن ساحلِ سمندر پر ٹہلتے ہوئے اُس کے ایک سوال نے مجھے چونکا دیا۔ وہ سوال یہ تھا کہ مجھے سیاست سے بھی کوئی دلچسپی ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا: "تھوڑی بہت دلچسپی کہہ لیں کہ ہے۔" جواب دیتے ہوئے میں نے احتیاط سے کام لیا، نہ قطعی انکار کیا نہ اقرار۔

"میرا خیال تھا کہ تمھیں سیاست سے دلچسپی ہوگی۔" وہ اب پہلے کی نسبت خاصی بے تکلف ہوچکی تھی۔ اُس کے لہجے سے کسی قدر مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں نے یہ کب کہا ایلس کہ مجھے دلچسپی نہیں۔" میں نے اپنے محتاط جواب سے فائدہ اٹھایا، پھر خود بھی بے تکلفی سے بولا۔ "بس یوں سمجھ لیں کہ سیاست کو میں نے اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔"

"خیر چھوڑو، اِس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور مجھ سے لگ کر چلنے لگی۔

"کیا اِس وقت کسی اور موضوع پر بات کرنا چاہتی ہو؟" میں نے اُسے کریدا۔

"ہاں!" وہ مسکرائی۔ "میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی تھی شارب کہ کبھی کسی لڑکی سے عشق بھی کیا ہے؟"

"عشق... ہاں کیا ہے۔" مجھے صالحہ یاد آگئی، وہی صالحہ جو بغداد میں ملی تھی اور جسے میں اب تک نہیں بھلا سکا تھا۔

"تم ایک دم اُداس سے کیوں ہوگئے شارب؟" وہ میرے اور قریب ہوگئی۔

"نہیں... نہیں تو۔"

"یقیناً تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ شاید تمھارے دل پر کوئی چوٹ لگی ہے۔"

"تمھارا اندازہ درست ہے ایلس!" میں نے اُس کے خیال

کی تصدیق کر دی۔ اِس طرح وہ مزید بے تکلف ہونے کے بعد کھل کر سامنے آ سکتی تھی۔

"کیا وہ لڑکی بے وفا نکلی؟" اُس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر؟" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"حالات نے بے وفائی کی۔"

"اُس نے کسی اور سے شادی کر لی؟"

"ہاں۔" میں نے طویل سانس لیا۔ میری آنکھوں میں ڈاکٹر حارث کا چہرہ گھومنے لگا۔

"اِس کے بعد تم نے کسی اور لڑکی سے عشق نہیں کیا؟"

"اب دل میں کوئی خواہش نہیں ایلس!" میں نے سرد آہ بھری۔

"شارب! خواہشوں کو زندہ رکھو دل میں! خواہشیں مر جاتی ہیں تو آدمی بھی زندہ نہیں۔ چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے۔ تمہیں پہلی بار دیکھ کر مجھے لمحہ بھر کو بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ تم اندر سے اتنے ٹوٹے ہوئے ہو گے۔ کاش میں تمہارے زخموں پر مرہم رکھ سکتی!"

ابھی تک میں صالحہ کے خیال میں محو تھا لیکن اُس کے آخری الفاظ سُن کر چونک اُٹھا۔ "تم نے کیا کہا ایلس؟"

اُس نے اپنی بات دُہرا دی، پھر بولی۔ "یہ بھی تو نیکی ہے نا شارب!"

ایلس! تمہیں اِس نیکی کا انجام معلوم ہوتا تو شاید ایسی بات نہ کہتیں۔ میں نے یہ سوچا ضرور مگر اُس سے کچھ نہیں کہا۔ میں یمامہ کا انجام بھولا نہیں تھا۔ ایلس کو یقیناً یہ خبر نہیں تھی کہ اِس طرح وہ اپنی موت کو دعوت دے رہی ہے۔ کیا اِس لڑکی کا صرف یہی مقصد ہو سکتا ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ جواب انکار میں تھا۔ اُس کی یہ حرکت مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ تو ہو سکتی تھی، مقصد نہیں! اِس خیال کو یوں بھی تقویت ملی کہ اُس کا باپ ہارڈی بھی اِس معاملے میں ملوث تھا۔ ایلس تنہا نہیں تھی۔

"تم خاموش کیوں ہو گئے شارب؟" ایلس مجھے خاموش دیکھ کر بول اُٹھی۔ "کیا تمہارے خیال میں یہ نیکی نہیں؟"

"ہے، بالکل ہے!" میں نے کہا اور شاید وہ یہی سُننا چاہتی تھی۔ یوں گویا اُسے میرے قریب آنے کی اجازت مل گئی تھی۔

"چلو! اب گھر چلتے ہیں۔" کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"کس کے گھر؟" میں نے دانستہ یہ سوال کیا۔

"ڈیڈی تو ابھی لوٹے نہیں ہوں گے اور مجھے تنہائی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ اتنی دیر تمہارے ساتھ رہ لوں گی۔ کچھ اور اچھا وقت گزر جائے گا۔" وہ بہت جلد بازی سے کام لے رہی تھی اور میں نے ہی اُسے یہ موقع دیا تھا۔ میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ باتوں باتوں میں حدود سے تجاوز کرنے لگی تو میں نے اُسے روک دیا۔

"کیا تمہیں اُس لڑکی سے اتنی ہی محبت تھی کہ اب... اب کوئی اور لڑکی تمہاری زندگی میں داخل نہیں ہو سکتی؟" اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ محبت اور ہوس میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں اُس کی بات ٹال گیا۔ اُس نے بھی شاید یہی سوچا ہو گا کہ پہلے دن اتنا کافی ہے۔ وہ دوسرے دن صبح مجھے اپنے گھر آنے کے لیے مدعو کر گئی۔ جاتے جاتے اُس نے یہ بھی کہا کہ اگر میں نہ آیا تو وہ پھر میرے گھر نہیں آئے گی۔ میں نے اُس سے وعدہ کر لیا کہ صبح اُس کے گھر ضرور آؤں گا۔

جب تک ایلس میرے ساتھ رہی کئی بار جی میں یہ آیا کہ اُس کا ذہن پڑھ لوں، اُس کے باطن میں کیا ہے، معلوم کر لوں مگر ہر بار میں نے اِس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ سامنے اگر کوئی پردہ پڑا ہو اور دوسری طرف کیا ہے، یہ جاننے کا تجسس بھی ہو تو آدمی مشکل ہی سے خود پر قابو پاتا ہے۔ میری کیفیت کچھ یہی تھی۔ کسی بااختیار شخص کے لیے بہ وقت ضرورت بھی اپنا اختیار استعمال نہ کرنا بہرحال آسان کام نہیں۔ میرے لیے اُس لڑکی کا ذہن پڑھنا چند لمحوں کی بات تھی، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اِس شکل پر قابو پاتے ہوئے مجھے پہلی بار زندگی کے ایک نئے لطف کا احساس ہوا۔ پہلے میں اِس لطف سے ناآشنا تھا۔ تجسس میں بھی ایک لطف، ایک لذت ہے۔ سب کچھ عیاں ہو جائے تو پھر زندگی میں کیا رہ گیا۔ اب سے پہلے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ ایلس کا معاملہ مجھے پیش آنے والے تمام واقعات سے مختلف تھا۔ مجھے اُس پر شک تھا مگر میں پھر بھی ایک عام آدمی کی حیثیت سے اپنا شک رفع کرنا چاہتا تھا۔ شک اور شبہے کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ایلس کی باتوں، اُس کے رویے اور اُس کی جاذب نظری نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اُس کی بے ساختگی اور پیش قدمی نے میرے اندر ہیجان برپا کر دیا تھا۔ اگر یمامہ نہ ماری گئی ہوتی تو شاید میرے قدم بہک جاتے اور پھر

ایلس کا وہی حشر ہوتا جو یمامہ کا ہوا۔ میں نے اِسی لیے اُسے حد سے تجاوز نہ کرنے دیا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ کس آگ کو ہوا دے رہی ہے! ایک ایسی آگ جس میں اُس کا وجود راکھ ہو جاتا۔ ہاں مجھے سب کچھ علم تھا کہ میرے وجود میں کیا طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ یمامہ کے معاملے میں مجھے اِس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ میں اُس ہولناک تجربے کو دُہرانا نہیں چاہتا تھا۔

ایلس نے مجھ سے جو گفتگو کی تھی، اُس میں صرف ایک بات کھٹکا دینے والی تھی۔ سیاست میں میری دلچسپی کے موضوع کو وقتی طور پر وہ ٹال تو گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ موقع دیکھ کر وہ پھر کبھی یہی ذکر چھیڑے گی۔ اُسے کریدنے کے لیے خود میں بھی اُس سے اِسی موضوع پر گفتگو کا خواہش مند تھا۔ اُس کا سوال بے معنی نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح ناشتا کر کے میں حسبِ وعدہ ایلس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ برابر والے گھر میں سکونت پذیر تھی۔ اُن دونوں باپ بیٹی نے کوئی ملازم نہیں رکھا تھا۔ یہ بات مجھے چوکیدار سے معلوم ہوئی۔ وہ مجھے گیٹ ہی پر مل گیا تھا۔ چوکیدار ہی سے مجھے چند اور باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ اُس علاقے میں کئی مناسب ہوٹل بھی تھے۔ وہ دونوں ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے تھے۔ ناشتا اور چائے وغیرہ کے لیے وہ ہوٹل تک جانے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ اُس کے لیے انھوں نے ضروری سامان کچن میں لا کر رکھ لیا تھا۔ چوکیدار، مالک مکان کی طرف سے مقرر تھا۔ ایک عرب ہونے کی وجہ سے چوکیدار نے میرے تمام سوالوں کے جواب دے دیے، لیکن اُس کے چہرے سے اُلجھن کا اظہار ضرور ہونے لگا کہ میں اُس سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہا ہوں۔

چوکیدار کو مطمئن کرنا ضروری تھا، اِس لیے میں نے باتوں باتوں میں اُسے یہ تاثر دیا کہ مجھے ایلس سے تعلقات استوار کرنا ہیں۔ اِسی حوالے سے میں نے ایک ضروری سوال اور کیا۔ "ایلس سے کوئی اور نوجوان تو ملنے نہیں آتا؟"

"جناب، اُسے نوجوان تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہو گی۔ ہفتے بھر میں بس وہی آیا ہے تین چار مرتبہ!" چوکیدار نے بتایا۔

"کوئی مقامی ہے یا غیر ملکی؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو مصری، مگر بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے چوکیدار کی بات سُن کر کہا۔ "تم اِس کا ذکر اِن دونوں میں سے کسی سے نہ کرنا کہ میں نے تم سے اُن کے بارے میں کچھ معلوم کیا ہے۔ یہ معاملات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس پچاس پیاسٹر کے دو نوٹ نکالے اور اُس کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ! رکھ لو، اگر تم نے آئندہ بھی اِس سلسلے میں میرا ساتھ دیا تو..."

"ارے... ارے رہنے دیں جناب! اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ تو ویسے بھی اپنے ہیں۔" چوکیدار نے انکار کیا۔ وہ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چوکیدار نے زیادہ انکار کیا تو میں نے ضد نہیں کی اور نوٹ جیب میں واپس رکھ لیے۔ "اب تم اندر جا کر اُنھیں میری آمد کی اطلاع دے دو۔ میرا نام شارب ہے، یہ بتا دینا۔" میں نے کہا۔ اُسے میں یہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ برابر والے گھر میں ٹھہرا ہوں۔"

میری بات سُن کر وہ اندر چلا گیا۔ میں اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ معاً میری نگاہ اوپر کی منزل کی طرف اُٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی تیزی کے ساتھ جھکا ہو اور منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا ہو۔ میں نے فوراً اُس طرف سے نگاہ ہٹا لی۔ جس مکان میں میرا قیام تھا، تقریباً یہ مکان بھی ویسا ہی بنا ہوا تھا۔ چوکیدار کی واپسی تک میں، گیٹ کے قریب ہی کھڑا رہا۔ "میں نے اُن سے کہہ دیا ہے۔" وہ آتے ہی بولا۔ "صاحب نے کہا ہے کہ میں آپ کو نشست گاہ میں بٹھا دوں، وہ آتے ہیں ابھی۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کے ساتھ چل دیا اور چلتے ہوئے ایلس کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ ایلس اُسے نظر نہیں آئی۔ چوکیدار مجھے نشست گاہ میں بٹھا کر چلا گیا تو کچھ دیر بعد بوڑھا ہارڈی آ گیا۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملا۔ "ایلس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج صبح آپ ضرور آئیں گے۔"

"مگر وہ خود نظر نہیں آ رہیں۔" میں بولا۔

"باتھ روم میں ہے۔" ہارڈی نے بتایا۔ "اور سُنائیے جی لگا یہاں؟ قاہرہ تو یہاں کی نسبت بہت مصروف شہر ہے۔"

"مجھے جس سکون کی تلاش تھی وہ کم از کم یہاں ضرور ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ علاقہ پسند آیا مجھے۔ کل شام تو میں اور ایلس، ساحلِ سمندر تک بھی گئے تھے۔"

"ہاں بتایا تھا اُس نے۔ وہ تو بس آپ کی دیوانی ہو گئی ہے۔ کل سے آپ ہی کا ذکر کیے جا رہی ہے۔ ہاں! اِس موقع سے فائدہ اُٹھا

کر اُس کے بارے میں ایک بات بتا دوں آپ کو!" ہارڈی رازدارانہ لہجے میں آگے کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔ "مَیں! یہ بات آپ سے اس لیے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں، ایلس کی طرف سے!" اُس نے تمہید باندھی۔

"آپ کہیں تو!"

"ایلس ذرا جذباتی واقع ہوئی ہے۔ کسی کو ذرا بھی دُکھی نہیں دیکھ سکتی۔" ہارڈی بولا۔ "اُس کے بس میں ہو تو ساری دُنیا کے دُکھ بانٹ لے۔ اُس کی اِس کمزوری سے کچھ لوگ بے جا فائدہ بھی اُٹھا جاتے ہیں اور بعد میں اُسے بے وقوف کہتے ہیں۔ مَیں آپ کو ہرگز ایسے لوگوں میں نہیں سمجھتا مگر اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کسی معاملے میں جذباتی ہو جائے تو کچھ خیال نہ کیجیے گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" مَیں نے اُسے یقین دلایا پھر مجھے چوکیدار سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، اُن کی روشنی میں بولا۔ "یہاں تو آپ لوگوں کو آئے صرف ہفتہ بھر ہوا ہے اِس لیے شاید ابھی کسی سے آپ کے تعلقات قائم نہیں ہوئے ہوں گے!"

"شکاگو میں ایک دوست ہے میرا جو کافی عرصے یہاں رہ چکا ہے، اُس نے ایک صاحب کا پتا دیا تھا۔ میں آتے ہی اُن سے ملا تھا، وہ بس کبھی کبھار نکل آتے ہیں اِدھر۔" ہارڈی نے بتایا۔ ابھی میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ ایلس آگئی۔ ہارڈی اُٹھنے لگا تو مَیں بولا۔ "آپ کہاں چلے؟"

"میں معافی چاہوں گا۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے ایک شخص سے ملنے جانا ہے۔ سُنا ہے کہ مصری آثارِ قدیمہ سے متعلق اُس کے پاس کچھ نادر کتابیں ہیں۔"

"جن کتابوں میں جتنی زیادہ دیمک لگی ہو، ڈیڈی کو وہ اتنی ہی پسند آتی ہیں۔" ایلس میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی:

"تم بہت شریر ہو!" ہارڈی ہنس پڑا۔ "تمھیں کیا معلوم کہ اِن کتابوں کی کیا اہمیت ہے!"

"اور مجھے معلوم بھی نہیں کرنا پیارے ڈیڈی!" ایلس کے لہجے پر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ ہارڈی چلا گیا تو وہ ایک دم میری طرف پلٹی۔ اُس نے جو کچھ کہا، میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔ وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی: "یہ تم چوکیدار سے کیا پوچھ گچھ کر رہے تھے؟" یہ کہہ کر وہ میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی جیسے چہرے سے میری جذباتی کیفیت کا اندازہ کرنا چاہتی ہو۔

"تو کیا میں سیدھا گھر میں گھس آتا!" مَیں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو پوچھنا ہی تھا مجھے کہ تم گھر میں ہو یا نہیں!"

"صرف یہ بات پوچھنے میں اتنی دیر نہیں لگتی۔ جی جناب!" وہ اِس طرح بولی جیسے میری چوری پکڑ لی ہو۔

"آخر مطلب کیا ہے تمھارا اِن باتوں سے؟" میں کسی قدر سنجیدہ ہو گیا۔ "اور تم تو باتھ روم میں تھیں تمھیں کیسے معلوم ہوئی یہ بات کہ میں نے چوکیدار سے بات کی ہے؟"

"باتھ روم بعد میں گئی تھی مَیں، پہلے اوپر کی منزل پر تھی۔" اُس نے اِس انداز میں یہ بات کہی جیسے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی: "میں اوپر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ تم نے بھی ایک بار اوپر نظر اُٹھائی تھی اور مَیں فوراً چھپ گئی تھی۔ تمھیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ ہے نا!"

"جی نہیں!" مَیں بھی اُسی کے لہجے میں بولا۔ "دیکھ لیا تھا مَیں نے تمھیں چھپتے ہوئے۔ تم مجھے اوپر دیکھتے ہی منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔"

"بڑی تیز نظر ہے تمھاری! معلوم ہوتا ہے میری طرح تم نے بھی بہت جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ ویسے سچ بتاؤ شارب، مزہ آتا ہے نا ایسی باتوں میں!"

"ہاں مزہ تو آتا ہے۔" مَیں نے کہا۔ اِس وقت جانے کیوں وہ بڑی بچکانہ سی باتیں کر رہی تھی۔

"جب تم چوکیدار سے بات کر رہے تھے تو سچ مچ مجھے کسی جاسوسی ناول کے ہیرو معلوم ہو رہے تھے۔ تمھارا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے ہیرو خفیہ طور پر پوچھ گچھ کرتے ہیں۔"

" اور تم چھت پر چڑھی ہوئی کیا کر رہی تھیں ؟ "

" تمہاری جاسوسی ! " یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی، پھر ہنستے ہنستے رُک کر بولی " ارے ہاں ابھی تک تمہارا شکریہ تو ادا کیا ہی نہیں۔ "

" کس بات کا شکریہ ؟ "

" تمہاری آمد کا ! "

" جب تم میرے گھر آئی تھیں تو میں نے بھی شکریہ ادا نہیں کیا تھا، اس لیے حساب برابر ہوگیا۔ " میں نے کہا، پھر اصل موضوع پر آگیا۔ " یہ بتاؤ ایلس کہ ایک عام امریکی شہری، عربوں کے بارے میں کیا نظریات رکھتا ہے ؟ " اس سوال سے میرا مقصد سیاست پر گفتگو چھیڑنا تھا۔

" مگر کس سلسلے میں ؟ " وہ ایک دم چونک کر بولی۔ " اور یہ تمہیں اچانک بیٹھے بیٹھے سیاست پر گفتگو کی کیا سوجھ گئی ؟ "

" تم بھی تو شاید کل اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی تھیں ! "

" ہاں مجھے تو دلچسپی ہے لیکن ... " وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

" لیکن کیا ؟ " میں نے پوچھا۔

" تمہیں اِس موضوع سے کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی حالانکہ میں جب یہاں نہیں آئی تھی تو یہی سمجھتی تھی کہ عرب نوجوان سیاست میں یقیناً دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ مجھے مایوسی ہوئی یہاں آکر! عرب ممالک اس وقت جن سیاسی حالات سے دوچار ہیں، ان میں یہ سرد مہری عجیب لگی ہے مجھے ! "

" تمہارا خیال غلط ہے ایلس ! " میں نے اس کی تردید کی۔ " ایسا نہیں ہے بلکہ تم شاید یہاں لوگوں سے زیادہ ملی جلی نہیں ورنہ ایسی بات نہ کہتیں۔ رہا میرا مسئلہ تو معاف کرنا، میں ذرا محتاط واقع ہوا ہوں۔ خصوصاً غیر ملکیوں سے گفتگو کرتے ہوئے، میں اپنے خیالات سے گریز کرتا ہوں۔ "

" یہ تو سراسر بے اعتمادی ہوئی ! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر بھی اعتماد نہیں۔ " اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

" اعتماد قائم ہونے میں وقت لگتا ہے۔ " میں بولا۔ " سچ بات یہ ہے کہ جس وقت تم نے مجھ سے وہ سوال کیا تھا، اس وقت تک ... "

" میں سمجھ گئی۔ " اس نے میری بات کاٹ دی۔

" کیا سمجھ گئیں ؟ "

اپنے وقت کی ایک حیران کن تحریر
متبول ترین سلسلہ
خونریز
مصنف
ایم اے راحت
ماضی کے ایک پر وقار گوشے سے کشید
ایک خوفناک حسینہ کی داستان
جسنے ایک عالم کو دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔
ایڈونچر سسپنس سے بھرپور کہانی
جو مدتوں بھلائی نہ جا سکے گی۔
بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا
آج ہی ایک خط لکھ کر طلب فرمائیں
گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
۲۱ - محمد روڈ، اسلام پورہ لاہور
فون:7229762-7248599

یہی کہ تم نے سیاست میں گہری دلچسپی رکھنے کے باوجود اِس کا اقرار نہیں کیا۔ میں نے اُس وقت یوں وہ بات ٹال دی کہ خود اجنبیوں کو ایسے ہی موضوعات پر گفتگو کرنا چاہیے جن میں دونوں کو دلچسپی ہو۔ ہاں وہ تم کیا پوچھ رہے تھے کہ عربوں کے بارے میں کیا تصورات ہیں امریکیوں کے!" وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اپنی بات دہرائی تو وہ صاف گوئی سے بولی۔

"سبھی جانتے ہیں کہ امریکہ کی ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام بھی اِس سے الگ نہیں کیونکہ وہاں عوام ہی کی منتخب حکومت برسرِ اقتدار آتی ہے۔ لیکن وہاں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو اسرائیل کو حق پر نہیں سمجھتا۔ اُس طبقے کا کہنا ہے کہ امریکہ کو عرب ممالک سے اتنی دولت بٹورنے کے باوجود یہ کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔"

"تمھارا اور تمھارے والد کا اِس سلسلے میں کیا نقطۂ نظر ہے؟" میں نے گفتگو کا دائرہ سمیٹ دیا۔

"ڈیڈی بھی یہی کہتے ہیں اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ فلسطین کو اُن کا حق ملنا چاہیے!" وہ پُرجوش آواز میں بولی۔ "تمھیں شاید یہ علم نہ ہو کہ وہاں زیرِ زمین ایک تحریک بھی چل رہی ہے اِس سلسلے میں! اگر تم میری باتوں کو راز رکھنے کا وعدہ کرو تو میں اور بہت کچھ بتا سکتی ہوں۔"

"اب تم بے اعتمادی کا اظہار کر رہی ہو مجھ پر!" میں نے شکایت کی۔

"یہ بے اعتمادی کا معاملہ نہیں بلکہ اور بات ہے۔ ڈیڈی کو تم پر اعتماد ہو نہ ہو، لیکن میں اعتماد کرتی ہوں تم پر!"

"اعتماد کرنے کی وجہ؟"

"جو لوگ خود اندر سے دُکھی ہوتے ہیں، وہ کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتے۔" اُس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "میں تمھارے متعلق شرط لگا سکتی ہوں کہ تم کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے! تمھاری ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ ڈیڈی مجھ پر خفا ہوں، لیکن میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی کہ دراصل ہمارے مصر آنے کا سبب کیا ہے!"

"تو کیا وہ تمام باتیں غلط تھیں جو کل تمھارے ڈیڈی نے اپنے بارے میں کہی تھیں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہ باتیں تو خیر جھوٹ نہیں تھیں لیکن حقیقت کچھ اور بھی ہے۔" اُس کی آواز دھیمی ہو گئی اور وہ میری طرف جھک آئی۔ "ڈیڈی کا تعلق اُسی زیرِ زمین تحریک سے ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ وہ تحریک فلسطینیوں کے مفاد میں کام کر رہی ہے۔"

"واقعی!" میں ناقابلِ یقین سے لہجے میں بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہا۔ "تو پھر اُس زیرِ زمین تحریک کا رابطہ فلسطینیوں سے بھی ہو گا۔"

"بالکل!" اُس نے تائید کی۔ "ڈیڈی نے تو یہاں آنے کے بعد اُن لوگوں سے رابطہ بھی قائم کر لیا ہے۔"

"تمھارے ڈیڈی کیا تم سے کچھ نہیں چھپاتے؟"

"مجھ سے کیوں چھپائیں گے کچھ!" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "میں خود بھی اُسی تحریک کی رُکن ہوں۔"

"تو یوں کہو کہ تم بھی ناولوں اور کہانیوں کا کوئی زندہ کردار بننا چاہتی ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم مذاق اُڑا رہے ہو میرا!" وہ یوں بولی جیسے بُرا مان گئی ہو۔ اُسی وقت ہلکی سی آہٹ ہوئی تو میں چونک اُٹھا۔ مڑ کر دیکھنے پر معلوم ہوا، ہارڈی نشست گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ خلافِ توقع اُسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ اُس نے کہا تھا، اُسے کسی شخص سے ملنے جانا ہے جس کے پاس آثارِ قدیمہ سے متعلق نادر کتب ہیں۔ اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ خود ہی بول اُٹھا۔

"مجھے یہی ڈر تھا۔"

"کیسا ڈر ڈیڈی؟" ایلس اُس کی طرف رُخ کر کے بولی۔

"یہی کہ تم سب کچھ بتا دو گی۔" وہ صوفے کی طرف بڑھا۔

"تو ہم لوگ کوئی غلط کام تو نہیں کر رہے!"

"میں نے یہ کب کہا!" ہارڈی کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔ "غلطی میری ہی ہے، تمھارا کوئی قصور نہیں ایلس! ناتجربہ کاری کا یہی انجام ہوتا ہے۔" اب وہ سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"آخر مجھے بھی تو بتائیں کہ بات کیا ہے!" میں اُن دونوں کے درمیان بول اُٹھا۔

"کم عمری اور ناتجربہ کاری!" اُس کے لہجے میں تاسف تھا۔ "میں یہ بھول گیا تھا کہ ایلس ابھی کم عمر ہے۔ مجھے ایلس کو تحریک میں شمولیت کی اجازت نہیں دینا چاہیے تھی۔"

"ڈیڈی! آپ پہلے بھی کئی بار یہی بات کہہ چکے ہیں، لیکن اب تک مجھ سے کوئی غلطی ہوئی؟"

"دیکھو ایلس! جو کام تمھاری نظر میں صحیح ہے، ضروری

نہیں کہ دوسروں کے لیے بھی صحیح ثابت ہو یا وہ دوسرے بھی اُسے صحیح سمجھیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

"اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو میں یہ عرض کر دوں کہ میں نے جو کچھ سنا ہے، اُسے سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ آپ لوگ ایک نیک کام کر رہے ہیں، اور اِس کا اجر خدا ہی کا دینے والا ہے۔"

"دیکھا ڈیڈی!" ایلس بول اُٹھی۔ "مجھے شارب سے یہی توقع تھی۔"

"کیا آپ چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟" میں نے سوال کیا۔ "آپ نے تو کہا تھا کہ کہیں کسی شخص سے ملنے..."

"وہ بھی غلط نہیں کہا تھا۔" ہارڈی میری بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے اُس شخص سے ملنے جانا تھا مگر مجھے خیال آیا کہ ایلس کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔ ابھی یہ نہیں سمجھتی کہ ہم نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، اُس میں قدم قدم پر موت کا سامنا ہو سکتا ہے۔ آپ خیال نہ کیجیے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی اسرائیلی ایجنٹ کو ہماری بھنک مل جائے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسرائیلی ایجنٹوں کے علاوہ امریکی ایجنٹ بھی ہمارے لیے خطرہ ہیں۔ ایسی صورت میں آپ ہی ایلس کو سمجھائیے کہ اِسے احتیاط سے کام لینا چاہیے یا نہیں!"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے اتفاق کیا۔

"شارب! تم بھی ڈیڈی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے!" ایلس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"تمھارے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں ایلس! تمھیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔"

"کیا میں نے تمھیں سب کچھ بتا کر غلطی کی ہے؟ بولو! اگر ہم پر کوئی وقت پڑ گیا تو کیا تم ہماری مدد نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں!" میں نے یقین دلایا۔ "مجھے تو فخر محسوس ہو گا کہ میں ایسے نیک اور انسانیت دوست لوگوں کے کام آیا جنھوں نے دوسروں کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔"

"مجھے آپ کے خیالات جان کر بے حد مسرت ہوئی مسٹر شارب!" ہارڈی مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

کچھ دیر بعد میں نے اُن دونوں سے رخصت کی اجازت چاہی۔ ایلس نے چائے پی کر جانے پر ضد کی۔ ہارڈی نے بھی کہا کہ اِس کی بیٹی بہت اچھی چائے بناتی ہے۔ میں مجبوراً رک گیا۔ چائے پینے ہی کے دوران میں چوکیدار نے کسی شخص شیخ کے آنے کی اطلاع دی اور میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں اُس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔ یہ وہی شخص ہو سکتا تھا جس کے بارے میں چوکیدار نے مجھے بتایا تھا کہ ایلس سے ملنے آتا ہے۔

"اُنھیں آنے دو۔" ہارڈی نے چوکیدار سے کہا اور وہ واپس چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی ہارڈی مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں نے چوکیدار کو ہدایت کر رکھی ہے کہ بغیر میری اجازت کے وہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دے، چاہے وہ آشنا ہو یا کوئی اجنبی۔ آپ کو بھی اِس سلسلے میں زحمت ہوئی، مگر مجھے یقین ہے کہ اب تمام حالات جان لینے کے بعد آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اِس قسم کی احتیاط تو بہت ضروری ہے۔ اِس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ سے مجھے یہی اُمید تھی۔" ہارڈی بولا اور پھر قدموں کی چاپ سُن کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو شخص نشست گاہ میں داخل ہوا، اُسے دیکھ کر میرے ذہن میں کسی بڑے سے مینڈک کا تصور اُبھرا۔ اُس کا رنگ تو گورا تھا، مگر چہرے کے نقوش پھیلے پھیلے سے اور بھدے سے تھے۔ جسم تھلتھلایا ہوا سا تھا۔ سر پر گنتی کے چند بال تھے، وہ بھی جھالر کی طرح پیچھے کی طرف۔ وہ پستہ قد تھا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اُس کے جسم پر سرمئی رنگ کا سوٹ تھا۔ میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ مجھے وہاں دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹکا تھا۔ ہارڈی اُس سے بہت لپک کر ملا اور ایلس نے بھی مسکرا کر اُس کا استقبال کیا۔ وہ ہارڈی کے قریب بیٹھ گیا۔ ایلس اب بھی میرے قریب بیٹھی تھی۔

"اِن سے ملو شیخ، یہ مسٹر شارب ہیں اور کل ہی قاہرہ آئے ہیں۔" ہارڈی نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ شیخ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ بڑے غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اخلاقاً کہا۔

"مگر معاف کیجیے گا، مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں

ہوئی۔ "یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ایلس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو شجیع!" ایلس کا لہجہ شکایتی تھا۔

"تمھیں شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔" ہارڈی بولا۔ "مسٹر شارب بھی اپنوں میں سے ہیں۔"

"لیکن کل تک تو صرف میں ہی اپنا تھا!" شجیع کے لہجے میں چبھن تھی۔

"اب بھی اپنے ہو تم!" ہارڈی کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔ "ایلس! تم شجیع کو اندر والے کمرے میں لے جا کر ذرا ٹھنڈا کرو، میں اِس دوران میں مسٹر شارب سے ایک ضروری بات کر لیتا ہوں۔"

اپنے باپ کی بات سنتے ہی ایلس اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے چہرے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آؤ شجیع!" اُس نے شجیع کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔ جب شجیع بدستور وہیں بیٹھا رہا تو ایلس پلٹ کر اُس سے مخاطب ہوئی۔ "کیوں، کیا بات ہے؟ تمھارا موڈ اتنا خراب کیوں ہو رہا ہے!"

"ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں! سمجھ گئیں تم!" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ "میں جا رہا ہوں اور اب کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کروں گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"سنو تو شجیع، تم اِتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو!" ہارڈی بلند آواز میں بولا۔ اُس نے سُن کر بھی جیسے کچھ نہیں سُنا اور تیزی کے ساتھ ایلس کے قریب سے گزر گیا۔ ہارڈی نے شجیع کو پھر آواز دی تو ایلس نے کہا۔ "اُسے جانے دیں ڈیڈی! اُس نے مجھے خرید تو نہیں لیا۔ میں نے صرف تحریک کی خاطر..."

"معلوم ہے!" ہارڈی نے اُس کی بات کاٹ دی۔ وہ شاید یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے سامنے ایلس کی زبان پر کوئی ایسی بات آ جائے جسے سُن کر میں کھٹک جاؤں۔ ایلس یقیناً بے خیالی میں یہ بول گئی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا آسان تھا کہ ایلس نے تحریک کی خاطر کیا کیا ہوگا۔ وہ شخص، ایلس پر اِس طرح اپنا حق جتا رہا تھا جیسے ایلس اُس کی بیوی یا محبوبہ ہو۔

"یہ شخص تھا کون جو ابھی احمقانہ باتیں کر کے گیا ہے؟" میں نے ہارڈی سے کہا۔

"اسے بھی ایلس کی حماقت کہہ لیں آپ کہ اُس شخص کو اتنی جرأت ہو گئی جو میرے سامنے ایسی نازیبا باتیں کر گیا۔" ہارڈی نے میرے سوال کا جواب دیا پھر بولا۔ "جو باتیں ایلس آپ کو بتا چکی ہے، اُس شخص کو بھی معلوم ہیں۔ یہ ایک ہوٹل میں ایلس کو مل گیا تھا۔ ایلس نے جلد بازی سے کام لے کر اُسے میرے اور اپنے بارے میں بتا دیا۔"

"یہ تو بہت خطرے کی بات ہے۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔

"یقیناً خطرے کی بات ہے، اِن حالات میں یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ میں نے ایلس سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ شخص مجھے قابلِ اعتماد نہیں لگتا، مگر یہ میری کوئی بات سنتی ہی کب ہے!"

"ڈیڈی! آپ تو بس ہر بات کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتے ہیں۔" ایلس نے جھنجھلا کر کہا۔

"اور کس پر ڈالوں ذمہ داری! سب کچھ تمھارا ہی تو کیا دھرا ہے۔" ہارڈی ناگواری سے بولا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی، اگر آپ یہی سمجھتے ہیں تو میں اب کسی معاملے میں نہیں پڑوں گی۔" ایلس کا لہجہ بن گیا۔

"لیکن معاملہ کیا تھا، کچھ معلوم بھی تو ہو۔" میں نے درمیان میں مداخلت کی۔

جواب میں ایلس کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ہارڈی بول اُٹھا۔ "جب آپ کو وہ ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں تو اِس معاملے کا علم بھی ہو جائے گا۔ اِس وقت ذہن ذرا سا پریشان ہے، میں خود شام کو آپ کے پاس آؤں گا۔ مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ اِس شخص سے کس طرح نمٹنا چاہیے۔"

"لیکن اُسے اتنی اہمیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ خود ہی یہاں کبھی نہیں آئے گا۔" میں بولا۔

"مسئلہ یہ نہیں۔" ہارڈی نے طویل سانس لے کر کہا۔

"پھر؟"

"آپ کو بتاؤں گا میں!" وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا نظر آنے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایلس کے سامنے کوئی بات کہتے ہوئے جھجک رہا ہے۔

"میں شام کو آپ کا انتظار کروں گا، اب چلتا ہوں۔" میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باپ بیٹی دونوں میں سے کسی نے مجھے نہیں روکا اور میں اُن کے گھر سے نکل آیا۔ اپنے گھر آنے کے بعد اِن باتوں پر غور کرنے لگا جو ایلس اور ہارڈی سے ہوئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ

دونوں کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مجھے راہ پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں دانستہ اُن کی تائید کر تا رہا تھا تاکہ وہ کھُل کر بات کر سکیں اور ایسا ہی ہوا تھا۔ ایلس اور ہارڈی دونوں ہی انتہائی چالاک معلوم ہوتے تھے۔ ایلس کو یقیناً شبہ ہو گیا تھا کہ میں اُسے اوپری منزل پر منڈیر کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ اُس نے اِسی لیے ہنسی میں یہ بات اُڑا دی تھی تاکہ میں نے اُسے چھپتے ہوئے دیکھ بھی لیا ہو تو کوئی شک نہ کروں۔ ایلس نے جس انداز میں زیرِ زمین تحریک کا ذکر کیا اور پھر عین وقت پر جس طرح ہارڈی کمرے میں آ گیا، اُس سے بھی یہی ظاہر تھا کہ سب کچھ پہلے سے سوچا سمجھا ہوا تھا۔ کوئی عام عرب نوجوان ہوتا تو یقیناً اِن باتوں پر غور نہ کرتا مگر میرا معاملہ مختلف تھا۔ انھیں اگر ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا، کہ وہ کس "بلا" کو زیرِ دام لانے کی کوشش کر رہے ہیں تو شاید میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ مجھے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ وہ اپنا کوئی خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنے جال میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ ایلس کی وارفتگی اور خود سپردگی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اُن کی دانست میں بہت آسانی سے اُن کے جال میں پھنس جاتا۔ پھر وہ مجھ سے جو کام لینا چاہتے لیتے اور میں انکار نہ کر سکتا۔ وہ شخص جس نے رقابت کا ڈھونگ رچایا تھا، اُن کا ساتھی بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ واقعی اُسے بھی میری طرح ایلس نے پھانسا ہو۔ اِس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب مجھے شام کا انتظار تھا کیونکہ ہارڈی نے شام کو آنے کے لیے کہا تھا۔ میرا قیاس تھا کہ ہارڈی اب مطلب کی بات پر آ جائے گا۔ کیونکہ ایلس نے اُس کے لیے خاصی راہ ہموار کر دی تھی۔

دوپہر کو کھانا کھا کر میں سو گیا اور پھر شام ہی کو اُٹھا۔ شام کو خلافِ توقع ہارڈی کی بجائے ایلس آئی۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور آنکھوں سے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ روتی رہی ہو۔ میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، تم اتنی اُداس کیوں ہو ایلس؟"

"میں واپس امریکہ جا رہی ہوں۔" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں؟" میں حیرت سے بولا۔ "اور تمھارے ڈیڈی؟"

"ڈیڈی ابھی یہیں رہنا چاہتے ہیں مگر میں... میں اب نہیں رہ سکتی یہاں!"

"لیکن کوئی وجہ تو ہوگی اِس کی!"

"میں ڈیڈی کے خیال میں، احمق اور انتہائی بے وقوف ہوں۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ مجھے تحریک کی رُکنیت سے بھی خارج کرا دیں گے۔ میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم ہی بتاؤ شارب، کیا میں تمھیں بے وقوف معلوم ہوتی ہوں؟ مجھ میں بالکل سمجھ نہیں؟" وہ بڑی مظلوم نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اداکاری کر رہی تھی مگر وہ اداکاری حقیقت سے بہت قریب تھی۔ اگر میں نے مختصر سے عرصے میں زندگی کے اتنے رنگ اور آدمیوں کے اتنے روپ نہ دیکھے ہوتے یا غیر معمولی ذہن کا مالک نہ ہوتا تو شاید دھوکا کھا جاتا۔ یہ بھی ہارڈی کی کوئی چال ہی ہو سکتی تھی کہ اُس نے خود آنے کی بجائے اپنی بیٹی ایلس کو بھیج دیا تھا۔ میں نے اُسے پہلے تسلی دی اور پھر کُریدا تاکہ معاملے کی تہ تک پہنچ سکوں۔

"اگر میں نے تمھیں ساری بات بتا دی تو تم یقیناً مجھے کوئی خراب لڑکی سمجھو گے شارب!" اُس کے لہجے میں اب بھی مظلومیت تھی۔

"خراب تو ہو تم!" میں نے مسکرا کر چٹکی لی۔

"تم بھی شارب، مجھے ایسا سمجھتے ہو!" وہ روہانسی ہو گئی۔ "کیا کسی نیک مقصد کے حصول کی خاطر قربانیاں نہیں دینا پڑتیں۔"

"اگر ایسا ہی سمجھتی ہو تم تو پھر اِسے خرابی نہیں ضرورت یا مجبوری کہو۔" میں بولا۔

"چلو مجبوری ہی سمجھ لو۔ اگر اِس مجبوری کے تحت میں نے شجیع سے محبت کے دو بول کہہ دیے تو کیا بُرا کیا! اِس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ یوں تمھیں دیکھ کر ہتھے سے اُکھڑ جاتا!"

"معاملہ کیا تھا، یہ نہ تمھارے والد نے بتایا نہ تم بتا رہی ہو۔"

"ہمیں ایک پیغام پہنچانے کے لیے کسی ایسے عرب کی ضرورت تھی جو محبِ وطن ہو اور جس پر اعتماد کیا جا سکے۔" ایلس اب اپنے جذبات پر قابو پا چکی تھی اور پُرسکون آواز میں گفتگو کر

رہی تھی۔" میں نے اِس کے لیے شجیع کو ہموار کر لیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اِسی کے لیے میں نے شجیع کی بعض حرکتیں برداشت کیں۔ شجیع اِس کے لیے تقریباً تیار ہو چکا تھا اور آج اسے تفصیلات بتائی جانے والی تھیں۔ اُسے شام کو آنا تھا مگر وہ صبح ہی آ گیا اور مجھے تمھارے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ کر بھڑک گیا۔ اُس کے ناراض ہو کر چلے جانے کی ساری ذمہ داری ڈیڈی نے مجھ پر ڈال دی۔ وہ پیغام انتہائی اہم نوعیت کا حامل ہے۔ اگر فلسطینی مجاہدین تک وہ پیغام نہ پہنچ سکا تو انھیں بھاری جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ شجیع کو وہ پیغام لے کر پورٹ فواد تک جانا تھا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہوگا کہ یہ شہر نہر سوئز کے پار ہے اور اس شہر کا شمار براعظم ایشیا میں ہوتا ہے۔ تمھیں یہ بھی خبر ہوگی کہ اسرائیلی سرحد پورٹ فواد سے صرف پچیس میل دور ہے۔ اسرائیل فلسطینی مجاہدوں کے خلاف بڑے پیمانے پر جو کارروائی کرنے والا ہے، ہم اُس کی تمام تفصیلات سے فلسطینی مجاہدوں کو آگاہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اِس طرح مجاہدین پہلے ہی اپنے دفاع کا بندوبست کر لیں گے۔ مجاہدوں کو ہماری بات پر یقین آ جائے، اِس کے لیے بھی ہم پیغام ہی کے ساتھ کچھ ثبوت بھی بھیجنا چاہتے ہیں۔ ڈیڈی اِس سلسلے میں بہت پریشان تھے۔ خود ڈیڈی پورٹ فواد تک یہ اہم کاغذات لے کر اس لیے نہیں جا سکتے کہ بہرحال غیر ملکی ہیں اور اِس معاملے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ڈیڈی نے اِسی لیے یہ فیصلہ کیا کہ کسی عرب ہی کو پورٹ فواد تک بھیجا جائے تاکہ اُس پر شک نہ ہو اور پورٹ فواد میں فلسطینی مجاہدین کے ایک نمائندے تک اہم کاغذات پہنچ جائیں۔ میں نے اِس سلسلے میں شجیع کو آمادہ کر لیا۔ اب تم ہی بتاؤ شارب! اُسے آمادہ کرنے کے لیے اپنے متعلق سب کچھ بتانا ضروری تھا یا نہیں؟ میں نے اِس میں کیا حماقت کی اور کون سی بے وقوفی کا ثبوت دیا؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"میرے خیال میں تو تم نے انتہائی بے باکی اور جرأت کا ثبوت دیا ہے الیس! اِس کی توقع لڑکیوں سے کم ہی کی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اِس میں تمھارا نہیں حالات کا قصور ہے کہ وہ شخص اتنی پست ذہنیت کا مالک نکلا۔ خیر، تو تم اپنے ڈیڈی سے لڑ کر امریکہ واپس جا رہی ہو، صرف اتنی سی بات پر!"

"تمھاری نظر میں یہ اتنی سی بات ہے! ڈیڈی تو یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی حماقت سے تحریک کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اُن کا کہنا ہے کہ اگر شجیع درمیان میں نہ آتا تو وہ کوئی اور متبادل بندوبست کر چکے ہوتے اب تک!"

"تو پھر کر کیوں نہیں لیتے اب؟ اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے نا! ڈیڈی کے خیال میں کسی متبادل بندوبست میں اتنا وقت ضائع ہو جائے گا کہ پھر وہ پیغام بھیجنا ہی فضول ثابت ہوگا۔ اب اِس کا وقت نہیں رہا۔ اُنھوں نے مجھے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے کہ میں تو امریکہ واپس چلی جاؤں اور بہ مجبوری وہ خود پورٹ فواد روانہ ہو جائیں۔ وہ میری ایک نہیں سُن رہے حالانکہ خود اُن کا پورٹ فواد جانا انتہائی خطرناک ہے مگر انھیں سمجھائے کون! وہ تحریک کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ تحریک کے لیے میں بھی جان دے سکتی ہوں شارب، لیکن یہ تو سراسر خودکشی ہے۔"

"میں بھی یہ سمجھتا ہوں۔ تمھارے ڈیڈی کو پورٹ فواد نہیں جانا چاہیے۔" میں نے تائید کی۔

"اُن کا فیصلہ بس ایک ہی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔" وہ میری طرف توجہ طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا تو پھر خود ہی بتانے لگی۔ "کہ اگر اُن کی بجائے کوئی اور شخص وہ اہم پیغام لے کر پورٹ فواد جانے پر راضی ہو جائے، مگر اُس شخص کا عرب ہونا ضروری ہے۔"

"فیصلے کی تبدیلی کے بعد تم بھی امریکہ نہیں جاؤ گی۔"

"ظاہر ہے۔" وہ بولی۔

"تو پھر تمھارے ڈیڈی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"وہ کس طرح؟"

"میں، وہ اہم پیغام اور کاغذات لے کر پورٹ فواد جاؤں گا۔"

"نہیں شارب! تم... تم مجھے جھوٹی تسلی دے رہے ہو! مجھے بتاؤ کیا... کیا واقعی تم... تم ہماری خاطر...."

"تمھاری خاطر نہیں الیس، اپنی خاطر!" میں اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ میرا جواب سن کر وہ اتنی خوش ہوئی کہ گزشتہ روز کی حدود سے تجاوز کرنے لگی۔ "شارب تم... تم کتنے عظیم ہو! تم نے میری عزت رکھ لی۔"

"الیس!" میرے ضبط کا بندھن ٹوٹنے لگا تو میں چیخ

"آگ سے نہ کھیلو، ورنہ جل جاؤ گی!"

"تمھیں... تمھیں کیا ہو گیا ہے شارب... یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو!"

"اُٹھو!" میں نے اُس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ "میرے ساتھ چلو!"

"مگر... مگر کہاں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اپنے ڈیڈی کے پاس۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اِسی وقت اُن سے بات کر لینا چاہتا ہوں۔"

الیس اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ مجھے اپنے ساتھ لیے، اپنے مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ مجھے نشست گاہ میں بٹھا کر وہ اپنے باپ کو بلانے چلی گئی۔ اُس کے چہرے سے بے پناہ مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاید اُسے یہ غلط فہمی تھی کہ میں اُس کی کوشش اور ذہانت سے اُس کے جال میں پھنستا ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

"مسٹر شارب! یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ خوب سوچ سمجھ لیا ہے آپ نے؟" ہارڈی نے آتے ہی کہا۔ الیس یقیناً اُسے میری آمادگی سے مطلع کر چکی تھی۔

"جان ایک ہی بار تو جائے گی مسٹر ہارڈی!" میں بولا۔ "پھر اگر کسی نیک مقصد کے لیے چلی جائے تو کیا حرج ہے!" مجھے مکمل طور پر آمادہ دیکھ کر ہارڈی تفصیلات بتانے لگا۔ اُس نے مجھے پورٹ فواد کا وہ پتا بھی لکھ کر دے دیا جہاں بہ قول اُس کے فلسطینی مجاہدوں کا نمائندہ قیام پذیر تھا۔ آخر میں وہ بولا۔ "نیک کام میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے مسٹر شارب کہ آپ آج ہی رات رختِ سفر باندھ لیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"کوئی اعتراض نہیں مجھے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں آج ہی روانگی کی تیاری کر لیتا ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، آپ رات کا کھانا کھا کر ٹہلتے ہوئے اِدھر نکل آیئے گا۔ میں وہ کتاب آپ کو دے دوں گا۔"

"کتاب؟" میں حیرت سے بولا۔

"جی ہاں، اُسی کتاب میں وہ پیغام چھپا ہوگا۔ بہ ظاہر وہ کتاب آثارِ قدیمہ کے موضوع پر ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا، کتاب کے ہر تیسرے صفحے پر چند الفاظ انڈر لائن کیے گئے ہیں۔ اُنھی الفاظ کو ایک خاص ترتیب دینے کے بعد وہ پیغام سمجھ لیا جائے گا!" ہارڈی نے مدھم لہجے میں بتایا۔

"اور وہ اہم کاغذات، الیس نے جن کا ذکر کیا تھا!" میں نے کہا۔

"اب صورتِ حال بدل چکی ہے، کاغذات کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ کو صرف وہ کتاب بہت احتیاط کے ساتھ فلسطینی مجاہدین کے نمائندے تک پہنچانا ہے۔"

"تو وہ مجھے کیوں نہ دے دیں۔"

"میں نے ابھی پیغام ترتیب نہیں دیا ہے۔ میں اِسی دوران میں یہ کام کر لوں گا۔"

"ظاہر ہے کہ اِس میں آپ کو بڑا وقت لگے گا، اِس لیے میں چلتا ہوں، آپ وہ پیغام ترتیب دیں۔" میں کھڑا ہو گیا۔

الیس مجھے اپنے گھر کے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ چلتے وقت اُس نے کہا۔ "شارب! مجھے معاف کر دینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمھیں اُس لڑکی سے اتنی گہری جذباتی وابستگی ہوگی جو تمھاری نہ ہو سکی، مگر... مگر میں... میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔ روایتی قسم کی تصوراتی محبت پر مجھے اب تک یقین نہیں تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ لوگ جھوٹ بولتے ہوں گے لیکن... لیکن اب... اب شاید مجھے یقین آ جائے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"جب آدمی پر خود گزرتی ہے تو اُسے یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔" اُس نے معنی خیز انداز میں کہا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔ میں چلا آیا۔ مجھے اب اس وقت کا بے چینی سے انتظار تھا، جب ہارڈی سے وہ کتاب مل جاتی۔ اب میری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا تھا کہ یہ سب کیا چکر ہو سکتا ہے۔ مگر قبل از وقت میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ ہارڈی اور الیس نے جو کچھ ظاہر کیا ہے، کم از کم حقیقت وہ نہیں ہو سکتی۔ زیرِ زمین تحریک کی آڑ میں وہ کوئی اور ہی کھیل، کھیل رہے تھے۔ اُن کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے مجھے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے بٹلر کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ چلا گیا تو میں گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار ابھی گیٹ سے متصل اپنی کوٹھری میں تھا۔ میں اپنے مکان کے گیٹ سے نکل کر برابر والے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ الیس کے گھر کا چوکیدار مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر جلدی سے میری طرف لپکا۔ میں رُک گیا۔

"آپ کے جاتے ہی وہ آیا تھا، شام کو!" چوکیدار نے بتایا۔
"کون؟" میں نے سوال کیا۔
"وہی جو میم صاحب سے ملنے آتا ہے جو صبح بھی آیا تھا۔" چوکیدار نے بتایا۔
"اچھا اچھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "اُسی کا ذکر کر رہے ہو جو مینڈک کی طرح لگتا ہے!"
"جی ہاں وہی۔"
میں نے اِس اطلاع پر چوکیدار کا شکریہ ادا کیا اور اپنے آنے کی خبر کرائی۔ چوکیدار اندر چلا گیا تو میں سوچنے لگا، وہ شخص یقیناً ہارڈی کا آدمی ہے اور صبح جو واقعہ پیش آیا تھا اُس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اُن لوگوں نے اپنی دانست میں مجھے پھانسنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا۔ چوکیدار جلد ہی لوٹ آیا اور میں اندر چلا گیا۔ ابھی میں نشست گاہ میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ہارڈی آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں موٹی سی ایک کتاب تھی۔ "یہ لیجیے مسٹر شارب!" اُس نے میرے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
میں نے اُس سے وہ ضخیم کتاب لے لی اور بولا۔ "ایلس نظر نہیں..."
"وہ شجیع کے ساتھ گئی۔" ہارڈی نے میری بات کاٹ کر کہا، پھر خود ہی بتلانے لگا۔ "وہ شام کو آپ کے جاتے ہی آ گیا تھا اور اپنے صبح کے رویے پر پشیمانی کے بعد معافی مانگ لی تھی۔ میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اُسے معاف کر دیا۔ ٹھیک کیا نا!"
ظاہر ہے کہ مجھے اُس کی تائید ہی کرنا تھی۔ اُس نے ایک بار پھر صبح ہونے والی باتیں مختصراً دُہرائیں کر پورٹ فواد پہنچ کر مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ مجھے ساری باتیں یاد ہیں۔ پھر میں نے اجازت چاہی کیونکہ مجھے اُس کتاب کو دیکھنے کی بے چینی تھی۔ ہارڈی نے مجھے نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کر دیا۔
میں سیدھا اپنی خواب گاہ میں پہنچا اور کتاب کے ہر تیسرے صفحے پر خط کشیدہ الفاظ کو ایک صاف کاغذ پر لکھتا گیا۔ کسی تیسرے صفحے پر صرف ایک لفظ کے نیچے لکیر کھینچی ہوئی تھی اور کسی پر کئی کئی لفظوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ مجھے اُس میں کافی دیر لگی۔ اِس محنت طلب کام سے فارغ ہو کر میں نے اُس کاغذ کو کئی بار پڑھا جس پر کتاب کے خط کشیدہ الفاظ لکھے تھے۔ وہ قطعی بے معنی اور مہمل عبارت تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر اُس عبارت میں کچھ ہوتا تو ہارڈی مجھے یہ بات کیوں بتاتا۔ اگر اُس عبارت میں واقعی کوئی پیغام تھا تو میں الفاظ کو وہ خاص ترتیب دینے سے قاصر تھا جس سے کوئی معنی اخذ کیے جا سکتے۔ میں نے کئی بار ان الفاظ کو ترتیب دے کر پڑھنا چاہا مگر ناکام رہا۔ وہ عبارت مہمل ہی رہی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں ہارڈی نے مجھے اُس عبارت میں اُلجھانے کے لیے تو یہ چال نہیں چلی؟ میں اُسی عبارت میں اُلجھ کر رہ جاؤں اور مزید کچھ نہ سوچ سکوں۔ مجھے اپنے اِس خیال میں وزن محسوس ہوا لہٰذا میں کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اُس کی جلد بھی دبیز تھی جس پر سیاہ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ کتاب بہت اہم ہے، لیکن ابھی تک اُس کی اہمیت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ ہارڈی بے سبب اُس کتاب کو پورٹ فواد نہیں بھیج سکتا تھا۔
سوچتے سوچتے مجھے جانے کیا سوجھی کہ کتاب کی دبیز جلد الگ کر دوں۔ پھر میں اُس جلد کو بھی پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ سیاہ کپڑا پھاڑ کر میں نے احتیاط سے الگ کر دیا اور چونک اُٹھا۔ کپڑے کے نیچے جلد کے برابر کا ہوا ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ وہ کاغذ چکنا اور موٹا تھا۔ میں نے اُس کاغذ کو اُلٹ کر دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"تمھارے ہاتھ میں جو کچھ ہے، اُسے پھینک کر اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو شارب!" یہ سرد آواز ایلس کی تھی۔ میں نے نظر اُٹھائی۔ ایلس، کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ریوالور کی نالی میری طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

ایک منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی
ایک دور کا عکس — ایک معاشرے کا ترجمان ناول
حضرت جان
ایک جلد میں مکمل
تحریر
قاضی عبدالستار
قاضی عبدالستار کا نام ہی قلم کی آبرو کا ضامن ہے۔
لفظوں کے سیپ میں روشن دیپ، تحریر کے غازی نام کے قاضی نے حضرت جان میں روشن کیے ہیں جو زبان و بیان کے رسیا صاحب ذوق لوگوں کے لئے ہے۔
ہزاروں قارئین کی پسندیدہ تحریر
(زیرِ طبع)
قیمت فی حصہ ۵۱ روپے علاوہ محصول ڈاک
جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے
آج ہی قریبی بک سٹال سے یا براہ راست ہم سے طلب کریں!
گل قریش لائبریری، ۱۱۔ عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون 7229762-7245599

موت کو سامنے دیکھ کر میں کبھی نہیں ڈرا۔ اس وقت بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "ایلس! کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمھارے ہاتھ میں یہ کھلونا دیکھ کر ڈر جاؤں گا؟" میں نے وہ کاغذ مسہری کے سرہانے ڈال دیا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ کتاب جو میری گود میں پڑی تھی اسے میں نے ہاتھ میں لے لیا۔ جلد نیچے گر گئی۔
"اب ہاتھ بھی اٹھا لو اور بہادر بننے کی کوشش نہ کرو!" ایلس چند قدم آگے بڑھ آئی۔ میں نے اس کی طرف متانگاہ نہ ہٹائی۔ وہ اس وقت بالکل بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ چہرے کا کھنچاؤ دلی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ آواز میں نرمی کی جگہ سختی اور حسین آنکھوں میں محبت کی بجائے نفرت تھی۔ "میرا خیال ہے ایلس کہ تم ہنگامہ نہیں چاہتیں ورنہ ہاتھ اٹھانے کو نہ کہتیں۔" میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "گولی چلا کر تم بھی خطرے میں پڑ جاؤ گی اس لیے ہم سودے بازی کر لیں تو کیا بُرا ہے!"
"کیسی سودے بازی؟" اس نے مجھے سخت نظروں سے دیکھا۔
"تمھیں صرف یہ کاغذ چاہیے جو میں نے کتاب کی جلد پر چڑھا ہوا کپڑا پھاڑ کر نکال لیا ہے۔"
"اور تم اس کے بدلے میں کیا چاہتے ہو؟" اس نے اپنے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ لیے۔
"مجھے دینے کو تمھارے پاس ہے بھی کیا!" میں ہنسا۔ "تم نے قیمت تو لگائی تھی میری۔ میں نے ہی قیمت وصول نہیں کی۔"
"تم میری توہین کر رہے ہو!"
"نہیں! حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔" میں نے اس کے اور اپنے درمیان فاصلے کا اندازہ لگایا۔
"میں تمھاری بکواس سننا نہیں چاہتی۔"
"تو پھر وہ کاغذ اٹھا لو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔ یہ کتاب چاہیے تو

سے بھی لے جاؤ۔ میں تو صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم لوگ ہمارے ہمدرد کب سے ہو گئے! ویسے وہ کہانی اچھی تھی کہ امریکہ میں ایک زیر زمین تنظیم فلسطینیوں کے غم میں دبلی ہو رہی ہے؟" میں نے اس کا مذاق اڑایا۔ "تم لوگ جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو اور سمجھتے یہ ہو کہ تمہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔"

"اور تم؟ اپنے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ میں بتاؤں کہ تم کیا ہو! سن سکو گے؟" اسے غصہ آ گیا۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی!" یہ کہتے ہی میں نے اس کے ریوالور پر کتاب کھینچ ماری۔ جب تک وہ سنبھلتی، میں نے درمیانی فاصلہ طے کر لیا۔

"ذلیل۔۔۔ دھوکے باز!" وہ مجھ سے اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ میں نے اسے پیر کی ٹھوکر سے دور کر دیا۔ وہ زور آزمائی کرنے لگی تو مجبوراً مجھے سختی سے کام لینا پڑا۔ میں نے اس کے منہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا کہ وہ چیخ نہ سکے۔ اپنی ٹائی اور ایک لیس جا کر اس کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے اور پھر پیروں کو بھی آزاد نہ رہنے دیا۔ اب وہ میرے سامنے فرش پر بندھی پڑی تھی۔ میں نے جھک کر ریوالور اٹھایا اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ایلس بے بسی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ منہ میں رومال ٹھونسے جانے سے اس کی صورت بگڑ گئی تھی۔ ایلس سے نمٹ کر مجھے سب سے پہلے اس کاغذ کی فکر ہوئی جو کتاب کی جلد سے برآمد ہوا تھا۔ اسے میں نے پتلون کی پچھلی جیب میں رکھا۔ اور مرا ایلس کو وہیں چھوڑ جانا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور غسل خانے میں بند کر دیا۔ اس نے معقول [illegible] تو بہت کی مگر میں نے توجہ نہ دی۔ خواب گاہ کی بتی بجھا کر میں باہر آ گیا۔ ایلس کو آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اس لیے میں ہارڈی کی طرف سے زیادہ فکر مند نہ تھا۔ اب مجھے اسی کی خبر لینا تھی۔

میرے گھر کا چوکیدار اپنی کوٹھری میں تھا۔ کوٹھری میں بتی جل رہی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے کھڑکی سے جھانکا اور مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ پھر کھڑکی سے غائب ہو گیا۔ اپنے گھر کے گیٹ سے نکل کر میں نے برابر والے مکان کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر وہاں سناٹا نظر آ رہا تھا۔ اندر صرف ایک کمرے میں روشنی تھی۔ باہر کے سارے بلب بجھے ہوئے تھے۔ چوکیدار کی کوٹھری میں بھی مجھے روشنی نظر نہ آئی۔ ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی، دس بجے تھے مگر یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اس گھر کے مکین سو گئے ہوں۔ میں آہستہ قدمی سے گیٹ تک پہنچا اور ذیلی دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ ذیلی دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے طویل سانس لے کر اطراف کا جائزہ لیا۔ بائیں جانب سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ وہ کار گزر گئی تو گلی پر سکوت ہو گیا۔ میں نے گیٹ پر چڑھ کر اندر پہنچنے میں دیر نہ کی۔ چوکیدار کی کوٹھری کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے میں نے سوچا اور کوٹھری کی کھڑکی کھول کر اندھیرے میں گھورنے لگا۔ اسی وقت کوٹھری کے اندر سے آوازیں آنے لگیں یوں جیسے کوئی مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو اور کسی سبب بول نہ سکتا ہو۔ میں کھڑکی پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ میں نے بتی جلانے سے گریز کیا اور اس شخص کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالنے لگا جو چوکیدار ہی ہو سکتا تھا۔ وہ کوٹھری کے فرش پر بندھا پڑا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ شور نہ کرے اور منہ سے کپڑا نکل جانے کے بعد مدھم آواز میں بولے۔ وہ میری آواز پہچان گیا۔ "شکریہ جناب!" وہ آہستہ سے بولا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں بھی کھول دیے تو اس نے کہا۔ "بتی جلا دوں؟"

"نہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔ "مجھے جلدی جلدی یہ بتاؤ کہ تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟"

"مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا جناب! میری پشت کوٹھری کے دروازے کی طرف تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر۔۔۔" وہ کراہا۔ "میرے سر کے پچھلے حصے پر چوٹ لگی ہے۔ معلوم نہیں کیا مارا تھا اس نے! ہوش آیا تو میں نے خود کو بندھا ہوا پایا۔"

"کچھ یاد ہے یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"جب بیگم صاحبہ آپ کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس گئی تھیں کچھ دیر بعد۔۔۔"

"ٹھیک ہے تم یہیں رہو۔ میں اندر جا کے دیکھتا ہوں۔ وہ لوگ اندر معلوم ہوتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" چوکیدار گھبرایا۔

"جنہوں نے پکڑے ہوں گے اور کون! بس تم باہر نہ نکلنا۔ ممکن ہے مسلح ہوں۔"

"مگر آپ۔۔۔ آپ اکیلے۔۔۔"

"میری فکر نہ کرو۔ ریوالور ہے میرے پاس۔" میں دبے پاؤں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے بھی میں نے احتیاط سے کام لیا۔ اندر اب بھی خاموشی تھی۔ میں نے اندر والے کمرے کی کھڑکی دیکھی۔ روشنی اسی میں تھی۔ گھر کا دروازہ مجھے کھلا ہوا ملا۔ اندر پہنچ

کر نشست گاہ کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس وقت مجھے مدھم سی آوازیں سنائی دیں جو اندرونی کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ جب وہ آوازیں مجھے واضح سنائی دینے لگیں تو میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ ان دونوں کی آوازیں میں نے پہچان لیں۔ کمرے میں ہارڈی اور شیخ تھے۔ ایلس کا باپ ہارڈی اور اس کا فرضی عاشق شیخ! ان دونوں کا موضوع گفتگو میں تھا۔

"بے وقوف تو ہے ہی وہ مگر پھر بھی میں مطمئن نہیں ہوں ہارڈی! تم لوگ پہلے بھی حماقتیں کر چکے ہو۔" شیخ کا انداز گفتگو ایسا تھا جیسے ہارڈی اس کا ماتحت ہو۔

"ضروری تو نہیں کہ ہم سے ہر بار بھول ہو جائے۔ ایلس کو میں نے اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ جلد سے جلد اسے روانہ کرا دے۔"

"مگر اس نے دیر لگا دی۔ پرواز کے وقت کا بھی اسے خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"ابھی تو بہت وقت ہے ہمارے پاس۔ آپ کوئی اندیشہ نہ کریں۔" ہارڈی کی آواز مدھم تھی۔

"وہ نوجوان مجھے ذرا مختلف نظر آیا تھا اسی لیے ذرا ڈر ہے! اور جیسے میں نروس ہو گیا ہوں۔" شیخ نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"کتاب کی جلد پر تو اس کا دھیان بھی نہ گیا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ اس نے کتاب کے ہر صفحے پر وہ الفاظ دیکھے ہوں گے جن پر نشان لگے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک کیا تم نے مگر۔۔۔ ہاں یہ بتاؤ تم نے وہ نقشہ دیکھا تھا؟ میں تو جلد بازی میں اس پر غور نہیں کر سکا۔ وہ بڑی محنت سے بنایا گیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، کسی فوجی ہوائی اڈے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔" میں توجہ سے ان دونوں کی باتیں سنتے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے سے قریب ہونے لگا۔

"مجھے بھی اسے دیکھنے کی زیادہ مہلت نہیں ملی مگر میں بھی آپ کے خیال سے متفق ہوں۔ صرف ایک ائیر بیس کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ نقشے میں اس کی واضح نشاندہی نہیں کی گئی۔ غالباً پورٹ سعید کا ائیر بیس ہے وہ۔"

"ہارڈی! تمہاری انہی باتوں کو تو میں حماقت کہتا ہوں!" شیخ کے انداز سے سختی کا اظہار ہونے لگا۔ "تمہیں پہلے یہ وضاحت کرنا چاہیے تھا۔ اب وقت گزرنے کے بعد۔۔۔"

پائل
جیسی زبان و بیان کی دلکش داستان کے خالق
ایم اے راحت
... ایک اور شاہکار
پرچھائیں
اپنے وقت کی ایک حیران کن تحریر
وہ شخص میرے سامنے آ گیا اور میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا: دوست ہم جانتے ہیں کہ تمہارا نام سردار ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنا نام بھول جاؤ۔ کیا تم نے ابوالحسن کا نام سنا ہے، جو ایک رات سویا — تو ہارون رشید بن گیا۔ ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ تم ہارون رشید سمجھو، ہارون رشید بن جاؤ۔
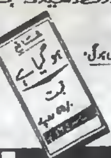
کل قریشی پبلیکیشنز اینڈ لائبریری
11 عمر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7220762 - 7248500

"میں نے صرف اپنے شبہے کا اظہار کیا ہے۔ یقین ہوتا تو ضرور کہتا۔" ہارڈی نے اپنی صفائی پیش کی۔ میں دروازے کے اور قریب ہو گیا۔

"تم نے چوکیدار کو تو ٹھیک طرح باندھ دیا ہے؟ اس نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟" شیمی نے پوچھا۔

"ہاں! اسے ہوش بھی آ گیا تو کوٹھری سے باہر نہ آ سکے گا۔ میں نے باہر سے تالا ڈال دیا ہے۔"

"اور کھڑکی؟"

"وہ بھی بند کر دی تھی شاید۔ ویسے وہ کھڑکی تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

"احمق ہو تم!" شیمی نے اسے ڈانٹ دیا۔ "جاؤ دیکھ کر آؤ، کھڑکی لگی ہے یا نہیں! تم لوگ چھوٹی باتوں پر توجہ نہیں دیتے، وہ بھی بعض اوقات اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔"

"میں دیکھے لیتا ہوں، اگر کھلی ہوئی تو بند کر آؤں گا۔"

"اور ذرا برابر کی کھڑکی بھی دیکھتے آنا۔ یہ لڑکی کبھی کبھی بہت ... ہے۔ وقت کی اہمیت کا تو ذرا احساس نہیں ہے۔"

میں دیوار سے بالکل چپک گیا۔ پہلے ہارڈی کے قدموں کی آواز سنائی دی، پھر وہ خود دروازے سے نکل کر میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے مہلت نہ دی۔ وہ میری جانب متوجہ نہ تھا اس لیے چوٹ کھا گیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی گردن پر تھا دوسرا منہ پر۔ جلد ہی آواز نکالے بغیر وہ میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ اسے میں نے آہستگی سے فرش پر لٹا دیا۔ اب شیمی کی باری تھی۔ میں اطمینان سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ شیمی مجھے فوراً ہی نظر آ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ دیکھیں انہیں جانے کیا ہو گیا!"

"کسے؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

"مسٹر ہارڈی کو۔ وہ نشست گاہ کے سامنے بے ہوش پڑے ہیں۔ الیس بھی انہیں دیکھ کر رو رہی ہے۔"

شیمی تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن تھی۔ وہ جیسے ہی میرے قریب پہنچا میرا ہاتھ چل گیا۔ گینڈے جیسے جسم والا! قد زیادہ تھا۔ وہ لہرا کر زمین پر آ رہا۔ الیس کے ساتھ میں نے سلوک اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ صنف نازک تھی۔ شیمی اور ہارڈی کو گھسیٹ کر کمرے میں لایا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے۔ پھر بھی میں نے احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔ میں نے ان دونوں کو باری باری باندھ دیا۔ اس کے لیے میں نے ہارڈی کی ٹائیاں استعمال کیں جو مجھے الماری میں مل گئیں۔ پھر کمرے کی تلاشی لینے پر مجھے کام کی کئی چیزیں ملیں۔ میں نے ...

ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کی دلچسپ گدگداتی ہوئی خودنوشت
بزدلیر
بے شمار سلسلے وار کہانیوں کے خالق
شمیم نوید کے راہبر قلم سے
تھکے ہوئے لمحات میں مسکراہٹیں بکھیر دینے والی
اے ڈی مہر کی تہقہہ بردوش روداد حیات۔
زندگی کی اکتا دینے والی یکسانی میں ایک خوشگوار
تغیر میں شگفتگی کی تازہ لہر
قبولیت عام کی سند حاصل کرنے والا کتابی سلسلہ
زیر طبع
قیمت
فی حصہ ۵۰ روپے
علاوہ محصول ڈاک
11- گمرو ڈ اسلام پورہ لاہور
کل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری فون: 7249599-7229762

انھیں ایک ایئر بیگ میں رکھ لیا۔ ان چیزوں میں جدید ساخت کا کچھ اسلحہ بھی تھا۔ وہاں مجھے کئی ایسے واضح ثبوت بھی نظر آئے جو پولیس کا کام آسان کر دیتے۔ تلاشی لے کر میں کمرے سے نکلا اور اسے باہر سے بند کر دیا۔ ایئر بیگ کو میں نے اپنے بائیں شانے پر لٹکا لیا تھا۔ باہر آکر میں چوکیدار کی کوٹھری کے پاس رک گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی کھڑا تھا مجھے رکتے دیکھ کر فوراً بول اٹھا۔ "کیا ہوا جناب؟"

"سنو یہاں ابھی پولیس آنے والی ہے۔ تم باہر آجاؤ۔"

"پولیس!" وہ گھبرایا۔

"ہاں ہاں گھبرانے کی کیا بات ہے! تم پولیس کو وہی بتانا جو گزری ہے۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر وہ.... وہ چید.... کیا...."

"میرا اندازہ غلط نکلا، بات کچھ اور تھی۔"

"کیا؟"

"سب معلوم ہو جائے گا تمھیں۔ فی الحال تم کسی کو اندر نہ جانے دینا۔" میں نے اسے ہدایت کی، پھر بولا۔ "اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم کھڑکی کے راستے نکل آؤ۔ میں پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں!" پھر میں وہاں مزید نہیں رکا اور گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں جلد ہوش میں نہیں آسکیں گے۔ فون کرنے سے پہلے میں نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ اس ایئر بیگ کو چھپانا ضروری تھا۔ صورت حال بدستور تھی۔ میں نے ایئر بیگ کا سامان ایک اٹیچی میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا اور ایئر بیگ کو مسہری کے نیچے ڈال دیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر میں نے ایلس کو بھی دیکھا۔ وہ اسی طرح بے بس پڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر بہت ہاتھ پیر چلائے۔ مجھے اس پر رحم بھی آیا مگر دروازہ بند کر دیا۔

میرے مکان میں بھی فون نہ تھا اور ہارڈی کے گھر بھی مجھے فون نظر نہیں آیا۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ وہاں قیام کرنے والے عموماً سیاح ہوتے تھے۔ مقامی لوگوں سے انھیں ربط ضبط کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ مجھے اسی لیے فون کرنے کے لیے نکلنا پڑا۔ ایک ہوٹل کے قریب مجھے ٹیلی فون بوتھ نظر آگیا۔ فون اس ہوٹل میں بھی تھا مگر میں نے وہاں صرف ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھی۔ میں وہاں فون پر بات کرتا تو لوگ متوجہ ہو جاتے۔ ٹیلی فون بوتھ سے ایک شخص فون کر کے نکلا تو میں اندر چلا گیا۔ سکے ڈال کر میں نے پولیس ہیڈ آفس کا نمبر ملایا۔ "ہیلو!" دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"پولیس ہیڈ آفس سے بول رہے ہیں آپ؟" میں نے تصدیق چاہی۔ جب تصدیق ہو گئی تو میں نے اسے پہلے اپنا نام اور پتا بتایا۔

"کیا نام بتایا شارب بن سلمان!"

"جی ہاں۔"

"کس لیے فون کیا ہے؟"

"میں نے کچھ غیر ملکی جاسوسوں کو ٹریس کیا ہے۔ آپ جلد از جلد تشریف لے آئیں تو بہتر ہے... بتاتے ہوئے پتے..."

"کیا... ٹھہرو، کیا کہا تم نے! غیر ملکی جاسوس! دماغ تو ٹھیک ہے تمھارا! جاسوسوں کو اگر ہم اسی طرح پکڑنے لگے تو پھر ہمیں تو نوکری چھوڑنی پڑ جائے۔"

"میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں!" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی مشکل سے بند کیے ہیں انھیں!"

کافی بحث مباحثے کے بعد وہ میری بات مانا۔ "اگر بات غلط ہوئی تو سمجھ لو تمھاری خیر نہیں ہے۔"

میں نے فون رکھ دیا اور باہر نکل آیا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ ایسی ہی صورت حال پیش آئے گی۔ صحیح صحیح نام پتا بتانے پر اس نے اتنی بحث کی تھی، اگر میں نام بتانے سے گریز کرتا تو وہ شاید میری بات سنتا بھی نہیں۔

واپس پہنچ کر میں ہارڈی کے گھر گیا۔ گیٹ میں گھستے ہی چوکیدار سامنے آگیا۔ "پولیس آگئی جناب؟"

"پولیس آنے والی ہے۔ میں فون کر آیا ہوں۔" میں آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں بدستور رسیوں میں جکڑے ہوئے اندر کمرے میں پڑے تھے۔ شاید ہوش میں آ گئے تھے۔ ... میں نے ہارڈی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ہارڈی نے ... میں ... گیٹ میں اپنے گھر پولیس کو ... پتے ہی گھر کا پتا دیا تھا۔ پولیس کے پہنچنے میں تھوڑی دیر لگی۔ چوکیدار نے مجھے آکر بتایا تو میں باہر آیا۔ گیٹ کے سامنے ایک پولیس جیپ کھڑی تھی۔ گیٹ کے ذیلی دروازے سے دو باوردی پولیس والے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک سادہ لباس والا تھا۔ میں ان تینوں کو لے کر نشست گاہ میں آگیا۔ تعارف ہوا۔ ایک پولیس انسپکٹر تھا، ایک سب انسپکٹر اور سادہ لباس والے کا تعلق خفیہ پولیس سے تھا۔ اس نے اپنے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتایا کہ کس عہدے پر ہے۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے آپ مجرموں کو قبضے میں کر لیں۔" میں نے تعارف کے بعد کہا۔

"لیکن ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، جب تک ان پر جرم ثابت نہ ہو جائے۔" سادہ لباس والے نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے باوردی پولیس انسپکٹر سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

"بالکل ٹھیک ہے جناب!" پولیس انسپکٹر نے سر ہلایا۔ "پہلے ثبوت تو مل جائے۔"

"سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے۔" میں نے پینٹ کی پچھلی جیب سے وہ نقشہ نکال کر سادہ لباس والے کو تھما دیا جو کتاب کی جلد سے برآمد ہوا تھا۔ پھر اپنی پینٹ ہی کی جیب سے میں نے ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"یہ ریوالور کس کا ہے؟" پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

"اس ریوالور سے ایک لڑکی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سادہ لباس والے کی طرف دیکھا جو نقشے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

"یہ تو کوئی نقشہ بنایا گیا ہے کیسا ہے اس میں؟ ہوائی راستے ہیں مختلف شہروں کے۔" سادہ لباس والے نے میری طرف نظر اٹھائی۔ مجھے اس کی حماقت پر افسوس ہوا۔ معلوم نہیں اسے کس نے پولیس کے محکمے میں بھرتی کر لیا تھا۔ اس کی نظر میں نقشے کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ مجبوراً مجھے اوّل سے آخر تک تمام روداد سنانا پڑی۔ میں نے انھیں ساری باتیں بتا دیں، کچھ بھی نہیں چھپایا۔ ہاں یہ نہیں بتایا کہ میں ہارڈی کے گھر سے کچھ چیزیں بھی لے آیا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی چھپائی کہ ہارڈی کے کمرے کی تلاشی لے چکا ہوں۔

"تمھارے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم لڑنے بھڑنے میں بہت ماہر ہو!" پولیس انسپکٹر مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جی ہاں میں جوڈو، کراٹے اور دیگر مارشل آرٹ جانتا ہوں۔" مجھے ان پر غصہ آرہا تھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھے باتیں کیے جا رہے تھے۔

"اگر ان لوگوں کے خلاف ثبوت نہیں ملا تو ہماری بھی مصیبت آئے گی اور تمھاری بھی۔" پولیس انسپکٹر بولا۔

"کیا یہ نقشہ ان کے جرم کا ثبوت نہیں؟"

"مگر یہ تو تم نے دیا ہے ہمیں! ان کے پاس سے تو برآمد نہیں ہوا۔" پولیس انسپکٹر جرح کرنے لگا۔ "تم نے ان لوگوں کو حبس بے جا میں رکھ کر اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا انھیں فرار ہو جانے دیتا!" میں جھنجلا گیا۔

"اچھا اس کمرے میں چلو جہاں تم نے غسل خانے میں لڑکی کو بند کر رکھا ہے۔" سادہ لباس والا مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں ان تینوں کو خواب گاہ میں لے آیا۔ وہ خواب گاہ کا جائزہ لینے لگے۔ ان کی نظریں ایک ایک شے کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے فرش پر پڑی ہوئی کتاب اور پھر اس کی پھٹی ہوئی جلد بھی ان کے حوالے کر دی۔ باتھ روم کا دروازہ میری نشان دہی پر سادہ لباس والے نے کھولا۔ ایلس کو غسل خانے سے نکال لیا گیا۔ منہ

ایک حرماں نصیب کی داستان الم جو چاندنی راتوں میں تو غضب کی علامت بن جاتی تھی
دلچسپ کہانیوں کی مصنفہ
سیما غزل
کے سرگزشت سے ماہنامہ جی کہانیاں ڈائجسٹ کا کتابی سلسلہ
ایک اور پُر تحیر سنسنی خیز سلسلہ وار آپ بیتی
چاند کے قیدی
2 جلدوں میں مکمل
نسل در نسل چلنے والے انتقام کی روداد
ایسے ناقابل فراموش المیے تحریر جو آپ کو لرزہ براندام کر دے گے۔
قیمت فی حصہ 45 روپے
ڈاک خرچ 12 روپے
شائع ہو گیا
ملنے کا پتہ ناشر
... کل قریشی لائبریری، 11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔
فون: 7229762-7248599

سے رومال نکالتے ہی اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ وہ مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگا رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اگر سادہ لباس والا اسے ڈانٹ کر چپ رہنے کو نہ کہتا تو وہ بولے ہی چلی جاتی پھر پولیس والے مجھے اپنے ساتھ ہارڈی کے گھر لے گئے۔ ایلس کو پولیس وین میں بٹھا دیا گیا جس پر اس نے بہت احتجاج کیا۔ وین اور جیپ میں سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ سپاہیوں نے ایلس کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس وقت تک ہارڈی کو بھی ہوش آ چکا تھا جب میں پولیس والوں کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دونوں بھی گرفتار ہو گئے۔ ہارڈی کے گھر کی تلاشی لیتے وقت مجھے بھی باہر نکال دیا گیا۔ ہارڈی کے گھر سے میرے بیان کی تائید میں پولیس والوں کو کئی ثبوت ملے ہوں گے، مگر انھوں نے مجھ پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔ "تمھیں اور چوکیدار کو بھی ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ آفس چلنا ہوگا۔" سادہ لباس والے نے مجھ سے کہا۔

"میں اپنا بیان دے ہی چکا ہوں، چوکیدار کا بیان بھی یہیں لے لیں۔"

"ہمیں تحریری بیان چاہیے۔ سمجھے! زیادہ چالاک نہ بنو!" سادہ لباس والا مجھ پر آنکھیں نکالتے بولا۔ "اور چوکیدار سے تمھیں بڑی ہمدردی معلوم ہوتی ہے!"

"میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ آپ اسے بھی لے گئے تو گھر کی رکھوالی کون کرے گا!"

انھوں نے میری بات نہ مانی۔ مجھے مجبوراً ان کے ساتھ چلنا پڑا۔ چوکیدار کو بھی ساتھ بٹھا لیا گیا۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا میں نے اُسے دلاسا دیا تو اس کے چہرے کی دہشت کچھ کم ہوئی۔

پولیس ہیڈ آفس میں لے جا کر مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ مجھے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ وہی سادہ لباس والا کمرے میں داخل ہوا اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جس کا دہانہ آگے کو نکلا ہوا تھا اور سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے وہ دونوں میرے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "وہ تو کہتے ہیں کہ تم بھی انھی کے ساتھی ہو!" سادہ لباس والا مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"میں ان کا ساتھی ہوتا تو آپ لوگوں کو کیوں بلاتا؟"

"لڑکی کے سلسلے میں تمھارا اور اس شخص کا جھگڑا ہو گیا تھا جا بتانا تمھیں جتاتا ہے چوکیدار نے بھی تصدیق کی ہے کہ تم لڑکی میں دلچسپی رکھتے ہو اور وہ شخص بھی!"

"اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے تو میں ان کا ساتھی کیسے ہو گیا؟ میں تو کل ہی قاہرہ سے آیا ہوں اور اس کا میرے پاس ثبوت ہے۔"

"ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے ہی تمھیں قاہرہ سے بلوایا تھا تاکہ پورٹ فواد بھیج سکیں۔" سادہ لباس والے کا ساتھی پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں نے ان لوگوں کو مجرم کہا تھا تو آپ نے مجھ سے ثبوت مانگا تھا!" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "انھوں نے کوئی ثبوت فراہم کیا آپ کو میرے بارے میں؟"

"ہم نے تمھارے گھر کی تلاشی ہی کب لی ہے! اس وقت تک یہ بات سامنے ہی نہیں آئی تھی۔ ممکن ہے تمھارے گھر کی تلاشی لے کر ہمیں ثبوت مل جائے۔"

مجھے وہ جدید ساخت کا اسلحہ یاد آیا جو میں نے اپنی اٹیچی میں رکھ دیا تھا اسی کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ معاملہ یہ رخ بھی اختیار کر سکتا ہے، میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا ورنہ ہرگز یہ قدم نہ اٹھاتا۔ میں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا: "تو انھوں نے اعترافِ جرم کر لیا ہے!" میرا انداز تصدیق طلب تھا۔

"تم ان کی فکر چھوڑ کر اپنی فکر کرو!" سادہ لباس والے نے مجھ پر طنز کیا۔ "ہم سختی بھی کر سکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ تم خود ہی اعتراف کر لو۔"

میں اپنی قوتوں کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے مشکل میں پڑ گیا ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ ایک عام آدمی جس کرب سے گزرتا ہوگا، مجھے اس کا کچھ اندازہ ہوا۔ میں نے انھیں راستی سے سمجھانا چاہا۔ "دیکھیں وہ محض انتقاماً مجھے پھنسا رہے ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔"

"اور تمھاری باتوں میں آ جائیں!"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں کہ میں نے تو قانون کی مدد کی ہے۔ اگر قانون کی مدد کرنے والوں کے ساتھ آپ کا یہی رویہ رہا تو پھر کون ایسے معاملوں میں پڑے گا! مجھے یقین ہے کہ انھوں نے میرے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔"

"تمھاری اطلاع کے لیے، ہم نے ان تینوں سے الگ الگ بیان لیا ہے اور انھیں آپس میں گفتگو کا موقع نہیں دیا۔ اس کے باوجود ان تینوں کے بیان میں ایک بات مشترک ہے کہ تم انھی کے ساتھی ہو۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے جناب کہ انھوں نے پہلے ہی سے یہ باتیں طے کر لی ہوں۔" میں نے بحث کی۔

"کیسی باتیں؟"

"یہی کہ اگر کھیل بگڑ جائے اور میری وجہ سے وہ لوگ پکڑے جائیں تو انھیں کیا بیان دینا ہے!"

"اب غالباً تم یہ کہو گے کہ اسی لیے انھوں نے پہلے سے تمھارے گھر میں کچھ ایسی چیزیں، کچھ ایسے ثبوت بھی رکھوا دیے جو بعد میں تمھارے گلے کا پھندا بن جائیں!" سادہ لباس والا اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا انھوں نے اپنے بیان میں کوئی ایسی بات بھی کہی ہے؟" میں نے بے جھجک پوچھ لیا۔

"انھوں نے کیا کیا کہا ہے، یہ ہم تمھیں بتانے کے پابند نہیں ہیں، سمجھ گئے! اس وقت تمھارے گھر کی تلاشی لی جا رہی ہوگی۔ کچھ دیر بعد معلوم ہو جائے گا کہ تمھارا بیان درست ہے یا ان لوگوں کا!" سادہ لباس والا پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "سر! آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ابھی کوئی قیاس آرائی قبل از وقت ہے۔" سادہ لباس والے کا ساتھی بولا۔ "اسے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔ وہ لوگ اس کے گھر کی تلاشی لے کر لوٹ آئیں تو بات کریں گے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "ہاں اس کی بھی تلاشی ضروری ہے۔ تم سمجھ گئے!" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"یس سر!" سادہ لباس والا بولا اور میری طرف بڑھ آیا۔ میری تمام جیبیں خالی کرا لی گئیں۔ پھر وہ دونوں مجھے اسی کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ بظاہر حالات میرے حق میں نہیں تھے۔ کچھ اور نہیں تو میرے گھر سے امریکی اسلحہ تو برآمد ہو ہی جاتا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ اور چیزیں بھی جو میں ہارڈی کے گھر سے لایا تھا۔ میری اٹیچی میں یہ چیزیں کیسے پہنچ گئیں، میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک اٹیچی میں میک اپ کا سامان بھی تھا، وہ بھی انھیں میری طرف سے مشتبہ کرتا۔ اس سے قطع نظر ہارڈی نے مجھ پر الزام عائد کیا تھا اسے ثابت کرنے کے لیے بھی اس

نے پہلے سے کوئی تدبیر کی ہو گی۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں بالکل نہ گھبرایا۔ امریکی ایجنٹوں نے میرے گرد جو جال بُنا تھا، میں اسے ایک ہی جھٹکے میں توڑ سکتا تھا۔ وہ کیا چاہتے تھے اور انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیا کیا! میرے لیے اب راز نہ تھا۔ پورٹ فواد میں کسی فلسطینی نمائندے کی بجائے کوئی اسرائیلی ایجنٹ ہوگا جسے میرے ذریعے وہ نقشہ مل جاتا۔ پھر وہ اسرائیلی ایجنٹ اس نقشے کو کسی طرح اپنی حکومت تک پہنچا دیتا۔ امریکی ایجنٹوں نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا تھا اگر میں راستے میں کہیں پکڑا بھی جاتا تو آن پر حرف نہ آتا۔ وہ اسکندریہ سے غائب ہو جاتے۔ منصوبہ تشکیل دیتے ہوئے انھوں نے تاریک پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کا ثبوت مجھے پیش آنے والے حالات تھے۔ یہ حالات میرے لیے ایک تجربے سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ میں اسی لیے فکر مند ہونے کی بجائے اپنی صلاحیتوں کو آزما رہا تھا۔ ایسی صلاحیتیں جو فطری تھیں اور ان کا میرے پُراسرار وجود سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر انجام کی فکر نہ ہو اور آدمی جب چاہے بساط الٹ سکے تو اس کا رد عمل یہی ہوتا ہے جو میرا تھا۔

دونوں سادہ لباس والے تقریباً ایک گھنٹے بعد لوٹے۔ مجھے ان کے چہرے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ سختی سے پیش آئیں گے۔ میں انھیں آتے دیکھ کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ ان دونوں کی نظریں مجھی پر تھیں۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے۔

"تمھارے علاوہ قاہرہ میں اور کون کون ہے؟" ایک نے سوال کیا۔

"تو آپ لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ میں واقعی امریکی ایجنٹ..."

"اِدھر اُدھر کی نہ اُڑاؤ! جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب دو!" دوسرا غرّایا۔

"جواب تو اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب کہ مجھے آپ کے مفروضے سے اتفاق ہو۔"

"یہ مفروضہ ہے!" چھوٹے بالوں والے نے اپنی جیب سے

بچے کا خدشات نکال کر میرے منہ پر مارے "یہ کاغذات تمھارے گھر سے برآمد ہوئے ہیں!"

"تو کیا یہ کاغذات مجھے پھنسانے کے لیے وہاں نہیں رکھے جا سکتے! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ..."

"پھر وہی بکواس! تم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہمیں بے وقوف بنا لو گے!"

"اور تمھاری اٹیچی سے جو سامان برآمد ہوا ہے اس کے بارے میں کیا جواب ہے تمھارا؟" دوسرے سادہ لباس والے نے فوراً ہی کہا۔ "ہمیں تمھاری ایک اٹیچی سے جدید ساخت کا امریکی اسلحہ بھی ملا ہے۔ اس سے بھی لاعلمی کا اظہار کر دو!"

"ہاں مجھے اس کے متعلق قطعی کوئی علم نہیں!" میں نے صاف انکار کر دیا۔

"اور اس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات ہوئے تو؟"

"ہوں گے کیسے! میں نے نہ وہ اسلحہ دیکھا، نہ چھوا۔" میرا لہجہ پُرسکون تھا۔ "لاعلمی اور بے دھیانی میں اپنے کپڑے وغیرہ نکالتے رکھتے میرا ہاتھ ان چیزوں سے بھی لگ گیا ہو تو مجھے خبر نہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھارے اعصاب بہت مضبوط ہیں، مگر ہم بھی دیکھیں گے کہ تم کب تک اپنی ضد پر اڑے رہتے ہو! اس کی انگلیوں کے نشانات لو!" چھوٹے بالوں والے نے اپنے ساتھی کو حکم دیا جو اس کا ماتحت معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔

"آپ غلط خطوط پر سوچ رہے ہیں۔" میں نے کمرے میں رہ جانے والے شخص کو مخاطب کیا۔

"احمقانہ باتیں نہ کرو!" وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر میری طرف جھکا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔ "کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے۔ گھبراتے نہیں۔" اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔ "اگر میں تمھیں یہاں سے نکال نہ سکا تو دوسری صورت بھی ہے۔ یہ لو۔" اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک کیپسول نکال کر مجھے دیا۔ "تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ دوسری صورت میں تمھیں کیا کرنا ہے۔ سسک سسک کر مرنے سے یہ کہیں بہتر ہے۔ یقین کرو تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اسے جلدی سے جیب میں رکھ لو ورنہ وہ آ جائے گا۔" وہ پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تم نے ان تینوں کو بھی یہ کیپسول پہنچا دیے ہیں؟"

"تو آپ بھی...؟"

"آہستہ بولو!" اس نے تیز سرگوشی کی۔

"بہت خوب!" میں ہنس پڑا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیپسول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے دور پھینک دیا اور اطمینان سے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ آپ واقعی اپنے ملک و قوم سے غداری کر رہے ہیں یا اپنی دانست میں میری زبان کھلوانے کے لیے آپ نے یہ حربہ آزمایا ہے۔ مگر میں اب بھی وہی کہوں گا۔ ان امریکی ایجنٹوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے انتقاماً یہ چکر چلایا ہے۔"

وہ بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ میرے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔ "اگر تم واقعی امریکی ایجنٹ نہیں ہو تو میں واقعی تمھاری ہمت اور حوصلے کی داد دوں گا!" اس کے لہجے میں نرمی آ گئی۔

"کیا آپ کو اب بھی میری بات پر یقین نہیں آیا؟"

"تمھاری باتوں پر یقین کرنے کو دل تو چاہتا ہے مگر تمھارے خلاف ثبوت بھی تو بہت ہیں۔ ہم نے قاہرہ سے بھی تمھارے بارے میں تصدیق کی ہے، دیکھو کیا جواب آتا ہے۔ یقین کرو کہ تم بے گناہ ثابت ہوئے تو ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔" وہ بدستور میرے چہرے پر نظر جمائے رہا۔ "تم نے اپنے بارے میں تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ طالب علم ہو، تمھارے والد احمد سلمان، زمالک میں رہتے ہیں اور یہ کہ رمسیس اسکواڈ شریر ان کا جنرل اسٹور ہے۔ یہی بتایا تھا نا تم نے؟"

"جی ہاں۔"

"اگر تمھارا بیان درست بھی مان لیا جائے تو بھی کئی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ انھوں نے اتنی جلدی کس طرح تمھارے گرد اتنا مضبوط جال بُن لیا؟ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے کہ تم بتانا بھول گئے ہو۔ اپنے ذہن پر زور دو، شاید یاد آ جائے۔"

"آپ سے میں نے صرف ایک بات چھپائی ہے۔"

"کیا؟" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہی بات رہ گئی تھی کہ اس لڑکی ایلس کو میں نے خود قریب

ہونے کا موقع دیا تھا اسی لیے اتنی جلدی سب کچھ ہو گیا۔"

"اس کی وجہ؟"

"مجھے اس پر شک ہو گیا تھا۔ کوئی لڑکی اتنی جلدی فاصلے طے نہیں کرتی۔ اسے کئی بار میری خواب گاہ اور نشست کے کمرے میں بھی تنہا رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں اس نے وہ چیزیں میری اٹیچی میں رکھ دی ہوں گی جہاں تک مجھے یاد آ رہا ہے، گذشتہ روز شام کو جب وہ آئی تھی تو میں نے اس کے پاس ایک ایئر بیگ بھی دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سیر کے لیے لے جانا چاہتی تھی۔ میں اسے خواب گاہ میں تنہا چھوڑ کر باتھ روم چلا گیا۔ میں نہا کر باہر آنے والا تھا کہ اس نے مجھ سے کہا، 'ابھی گھر ہو کر آتی ہوں، تم کپڑے بدل لو۔' وہ کچھ دیر بعد لوٹ کر آئی تو ایئر بیگ اس کے پاس نہیں تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایئر بیگ میں وہ چیزیں ہوں جو میری اٹیچی سے برآمد ہوئی ہیں! میں باتھ روم میں تھا۔ اس عرصے میں وہ یہ کام کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ میری نشست گاہ میں بھی اُن دونوں باپ بیٹی کو تنہا رہنے کا موقع مل چکا ہے۔ ان حالات میں اگر میرے گھر سے تلاشی کے دوران ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کم از کم میں تو بالکل مطمئن ہوں کیونکہ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔"

"تمھاری عمر غالباً ابھی بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی!" اس نے تصدیق طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"جی.... جی ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے مگر عمر کا اس معاملے سے کیا..."

"تم نے جتنے مدلل انداز میں اپنی صفائی پیش کی ہے اور جس قدر سکون و اطمینان کا اظہار کر رہے ہو، اس کی توقع کسی نوجوان سے نہیں کی جا سکتی! خاص طور پر کسی ایسے نوجوان سے جو محض ایک طالب علم ہو!" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "اگر تم اپنے حق میں اتنی مدلل باتیں نہ کرتے تو شاید مجھے تمھارے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑتی۔" اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "آ جاؤ اب!" اس نے بلند آواز میں کہا۔

اس کا ماتحت اندر آ گیا اور ایک کاغذ پر میری انگلیوں کے نشانات لیے۔

"صبح تک مجھے رپورٹ چاہیے۔" اس نے اپنے ماتحت کو تاکید کی۔

"یس سر!" یہ کہہ کر اس کا ماتحت چلا گیا۔

"سنو!" اس نے مجھے متوجہ کیا۔ "یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں، تم یہ کوشش نہ کرنا! ناحق پریشانی ہو گی تمھیں!۔ اس وقت تک تمھاری حیثیت ملزم کی رہے گی جب تک واقعی بے گناہ ثابت نہ ہو جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے لیے دشواریاں پیدا نہیں کرو گے۔" وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "جلد ہی تم سے ملاقات ہو گی۔" میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "اس وقت میں کچھ نہیں سنوں گا!"

وہ چلا گیا اور پھر کوئی نصف درجن افراد کمرے میں آ گئے۔ میں انھیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ ان میں سے دو نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ مجھے گھیرے میں لیے اس کمرے سے نکلے۔ کمرے کے باہر برآمدہ تھا۔ کچھ فاصلہ طے کر کے انھوں نے مجھ سے ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہونے کو کہا۔ میں ان کی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ انھوں نے مجھے اسی کمرے کے نیچے بنے ہوئے ایک تنگ سے تہ خانے میں بند کر دیا اور چلے گئے۔ انھوں نے اب میرے ہاتھ کھول دیے تھے۔

میں نے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ وہاں بے پناہ گرمی تھی اور اس کا سبب زیادہ روشنی کے بلب تھے۔ تہ خانے میں اتنی روشنی تھی کہ سوئی بھی گر جاتی تو اسے تلاش کرنا مشکل نہ ہوتا۔ وہاں صرف پختہ فرش تھا اور دیواریں۔ ایک جانب دروازہ نظر آیا تو میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ وہ باتھ روم تھا اور وہاں بھی تیز روشنی تھی۔ تہ خانے میں مجھے کوئی سوئچ نظر نہ آیا کہ روشنی گل کر دیتا۔ ذرا سی دیر میں میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ تہ خانے کے سوراخوں دار دروازے سے ہوا کا گزر تو تھا مگر صرف اتنا کہ میں سانس لے سکوں۔ گرمی کی وجہ سے میں نے قمیص اتار دی اور پھر بنیان بھی، لیکن پھر بھی بے سکون ہی رہا۔ تہ خانے کی چھت اتنی اونچی تھی کہ جگہ جگہ لگے ہوئے تیز روشنی کے بلب مجھ سے دور تھے۔ بلب توڑے نہ جا سکیں، اس کے لیے بھی احتیاط برتی گئی تھی، ان کی اطراف آہنی تاروں کے جال تھے۔ کسی شخص کے لیے اتنی شدید گرمی کے باوجود سو جانا ممکن نہیں تھا، پھر بھی میں پختہ فرش پر لیٹ گیا اور جوتے بھی اتار کر ایک طرف ڈال دیے۔ ابھی

میں موزے بھی رکھ دیے۔ وہ میری گھڑی بھی اتروا کر لے گئے تھے اس لیے میں وقت کا اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ مجھے فرش پر لیٹے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ تہ خانہ ایک دم تیز چیخوں سے گونج اٹھا۔ میں نے روشنی سے بچنے کے لیے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور ایک طرف کروٹ لیے پڑا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چیخوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

ذرا سی تلاش کے بعد مجھے ان تیز چیخوں کا راز معلوم ہو گیا۔ تہ خانے کی ایک دیوار میں چھت کے قریب سوراخ نظر آ گئے تو میں نے طویل سانس لیا۔ گرمی اور شور! ان کا مقصد یہی تھا کہ میں سو نہ سکوں۔ میرے جسم سے پسینا بہتا رہا اور میں تیز چیخیں سنتا رہا۔ پیاس لگی تو باتھ روم میں گیا۔ وہاں ایک بالٹی میں تھوڑا سا پانی تھا۔ میں نے ڈونگے سے پانی پیا اور باہر آ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق چھت کے قریب جو سوراخ تھے، ان کے پیچھے دیوار میں کوئی لاؤڈ اسپیکر چھپا ہوا تھا۔ اس لاؤڈ اسپیکر کا رابطہ کسی ٹیپ ریکارڈر سے ہوگا جو اوپر والے کمرے میں ہو سکتا تھا۔ وہ تیز چیخیں میری سماعت پر بہت گراں گزر رہی تھیں مگر میں انھیں سننے پر مجبور تھا۔

وہ سارا تماشا اذیت دہ ہونے کے باوجود مجھے دلچسپ لگا۔ میرے لیے اس میں ایک نیا پن ضرور تھا۔ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا، مجھے نہیں معلوم! میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے اور آنکھیں بند کیے تہ خانے کے فرش پر پڑا رہا جو میرے پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

پھر جانے کب وہ تیز روشنیاں بجھ گئیں اور چیخوں کی آوازیں بھی رک گئیں، مگر میں اسی طرح پڑا رہا۔ میری سماعت میں اب بھی وہی تیز چیخیں گونج رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد گرمی کا احساس ذرا کم ہوا تو میں نے کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ تہ خانے میں اب صرف ایک بلب جل رہا تھا، وہ بھی کم روشنی کا۔ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں نے سلاخوں دار دروازے کی طرف دیکھا۔ آنے والے وہی تھے جو مجھے اس تہ خانے میں بند کر گئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے قمیص وغیرہ پہننے کو کہا۔ میں نے بغیر کچھ کہے پسینے میں بھیگی ہوئی بنیان اور قمیص پہن لی اور پھر موزے اپنی پینٹ کی جیبوں میں ٹھونس کر جوتے بھی پہن لیے۔ وہ بہت چوکنا نظر آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے بھی وہ غافل نہ تھے۔ انھوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

وہ لوگ مجھے دوبارہ اسی کمرے میں تنہا چھوڑ گئے جہاں مجھ سے پوچھ گچھ ہوئی تھی۔ اب میرے ہاتھ پھر آزاد تھے۔ کمرے میں پنکھا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اس کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ پسینہ خشک ہوا تو جان میں جان آئی۔ میں نے پینٹ کی جیبوں سے موزے بھی نکال لیے اور انھیں پہن لیا۔ سماعت میں اب ان چیخوں کی بازگشت بھی ختم ہو چکی تھی جو مسلسل مجھے سنوائی گئی تھیں۔ شاید انھوں نے اسی لیے مجھے کچھ دیر وہاں اکیلا چھوڑ دیا کہ میں حواس میں آ جاؤں اور وہ مجھ پر کوئی نیا حربہ آزما سکیں۔ تہ خانے سے اس کمرے تک آتے ہوئے مجھے وقت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ برآمدے کے باہر دھوپ تھی۔ گویا پوری رات اور دن کا کچھ حصہ میں نے ان کی قید میں گزارا تھا۔ ممکن ہے کہ ہیلس، ہارڈی اور شیمع نے اعتراف جرم کر لیا ہو۔ سلاباس والوں نے تو یہی ظاہر کیا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا۔ اگر وہ اعتراف جرم کر چکے تھے تو اذیت سے بچ گئے ہوں گے ورنہ ان کا حشر بھی مجھ سے مختلف نہ ہوا ہوگا۔ مشرقی ممالک میں تو تھرڈ ڈگری کا استعمال بہت عام ہے۔ مجرم آسانی سے زبان نہیں کھولتے اور کچھ یہ بھی ہے کہ پولیس بھی زیادہ کشٹ نہیں پالتی۔ ایسا ہی کچھ معاملہ یہاں بھی معلوم ہو رہا تھا۔ امریکی ایجنٹوں کو قانون کے حوالے کرانے کے بعد اب مجھے ان کی طرف سے کوئی فکر نہ تھی۔ بقیہ معاملات سے وہ لوگ خود نمٹ لیتے جن کی یہ ذمہ داری تھی۔ مجھے تو صرف اتنا خیال تھا کہ طاقت کا استعمال کیے بغیر کسی طرح میں وہاں سے نکل جاؤں۔

اس کمرے کے درمیان ایک بڑی سی میز رکھی تھی۔ میز کی ایک طرف صرف ایک کرسی پڑی تھی اور دوسری جانب سامنے دو کرسیاں تھیں۔ گزشتہ رات میں یہیں بیٹھا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا کرسی پر جا بیٹھا اور میز کے نیچے ٹانگیں پھیلا دیں۔ مجھے آرام سے بیٹھے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ کمرے میں داخل ہونے والے تین افراد تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص میرے لیے آشنا تھا۔ یہ چھوٹے بالوں والا وہی شخص تھا جس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے والے کی شخصیت متاثر کن تھی۔ نیلے رنگ کا سوٹ اس کے جسم پر تھا اور گلے میں ٹائی تھی۔ سوٹ والے کے بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے ایک سیاہ فام شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی اور سر گھٹا ہوا تھا۔ جسم پر ایسا لباس تھا جو عموماً فری اسٹائل کشتیاں لڑنے والے پہنتے ہیں۔

انھیں آتے ہوئے دیکھ کر میں نے صرف اتنا کیا کہ کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سامنے والی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ سیاہ فام شخص ان دونوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"تو انسپکٹر، یہ ہے وہ نوجوان!" سوٹ والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے چھوٹے بالوں والے سے کہا۔

"جی ہاں سر!"

"میں نے سنا تھا کہ تم کسی طرح قابو میں نہیں آ رہے۔" سوٹ والا مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سوچا کہ تم سے مل ہی لوں۔ انسپکٹر نے تمھاری بڑی تعریف کی ہے۔" اس کا لہجہ شائستہ تھا۔

"یہ کل سے مجھ پر مہربان ہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہوں۔" سوٹ والے کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس کی نگاہ میرے چہرے پر تھی۔ "احمد سلمان نے تو تمھیں اپنی تحویل میں لینے سے انکار کر دیا۔" وہ ایک دم بولا۔ "اس نے تو کچھ اور ہی بیان دیا ہے۔ تم اس کے گمشدہ بیٹے سے ملتے ہو جب ہارون نام تھا اس کا! اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ایک بیٹا تھا جو کچھ دن کے لیے جانے کیوں گھر لوٹ آیا تھا۔ تم تو جانتے ہو گے اسے! اگر نہ جانتے تو احمد سلمان کے متعلق اتنی تفصیلات کا علم تمھیں کیسے ہوتا! جانتے ہو نا تم احمد سلمان اور ہارون کو؟"

"ہاں جانتا ہوں۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "مگر وہ مجھے نہیں جانتے۔"

"ارے تم نے یہ کیا کہہ دیا؟ احمد سلمان تمھارا باپ ہے۔ تم نے یہی تو بتایا تھا۔ مجھے تو یقین ہے اس بات پر! احمد سلمان یقیناً جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے غلط بیان دیا ہے کہ ہارون کے سوا اس کا کوئی بیٹا نہیں۔"

"میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ غیر ضروری گفتگو نہ کریں۔" میں نے سوٹ والے سے نرمی کے ساتھ کہا۔

وقت کے سب سے بڑے جعلساز کی سرگزشت

جرم زادہ

وقت کے مایہ ناز قلم کار ایچ اقبال
کا ایک تہلکہ خیز سلسلہ

ہزاروں قارئین کی پسندیدہ تحریر

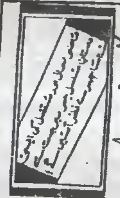

وقت اور حالات کے شعلے اپنی تند زبانیں لیے ہر وقت شکار کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے والا ہر شخص ان شعلوں کی لپیٹ میں آتا ہے۔ بعض لوگ ان شعلوں میں جل کر کندن ہو جاتے ہیں اور کچھ ان کی تپش سے جھلس جاتے ہیں۔

11 - مزنگ روڈ اسلام پورہ لاہور
گل قریشی پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
فون: 7229762 - 7248599

"تم کہتے ہو تو کوئی اور بات کر لیتے ہیں... ہاں یاد آیا! مجھے تمہارے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مارشل آرٹ میں تم اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مجھے بھی بڑا شوق ہے۔ کیا تم میری خاطر اپنے فن کا مظاہرہ کر سکو گے؟"

"آپ غالباً اسی لیے انہیں ساتھ لاتے ہیں۔" میں نے سیاہ فام شخص کی طرف دیکھا۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھے۔"

"اگر آپ نے مجھے مجبور ہی کر دیا تو میں اپنی مدافعت ضرور کروں گا لیکن بہتر یہ ہے کہ ایسا نہ ہو۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ آدمی کسی روح سے نہیں لڑ سکتا!" میں سوٹ والے کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"بہت اچھے جا رہے ہو!" سوٹ والا ہنس پڑا۔ "بچنے کی اب یہی آخری صورت رہ گئی ہے کہ تم خود کو پاگل ظاہر کرو مگر کسی پاگل کی اداکاری مشکل ہوتی ہے۔ تمہیں پہلے ہی ان خطوط پر سوچنا چاہیے تھا۔ اب یہ اداکاری نہیں چلے گی۔"

"تو آپ کو یقین نہیں آیا کہ میں ایک روح ہوں!" میں بدستور مسکرا رہا۔ "آپ اسے اداکاری سمجھ رہے ہیں! حالانکہ آپ سے اور یہ جو انسپکٹر صاحب بیٹھے ہیں ان سے عمدہ اداکاری مجھے نہیں آتی! پھر یہ کہ روحوں کو اداکاری سے کیا کام!"

"تم نے سنا انسپکٹر!" وہ ہنس کر برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوا۔

"جی ہاں سر! میرا خیال ہے کہ تھرڈ ڈگری..."

"نہیں!" سوٹ والے نے انکار میں سر ہلایا۔ "ابھی نہیں۔ میں کچھ دیر اس سے اور بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "ایک بات بتاؤ! کسی روح کو اسلحہ کی کیا ضرورت ہے؟ روح تو بغیر اسلحہ کے بھی سب کچھ کر سکتی ہوگی! اور پھر جسم کی بھی روح کو کیا حاجت ہے!"

"یہ روحوں کے معاملے ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکتے!" میں نے یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہا ہے۔ میں مزید بولا۔ "مجھے آپ کی اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ روح کو جسم کی حاجت نہیں ہوتی۔ مجھے بھی نہیں لیکن جسم اچھے لگتے ہیں۔ جسم تو روح کا مکان ہے۔ پھر اگر میں اپنے مکان میں آ گیا تو مجھے اختیار ہے۔ میں جب چاہوں اس مکان کو چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ ایک بات اور بتاؤں آپ کو یہ مکان بھی نظر کا فریب ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ جو لوگ مر جاتے ہیں ان کی روحوں سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں رہتا۔ ان کا وجود صرف چند یادوں تک محدود رہ جاتا ہے۔ ان یادوں کو آپ دیکھ نہیں سکتے نہ کسی کو مجسم دکھا سکتے ہیں لیکن اس مرنے والے کی روح چاہے تو کسی بھی جسم میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ در اصل وہ جسم نظر کا دھوکا ہوتا ہے، حقیقتاً اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ باتیں میرے سوا کوئی اور آپ کو نہیں سمجھا سکتا کیونکہ میں انہیں ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ میرا جسم بھی فریب نظر ہے اور یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں جب تک چاہوں آپ کو میرا جسم نظر آتا رہے اور جب چاہوں نظر نہ آئے۔ آپ کہیں تو میں اس کا عملی ثبوت پیش کروں؟"

"سر! یہ وقت ضائع کر رہا ہے۔" میرے چپ ہوتے ہی انسپکٹر بول اٹھا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" سوٹ والے نے تائید کی۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ وہ سیاہ فام شخص کی طرف مڑا۔ انسپکٹر نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ اب ان میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہ تھا۔

"ادھر دیکھیں جناب!" میں نے سوٹ والے کو مخاطب کیا۔ "میرا جسم کہاں گیا؟" یہ کہتے ہوتے میں نے اپنے آپ کو ان کی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ ان تینوں ہی کے چہروں پر وحشت برسنے لگی۔ یہ میں نے مجبوراً کیا تھا۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا کہ میں اپنے جسم کو ان کی نظروں سے چھپا لیتا اور نادیدہ بن جاتا۔

"اور اب دیکھیے، میں پھر آپ کو نظر آنے لگا!"

"تم... تم کوئی شعبدہ باز ہو!" سوٹ والا بڑی دیر میں بول سکا۔

"نہیں!" میں مسکرایا۔ "میں وہی ہوں جو کہہ چکا ہوں۔ آپ بیٹھیں تو میں اس کے اور بہت سے ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔"

سوٹ والا دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے انسپکٹر اور سیاہ فام شخص کے چہروں پر بھی خوف کے آثار دیکھے۔ میں نے سارے معاملے کو ایک اور ہی شکل دے دی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

"سر! یہ... یہ نظر بندی بھی ہو سکتی ہے۔" انسپکٹر نے سوٹ

والے سے یوں کہا جیسے خود بھی اس طرح اپنے دل کو تسلی دے رہا ہو۔ وہ بھی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ "رات سے اب تک جو واقعات گزر چکے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ ہمیں بار بار دھوکا دیتا رہا ہے۔ اب یہ شعبدہ دکھا کر ہمیں متاثر کرنا چاہتا ہے۔"

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے انسپکٹر!" سوٹ والا بھی سنبھل گیا۔ انسپکٹر اسے "سر" کہہ رہا تھا اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ کوئی بڑا افسر ہے۔ اس نے مزید کہا۔ "کچھ دیر کو اس نے واقعی مجھے بھی چکرا دیا تھا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو یہ اذیت کیوں برداشت کرتا!"

"تو کیا آپ کا خیال ہے میں اس تہہ خانے سے نکل نہیں سکتا تھا!" میں ہنسا۔

"پھر کیوں نہیں نکلے؟" سوٹ والے نے مجھے گھورا۔

"روحیں خود کو ظاہر کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ اس سے عام آدمیوں کے لیے بڑے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن واقعات کی کوئی توجیہہ نہ کی جا سکے وہ پریشان کن ہوتے ہیں۔ آپ ہی بتائیں کہ میں اس تہہ خانے سے فرار ہو جاتا تو کتنی مشکلات پیدا ہو جاتیں! آپ لوگوں کے لیے! ان غریبوں کی نوکری الگ خطرے میں پڑتی جو میری حفاظت پر مامور کیے گئے تھے۔"

"تم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ جب چاہو فرار ہو سکتے ہو..."

"فرار کا لفظ آپ نے غلط استعمال کیا!" میں نے سوٹ والے کی بات کاٹی۔ "میں جب چاہوں یہاں سے جا سکتا ہوں، مجھے کوئی نہیں روک سکتا!"

"پھر کیا دشواری ہے، چلے جاؤ!" سوٹ والے نے سیاہ فام شخص کو اشارہ کیا۔

"آپ سمجھتے ہیں یہ مجھے روک لے گا! ایک روح کو! میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت یہ شخص اندر سے بے حد خوف زدہ ہے اور دعا کر رہا ہے کہ کسی طرح آپ اسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔ اس کے پاؤں بھی کانپ رہے ہیں!"

"نن... نہیں... بل... بالکل نہیں جناب!" سیاہ فام شخص کسی کوک بھرے کھلونے کی طرح بول اٹھا۔

"دیکھا آپ نے!" میں نے سوٹ والے سے کہا۔ "خیر اسے چھوڑیں یہ تو یوں بھی توہم پرست ہے، مگر آپ تو ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے، آپ کا کوئی عقیدہ نہیں! پھر آپ کیوں ڈر گئے تھے؟ آپ اس وقت کیوں یہ سوچ رہے ہیں کہ کہیں واقعی یہ کوئی پراسرار معاملہ ہو!" میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔

"تم... تم..." سوٹ والا ہکلا گیا۔ اس کے چہرے سے اندرونی کیفیت کا اظہار ہونے لگا۔

"اور انسپکٹر تم جو خود کو بہت ذہین سمجھتے ہو، میں بتاؤں کہ اس وقت تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"نہیں!" انسپکٹر نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ اپنے افسر کی حالت دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا خیال ہے انسپکٹر کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ ہرگز ناانصافی نہیں کی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسپکٹر طالب تم سے زیادہ ذہین ہے۔" سیاہ فام شخص اور انسپکٹر نے تب مجھے واقعی ایک روح تسلیم کر لیا مگر سوٹ والے کا ذہن اب بھی اس مفروضے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "دیکھیے جناب! انسان کی عقل ابھی تک بے شمار اسرار سے پردہ نہیں اٹھا سکی۔ مختلف مذاہب نے مختلف زمانوں میں ان اسرار کو سمجھانے کی کوشش تو کی ہے مگر انسانی ذہن بڑا باغی ہے۔ بغاوت اس کی سرشت میں ہے۔ آپ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ آپ عقل کے آدمی، بغیر کسی عقلی دلیل کے آپ کوئی بات تسلیم نہیں کرتے۔ یہ واقعہ جو ابھی آپ کو پیش آیا اور آ رہا ہے اس کا بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک جسم نظر آتے آتے آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ آپ نے یہ تو ٹھیک سوچا کہ ایک ٹیلی پیتھ دوسرے آدمی کا ذہن پڑھ سکتا ہے لیکن وہ غائب کیسے ہو جائے گا! ہو سکتا ہے آپ کوئی شعبدہ کہہ کر نظر انداز کر دیں، مگر یہ شعبدہ ہے تو اس کی وجہ؟ خیر اسے بھی چھوڑیں۔ میں اپنے روح ہونے کا ایک اور ثبوت پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کو فضا میں پرواز کر کے دکھاتا ہوں کہ روحیں اس پر قادر ہوتی ہیں۔ پرواز کرتے ہوئے کبھی میں آپ کو نظر آؤں گا، کبھی غائب ہو جاؤں گا۔"

میں نے جو کچھ کہا تھا اس کا عملی مظاہرہ کیا تو سیاہ فام شخص اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ گر کر بیہوش ہو گیا۔ انسپکٹر نے خوف

نے سب کچھ دیکھا ہے۔ سوٹ والا بھی حیرت بھری نظروں سے کمرے میں میرے وجود کو ڈھونڈ رہا تھا اور میں دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

"میں اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ چکا ہوں مگر آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ ادھر ہی دیکھتے رہیں کرسی کی طرف! تاکہ آپ مجھے ظاہر ہوتے دیکھ سکیں۔ یہ کوئی شعبدہ نہیں ہے!"

"حیرت انگیز!" سوٹ والے نے مجھے کرسی پر آرام سے بیٹھے ہوئے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

"آنکھیں کھول لیں انسپکٹر! اب خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اور میں یوں بھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ اگر میری باتوں پر یقین کر لیا جاتا تو میں نہ خود کو ظاہر کرتا اور نہ کوئی ثبوت پیش کرتا۔ میں کوئی بدروح نہیں کہ خلقِ خدا کو پریشان کروں۔ میرا یقین نیکی پر ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں یہاں سے کب کا چلا گیا ہوتا۔" میرے کہنے پر انسپکٹر نے آنکھیں کھول دیں تو میں بولا۔ "آپ کی کرسی کے پیچھے وہ شخص بے ہوش پڑا ہے جسے مجھ سے دو دو ہاتھ کرانے کے لیے لایا گیا تھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اسے یہاں سے ہٹوا دیں تاکہ میں چند ضروری باتیں سکون سے کر سکوں۔" میں نے تصدیق طلب انداز میں سوٹ والے کی طرف دیکھا۔

"ہاں... ہاں جلدی کرو۔" اس کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ سوٹ والے نے میری بات کی تائید کر دی۔ انسپکٹر اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے گرتے گرتے بچا۔ میں نے اسے ہدایت بھی کی کہ ہوش میں آتے ہی سیاہ فام شخص کو سمجھا دیا جائے کہ وہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ ذرا دیر میں بے ہوش سیاہ فام کو وہاں سے چار افراد اٹھا کر لے گئے۔ انسپکٹر پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ میں اس دوران کچھ نہ بولا۔ سوٹ والا کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔

"اب آپ کو یقین آ جانا چاہیے کہ بہت سی چیزیں میرے اختیار میں تھیں مگر میں نے اپنا اختیار استعمال نہیں کیا۔" میں نے سوٹ والے کو مخاطب کیا۔ "کچھ دیر کو آپ ہی کی بات تسلیم کر لیتا ہوں کہ شعبدہ گر ہوں۔ تو یہ غور کریں کہ میں اپنی شعبدہ گری سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے بقول آپ کے فرار ہو جاتا پھر؟ بتائیں میرے لیے یہ آسان تھا یا نہیں؟"

"ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ وہ بیان کرو!" سوٹ والا اپنے حواس پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ "تم سے مجھے اتفاق ہے۔ اکثریت توہم پرستوں کی ہے۔ میں ذاتی طور پر ان باتوں کا قائل نہیں ہوں لیکن... مگر... جو کچھ میں نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسے دیکھ کر حیران اور خوف زدہ ہوں۔ ممکن ہے کبھی انسان روح کا عقدہ بھی کھول دے لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔ کائنات کے بہت سے اسرار فی الحال انسانی ذہن کی دسترس سے باہر ہیں لیکن کیا خبر کسے معلوم کہ آنے والے لوگ ہماری حماقتوں پر ہنسیں کہ ہم اتنی ذرا ذرا سی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ خیر تم بتاؤ کہ اب کیا چاہتے ہو؟"

"میرا کچھ سامان آپ کے محافظ خانے میں ہے، وہ منگوا دیں!"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"مطلب یہ کہ میں اب جانا چاہتا ہوں!"

"لیکن ہم... ہم تمہیں کیسے رہا کر سکتے ہیں! یہ معاملہ انتہائی اہم نوعیت کا ہے کیوں کہ اس میں دو غیر ملکی بھی ملوث ہیں۔ اور... اور تم... تم بھی تو...!"

"دیکھیں مجھے مجبور نہ کریں کہ تشدد پر اتر آؤں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "میں خود بھی جا سکتا ہوں تو محافظ خانے سے اپنا سامان لے کر جا سکتا ہوں، مجھے کوئی نہیں روک سکے گا لیکن اس طرح ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ آپ کی حیثیت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اپنے افسرانِ بالا کے سامنے آپ کو اس سلسلے میں جواب دہ ہونا پڑے گا کہ وہ شخص کیسے فرار ہو گیا جس پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا شبہ تھا؟ سوچیں کہ یہ صورت حال پیش آئی تو آپ کی بدنامی ہو گی یا نہیں؟"

"تو تم مجھے ایک غیر قانونی کام کی ترغیب دے رہے ہو، یہ نہیں ہو سکتا!"

"تو پھر وہ ہو گا جو آپ کے لیے اس سے بھی زیادہ افسوس ناک ہو گا! اسے دھمکی نہ سمجھیں، یہ حقیقت ہے۔"

"لیکن تم میری مجبوری بھی تو سمجھو۔" وہ نرم پڑ گیا۔ "میرے پاس تمہاری رہائی کا کیا جواز ہے؟"

"جواز؟" میں مسکرایا۔ "کیا مجھے آپ جیسے شخص کو یہ بھی بتانا پڑے گا! خیر... یوں سمجھیں! اس معاملے کو کہ میں نے کچھ غیر ملکی ایجنٹوں کی نشان دہی کی، پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان غیر ملکی ایجنٹوں نے مجھ پر اپنا ساتھی ہونے کا الزام لگایا۔ آپ نے تفتیش کی اور یہ الزام غلط ثابت ہوا۔ اتفاق سے یہی حقیقت بھی ہے۔ بہرحال الزام غلط ثابت ہونے پر آپ نے مجھے رہا کر دیا کیوں کہ میں ایک محبِ وطن شہری تھا۔ اب فرمائیں؟"

"پھر تمہیں وہ چیزیں کیوں چاہئیں جو محافظ خانے میں ہیں؟ انہی میں جدید ساخت کا امریکی اسلحہ بھی ہے جو تمہاری اٹیچی سے برآمد ہوا ہے۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں!"

"صرف میری انگلیوں کے نشانات نہیں بلکہ ہارڈی کی انگلیوں کے نشانات بھی ان پر ملے ہیں! آدھا سچ نہ بولیں۔ فنگر پرنٹس ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزری!" میرے لہجے میں چبھن تھی۔

"تمہیں کس نے بتائی یہ بات؟" وہ بے خیالی میں کہہ گیا۔

"تعجب ہے کہ آپ ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکے!"

"ہاں کوشش تو کر رہا ہوں سمجھنے کی۔" اس نے طویل سانس لیا۔ "بہرحال... اگر اس اسلحہ پر ہارڈی کی انگلیوں کے نشانات بھی ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا! وہ اسلحہ تمہاری اٹیچی سے برآمد ہوا ہے اور اب تمہیں وہ چاہیے بھی! یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ تم بھی امریکی ایجنٹ ہو۔"

"نتائج پر اتنی جلدی جست لگانا اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔ "وہ اسلحہ مجھے کسی اور غرض سے چاہیے۔"

"وہ غرض بیان کرو!" اس نے مجھے زچ کرنا چاہا۔

"میں نے خود کو آپ کے سامنے ظاہر کر دیا ہے۔ میرے خیال میں یہی بہت ہے۔ ہر بات سے پردہ اٹھانا مناسب نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اسلحہ ملک دشمن عناصر کے ہتھے نہیں چڑھے گا۔ وہ شر پھیلانے کے لیے نہیں بلکہ رفعِ شر کے لیے استعمال ہو گا۔ پھر میں نے... نے بتایا کہ گزشتہ رات خود میں نے ہارڈی کے گھر سے وہ اسلحہ لایا تھا اور اس کے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔"

"مگر سوال تو یہ ہے کہ تمہیں اسلحہ کیوں چاہیے؟" وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

"ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کے لیے!"

"کیا ایک روح کو اسلحہ کی ضرورت بھی ہے؟" اس نے طنز کیا۔

سوٹ والا اپنے خیالات و نظریات میں اس قدر پختہ تھا کہ مجھے ایک بار پھر اپنی ذہنی قوت بروئے کار لانا پڑی۔ وہ وقتی طور پر خوف زدہ تو ہو جاتا مگر مجھے روح تسلیم نہ کرتا۔ میرے طاقتور ذہن نے اس کے دماغ کو جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے بڑی مدافعت کی مگر زیر ہو ہی گیا۔

"تم یقیناً روح ہو... روح... اور تم نے جو کچھ کہا... کیا ٹھیک تھا۔" وہ میرے ذہن کے زیر اثر بڑبڑانے لگا۔ دوسری کرسی پر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا انسپکٹر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ سوٹ والا بڑبڑاتا رہا۔ "تم ہو... کھو گئے وہیں ہو گا کہ اسی شام میری بستری ہے اور میرٹ... محکمے کی... بھلائی بھی... اس طرح معاملہ ختم ہو جائے گا... تم امریکی ایجنٹ نہیں... جھوٹے ہیں وہ!... تمہارا مشورہ بالکل درست ہے... مجھے یہی کرنا چاہیے اور یہی کروں گا!"

میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا اور پھر وہی ہوا جو میری خواہش تھی۔ محافظ خانے سے وہ سامان منگوا کر میرے حوالے کر دیا گیا جو میری اٹیچیوں سے برآمد ہوا تھا۔ وہ کاغذات جو انہیں میری نشست گاہ سے ملے تھے، قالین کے نیچے، ان کو بھی ہارڈی کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔

"میں فی الحال کچھ دن اسی جگہ میں قیام کروں گا مگر مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں!" میرے لہجے میں حکم تھا۔

"اب آپ کو اس معاملے میں قطعی پریشان نہیں کیا جائے گا۔" سوٹ والے کا لہجہ بدل گیا تھا۔ "آپ جب تک اپنے گھر پہنچیں گے، وہاں سے پولیس کو بھی ہٹا لیا جائے گا۔ ہم پر اور ہمارے محکمے پر آپ کا یہی احسان کیا کم نہیں کہ آپ کی وجہ سے ایک بڑی سازش پکڑی گئی۔ آپ کی ہدایات کے مطابق ہم ان پُراسرار واقعات کا ذکر بھی کسی سے نہیں کریں گے۔"

میں پولیس ہیڈ آفس سے سوٹ والے کی کار میں ساحل ابھی پہنچا۔ کار اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میرے شانے سے ایک بیگ لٹکا ہوا تھا جس میں تمام سامان تھا۔ اس بیگ کا بندوبست بھی سوٹ والے ہی نے کیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کس عہدے پر ہے۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے جب میں اپنے مکان کے گیٹ میں داخل ہوا۔ برابر والے گھر کے پھاٹک پر تالا پڑا تھا اور دو مسلح سپاہی گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں انہیں نظرانداز کر گیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ میرے گھر کا چوکیدار اپنی کوٹھری سے اسی وقت نکلا جب میں برآمدے کی طرف بڑھا۔ وہ لپک کر میرے قریب آ گیا۔ "کیا بات ہے؟" میں رک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ... وہ جناب... یہاں پولیس...!"

"غیر ضروری باتیں نہ کرو! مجھے بھی سب کچھ معلوم ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو اور اپنی کوٹھری میں جاؤ!"

"مگر... لیکن وہ... وہ جناب!" وہ سٹپٹا گیا۔ "وہ آئے تھے... وہ... کہہ رہے تھے کہ مکان خالی کرانا ہے!"

"کون مالک مکان؟"

"جی ہاں جناب! انہیں معلوم نہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ پولیس آپ کو...؟"

"ٹھیک ہے، وہ اب آئیں گے تو میں بات کر لوں گا۔ یہ بتاؤ وہ بٹلر بھی ہے یا چلا گیا؟"

"اندر ہے جناب! آج صبح آیا تو پھر پولیس والوں نے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیا۔ مجھ سے بھی کہہ دیا تھا کہ اپنی کوٹھری میں رہوں، باہر نہ نکلوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے گئے ہیں پولیس والے۔"

"اچھا اب تم جاؤ! اب یہاں پولیس والے تمہیں پریشان کرنے نہیں آئیں گے۔"

"بہت بہتر جناب!" وہ واپس کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

میں اندر پہنچا تو بٹلر بھی گھبرایا ہوا تھا۔ اسے بھی میں نے تسلی دی اور خورد و نوش کا بندوبست کرنے کو کہا۔ وہ بازار سے سودا لینے چلا گیا تو میں نے سب سے پہلے اپنی اٹیچیوں کا جائزہ لیا۔ وہ کھلی پڑی تھیں۔ کپڑے بُری طرح ٹھونسے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں ترتیب سے رکھا جو سامان میں بیگ میں ساتھ لایا تھا اسے پھر کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ پھر میں غسل خانے میں گھس گیا۔ نہا کر اور لباس تبدیل کرنے کے بعد ہی تر و تازہ دم ہوا۔ اس دوران بٹلر ناشتا بنا کر لے آیا۔ میں صبح سے بھوکا تھا۔ ڈٹ کر ناشتا کیا، پھر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ معاملات میری توقع کے مطابق نمٹ گئے۔ شوگران سے نکلنے کے لیے مجھے اپنی قوتیں استعمال کرنی پڑیں۔ حالات نے کچھ ایسی ہی صورت اختیار کر لی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا مگر مجھے ملال ضرور تھا۔

اسکندریہ میں مزید چند روز سکون سے گزرے۔ اسی دوران مالک مکان آیا اور میں نے اسے مطمئن کر کے بھیج دیا۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گیا کہ میں نے کچھ جرائم پیشہ افراد کو پکڑوا دیا جو برابر والے گھر میں رہتے تھے۔ اصل واقعہ کی میں نے اسے ہوا بھی نہ لگنے دی۔ اس عرصے میں مجھے گھومنے پھرنے کا خوب موقع ملا۔ میں شام کو ساحل سمندر پر دیر تک اکیلا ٹہلتا رہتا۔ جب بالکل ہی اندھیرا ہونے لگتا تو میں واپس آتا۔ میں کنارے کنارے دور تک نکل جاتا اور پھر لوٹ آتا۔ اس دوران بھی میں اپنے دشمنوں سے غافل نہیں رہا۔ اب میرے پاس اُن سے نمٹنے کو بہت کچھ تھا۔ میرے کوٹ کی جیبوں میں خطرناک ہتھیار رہتے۔ جدید ساخت کے امریکی ہتھیار! چھوٹی گیند کے برابر کے پلاسٹک بم، بارہ بور کا ریوالور جس پر سائیلنسر چڑھا ہوتا اور اسی طرح کے دوسرے حربے۔

میں نے وہ چند روز سیر کرتے اور سوچتے گزارے۔ وہاں میرے اعصاب کو بڑا سکون ملا۔ اس عرصے میں کئی لڑکیوں نے میرے قریب آنے کی کوشش کی مگر خواہش کے باوجود میں نے انہیں دور ہی رکھا۔ کچھ سمندر کے کنارے ملیں، کچھ ہوٹلوں میں اور کچھ دیگر تفریحی مقامات پر۔ مگر بات تعارف کی حد سے آگے نہ بڑھی۔ لڑکیوں کی دلچسپی کا سبب مجھے معلوم تھا۔ میری وجاہت انہیں میری طرف متوجہ کر لیتی تھی اور پھر جب میں ان سے بے رخی برتنے لگتا تو اُن کی انا کو ٹھیس لگتی۔ وہ مجھے مغرور جان کر نظر انداز کر دیتیں۔ یہاں کے تلخ تجربے نے مجھے بہت محتاط رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں حتی الامکان کسی ایسے تلخ تجربے سے بچنا چاہتا تھا۔ پھر یوں بھی ہے کہ کوئی ایسا ملا ہی نہیں جو دامن دل تھام لیتا۔ ہاں اس عرصے میں صالحہ ضرور یاد آتی۔ وہ بھی تو ایک ایسی تھی جسے میں کوشش کے باوجود نہ بھلا سکا۔ وہ جانے بغداد میں ہو گی یا بصرے میں۔ اسے تو خبر بھی نہ ہو گی کہ کسی نے اُسے اتنا چاہا تھا، اتنا کہ شاید اُس کا محبوب بھی نہ چاہتا ہو گا۔ عشق کا زخم بڑا کاری ہوتا ہے، زندگی بھر یہ زخم نہیں بھرتا۔ اسی زخم کی کسک مجھے بھٹکاتے پھرتی۔ وہ ایک یہودی سرجن کی جگر سے لگی اور اس کو چاہتی تھی پھر بھلا میں دیوار کیوں بن جاتا! وہ تو ناداننگی میں مجھے اپنا محبوب جان کر قریب آ گئی تھی۔ میں نے اپنے دل کو تو سمجھا لیا مگر دل؟ دل کچھ نہیں سنتا۔ کوئی دلیل، کوئی حجت، کوئی جواز اُسے مطمئن نہیں کر سکتا۔ دل اور ذہن کا معاملہ بالکل جُدا ہے اور صالحہ کے معاملے میں تو میرے ذہن نے بھی مجھ سے بغاوت کر دی تھی۔ میں بار بار اُس کافر کو بھلانے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔ تیسرے دن میں نے اُسے بھولنے کی خاطر خود کو بھلانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے بھیڑیوں کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ قاہرہ دور تو نہیں ہے۔ وہاں میرے دشمن بھی موجود ہیں۔ وہ مجھے اتنی فرصت نہ لینے دیں گے کہ صالحہ یاد آ سکے۔ پھر میں اپنے دشمنوں سے نمٹ کر ہندوستان چلا جاؤں گا۔ ایک اجنبی سرزمین کی طرف! ہندوستان میرے لیے نیا ملک تھا اور وہاں میں اب تک نہیں جا سکا تھا۔ میری ماں کا سراغ بھی تو وہیں مل سکتا تھا۔ جس شام میں نے یہ فیصلہ کیا، مجھے بڑی تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سمندر کے کنارے کنارے ٹہلتا ہوا دور نکل آیا اور ایک جگہ رک کر ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنے لگا۔

سورج ڈوب گیا اور ہلکا ہلکا اندھیرا بھی پھیلنے لگا مگر میں اُسی جگہ کھڑا رہا۔ میں اُس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ اس سمندر نے کتنے زمانے دیکھے ہیں، میری ہی طرح کتنے لوگ تنہا اس کے کنارے آ کر کھڑے... میں اس سے آگے نہ سوچ سکا اور میرے اعصاب ایک دم جھنجھنا اٹھے

جیسے آج ہی تو ہنگاموں کی خواہش کی تھی۔ کیا خواہشیں اتنی جلدی بھی پوری ہو جاتی ہیں! میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میں نرم ریت پر گر گیا۔ دوسرا جھٹکا لگنے سے پہلے میرے ذہن کا خودکار حفاظتی نظام متحرک ہو گیا۔ میں گھٹنوں کے بل اٹھا اور دور مجھے ایک ہیولا سا نظر آیا۔ میرا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں رینگ گیا۔ اٹھتے اٹھتے میں نے ریوالور نکال لیا۔ وہ ہیولا بہرحال میرے ریوالور کی رینج میں تھا۔ میں نے فائر کر دیا۔ وہ زمین پر گرا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔ دور تک اس کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ ذرا قریب ہونے پر میں نے اتنا محسوس کر ہی لیا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اب وہ اٹھ کر بھاگ رہی تھی۔ میں نے بھی بھاگتے بھاگتے دوبارہ اس کا نشانہ لیا۔ وہ لہرائی مگر اس بار بھی شاید بچ گئی۔ وہ سیدھی ایک سمت میں نہیں بلکہ لہراتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن میں اب کوئی غیر محتاط قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے ذہن کے خودکار حفاظتی نظام کو بحال رہنے دیا۔ اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے میرے پاس دوسرے ذرائع بھی تھے۔ اس نے بھاگتے بھاگتے ٹھٹک کر میری طرف کوئی چیز اچھالی۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ میرے قریب ہلکا سا دھماکا ہوا اور دھواں پھیل گیا۔ میں اس دھوئیں سے کتراتا ہوا اُس کے تعاقب میں بھاگتا رہا۔ ممکن ہے کہ مجھے اپنے دشمنوں کے حربوں کا تجربہ نہ ہوتا تو چوٹ کھا جاتا مگر وہ بار بار میرے آزمائے ہوئے تھے۔ میں اُسے پہچان گیا تھا۔ وہ بیلیا تھی، روسی ایجنٹ بیلیا! وہ مجھے تلاش کرتی ہوئی اسکندریہ آ پہنچی تھی اور ایسا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔

"رک جاؤ بیلیا! بھاگو مت! تم اپنی موت سے نہیں بھاگ سکتیں!"

میں اب اُس کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ آٹھ دس گز کے فاصلے پر تھی۔ میں اُس پر فائر کرنے سے پہلے ذرا جھجکا تو سہی مگر پھر لبلبی دبا ہی دی۔ گولی اُس کی پشت پر کولہے کے قریب لگی۔ وہ چیخ کر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا پرس ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا فاصلے پر گرا۔ میں قریب پہنچا تو وہ تقریباً نیم جاں تھی۔ اتنا اندھیرا نہیں پھیلا تھا کہ میں اُس کا چہرہ نہ دیکھ پاتا۔

"ابوالہول!" اُس نے کراہتے ہوئے کروٹ لی اور سیدھی ہو گئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ میری طرف اٹھ گئے۔ ہاتھ خالی تھے۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اُس نے مجھے پکارا۔ "آؤ!... ابوالہول!... میرے... میرے قریب... قریب آ جاؤ!" اُس کے اٹھتے ہوئے ہاتھ کانپنے لگے۔ "کیا... کیا تم میری... میری یہ آخری... خواہش..." وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور کراہنے لگی۔

ایک مرتی ہوئی عورت فریب نہیں دے سکتی! میں نے سوچا اور ریوالور جیب میں رکھ کر اُس کے قریب ریت پر بیٹھ گیا۔ اگر اس حالت میں بھی وہ کوئی حربہ آزماتی تو اُس کی گردن میری دسترس سے دور نہیں تھی۔ اس کی پشت سے بہنے والا خون ریت میں جذب ہو رہا تھا۔

"تم... ابوالہول..." اس کی زبان لڑکھڑائی۔ "تم... میرا خواب تھے... یہ... یہ خواب ٹوٹ گیا... تم نے مجھے شکست دے... دی... کا... کاش میں... میں تمہیں فتح... فتح کر سکتی! غلط... میں نے غلط نہیں لکھا تھا... آ... آخری لمحوں میں... جھوٹ... میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میں ایک غیر... غیر معمولی... لڑکی... نن... نہیں عورت... آ... آہ!" اُس کا سانس اُکھڑنے لگا۔

"بیلیا! کہو... کہو کیا کہنا چاہتی ہو بولو!" میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ابوالہول!" اس کے ہونٹ کانپے۔ "میں خوش... خوش قسمت ہوں کہ تمہارے زانو پر... سر ہے اور... اور میں..." چند لمحے وہ اپنے دونوں ہونٹ بھینچے رہی پھر بول اٹھی۔ "اگر میرا... تم... میرے ملک کے حصے میں آ... آتے تو... تو... میں نے ہی... یہ سودا کیا تھا... انہوں نے مان لیا تھا کہ... کہ وہ... وہ میرا خواب... میری آنکھوں میں... سجا دیں گے۔ ہاں... ہاں پھر... پھر تم... تم ابوالہول... میرے ہو جاتے... میں... میں اور تم اپنے... ملک کے لیے... ابوالہول... پھر... پھر... ایک... ایک نئی نسل... خواب... مگر... ا... ا... مگر..." لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہونے لگے اور پھر اُس کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ "ابوالہول" آخری بار اس کے ہونٹ کانپے اور پھر انہیں ہمیشہ کے لیے چپ لگ گئی۔

میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ بیلیا کی موت ایسی نہ تھی کہ میں اس سے متاثر نہ ہوتا۔ وہ مرتے مرتے بھی میرے دل پر ایک چرکا لگا گئی تھی۔ دشمن جو ہوئی! مجھے جانے کیا کیا یاد آنے لگا۔ پہلی بار وہ کب ملی تھی؟ اس نے مجھے خط میں کیا لکھا تھا؟ ایسی ہی بہت سی باتیں! پھر جانے کیسے مجھے اُس شے کا خیال آیا جسے میں نے نشان پیما کا نام دیا تھا اور اس کے معنی فرض کیے تھے۔ وہ شے، وہ نشان پیما جس کے ذریعے بیلیا مجھ تک پہنچی تھی، اس وقت بھی اس کے پاس ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا۔

وہ چمڑے کی ایک بیلٹ تھی جو مجھے بیلیا کی کمر سے بندھی ہوئی ملی۔ اسی بیلٹ کے درمیانی حصے میں ایک چوکور اور چھوٹی سی مشین لگی

میں نے اُس ہیلمٹ کو اُٹھا کر دیکھا تو وہ کافی وزنی محسوس ہوئی۔ میرے سامنے قیاسات درست ثابت ہوئے۔ یہی مشین کی ایک حکم رسانی میری طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میرے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ثابت ہوا۔ وہ شے میرے لیے انتہائی خطرناک تھی۔ اگر وہ پھر میرے کسی دشمن کے ہاتھ پڑ جاتی تو شدید خطرہ ثابت ہوتی۔ یہی وہ شے ہو سکتی تھی جسے میں نے پروفیسر العینی اپنے غائب کی ایجاد سمجھا تھا۔ میں نے پتے جسم کی غیر معمولی قوت سے کام لے کر اس شے کو فوراً ہی توڑ پھوڑ دیا۔ اسے توڑنا شاید کسی عام آدمی کے بس کا کام نہ ہوتا کیونکہ وہ عجیب دھاتوں سے بنی ہوئی تھی اور اندر سے ٹھوس تھی۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سمندر میں پھینکنے کے بعد میں نے بیلیا کا پرس اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھنا چاہا! اس میں بھی مجھے کچھ عجیب چیزیں ملنے کی توقع تھی جو شاید آئندہ میرے کام آتیں۔ پرس ذرا بڑا تھا کوٹ کی جیب میں نہ آیا۔ میں نے اُسے کوٹ کی اندرونی جیب کے قریب رکھ کر بٹن لگا لیے۔ اب وہ دوسروں کی نظروں سے بھی چھپا رہتا اور گرتا بھی نہیں۔ کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے میری نگاہ بیلیا کی لاش پر پڑی اور میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ پھر بیلیا کی لاش کو سمندر کی لہروں کے سپرد کرتے ہوئے بھی میری سماعت میں وہ الفاظ گونجتے رہے جو اُس نے اپنی موت سے پہلے کہے تھے: "ابوالہول! تم میرا خواب تھے۔ ..." انھوں نے مان لیا تھا کہ وہ میرا خواب میری آنکھوں میں سجا دیں گے ... یہی اور ایسے ہی بہت سے لفظ، بہت سے نشتر دیر تک میری روح میں اُترتے رہے۔

جسے میں اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھا تھا، وہ بیلیا اب مر چکی تھی مگر میرے احساس میں اب بھی زندہ تھی۔ ایسے دشمن کسے نصیب ہوتے ہیں! یہی سوچتا ہوا میں آبادی کی طرف آیا۔ معلوم نہیں سمندر نے بھی بیلیا کو قبول کیا کہ نہیں یا اُسے کنارے پر لا پھینکا! کیونکہ میں اُسی شب اسکندریہ سے قاہرہ روانہ ہو گیا۔ بیلیا کے پرس سے مجھے ایک ایسی ہی چیز ملی تھی کہ میں اپنے ایک اور خطرناک دشمن کا ٹھکانہ لگا سکتا تھا۔

قاہرہ پہنچ کر میں نے وقتی طور پر ایک ہوٹل میں قیام کیا، پھر دوسرے ہی دن پُرانے قاہرہ میں جامعۃ الازہر کے قریب ایک مکان کرائے پر حاصل کر لیا۔ پرانے قاہرہ کا یہ علاقہ جو الازہر کہلاتا ہے، میں نے اپنی سکونت کے لیے دانستہ منتخب کیا۔ یہاں سے عابدین پیلس کا علاقہ زیادہ دور نہیں تھا۔ عابدین پیلس کے علاقے میں دارالکتب سے چند بلڈنگ کے فاصلے پر وہ پُرشکوہ اور وسیع و عریض عمارت تھی۔ میں نے دو روز تک اسی عمارت کے مکینوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ میں اس عمارت میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھے رہا۔ مجھے اُسی عمارت میں داخل ہونا تھا اور پھر مجھے ذریعہ مل ہی گیا اور یہ ذریعہ دانیہ تھی، لیکن کئی دن بعد مجھے یہ موقع مل سکا۔

دانیہ سے میری ملاقات قاہرہ کی عظیم لائبریری "دارالکتب" میں ہوئی جہاں لاکھوں کتابیں ہیں۔ اُسے ایک کتاب کی تلاش تھی۔ میں بھی دانستہ اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اُس نے جلد ہی یہ بات محسوس کر لی اور میری طرف مڑ کر آہستہ سے بولی: "غالباً آپ مجھ سے تعارف حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کافی دیر سے میرے پیچھے گھوم رہے ہیں۔"

"جی ... جی ہاں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور آگے بڑھ کر ایک ریک سے نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب نکال لی۔ "آپ کو بھی شاید نفسیات سے دلچسپی ہے ورنہ اس طرف نہ آتیں!" میں نے اس کا جائزہ لیا۔

"جی نہیں۔" اُس نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں تو اس لیے ادھر آنکلی تھی کہ دیکھوں آپ میرے پیچھے آتے ہیں یا نہیں!"

"میرا خیال ہے کہ گفتگو کے لیے یہ جگہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔"

"خیر!" اس کی حسین آنکھیں سوالیہ بن گئیں۔ "ابھی تو آپ سے تعارف بھی نہیں ہوا۔"

"مجھے آپ کسی بھی نام سے پکار سکتی ہیں۔"

"جی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جی ہاں۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنا اصل نام معلوم نہیں۔"

"تعجب ہے! پھر بھی کوئی تو نام ہو گا! آپ کے احباب کچھ تو کہتے ہوں گے۔"

"احباب!" میں نے طویل سانس لیا اور کتاب دوبارہ ریک میں رکھ دی۔

"کیوں؟ کتاب کیوں واپس رکھ دی آپ نے؟"

"بس اب جی نہیں لگے گا پڑھنے میں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر آپ اسے بے جا جسارت خیال نہ کریں محترمہ دانیہ تو ..."

"یہ ... یہ آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ چونک کر بولی۔

"بس ہو گیا معلوم۔"

"آپ بڑے پُراسرار آدمی معلوم ہوتے ہیں یا پھر خود کو پُراسرار ظاہر کرنا چاہتے ہیں!"

"ایسی کوئی بات نہیں ... لیکن ہم دونوں ہی یہاں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہے ہیں، اس لیے ..."

"ٹھیک ہے چلیے! آپ نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ دانیہ کے ساتھ میں دارالکتب کی عمارت سے باہر آ گیا۔

"یہ بہت غلط ہے کہ آپ تو میرا نام بھی جانتے ہیں اور مجھے آپ نے اب تک اپنے بارے میں ..."

"شارب۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنا یہی نام سُنا۔"

"تو پھر آپ کیوں کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنا اصل نام معلوم نہیں؟"

"وہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا میں! مگر یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ فی الحال تو یہ بتائیے کہاں چلیں؟"

"دیکھیں اگر آپ مجھ سے کسی ہوٹل میں چلنے کو کہیں گے تو میں ہرگز نہیں مانوں گی۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "ہوٹلوں میں بیٹھنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"تو پھر میرے گھر چلیے۔"

"ابھی میں نے آپ پر اتنا اعتبار نہیں کیا!" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر مجھے اپنے گھر لے چلیں۔"

"گھروں کی نوبت اتنی جلدی نہیں آتی! آپ کا کیا خیال ہے؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تو پھر آپ سے گفتگو مشکل ہو جائے گی۔ یہاں لب سڑک تو تماشا بن جائے گا بیچارا!"

"خیر تماشے سے تو میں نہیں ڈرتی لیکن یہ بات ضرور ہے کہ یہاں گفتگو میں لطف نہیں آ رہا۔ اچھا یوں کریں، آپ یہیں ٹھہریں، میں اپنی گاڑی لے کر آتی ہوں، قریب ہی کھڑی ہے۔" وہ مڑی۔

"سوچ لیجیے محترمہ! اگر واقعی آنا ہو تو بتا دیں ورنہ میں بے وقوف بننے پر راضی نہیں ہوں۔"

"کبھی کبھی بے وقوف بن جانے میں بھی کوئی حرج نہیں!" اُس نے مڑ کر کہا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دانیہ حسین تو نہیں قبول صورت ضرور تھی۔ میں نے اس دوران یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس پر میرا جادو چل گیا ہے۔ اس کا مجھے پہلے ہی یقین تھا اور اسی لیے میں نے تعارف میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ مشکل ہی تھا کہ میں کسی لڑکی سے کلام کروں اور وہ مجھے نظرانداز کر جائے۔ اسکندریہ کے دورانِ قیام مجھے اچھی طرح اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ لڑکیاں تو خود میری طرف کھنچتی تھیں۔ دانیہ بھی یقیناً مجھ سے متاثر ہوئی تھی ورنہ کوئی لڑکی پہلی ملاقات میں اتنی بے تکلف نہیں ہوتی۔ اس بے تکلفی کا ایک سبب اور بھی تھا جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر کا چاند اپنی ضیا پاشیوں میں بامِ عروج پر تھا۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے کہ قبول صورت لڑکیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا ہوا بے سبب ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اس نے واپسی میں زیادہ دیر نہیں کی۔ لمبی سی خوبصورت کار سے اس کی امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ کار اس نے میرے بالکل قریب لا کر کھڑی کی اور ہاتھ بڑھا کر اگلا دروازہ کھول دیا۔ "آئیے!" وہ جھکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"شکریہ۔" میں نے کار کی نشست پر بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔

"اہرام کی طرف چلیں؟" اس نے گیئر بدلا۔

"نہیں۔"

"تو پھر قلعے چلتے ہیں۔" کار آگے بڑھی۔ "میں اکثر وہاں جاتی ہوں۔ بڑا سکون ملتا ہے۔ وہیں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"ہاں یہ مناسب ہے۔" میں نے تائید کی۔

"کچھ اور نہیں تو میرا یہ تجسس تو آپ اسی وقت دور کر دیں کہ مجھے کیسے جانتے ہیں! الجھن سی ہو رہی ہے مجھے!"

"آپ یقین کر لیں گی؟"

"کیوں نہیں!" اس نے اپنے شانوں پر بکھری ہوئی سیاہ گھٹاؤں کو جھٹکا دیا۔

"دراصل بڑی دلچسپ اور عجیب سی بات ہے جسے سن کر شاید آپ ہنس پڑیں۔" میں نے پہلو بدل کر اس کے متناسب جسم کو دیکھا۔

"اگر ہنسنے کی بات ہوئی تو ضرور ہنسوں گی۔" وہ مسکرائی۔

"تو پھر اس پر ہنسیں کہ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔"

"کیا پہلے کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی جو مجھے دیکھ کر ..."

"بس یوں ہی تو ہے۔" میں نے بھی اس کی بے حجابی سے فائدہ اٹھایا۔

"اچھا پھر؟" وہ لطف لینے لگی۔

"پھر یہ کہ آپ کے متعلق ..."

"اچھا تو یہ قصہ ہے!" وہ میری بات کاٹ کر ہنس پڑی، پھر بولی۔ "معاف کیجیے گا، مجھے آپ کی بات سن کر سچ مچ ہنسی آ گئی۔ اس زمانے میں آپ جیسے لوگ بہ طور نمونہ... خیال نہ کیجیے گا، میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی۔ خیر تو آپ نے کیا کیا معلوم کیا میرے بارے میں؟"

"کچھ زیادہ نہیں... کیا آپ کار کچھ آہستہ نہیں چلا سکتیں؟"

وہ واقعی بڑی تیز رفتاری سے کار چلا رہی تھی۔

"آپ کہتے ہیں تو آہستہ کر لیتی ہوں، مجھے مزہ نہیں آ رہا ہے۔" کار کی رفتار قدرے کم ہو گئی۔ "ہاں، وہ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"بس اتنا معلوم ہوا ہے مجھے کہ آپ ایک معزز خاندان کی فرد ہیں۔ ابھی شادی نہیں کی اور یہ کہ آپ کے بھائی صاحب کا نام عاطف ہے۔ وہ بھی ابھی کنوارے ہیں۔"

"کنوارے پن پر آپ کی بڑی توجہ ہے! آپ بھی ابھی کنوارے ہی معلوم ہوتے ہیں!"

"جی ہاں... یوں بھی ابھی میری عمر زیادہ نہیں... پھر یہ کہ مجھ سے خانماں برباد کو قبول بھی کون کرے گا!" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"خیر اب ایسی مایوس کن صورت حال بھی نہیں۔ آپ شاید گھر سے کم نکلتے ہوں گے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی اللہ کی نیک بندی اب تک آپ کو قبول کر چکی ہوتی۔" اُس کے لہجے میں شوخی بھی تھی اور زندہ دلی بھی! "ویسے قیام کہاں ہے آپ کا؟"

"ابھی چند روز ہوئے الازہر میں ایک مکان کرائے پر لیا ہے۔"

"کیا کسی اور شہر سے آئے ہیں یہاں؟"

"جی ہاں! اسماعیلیہ سے۔"

"والدین وہیں ہیں؟" میں چپ رہا تو پھر اُس نے اپنا سوال دہرایا اور بولی۔ "آپ کچھ اُداس ہو گئے!"

"یہ ذکر مجھے ہمیشہ اُداس کر دیتا ہے، اِس لیے بچتا ہوں اِس سے!"

کچھ دیر کو وہ بھی سنجیدہ نظر آنے لگی۔ مگر پھر اُس کی فطری شوخی عود کر آئی۔ کار اب قلعے کے علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ فقرے بازی کرتی رہی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اس طرح وہ مجھے ہنسانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ فقرہ کہہ کر خود ہی زور سے ہنس پڑتی اور میری طرف دیکھتی۔ میں ہنسنے سے یا خوش مزاجی کا اظہار کرنے سے دانستہ گریز کرتا رہا۔ اب وہ قلعہ نظر آنے لگا تھا جسے صدیوں پہلے صلاح الدین ایوبی نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی قلعے کی وجہ سے یہ آبادی قلعہ کہلاتی ہے۔ مجھے اپنے شہر میں اجنبی جان کر دانیہ اُس قلعے کے بارے میں بتانے لگی۔ "وہ دیکھیے قلعے کے اندر مسجد نما جو یہ کے مینار نظر آ رہے ہیں اور دائیں طرف... وہ ایک اور مسجد کے مینار ہیں۔ یہ مسجد استنبول کی مسجد کی طرح اور اُسی طرز پر بنوائی گئی ہے۔ نظر آ رہے ہیں آپ کو مینار؟"

"جی... جی ہاں!"

"اور وہ جو آپ کو قلعے کے عقب میں پہاڑ نظر آ رہے ہیں، یہ مقطم کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ قلعے ہی میں ایک خوب صورت محل بھی ہے، دکھاؤں گی آپ کو! معلوم ہے، یہ محل کس نے بنوایا تھا؟" وہ اپنی معلومات کا رعب ڈالنے لگی۔ مجھے معلوم تو تھا کہ وہ محل، خاندانِ خدیو کے بانی محمد علی پاشا نے تعمیر کرایا تھا جو شاہ فاروق کا جدّ بھی تھا اور یہ کہ استنبول کی مسجد کے نمونے پر وہ مسجد بھی اُسی نے بنوائی تھی۔ مگر میں نے دانستہ غلط جواب دیا اور وہ خوش ہو گئی۔ "آپ کو تو کچھ بھی نہیں معلوم!" پھر وہ مجھے اُس قلعے کے اندر بنی ہوئی عمارتوں کے بارے میں اُس وقت تک بتاتی رہی جب تک قلعے کے قریب پہنچ کر کار نہ روک دی۔ "آئیے! میں پہلے آپ کو قلعے کی سیر کراؤں، پھر کہیں بیٹھ کر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔" اُس نے کار کے شیشے چڑھا لیے۔

ہر چند کہ میں وہاں پہلی بار آیا تھا مگر میرے حافظے میں اُس تاریخی قلعے کے متعلق ایک ایک تفصیل محفوظ تھی۔ کافی دیر گھمانے پھرانے کے بعد وہ میرے ساتھ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ شام کا وقت تھا اور وہاں خاصی چہل پہل تھی، مگر دانیہ نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا کہ لوگ اُدھر کم ہی آ جا رہے تھے۔ دانیہ کو میرے بارے میں سب کچھ جان لینے کا بڑا تجسس تھا۔ اُس نے بیٹھتے ہی سوالات شروع کر دیے۔ میرا منشا بھی یہی تھا اور اسی لیے میں نے پُرتجسس فضا پیدا کر دی تھی۔

"قوم اور مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہانے والوں کے لیے میرا وجود ایک سوال ہے۔" میں نے جذباتی لہجہ اختیار کیا۔ دانیہ سنجیدگی سے میری باتیں سننے لگی۔ "میں نہیں جانتا کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم، اور اگر جانتا بھی ہوں تو نہیں جاننا چاہتا۔ جنگ کس نے کی؟ کس لیے کی؟ یہ نوبت کیوں آئی؟ میرے سوال یہ نہیں ہیں، میں یہ نہیں پوچھتا، میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں

کہ میری ماں کون تھی؟ میرے باپ کا کیا نام تھا؟ اِن سوالوں کا جواب مجھے نہیں ملا۔ آپ اُس بچے کا تصور کریں جس نے ابھی چلنا سیکھا ہو اور جلتی ہوئی بستی کے درمیان تنہا رہ گیا ہو۔ وہ اپنے گھر کے ملبے پر تنہا بیٹھا ہے اور کچھ نہیں جانتا، پھر ہوش سنبھالنے پر اُسے بتایا جاتا ہے کہ اُس کے باپ، ماں، بھائی اور عزیز کسی کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔ وہ بھری دنیا میں اکیلا ہے۔ ایک بے اولاد شخص اُس بچے کی پرورش کرتا ہے اور اُسے شارب کے نام سے پکارنے لگتا ہے۔ وہ بچہ جوان ہوتا ہے اور اُسے پرورش کرنے والا اپنا سب کچھ اُس بچے کو سونپ کر مر جاتا ہے۔ تو کیا وہ بچہ یہ بھول سکتا ہے کہ اُسے اپنے والدین کے چہرے بھی یاد نہیں؟ کیا اُسے یہ کرب نہ ہو گا کہ اُس کا اصل نام بھی کوئی تھا۔ گھر بھی تھا، وطن بھی تھا؟"

"ہاں میں اُس بچے کا دکھ محسوس کر سکتی ہوں شارب!" دانیہ بھی جذباتی ہو گئی تھی اور جذبات، تکلفات کو ختم کر دیتے ہیں۔ "جہاں تک میں سمجھی ہوں، تمھارا گھر کسی سرحدی بستی میں تھا جو اسرائیل کی بربریت کا نشانہ بن گئی اور تم بچ گئے۔ تمھیں کسی نیک دل شخص نے اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور اب وہ شخص بھی اس دنیا میں نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اندر سے اتنے زخم زخم ہو گے۔"

کچھ دیر میں خاموش رہا اور اس کی طرف نظر اُٹھانے کی بجائے خلا میں گھورتا رہا۔ "وہ نیک دل شخص پہلے غزہ میں تھا، پھر وہ مجھے لے کر اسماعیلیہ چلا آیا۔ غزہ اب اسرائیل کے قبضے میں ہے۔" میں نے گویا دانیہ کے قیاسات کی تصدیق کر دی۔ "اسی کی خواہش تھی کہ میں نوکری کی بجائے کوئی کاروبار کروں۔ میں اسی کی خواہش کے احترام میں یہاں آیا ہوں۔"

"تمھیں کتنے دن ہوئے یہاں آئے ہوئے؟" اس نے پوچھا۔

"صرف چند روز ہوئے ہیں۔ ابھی اپنے محسن کی موت کے بعد یوں بھی اسماعیلیہ میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔"

"کیا کاروبار کرنا چاہتے ہو؟"

"ابھی کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ وہاں خاصی جائداد تھی جس میں سے تقریباً نصف میں نے فروخت کر دی ہے۔"

"ہوں!" اس نے ہنکارا بھرا اور کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔ "کل کسی وقت تم میرے گھر آ جاؤ، میں تمھیں بھائی جان سے ملوا دوں گی۔ وہ تمھیں یقیناً کوئی بہتر مشورہ دے سکیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا اور اس انکار میں مصلحت تھی۔

"وجہ؟"

"پہلے تم میرے گھر چلو گی۔" میں نے بھی تکلف کو بالائے طاق رکھ دیا۔ "اگر تمھاری یہی ضد ہے تو پھر کل میں ہی آ جاؤں گی، مگر میں نے تمھارا گھر تو دیکھا نہیں؟"

"ابھی چلو۔"

"ایسا کرتی ہوں کہ تمھارا گھر آج دیکھ لیتی ہوں، مگر آؤں گی کل! آج میں نے اپنی ایک پرانے فرینڈ کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ کل شام اطمینان سے آؤں گی۔ اِس وقت میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑتی ہوئی نکل جاتی ہوں۔"

"بوائے فرینڈ؟" میں نے اٹھتے ہوئے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"ہاں ہاں کیوں؟ کیا لڑکیوں کے دوست نہیں ہوتے؟ اور تم بھی تو دوست ہو میرے! تمھیں اعتراض تو نہیں دوست کہنے پر؟" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ مجھے میرے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئی۔

دوسرے دن شام کو وہ مقررہ وقت پر آ گئی۔ میرا دشمن اسی عمارت میں تھا جہاں دانیہ رہتی تھی، مگر جلد بازی سے کام بگڑ جاتا۔ وہ انتہائی محتاط، چوکنا اور چالاک تھا کہ اُسے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو پھر اس کا سراغ نہ ملتا۔ میں پہلے سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے گرد جال بُن دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے دانیہ سے تعلقات استوار کیے تھے۔ جال بُن جانے کے بعد ڈوری کھینچ لینا میرے لیے آسان ہو جاتا۔

میں نے دوسری ہی ملاقات میں بہت سی کام کی باتیں معلوم کر لیں۔ کسی لڑکی کے سامنے آدمی خود کو مظلوم ظاہر کر کے بہت جلد اس کی ہمدردیاں حاصل کر لیتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا تھا۔ دوسری ملاقات میں مجھے اس پُراسرار مہمان کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ وہ دانیہ کے بھائی عاطف کے بے حد قریب ہے۔ اُس روز میں نے اسی پر اکتفا کیا۔ دانیہ کچھ اور قریب آ گئی، مگر میں نے اپنا اصل مقصد ظاہر نہ ہونے دیا اور اسی لیے اپنے دشمن کے بارے میں بھی بس سرسری سی گفتگو کی۔ یوں جیسے مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔

اگلے روز میں نے دانیہ سے عابدین پیلس کے قریب

ملنے کا وعدہ کیا۔ اس پیلس کی خصوصیت یہ ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دن کی مناسبت سے اس میں تین سو پینسٹھ کمرے ہیں۔ اسی لیے قریب البیل فیلڈ گورنر ہاؤس) ہے۔ دانیہ کی کار اسی طرف سے آئی اور میں نے اُسے پہچان لیا۔ میں اُس کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا تو وہ بولی: "آج بھی نہیں چلو گے میرے گھر؟" اُس نے گذشتہ روز بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔

"گھر میں گھسے کہیں؟" میں نے اُسے ٹالا۔ "آج بھی وہیں چلو جہاں پرسوں گئے تھے۔ وہ جگہ مجھے بھی اچھی لگی۔ وہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے اور یہ منظر شام کے وقت بہت اچھا معلوم ہوا تھا مجھے! تمھارے چلنے پر تمھیں تو کوئی ......"

"نہیں نا!" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "میں تو گھر چلنے کو اس لیے کہہ رہی تھی کہ کہیں تم سوچو، لے جانا ہی نہیں چاہتی اپنے گھر! پھر تمھیں بھائی جان سے بھی ملوانا تھا!"

"تم سے ملاقات ہوگئی ہے تو ان سے بھی مل لوں گا۔" میں نے اسے تیز نظروں سے دیکھا، مگر مجھے اُس کے چہرے پر وہ رنگ نظر نہ آسکا جس کی توقع تھی۔

اُس روز دانیہ سے میری ملاقات بہت سود مند ہوئی۔ مجھے اپنے دشمن کے متعلق تمام تفصیلات کا علم ہوگیا۔ وہ کیوں اور کیسے اس عمارت میں مقیم ہے اور عاطف سے اس کا کیا تعلق ہے؟ عاطف کے حوالے سے خود میں نے اس کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

"مگر دانیہ وہ ہے کون؟ اور تمھارے بھائی جان سے اُس کے اتنے گہرے مراسم کیسے ہیں؟"

"بس حماقت کہہ لو بھائی جان کی!"

"اپنے بھائی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کر رہی ہو؟"

"حماقت کو تو حماقت ہی کہا جائے گا، چاہے وہ حماقت بھائی سے سرزد ہو یا باپ سے۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔ "میں تو ایک دفعہ ان کے منہ پر بھی یہ بات کہہ چکی ہوں۔ دراصل بھائی بہن کے علاوہ ہم دونوں اچھے دوست بھی ہیں۔ والدہ کے مرنے کے بعد تو اس دوستی میں اور پائیداری آگئی ہے۔ وہ میرے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتے اور میں اُن سے کچھ نہیں کہتی۔ ہاں دوست کی حیثیت سے اچھا بُرا ایک دوسرے کو ضرور سمجھا دیتے ہیں، وہ بھی موڈ دیکھ کے! جو میرے دل میں ہوتا ہے، میں نہیں چھپاتی اور وہ بھی صاف بات کرتے ہیں۔ دراصل اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے سے تلخیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ اب یہی رچرڈ کا معاملہ لے لو، میری نظر میں یہ سراسر حماقت ہے، لیکن میں ان پر اپنی مرضی نہیں تھوپتی۔ اُن کا معاملہ ہے، وہ جانیں۔ اگر وہ اس معاملے میں جذباتی ہوگئے ہیں تو وہ جانیں۔ رچرڈ اسی شخص کا نام ہے جو کچھ دن سے ہمارا مہمان ہے۔" میں نے اُسے بولنے دیا۔ "بھائی جان نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور میں نے بھی! قصہ یہ ہوا کہ انھیں وہاں ایک لڑکی نیرین پسند آگئی۔ نوبت شادی تک پہنچنے والی تھی کہ یا تو کسی رقیب روسیاہ نے یا پھر کسی اور نے کسی دوسرے چکر میں نیرین کو قتل کردیا۔ بس بھائی جان جذباتی ہوگئے۔ بڑا چکر چلا مگر قاتل کا سراغ نہیں ملا۔ بھائی جان نے رو پیٹ کر صبر کرلیا۔ پھر اتنے بددل ہوئے کہ تعلیم اُدھوری چھوڑ چھاڑ کر واپس آگئے۔ والد اس وقت زندہ تھے۔ اُنھوں نے بھائی جان کو لاکھ سمجھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُن دنوں میں امریکہ جانے والی تھی۔ خیر میں تو وہاں سے پڑھ پڑھا کر اطمینان سے واپس آگئی، میں نے وہاں کوئی ایسا ڈراما نہیں کیا۔ بھائی جان البتہ بہت دن تک آہیں بھرتے رہے اور پھر رفتہ رفتہ راہ راست پر آگئے۔ معاملہ اچھا خاصا ٹھنڈا پڑ گیا تھا کہ رچرڈ ٹپک پڑا۔ یہ نیرین کا بھائی ہے۔ میں نے بھائی جان سے اس کا کبھی ذکر سُنا تھا۔ موصوف نے یہاں آکر فرمایا کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کی تلاش میں آئے ہیں۔ اب یہیں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ مہمان خانہ بھی اُنھی کے تصرف میں ہے۔ مجھ سے بس دو ایک بار ہی ملاقات ہوئی ہے، اتنے دن میں! کبھی ہندو چینی بن جاتا ہے، کبھی جاپانی، کبھی کچھ، کبھی کچھ! سُنا ہے، میک اپ میں ماہر ہے! ہوگا! جب جی چاہتا ہے غائب ہوجاتا ہے، جب مرضی ہوتی ہے آجاتا ہے۔ اُس کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ بھائی جان نے ملازمین کو بھی منع کردیا ہے کہ اُدھر نہ آئیں جائیں۔ خود بھائی جان بھی کم جاتے ہیں اُدھر! اور مجھے تو خیر کوئی دلچسپی ہی نہیں اُس سے۔ مہمان خانے کا ایک دروازہ بالکل الگ ہے، وہیں سے آتا جاتا ہے۔ ہے تو خوب صورت مگر معلوم نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو! مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں۔ بھائی جان کبھی کبھار اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ خود کھاتا پکاتا ہے حالانکہ ملازمین ہیں، مگر وہ تو شاید آدم بیزار ہے۔ کل بھائی جان بتا رہے تھے کہ وہ کچھ دن کے لیے اسکندریہ جا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ وہیں سے دفع ہوجائے اپنے وطن تو اچھا ہے۔ بتاؤ شارب، ایسے مغرور شخص سے کوئی ملنا پسند

کرے گا؟"

"ہاں ہرگز نہیں!" میں نے پُرزور آواز میں دانیہ کی تائید کی، پھر بولا۔ "میں بس تمھاری ایک بات سے متفق نہیں۔"

"تم معاملات دل کو حماقت کہتی ہو۔"

"کیسے معاملات دل! یہ سب غیر حقیقت پسندانہ باتیں ہیں۔ اسے یوں سمجھو کہ اگر تم میری ضرورت ہو اور میں تمھاری تو جب تک یہ ضرورت برقرار رہے ٹھیک ہے! نہیں تو اس میں آہ و فغاں کرنا، بوریت پھیلانا، خود کارٹون بننا اور دوسروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہنسیں بھی نہیں، یہ سب حماقت ہے! چلیں مان لیا وہ لڑکی نیرین بہت خوب صورت ہوگی، مگر حُسن اُسی پر ختم تو نہیں ہوگیا، ایک سے ایک حسین لڑکی ہے۔ بس یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ پھر بھائی جان کو چین کیوں نہیں آتا! میں کبھی کبھی ان کے پاس دوسری لڑکیوں کو آتے جاتے دیکھتی ہوں تو کہتے ہیں، بس جی بہلا رہا ہوں مگر نیرین کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ میں تو بور ہوگئی ہوں، اُس کا ذکر سُن سُن کے! اور جب سے یہ شخص آیا ہے یہاں بھائی جان کے پاس کوئی اور بات ہی نہیں کرنے کو! معلوم نہیں کب ٹلے گا!" اُس نے منہ بنایا۔ "خیر خاک ڈالو اس پر! اُس کے ذکر سے اچھا خاصا موڈ تباہ ہوگیا!"

"ہاں چھوڑو، ہوگا! آؤ اب چلتے ہیں۔" میں کھڑا ہوگیا۔

اُس دن زبردستی دانیہ مجھے اپنے گھر لے ہی گئی۔ عمارت اندر سے خاصی بڑی تھی اور تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصہ دانیہ کے تصرف میں تھا، ایک اس کے بھائی عاطف کے قبضے میں تھا، تیسرا حصہ مہمان خانہ تھا۔ میں نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ دانیہ کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی خوش اخلاقی سے ملا۔

"یہ میرے نئے بوائے فرینڈ ہیں شارب!" دانیہ نے میرا تعارف اُس سے کرایا۔ "ان کا ایک مسئلہ ہے، بتاؤں گی آپ کو!"

"ضرور!" عاطف مسکرایا۔ "ان سے مل کر خوشی ہوئی۔" اُس نے دانیہ کی طرف دیکھا۔ "اچھا میں ذرا ایک فون کرلوں، تم لوگ بیٹھو!"

"نہیں، ہم چل رہے ہیں!" دانیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ مجھے وہاں سے اٹھا لائی۔ اپنی خواب گاہ میں آکر اُس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ مجھے اُس کے ارادے کچھ خطرناک معلوم ہوئے... میں چوکنا ہوگیا۔ "آؤ ادھر آجاؤ شارب، یہاں اس کرسی پر!" وہ اپنی مسہری پر نیم دراز ہوگئی۔

"میں اب چلوں گا دانیہ!" میں نے مسہری کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی سے؟"

"ہاں آج تمھارے ساتھ خاصا وقت گزر گیا مگر خوشگوار!" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"معلوم ہے میں نے آج تمھاری وجہ سے کسی بوائے فرینڈ کو وقت نہیں دیا!" اُس نے گویا مجھ پر احسان کیا۔

"کتنے بوائے فرینڈز ہیں تمھارے؟"

"گنے نہیں کبھی!" وہ ہنس پڑی۔ "پھر یہ بھی ہے کہ میں ان میں کمی بیشی کرتی رہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ بہت سے بور بھی کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شادی کرلو! بھلا کوئی تُک ہوتی ہے!"

"مگر شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"میں اس سسٹم کی قائل نہیں! اور سُنو تم بھی اس مسئلے پر بور نہیں کروگے۔ بس یہ ٹوپک ختم!"

"چلو ختم!" مجھے کون سی اُس سے شادی کرنا تھی۔ "ہاں یہ بتاؤ تمھارے بھائی جان کیا کرتے ہیں؟"

"عیش!" وہ ہنسی۔ "کوئی اور کام ہے نہیں۔ والد نے دو تین بڑی بڑی بلڈنگیں بنوادی تھیں، ہیلیوپولس کے علاقے میں ہیں وہ بلڈنگیں! اتنا کرایہ آجاتا ہے کہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کرایہ وغیرہ وصول کرنے اور دوسرے معاملات کے لیے ایک دفتر بھی بنا ہوا ہے۔ بھائی جان تو خیر سال بھر میں دو چار دفعہ ہی جاتے ہوں گے وہاں! میں البتہ پابندی سے ہر مہینے دو ایک دن وہاں ضرور جاتی ہوں۔ چھوٹا سا عملہ ہے۔ تھوڑا بہت ہیر پھیر کرتا رہتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جان کر نظر انداز کرجاتی ہوں۔" پھر دانیہ مجھے اپنے مشاغل کے بارے میں بتانے لگی۔ اُس کا ایک مشغلہ مطالعہ بھی تھا۔ وہ اسی لیے دار الکتب کے چکر بھی لگاتی رہتی تھی۔ وہاں کچھ کتابیں اُس کے ذوق کی تھیں۔ وہ کتابیں جاری نہیں کی جاتی تھیں۔ خود اس کی لائبریری میں بھی قلمی کتابیں تھیں۔ کئی کتابیں اُس نے مجھے دکھائی بھی جن پر مصری حکومت پابندی لگا چکی تھی۔ اُس کے مطالعے کا موضوع ہی ایسا تھا۔

اُس رات دانیہ نے بڑی مشکل سے میری جان چھوڑی۔ میں نے صرف یہ خیال رکھا کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ اگر وہ ناراض ہو جاتی تو میری ساری محنت بیکار جاتی۔ میں پھر اُس عمارت میں داخل نہ ہو پاتا۔ باتوں باتوں میں اُس سے میں نے یہ بھی پوچھ لیا کہ اُس کا مہمان اسکندریہ کب جا رہا ہے؟ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ دو تین دن بعد ہی جا سکے گا۔ یقینی طور پر دانیہ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اُس نے اپنے بھائی سے صرف یہی سُنا تھا۔ چلتے وقت میں نے دانیہ کو یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ آئندہ شب میں اُس کے گھر رہوں گا، پھر جی بھر کے باتیں کریں گے۔

اُس عمارت میں یوں بھی میرا زیادہ رہنا مناسب نہیں تھا۔

میں اپنے دشمن کے لیے جو دام پھیلا رہا تھا، اُس کی ذرا سی بھی بھنک اُسے مل جاتی تو پرِ پرواز سمیٹنے کی بجائے بلندیوں کی طرف اُڑ جاتا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ میں سبب تبدیلی میں اُس پر قابو پانے میں کامیاب ہوتا۔ وہ اسکندریہ جانے والا ہے، اس خبر سے بھی تصدیق ہو گئی کہ میں غلط راہ پر نہیں جا رہا۔ یہ وہی تھا جس کی مجھے تلاش تھی اور جو عرصہ دراز سے مجھے غوطے دے رہا تھا۔ اس بار میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے نہیں چھوڑوں گا۔ اگر وہ ایک بار نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو پھر مجھے اُس کی گرد بھی نہ ملتی۔ عاطف کی امریکی محبوبہ میرین دراصل کون ہو گی اور رچرڈ سے اس کا کیا تعلق ہو گا۔ یہ میرے لیے سامنے کی بات تھی اور یہ بھی کہ رچرڈ کے پردے میں دراصل کون ہے؟

یہ میرے لیے بھی مناسب تھا اور دانیہ کے حق میں بھی کہ معاملہ طول نہ کھینچے۔ مغربی تہذیب کی پروردہ اور امریکہ میں تعلیم

حاصل کرنے والی وہ لڑکی دانیہ بس نام کی مسلمان تھی۔ اس کا ڈھب قطعی الگ تھا۔ لباس میں، گفتار میں، کردار میں اور نظریات میں۔ پرانے قاہرہ میں رہنے کے باوجود وہ ذہنی طور پر امریکہ ہی میں تھی۔ ایسی لڑکیاں زیادہ صبر نہیں کرتیں۔ اس کی بے صبری میرے لیے کوئی بھی مسئلہ پیدا کر دیتی۔ طاقت کا استعمال میں بس آخری لمحات میں کرنا چاہتا تھا، وہ بھی ایسی صورت میں کہ کوئی اور راستہ نہ ہو۔ مجھے جانے کیوں یہ وہم سا ہو گیا تھا کہ اگر اسکندریہ میں طاقت کے استعمال کی نوبت نہ آتی تو شاید میرے دشمن وہاں میری موجودگی سے بے خبر رہتے۔

دوسرے دن شام کو میں اپنے گھر سے نکل کر سیدنا حسینؓ کی مسجد تک پیدل گیا۔ ایک روایت کے مطابق اس مسجد میں حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک دفن ہے۔ یہ تاریخی مسجد جامعہ ازہر کے قریب ہی ہے۔ دن کے وقت میں اس مسجد میں گیا تھا۔ پھر کچھ دور ہی چلا تھا کہ ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں براہِ راست بھی دانیہ کے گھر جا سکتا تھا، اس میں اب کوئی قباحت نہیں تھی، مگر میرے ذہن میں کچھ اور ہی تھا۔ میں نے اسی لیے دانیہ سے سیدہ زینبؓ کے علاقے میں ملنے کو کہا تھا۔ پرانے قاہرہ کے اس علاقے میں سیدہ زینبؓ کا مزارِ مبارک ہے، اسی سبب سے یہ علاقہ ان کے نام سے منسوب ہے۔ میں دانیہ کے گھر تو جانا چاہتا تھا، مگر ذرا رات گئے۔ اس دوران میں اُسے گھماتا پھرتا۔

ٹیکسی کو میں نے مقررہ جگہ چھوڑ دیا۔ دانیہ وقت کی پابند تھی اور ابھی اس کی آمد میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نے اس دوران سیدہؓ کے مزارِ مبارک کی زیارت کر لی۔ مزارِ مبارک کے اطراف چاندی کا احاطہ بنا ہوا ہے۔ مجھے وہاں معلوم ہوا کہ یہ احاطہ بوہرہ فرقے نے بنوایا ہے۔ میں کچھ دیر وہاں رہا اور وہاں کے روح پرور مناظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتا رہا۔ دانیہ کی سبز لمبی کار وقتِ مقررہ پر میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں کار میں بیٹھ گیا اور اُس کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ بہت خوش خوش نظر آئی۔

"معلوم ہے تمھیں، آج میں کیوں اتنی خوش ہوں!" اُس نے کار اسٹارٹ کی۔

"ہاں معلوم ہے۔" میں مُسکرایا۔

"اچھا بتاؤ۔" دانیہ بھی مسکرائی اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

"آہستہ چلاؤ، سڑک زیادہ چوڑی نہیں ہے۔" میں نے اُسے تیز رفتاری سے روکا۔

"معلوم ہے مجھے، ڈرو مت!" اُس نے رفتار کچھ کم کر دی۔ کار اب اُس گیارہ سو سال قدیم آبادی کے وسط سے گزر رہی تھی۔ "ہاں وہ تم نے میرے سوال کا جواب.....؟"

"کچھ باتیں کہہ دی جائیں تو اپنا حُسن کھو دیتی ہیں۔"

"غلط سمجھے!" وہ زور سے ہنس پڑی۔ "ایسی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں تھی۔"

"کیسی بات؟ اور تم کیسے سمجھیں کہ میرا اشارہ کس طرف تھا؟" میں نے اُسے چھیڑا۔

"تمھاری اطلاع کے لیے میں ایک کتاب کی بات کر رہی تھی جس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی کیونکہ وہ یہاں ممنوع ہے۔" وہ میرا سوال خوبصورتی سے گول کر گئی۔ "سو گنی میں خریدی ہے، پھر بھی سستی ہے۔"

"یقیناً سستی ہو گی۔"

"کیا تمھیں کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

"میں چلتی پھرتی کتابیں پڑھنے کا قائل ہوں۔ میرے لیے تو ہر چہرہ ایک کتاب ہے۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "علم کتابوں ہی تک تو محدود نہیں!"

"تم زیادہ لمبے لمبے سانس نہ لیا کرو، جیسے دنیا بھر کے دکھوں کا بوجھ تمھارے ہی ناتواں کاندھوں پر ہے۔ زندگی سے لطف اٹھاؤ۔"

"ہاں وہ تم جامعہ ازہر کی لائبریری میں گئی ہو؟" میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "میں کل صبح اُدھر نکل گیا تھا، یوں ہی گھومنے کے لیے۔ جہاں جامعہ ہی سے متعلق مختلف کالجوں کی عمارتیں ہیں، اُسی کے قریب! وہاں بڑی قدیم اور نادر کتابیں ہیں۔"

"تم تو مجھے اس طرح سمجھا رہے ہو کہ میں بھی تمھاری طرح اجنبی ہوں یہاں!" وہ ہنسی۔ "کوئی لائبریری اس بندی سے نہیں بچی! اور کام ہی کیا ہے دن بھر! مطالعہ، تفریح اور دوستی، ورنہ وقت کیسے گزرے! گھر میں پڑے پڑے تو اچھے بھلے آدمی کو دیمک لگ جائے۔"

میں نے اہرام کی طرف چلنے کو منع کیا، مگر وہ نہ مانی۔ ہاں اتنی بات ضرور مان گئی کہ وہاں زیادہ دیر نہ رُکی۔ وہ مجھے قاہرہ میں سچ مچ اجنبی جان کر سیر کرا رہی تھی۔ وقت کسی نہ کسی طور گزارنا ہی تھا اس لیے میں نے بھی کچھ نہ کہا۔ اہرام کی طرف چلنے سے میں نے صرف ابوالہول کی وجہ سے منع کیا تھا۔ کیوں کہ اس سے مجھے اب وحشت سی ہونے لگی تھی۔

رات کو کوئی دس بجے کے قریب میں دانیہ کے ساتھ اُس کے گھر پہنچا۔ اس دوران ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا بھی کھا لیا۔ وہ تو ہوٹل میں کھانے پر آمادہ نہ تھی، مگر میرے کہنے پر راضی ہو گئی۔ وہ مجھے اپنی نشست گاہ میں بٹھا کر کچھ دیر لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ میں نے وہاں ایک دیوار پر مصر کی مشہور بیلے ڈانسر نجوا فواد کی بڑی سی تصویر لگی دیکھی۔ دانیہ لباس تبدیل کر کے آ گئی تو میں نے تصویر کے بارے میں پوچھا۔

"میری دوستی ہے نجوا سے۔" اس نے بتایا۔ "آج کل ایک بڑے ہوٹل کیرو شیریٹن سے وابستہ ہے۔ غضب کی فنکار ہے۔ کبھی ملواؤں گی تم سے!"

"تو گرل فرینڈ بھی ہیں تمھاری؟" میں مسکرایا۔

"کیوں نہیں!"

"مگر مجھے تو ان دنوں میں کوئی نظر نہیں آئی: نہ کوئی گرل فرینڈ نہ بوائے فرینڈ۔"

"دیکھو میں رقابت وغیرہ کے چکر نہیں پالتی اور اپنی مرضی کی مالک ہوں، کسی کی غلام نہیں۔ جب جس سے ملنا چاہتی ہوں، ملتی ہوں۔ سب میری عادت جانتے ہیں۔ دوستی قائم رکھنے کے لیے میری اپنی شرائط ہوتی ہیں، کوئی ملے نہ ملے۔ اس سلسلے میں خود میں بھی احتیاط سے کام لیتی ہوں۔ میرے کئی بوائے فرینڈ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں۔ میں تعلقات میں حدود کی قائل ہوں۔ ہر شخص کو اپنی حد میں رہنا چاہیے، اس سے تجاوز کم از کم مجھے کھل جاتا ہے۔"

"اس وقت تو تم بڑی سنجیدگی سے باتیں کر رہی ہو!"

"ہاں تم نے ذکر ہی ایسا چھیڑ دیا۔ دراصل جب تک ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھ نہ لیا جائے، دوستی چلتی نہیں۔ خیر... یہ بتاؤ کیا پیو گے؟"

"یعنی؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"کوئی بھی مشروب!" وہ اپنے گاؤن کی ڈوری سے کھیلنے لگی۔ اُس کے جسم پر اب شب خوابی کا لباس تھا۔

"نہیں، مجھے کسی مشروب کی ضرورت نہیں۔ تمھارا اشارہ شاید شراب کی طرف تھا؟"

"ہاں۔" اُس نے اقرار کیا۔

"کیا پیتی ہو تم؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"دوستوں کے لیے مقامی اور باہر کی، سبھی قسم کی رکھتی ہوں۔ تم اگر نہیں پیتے تو کوئی بات نہیں۔ میں کسی دوست کو کبھی کسی بات پر مجبور نہیں کرتی۔"

"تمھارے بھائی تو ادھر نہیں آتے؟" میں نے مصلحتاً سوال کیا۔

"اوّل تو کبھی وہ رات کے وقت ادھر آتے نہیں، لیکن آ بھی جائیں تو کبھی بور نہیں کرتے اور نہ میں اُن سے کوئی بات چھپاتی

ہوں۔ میرا مطلب یہ کہ میرے دوست یہاں پیتے بھی ہیں۔ ویسے کوئی ضروری بات ہو تو ہم فون پر کر لیتے ہیں۔ جس طرح وہ کبھی میرے دوستوں کی موجودگی میں اِدھر نہیں آتے اسی طرح میں بھی ان کا خیال رکھتی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ میرے بھائی بھی ہیں اور دوست بھی! اور دوستی میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔" پھر اُس نے پوچھا: "تم اس لباس میں خود کو بے آرام تو محسوس نہیں کر رہے؟ کہو تو میں تمہارے لیے لباس کا ..."

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔"

"تو پھر آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی پسند کے ریکارڈ سناتی ہوں۔ میرے پاس بہت اچھا ذخیرہ ہے۔"

دانیہ کی پسند اس کے مزاج کے مطابق تھی۔ ہیجان خیز مغربی موسیقی کی تال پر اُس کے دونوں پیر حرکت کرتے رہے۔ اس دوران اس نے مجھ سے رقص کے لیے بھی کہا، مگر میں نے ناواقفیت کا بہانہ کر دیا۔ میرے لیے یہ آگ سے کھیلنا ہی ہوتا اور میں یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہ تھا۔ کچھ دیر میں اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اکیلی ہی رقص کرنے لگی۔ میں اگرچہ اس کے انداز و ادا سے متاثر ہو رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ پھر وہ تھک کر میرے قریب صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اُس کا جسم پسینے سے تر تھا اور سانس کی رفتار معمول پر نہیں تھی۔ وہ میرے قریب صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ اب وہ وقت آ گیا تھا جس کا مجھے بہت دیر سے انتظار تھا۔ وال کلاک نصف شب گزر جانے کا اعلان کرنے والا تھا۔

"دانیہ! تم تو سو رہی ہو... تمہیں تو نیند آ رہی ہے!"

"نن... نہیں تو... میں کہاں... میں تو جاگ رہی ہوں۔" اُس کے ذہن نے تھوڑی سی مزاحمت ضرور کی، مگر کچھ ہی دیر میں وہ بالکل بے خبر سو گئی۔ جب میں مطمئن ہو گیا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُس نشست گاہ میں اُسی طرح بتی جلتی چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

کوٹھی کے اُس حصے تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی جو مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ اُس حصے کا دروازہ مجھے بند ملا۔ یہ توقع مجھے پہلے ہی سے تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور میرا جسم اوپر اٹھتا چلا گیا۔ دیوار زیادہ بلند نہ تھی۔ میں بہ آسانی دوسری طرف پہنچ گیا۔ اب میں مہمان خانے کی حدود میں تھا۔ وہاں کئی کمرے تھے اور بائیں جانب ملان بھی تھا۔ میں کچھ دیر دیوار سے لگا تاریکی میں گھورتا رہا۔ اگر وہ اس وقت نہ ہوا تو؟ میرے دل میں خدشہ پیدا ہوا۔ اس خدشے کا سبب ہر سمت پھیلی ہوئی تاریکی اور سناٹا تھا۔ میری تمام قوتیں اس وقت پوری طرح بیدار تھیں۔ میں اندھیرے میں دُور دُور تک دیکھ رہا تھا۔ میری قوتِ بصارت نے تاریکی میں شگاف ڈال دیے تھے۔ اب میں نے اپنی سماعت کا دائرہ بھی وسیع کر لیا تھا۔ مگر اپنے دشمن کی تلاش میں خیال کی لہروں کو سمیٹے رہا۔ اس طرح وہ چوکنا ہو جاتا۔ میں قدم قدم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگا کیوں کہ وہاں مجھے صرف وہی کمرے نظر آ رہے تھے جو سامنے کے رُخ پر تھے۔ ایک کمرہ ان کے عقب میں بھی تھا۔

میں اندھیرے ہی کا ایک حصہ بنا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ میرے قدم رُک گئے۔ میں نے مدھم سی آواز سنی اور پھر وہ آواز واضح ہو گئی۔ یہ کسی کے قدموں کی چاپ تھی جو یقیناً مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ آواز عقبی کمرے ہی کی طرف سے آ رہی تھی۔ جو کافی دور تھا۔ یہ میری قوتِ سماعت کا کمال تھا کہ اُس بند کمرے میں چلنے والے کے قدموں کی چاپ بھی میں نے واضح طور پر سن لی۔ جلد ہی میں اس کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ میرا دشمن اُسی کمرے میں ہو سکتا تھا۔ اس وقت مجھے اس کے بیدار ہونے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ میں مزید محتاط ہو گیا۔

اُس کمرے میں کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ اور اُن پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اندر بہت ہلکی روشنی تھی۔ میں اندر کی آوازیں سننے لگا۔ قدموں کی چاپ اب معدوم ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحے بعد مجھے جو آوازیں سنائی دیں اُن سے میں سمجھ گیا کہ وہ ٹرانسمیٹر پر کسی سے گفتگو کرنے کے لیے فریکوئنسی سیٹ کر رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے اور تجسس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُسے مزید کچھ دیر زندہ رہنے کی مہلت دے دوں۔ میں ہر طرح سے لیس ہو کر آیا تھا۔ اور اب مجھ سے بچ کر نکل جانا محال ہی تھا۔

"واشنگٹن... واشنگٹن... تھری ناٹ کالنگ۔ اوور!"

مجھے اس کی آواز سنائی دیتی رہی اور پھر رابطہ مل ہی گیا۔ رابطہ ملنے کے بعد وہ میرے بارے میں کسی کو رپورٹ دیتا رہا۔ اُدھر سے بھی اُسے ہدایات دی جاتی رہیں۔ وہ یقیناً کسی ایسی ہی شخصیت سے بات کر رہا تھا جو اُسے ہدایت دینے کی اہل تھی۔

"تم اسکندریہ کب جا رہے ہو؟ اوور!" اُس سے پوچھا گیا۔

"کل کسی وقت۔ اوور!"

"اگر تم کوئی فائدہ اٹھا سکو تو اس کی ماں کو ہندوستان سے مصر بھیج دیا جاتے؟ اوور!"

"نو سر! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا پروفیسر ہمارے ملک کو بھی وہ ایجاد دینے پر راضی ہو گیا جو اُس نے روس کو فراہم کی ہے؟ اوور!"

"نہیں! ہمارے احتجاج کے بعد اُس نے وعدہ کیا ہے کہ اب وہ جانبداری سے کام نہیں لے گا۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس ایجاد کی تیاری میں بہت وقت اور سرمایہ لگے گا۔ اُس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ روس سے اُس ایجاد کو واپس لے لے گا یا اسے ناکارہ بنا دے گا۔ اس معاملے کو اب ختم سمجھو۔ تم نے جو ہم سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا تھا تو اُس کی ایک وجہ تھی۔ ہماری ایک ایجنٹ سے ماضی میں ایک حماقت ہو چکی ہے جس کا احساس اب ہوا ہے۔ اس نے ابوالہول کو ایک تصویر بھیجی تھی۔ اُس وقت ابوالہول بغداد میں تھا۔ اُس تصویر کی کچھ کاپیاں یہاں بھی ہیں اس میں ہندوستان کے شہر دہلی کی مشہور جامع مسجد کے مینار بھی نظر آ رہے ہیں۔ ابوالہول اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس کی ماں کبھی دہلی میں بھی تھی اور یہ تو تمہارے علم ہی میں ہے کہ اب بھی ہم نے مصلحتاً اُسے وہیں رکھا ہے۔ تم اس کی وجہ بھی جانتے ہو۔ ابوالہول کو اگر وہ تصویر نہ بھیجی جاتی تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا کہ اُس کی ماں امریکہ میں ہو گی۔ اب ہم سوچ رہے ہیں کہ اُسے اگر ہندوستان میں بھی رہنے دیں تو کم از کم وہ شہر دہلی نہ ہو۔ اس سلسلے میں جلد ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ کیا کیا جائے۔ تم اگر فی الحال اس پر قابو نہ بھی پا سکو تو اس سلسلے میں آئندہ ہدایات ملنے تک اُسے وہیں اُلجھائے رہو۔ جب تک ابوالہول ہندوستان کا رُخ نہیں کرتا کوئی خطرے کی بات نہیں۔ دہلی سے ملنے والی رپورٹوں کے مطابق اس کی ماں سخت نگرانی اور حفاظت میں ہے تمہاری شاگرد سونیا اچھی جا رہی ہے۔ اور کوئی خاص بات؟ اوور!"

"نو سر! اب میں اسکندریہ پہنچ کر ہی رپورٹ دوں گا۔ اوور!"

"اوور اینڈ آل۔"

میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ میں اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر جب تک میری سماعت سے اُس کے تیز تیز سانسوں کی آوازیں نہ ٹکرائیں اور مجھے یقین نہ ہو گیا کہ وہ اب سو چکا ہو گا، میں ہلا بھی نہیں۔ اس کے لیے مجھے تقریباً ایک گھنٹے صبر کرنا پڑا۔

وہ مانا ہوا امریکی ایجنٹ جس پر اس کے ملک کو فخر تھا، وہ جس نے ساری دنیا میں اپنے ملک کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے اور وہ جس کے ہاتھوں اسرائیلی ایجنٹوں کی تربیت ہوئی تھی جس کا سراغ ملنا ایک مسئلہ بن گیا تھا، وہی اس وقت اپنی موت سے بے خبر بہت سکون سے سو رہا تھا۔ اُسے یقیناً یہ نہ تھی معلوم کچھ ہی دیر میں ہمیشہ کے لیے سُلا دیا جائے گا۔

سوتے ہوئے بے خبری میں اُسے ٹھکانے لگا دینا میرے لیے اس وقت بہت آسان تھا مگر اس میں صرف ایک خیال مانع ہوا۔ اس وقت اُس کا شعور خوابیدہ تھا۔ میں چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے ذہن کو کورے کاغذ کی مانند بنا دیتا یا پھر دو تین شدید ذہنی جھٹکے دے کر اُسے ٹھکانے لگا دیتا۔ یہ دونوں ہی صورتیں میرے بس میں تھیں۔ اُس کا ذہن بیدار ہوتا تو یقیناً میں ایسا نہ کر پاتا لیکن نیند کی حالت میں یہ ممکن تھا۔ اس کے لیے مجھے کمرے میں جانے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اُسے اس کے انجام تک پہنچانے سے پہلے آخری بار میں ایک اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اُسے قتل کر دیا تو پھر میری ماں کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس دھمکی میں واقعی کوئی وزن تھا یا وہ اس طرح اپنی یقینی موت کو ٹال رہا تھا؟ یہ اندازہ لگانا، اس سے گفتگو کیے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اب وہ بچ کر جاتا بھی کہاں! اور اگر قریب آ کر مجھ سے بچنا ممکن ہوتا تو وہ اب تک دور دور کیوں رہتا؟

میں نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کھڑکیوں کے ذریعے کوئی باہر نکل سکتا تھا نہ اندر جا سکتا تھا۔ اُن پر لوہے کی موٹی جالیوں کے جنگلے تھے۔ ہوا کے گزر کے لیے دروازے کی سیدھ میں کافی بلندی پر ایک روشندان تھا۔ اُس کے درمیان بھی دو آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کھلا ہوا تو تھا مگر اُس کے ذریعے بھی کمرے میں پہنچنا محال تھا۔ کمرے کا دروازہ بھی خاصا مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ دروازے کو وہ اندر سے مقفل کر کے ہی سویا ہو گا۔ کمرے میں داخل ہونے کی مجھے صرف ایک

ہی صورت نظر آئی اور میں نے اُسی پر عمل کیا۔ ممکن تھا کہ اسی طرح اُس کی آنکھ کھل جاتی مگر اُس وقت تک وہ میرے قابو میں آچکا تھا۔

میں ایک کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا اور لوہے کے جنگلے میں اپنا پنجہ پھنسا دیا۔ لکڑی کی چوکھٹ چرچرائی۔ میں نے جنگلے کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ میرے ہاتھ میں آگیا۔ اب میرے سامنے بند کھڑکی تھی۔ اس کا شیشہ توڑ کر چٹخنی کھولنا آسان تھا۔ میں نے آہنی جنگلا آہستہ سے زمین پر رکھ دیا اور اسی وقت مجھے اندر ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ اب ایک لمحہ ضائع کرنا بھی خطرناک تھا۔

میں نے کھڑکی پر اپنے ہاتھ کی ضرب لگائی اور وہ ٹوٹ کر اندر جا گری۔ اسی کے ساتھ میں نے چھلانگ لگائی اور کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی میرے ہاتھ ایک خطرناک ہتھیار آچکا تھا۔

"ابوالہول!" میرا دشمن چیخ اُٹھا۔ وہ ابھی مسہری سے نہیں اُتر سکا تھا اور اُس کے ہاتھ بھی خالی تھے۔ مجھے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا دیکھ کر وہ اسی طرح ساکت رہ گیا تھا۔

"پہچان گئے مجھے!" میں حقارت سے ہنسا۔ "مگر تمھارا اندازہ غلط ہے، میں ابوالہول نہیں ہوں۔"

"تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے! تم ابوالہول کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتے: تمھاری خوشبو....." اس کا ایک ہاتھ بہت آہستگی سے تکیے کی طرف رینگنے لگا۔

"مرنے میں جلدی نہ کرو، ہنری ناٹ!" میں نے سختی سے کہا۔ "ہاتھ اٹھالو!" اُس نے میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کی۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا دیے۔ "تم شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ میں تمھارے اس محفوظ قلعے تک نہیں پہنچ سکوں گا! موت ہر جگہ پہنچ جاتی ہے ہنری ناٹ! اور میں بھی ابوالہول نہیں، حقیقتاً تمھاری موت ہوں۔ کتنے رنج کی بات ہے کہ اب بیچاری سیلیا بھی زندہ نہیں کہ عین موقع پر تمھیں بچانے آجاتی!"

"کیا... کیا وہ تمھارے ہاتھوں ماری گئی؟" میں نے اُس کے لہجے میں خوف کا ہلکا سا شائبہ محسوس کیا۔

"ہاں وہ ماری گئی اور مجھے تمھاری موت کا راستہ دکھا گئی۔ ہے نا عجیب بات کہ اُسی کی مداخلت کی وجہ سے تم ایک بار مرتے مرتے بچے اور وہی تمھاری موت کا سبب بننے والی ہے۔"

"مگر کیسے؟" وہ اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے، یہ بات مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔

"وہ تم سے زیادہ ذہین تھی، اُس نے تمھارے اس محفوظ قلعے کا سراغ لگا لیا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے پرس سے جو پاکٹ ڈائری ملی، اس میں تمھارا پتا درج تھا۔ اُس اشاراتی تحریر کو سمجھنا میرے لیے زیادہ مشکل نہ ہوا۔ اُس نے تین کا ہندسہ بنایا تھا جس کے آگے کراس کا نشان تھا، یعنی ہنری ناٹ، تم! پھر اُس نے پیلس لکھا اور تین سو پینسٹھ! یہ اس علاقے کی نشان دہی تھی، عابدین پیلس! اس کے بعد دارالکتب، پھر چند فرلانگ شمال، دو کا ہندسہ دوسری گلی کا اشارہ تھا، یعنی دارالکتب سے شمال کی طرف چند فرلانگ پر دوسری گلی! آخر میں تمھاری عزیزی بہن ٹیبن کے عاشق کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی اور کی نظر سے یہ تحریر گزرتی تو شاید کچھ نہ سمجھ پاتا اور ممکن ہے کہ میں بھی بار بار سرسری دیکھتا تو نظر انداز کر جاتا، مگر تمھارا آخری وقت آچکا تھا۔ میں کیسے اُس تحریر کو نظر انداز کر دیتا! نہیں ہلنا مت! یہ دیکھ رہے ہو، میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ یہ بھی سیلیا ہی کا تحفہ ہے اس سے گولی کی بجائے شعاعیں نکلتی ہیں۔ مجھ پر سیلیا نے یہی ہتھیار آزمایا تھا۔ مجھے تو صرف یوں محسوس ہوا تھا جیسے میری پشت میں بیک وقت ہزاروں سوئیاں اتر گئی ہوں اور میں وقتی طور پر مفلوج ہو گیا تھا۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ شعاعیں کسی عام آدمی کے جسم پر پڑ جائیں تو وہ بڑی بھیانک موت مرے۔ میں نے ایک پتھر پر ان کا تجربہ کیا تھا۔ شعاعیں ہیولے کی صورت میں پتھر پر پڑی تھیں اور پھر اُس پتھر میں آر پار بے شمار سوراخ ہو گئے تھے۔ کہو تو تجربہ کر کے دکھاؤں؟"

"نہیں!" وہ بے اختیار بول اُٹھا۔

"تمھیں قتل کر کے مجھے افسوس رہے گا ہنری ناٹ کہ تم سے آخری ملاقات یادگار نہیں رہی۔ آخر تم نے حوصلہ کھو ہی دیا۔ میں تمھیں آہنی اعصاب کا مالک سمجھتا تھا۔ آج تو تم مجھے کوئی دھمکی بھی نہیں دے رہے کہ اگر میں نے تمھیں ہلاک کر دیا تو میری ماں کو قتل کر دیا جائے گا!" میں نے اُسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ نیک اب میں نہیں تھا اور اُس کی بھوری آنکھیں بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں۔

"یقین کرو وہ دھمکی نہیں تھی ابوالہول!" اس کی آواز میں

ارتعاش تھا۔

"میرے خیال میں تمھاری حکومت اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتی! تمھارے بڑے مجھے اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کسی قدر تم بھی مجھے جانتے ہو کہ اگر میں انتقام پر اُتر آیا، چڑ گیا تو کیا تباہی پھیل جائے گی۔ چاہے تم خود کو اپنے ملک کا سرمایہ کہتے رہو، مگر تم اپنی قوم کے مزاج سے بھی واقف ہو گے! وہ معمولی نقصان کی خاطر کوئی بڑا نقصان اُٹھانے پر ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے تمھارے خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ تمھیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ میری حکومت تمھارے بارے میں کتنے خطرناک فیصلے کر چکی ہے۔ یہ جان کر بھی شاید تمھیں حیرت ہو کہ تمھاری ماں اب میری قید میں ہے۔ اُسے میں نے گذشتہ ہفتے یہیں بلوا لیا ہے تاکہ تم سے کوئی سودے بازی کی صورت نکل آئے تو....."

میں ہنس پڑا۔

"تم ہنس رہے ہو ابوالہول!" وہ برہم ہو گیا۔ "لیکن ابھی تمھاری ہنسی دم توڑ دے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"تمھاری ماں کو میں نے جن خطرناک آدمیوں کے حوالے کیا ہے، اُنھیں یہ تاکید کر دی ہے کہ اگر میں ہر دوسرے دن ان سے رابطہ قائم نہ کروں تو وہ بے دریغ تمھاری ماں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں! اب ہنسو! تمھاری ماں اب امریکی حکومت کے قبضے میں نہیں، میرے قبضے میں ہے!"

میں پہلے سے بھی زیادہ زور سے ہنس پڑا تو اس کا چہرہ بجھنے لگا۔ "سنو ہنری ناٹ! بہادروں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ جب وہ شکست کھا جائیں تو خندہ پیشانی سے اُسے قبول کر لیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ تم اندر سے بہادر نہیں، بزدل ثابت ہوئے۔ تمھیں جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں رہا۔ موت کے خوف سے شاید تمھاری عقل خبط ہو گئی ہے۔ ورنہ ایسی احمقانہ باتیں نہ کرتے۔ تم شاید یہ بھول گئے، میں نے تم سے کہا تھا کہ صرف اپنی ماں کی زندگی بچانے کے لیے میں ساری انسانیت کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتا!"

"تو تم... تمھیں اپنی ماں کی موت کا بھی افسوس نہیں ہوگا!" اس کی آواز بے جان سی ہو گئی۔

"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی موت سے بچنے کے لیے مجھے دھمکی نہیں دے رہے: یاد ہے نا تمھیں! تم نے تو مجھے اپنی حکومت کے اگلے اقدام سے آگاہ کیا تھا کہ میرے ہاتھوں تمھارا قتل ہو گیا تو میری ماں بھی زندہ نہیں بچے گی! یہی کہا تھا نا تم نے بولو!" اُس نے سر ہلا کر میری بات کی تائید کی تو میں نے مزید کہا۔ "تو سنو کہ تم نے جھوٹ بولا تھا! تم نے اپنی موت سے بچنے کے لیے ہی یہ کہانی سنائی تھی! اور اس کا ثبوت یہ نئی کہانی ہے جو تم ابھی مجھے سنا چکے ہو۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔ یہی تمھارے ساتھ بھی ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم اپنے بڑوں کی پیشکش قبول کر لیتے۔ آج بھی تو تم سے کہا گیا تھا کہ اگر کوئی فائدہ اٹھا سکو تو میری ماں کو ہندوستان سے یہاں بھجوا دیا جائے مگر تم نے انکار کر دیا!"

میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ "ابوالہول! میں ہار گیا!" میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے طویل سانس لیا۔ "کیا تم مجھ سے سودے بازی کر سکتے ہو؟"

"کس معاملے میں؟"

"مجھ سے زیادہ تمھارے لیے وہ چینی ایجنٹ لوئی چو خطرناک ہے۔ اگر میں تمھیں اس کا پتا بتا دوں تو کیا تم مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟"

"اور تم بدستور میرے لیے خطرہ بنے رہو گے!"

"نہیں! میں اپنی حکومت سے معذرت کر کے امریکہ واپس چلا جاؤں گا۔" اُس نے پُر اُمید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "پہلے تم ہی نے مجھے یہ پیشکش کی تھی۔" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"اگر تم پے در پے جھوٹے ثابت نہ ہوتے، بزدلی کا ثبوت نہ دیتے تو شاید میں تمھیں اب بھی قتل نہ کرتا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ تمھارے علم میں چند ایسی باتیں آچکی ہیں جو میری ماں کے لیے خطرے کا سبب بن سکتی ہیں۔ اگر تم بچ گئے تو اپنی حکومت کو فوراً تازہ ترین صورت حال سے باخبر کر دو گے اور میری ماں کو فوری طور پر ہندوستان سے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔"

"مگر وہ خود بھی تو یہی سوچ رہے ہیں۔" وہ جلدی سے بولا —

"دیر لگے گی اس میں! ابھی اُنھوں نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا اور میں اس فیصلے سے پہلے ہی ہندوستان پہنچ جاؤں گا!" میں نے اُسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ "رہا اس چینی ایجنٹ ٹونی چو کا معاملہ تو جس طرح میں نے بیلیا ایسی خطرناک ایجنٹ کو ختم کر دیا، جیسے میں نے تمھیں ڈھونڈ نکالا، اُسے بھی تلاش کر لوں گا۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں احمق آدمی!"

موت واقعی انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے ورنہ وہ بدنصیب شخص نتیجے سے بیگانہ اور بے پروا ہو کر مجھ پر چھلانگ نہ لگا دیتا۔ ابھی اُس نے مجھ تک پہنچنے کے لیے نصف فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ رنگ برنگی شعاعوں کی بوچھاڑ اُس کے جسم پر پڑی اور وہ گوشت کے کسی بے جان لوتھڑے کی طرح زمین پر آ رہا۔ کمرے میں جلتے ہوئے گوشت کی بو پھیل گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے جسم کو دہکتی ہوئی سلاخوں سے چھید دیا گیا ہو۔ وہ چیخ بھی نہیں سکا۔ شعاعوں کی زد میں اُس کا چہرہ بھی آ گیا تھا۔ میں اُس کا مسخ چہرہ زیادہ دیر نہ دیکھ پایا اور منہ پھیر لیا۔

پھر اس عمارت سے فرار ہونے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں وہاں سے الازہر پہنچا۔ وہ مکان چھوڑنے کا فیصلہ میں نے دن ہی میں کر لیا تھا۔ میرا سامان بندھا رکھا تھا۔ پہلے میرا کچھ اور ارادہ تھا مگر اب وہ ارادہ بدل دیا۔ میں قاہرہ ہی کے کسی اور علاقے میں سکونت اختیار کر لیتا، چینی ایجنٹ ٹونی چو سے نمٹنے کے بعد ہی قاہرہ سے ہندوستان جاتا۔ موجودہ صورتِ حال کا تقاضا کچھ اور تھا۔ میں نے اسی تقاضے کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہیلیو پولس کا علاقہ ایئرپورٹ سے قریب تر ہے۔ میں اُسی علاقے اور اُسی ہوٹل میں منتقل ہو گیا جہاں قاہرہ آنے کے بعد پہلی بار ٹھہرا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی دن قاہرہ سے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ امریکی حکومت میری ماں کو وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیتی یا ہندوستان ہی کے کسی اور شہر میں بھیج دیتی، میں اُسے امریکی ایجنٹوں کے چنگل سے چھڑا لینا چاہتا تھا۔

جب میں نے یہ اعلان سُنا کہ جہاز اب پالم کے ہوائی اڈے پر اُترنے والا ہے تو میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میں اب اُس شہر میں داخل ہونے والا تھا جہاں میری ماں تھی اور جہاں ہنگامے میرے انتظار میں تھے۔

مجھے دلّی آئے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ میں نے پہلے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ امریکی ایجنٹ جو قاہرہ میں میرے ہاتھوں مارا گیا، اُس کے متعلق امریکی حکومت کو کم از کم ہفتے بھر میں کچھ علم ہو سکے گا۔ اِسی کے بعد امریکی حکومت کوئی قدم اٹھا سکے گی۔ میری ماں کو دلّی میں ہی رکھنے یا نہ رکھنے کا مسئلہ بھی ایک ماہ قبل امریکی حکومت کے زیرِ غور تھا۔ اپنے ایک خطرناک ایجنٹ کی موت اور میری گمشدگی کے بعد اُنھوں نے کیا فیصلہ کیا ہو گا؟ یہ سوال میرے نزدیک بہت اہم تھا۔ کسی مصلحت کے تحت اُنھوں نے میری ماں کو دلّی میں رکھا تھا۔ کیا وہ مصلحت اب بھی برقرار ہو گی؟ یا اُنھوں نے یہ جاننے کے بعد کہ میں ایک بار پھر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو چکا ہوں، احتیاطاً میری ماں کو دلّی سے کہیں اور بھیج دیا ہو گا؟ میرا ذہن سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا اُبھرتا رہا۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ میں نے قاہرہ سے ہندوستان کے شہر دلّی کا رُخ کیا ہو گا!! اس خیال سے میرے ذہن کو ذرا سا سکون ہوا۔ میں کہاں، کس ملک اور کس شہر میں ہوں؟ اب تک اس کا علم پروفیسر کو بھی نہیں تھا۔ پھر امریکی حکومت کو کیسے خبر ہوتی کہ میں دلّی پہنچ چکا ہوں۔ کیا خبر میرے بارے میں کوئی سراغ ملنے کے بعد ہی وہ میری ماں کو دلّی سے کہیں اور منتقل کرنے کی بابت سوچیں۔ اِس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا پروفیسر نے مجھے اپنی قوتیں استعمال کرنے کی ترغیب دی تھی اور ڈرایا بھی تھا کہ اِس طرح میری حیرت انگیز قوتیں ختم بھی ہو سکتی ہیں۔ ایسا ہو بھی جاتا تو مجھے کوئی ملال نہ ہوتا۔ ہاں بس اتنی خواہش ضرور تھی کہ اس سے پہلے میں اپنے والدین اور بھائی کو دشمنوں کے نرغے سے نکال لوں۔ میں یہ بھولا نہیں

تھا کہ میرے والد کس اذیت میں ہیں! کیا خبر میری ماں بھی کسی ایسی ہی روحانی یا جسمانی اذیت میں مبتلا ہو! اور میرے بھائی کو بھی اذیتیں دی جا رہی ہوں۔ ان روح فرسا خیالوں نے مجھے بے چین کر دیا اور مجھے شدت سے شراب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میری بلانوشی کسی کو بھی میری طرف متوجہ کر سکتی ہے اور متوجہ ہونے والا میرا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے جو میری عادات سے واقف ہو، یہ سوچ کر میں نے کمرے ہی میں شراب منگوالی۔

میں ابھی دوسری بوتل ختم کر پایا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے ریسیور اُٹھا لیا۔ "پرنس ادریس!" میں نے کہا۔

"آپ ہٹلر سے آئے ہیں نا؟" میں نے ثمینہ احمد کی آواز پہچان لی، مگر وہ یقیناً میری بدلی ہوئی آواز نہیں پہچان سکی ہو گی۔

"جی ہاں۔"

"آپ نے مجھے آج گھر پر فون کیا تھا؟"

"جی ہاں" میں نے اقرار کیا۔

"آپ کے اُن دوست کا کیا نام ہے جو مجھ سے یہاں ملے تھے؟"

میں نے فوراً ہی ایک نام لے دیا اور پھر جلدی سے بولا۔ "بیگم صاحبہ آپ کو تو یاد ہی نہیں ہو گا، اُس کا نام وہ لوگ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اور بات بھی سال بھر پہلے کی ہے۔ اس دوران میں نہ جانے آپ کتنے لوگوں سے ملی ہوں گی!"

"ہاں یہ تو آپ نے بالکل درست کہا۔ مجھے واقعی آپ کے دوست کا نام یاد نہیں آ رہا۔ خیر۔۔۔ وہ آپ نے نواب صاحب سے کسی اداکاری۔۔۔ میرا مطلب یہ کہ اداکاری کی تربیت دینے والے۔۔۔"

"جی، جی ہاں" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "کسی وقت تشریف لائیں یا پھر مجھے کہیں حاضر ہونے کا حکم دیں تو تفصیلی گفتگو ہو۔"

"میں خود آ جاؤں گی، کسی وقت! آپ ہوٹل میں اپنے اوقات بتائیں۔"

"کل آ جائیں، صبح سے دو بجے تک کسی بھی وقت۔"

"کل تو مشکل ہے، میں آگرہ جا رہی ہوں اور معلوم نہیں کتنے دن لگیں وہاں۔ ہاں آج ممکن ہے۔ میں آپ کو کوئی وقت دے سکوں۔"

"بسر و چشم!" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آج مجھے بھی کہیں نہیں جانا۔ کل سے البتہ سیر و تفریح کا پروگرام ہے۔ روز روز تو دلّی آنا ہوتا نہیں!"

"تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ اس وقت سوا سات بج رہے ہیں، میں دس بجے رات تک آ سکوں گی۔"

"کمرہ نمبر تو یاد ہے آپ کو؟ میں نے محترم نواب صاحب کو۔۔۔"

"جی میں نے سو سات ہی بتایا تھا نا آپ نے؟" میں نے تصدیق کر دی تو اُس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے قطعی توقع نہیں تھی کہ ثمینہ احمد سے اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔ اسی عورت کے ذریعے میں جلد از جلد جمیلہ احمد کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکتا تھا، وہ جمیلہ احمد جس پر مجھے امریکی ایجنٹ ہونے کا شبہ تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ پھر جب تک دس بجے اور وہ آئی تو میں اپنے ذہن میں ایک خاکہ مرتب کر چکا تھا۔

میں اُس سے بڑی خوش اخلاقی سے ملا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بھی ایک چمک سی لہرائی۔ یقیناً میری وجاہت نے اُسے متاثر کیا تھا۔ "پہلے یہ فرمائیں بیگم صاحبہ کیا پئیں گی؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"آپ کیا پی رہے تھے؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔ میں نے بے تکلفی کے ساتھ میز کے نیچے سے ایک بوتل نکال کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس میں ابھی نصف شراب باقی تھی۔

"شکریہ! مجھے اِس کا شوق نہیں۔" اُس نے جھوٹ بولا۔ "ہاں کبھی کبھار مجبوراً تقاریب میں چکھ لیتی ہوں۔ آپ اِسے اگر میری بداخلاقی نہ سمجھیں تو کہوں کہ میرے پاس وقت کم ہے۔" اُس نے اپنی اہمیت جتائی حالانکہ مجھے یقین تھا کہ اُسے ساری رات بھی بٹھائے رکھوں تو وہ میرے پاس سے اُٹھ کر نہیں جائے گی۔ میں اُس بگڑی ہوئی عورت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

پھر میں نے مختصراً اُس فرضی ادارے کا ذکر کیا جو

ڈپنے میں اداکاری کی تربیت دینے کے لیے کھولا جانے والا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ میں ہی اُس ادارے کا سرپرست ہوں۔ اُس نے افتتاحی تقریب میں شرکت کی حامی بھر لی اور مہمانِ خصوصی کے لیے ہندوستان کے مشہور اداکار دلیپ کمار کا نام لیا۔ "یہ ممکن ہے کل ہی میری اُن سے ملاقات ہو جائے۔ آپ کہیں تو کوئی ڈیٹ لے لوں اُن سے؟" وہ ایسے لہجے میں بولی جیسے مجھ پر احسانِ عظیم کر رہی ہو۔ "آپ کو تو خبر ہوگی کہ اُن جیسے عظیم اداکار سے ڈیٹ لینا کوئی آسان بات نہیں۔"

"بالکل بجا کہا آپ نے! مگر کل؟"

"میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا نا کہ کل آگرہ جا رہی ہوں، وہیں اُن سے ملنے کا امکان ہے۔ پچھلے دنوں وہ یہاں بھی آئے ہوئے تھے مگر اتنے مصروف رہے کہ ملاقات نہ ہو سکی۔"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو کر کے آخر میں مطلب کی بات پر آ ہی گیا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اِسی وجہ سے کچھ تعلقِ خاطر محسوس کر رہا ہوں۔ اِسی تعلق کے سبب اب مجھے ایک بات پر بہت رنج ہو رہا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ میں نے جو کچھ سنا ہے وہ سچ بھی ہے یا نہیں! بہرحال افسوس سا ہو رہا ہے، جانے کیوں! حالانکہ آج پہلی بار آپ سے ملاقات..."

"کس بات پر افسوس ہو رہا ہے آپ کو؟" وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔

"بس ایسی ہی بات ہے، چھوڑیں!" میں نے تجسس پیدا کیا۔ "نجی قسم کی باتوں کو زیرِ بحث لانا کچھ اچھا نہیں لگتا!"

"آپ بتائیں تو سہی کہ بات کیا ہے؟" میری توقع کے مطابق وہ پُرتجسس لہجے میں بولی۔ "یقین کریں، اگر وہ بات سچ ہوئی تو میں اُس کے اعتراف سے گریز نہیں کروں گی۔ جب آپ کے علم میں بھی وہ بات ہے تو پھر نجی کہاں رہی!"

"میں پہلے بھی دبئی گھومنے آتا رہا ہوں۔" میں نے بات بڑھایا۔ "یوں ہی ایک بار کچھ دوستوں کی محفل میں آپ کا ذکر بھی آ گیا تھا۔ اُس وقت میں نے صرف آپ کا نام ہی سُنا تھا اس لیے اُس بات پر کوئی زیادہ دھیان نہیں دیا، لیکن آج آپ سے ملنے کے بعد وہ بات یاد آئی تو رنج سا ہوا۔ مجھے اِس وقت آپ کو اتنے قریب دیکھ کر یقین نہیں آ رہا کہ آپ ایسی خاتون جس کی شریکِ حیات ہوں، وہ دوسری شادی کا تصور بھی کر سکتا ہے! حیرت ہے!"

اُس نے میری بات سن کر طویل سانس لیا، پھر بولی۔ "حیرت تو خود مجھے بھی ہے پرنس!"

"تو واقعی یہ بات سچ ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں سچ ہے پرنس!" اُس نے پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ "یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ خاتون جو میری محبت کی شریک بن بیٹھی ہیں، ہڈیوں کا ڈھانچا ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے نواب صاحب کو اُن کی کون سی ادا بھا گئی ہے۔"

"ہیں کہاں کی وہ؟" میں نے لاتعلقی سے سوال کیا تاکہ اُسے کوئی شک نہ ہو۔

"شادی تو فرانس میں ہوئی تھی۔ میں بھی تھی نواب صاحب کے ساتھ، مگر وہ خاتون فرانسیسی نہیں ہیں۔"

"پھر؟"

"کسی عرب ملک کی ہیں، شاید مصر کی یا پھر کسی اور عرب ملک کی ہوں گی، میں نے کبھی نواب صاحب سے پوچھا نہیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ..."

پھر ثمینہ احمد جانے اور کیا کیا کہتی رہی، مگر میں جیسے کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ "ہڈیوں کا ڈھانچا ہیں... کسی عرب ملک میں" میرا ذہن انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا۔ مجھے اپنا سانس محسوس ہونے لگا۔ میرا ذہن بہت سرعت سے کچھ کڑیاں جوڑنے میں مصروف اور دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بُڈھی اور امریکی ایجنٹ، یہ دونوں باتیں ایک ہی سمت اشارہ کر رہی تھیں۔ اپنی منزل کو اس قدر قریب دیکھ کر مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

اب تک میں نے جمیلہ احمد کے بارے میں جو مفروضے قائم کیے تھے، وہ ثمینہ احمد کے بیان سے غلط ثابت ہو گئے۔ ثمینہ احمد سے گفتگو کرتے ہوئے جیسے بہت وقت نکل گیا۔ اِس کو ثمینہ احمد نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ بولی۔ "پرنس! آپ کیا

گئے؟"

میں اُس کی آواز سُن کر چونکا۔ "دراصل میں یہ سوچ رہا تھا بیگم صاحبہ کہ ہر شخص کی نظر میں حُسن اور خوبصورتی کا معیار مختلف ہوتا ہے۔" میں نے بات بنائی، پھر بڑی ہوشیاری سے ایک سوال کیا جو میرے نزدیک بہت اہم تھا۔ "جمیلہ احمد صاحبہ کا قیام کہاں ہے؟ آپ تو جاتی ہوں گی وہاں؟"

"جی نہیں۔" اُس نے قدرے ناگواری سے جواب دیا، پھر بولی "معاف کیجیے گا، میں اس موضوع پر مزید گفتگو پسند نہیں کروں گی۔ یہ بتائیں کہ یہاں آپ کا قیام کب تک ہے؟" اُس نے میرے سوال کو ٹال دیا۔

"ابھی کچھ دن رہوں گا۔ فی الحال! یقینی طور پر کچھ عرض نہیں کر سکتا۔" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی دو ایک ہفتے تو رہیں گے نا؟"

"جی!"

"پھر آگرہ سے آکر ہی آپ سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔ میں فون کر لوں گی آپ کو۔ ہوٹل میں رات کے وقت تو آپ ملیں گے ہی!" تصدیق طلب انداز میں بولی۔

"بالکل!" میں نے کہا اور پھر اُس نے رخصت کی اجازت چاہی۔ میں نے اُسے نہیں روکا، البتہ اُس کے چہرے سے یہی ظاہر تھا جیسے وہ رُکنا چاہتی ہو یا میں اُس سے رُکنے کو کہوں گا۔ اُسے شاید یہ علم نہیں تھا کہ میں اس وقت کس قدر ہیجان کا شکار ہوں اور یہ کہ تنہائی چاہتا ہوں۔ ایسی بوالہوس عورت کو روکے جانے کی خواہش کیوں ہوگی، میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

میں نے کچھ عرصے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی پُراسرار قوتیں استعمال کرنے سے بچوں گا، میں اِس طرح اپنے دشمنوں سے محفوظ رہتا مگر اُس وقت اپنے فیصلے پر قائم رہنا مشکل ہو گیا۔ اب میرے لیے مزید صبر کرنا محال تھا۔ ممکن ہے کہ ثمینہ احمد میرے سوال کا جواب دینے سے گریز نہ کرتی تو میں اب بھی ایسا نہ کرتا۔ مصر سے ہندوستان آنے کے بعد میں نے جیسے خود کو بالکل بدل لیا تھا۔ یہ تبدیلی اُس وقت تک کے لیے تھی جب تک مجھے کامیابی کی امید نہ بندھ جاتی۔ یہ وہ وقت تھا کہ میں نے ثمینہ احمد کا ذہن پڑھنا شروع کر دیا۔ اب یہ وقت ضائع کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں اُس کے ذہنی [illegible] اُلجھتے ہوئے بولا۔ "آئیے میں نیچے تک چھوڑ آؤں آپ کو!"

"اِس تکلف کی کیا ضرورت ہے، میں چلی جاؤں گی۔" وہ نشست سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ نے بھی تو زحمت کی ہے یہاں تک آنے کی!" میں کھڑا ہو گیا۔ گفتگو کرتے ہوئے بھی میری توجہ اُس کے ذہن ہی پر مرکوز رہی۔

اُس کے ذہن نے قطعی مدافعت نہیں کی، اور میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ مجھے رجھانے کے لیے مختلف حربے آزماتی ہوئی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اُسے یقیناً یہ خبر نہیں تھی کہ میں اُس کے اندر جھانک رہا ہوں۔ وہ نیچے آ کر جب تک اپنی گاڑی میں بیٹھی، میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اُسے چھوڑ کر سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔

ثمینہ احمد کا ذہن پڑھنے کے بعد مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ میری منزل قریب آ گئی ہے۔ میرے لیے جو بات سب سے زیادہ چونکا دینے والی ثابت ہوئی، وہ یہ تھی کہ ثمینہ احمد کو اپنے شوہر نواب افتخار احمد پر امریکی ایجنٹ ہونے کا شبہ تھا۔ یہ شبہ اُسے پہلی بار فرانس کے دورانِ قیام میں ہوا۔ یہ چھ سال پہلے کی بات تھی۔ فرانس میں ثمینہ احمد نے اپنے شوہر کو کچھ امریکیوں سے ملتے دیکھا تھا۔ اُن امریکیوں کا تعلق امریکی سفارت خانے سے تھا۔ ثمینہ احمد نے جب اس سلسلے میں استفسار کیا تو نواب افتخار احمد کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ پھر انہی لوگوں کے ساتھ جمیلہ احمد نظر آئی جس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ چند ہی دن بعد خلافِ توقع نواب افتخار احمد نے ہندوستان واپسی کا فیصلہ کیا اور اسی کے ساتھ ثمینہ احمد کو بتایا کہ میں نے ایک اور شادی کر لی ہے۔ ثمینہ احمد سے نواب افتخار احمد کے کوئی اولاد نہیں تھی، دوسری شادی کرنے کا اُس نے یہی جواز پیش کیا۔

"قہراً و جبراً" ثمینہ احمد نے دوسری عورت کو بظاہر برداشت کر لیا مگر اندر سے وہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ اُسے اپنے شوہر سے واقعی محبت تھی۔ دوسری عورت اس محبت میں حصہ بٹانے آ گئی تھی تو اُس کی محبت انتقام میں بدل گئی۔ غنودہ غنودہ سی جمیلہ احمد بہت کم گو تھی، لیکن بہرحال ثمینہ احمد سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت تھی۔ ثمینہ احمد کو بالکل معلوم نہ تھا کہ اُس کے شوہر نے کب، کہاں اور کن حالات میں جمیلہ احمد سے شادی کی۔ نہ اُسے یہ خبر تھی کہ شادی کی اُس خفیہ تقریب میں کون لوگ شریک تھے۔ اس کے علاوہ جمیلہ احمد

کے بارے میں بھی نواب افتخار احمد نے اُسے پوچھنے کے باوجود کچھ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے؟ فرانس سے ہندوستان آنے کے بعد دونوں میاں بیوی میں عملاً ازدواجی تعلقات ختم ہو گئے۔ مگر دکھاوے کے لیے وہ اب تک ساتھ رہ رہے تھے۔ جمیلہ احمد کو نواب افتخار احمد نے ایک الگ کوٹھی میں رکھا تھا جو لودھی روڈ کی ایک ذیلی شاہراہ پر تھی۔ یہ لودھی روڈ ہی کی دوسری شاہراہ کہلاتی ہے اور لودھی پارک اِس کے عقب میں ہے۔

پھر جب ثمینہ احمد نے انتقاماً بے راہ روی اختیار کر لی تو نواب افتخار احمد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ خود بھی اُسی راہ پر چلنے لگا۔ ثمینہ احمد کچھ اور ہی سمجھی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ نواب افتخار احمد یہ بے راہ روی برداشت نہیں کر سکے گا۔ پھر وہ اُس سے جو بات چاہے گی منوا لے گی۔ اُس کا اصل مقصد دوسری بیوی کو طلاق دلانا تھا۔ اس میں ثمینہ احمد کو ناکامی ہوئی تو وہ دوسرے حربے آزمانے لگی۔ اُن کا مقصد بھی نواب افتخار احمد پر دباؤ تھا۔ اس ضد میں وہ اتنی آگے بڑھ گئی کہ اُس نے جمیلہ احمد کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس موقع پر کچھ غیر ملکی سامنے آ گئے جو امریکی تھے۔ وہ لوگ، جمیلہ احمد کی ڈھال بن گئے۔ اُن لوگوں کے بارے میں ثمینہ احمد کو بس یہ معلوم ہو سکا کہ اُن کی سربراہ ایک امریکی عورت ہے۔ اِن کے بارے میں بھی ثمینہ احمد کا یہی خیال ہے کہ یہ لوگ امریکی ایجنٹ ہیں۔ اُن امریکی ایجنٹوں کا جمیلہ احمد سے کیا تعلق تھا اور وہ کیوں جمیلہ احمد کی حفاظت کر رہے تھے، یہ باتیں ثمینہ احمد کے لیے راز تھیں۔ وہ انتہائی بااثر عورت ہونے کے باوجود اس عقدے کو حل نہ کر سکی۔ چھ سال کے دوران میں اُس نے پس پردہ رہ کر کئی بار جمیلہ احمد کو ختم کرانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ جمیلہ احمد کے گرد اُن امریکیوں نے ایسا مضبوط حصار قائم کر رکھا تھا جسے کسی طرح توڑنا ثمینہ احمد کے بس میں نہ تھا، مگر اُس کی کوششیں اب بھی جاری تھیں۔ ان کوششوں سے وہ یوں بھی باز نہ آتی کہ اُس کے امریکی دشمن کبھی اُس کی زندگی کے لیے خطرہ نہیں بنے۔ انھوں نے ثمینہ احمد کو ان حرکتوں سے روکنے کے لیے پہلے دھمکی سے کام چلانا چاہا، پھر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ثمینہ احمد پر یقیناً وہ کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ اُنھیں ثمینہ احمد کی بے راہ روی کا علم تھا۔

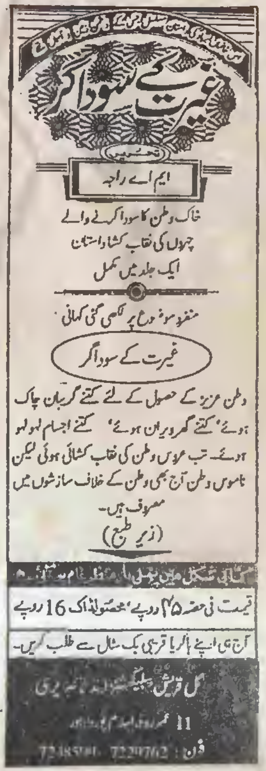

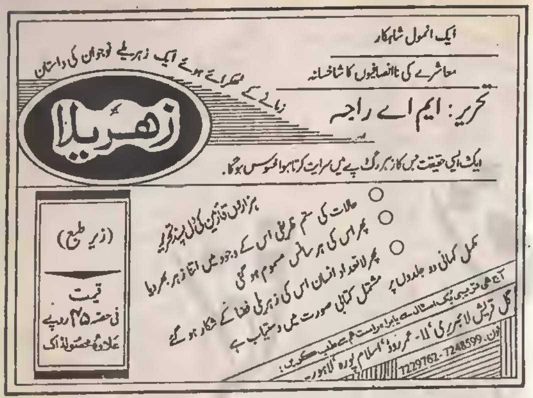

جب بھی ثمینہ احمد ادھر سے گزرنے لگتی اُسے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا جاتا۔ کسی بے راہ عورت کے لیے اِس سے بڑی ذہنی اذیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے شکار کو ورغلا کر یا ڈرا کر بھگا دیا جائے۔ ثمینہ احمد کے دشمن اُس کے ساتھ یہی کھیل کھیلتے رہتے تھے۔ خود میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ انھوں نے مجھے ثمینہ احمد کا "شکار" سمجھ کر دھمکی دی۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ میں خوفزدہ ہو کر ثمینہ احمد سے تعلقات ختم کر لوں۔ ثمینہ احمد کچھ ہی دن پہلے اُس کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کر چکی تھی، جہاں جمیلہ احمد کا قیام تھا۔ نواب افتخار احمد نے ثمینہ احمد کو اُس کوٹھی میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ یہ بات کوٹھی کے ملازمین کے علم میں بھی تھی۔ اُنھیں بھی سختی سے یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ ثمینہ احمد وہاں داخل نہ ہو۔ وہ نواب افتخار احمد کے دیرینہ ملازم تھے اور اُن پر نواب کو پورا بھروسا تھا۔ نواب افتخار احمد اور چند امریکیوں کے سوا اُس کوٹھی میں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ امریکی بھی کسی نہ کسی ظاہری سبب سے وہاں آتے جاتے تھے۔

اِن میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی، جو ہر ہفتے جمیلہ احمد کا طبی معاینہ کرنے کے لیے آتی تھی۔ یہ امریکی لیڈی ڈاکٹر ثمینہ احمد کی نظر میں زیادہ مشتبہ تھی۔ اِس کی وجہ یہ کہ وہ نگرانی کے باوجود ہمیشہ ثمینہ احمد کے آدمیوں کو جُل دے کر نکل جاتی تھی۔ ثمینہ کو اُس کے متعلق اب تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے؟ ثمینہ احمد کا ذہن پڑھ کر مجھے اِن باتوں کے علاوہ اور بھی کئی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔

حالات اور قرائن سے یہی ظاہر تھا کہ میں درست نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میں چھ سال قبل ہی تو پروفیسر سے باغی ہو کر بھاگا تھا اور اُس وقت سے اب تک ساری دُنیا میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ نواب افتخار احمد نے بھی جمیلہ احمد سے اُسی زمانے میں شادی کی تھی۔ یہ اُس اُلجھی ہوئی گتھی کا پہلا سرا تھا۔ جمیلہ احمد کی کم گوئی، غنودہ غنودہ سا نظر آنا اور امریکیوں کے ساتھ اُس کا ہونا، میرے نزدیک یہ بھی اہم بات تھی۔ ثمینہ احمد کے بیان کے مطابق وہ مصر یا کسی اور عرب ملک کی تھی۔ فرانس میں امریکی سفارت خانے سے متعلق افراد کے ساتھ وہ دیکھی گئی تھی، پھر

نواب افتخار احمد نے اُس سے شادی کر لی تھی۔ اُس کے بعد اپنے ساتھ اُسے ہندوستان سے آیا تھا۔ پھر ہندوستان آنے کے بعد بھی اُس کا امریکیوں کی حفاظت میں رہنا، اِس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ امریکیوں کو اُس سے کوئی گہری دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ دلچسپی بے سبب نہیں ہوگی۔

دِلّی ہی میں میری ماں بھی تھی جو امریکی ایجنٹوں کی سخت نگرانی میں تھی۔ میں اُسی کی تلاش میں قاہرہ سے دہلی آیا تھا۔ طویل جدّ و جہد اور تلاش و کاوش کے بعد اپنی ماں کے بارے میں مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں، کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے میں نے اُن پر دوبارہ غور کیا۔ جب میں پروفیسر کے پاس سے فرار ہو گیا تو اُسے اغوا کیا گیا، گویا تقریباً چھ سال پہلے! امریکیوں نے مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے اُسے یرغمال بنا لیا۔ اُسے مصلحتاً امریکہ میں رکھنے کی بجائے ہندوستان میں رکھا گیا اور ہندوستان کا وہ شہر دِلّی تھا۔ دِلّی میں میری ماں کی حفاظت اور نگرانی کی ذمہ دار ایک امریکی ایجنٹ سونیا تھی۔ بقیہ امریکی ایجنٹ اُسی کی ماتحتی میں تھے۔

جمیلہ احمد کی نگرانی اور حفاظت پر مامور امریکی ایجنٹوں کی سربراہ بھی ایک امریکی عورت تھی۔

چھ سال پہلے میری ماں کو یرغمال بنایا جانا اور اتنے ہی برس قبل جمیلہ احمد اور نواب افتخار احمد کی شادی ہونا۔ میری ماں کو ہندوستان میں رکھا جانا اور جمیلہ احمد کا بھی ہندوستان آنا، پھر دونوں معاملات میں امریکیوں کا ملوث ہونا، یہ باتیں، یہ مماثلت، واقعات کی یہ یکسانی کیا محض اتفاقات پر مبنی ہو سکتی ہے؟ میرے ذہن نے اِس کا جواب نفی ہی میں دیا۔ اتنے اتفاقات مشکل ہیں۔

میں نے اپنی ماں کی دو تصویریں دیکھی تھیں، ایک بغداد کے دورانِ قیام میں اور دوسری قاہرہ میں۔ پہلی تصویر مجھے ایک امریکی ایجنٹ نے بھیجی تھی جس کے پس منظر میں دِلّی کی جامع مسجد کے مینار تھے۔ وہ تصویر مجھے اِس یقین دہانی کے لیے بھیجی گئی تھی کہ میری ماں، امریکیوں کی قید میں ہے۔ دوسری تصویر نیلی آنکھوں والی یمامہ کے پاس تھی۔ وہ تصویر یمامہ کے پاس اِس لیے محفوظ رہی کہ اُس میں یمامہ کا محبوب بھی تھا۔ یہ دونوں تصویریں میرے عہدِ طفلی کی تھیں۔ گویا اب سے تقریباً انیس سال پہلے کی!

اِن دونوں تصویروں کے علاوہ ماضی قریب کی کوئی تصویر میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ اتنے طویل عرصے میں چہرے کے خدوخال بدل جانا فطری بات ہے۔ اِس کے علاوہ جسمانی ساخت میں بھی بڑی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ مجھے اِسی لیے یقین نہیں تھا کہ اپنی ماں کو پہچان سکوں گا۔ جمیلہ احمد کو دیکھ کر کوئی قطعی فیصلہ میرے لیے مشکل ہوتا۔ وہ خود اپنے بارے میں کچھ بتلانے کے قابل ہوگی، میری نظر میں یہ امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔

جمیلہ احمد کے معاملے میں دو شخصیتیں اہم تھیں، پہلی اہم شخصیت نواب افتخار احمد کی تھی اور دوسری اُس پُراسرار امریکی عورت کی شخصیت جو امریکی ایجنٹ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اِنھی دونوں سے کوئی سُراغ ملتا۔ نواب افتخار احمد کے بعد اُس پُراسرار عورت تک پہنچنا بھی ممکن تھا۔

ثمینہ احمد کا ذہن پڑھ کر میں اپنی پُراسرار قوتوں کو استعمال کرنے کا خطرہ مول لے چکا تھا کہ اِس کے سوا کوئی راہ نہ تھی۔ اگر پروفیسر کو اِس طرح واقعی میرا سراغ مل جاتا ہوگا کہ میں کہاں ہوں تو ایسا ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے دوبارہ اپنی قوتوں کے استعمال سے کوئی خوف نہ تھا۔ ہندوستان آ کر میں نے اپنے جو اختیارات خود ہی معطل کر دیے تھے، اُنھیں بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔ میں اِس طرح کم سے کم وقت میں صحیح اور یقینی نتیجے تک پہنچ جاتا۔ پھر جیسے میرے اندر سویا ہوا ابوالہول بیدار ہو گیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ لباس تبدیل کر کے میں نے پہلے نواب افتخار احمد کو فون کر لینا ضروری خیال کیا کہ وہ اِس وقت اپنے گھر ہے بھی یا نہیں! میں نے آپریٹر کو نمبر بتایا اور اُس نے کچھ دیر بعد ہی نمبر ملا دیا۔ دوسری جانب سے بولنے والی کوئی عورت تھی۔ "اپنا نام بتلائیے جناب!" یہ آواز ثمینہ احمد کی نہیں تھی۔

"وہ بھی عرض کر دوں گا محترمہ!" میں نے کہا۔ "پہلے یہ بتا دیں کہ نواب صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"آخر آپ نام کیوں نہیں بتا رہے! اگر آپ نے نام نہیں بتایا تو میں فون رکھ دوں گی۔" اُس کے لہجے میں شائستگی نام کو نہ تھی۔

"فون نہیں ریسیور!" میں نے اُس کی تصحیح کی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ عورت یا تو نواب افتخار احمد کی کوئی مُنہ چڑھی ملازمہ ہے یا پھر منظورِ نظر۔

"بکواس نہ کریں!" اُس نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

نواب افتخار احمد ایسے "معزز" افراد ہر ایک سے بات کرنا پسند نہیں کرتے اس لیے اُن کی موجودگی اور غیر موجودگی کا انحصار فون کرنے والے پر ہوتا ہے۔ کس سے بات کرنا ضروری ہے کس سے نہیں! دوسری کوشش بھی فضول ہی ثابت ہوتی۔ میں نے مصلحتاً نام بتانے سے گریز کیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ وہ گھر ہی پر ہوگا کیونکہ اب رات کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ وہ گھر پر ہوتا یا کہیں اور، مجھے ہر حال میں اُسے تلاش کرنا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں نے ٹیکسی کی اور ڈیفنس کالونی روانہ ہو گیا۔ نواب افتخار احمد کی کوٹھی وہیں تھی۔ ثمینہ احمد کا تعاقب کرتے ہوئے میں ایک بار وہاں جا چکا تھا۔ راستے کی تفصیلات میرے ذہن میں تھیں اس لیے وہاں تک پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں نے ٹیکسی کو مصلحتاً کچھ پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ٹیکسی چلی گئی تو میں نے اِرد گرد کا جائزہ لیا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو نادیدہ بنا لیا۔ یہ قوت بھی میری پُراسرار قوتوں میں سے ایک تھی۔ میں اپنے ذہن کو یکسو کر کے یہ خواہش کرتا کہ میرا جسم نظر نہ آئے اور ایسا ہو جاتا۔ میری پُراسرار قوتیں میرے طاقتور ذہن کی تابع تھیں۔

میرا جسم جب خود میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا تو میں آگے بڑھا۔ وہاں سے وہ کوٹھی زیادہ دُور نہیں تھی۔ جہاں مجھے پہنچنا تھا، میں کچھ ہی دیر بعد وہاں پہنچ گیا۔ اور نیم پلیٹ پڑھ کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ میں نے دانستہ دیر تک اپنی انگلی نہ ہٹائی اور اندر گھنٹی بجتی رہی۔

"کون ہے؟" کوئی پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے دُور ہی سے چیخا۔ آواز میں قدرے جھنجلاہٹ تھی۔

میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ شخص بڑبڑاتا ہوا پھاٹک تک آیا اور اُس کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اپنے لباس سے وہ کوئی ملازم معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر پھاٹک سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ کہیں گھنٹی بجانے والا واپس تو نہیں جا رہا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں اُس کے قریب سے گزر کر تیزی کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔ گھنٹی بجانے کا مقصد محض یہ تھا کہ میں ضروری قباحت سے بچ جاؤں اور مجھے دروازے کھلے ہوئے ملیں۔ مجھے اِس کوٹھی میں نواب افتخار احمد کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں تھا۔ خواب گاہ کی کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ بند دروازے میں تو کہیں شیشہ نہیں لگا ہوا تھا، ہاں کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اندر نیلی بتی جل رہی تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو چکا ہے۔ میں نے دروازے پر کئی بار دستک دی تو اندر سے ایک مردانہ غصیلی آواز سُنائی دی۔

"یہ کون بدتمیز ہے! خبر نہیں کہ یہ ہمارے آرام کا وقت ہے!"

میں بھلا کہاں باز آنے والا تھا، جواب میں تو کچھ نہ بولا، بس دستکیں دیتا رہا۔

"اچھا ٹھہرو، ہم آتے ہیں!... آتے ہیں ابھی، اور... اور اِس گستاخی کا مزہ چکھاتے ہیں!" اندر سے طیش بھری آوازیں سُنائی دیں۔ مگر دروازہ پھر بھی فوراً نہیں کھلا۔ جب اندر سے قدموں کی چاپ سُنائی دی تو میں فوراً پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھول کر باہر آنے والا نواب افتخار احمد ہی تھا۔ اُس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔ پہلے وہ باہر کسی کو نہ دیکھ کر چونکا، پھر زور زور سے ملازمین کو آوازیں دینے لگا۔ وہ بہت غصّے میں معلوم ہو رہا تھا۔ کئی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں اُسی وقت خواب گاہ کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوا۔ اندر اب بھی نیلی بتی جل رہی تھی۔ وہاں پُرانی وضع کی بڑی سی مسہری کے قریب ایک میز اور کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ میز پر سامانِ مے نوشی سجا تھا۔ ایک خوبصورت گلاس میں تھوڑی سی شراب باقی تھی اور دوسرا گلاس خالی تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ باہر سے اب بھی نواب افتخار احمد کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنے ملازمین پر برس رہا تھا اور ملازمین صفائی پیش کر رہے تھے۔

"ابھی ہم نے گھنٹی بجنے کی آواز بھی سُنی تھی۔ کون آیا تھا؟" نواب افتخار احمد کی آواز میں بدستور برہمی تھی۔

"معلوم نہیں کون تھا سرکار جس نے گھنٹی بجائی تھی۔ میں تو بہت لپک کر گیا تھا، مگر باہر کوئی نہیں ملا۔"

"بیگم صاحبہ آ گئیں؟"

"جی! ابھی نہیں آئیں۔"

"ساری کوٹھی کی تلاشی لو، کہیں کوئی چور نہ گھس آیا ہو!" کوئی ہوتا تو ہو گا نہیں کہ اِدھر ہم نے دروازہ کھولا، اُدھر [illegible]

سے اوجھل! ابھی جاگ رہے ہیں ہم، کوئی بات ہو تو ہمیں بتا دینا!"
"بہتر ہے سرکار!" کسی نے جواب دیا۔
نواب افتخار احمد نے خواب گاہ میں آ کر دروازہ بند کر دیا اور مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ "اٹھو! ہمارے لیے ایک جام اور بنا دو۔ معلوم نہیں کون خبیث تھا جس نے رنگ میں بھنگ ڈال دی!"
"آپ کہہ رہے تھے کہ کوئی... کوئی چور... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" جواب میں مسہری کی طرف سے ایک خوفزدہ نسوانی آواز ابھری۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہاں کوئی چادر اوڑھے لیٹا ہے۔
"ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے!" نواب افتخار احمد یہ کہتے ہوئے مسہری کے پاس پہنچ گیا۔
"اور وہ فون... معلوم نہیں وہ کون تھا جو آپ کو فون پر پوچھ رہا تھا!"
"خاک ڈالو، ہو گا کوئی! تم یہ کیا قصے لے بیٹھیں! ہمارا موڈ آج پہلے ہی بہت مکدر ہو چکا ہے۔" نواب افتخار احمد مسہری پر بیٹھ گیا۔ پھر اس لڑکی نے کچھ نہیں کہا وہ بستر سے اپنا لباس درست کرتے ہوئے اٹھی!
"تم بھی چاہو تو تھوڑی اور پی لو، ڈر نکل جائے گا۔"
وہ لڑکی کوئی جواب دیے بغیر مسہری سے اتر کر میز کی طرف بڑھی۔ اس کے قدم ہموار نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ جیسے تیسے نواب افتخار احمد کے لیے گلاس میں شراب انڈیلنے لگی۔ اور جا کر اس کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ پھر وہ سرہانے سے ٹیک لگا کر مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ میں نے اس عرصے میں نواب افتخار احمد کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ شراب نوشی سے یوں بھی شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اگر اس کے ذہن میں قوت مدافعت ہو گی بھی تو ظاہر نہ ہوئی۔ مجھے اپنے سوالوں کے جواب ملتے رہے۔
نواب افتخار احمد کیوں، کب اور کیسے امریکی ایجنٹ بنا، اس سے قطع نظر یہ حقیقت تھی کہ اس نے اپنے آقاؤں کے ایما ہی پر جمیلا احمد سے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ افتخار احمد کو جمیلا کے بارے میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ امریکی حکومت کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تاکید کی گئی تھی کہ نواب افتخار احمد کبھی اس سے ازدواجی تعلق قائم نہ کرے۔ اس کے سپرد بس یہ ذمہ داری کی گئی کہ جمیلا احمد کو ہندوستان کے دوران قیام میں کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ ہو۔ جمیلا احمد سے متعلق تمام امور میں اسے ایک امریکی ایجنٹ سونیا کی ہدایات کا پابند کر دیا گیا۔
سونیا اُسی کے ساتھ ساتھ فرانس سے ہندوستان آئی اور اب تک یہیں تھی۔ سونیا نے اپنے ساتھیوں کو چند ماہ پہلے ہی ہندوستان بلایا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب ثمینہ احمد نے پر پرزے نکالنا شروع کیے تھے۔ سونیا نے نواب سے اُس کی شکایت بھی کی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، ہم آپ کی بیوی کو بھگت لیں گے۔ نواب افتخار احمد کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید ثمینہ کو قتل کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا سونیا نے کسی طرح معاملے کو سنبھال لیا اور اب تک سنبھالے ہوئی تھی۔ شاید اُسے امریکی حکومت کے لیے نواب کی خدمات کا علم تھا ورنہ وہ بہ آسانی ثمینہ کو راستے سے ہٹا دیتی۔ نواب افتخار کو جمیلا احمد کے بارے میں بڑا تجسس تھا کہ وہ کون ہے اور امریکی حکومت کے لیے کیوں اتنی اہمیت رکھتی ہے؟ اس تجسس کے باوجود وہ کبھی حد سے نہ بڑھا۔ اس نے عملی زبان میں ایک آدھ بار سونیا سے مزید کچھ معلوم کرنا چاہا، مگر جب اُسے یہ احساس ہو گیا کہ سونیا کچھ نہیں بتائے گی تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے آقاؤں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ ہاتھ اُس کی گردن تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔
نواب افتخار نے اپنا کردار نبھانے کی خاطر سونیا کی ہدایت پر کبھی کبھار اُس کوٹھی میں چلا جاتا تھا جہاں جمیلا احمد کو رکھا تھا۔ نواب کے دیرینہ ملازمین اُس کی ہدایت پر جمیلا احمد کا پورا خیال رکھتے تھے۔ انھیں کیا سبھی کو یقین تھا کہ جمیلا احمد، نواب کی دوسری بیوی ہے۔ ابتدا میں جب ثمینہ بالکل بے قابو نہیں ہوئی تھی تو سونیا کے ایما پر نواب، جمیلا احمد کو مختلف تقریبات میں بھی ساتھ لے جاتا رہا تھا۔ مگر کئی سال سے یہ سلسلہ بالکل بند ہو چکا تھا۔ جمیلا احمد اُس کوٹھی کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اول تو نواب افتخار کی ہمت نہ پڑتی کہ جمیلا احمد سے زیادہ گفتگو کر سکے۔ دوم خود جمیلا بھی بہت کم زبان کھولتی۔ نواب افتخار نے تو اُسے کبھی مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں گم اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔ نواب اُس سے جب بھی ملنے جاتا، سونیا ضرور ساتھ ہوتی۔
وہیں ایک قریبی کوٹھی میں سونیا کا قیام تھا جہاں وہ ایک امریکی لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے رہتی تھی۔ اُسی کے ایما پر نواب نے اُسے

جمیلا احمد کا مستقل معالج مقرر کر دیا تھا۔ وہ ہر ہفتے پابندی سے جمیلا احمد کا طبی معائنہ کرنے جاتی، مگر اُس کا اصل مقصد کوٹھی کے اندرونی حالات کا جائزہ لینا ہوتا۔ یہ بات نواب افتخار احمد کے علم میں بھی تھی۔
میں یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد زیادہ مزید نہیں رکا کہ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ میری ماں وہی عورت ہے جسے لوگ نواب افتخار احمد کی عرب نژاد دوسری بیوی سمجھتے ہیں۔ اس کے یقین کا ایک سبب سونیا کا نام بھی تھا۔ یہ نام پہلی مرتبہ میں نے قاہرہ میں سنا تھا۔ سونیا اُسی امریکی ایجنٹ تھری ناٹ کی شاگرد تھی، جو میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ وہی ٹرانسمیٹر پر واشنگٹن سے گفتگو کر رہا تھا اور اسی گفتگو میں سونیا کا ذکر آیا تھا۔ واشنگٹن سے سونیا کے متعلق اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں میری ماں اُسی کی حفاظت اور نگرانی میں ہے۔
میں اب تک متعدد خطرناک امریکی ایجنٹوں سے نمٹ چکا تھا۔ مجھے اُن کی شیطانی ذہانت کا علم تھا۔ سونیا سے پہلے کبھی میرا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ مگر میرے لیے یہ جاننا بھی کافی تھا کہ اس کی تربیت تھری ناٹ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ وہ بہر حال کوئی معمولی ایجنٹ نہیں ہو گی ورنہ اُسے اتنی بڑی ذمہ داری سپرد نہ کی جاتی۔
اس انکشاف کے بعد میرا جی تو یہی چاہا کہ اُڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں، مگر میں نے انتہائی صبر و ضبط کا ثبوت دیا۔ اُس کے گرد امریکی ایجنٹوں کا حصار تھا۔ دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ میں پہلے اس حصار کو توڑ دوں۔ مجھے اُن امریکی ایجنٹوں کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو کوئی بات نہ تھی، لیکن میری جلد بازی سے میری ماں کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچ جائے یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ امریکی ایجنٹوں سے ہر سفاکی اور بربریت متوقع تھی۔ کہیں بگڑتا دیکھ کر یا میرا خصوصی توشیوں سے مجھے پہچان کر میری ماں کے حق میں کوئی خطرناک قدم اٹھا لیتے تو میں زندگی بھر خود کو اس غلطی پر معاف نہ کرتا۔
نواب افتخار احمد کی کوٹھی میں گھسنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اگر اُس نے میری ماں پر کوئی ظلم کیا ہو یا کسی طور اس جرم میں شریک ہو تو میں اُسے عبرت ناک سزا دے سکوں۔ وہ محض ایک مہرہ ثابت ہوا۔ اس معاملے میں اُس کا دامن بے داغ تھا۔ ورنہ شاید میں اُسے زندہ نہ چھوڑتا، لیکن سونیا کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ ہرگز قابل معافی نہیں تھی۔ سونیا کا تعلق براہ راست اُن مجرموں سے تھا جو میری نظر میں انسان دشمن تھے۔ سونیا کا جس کوٹھی سے تعلق تھا اس کا پتا اور محل وقوع میں نے نواب افتخار احمد کے ذہن سے پڑھ کر معلوم کر لیا تھا۔
ڈیفنس کالونی سے لودھی روڈ پہنچنے سے پہلے میں نے اپنے جسم کو نادیدہ نہ بننے دیا تاکہ کسی ٹیکسی کے ذریعے وہاں تک پہنچ سکوں۔ یہاں مجھے زیادہ نہ بھٹکنا پڑا۔ ٹیکسی کی تلاش میں مجھے ڈیفنس کالونی کے ایک چوراہے تک پیدل جانا پڑا۔ مگر مایوسی نہیں ہوئی۔
لودھی روڈ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے میں جلد ہی وہاں جا پہنچا۔ ٹیکسی کو میں نے لودھی پارک کے سامنے ہی رکوایا تھا۔ ڈاکٹر کلاڈا ولسن، یہ سونیا کا وہ جعلی نام تھا جو اُس نے اپنی اصل شخصیت کو چھپانے کے لیے اختیار کر رکھا تھا۔ مجھے اسی نام کی تختی تلاش کرنا تھی۔ ٹیکسی کو رخصت کرتے ہی میں نے اپنے جسم کو نادیدہ بنا لیا۔ میں دیر تک اس علاقے میں نصف شب گزر جانے کے بعد کسی خاص کوٹھی کی تلاش امریکی ایجنٹوں کو میری طرف متوجہ کر دیتی۔ سونیا پر اچانک اور بے خبری میں قابو پانا میرے لیے زیادہ مناسب تھا۔
اپنے جسم کو نادیدہ بنا لینے کے بعد مجھے زیادہ فکر نہیں رہی اور میں اطمینان کے ساتھ ناموں کی تختیاں پڑھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کوٹھی کا نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس نمبر کی کوٹھی تو مل گئی۔ مگر وہاں مجھے کلاڈا ولسن کی بجائے کسی اور نام کی تختی نظر آئی۔ تختی پر ولسن میکوف لکھا ہوا تھا۔ کلاڈا کے نام میں بھی ولسن شامل تھا۔ اگر مجھے اس کوٹھی کا نمبر اور سونیا کا پورا جعلی نام معلوم نہ ہوتا تو یقیناً دھوکا کھا جاتا۔ اور وہ کوٹھی تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتا۔
میں نے کوٹھی کا جائزہ لیا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ اندر بالکل اندھیرا اور سناٹا تھا۔ اس کے باوجود میں نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ کہیں دور گھنٹی بجنے کی آواز تو سنائی دیتی رہی، مگر پھاٹک کسی نے نہیں کھولا۔ میں یہ سوچ کر پلٹنے ہی والا تھا کہ کوٹھی میں کوئی نہیں، لیکن اسی وقت ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ میں چونک کر اُس طرف دیکھنے لگا۔ میری پُراسرار قوتوں میں سے ایک قوت یہ بھی تھی کہ اندھیرے میں واضح طور پر دیکھ سکوں۔ مجھے اپنے اندر یہ قوت بیدار کرنے میں کچھ دیر لگی۔

کوٹھی کی چھت سے مجھے صرف پھاٹک کی طرف نگاہیں نظر آئیں۔ اُس شخص کا چہرہ چھت کی دیوار سے چھپا ہوا تھا۔ شاید سونیا نے کسی آدمی کو کوٹھی کی نگرانی کے لیے چھوڑا ہوا تھا۔ پھاٹک کا بیرونی حصہ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں روشنی تھی۔ میں کیوں کر دیکھنے والے کی نظروں سے اوجھل تھا اس لیے اُس کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی حیرت نظر آئی تھی۔ میں نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر اُن آنکھوں پر نگاہ جمائے ہوئے دوبارہ کال بیل کا بٹن دبانے لگا۔ اِس مرتبہ وہ شخص بوکھلا گیا اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ مجھے یہ توقع بھی تھی۔ گھنٹی بجتی ہے اور گھنٹی بجانے والا نظر نہ آئے تو کوئی بھی ہو، اپنے اوسان بجا نہیں رکھ سکتا۔ وہ دراز قد امریکی آنکھیں پھاڑے پھاٹک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے بٹن سے انگلی ہٹائی اور اُس شخص کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔ میرے طاقتور ذہن کو تھوڑی سی جدوجہد تو کرنا پڑی، مگر جلد ہی وہ شخص قابو میں آ گیا۔ میں نے دوبارہ اِسی لیے گھنٹی بجائی تھی کہ اُس شخص کا ذہن ہیجان کا شکار ہو جائے۔ ہیجان کے وقت بھی ذہن کی قوتِ مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ولسن اُسی کا نام تھا۔

"کیا تم اِس عجیب واقعے کی اطلاع سونیا کو نہیں دو گے!" میں نے اُس کے ذہن کو ترغیب دی۔

"ہاں اُسے مطلع تو کرنا چاہیے مگر..." اُس کا ذہن سوچنے لگا۔

"مگر کیا؟"

"یہ کہ وہ اسے میرا توہم سمجھ کر مذاق اُڑائے گی۔"

"لیکن یہ تمہارا وہم تو نہیں۔ تم نے تو دو مرتبہ گھنٹی بجنے کی آواز سنی ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" تجربے میں آنے کے باوجود اُس کا ذہن یہ بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"ممکن تھا جبھی تو گھنٹی بجی، ورنہ کیوں بجتی؟" میرے ذہن نے دلیل دی، اور پھر اُسے سونیا سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اُس شخص نے اپنے کوٹ کی ایک جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا اور پھر ایک باریک سا تار باہر کھینچ لیا۔ اِس موقع پر میں نے اپنی ایک اور پُراسرار قوت کو تحریک دی۔ یہ دُور تک سننے کی قوت تھی۔ وہ شخص ٹرانسمیٹر پر سونیا سے جو گفتگو کرتا، مجھے واضح طور پر اِس طرح سنائی دیتی جیسے میں اُس کے قریب کھڑا ہوا سب کچھ سن رہا ہوں۔ اِس وقت میری کئی قوتیں ایک ساتھ بیدار تھیں یعنی دُور کی بات سننے، دُور کی چیز کو قریب دیکھنے اور اندھیرے میں شگاف ڈالنے پر بیک وقت قادر تھا۔ اس کے علاوہ میرا جسم بھی اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ یہی اُسے اندھیرے میں ہونے کے باوجود واضح اور قریب دیکھ رہا تھا، مگر وہ مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔ اب وہ سگریٹ کیس کھول کر اُسے منہ کے قریب لے جا رہا تھا۔ کچھ دیر میں اُس نے سونیا سے رابطہ قائم کر لیا تو میں اُن دونوں کے درمیان ٹرانسمیٹر پر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

"ولسن! یقیناً تمہارے دماغ میں کوئی خلل پیدا ہو گیا ہے۔ اوور!" ولسن کی روداد سننے کے بعد دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز اُبھری جس میں جھنجلاہٹ تھی۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں توہم پرست نہیں ہوں۔ میرا فرض تھا کہ تمہیں اِس غیر معمولی واقعے سے مطلع کر دوں۔ آگے تم جانو۔ اوور۔" جواب میں ولسن نے کہا۔

"اگر واقعی ایسا ہی ہوا جو تم بیان کر رہے ہو تو یہ کوئی سازش معلوم ہوتی ہے اور اِس کا مقصد محض یہ ہے کہ میں بدحواس ہو کر وہاں پہنچ جاؤں۔ اِس سے قطع نظر کہ یہ واقعہ کیسے رونما ہوا، کوئی مجھے آج رات گشت لگانے اور نگرانی کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ کیا تم نے اِس بات پر غور نہیں کیا؟ اوور۔" اِس بار بولنے والی کی آواز میں نرمی تھی۔

"ممکن ہے، تمہارا خیال درست ہو لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اوور۔"

"تم وائرنگ چیک کرو۔ یقیناً اُس میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔ اوور اینڈ آل۔"

سونیا نے ثابت کر دیا کہ وہ بیدار ذہن ہے۔ اُسے ایک درست نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید دوڑا چلا آتا۔ اُس کے ساتھی کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک کار میں بیٹھی ہوئی سارے علاقے کا گشت لگا رہی ہے۔

سونیا کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اُسے آخر وقت تک حقیقت کا علم نہ ہو۔ اگر اُسے کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ مقابلے پر کون ہے تو وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے انتہائی قدم اٹھانے سے بھی یقیناً گریز نہ کرتی۔ یہ انتہائی قدم میری ماں کے لیے خطرہ ثابت ہوتا۔ اِسی خطرناک صورتِ حال سے بچنے کی خاطر میں بہت

محتاط اور چوکنا تھا۔ اب تک حاصل ہونے والے تلخ تجربات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کسی خطرناک ایجنٹ کو قابو میں کرنے کے لیے ذہنی رابطہ قطعی نامناسب ہے۔ سونیا بھی میری نظر میں ایک خطرناک ایجنٹ تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اُس کا ذہن میرا تابع ہو جاتا، البتہ میری غیر معمولی جسمانی قوت اُسے میرے سامنے یقیناً بے بس کر دیتی۔

ولسن کا ذہن پڑھ کر مجھے جو اہم بات معلوم ہوئی، وہ اُن امریکی ایجنٹوں کی تعداد سے متعلق تھی۔ سونیا اور ولسن کے علاوہ تین اور تھے۔ اِن تینوں میں سے دو تو اِس وقت سونیا کے ساتھ تھے اور ایک اُس کوٹھی میں تھا جہاں میری ماں تھی۔ سونیا نے اُسے ملازمین میں شامل کروا دیا تھا۔ سونیا نے اُس شخص کا انتخاب اِس لیے کیا تھا کہ وہ اہلِ زبان کی طرح اُردو بولنے پر قادر تھا۔ وہ شخص اِسی لیے ملازمین میں کھپ گیا۔ اُسے ایک آپ میں دیکھ کر کوئی شبہ نہ کر پاتا کہ وہ ہندوستانی ہونے کی بجائے امریکی ہے۔

اِن امریکی ایجنٹوں میں سے کوئی بھی قابلِ معافی نہ تھا۔ سبھی میرے دشمن تھے۔ موقع ملنے پر کوئی بھی میرے لیے خطرہ بن جاتا۔ اِن لوگوں کے علاوہ مقامی غنڈوں اور بدمعاشوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ صبح کے وقت کوٹھی کے گرد اُن کا گھیرا ہوتا۔ گو کہ رات کی تاریکی میں خطرات کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے، اِسی لیے سونیا خود چوکنا رہتی۔ کرائے کے اُن مقامی غنڈوں سے مجھے کوئی غرض نہ تھی۔ میری اصل جنگ اُن امریکی ایجنٹوں سے تھی۔ اُن میں سے اگر کوئی بھی اِس قابل رہ جاتا کہ اپنے آقاؤں کو صورتِ حال سے آگاہ کر سکے تو میرے لیے خطرات بڑھ جاتے۔ میں اپنی حیرت انگیز قوتوں کو بروئے کار لا کر پہلے ہی ایک بڑا خطرہ مول لے چکا تھا۔ اب ذرا سی بھی غفلت مہنگی پڑتی۔ ایسے ہی موقعوں پر میرے دل کا گداز مجھے خطروں سے دوچار کرتا آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے سب سے پہلے ولسن کے بارے میں ایک فیصلہ کیا تو دل پر بڑا جبر کرنا پڑا۔

ولسن اُس وقت سونیا کی ہدایت پر بجلی کے تاروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ جانے وہ کون تھا اور اُس نے جانے کیوں ایسی پُرخطر زندگی اپنائی تھی؟ میرے ذہن میں لمحہ بھر کو یہ خیال پیدا تو ہوا مگر میں نے اُسے ذہن سے جھٹک دیا۔ اِس سے پہلے کہ میرے اندر کی نیکی پوری طرح بیدار ہو جاتی اور مجھے خطرے میں ڈال دیتی، میں نے ولسن کے ذہن کو قابو میں کر لیا۔ میرے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ اُس کو قتل کر دیتا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں خفیف سے جھٹکے سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ ایسا کرنے سے پہلے میں نے اُس کے ذہن میں چند باتیں نقش کر دی تھیں۔ ولسن کو اُن باتوں کے سوا اب کچھ بھی یاد نہ تھا۔

پھر مجھے بس تھوڑی ہی دیر انتظار کرنا پڑا۔ میں نے ایک موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور پھاٹک کے سامنے سے ایک طرف ہو گیا۔ اُس کے بعد پھاٹک کھول کر جو شخص موٹر سائیکل پر سوار باہر نکلا، اُس کے چہرے پر انتہائی دہشت کے آثار تھے۔ یہ ولسن تھا۔ پھاٹک کو اُسی طرح کھلا چھوڑ کر وہ تیزی کے ساتھ سڑک پر آ گیا۔ میں نے کچھ فاصلے سے اُس کا تعاقب کیا۔ موٹر سائیکل کی رفتار میرے اندازے کے مطابق پچاس سے کچھ اوپر ہو گی جو مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے لیے اِس رفتار کا ساتھ دینا کوئی مشکل نہ تھا۔ میں چاہتا تو اُسے بھی پیچھے چھوڑ جاتا۔ اپنی اِس حیرت انگیز قوت کا تجربہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے سامنے سے ایک کار آتی دکھائی دی، مگر ابھی موٹر سائیکل اور اُس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ دُور کی چیزوں کو بالکل قریب دیکھ لینے کی قوت نے کار چلانے والی کا چہرہ واضح کر دیا۔ وہ خوبصورت نقوش کی مالک تھی۔ معلوم نہیں وہ میک اپ میں تھی کہ یہ اُس کا اصل چہرہ تھا، لیکن مجھے پہلی ہی نظر میں یقین ہو گیا کہ وہی سونیا ہے۔ اِس یقین کا سبب برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا امریکی بھی تھا۔ دوسرا ساتھی پچھلی سیٹ پر تھا۔ پھر میں نے اُس کے ہونٹوں کو متحرک دیکھا تو اپنی سماعت کا دائرہ بھی وسیع کر لیا۔ اب وہ جو کچھ کہتی مجھے بھی سنائی دیتا۔ وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھی۔

"...کو تیز رفتاری کا جنون ہے۔ یہ ولسن کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں وہی معلوم ہوتا ہے، لیکن ہوا کیا جو یہ ٹرانسمیٹر پر کوئی اطلاع دیے بغیر کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا!" سونیا کا ساتھی حیرت سے بولا۔

"کوئی تو وجہ ہو گی۔" سونیا نے کہا۔ "ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ یقیناً میری ہی تلاش میں نکلا ہے۔" سونیا کے لہجے سے قدرے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس نے کار کو سڑک کے کنارے کر لیا۔ ولسن کی موٹر سائیکل، کار کے قریب پہنچ کر رکی ہی تھی کہ سونیا نے بھی کار کو بریک لگا دیے۔ میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود سب کچھ واضح طور پر دیکھ اور سن رہا تھا۔ اب میرے قدم بھی رک چکے تھے۔

اور تمدن مجھ پر ہی خوف کی حد تھی۔ میں نے سونیا کو کار سے باہر نکلتے دیکھا، اُسی وقت ولسن کا ہاتھ تیزی کے ساتھ کوٹ کی جیب میں گیا۔

سونیا نے چونک کر اُسے مخاطب کیا: "کیا بات ہے ول..."

سونیا اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ ولسن نے اپنے کوٹ کی جیب سے سائیلنسر چڑھا ہوا ریوالور نکالتے ہی اُس پر پے در پے دو فائر کیے۔ پہلی گولی نے سونیا کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا اور دوسری گولی نے اُس کی گردن اُدھیڑ ڈالی۔ پھر اس سے پہلے کہ سونیا کے دونوں ساتھی سنبھل پاتے، ولسن نے انہیں بھی نشانہ بنا دیا۔

یکے بعد دیگرے دو چیخیں گونجیں اور پھر مرتے مرتے بھی سونیا کے ایک ساتھی نے اپنا ریوالور نکال کر ولسن کا سینہ چھید دیا۔ یقیناً اُس کے ریوالور پر بھی سائیلنسر چڑھا ہوا تھا ورنہ دھماکہ ضرور ہوتا۔ اُن تینوں کی موت میری توقع کے عین مطابق تھی۔ لیکن وہ زندہ بھی رہ جاتا تو شاید برسوں علاج کے بعد اُس کا دماغی توازن درست ہوتا۔ پھر بھی وہ یہ نہ بتا پاتا کہ اُس نے اپنے ساتھیوں کو کیوں قتل کر دیا تھا؟

سونیا! اپنے اُستاد تھیری ناٹ سے زیادہ خطرناک اور ذہین ثابت نہ ہو سکی۔ اُستاد، اُستاد ہی ہوتا ہے۔ سونیا کا طریقۂ کار یقیناً تھیری ناٹ سے مختلف تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے لیے پُراسرار نہیں تھی اور شاید گھل مل کر کام لینا اُسے پسند تھا۔ اس کے علاوہ شاید اپنے ساتھیوں پر اعتماد بھی تھا۔ اُسے ولسن سے یہ توقع ہرگز نہ رہی ہوگی کہ وہ ایک دم ریوالور نکال کر فائرنگ شروع کر دے گا۔

جو کچھ بھی ہوا، میں نے دیکھا اور سُنا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا، لیکن دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ کچھ بھی ہو، ان چاروں کی موت کا واحد ذمہ دار میں ہی تھا۔ میں نے اپنی بصارت اور سماعت کی قوتوں کو سمیٹ لیا۔ اب صرف ایک امریکی ایجنٹ میری راہ میں حائل رہ گیا تھا۔ یہ ایجنٹ اُس کوٹھی میں تھا جہاں میری ماں تھی۔ جلد ہی میں نے وہ کوٹھی تلاش کر لی۔

وہاں سنگین حفاظتی انتظامات میں سے نعمت مرحوم کی ذمہ داری کوٹھی کی نگرانی اور حفاظت تھی۔ چار مسلح افراد رات کو پہرا دیتے اور دو دن کے وقت۔ امریکی ایجنٹ رات کو پہرا دینے والوں میں شامل تھا۔ کوٹھی کے اندر اور باہر اتنی روشنی تھی کہ سوئی بھی گرے تو نظر آ جائے۔ ایک ملازم، عمارت کے باہر کیاری میں تھا اور تین عمارت کے اندر تھے۔

ایک ملازم چھت پر تھا، تاکہ دور تک نظر رکھ سکے، ایک صدر دروازے کے قریب تھا اور ایک اس کمرے کے دروازے پر جو میری ماں کے لیے مخصوص تھا۔ میرے ذہن کی طاقتور لہریں باری باری اُن سب کے ذہنوں کو چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ مجھے امریکی ایجنٹ کی تلاش تھی۔ وہ مجھے اُنہی تینوں افراد میں ملا جو عمارت کے اندر تھے۔ وہ ایک ہی ذہنی جھٹکے میں بیٹھ گیا۔ اُس پر بیہوشی مسلط ہو چکی تھی۔ سونیا کے بعد بقیہ ساتھیوں میں یہی شخص خطرناک تھا۔ اُس کا شیطانی ذہن مجرموں کے لیے آئندہ بھی سودمند ثابت ہوتا۔ اس لیے میں نے اُس کے ذہن کو تہ و بالا کر دیا۔ وہ صبح ہوتے ہوتے ہوش میں تو آ جاتا، مگر ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہوتا جسے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ممکن ہی تھا کہ دماغی امراض کے ماہرین اُس کا علاج کر سکتے۔ کسی شخص کے ذہن کو ناکارہ بنا دینا بھی قتل ہی کے برابر ہے، مگر جان لینے سے کم! یہ دلیل میرے دل کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوئی۔ پہرا دینے والے بقیہ تین افراد میں سے دو کو تو میں نے گہری نیند سُلا دیا اور ایک کے ذہن کو اپنا تابع کر لیا۔ یہ وہی تھا جو صدر دروازے پر متعین تھا۔ وہ عمارت کا صدر دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور پھاٹک کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر وہ رُکا اور ذیلی دروازے میں لگا ہوا قفل کھول دیا۔ پھر ذیلی دروازہ کھلتے ہی میں اندر داخل ہو گیا اور اُس سے چابیوں کا گچھا لے لیا۔ "اب تم باہر کی ساری بتیاں بجھا کر سو جاؤ۔" میں نے اُسے حکم دیا۔ میں اُس کی نظروں سے اوجھل ہی تھا۔

"بہت اچھا جناب!" اُس نے فرماں برداری سے سر ہلایا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

میں اُس عمارت کے صدر دروازے سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔ رات کو پہرا دینے والوں کے علاوہ کوٹھی میں پانچ افراد اور تھے۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی اُن سبھی کی نیند گہری کر دی۔ عمارت کے باہر کی بتیاں بجھ گئیں تو جس ملازم کے ذہن کو میں نے تابع بنایا تھا، وہ بھی میرے حکم کے مطابق سو گیا۔ اب مجھے کسی طرف سے بھی کوئی خطرہ نہیں تھا اور اپنا جسم چھپائے رکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے خواہش کی کہ میرا جسم ظاہر ہو جائے اور دوسرے ہی لمحے ایسا ہو گیا۔ میں ابھی تک صدر دروازے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

میں نے اس قدر احتیاط صرف اس غرض سے برتی کہ کسی مرحلے پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ میں اس وقت بھی مطمئن تھا کہ وہاں سے [illegible]

کس طرح پہنچوں گا۔ جس امریکی ایجنٹ کا ذہن میں نے ناکارہ بنایا تھا اُس کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی۔ میں اُس موٹر سائیکل کو صدر دروازے کے قریب کھڑا دیکھ چکا تھا۔ اُس کی چابی امریکی ایجنٹ کی جیب میں تھی۔ یہ بات میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔

میں نے اب تک انتہائی صبر کا مظاہرہ کیا تھا۔ تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں تو میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا۔ بالآخر میں نے اپنے دشمنوں کے خلاف وہ جنگ جیت لی۔ میں اب اپنی ماں کو اُن کے نرغے سے نکال کر لے جانے والا تھا۔

"ماں!" میں نے زیرِ لب کہا اور پھر جیسے میرے قدم خود بخود اندر کی طرف اُٹھنے لگے۔

وہ جس نے مجھے جنم دیا تھا، کمرے میں بند تھی۔ کمرے کے دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب ہی ایک شخص بے شعور پڑا تھا۔ میں تیزی سے جھکا اور اُس کی جیب سے موٹر سائیکل کی چابی نکال لی، اور اُسی کے ساتھ اُس کا ریوالور بھی احتیاطاً اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہی وہ امریکی ایجنٹ تھا جسے سونیا نے پہرے داروں میں شامل کرا دیا تھا۔ اتنی احتیاطی تدابیر اور سخت حفاظت و نگرانی کے باوجود تہمینہ احمد بھلا اپنے مقصد میں کس طرح کامیاب ہو جاتی۔ اُس کی ناکامی ہی میرے لیے وجہ کامیابی ہوئی۔ اُسے شاید پوری طرح یہ احساس نہ تھا کہ اُس کا مقابلہ کتنے خطرناک لوگوں سے ہے۔

ریوالور اور چابی اپنی جیب میں رکھ کر میں نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پایا، پھر کمرے کا تالا کھولنے لگا۔ گچھا میرے پاس تھا، ایک چابی تالے میں لگ گئی۔ گچھے کو وہیں پھینک کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ خلافِ توقع کمرے میں تیز روشنی تھی۔ وہ بھولے سے شاید بتی جلی چھوڑ کر سو گئی ہوگی۔ میں نے سوچا اور کمرے میں قدم رکھا۔

"کون ہے؟" خوفزدہ سی ایک نسوانی آواز سُن کر میں چونک اُٹھا۔

دائیں جانب ایک مسہری پر وہ گٹھری سی بنی پڑی تھی اور خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھولے جانے سے شاید وہ جاگ گئی تھی یا پھر ابھی سوئی نہ تھی۔

"ماں!" میرے ہونٹ کانپے۔ تہمینہ احمد نے غلط نہیں کہا تھا، وہ حقیقتاً ہڈیوں کا ڈھانچا معلوم ہو رہی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی اور دونوں آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی سی تھیں۔ اُسے دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر میں بے ساختہ "ماں ماں" پکارتا ہوا اُس کی طرف لپکا۔

وہ مجھے اپنی طرف لپکتے دیکھ کر چیخ اُٹھی اور پھر اُٹھ کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔

"خدا کے لیے... میں تمہارا..." میں اُس کے قریب پہنچ کر بولا مگر لفظ جیسے میرے حلق میں اٹکنے لگے۔ آنسوؤں کی وجہ سے میری نظر دھندلا رہی تھی۔ میں نے آنسو پونچھ لیے۔ مجھے اُس کے چہرے پر بے حد خوف نظر آیا۔ میں اب بہت غور سے اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ تصویر والے چہرے اور اُس کے چہرے میں مجھے بس خفیف سی مماثلت نظر آئی۔ تاہم میرا دل چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہی میری ماں ہے۔ اُس کی حالت کسی ایسے نفسیاتی مریض کی سی تھی جو اپنے سائے سے بھی خوف کھاتا ہو۔ وہ جانے کیوں مجھ سے ڈر رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میرا چہرہ اُس کے لیے اجنبی تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ آنسو میری آنکھوں میں اُمڈتے چلے آ رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اُس کی بانہوں میں سمٹ جاؤں اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا لے۔ ایک عمر کی تنہائیاں اور محرومیاں میرے وجود کو جیسے ریزہ ریزہ کیے دے رہی تھیں۔ اپنے بکھرتے وجود کو سمیٹتے ہوئے میں نے اُسے دوبارہ مخاطب کیا: "تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ چلو!"

"نہیں!" وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر چیخی۔ "تم مجھے قتل کر دو گے!" اُسے یقیناً باہر جانے سے خوفزدہ کیا جاتا رہا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کس سے خوفزدہ ہے۔ اُس نے خوفزدہ آواز میں رُک رُک کر کہا: "تمہیں شاید اُس نے بھیجا ہے... تہمینہ نے... وہ... وہ مجھے مار ڈالے گی... مار دے گی!"

اُس کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی طرح میری بات نہیں مانے گی، اُسے سمجھانا فضول ہے۔ [illegible] ہو گئے، کیسے اعتبار آ جاتا! زندگی بھی کیا کیا زخم لگاتی ہے! مجبوراً مجھے دوسرا قدم اُٹھانا پڑا۔ اس کے سوا میں اور کیا کرتا! فی الحال تو اُسے وہاں سے نکال کر لے جانا ضروری تھا۔

اُس کے ذہن پر توجہ دیتے ہی میں چونک اُٹھا۔ اُس کا ذہن تقریباً کسی سادہ صفحے کی طرح تھا اور اُس پر بہت کم نقوش

ثبت تھے۔ اِن نقوش کی تہ میں بھی یقیناً بہت کچھ تھا، جو اُسے دیا دیا گیا تھا۔ اُسے اپنے بارے میں صرف چند باتوں کا علم تھا، اور وہ باتیں مجھے بھی معلوم تھیں۔ کسی نے دانستہ اُس کے ذہن سے ماضی کو محو کر دیا تھا، لیکن پوری طرح اِس میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ابھی گویا راکھ میں دبی ہوئی کچھ چنگاریاں باقی تھیں۔ شاید وہی چنگاریاں اندر ہی اندر اُس کے وجود کو جلا رہی تھیں۔ اُس کے ذہن کا تفصیلی معائنہ کسی اور وقت پر اُٹھا کر میں نے اُسے اپنا تابع بنا لیا۔ اُس میں قبولیت بہت تھی، اِس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ طویل عرصے سے وہ ہپناٹک ٹرانس میں رہی ہے۔

اب اُس کے چہرے سے خوف کے تاثرات غائب ہو چکے تھے اور وہ مجھے پُراعتماد نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”آؤ ماں چلیں!“ میں نے اُس سے کہا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اُس نے بلا جھجک میرا ہاتھ تھام لیا اور مسہری سے نیچے اُتر آئی۔ اُس وقت میری عجیب کیفیت تھی۔ ماں کے لمس نے مجھے جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ میں جلدی اُسے عمارت سے باہر لے آیا اور ایک طرف کھڑا کر کے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔ باہر اب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ عمارت سے پھاٹک تک پختہ راستہ تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی تو میں نے اُسے پیچھے بٹھا کر کمر میں ہاتھ ڈالنے کے لیے کہا۔ اُس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ پھر میں نے کلچ دبا کر گیئر ڈالا۔ ایکسیلریٹر پر دباؤ ڈالتے ہی موٹر سائیکل ایک خفیف سے جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

پھاٹک تک پہنچ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ موٹر سائیکل کو پھاٹک کے ذیلی دروازے سے باہر نکالنا مشکل تھا۔ دروازہ چھوٹا تھا۔ اس کے لیے پھاٹک کھولنا ضروری ہو گیا، اور پھاٹک میں قفل لگا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا میں اندر ہی پھینک گیا تھا۔ اُسے اُٹھا کر لانے میں دیر لگتی، اِس لیے میں نے تالا توڑ دیا۔ موٹر سائیکل کو میں نے ایک طرف کھڑا کر دیا تھا اور اُس کے قریب ہی میری ماں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر پھاٹک کے دونوں پٹ کھول کر میں موٹر سائیکل کی طرف پلٹا اور دوبارہ اپنی ماں کو ساتھ بٹھا لیا۔

کوٹھی کے پھاٹک کو اُسی طرح کھلا ہوا چھوڑ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اشوکا ہوٹل پہنچتے پہنچتے میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔ میں نے ہوٹل پہنچ کر اس پر تیزی سے عمل کیا۔ صبح ہوتے ہی نواب افتخار احمد کو اِس واقعے کی خبر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ اُس کے ملازمین بیدار ہو کر میری ماں کو غائب دیکھتے تو فوراً نواب افتخار احمد سے رابطہ قائم کرتے۔ پھر نواب افتخار کو سونیا اور اُس کے ساتھیوں کے قتل کا علم بھی ہو جاتا۔ اُن کی لاشیں کوٹھی سے زیادہ دُور نہیں تھیں۔ اُسے یہ علم تو تھا ہی کہ جس عورت کو اِس قدر حفاظت اور نگرانی میں رکھا گیا ہے۔ وہ امریکی حکومت کے لیے بہت اہم ہے۔ نواب افتخار احمد با اثر آدمی تھا۔ میری ماں کی تلاش میں وہ اپنے تمام تر اثر و رسوخ استعمال کرتا۔ میں نے اِسی لیے پہلے ہی اس کا توڑ سوچ لیا تھا۔

میرے پاس میک اپ کا سامان موجود تھا۔ میں نے اپنی ماں کے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر ہندوستانی عورت کا میک اپ کر دیا۔ وہ میرے ذہن کے زیرِ اثر تھی۔ اس لیے خاموش بیٹھی رہی۔ جب میں اُس کے میک اپ سے فارغ ہوا تو صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔ میں نے اُسے اپنے بستر پہ لٹا دیا اور فون کر کے، آپریٹر سے ایئرپورٹ انکوائری ملانے کو کہا۔ اپنی ماں کو امریکی ایجنٹوں کے چنگل سے نکالنے کے بعد میرا دِلّی میں رہنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ اب مجھے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ میں نے نواب افتخار احمد کو زندہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ وہ اپنے آقاؤں کو میری ماں کی گمشدگی سے فوراً آگاہ کر دیتا۔ پھر امریکیوں کو یہ اندازہ لگنے میں دیر نہ لگتی کہ اِس میں میرا ہاتھ ہو گا۔ ایسی صورت میں وہ فوراً ہی اپنے کسی خطرناک ایجنٹ کو میری تلاش میں دِلّی بھیج دیتے اور یوں انھیں میرا سراغ مل جاتا کہ میں کہاں ہوں۔

نواب افتخار احمد کو راستے سے ہٹانے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنی ماں کو ہوٹل میں اکیلا چھوڑ کر جانے پر راضی نہ تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں بس یہی ایک راہ تھی کہ میں جلد از جلد دِلّی کو خیرباد کہہ دوں اور وہاں سے اپنی ماں کو لے کر کہیں اور چلا جاؤں۔

جانے کو تو میں دُنیا کے کسی بھی ملک میں چلا جاتا، مگر اب میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ ماں بھی تھی۔ اُس کے لیے، پاسپورٹ حاصل کرنے اور دیگر ضروری کارروائیوں میں وقت لگتا، اور وقت میرے پاس بالکل نہیں تھا۔ اِس سے قطع نظر یہ کہ ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہ تھا۔ ہمالیہ سے راس کماری تک اور آسام سے پنجاب تک خاصا بڑا رقبہ تھا، آبادی بھی گھنی تھی۔ وہاں میں اپنے دشمنوں کو بہت دن شہر در شہر گھماتے پھرتا۔ پھر یہ کہ

ہندوستان میں میرا قیام ہر طرح مناسب تھا۔ وہاں سے چین اور روس، دونوں زیادہ دُور نہ تھے۔ اِن دونوں حکومتوں میں سے ایک نے میرے والد اور دوسرے نے بھائی کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ہندوستان میں رہ کر میں اُن کی رہائی کے لیے بھی کوئی مثبت قدم اُٹھا سکتا۔

دِلّی کے علاوہ ہندوستان میں دو بڑے شہر اور تھے، ایک کلکتہ، دوسرا بمبئی! اِن میں سے میں نے کلکتے کا انتخاب کیا کیوں کہ میری معلومات کے مطابق یہ شہر بمبئی سے بھی بڑا تھا۔ جتنا بڑا شہر ہوتا میرے لیے اتنا ہی بہتر تھا۔ اب تک میرا تجربہ یہی تھا کہ میرے دشمن مجھے بڑے شہروں میں جلد تلاش نہیں کر پاتے۔ میں اِس وقت کلکتے ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اُٹھا لیا اور بولا۔ ”پرنس ادریس!“

”ایئرپورٹ انکوائری سے بات کیجیے سر!“ آپریٹر مؤدب لہجے میں بولی۔ پھر اُس نے براہِ راست رابطہ ملا دیا۔

انکوائری سے گفتگو کا بہتر نتیجہ نکلا۔ اگر میں اُسی وقت ہوٹل سے روانہ ہو جاتا تو مجھے ایئر انڈیا کی ایک پرواز کے ٹکٹ مل جاتے۔ میں فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہوٹل کے واجبات ادا کر کے میں نے سامان سمیٹا اور اِسی دوران ایک اہم کام انجام دیا۔ میری ماں کا چہرہ تو میک اپ سے بدل گیا تھا لیکن وہ ابھی تک خود کو جمیلہ احمد ہی سمجھ رہی تھی۔ میں نے اُس کے ذہن سے گزشتہ چھ سال کے دوران میں پیش آنے والے تمام واقعات کی یادیں قطعی محو کر دیں۔ اب اُس کا ذہن کسی کورے کاغذ کی طرح تھا۔ میں نے اُس پر کچھ نئے نقوش اُبھار دیے۔

عموماً مائیں اپنے بیٹوں کے نام رکھتی ہیں، مگر مصلحتاً مجھے اپنی ماں کا نام رکھنا پڑا۔ مجھے یہ بات عجیب لگی۔ مگر خود میرا وجود بھی تو عجیب اور حیرت انگیز تھا۔

”میں تمھارا بیٹا ہوں نا؟“ میں نے اٹیچی بند کرتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔ اب میں نے اُس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا کیوں کہ اِس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

”ہاں! تم میرے بیٹے ہو!“ اُس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ یہ جواب سُن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

”میرا نام کیا ہے؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”تمھارا نام... ادریس ہے۔“

اُس کے ذہن سے گزشتہ چھ سال کی یادوں کے تمام نقوش مٹا دینے کے بعد میرے لیے خطرہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اب اُس نے ایک نئی شخصیت اپنا لی تھی۔ یہ نئی شخصیت اپنا لینے کے بعد خوف کے اندھیرے اس کی اطراف سے چھٹ گئے تھے اور آنکھوں میں فطری چمک آ گئی تھی۔ اُس کی پُتلیوں کا رنگ بھی میری پُتلیوں کی طرح سبز تھا جسے میں نے کونٹیکٹ لینس کے ذریعے سیاہ بنا دیا تھا۔

صبح پانچ بجے سے کچھ پہلے میں، پالم ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ پھر جب ذرا دن چڑھے ایئر انڈیا کی وہ پرواز کلکتے روانہ ہوئی تو میں نے اپنی روح میں بڑی طمانیت محسوس کی۔ میرا دِلّی آنا رائیگاں نہیں ہوا تھا۔ میں وہاں سے ایک بڑی دولت اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور وہ بڑی دولت میری ماں تھی۔ دُنیا کی بھیڑ میں اب میں اکیلا نہ تھا۔

کلکتہ پہنچ کر میں نے عارضی طور پر ایک ہوٹل میں قیام کیا اور پھر دوسرے ہی روز کسی مکان کی تلاش شروع کر دی۔ کافی جستجو اور پیسے خرچ کرنے کے بعد پارک سرکس کے علاقے میں مجھے ایک اوسط درجے کا چھوٹا سا مکان مل گیا۔ کرایہ تو اُس کا برائے نام تھا مگر پگڑی بہت تھی۔ بڑے شہروں میں رہنے کی جگہ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ یہی حال اُس شہر کا تھا۔ میں ہوٹل سے فوراً ہی اُس مکان میں منتقل ہو گیا جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ وہاں ہم دونوں ماں بیٹے کی گزر بہ آسانی ممکن تھی۔ کمروں کے علاوہ چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ میں اُسی روز گھر کے لیے فرنیچر اور دیگر ضروری ساز و سامان لے آیا۔ پڑوسی بہاری تھے۔ انھیں جب علم ہوا کہ میں بھی بہار کے ایک شہر پٹنہ کا ہوں تو وہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ وہ لوگ چھپرا کے تھے۔ اگلے ہی دن انھوں نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ کا بندوبست کرا دیا۔

میں نے پڑوسیوں کو بتا دیا تھا کہ ایک حادثے کی وجہ سے میری ماں کے حافظے پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ اُسے بس اپنے بارے میں صرف چند باتیں یاد رہ گئی ہیں۔ ڈاکٹروں نے اُسے خوش رکھنے کو کہا ہے۔ اُن غریبوں نے میرے بیان کو درست جان کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ اپنے متعلق میں نے یہ کہانی سُنائی کہ کلکتے میں کوئی بڑا کاروبار جمانے آیا ہوں، اور یہ کہ ایک رئیس گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔

بیٹی ماں اب بھی کھوئی کھوئی سی رہتی تھی اور مجھے اس کا سبب معلوم تھا۔ جب پہلی بار میں نے اس کی ذہنی حالت [illegible] کی تھی تو مجھے ماننا پڑا کہ بیشتر یوں پتا چل نہ سکے تھے جانے کے باوجود [illegible] جاننے کے بعد وہ ان خلیوں میں اس زندگی تھی۔ فرصت ملتے ہی میں نے اس کے ذہن کا تفصیلی معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر آہستہ آہستہ ان خلیوں کو حرارت پہنچائی جائے اور انھیں بیدار کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے تو ایک نہ ایک دن میری ماں کی یادداشت واپس آ سکتی ہے۔ اس امید نے جیسے مجھے نئی زندگی بخش دی۔ اگر میری ماں کی یادداشت واپس آ جاتی تو مجھے بہت سے تشنہ سوالوں کے جواب مل جاتے۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرا وطن کون سا تھا؟ میرے والد کیا تھے؟ ان کا اور میری ماں کا نام کیا تھا؟ میرے والدین ہندوستان کیوں گئے؟ پھر وہاں سے سعودی عرب کیسے جا پہنچے؟ جہاں سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ میری ماں، فرانس میں کیوں تھی؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات تشنۂ جواب نہ رہتے۔

اس تفصیلی معائنے کے چند ہی دن بعد میں نے اپنی کوشش شروع کر دی۔ میں نے اس پر تنویمی حالت طاری کر دی اور شعور کو سلا دیا۔ اس کے ذہن پر میری پوری توجہ تھی۔ یہ بہت خطرناک کام تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی اس کی زندگی کے لیے خطرہ بن جاتی، کیوں کہ مجھے اپنے طاقتور ذہن کی تباہ کاریوں کا علم تھا۔

"تمھارے دو بیٹے تھے... تھے نا؟" میں نے پہلا سوال کیا اور اسی کے ساتھ اس کے دماغ کو بہت ہی ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کے باوجود وہ کراہ اٹھی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اولاد کے معاملے میں ہر عورت جذباتی ہوتی ہے۔ میں نے یہ سوال اسی لیے کیا تھا۔

"ہوں!" کافی دیر بعد اس نے ہنکارا بھرا۔

"تمھارا بڑا بیٹا ایک ہی سال کی عمر میں اغوا کر لیا گیا تھا۔ یاد کرو کہ اس وقت تم سعودی عرب کے شہر جدہ میں تھیں۔"

"سعودی عرب... جدہ..." وہ بڑبڑانے لگی۔

"ہاں تم جدہ میں تھیں۔ تمھارے ساتھ اور کون تھا وہاں؟"

"کون تھا میرے ساتھ... کون؟" اس کا چہرہ پسینے میں بھیگنے لگا۔

"کیا جدہ میں تمھارے شوہر ساتھ نہیں تھے؟" میں نے اس کے لاشعور کو ترغیب دی۔

"تھے!" اس نے جواب دیا۔ "جدہ... شہر... مدت..."

یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میں نے اس دن مزید سوالات نہیں کیے اور اسے ہوش میں لے آیا۔

"میں شاید لیٹے لیٹے سو گئی تھی بیٹے؟" اس نے آنکھیں کھولتے ہی مجھے مخاطب کیا۔

"ہاں ماں! تمھیں نیند آ گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ غالباً اُسے میری بات پر یقین آ گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر طویل سانس لیا اور آئندہ کے اندیشے مجھے بے چین کرنے لگے۔ کیا میں اس کی یادداشت واپس آنے تک اس کے ساتھ رہ سکوں گا؟ میں تو ابھی حالتِ جنگ میں تھا۔ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔ ایسی حالت میں کیا میرا اس کے ساتھ رہنا مناسب تھا؟ کیا اس طرح میری وجہ سے اس کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جاتی! نواب افتخار احمد نے اپنے آقاؤں کو اب تک صورتِ حال سے مطلع کر دیا ہوگا۔ میرے دشمنوں کو خبر لگ چکی ہوگی کہ میں کس ملک میں ہوں۔ کیا وہ اپنی اتنی بڑی شکست پر خاموش بیٹھ جائیں گے؟ مجھے سوالوں کے ہجوم گھیرنے لگے۔ میرے اندیشے غلط نہ تھے۔ ذہن زیادہ پریشان ہوا تو میں اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

شام کا وقت تھا۔ میرے پڑوسی نے بتایا تھا کہ شام کو دھرم تلہ میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ کلکتے میں بجلی سے چلنے والی ٹراموں کا جال بچھا ہوا ہے اور ہر جگہ سے دھرم تلہ کے لیے ٹرام ضرور ملتی ہے۔ میں خود ڈیوڑھی والی اس صاف ستھری ٹرام کے پہلے درجے میں بیٹھ گیا۔ ٹرام تیز رفتار تھی، اس نے مجھے جلد ہی دھرم تلہ پہنچا دیا۔ میں نے پہلی بار وہ علاقہ دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے قاہرہ کا تحریر اسکوائر یاد آ گیا۔ وہ علاقہ کھلا، پُر فضا اور خوبصورت تھا۔ اپنی دائیں جانب میں نے وسیع سبزہ زار دیکھے۔ مجھے انھی کے پس منظر میں کافی فاصلے پر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ایک بلند عمارت نظر آئی۔ یہ عمارت ہندوستان میں انگریزوں کے دورِ عروج کی یادگار تھی۔ اسے وکٹوریہ میموریل کہا جاتا ہے۔ میرے سامنے سڑک کی دوسری جانب میٹرو سینما تھا اور اسی کے برابر قلوپطرہ ہوٹل۔ اس ہوٹل کے نام کی وجہ سے مجھے پھر مصر یاد آ گیا۔ ملکہ قلوپطرہ بھی تو مصر ہی کی تھی۔ میں سڑک عبور کر کے بائیں طرف جانے والی ایک

معروف شاہراہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے ایک بلند و بالا مسجد نظر آئی۔ یہ مسجد ہندوستان کے ایک مجاہدِ آزادی کی یاد میں تعمیر کی گئی ہے اور مسجد ٹیپو سلطان کہلاتی ہے۔ اس مسجد سے ذرا آگے مجھے ایک خوبصورت نیون سائن روشن نظر آیا۔ انگریزی حروف میں اس طرح "ساقی" لکھا تھا جیسے کوئی عورت محوِ رقص ہو۔ ساتھ ہی نیچے "بار" لکھا گیا تھا۔ ساقی بار! کسی شراب خانے کے لیے ایسا خوبصورت اور بامعنی نام پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس نام کی کشش تھی جو مجھے اس بار میں کھینچ لے گئی۔

چھوٹا سا وہ بار مجھے اچھا لگا۔ میں نے باوردی بیرے کو شراب لانے کے لیے کہہ دیا۔ دھرم تلہ آ کر واقعی میرے پریشان ذہن کو سکون ملا تھا۔

ابھی میں نے پہلی بوتل خالی کر کے دوسری کے لیے آرڈر دینے والا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور سمجھ گیا کہ مجھے کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ جب پروفیسر مجھ سے رابطہ قائم کرتا تو میرے ذہن میں ایسی ہی سنسناہٹ شروع ہو جاتی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جاتی۔ اس وقت بھی یہی ذہنی رابطہ کا عمل تھا جو میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ "ٹک ٹک" کی آوازیں بند ہوئیں تو میرا دماغ جیسے روشن ہو گیا۔ میں اپنے ذہن میں ابھرنے والے ان روشن لفظوں کو پڑھنے لگا۔ "میرے بچے! میری تخلیق، ابوالہول! تو نے آخر وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ تو نہیں جانتا دشمن کتنا [illegible] ہے، وہ تیری اس حرکت پر سخت برہم ہو گئے ہیں۔ مجھ پر وہ سخت دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں تجھے اپنے ہی ہاتھوں ختم کر دوں یا پھر تجھے سرکشی سے باز رکھوں۔ میں نے بمشکل ان سے کچھ مہلت لی ہے۔ تو ہی بتا کہ خالق اپنی تخلیق کو کس طرح مار سکتا ہے! مگر مجھے یقین ہے کہ اب مہلت ختم ہونے کے بعد وہ نہیں مانیں گے! مجھے اپنی زندگی بچانے کے لیے مجبوراً ان کا حکم ماننا پڑے گا۔ تجھے شاید ان کی طاقت اور اقتدار کا اندازہ نہیں۔ وہ ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور ساری دنیا ان کا لوہا مانتی ہے۔ انھوں نے اب تیرے حصول یا تیری موت کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ وہ بعض بڑی طاقتوں کو اربوں ڈالر کی پیشکش کر چکے ہیں۔ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ چین اور روس، ان کی یہ پیشکش قبول کر لیں گے۔ تو اگر ان کے ایجنٹوں کو شکست دے کر اپنی ماں کو چھڑا لے گیا تو اسی پر زیادہ خوش نہ ہو۔ اب وہ تیرے باپ اور بھائی کا سودا کر رہے ہیں۔ سن کہ وہ سب خیریت سے ہیں اور اس بار وہ محض دھمکی نہیں دیں گے۔ اگر چاہتا ہے کہ تیرا باپ اور بھائی ہلاک نہ ہو جائیں تو ابھی وقت ہے، مان جا! سرکشی چھوڑ دے۔ ممکن ہے کہ تو [illegible] بچ نکلے، مگر اب تیرے ساتھ تیری [illegible] بھی بے جھپتی ہیں۔ تو اپنی اس کمزوری کو کہاں کہاں ساتھ لیے پھرے گا؟ بچے! کیا وہ ملی نہ جائے گی تجھے، اپنے آپ کو، اپنے والدین اور معصوم بھائی کو بچانے کے لیے اپنی ضد چھوڑ دے میرے بچے! ورنہ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ تو نہ رہا تو پھر شاید میں بھی نہ رہ سکوں گا!

تیرا خالق، تیرا پروفیسر۔"

جب وہ روشن لفظ میرے ذہن میں بجھ گئے تو دیر تک میرا جسم سنسناتا رہا۔ اب سے پہلے کبھی میں کسی دھمکی سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ پہلے مجھے اس محبت کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا جو ایک بیٹے کو اپنی ماں سے ہوتی ہے۔ مجھے اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہوئے چند ہی دن تو گزرے تھے، گنتی کے چند دن! میں سوچنے لگا، کیا رشتے آدمی کو اتنا کمزور کر دیتے ہیں؟ میں انھی چند دنوں میں اس کے اتنا قریب ہو گیا تھا جیسے اب کبھی میرے اس کے درمیان ہجر کی دیوار حائل نہیں ہوگی۔ پروفیسر نے دانستہ یا نادانستگی میں جس خطرے کا اظہار کیا تھا، وہ بے معنی نہیں تھا۔ یہ میں پہلے ہی خود بھی سوچ چکا تھا کہ اگر اپنی ماں کے ساتھ رہا تو میری وجہ سے اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں اپنے سکونِ دل کی خاطر اسے خطرے میں کیسے ڈال دیتا! یہ تو خود غرضی ہوتی، اور محبت خود غرض نہیں ہوتی۔

"میں جتنی جلدی بھی اس سے دور ہو جاؤں، اچھا ہے۔" میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کرنے لگے۔ سوچتے سوچتے میں بڑبڑانے لگا تھا۔

وہ جو امید بندھی تھی کہ میری کوششوں سے اس کی یادداشت واپس آ گئی تو ماضی کی گرہیں کھل جائیں گی، اب خام خیال معلوم ہونے لگی۔ یہ واضح بات تھی کہ میرے دشمن۔ یعنی کہ [illegible] کرتے ہوئے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ وہ میری طرح کسی پُراسرار اور حیرت انگیز وجود کی مالک نہیں تھی کہ پروفیسر سے اس کا رابطہ ہوتا اور دشمن اس تک جا پہنچتے۔ اگر میں

اُس سے جُدا ہو جاتا تو اُس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔

اپنے ذہنی ہیجان پر قابو پانے کے لیے میں نے پے در پے دو تین پیگ اور چڑھا لیے۔ بلانوشی بھی میرے وجود کا ایک لازمہ تھی۔ مجھے اب تک صرف ہلکا سا نشہ ہوا تھا۔ میری میز پر سے خالی بوتلیں اٹھاتے ہوئے بیرا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور مزید ایک بوتل لانے کو کہا۔

"جی اچھا!" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"جاؤ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اُس سے جانے کے لیے کہا۔ اُس نے شاید اپنی ملازمت کے دوران میں کوئی ایسا بلانوش نہیں دیکھا تھا جو تین بوتلیں ختم کر کے چوتھی بوتل کا آرڈر دے سکے۔ وہ کاؤنٹر کی طرف چلا گیا اور میں دوبارہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

پروفیسر کی فراہم کردہ اطلاعات سے یہ صاف ظاہر تھا کہ امریکی بوکھلا گئے ہیں۔ اس بوکھلاہٹ کی وجہ شاید یہ کھلی شکست تھی کہ میں اپنی ماں کو اُن کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اب میرے والد اور بھائی کا سودا کر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چین اور روس یقیناً اب میری تلاش سے دستبردار ہو جانا چاہتے ہیں۔ پروفیسر کی یہ اطلاع کہ اُس نے تمام ایجنسیوں سے کچھ مہلت طلب کر لی ہے اور یہ کہ خود اُس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے، میرے نزدیک محض فریب تھا۔ وہ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے پہلے بھی ایسی اطلاعات دیتا رہا تھا۔ اگر یہ اطلاع درست بھی تھی کہ اُس کی زندگی خطرے میں ہے تو بھلا مجھے اُس شخص سے کیا ہمدردی ہوتی جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرا وطن، میرے والدین اور میرا بچپن۔ میں تو اُس کی موت پر خوش ہوں گا اور یہ بات شاید اُسے بھی معلوم ہو گی۔ وہ اب خود بھی مظلوم بن کر مجھے فریب دینا چاہتا تھا۔

پھر بیرا نئی بوتل رکھ کر چلا گیا۔ اس بوتل کے ختم ہونے تک میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور بل ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ساقی بار سے نکل کر میں نے کسی فوٹو اسٹوڈیو کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ کچھ دور چل کر ایک فوٹو اسٹوڈیو نظر آگیا تو میں اُس میں گھس گیا۔

"جی صاحب!" کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک آدمی میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ کے یہاں ایسا انتظام بھی ہے کہ تصویر فوراً مل جائے؟"

مجھ سے دریافت کیا۔

"فوراً سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" اُس نے سوال کیا۔

"جلد از جلد سمجھ لیں۔"

"تین گھنٹے سے پہلے مشکل ہے اور اب دکان بند ہونے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ کل لے لیں۔"

مجبوراً مجھے رضامندی کا اظہار کرنا پڑا۔ میں دوسرے دن وہاں آنے سے بچنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا: "میرا آنا تو ضروری نہیں؟"

"جی نہیں! کسی کو بھی رسید دے کر بھیج دیجیے گا۔" اُس نے جواب دیا۔

"جس چہرے کا کلوز اَپ چاہیے تصویر قد آدم ہو۔ وہ جو اُدھر لگی ہوئی ہے۔" میں نے انگلی سے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جو ایک فریم میں لگی ہوئی تھی۔

"اتنا بڑا کلوز اَپ! اور صرف چہرے کا!" اُس کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

"جی ہاں!" میں بولا۔ "اور ڈیٹیل واضح ہو۔"

"تو پھر آئیں!" اُس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں اُس کے ساتھ اسٹوڈیو میں چلا گیا اور پھر کچھ دیر بعد تصویر کھنچوا کر واپس باہر آ گیا۔ رسید کٹوا کر میں نے رقم ادا کی اور چلتے چلتے تاکید کی: "کل تصویر ضرور مل جائے۔"

"آپ بے فکر رہیں، مل جائے گی۔" اُس نے مجھے یقین دلایا۔

میں نے وہاں سے پارک سرکس کے لیے ٹیکسی کر لی کیوں کہ میرے پاس اب وقت کم تھا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا، اُس پر اگر اِسی وقت عمل ہو جاتا تو بہتر تھا۔ پارک سرکس پہنچ کر میں نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی بجائے اپنے پڑوسی کے دروازے پر دستک دی۔

"کون صاحب ہیں؟" اندر سے دستک کے جواب میں ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"میں ہوں ادریس!" میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

"ابھی حاضر ہوا۔" یہ وہی صاحب تھے جنھوں نے ملازمہ کا بندوبست کرایا تھا۔ میں نے آواز سے اُنھیں پہچان لیا۔ شریف، ملنسار اور باوضع آدمی تھے۔ "آئیے آئیے" کہتے ہوئے انھوں نے مجھے اپنی چھوٹی سی بیٹھک میں بلا لیا۔ میں اندر چلا گیا۔ فرشی نشست تھی۔ میں جوتے دروازے کے قریب اتار کر چاندنی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُن سے بولا۔ "ایک زحمت دینا تھی آپ کو۔ اسی لیے حاضر

ہوا تھا۔" اُنھیں شراب کی بُو نہ آ جائے، یہ احتیاط کر کے میں ذرا فاصلے ہی سے بیٹھا تھا۔

"جی جی فرمائیے! زحمت کی کیا بات ہے! آپ کی خدمت کر کے تو خوشی ہو گی۔" وہ خوش اخلاقی سے بولے۔

"عنایت ہے آپ کی۔" میں بولا۔ پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔ "کچھ دن کے لیے ایک ضروری کام سے مجھے پٹنہ جانا ہے۔ وہاں کچھ زیادہ دن لگیں گے نہیں۔ سوچا اُنھیں ساتھ لے چلوں، پھر میں نے سوچا امی کو کہاں ساتھ لیے جاؤں گا۔ لیکن اُنھیں یہاں اکیلا چھوڑنا بھی۔۔۔" میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ذرا توقف سے کہا۔ "پھر خیال آیا آپ سے مشورہ کر لوں۔"

"آپ قطعی بے فکر ہو کر چلے جائیں اور اطمینان سے آئیں۔ یہاں ہم لوگ موجود ہیں۔ ان شاء اللہ اُنھیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔" وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئے۔ کئی روز پہلے وہ مجھے شادی کرنے کا مشورہ بھی دے چکے تھے۔ اُس روز بھی اپنی بات دہرائی کہ "آپ شادی کر لیجیے ادریس صاحب! ملازم تو پھر ملازم ہوتے ہیں۔ آپ کی دلہن گھر میں آ جائیں تو یقیناً والدہ کی صحت پر اُس کا اچھا اثر پڑے گا اور اُنھیں تنہائی بھی محسوس نہیں ہو گی۔"

"آپ کا مشورہ بالکل درست ہے محترم! لیکن جانے سے پہلے میں اپنا کچھ بار جانا چاہتا ہوں۔" میں نے اُنھیں اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا اُس کی روشنی میں بولا۔ پھر گفتگو کا رُخ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ "آپ نے میری ہمت بندھا دی۔ بہت بہت شکریہ۔ گھر کے کام کاج کے لیے تو خیر ملازمہ ہے، صرف امی کی دیکھ بھال کا مسئلہ تھا۔ اس کا بھی میں نے ایک حل سوچ لیا ہے، اس لیے کہ نا معلوم جا کے کتنے دن لگیں مجھے۔ یہاں کولوٹولہ میں ہمارے ایک دور کے عزیز ہیں، رشتے میں بھائی لگتے ہیں میرے! اُن سے آج طے کیا تھا۔ وہ بھی ہر دوسرے تیسرے دن آتے جاتے رہیں گے۔"

"کیا نام ہے اُن کا؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"شریف حسین!" میرے ذہن میں جو نام بھی پہلے آیا، بتا دیا۔

"ٹھیک ہے! میں آپ کی بھابی کو تاکید کر دوں گا کہ وہ ہر طرح والدہ کا خیال رکھیں۔" اُنھوں نے مجھے یقین دلایا۔

"اچھا! اب میں اجازت چاہوں گا، روانگی کی تیاری بھی کرنا ہے۔" میں بولا۔

اُنھوں نے چائے پلانے پر اصرار کیا اور میں نے معذرت کر لی، پھر اُٹھ کر چلا آیا۔

ملازمہ نیک اور غریب تھی۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں، اِس لیے ساتھ ہی رہنے پر راضی ہو گئی تھی۔ شوہر مر چکا تھا اور جوان شادی شدہ بیٹے کو اُس کی زیادہ پروا تھی نہیں۔ قیام و طعام کے علاوہ میں نے اُسے پیشگی تنخواہ بھی دے دی تھی۔ اس نے بدلے میں مجھے بڑی دعائیں دی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شریف عورت میرے پیچھے میری ماں کا پورا خیال رکھے گی۔ وہ ماں کے کمرے ہی میں سوتی بھی تھی۔ گھر کا سودا سلف لانے کی ذمہ داری بھی میں نے اُسی پر ڈالی تھی۔ گھر پہنچتے ہی پہلے میں نے اُسی سے بات کی۔ میں اُسے اپنے کمرے میں لے آیا اور مختصر باتیں بتائیں جو اپنے پڑوسی کو بتا چکا تھا۔ اُس نے بھی مجھے ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ میری ماں کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گی۔ مجھے اُس سے ایسے ہی جواب کی توقع بھی تھی۔ میں نے گھریلو اخراجات کے لیے کچھ رقم بھی اُسے دے دی۔ پھر وہ باورچی خانے میں میرے لیے کھانا گرم کرنے چلی گئی اور میں اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ابھی سوئی نہ تھی۔

"کچھ دن کو میں ایک کام سے جا رہا ہوں ماں!" میں نے اُس کی مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" اُس کی آواز سپاٹ اور ہر جذبے سے عاری تھی۔

"جلد لوٹ آؤں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا! اور یہ پیسے اپنے پاس رکھ لو۔" میں نے کوٹ کی جیب سے نوٹ نکال کر اُسے تھما دیے۔ اُس نے خاموشی سے نوٹ سمیٹ کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیے۔ پھر میں نے مزید کہا۔ "اور ہاں وہ جو چچا شریف حسین تھے وہ میرے پیچھے آیا کریں گے۔ تمھیں کوئی تکلیف ہو تو اُن سے کہہ دیا کرنا!"

"کون؟۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے تو نہیں معلوم۔" اُس کے چہرے سے اُلجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"تم اُنھیں دیکھو گی تو پہچان لو گی۔ اُن سے ہماری دور کی رشتہ داری ہے۔"

"اچھا!" اُس نے یہ کہہ کر اِس طرح طویل سانس لی جیسے کوئی اُلجھن رفع ہو گئی ہے۔ میں بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اِس سلسلے میں اپنے ذہن پر زیادہ زور دے، اِس لیے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ پھر ملازمہ کھانا لے کر آ گئی۔ میں نے وہیں کھانا کھایا اور

اسی دوران میں نے اپنی ماں کو اُسی رات روانگی کے متعلق بتادیا۔
"آپ کہیں تو راستے کے لیے کھانا وغیرہ تیار کردوں!" ملازمہ نے کہا۔
"نہیں! اِس کی ضرورت نہیں ہے بُوا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ ابھی مجھے یہاں سے چلنے میں دیر لگے گی۔ سامان وغیرہ رکھنا ہے۔ جب جاؤں گا تو تمہیں جگا دوں گا، دروازہ بند کر لینا۔" یہ کہتے ہی میں مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا، پھر اپنی ماں سے بولا۔ "اب تم بھی سو جاؤ ماں، خدا حافظ!"
"خدا حافظ!" میری ماں کے ہونٹ ہلے اور میں اُس پر آخری نظر ڈالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر آکر میں نے صحن کی بتی بجھادی اور اپنے کمرے میں آگیا۔ پھر اپنے کپڑے وغیرہ اور دوسرا ضروری سامان سمیٹنے میں مجھے زیادہ وقت نہ لگا۔ میرے سامان میں وہ ریوالور بھی شامل تھا جو میں نے شہر میں ایک امریکی ایجنٹ کی جیب سے نکالا تھا۔ اُسے میں نے سنبھال کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اُس سے ایک گولی بھی نہیں چلائی گئی تھی۔ میں اُس کا پہلے ہی جائزہ لے چکا تھا۔ اب تک وہ میری ایک اٹیچی میں کپڑوں کے نیچے رکھا تھا، لیکن موجودہ حالات میں یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں اُسے اپنی جیب میں رکھوں۔ جب ساری تیاری ہوگئی تو میں اپنے چہرے پر نیا میک اپ کرنے بیٹھ گیا۔ میک اپ کر کے فارغ ہوا تو میں نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔ سامنے آئینے میں ایک ادھیڑ عمر ہندوستانی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ نئی وگ نے بھی میرے چہرے کو خاصا بدل دیا تھا۔ سر کے بالوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے سفید بالوں کو چھپانے کے لیے مہندی لگائی گئی ہو۔ مختلف قسم کی وگیں میں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد وقتاً فوقتاً خرید لی تھیں۔
میک اپ کا سامان ایک اٹیچی میں رکھنے کے بعد میں نے اٹیچی بند کی اور کھڑا ہوگیا۔ اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے تمام تیاریوں میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا تھا۔ دونوں اٹیچیاں اُٹھانے سے پہلے میں نے کمرے کی بتی بھی بجھادی اور صحن میں آگیا۔ وہاں بھی تاریکی تھی، البتہ دوسرے کمرے میں نیلا بلب جل رہا تھا۔ صحن کی بتی میں نے اسی لیے بجھا دی تھی کہ چلتے وقت ملازمہ کی نظر میرے چہرے پر نہ پڑے۔ پھر بھی میں نے احتیاط سے کام لیا اور گھر کے دروازے تک پہنچ کر ہی ملازمہ کو آواز دی۔ "دروازہ بند کر لو بُوا، میں جا رہا ہوں۔"

ملازمہ شاید ابھی تک میرے جانے کے انتظار میں سوئی نہیں تھی، اسی لیے فوراً بول اٹھی۔ "وہ ابھی آئی۔"
جب مجھے اپنے عقب میں اُس کے قدموں کی آواز سنائی دی اور صحن کی بتی جلی تو میں بغیر مڑے "خدا حافظ" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ دروازہ میں پہلے ہی کھول چکا تھا۔ نئی حیثیت اختیار کرتے ہی مزید ایجنٹوں سے بچنے کے لیے میں نے دو میک اپ کر لینا ضروری سمجھا تھا۔ میں وہ گلی عبور کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر آگیا۔ ٹیکسی ملنے میں ذرا دیر تو ہوئی مگر میں وہیں کھڑا رہا۔ اُس وقت تک میں اپنی ماں کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ اگر مجھے اُس کی زندگی کا خطرہ نہ ہوتا تو کبھی اُسے یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاتا۔
پھر ٹیکسی مل گئی تو میں نے اُسے دھرم تلہ چلنے کو کہا۔ گرانڈ ہوٹل وہیں تھا جہاں فی الحال میں نے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ دنیا کے دیگر ملکوں اور شہروں کی طرح اِس بڑے شہر کے متعلق بھی میرے حافظے میں بہت سی کام کی باتیں محفوظ تھیں۔ وہاں کے محلے، آبادیاں اور مشہور مقامات سبھی میرے جانے ہوئے تھے۔ ضرورت پڑنے پر میں وہاں کے کسی بھی مقامی باشندے کا ذہن پڑھ کر مزید تفصیلی معلومات حاصل کر لیتا۔ میرے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔
گرانڈ ہوٹل کی دوسری منزل پر میں نے ایک کمرہ حاصل کر لیا اور پھر اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا۔
دوسرے دن صبح میں ناشتا کرتے ہی ہوٹل سے نکل گیا۔ میں نے اپنی ماں کی وجہ سے اُسی شہر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات صرف میرے ہی علم میں تھی کہ میری ماں کہاں اور کس حیثیت سے رہ رہی ہے۔ میرے دشمنوں کو یہ بات معلوم ہونا ممکن نہ تھا۔ اب نہیں تو کچھ دن بعد میرے دشمن مجھے ڈھونڈ ہی لیتے۔ وہ بمبئی ہوتا یا کلکتہ، دلّی ہوتا یا کوئی اور شہر، یہ ہوتا ہی تھا۔ پھر اگر میں اُس شہر سے کہیں اور چلا بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہاں میرے دل کو یہ سکون تو رہتا کہ میری ماں بھی اسی شہر میں ہے، اور میں جب چاہوں اُس سے مل سکتا ہوں۔
میں نے پہلے ہی سے یہ تدبیر کر لی تھی۔ اِس طرح میرے لیے اُس کا علاج بھی ممکن تھا۔ میں نے ہر بات پر کافی سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ بڑے ہوٹلوں کی سکونت کا تلخ تجربہ مجھے پہلے سے

تھا۔ مجھے فی الوقت کچھ خبر نہ تھی کہ اِس شہر میں کتنے عرصے رہنا پڑتا۔ میں اسی لیے کسی مستقل ٹھکانے کی تلاش میں نکلا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل کی نسبت وہاں مجھے کم خطرہ ہوتا۔ میرا ارادہ کولوٹولہ میں رہنے کا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ گنجان آبادی کا علاقہ تھا اور مجھے مستقل سکونت اختیار کرنے کے لیے کسی ایسے ہی علاقے کی تلاش تھی۔
ہوٹل سے نکل کر میں پیدل چلتا ہوا دھرم تلہ کے چوراہے تک آیا اور پھر وہاں سے ایک ٹرام میں بیٹھ کر کولوٹولہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ مجھے پہلے سے یہ احساس تھا کہ ایسے علاقوں میں آسانی سے جگہ نہیں ملتی، لیکن میری تلاش و کاوش رائیگاں نہیں گئی۔ اُس علاقے میں غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ یہاں زیادہ لوگ وہ تھے جو معاش کی تلاش میں ہندوستان کے دوسرے دو صوبوں یوپی اور بہار سے آکر آباد ہوگئے تھے۔ مقامی بہت کم تھے۔ مجھے وہاں ایک بلڈنگ میں ایک چھوٹا سا کمرہ حاصل کرنے کے لیے دس ہزار روپے پگڑی دینا پڑی۔ کرایہ صرف بیس روپے مہینا تھا۔ جن صاحب سے میں نے وہ کمرہ پگڑی پر حاصل کیا، وہ ہندوستان کے ایک شہر مُراد آباد کے تھے۔ مُراد آبادی برتنوں کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔ ایک بیوی اور دو چھوٹی بچیوں سمیت وہ اُس کمرے میں رہتے تھے۔ کاروبار میں گھاٹا ہونے کی وجہ سے وہ دوبارہ اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر "بلڈنگ والے" کے دفتر پہنچے اور کچھ لے دے کر رسید میرے نام کرادی۔ اِس چکر میں شام ہو گئی۔ انھوں نے اُسی روز کمرہ خالی کر کے چابی مجھے تھمادی اور خود بیوی بچیوں کو لے کر ایک مسافر خانے میں منتقل ہو گئے۔
اُس بلڈنگ کا نمبر پیاسی تھا اور وہ اِسی نام سے مشہور تھی، پیاسی نمبر! اُس چار منزلہ بلڈنگ کی پہلی منزل پر وہ کمرہ تھا جس میں باتھ روم کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ میں نے اِسی کو غنیمت جانا۔ وہاں مجھے ایک بات اچھی لگی کہ کسی شخص کو دوسرے شخص کے بارے میں زیادہ کرید نہیں تھی۔ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیا کرتا ہے وغیرہ۔ سب اپنی اپنی دُھن میں لگے ہوئے تھے۔ میں اگلے ہی دن ہوٹل سے وہاں پہنچ گیا۔ اوسط درجے کا ایک چھوٹا سا ہوٹل، بلڈنگ کے نیچے ہی تھا۔ میں نصف پہر کا کھانا وہیں کھا کر ضروری سامان خریدنے نکل گیا۔

پھر شام ہوئی تو مجھے اُس تصویر کا خیال آیا جو گذشتہ روز دھرم تلہ کے ایک فوٹو اسٹوڈیو میں کھنچوائی تھی۔ اب سے پہلے کبھی مجھے یہ ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے محض احتیاطاً ایسا کیا تھا کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو میں اپنے چہرے پر وہ میک اپ کر سکوں۔ اس کے لیے تصویر ضروری تھی۔ اسی غرض سے میں نے صرف چہرے کا بڑا کلوز اَپ بنوایا تھا کہ چہرے کے نقوش واضح نظر آئیں۔
اُس روز میں نے دل پر جبر کر کے پارک سرکس کا رُخ نہیں کیا، ورنہ مجھے رہ رہ کر اپنی ماں کا خیال آرہا تھا۔ میں دھرم تلہ ہی سے تصویر لے کر اور کچھ دیر ساقی بار میں اپنی تشنہ لبی دور کر کے لوٹ آیا۔ اگر میں صبح و شام وہیں کے پھیرے لگاتا رہتا تو اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ دو روز اور یونہی گزر گئے، میں پارک سرکس نہ گیا۔ تیسرے دن جب میرا دل کسی طرح نہ مانا اور بار بار ماں کا چہرہ آنکھوں میں گھومنے لگا تو میں پارک سرکس پہنچ ہی گیا۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر بعد اندر سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔
"کون صاحب ہیں؟" یہ ملازمہ کی آواز تھی۔
"میں ہوں شریف حسین۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا ادریس میاں کا گھر یہی ہے؟" میں نے اپنی آواز بدل لی تھی۔
"جی ہاں!" وہ بولی۔ "ذرا ٹھہریے، پڑوس سے کچھ عورتیں آئی ہیں، میں اُنھیں کہہ آدوں۔ آپ ادریس صاحب کے چچا ہیں نا؟" اُس نے دروازہ کھول کر ذرا سا جھانکا۔
"جی! میں انتظار کر لیتا ہوں، آپ کہہ دیں اُن سے۔" میں دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد دو عورتیں دروازے سے نکلیں۔ میں نے اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ وہ چلی گئیں تو عقب سے ملازمہ کی آواز آئی۔ "آجایئے جناب!"
میں نے گھر میں قدم رکھتے ہی ملازمہ کے ذہن کو تابع کر لیا۔ اُس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور پھر میرے ہی ایما پر اُس کمرے میں چلی گئی جو میرے استعمال میں تھا۔ میں نے اُس کا ذہن پڑھ کر یہ بھی معلوم کر لیا کہ گذشتہ دنوں میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں نے اُس کے ذہن کو دوسرے کمرے میں جا کر سو جانے کی ترغیب دی تھی۔
جب میں اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ گم صم

سی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکی اور پھر حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اُس سے کچھ کہے بغیر مسہری کے قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے فوراً ہی اُس کے ذہن پر توجہ دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آخر میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں؟ ملازمہ نے اُسے صرف میرا نام بتایا تھا۔ ملازمہ شاید یہ سمجھی ہوگی کہ وہ مجھے پہچان لے گی۔ میں نے اُسے سوچنے دیا کہ دیکھوں اُسے کچھ یاد آتا ہے یا نہیں؟ اس سے مجھے اُس کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ ہوتا۔ میں اُسے بتا چکا تھا کہ دور کے ایک رشتہ دار اُس سے ملنے آیا کریں گے اور یہ کہ اُن کا نام کیا ہے۔ وہ تین ہی روز پہلے کی بات بھول گئی تھی۔ سوچتے سوچتے اُس کا ذہن ماضی کے نہاں خانوں میں گم ہونے لگا۔ میں کون ہوں؟ بار بار اُس کے ذہن میں یہی سوال اُبھر رہا تھا۔

"تمہارا تعلق ایک عرب ملک سے ہے۔" میں نے اُس سے ذہنی رابطہ بحال رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جی!" وہ چونک کر بولی۔ "کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" پھر وہ میرا جواب سُنے بغیر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "عرب ملک سے... ہاں... ہاں میں... مگر وہ... وہ کون سا ملک تھا؟"

"شام!" میں پھر بول اُٹھا۔

"نہیں..." وہ روانی میں کہہ گئی۔

میں نے کئی اور ملکوں کے نام لیے، مگر وہ انکار کرتی رہی۔ اب وہ مرحلہ آگیا تھا کہ میں اُس کے شعور کو سُلا دیتا۔ "تمہیں نیند آرہی ہے نا!"

"ہاں!" وہ غنودہ سی آواز میں بولی۔

"تو پھر سو جاؤ! لیٹ جاؤ۔" میں نے اُس کے ذہن کو ترغیب دی۔ وہ لیٹ گئی۔ شعور کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی میں نے اُسے مخاطب کیا: "کبھی تم اپنے وطن سے اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان آئی تھیں۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

"میں... ہندوستان... ہاں آئی تھی۔" اُس کی آواز بوجھل سی تھی اور خوابیدہ بھی۔

"اُس وقت تمہارا بیٹا کتنا بڑا تھا؟" میں نے کامیابی کے آثار دیکھ کر مزید پیش قدمی کی۔

"بیٹا... نہیں... میں اکیلی تھی... مگر بیٹا..." اُس کے ذہن پر دباؤ پڑنے لگا۔ میں نے بھی خفیف سا دباؤ ڈالا اور وہ کراہنے لگی۔

"تم دلّی میں تھیں۔ اپنے بیٹے کو گود میں لے کر تم نے دلّی کی جامع مسجد کے سامنے تصویر بھی کھنچوائی تھی!"

"ہاں... ہاں، مجھے... مجھے یاد آرہا ہے... آرہا ہے یاد... تصویر کھنچی تھی۔"

اُس دن میری ماں نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کر دی جو میرے علم میں تھیں، اور یہ بہرحال کامیابی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اُس کے ذہن پر مزید بوجھ ڈالنا خطرناک ہوتا۔ اس لیے میں نے اُس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ پھر مجھے ایک اور راہ سوجھی کہ یہ باتیں اُس کے شعور کی سطح پر آجائیں تو شاید خاطر خواہ کامیابی ہو۔ میرے طاقتور ذہن کے لیے یہ کام مشکل ثابت نہ ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ میں نے یہ تاکید کر دی کہ میرے سوا وہ کسی سے اِن باتوں کا ذکر نہیں کرے گی۔ اس کے بعد میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُس کے چہرے سے تکلیف کے آثار ظاہر تھے۔

"میرے سر میں درد... درد ہو رہا ہے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"تم بالکل ٹھیک ہو، تمہیں کچھ نہیں ہوا، اور سر کا درد بھی ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "میں اب چلتا ہوں۔ تمہیں کچھ دیر آرام کی ضرورت ہے۔"

"جا... جا رہے ہیں آپ!... مگر یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ... آپ کون ہیں؟" وہ اُٹھنے لگی۔

"لیٹی رہو۔" میں نے اُس سے کہا، پھر بولا۔ "اِس وقت اِن باتوں پر غور نہ کرو۔ میں جلد ہی پھر آؤں گا۔"

"اچھا!" اُس نے میری بات مان لی۔ اُسے واقعی فی الحال آرام کی ضرورت تھی۔

میں نے ملازمہ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے اُسے بیدار کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں آگئی۔ آتے ہی اُس نے کہا۔ "معاف کیجیے گا جناب، میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے سوچا، آپ اماں سے باتیں کر لیں، میں کمر سیدھی کر لیتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "بس اِن کا خیال رکھا کرو۔"

"بہتر ہے۔" وہ بولی، پھر جلدی سے کہا۔ "آپ بیٹھیے، میں چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے۔"

"نہیں، اب چلوں گا، پھر کسی دن سہی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شدید ذہنی تھکن نے اُس پر غنودگی طاری کر دی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدموں سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے مختلف سوالات، ترغیبات اور جدوجہد کے نتیجے میں اُس کے حافظے کو بڑی تحریک ملی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ اب میں جلد ہی ماضی کی گرہیں کھولنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اُسے یاد آگیا تھا کہ وہ کسی عرب ملک کی رہنے والی ہے۔ اِس کے علاوہ یہ کہ ایک سال کی عمر میں کہاں اور کن حالات میں میرا اغوا ہوا، پھر یہ کہ اب سے چھ سال قبل وہ اپنے دوسرے بیٹے اور شوہر سے بھی جُدا ہو گئی۔ یہ تھیں، وہ باتیں جو میرے علم میں بھی تھیں اور میری ماں کے ذہن نے بھی اِن کی تصدیق کر دی۔ یہ میرے لیے یقیناً بڑی کامیابی کی بات تھی۔ میں اب ہر دوسرے تیسرے دن پابندی سے پارک سرکس جانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے مانوس ہوتی گئی اور اجنبیت نہیں رہی۔ اُس نے مجھے اپنے کسی قریبی عزیز کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ میں بہت آہستہ آہستہ اُس کے ذہن کو راہ پر لا رہا تھا۔ اگر میں غیر معمولی ذہنی قوتوں کا مالک نہ ہوتا تو شاید کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔ ایک طرف تو میں سخت بے چین تھا کہ جلد از جلد اُس کی ذہنی صحت بحال ہو جائے اور میری کوششیں جاری تھیں، دوسری طرف جلد بازی کے نتیجے میں اُس کے ذہن کو کوئی ایسا نقصان پہنچنے کا بھی احتمال تھا جس کا تدارک ممکن نہ تھا۔ اُسے ذہنی طور پر سنبھلنے اور ذہنی توازن برقرار رکھنے کے لیے مناسب وقت دینے کی ضرورت تھی ورنہ یادوں کے اِس ہجوم میں شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ اُسے ہلکان کر دیتی۔ اُس کی جسمانی صحت بھی اِس قابل نہ تھی کہ وہ یہ ذہنی صدمہ برداشت کر لیتی۔

اپنی ماں کے سلسلے میں تمام تر جدوجہد اور اضطراب کے باوجود میں اپنے دشمنوں کو نہیں بھولا تھا۔ جس قدر وقت گزر رہا تھا، میں پہلے سے زیادہ محتاط اور چوکنا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اچانک میرے خوابوں کی فصل اُجاڑنے آجاتے۔ میں نے کسی امکان کو نظر انداز نہیں کیا۔ میں اب اپنی ماں سے ملنے جاتا تو راستے میں ایک ایک ذہن کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا، ایک ایک

پاک وطن کا سودا کرنے والے چہروں کی نقاب کشا داستان

غیرت کے سوداگر

ایم اے راحت

وطن عزیز کے حصول کے لئے کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے گھر ویران ہوئے، کتنے اجسام لہو لہو ہوئے۔ تب عروس وطن کی نقاب کشائی ہوئی لیکن ناموس وطن آج بھی وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی

جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے تھے

مکمل کہانی ایک جلد پر مشتمل کتابی صورت میں دستیاب ہے

ناشر:
گل قریش لائبریری، 11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔ 7248599 7229762

چہرے کو غور سے دیکھتا کہ کہیں کوئی چہرہ میرے دشمن کا چہرہ نہ ہو۔ یہ اُنہی دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے اپنی ماں کی ذہنی صحت کو تیزی سے بحال ہوتے دیکھ کر آخری قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میرے خیال میں اب وہ معمولی سا ذہنی جھٹکا برداشت کر لیتی۔ اِس ذہنی جھٹکے کے بعد یا تو وہ طویل عرصے کے لیے بستر سے اُٹھنے کے قابل نہ رہتی یا پھر اُس کی یادداشت مکمل طور پر واپس آجاتی۔ ناکامی کی صورت میں اُس کی زندگی کو تو خطرہ نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ ایک مدت تک مجھے اُس کی صحت یابی کا انتظار کرنا پڑتا۔

"تم روز کیوں نہیں آتے شریف حسین!" اُس دن وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "میں تمہارا انتظار کرتی رہتی ہوں۔ تم آجاتے ہو تو جانے کیوں مجھے کچھ سکون سا مل جاتا ہے۔" اب وہ مجھ سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگی تھی۔ اب اُسے دیکھ کر شاید ہی کسی کو یہ خیال آتا کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں ہے۔

"ہاں بس کام دھندے میں فرصت نہیں مل پاتی۔" میں نے جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"مجھے جانے کیا کیا خیال آتے رہتے ہیں، عجیب سے خیال! تمہارے سوا کسی سے میں یہ باتیں بھی تو نہیں کرتی، کوئی جانے کیا سوچنے لگے، کیا سمجھے گا۔" اُس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "تم آتے ہو تو باتیں کر کے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ ذہن پر ہر وقت ایک بوجھ سا رہتا ہے، معلوم نہیں کیوں! بس ہر وقت یہی جی کرتا ہے کہ یہ بوجھ ہٹا دوں۔ کیسے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم بتاؤ... بتاؤ میں کیا کروں؟... کیا کروں میں!"

وہ جس ذہنی خلفشار اور اُلجھن کا شکار تھی، مجھ سے چھپا نہ تھا۔ اُس کے ذہن سے وہی بوجھ تو مجھے ہٹانا تھا۔ طلارہ کو میں نے حسبِ معمول اُس روز بھی گہری نیند سُلا دیا تھا۔ میں نے اُس سے اپنی طرف دیکھنے کو کہا۔ اُس کی نگاہ اُٹھی، اور پھر وہ میرے ذہن کے زیرِ اثر آ گئی۔

"تمہاری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں، بستر پر لیٹ جاؤ۔" میں نے اُسے مخاطب کیا۔

"ہاں... مجھے نیند... نیند سی آ رہی ہے۔" وہ جیسے کہیں دُور سے بولی۔ اُس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اُس نے ٹانگیں پھیلا دیں اور بستر پر لیٹ گئی۔

اُسی وقت میرے ذہن نے اُس کے دماغ کی اُوپری سطح کو ہلکی سی حرکت دی۔ وہ آہستہ سے کراہی۔ پھر میرے ذہن کی طاقتور لہریں، اُس کے دماغ کو حرارت پہنچانے لگیں تاکہ وہ ذہنی جھٹکا برداشت کر سکے۔ چند لمحے بعد ہی اُس کے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ یہ ذہنی جھٹکا ذرا مختلف تھا۔ اُس کے حافظے کے تالے کھلنے اور ٹکرانے لگے۔ یہ عمل یقیناً اُس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اِسی لیے اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ چند لمحے مجھ پر بھی قیامت گزرے۔ میرا ذہن اُس کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ اُس کے دماغ کی شریانوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ اگر یہ گردش کچھ اور تیز ہو جاتی تو دماغ کی کوئی شریان پھٹنے کا خطرہ بھی تھا۔ میں کیونکہ پہلے ہی سے کسی ایسی صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اِس لیے وہاں خون کو مزید تیز نہ ہونے دیا۔ خود میرے لیے بھی یہ تجربہ نیا، عجیب اور انتہائی سنسنی خیز تھا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ اگر وہ میری ملل نہ ہوتی، مجھے اُس سے اتنی جذباتی وابستگی نہ ہوتی تو شاید میں اِس کیفیت سے نہ گزرتا۔ وہ قیامت خیز لمحے گزر گئے تو میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اُسے آواز دی۔

"ہوں!" اُس کے ہونٹوں میں لرزش ہوئی۔ اُس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

میرے جسم میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ شاید مجھے اتنی خوشی زندگی بھر نصیب نہیں ہوئی جو اُس لمحے میں نے محسوس کی۔ میری کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار اُس کے جواب پر تھا۔ اُس کی اِک ذرا سی "ہوں" نے جیسے میرے ایک خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیا۔

"تمہیں خبر ہے کہ تم کون ہو؟" میں نے اپنی کامیابی کے یقین کی خاطر پہلا سوال کیا۔

"ہاں مجھے خبر ہے!" اُس نے جواب دیا اور اِسی کے ساتھ وہ سسکیاں سی لینے لگی، پھر وہ ایک دم چیخ اُٹھی۔ "نہیں، نہیں... مجھے کہاں لے جا رہے ہو تم؟... کہاں ہے... میرا بچہ... میرا بچہ کہاں ہے؟... بتاؤ... بتاؤ!" وہ چیخنے لگی اور میں نے اُسے چیخنے دیا۔ اُس کی یادداشت رفتہ رفتہ واپس آ رہی تھی۔ چھ سال پہلے ایک رات اُس پر جو گزرا تھا، وہ اُسے یاد آ رہا تھا۔ میں اُس کا ذہن پڑھ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ واقعات جنہیں اُس کے لاشعور میں گہری نیند سُلا دیا گیا تھا، اب شعور کی سطح پر آ رہے تھے۔ یہ عمل فطری اور لازمی تھا، میں نے اُسے نہیں روکا۔ اُس کی روح کو اِس کرب سے گزرنا ہی تھا مگر اُس کی چیخیں نقاہت کے سبب زیادہ بلند نہ تھیں۔

جب وہ چیختے چیختے نڈھال ہونے لگی تو میں نے اُس کے ذہن کو سہارا دیا۔ اب اُس کی یادداشت مکمل طور پر واپس آ چکی تھی۔ کچھ دیر میں نے اُسے گہری نیند سُلا دیا۔ اور اُس کے ذہن کو بالکل نہیں چھیڑا۔ ہر چند کہ مجھے ابھی صرف ایک شب کی روداد معلوم ہوئی تھی، لیکن میں نے صبر سے کام لیا۔ وہ رات تھی جب اُسے اغوا کنندوں نے یرغمال بنایا تھا۔ اُس کی آنکھ کھلی تو آغوش خالی تھی۔ وہ اجنبی لوگوں کے درمیان تھی جو اُسے کہیں لے جا رہے تھے۔ وہ جب سوئی تھی تو میرا شیر خوار بھائی اُس کے پہلو میں تھا۔ وہ بھی اُس وقت سال بھر سے زیادہ کا نہ تھا۔ وہ اُسی کے لیے چیخ رہی تھی۔ اُسے یہ خبر نہ تھی کہ اُس کے شوہر پر کیا گزری۔

کچھ وقت گزر گیا تو میں نے ایک بار پھر اُس کے ذہن پر توجہ دی۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی، ڈراؤنا خواب! میں نے آہستہ آہستہ اُسے بیدار کیا، اور اسی کے ساتھ اُس کے ذہن سے خوف و دہشت کے نقوش مٹا دیے۔ یادداشت واپس آنے کے بعد یہ بہت ضروری تھا۔ اب مجھے معلوم تھا کہ گزشتہ چھ سال کے دوران میں پیش آنے والے واقعات اُس کے ذہن سے اب حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے ہیں اور اب از سرِ نو مجھے اُس کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔ اُسے اُس وقت یہ بتانا بھی کسی طرح مناسب نہ ہوتا کہ میں اُس کا وہی بڑا بیٹا ہوں جسے ایک سال کی عمر میں اغوا کر لیا گیا تھا۔ وہ یہ خوشی برداشت نہ کر پاتی۔

پھر اُس نے آنکھیں کھول ہی دیں اور نحیف سی آواز میں بولی: "میں... میں کہاں ہوں؟" پھر اُس کی نگاہ میری طرف اُٹھی۔ "تم... تم کون ہو؟"

"میں تمہارا ایک ہمدرد ہوں۔ تمہیں ظالم اور بے رحم لوگوں کے چنگل سے نکال کر یہاں لے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ... یہ کون سی جگہ ہے؟" وہ یہ سوال کرتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "تم تو مجھے ہندوستانی معلوم ہوتے ہو!"

"ہاں میں ہندوستانی ہوں، اور تمہیں شاید یہ سُن کر حیرت ہو کہ تم اِس وقت فرانس میں نہیں، ہندوستان میں ہو۔"

"کیا؟" وہ ناقابلِ یقین لہجے میں بولی۔ "مگر یہ... یہ کیسے ممکن ہے؟"

پھر میں نے اُسے رفتہ رفتہ سکون اور اطمینان کے ساتھ کم از کم یہ بات بتا دی کہ جو واقعہ اُسے پیش آیا تھا، اُسے چھ سال گزر چکے ہیں۔ اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے میں نے اپنی ذہنی قوتوں کو بھی استعمال کیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر چھ سال میں نے کہاں اور کس حال میں گزارے؟ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔" وہ اپنا ماتھا رگڑنے لگی۔

"اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "تمہیں کچھ یاد نہیں آئے گا۔"

"لیکن کیوں؟"

"اِس لیے کہ گزشتہ چھ سال تم نے عالمِ ہوش میں نہیں گزارے۔" میں نے اُس کے سوال کا جواب دیا۔ "تمہیں ایک خود فراموشی کے عالم میں رکھا گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا جس سے نمایاں طور پر بے یقینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل ایک تکلیف دہ تجربے سے گزر

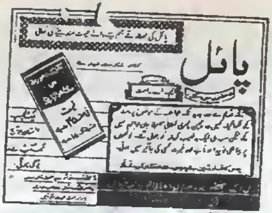

چکی تھی۔ اُس کی ذہنی حالت فی الحال ایسی نہ تھی کہ میں بار بار بغیر کسی دلیل و حجت کے اُسے اپنی باتیں ماننے پر مجبور کرتا ورنہ مجھے اتنی گفتگو کی ضرورت نہ تھی۔ میں اُسے بہ آسانی اپنے طاقتور ذہن کے زیرِ اثر لا کر ہر بات منوا لیتا۔ پھر بھی کم از کم یہ ضروری تھا کہ وہ مجھے اپنے باب میں مخلص سمجھے اور میں اُس سے جو کہوں اُسے شک و شبہے کی نظر سے نہ دیکھے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لیے اُس کے ذہن کو زیادہ دیر میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں رہنا پڑتا۔ سو میں نے یہ مجبوری ہی کیا۔ اُس کے بعد وہ مجھ سے گفتگو کرتی رہی، مگر اُس کا لہجہ بدل گیا۔ اُس کے لہجے کی شائستگی اور انداز و اطوار سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور ذہین عورت ہے۔ وہ بڑی رواں انگریزی بول رہی تھی۔

"تمہاری باتوں پر مجھے یقین ہے۔" اُس نے مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا، پھر بولی۔ "لیکن وہ لوگ کون تھے جنہوں نے ایسا کیا اور... اور اِس کا تو مطلب یہ ہے کہ... کہ میرے شوہر نے تو مجھے اب تک مُردہ تصور کر لیا ہو گا... اور... اور میرا بچہ... وہ تو اب تک سات سال کا..." اُس کی آواز بھرانے لگی۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہی تھی کہ صرف وہی ظلم کا شکار ہوئی ہے۔

میرے لیے یہ بڑی آزمائش کے لمحے تھے۔ اگر میں اُسے حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیتا تو بھی اُس کے ذہن پر کوئی اچھا اثر نہ پڑتا اور کچھ نہ بتاتا تو وہ مجھ پر دباؤ ڈالتی کہ میں اُسے فوراً

اُس کے شوہر کے پاس پہنچا دوں۔ میں اِسی لیے کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا، پھر ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ اِس عرصے میں کچھ نہ بولی۔ اُس کے چہرے سے حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر خود میں نے ہی اُسے مخاطب کیا۔ "تمھیں اپنے شوہر کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُنھی کے ایما پر میں تمھیں ہندوستان سے لے کر آیا ہوں۔ وہ مجھے اپنا قابلِ اعتماد دوست سمجھتے ہیں۔ ورنہ تمھیں میرے ساتھ یہاں نہ بھیجتے۔ تمھارا..."

"وہ... وہ کہاں ہیں؟" اُس نے میری بات کاٹ کر بےچینی سے پوچھا۔

"چین میں ہیں۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب پر اُسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

"کیا اُن سے تمھارا رابطہ قائم ہے؟" اب اُس کی آواز قدرے پُرسکون تھی۔

"نہیں!"

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ مصلحت کا یہی تقاضا ہے۔ اُنھوں نے مجھے منع کر دیا ہے کہ میں خود اُن سے رابطہ قائم نہ کروں۔ جب حالات درست ہو جائیں گے اور کوئی خطرہ نہیں رہے گا تو وہ خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کر لیں گے۔"

"خطرہ!" وہ پھر مضطرب ہو گئی۔ "کیا وہ خطرے میں ہیں؟"

"نہیں! اُنھیں کوئی خطرہ نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "اُنھوں نے تمھیں میرے ساتھ یہاں بھیج کر خطرے کا سدِباب کر دیا ہے۔" پھر میں نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کی۔ "طویل عرصے سے کچھ لوگ جانے کیوں تمھارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اب تک اِس دشمنی کا سبب معلوم نہیں ہو سکا، لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے تمھارے شوہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"اور... اور میرا بچہ... وہ بھی خیریت سے ہے نا!" میری بات ختم ہوتے ہی وہ بول اُٹھی۔

میں نے اقرار میں جواب دے کر مزید کہا۔ "تم طویل علاج کے بعد صحت یاب ہوئی ہو۔ ڈاکٹروں نے تمھیں سکون اور آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اپنے ذہن پر فکر سوار رکھو گی، تو دوبارہ بیمار پڑ جاؤ گی!"

"تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو، لیکن جب تک مجھے اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل جائیں گے، میرا ذہن پُرسکون نہیں ہو گا۔"

"جن باتوں کا جواب میرے لیے ممکن ہوا، ضرور دوں گا!" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔ "پوچھو! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ گمنام دشمن امریکی ہیں۔ میں نے اُن کی قید کے دوران صرف اتنا محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے کوئی اہم شخصیت سمجھ رہے تھے۔ کیوں؟ اِس کی وجہ مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ وہ بھی کوئی بوڑھا امریکی ہی تھا، جس نے مجھے یہ خوشخبری سُنائی تھی کہ مجھے رہا کیا جانے والا ہے۔ اُسی گفتگو کے دوران میں شاید... بلکہ یقیناً ایک بار میری نگاہ اُس کی طرف اُٹھی تھی۔ پھر... پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ مجھے اُن کی قید سے کس طرح رہائی ملی؟"

"یہ جس زمانے کا ذکر ہے، میں خود بھی پیرس میں تھا۔" میں نے اُس کے سوال کا جواب دیا۔ "اُنھی دنوں میری ملاقات تمھارے شوہر سے ہوئی تھی جو بہت پریشان تھے۔ پریشانی کا سبب معلوم ہونے پر میں نے اُن کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ ایکسپرائیویٹ سراغ رساں کی حیثیت سے وہاں میرے قدم جم چکے تھے اور میرے پاس وسائل بھی تھے۔ ابتدا میں میرا اور تمھارے شوہر کا تعلق نسبتاً کاروباری رہا، مگر بہت جلد ہمارے درمیان مضبوط دوستی کے رشتے استوار ہو گئے۔ میں نے تمھاری تلاش شروع کر دی۔"

میں اُسے مطمئن کرنے کی خاطر ایک فرضی کہانی سُناتا رہا۔ "تقریباً چند ماہ بعد میں اپنی انتھک کوششوں میں کامیاب ہوا۔ وہ امریکی تمھیں پیرس سے کہیں اور لے جا رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی ہاتھ تو نہیں آسکا، مگر میں تمھیں اُن کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر کچھ ہی دن بعد دوبارہ تمھیں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو تمھارے شوہر کی درخواست پر میں نے تمھاری حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ تم اُس وقت زیرِ علاج تھیں۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ تمھاری ذہنی صحت کی بحالی میں طویل عرصہ لگے گا۔ پھر جیسا کہ میں بتا بھی چکا ہوں کہ تمھارے ہی شوہر کے ایما پر میں تمھیں یہاں لے آیا۔ یہاں سکون کے ساتھ تمھارا علاج بھی ہوا اور تم اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ رہیں۔"

"تو گویا میں یہاں کئی سال سے ہوں۔" میری بات ختم ہوئی تو وہ بولی، پھر کہا: "اور اِس دوران میں تم بھی یہیں رہے؟ میرا مطلب ہے کہ پھر فرانس واپس نہیں گئے۔"

"نہیں! میں یہاں تمھیں اپنے ایک قابلِ اعتماد ماتحت کے پاس چھوڑ کر دوبارہ فرانس واپس چلا گیا تھا۔ تمھیں میرے ماتحت نے پہلے کئی سال دہلی میں رکھا، پھر وہاں بھی تمھارے گرد خطرات منڈلانے لگے تو وہ یہاں آ گیا۔ اور جب مجھے تفصیلات سے آگاہ کیا، پھر میں چند ماہ قبل یہاں آ گیا۔ اور اُسے پیرس بھیج دیا۔ اُس نے یہاں تمھیں اپنی ماں..."

"یہ کون سا شہر ہے؟" اُس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"کلکتہ!" میں نے اُسے بتلایا۔

"کیا یہاں میرے لیے خطرات نہیں ہیں؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "اب تمھارے دشمنوں کے لیے تمھیں پہچان لینا ناممکن ہے۔ اگر پہلے ہی یہ بات ہمارے ذہن میں آ گئی ہوتی تو شاید تمھیں دہلی سے یہاں نہ لانا پڑتا۔ دراصل ہمیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ تمھیں تلاش کرتے ہوئے ہندوستان تک آ جائیں گے، اِس لیے پہلے تمھارے چہرے پر کسی ہندوستانی عورت کا میک اپ نہیں کیا گیا تھا۔"

"اور اب؟" وہ میری بات سُن کر چونکی۔

میں نے جواب میں آئینہ اُس کے رُوبرو کر دیا۔

"کمال ہے! حیرت انگیز!" اُس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے مجھے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ "میری تو پتلیوں کا رنگ بھی وہ نہیں رہا۔"

پھر میں نے اُسے سمجھایا کہ وہ بدستور ایک مخبوط الحواس اور کم گو عورت کا کردار ادا کرتی رہے۔ اُس نے بغیر کسی بحث کے میری بات مان لی۔ اُس کے رویّے سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر مکمل بھروسا کر چکی ہے۔ میں نے اُسے ملازمہ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ گفتگو کے دوران میں کیوں کہ میرا ذہن اُسے پوری طرح مطمئن کرنے میں مصروف رہا تھا، اِس لیے اب تک وہ موقع نہیں مل سکا تھا جس کا اِتنی دیر سے منتظر تھا۔ اب وہ میری طرف سے مطمئن ہو چکی تھی اور ذہنی ہیجان کا شکار نہیں تھی۔ مجھے اِسی لمحے کا بےچینی سے انتظار تھا کہ اُس کی یادداشت واپس آ جائے، اُس کا ذہن پڑھ کر میں اپنے گمشدہ ماضی کو تلاش کر لیتا۔ مجھے اُن سوالوں کے جواب مل جاتے جو ایک مدت سے میری روح کو مصلوب کیے ہوئے تھے۔ میری ماں خود کون تھی؟ کہاں کی تھی؟ میرے والد مُلک مُلک کیوں بھٹکتے پھرتے تھے؟ کُرّۂ ارض پر پھیلی ہوئی متعدد لکیروں میں سے وہ لکیریں کون سی تھیں جو میرے وطن کی نشان دہی کرتیں؟ میں کہاں پیدا ہوا تھا اور میرا خاندانی پس منظر کیا تھا؟ جن تیرہ سالوں کے درمیان پروفیسر نے مجھ پر سائنسی تجربات کیے، میرے والدین کہاں اور کس حال میں رہے؟ اُن پر کیا گزری، کیا بیتی؟ میں نے اپنی ذہنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر اپنی ماں کے ذہن کو تو مطمئن کر دیا تھا، مگر خود میرا ذہن انتہائی ہیجان میں مبتلا تھا۔ یہ ہیجان اُسی وقت ختم ہوتا جب مجھے میری طویل جدوجہد کا صلہ مل جاتا۔ یہ صلہ، میری پہچان، میری شناخت تھا کہ میں کون ہوں؟ ابوالہول، دراصل کون ہے؟

ابھی میں نے سوالوں کے بھنور سے نکل کر اُس کے ذہن سے رابطہ قائم کیا ہی تھا کہ میرے سارے جسم میں ایک برقی رَو سی دوڑ گئی۔ خطرے کا شدید احساس ہوتے ہی میں ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ماں کے ذہن سے رابطہ منقطع کر لیا۔ کسی طاقتور خیال کی تیز رَو لہر میرے ذہن کی سطح کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بالآخر میرے دشمن، میری تلاش میں وہاں تک آ پہنچے ہیں۔ اُن کے سوا بھلا کس میں اتنی جرأت ہوتی کہ میرے ذہن کو چھیڑتا! اِس طرح اُنھوں نے یقیناً یہ سُراغ لگا لیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ ابھی میں سنبھل نہ پایا تھا کہ مجھ پر دوسرا حملہ ہوا اور میرے ذہن میں دھواں سا بھرنے لگا۔ حملے کا یہ انداز صرف ایک ہی خطرناک ایجنٹ کا تھا اور وہ لوئی چو تھی جسے میں نیو قاہرہ میں زندہ چھوڑ آیا تھا۔ یہ بات میرے لیے بہت خطرناک تھی کہ میں اِس وقت اپنی ماں کے پاس تھا۔

سوچنے والے ذہنوں اور محسوس کرنے والے دلوں کے لیے کبھی صدیاں، ایک لمحہ بن جاتی ہیں اور کبھی چند لمحے، کچھ ساعتیں صدیوں پر پھیل جاتی ہیں۔ یہی حال اُس وقت میرا تھا جب میں نے یہ اعلان سُنا کہ جہاز اب دلّی کے ہوائی اڈّے پر اُترنے والا ہے۔ اُس وقت کے احساس کو لفظوں میں لکھنا شاید میرے بس کا کام نہیں۔ حال ایسا تھا کہ کسی سے کہا نہ جائے اور کہے بغیر رہا بھی نہ جائے۔ اُن صدیوں ایسی ساعتوں کی کہانی بڑی ہی عجیب تھی۔ میرے دل پر جانے کیا کیا گزر رہی تھی۔ میرے حافظے میں وہ شہر اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ سانس لے رہا تھا، ایک زندہ شہر دلّی، صدیوں پُرانا اور بالکل نیا دلّی!

آریاؤں کے قدیم رزمیے "مہابھارت" میں اس شہر کا نام اندر پرستھ تھا۔ یہ بات تقریباً تین ہزار سال پُرانی ہے۔ قدیم تہذیبوں کی یہ وادی دریائے جمنا کے کنارے صدیوں سے آباد رہی ہے۔ یہاں بڑی بڑی تہذیبوں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ ان تہذیبوں کے آثار آج بھی اس شہر کے ماتھے پر سجے ہوئے ہیں۔ یہ شہر ہزاروں سال ہندوؤں اور پھر مسلمانوں کا تہذیبی مرکز رہا۔ یہ شہر سات بار بسا اور اُجڑا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہ تغلق آباد کہلایا گیا اور کبھی اس کا نام شاہجہان آباد رکھا گیا۔ اس شہر میں تاریخ نے ایک بڑا سفر کیا۔ مغلوں کے زوال کے بعد انگریزوں نے بھی کلکتے کے بعد اسی کو اپنے طور پر بسایا اور نئی دلّی نے جنم لیا۔ یہی شہر اب بھی ہندوستان کا دل ہے جس کی دھڑکنیں سارے ہندوستان میں سنائی دیتی ہیں۔ اس شہر کی ایک ایک تفصیل میرے ذہن میں ہے اور شاید میں نے بھی اسی شہر میں جنم لیا ہے۔

میرے ذہن میں اس وقت وہ تصویر اُبھر آئی جو میرے ماضی کی یادگار ہے۔ اس تصویر میں میری ماں مجھے دلّی کی جامع مسجد کے سامنے گود میں لیے کھڑی ہے۔ میری عمر اُس وقت ایک سال تھی۔ برسوں پہلے میرے والدین اسی شہر میں تھے اور اب بھی میری ماں اسی شہر میں ہے۔ میں سوچنے لگا۔ کہاں اور کس حال میں ہے میری ماں؟ میں اُسی کو تو ڈھونڈنے آیا ہوں، اپنے ماضی کو ڈھونڈنے! مجھے میرا ماضی، قاہرہ میں نہیں ملا، شاید یہاں مل جائے۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے طویل سانس لیا اور ایئر ہوسٹس کی ہدایت پر بیلٹ باندھنے لگا۔ میں قاہرہ سے پوری تیاری کے ساتھ چلا تھا۔

ایک عام آدمی کی حیثیت سے مجھے قاہرہ سے دلّی پہنچنے میں جو قانونی دشواریاں پیش آئیں، انھیں میں نے راہ میں حائل نہ ہونے دیا۔ اسی دوران میں نے اپنا ایک نام سوچا، ادریس المہندس! اور پھر اسی نام کو آخر تک اپنائے رہا۔ اپنے نام کا یہ بھید بھی مجھ پر ایک طویل عرصے بعد کھلا کہ یہی نام میرے ذہن میں کیوں آیا؟ نام آدمیوں اور شہروں کی پہچان ہوتے ہیں، اور دلّی بھی ایک نام تھا، بڑا نام! اسی دلّی کی گلیاں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، میر اور غالب کی زمین مجھے بُلا رہی تھی، دلّی کی اردو میرے حافظے میں زندہ ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا خمیر بھی اسی شہر کی خاک سے اُٹھا ہے۔ میں جیسے بالکل بدل گیا ہوں، جیسے ابوالہول نہیں رہا ہوں، ادریس بن گیا ہوں، دلّی کا ایک شہری ادریس! قانونی طور پر میرے پاس مصر کا پاسپورٹ تھا۔ میں ایک عرب نوجوان سیاح، ایک امیر باپ کا بیٹا جو سیاحت کی غرض سے دلّی آیا تھا۔ میں جب دلّی پہنچا تو بیس سال کا تھا اور یہی عمر پاسپورٹ میں بھی لکھی جاتی ہے، مگر میں اپنی عمر سے پانچ چھ سال زیادہ لگتا تھا۔ میرے پاس انتہائی جدید ساخت کے روسی اور امریکی ہتھیار تھے، مگر قاہرہ ایئرپورٹ پر بھی انھیں کوئی نہ پہچانا اور دلّی کے ہوائی اڈّے پر بھی یہی ہوا۔ وہ ظاہر

عام استعمال کی اشیا تھیں، اُنھیں روکتا بھی کون! مگر یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے میں اُس واقعے کا ذکر کردوں جو دلّی کے ہوائی اڈّے پر جہاز اُترتے ہی پیش آیا۔ وہ بڑا سنسنی خیز واقعہ تھا۔ میں اپنے جہاز کی کھڑکی سے وہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ ہوائی اڈّے پر بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ جہاز کے مسافروں کو صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ ابھی اُنھیں جہاز سے اُترنے کے لیے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے سوا اس اعلان سے ہر شخص ہی کچھ مضطرب اور ہراساں نظر آرہا تھا۔ بات ہی ایسی غیر معمولی تھی۔ جہاز عموماً گرد باد، دھند کے سبب ہوائی اڈّوں پر نہیں اُترپاتے۔ آئے دن ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ موسم پر ابھی آدمی اختیار حاصل نہیں کرسکا، مگر جہاز ہوائی اڈّے پر اُتر چکا تھا، پھر کیوں سیڑھیاں نہیں لگائی گئیں اور مسافروں سے انتظار کو کہا گیا؟ یہی بات لوگوں کی تشویش کا سبب تھی۔ پھر جہاز کی کھڑکیوں سے جو کچھ نظر آرہا تھا، لوگ اُسے بھی کوئی معنی نہ پہنا سکے۔ میرے برابر والی نشست پر جو شخص بیٹھا تھا وہ بھی چپ نہ رہ سکا۔ اُس نے مجھے مخاطب کرلیا: "آخر یہ اتنا ہنگامہ کیسا ہے؟ ہر طرف بھاگ دوڑ سی ہے؟" وہ ہندوستانی ہی تھا، مگر اُس نے مجھے عرب جان کر عربی کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔

"معلوم نہیں؟" میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔ میرے لہجے میں لاتعلقی تھی، اس لیے وہ پھر کچھ نہ بولا۔ میں پھر ہوائی اڈّے کی عمارت کی طرف متوجہ ہوگیا جو کافی فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ وہاں سے ہمارے جہاز تک ادھر اُدھر ایئر انڈیا کی گاڑیاں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہ پورا علاقہ خالی نظر آنے لگا۔ اب وہاں نہ کوئی گاڑی تھی، نہ کوئی شخص! بس اچانک ہی ایک تیز گرج سی سر کے اوپر سے گزرتی چلی گئی۔ وہ ایئر انڈیا کا ایک جمبو جیٹ تھا۔ وہ بہت نیچی پرواز کرتا ہوا لمحوں میں ایئرپورٹ کی عمارت تک پہنچ گیا اور یوں لگا جیسے وہ عمارت سے ٹکرا جائے گا، لیکن عمارت کے قریب پہنچتے ہی وہ تیزی سے مڑا اور شمال کی طرف بلند ہوتا گیا۔ میرے لیے بہت سہل کام تھا کہ اپنا تجسس دور کرلیتا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر آدمی ذرا سا صبر سے کام لے تو بہت سی باتیں خود بہ خود معلوم ہوجاتی ہیں۔ وہ جہاز ایک چکر کاٹ کر پھر پلٹا۔ اس کے بعد ہمارے جہاز سے کچھ دور رن وے پر اُترتا دکھائی دیا۔ اُس کے پہیوں نے زمین کو چھوا اور اُسی وقت ہلکا سا دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا اُس جہاز میں سوار ڈھائی سو مسافروں کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہوتا، اس کا اندازہ بعد میں ہوا۔

قصّہ یہ تھا کہ یہ جہاز، لندن سے آیا تھا اور کچھ دیر بعد بمبئی جانے والا تھا۔ دلّی کے ہوائی اڈّے پر اُترتے ہوئے یہ جہاز ایک بھیانک حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ ایک گدھ، جہاز کے انجن میں گھس گیا جس سے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی۔ پٹرول کی ٹنکی میں جو بیس ہزار گیلن پٹرول تھا، جہاز کے زمین چھوتے ہی پھٹ گئی اور تمام پٹرول جہاز کے اردگرد پھیل گیا۔ اگر کسی وجہ سے پٹرول میں آگ لگ جاتی تو جہاز اُس کی لپیٹ میں آجاتا۔ اور بڑی تباہی مچتی لیکن یہ مرحلہ بڑی خیریت سے گزر گیا۔

عارضی طور پر قیام کے لیے میں نے نئی دلّی کا ایک ہوٹل، اشوکا منتخب کیا اور ہوائی اڈّے سے وہاں پہنچ گیا۔ اُس ہوٹل کی تیسری منزل پر مجھے کمرہ ملنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ بڑے ہوٹلوں کی انتظامیہ کا سلوک یوں بھی سیاحوں کے ساتھ اچھا ہی ہوتا ہے۔ دلّی پہنچ کر مجھے اپنی ماں کو تلاش کرنے کا آغاز کیسے کرنا ہے؟ اس کا بس ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ اس کی وجہ یہ کہ اس سلسلے میں مجھے تفصیل سے کچھ سوچنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ میں، دلّی روانگی کی دیگر تیاریوں میں زیادہ مصروف رہا تھا۔ ان تیاریوں میں ہندوستانی کرنسی اور ڈالر وغیرہ کا حصول بھی شامل تھا۔ وہی ہلکا سا خاکہ جو قاہرہ سے چلتے ہوئے میرے ذہن میں اُبھرا تھا، دلّی پہنچ کر واضح ہونے لگا اور میں نے اُسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہوٹل والوں نے مجھے سیاح جان کر دلّی شہر کا نقشہ اور اس ضمن میں کئی خوبصورت کتابچے فراہم کر دیے۔ اُنھیں کیا خبر تھی کہ میں دلّی میں اجنبی ہوکر بھی اجنبی نہیں ہوں۔ میں نے اُس نقشے اور کتابچوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور اُنھیں ایک طرف رکھ دیا۔ میرے کہنے پر کار کا بندوبست بھی ہوگیا۔ ہرچند کہ مجھے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی مگر

میں نے انکار نہیں کیا کیونکہ وہاں مجھے لوگوں میں گھلنا ملنا تھا، الگ تھلگ اور سیلے دیے نہیں رہنا تھا۔ پھر اس میں کچھ اور مصلحتیں بھی تھیں۔

وہ سردار جی بڑے دلچسپ آدمی نکلے جو میرے گائیڈ تھے۔ عمر ان کی یہی کوئی پینتیس چالیس کے درمیان ہوگی۔ سر پر پگڑی تھی اور داڑھی کے چمکدار سیاہ بالوں کو انھوں نے بہت کس کر باندھا تھا۔ بھرا بھرا چہرہ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ اُن گائیڈوں میں سے نہیں تھے جو خواہ مخواہ سیاحوں پر اپنی معلومات کا رعب جھاڑتے ہیں یا بے سبب اِدھر اُدھر گھما کر وقت ضائع کرتے ہیں۔ جب اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ میں ہندوستان میں بولی جانے والی کئی زبانیں اور بولیاں جانتا ہوں تو وہ حیران رہ گئے۔ پھر میں نے اُن سے پنجابی زبان اور خالص پنجابی لہجے میں گفتگو کی تو اُن کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ ایک عرب نوجوان سیاح سے انھیں یہ توقع ہو بھی کیسے! کسی اجنبی سے اپنی مادری زبان سن کر جو خوشی ہوتی ہے اُن کے چہرے سے ظاہر تھی۔ سردار جی خوش لباس و خوش

گفتار اور مستعلیق آدمی تھے، صاحبِ ذوق بھی تھے جس کا اندازہ مجھے کچھ ہی دیر میں ہو گیا۔ مجھے اُن کے ساتھ آمد وغیرہ لکھانے جانا تھا، مگر روانگی سے پہلے میں نے اُن کے لیے چائے منگوالی۔

چائے سے نمٹ کر میں اُن کے ساتھ ضروری کاغذی کارروائیوں کے لیے نکلا۔ دلّی کا حسین و جمیل اور تاریخی شہر میری نگاہوں کے سامنے تھا، ہم راج پتھ سے گزرے، امر جیوتی سامنے تھی۔ گمنام سپاہی کی قبر پر شعلۂ آزادی فروزاں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تاریخ کی کتاب میری نگاہوں کے سامنے کھلی ہوئی ہو۔ میں ان مناظر کو اپنے وجود میں جذب کرتا رہا اور میرے لہو کی خوشبو پکار پکار کر مجھ سے کہتی رہی کہ میں یہیں کہیں ہوں، مجھے ڈھونڈو۔۔۔ یہ میری ماں کی خوشبو تھی، یہ میری زندگی کی بنیادی پکار تھی۔۔۔ میں دیوانوں کی طرح سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی عورتوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے ابھی کوئی عورت اپنی بانہیں پھیلا کر میری طرف لپکے گی اور مجھے، میرا بیٹا، کہہ کر لپٹا لے گی۔

جذبات جب مجھ پر زیادہ ہی حاوی ہونے لگے تو میں نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور سردار جی سے باتیں کرنے لگا، اپنے دشمنوں سے جیتنے کے لیے مجھے عقل و ہوش کی ضرورت تھی۔ لوٹتے لوٹتے شام ہو گئی، دلّی جو تھی کسی دلہن کی طرح جگمگانے لگی، میں نے باتوں کے دوران سردار جی سے کہا کہ میں کوئی گھر کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا یہاں اشوکا میں آپ کو کوئی پریشانی ہے؟"

"نہیں سردار جی!" میں بولا "بات یہ ہے کہ ہوٹل بازی مجھے کچھ پسند نہیں۔"

"کل بتاؤں گا آپ کو۔" وہ میرے ساتھ ساتھ ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "چاندنی چوک میں ہے تو سہی ایک ایسا مکان جیسا آپ چاہتے ہیں، معلوم کروں گا۔ یہاں، اگر نئی دلّی میں کوئی۔۔۔"

"نہیں۔" میں نے اُن کی بات کاٹ دی "پرانی دلّی کے کسی اچھے سے علاقے میں چاہیے۔ میں نے سنا ہے چاندنی چوک اچھا علاقہ ہے۔ ویسے جامع مسجد کے قریب کہیں کوئی ایسا گھر مل جائے جہاں زیادہ گھنی ہوئی آبادی نہ ہو تو اور اچھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں اپنی دادی کی تصویر گھوم رہی تھی جس میں مجھے دلّی کی اس تاریخی مسجد کے مینار نظر آئے تھے۔

"یہ مشکل ہے۔" انھوں نے صاف گوئی سے کہا "اوّل تو اُس علاقے میں کرائے پر مکان ملتا ہی نہیں، ملتا ہے تو بڑی کوشش اور تلاش کے بعد! پھر یہ کہ جیسا مکان آپ چاہتے ہیں وہاں ملنا دشوار ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر وہیں چاندنی چوک میں دیکھ لیں۔"

"وہیں ہمارا گردوارہ بھی ہے، گردوارہ سیس گنج ہے۔" وہ بتانے لگے "گردوارے کے قریب ہی کوتوالی ہے، پھر سنہری مسجد۔ وہ مکان جس کا میں نے ذکر کیا سنہری کے نزدیک ہے۔ ایک خاندانی رئیس ہیں جبار احمد خان، ان کا مکان ہے وہ۔ بڑے مہربان ہیں مجھ پر۔ خود تو وہ قرول باغ والی کوٹھی میں رہتے ہیں، کئی اور کوٹھیاں بھی ہیں ان کی یہاں دلّی میں، کوئی نہ کوئی خالی ہی پڑی رہتی ہے۔ چاندنی چوک والا مکان بھی آج کل خالی پڑا ہے۔ کبھی اُن کا کوئی مہمان آجاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے وہاں، مگر کرایہ نہیں لیں گے وہ، اگر راضی بھی ہو گئے!"

"مہربان وہ آپ پر ہیں۔" میں آہستہ سے ہنسا "میں کیوں خواہ مخواہ انھیں زیرِ بار کروں؟"

"ٹھیک ہو جی سرکار!" وہ اپنے مخصوص لہجے میں خوش مزاجی سے بولے۔ "تساں مہمان او ساڈے۔ فیر روز روز ایسے بندے کدوں، ہندوستان آں دے ایں!"

میں نے فوری طور پر سردار جی سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تیسری منزل پر لفٹ سے نکل کر راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے میں نے سردار جی سے ہوٹل میں نظر آنے والی کچھ زیادہ ہی چہل پہل کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ آج رات کسی مشہور گلوکارہ کا اسٹیج شو ہے اور اسی کے سبب لوگوں کی آمد و رفت ضرورت سے زیادہ ہے۔

سردار جی نے مجھے میرے کمرے میں پہنچانے کے بعد رخصت کی اجازت طلب کی تو میں نے انھیں روک لیا اور مسکرا کر بولا "چلے جائیے گا، ابھی تو شام ڈھلی ہے! اور کیا شام ڈھلے یہاں ساغر و مینا نہیں کھنکتے؟"

وہ میرا اشارہ سمجھ گئے اور مسکرا کر میری دعوت قبول کر لی۔ اُس شخص کی صحبت میں مجھے لطف آرہا تھا اور وہ تھا بھی پُرخلوص آدمی، ورنہ وہ کیوں میری خاطر کسی کا احسان لیتا! بڑے شہروں میں مکان آسانی سے تو نہیں مل جاتے، وہ بھی اپنی پسند کے علاقے میں!

دورِ ساغر چلا مگر میں نے احتیاط سے کام لیا۔ تشنہ لبی کے باوجود زیادہ بے باک نہ ہوا۔ سردار جی نے ہندوستانی فلموں پر تبصرہ کیا پھر کچھ دیر سیاست پر بولے، بیچ بیچ میں وہ مجھ سے مصر کے بارے میں اور وہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے متعلق سوالات کرتے رہے، باتیں ہوتی رہیں، جام کھنکتے رہے۔ پھر رات کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب وہ دوسرے دن صبح گیارہ بجے تک آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ میں نے اُن کے جانے کے بعد اپنی تشنہ لبی دور کی اور پھر انکوائری سے معلومات حاصل کر کے اندر ٹکٹ لے کر اُس ہال میں پہنچ گیا جہاں اسٹیج شو ہو رہا تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو پروگرام شروع ہو چکا تھا، بہت ہجوم تھا۔ بڑی مشکل سے بیٹھنے کو جگہ ملی۔ میرے وہاں جانے کا مقصد محض اُس گلوکارہ کو دیکھنا اور سننا ہی نہیں تھا۔ ذہن میں کچھ اور بھی تھا۔ اس کا انحصار حالات پر ہوتا اور حالات مجھے ابتدا ہی سے اپنے حق میں نظر آئے، مگر میں نے ذرا صبر سے کام لیا۔ وہاں مہ وشوں کے پرے کے پرے تھے۔ ملاحت و صباحت جیسے ختم تھی اُن پر! سادگی میں جو اپنا ایک حُسن ہوتا ہے، وہ تھا اُن میں! میں اُنھیں چوری چوری دیکھتا رہا اور اس گلوکارہ کو سنتا رہا۔

ہر چند کہ سب کی توجہ گلوکارہ کی طرف تھی مگر ایک قریبی میز پر بیٹھی ہوئی حسین عورت میری طرف بھی گاہے گاہے دیکھ لیتی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ دونوں کی عمر میں بڑا فرق تھا۔ وہ نوجوان میری سی عمر کا ہوگا اور عورت کا شباب، عمر کی شام کو پہنچ رہا تھا، ہاں ابھی کچھ مدھم سی روشنی تھی، یا بالکل رات نہیں ہوئی تھی۔ اپنے زیور اور لباس

اور رکھ رکھاؤ سے وہ مجھے اُسی طبقے کی فرد معلوم ہوئی جس کی قدریں ذرا جُدا ہوتی ہیں۔ مجھے قاہرہ کے دورانِ قیام آخری دنوں میں جو لڑکی دانیہ ملی تھی وہ بھی اسی طبقے کی فرد تھی۔ دانیہ جوان تھی اور یہ عورت تقریباً ادھیڑ عمر، مگر مجھے کسی جوانی یا ادھیڑ عمر سے کیا لینا! مجھے تو اُس عورت کو اپنی طرف متوجہ پاکر کچھ اور ہی خیال آیا تھا۔ ممکن ہے اُس عورت کے علاوہ کسی اور کو بھی وجاہت نے متاثر کیا ہو مگر میں نے کسی پر غور نہ کیا اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت سمجھی۔ مجھے اس ہجوم میں کسی ایک عورت کی تلاش تھی، اس طبقے کی کوئی عورت! اور وہ عورت خود میری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ کی فی الحال نہ ہوس تھی اور نہ وقت تھا۔ پہلے ہی دن سے اگر میں اپنے ذہن میں اُبھرنے والے خاکے میں رنگ بھرنے لگتا تو شاید میرا کام آسان ہو جاتا۔ میں اسی لیے گیت ختم ہوتے تک کئی بار اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ گیت کے بولوں اور اُس فضا نے بھی میرا ساتھ دیا اور آخری مرتبہ وہ بھی مسکرا ہی دی۔ خود صیاد زیرِ دام آگیا۔

پروگرام ختم ہوا تو وہ اپنے نوجوان ساتھی سے جو ٹھیک جانے کا بہانہ کر کے بیٹھی رہی اور میں بھی نہ اُٹھا۔ اُس نے بھی یقیناً اپنی دانست میں میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ حسین عورتیں چاہے کسی عمر کی ہوں، اُنھیں اپنے بارے میں ذرا جلدی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ اور میں تقریباً ساتھ ساتھ ہی اپنی اپنی کرسیوں سے اُٹھے، ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور آگے بڑھتے ہوئے قریب آ گئے۔ اُس عورت کا نوجوان ساتھی ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ عمدہ کھادی کی سفید ساری باندھے ہوئے تھی، سر کے گرد ایک ہلکا۔ ہالا کوٹ لپیٹا تھا اور ہاتھ پہ بندھا تھی۔

"شاید میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے... یا نہیں، چہرہ مانوس سا ہے کسی تقریب میں یا جیمسفورڈ کلب میں؟" وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے رواں انگریزی لہجے میں بولی۔

"جی... جی ہاں!" میں نے اُردو میں جواب دیا۔ وہ چونکی میں مزید بولا "مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" میں مسکرایا "میں فاصلوں کو جلدی سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔" کبھی کبھی کسی اور جنم کے بچھڑے ہوئے بھی تو مل جاتے ہیں۔ کیا خبر آپ سے کسی اور جنم میں ملاقات ہوئی ہو؟"

"ارے...!" وہ اب لمحۂ حیرت سے نکل آئی تھی اور ملی جُلی ہندی اردو میں بات کرنے لگی تھی "آپ تو ہماری طرح، ہماری زبان بول رہے ہیں، اور آواگون پر بھی یقین لگتا ہے آپ کا!"

"مجھے اس فلسفے پر یقین نہیں۔ یہ ایک رومانی سا خیال ہے اور اچھا لگتا ہے؟"

میری توقع کے مطابق وہ متاثر نظر آنے لگی۔ پھر میں نے ذرا... بے تکلفی لی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں آ گئی۔ تعارف ہوا تو میں چونکا۔ اُس نے اپنا نام شمینہ احمد بتایا تھا "لگتا ہے آپ کو میرا نام سُن کر حیرت ہوئی؟" وہ بولی۔

"جی!" جی میں نے اعتراف کر لیا کیونکہ میں اُسے کوئی ہندو عورت سمجھا تھا۔ اس کا سبب شاید یہ رہا ہو کہ میں پہلی بار ہندوستان آیا تھا، اور یہ بھی کہ مجھ سے اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے حافظے اور غیر معمولی ذہن پر

زیادہ زور نہیں دیا تھا ورنہ شاید مجھ سے اندازے کی یہ غلطی نہ ہوتی۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُس کے نوجوان ساتھی نے رخصت کی اجازت چاہی۔

"ہاں تم جاؤ، میں یہاں رُکوں گی کچھ دیر۔ کل ناشتہ ساتھ ہی کر لینا!"

"بڑی نوازش!" نوجوان سر خم کرتا ہوا وہاں سے اُٹھ گیا۔

"مجھے اداکاری سے بڑا لگاؤ ہے، بس اسی ناتے ان لوگوں نے مجھے اپنا بڑا مان لیا ہے۔" یہ لڑکا بھی ایک ڈرامیٹک سوسائٹی سے وابستہ ہے۔" نوجوان کے جاتے ہی وہ بولی "مجھے بچپن میں بہت شوق تھا ایکٹنگ کا... بھری سی... کالج اور پھر یونیورسٹی میں بھی بہت اسٹیج ڈرامے کیے پر میرے اتو جی نے مجھے فلم لائن میں نہ جانے دیا اور پھر..." وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی، جیسے اُس نے یہ تاثر دیا تھا کہ اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ وہ اپنی بات اَدھوری چھوڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ بولی "ارے آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی!"

جی میں آئی کہ دوں کہ اسے کا فرادا چائے پینے کون آیا تھا مگر میں نے بھی اداکاری سے کام لیا جیسے اُس کی صحبت میں چائے پینے کا ہوش نہ رہا ہو۔ اس بہانے مجھے چائے پینے سے نجات مل گئی۔

"اگر بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں!" اُس نے مُسکرا کر بڑی قاتل نظروں سے مجھے دیکھا۔

"پوچھیں!" میں بھی مُسکرانے لگا۔

"آپ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ عرب ہونے کے باوجود نوجوانی ہی میں اتنی اچھی اردو کیسے سیکھ لی؟" اُس کے لہجے میں ستائش بھی تھی اور کسی قدر شک بھی۔

"اگر انسان سیکھنا چاہے تو بہت کچھ سیکھ سکتا ہے!"

میں نے اُسے مطمئن کرنے کے لیے محتاط انداز میں جواب دیا "یہ مسئلہ قبولیت اور اپنی اپنی صلاحیت کا ہے۔ بنیادی طور پر انسان میں ہر صلاحیت موجود ہوتی ہے، وہ جسے چاہے جِلا دے سکتا ہے۔ جس طرح آپ کو بچپن سے اداکاری کا شوق رہا ہے اسی طرح مجھے مشرقی زبانوں سے گہری دلچسپی رہی ہے۔

قاہرہ یونیورسٹی میں اس کے لیے ایک الگ شعبہ موجود ہے، غالباً آپ کے یہاں کی یونیورسٹیوں میں بھی ایسے شعبے ہوں گے۔ میں نے جب اردو سیکھنے کا آغاز کیا تو معلوم ہوا کہ یہ زبان میرے لیے بہت سہل ہے۔ عربی کے بہت سے لفظ اس زبان میں شامل ہیں۔ شاید اسی لیے یہ زبان سیکھنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا جس سے اب اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے مزید کہا "اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو؟"

"پوچھنا تو بہت کچھ ہے لیکن شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"جی ہاں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میں بھی کچھ دریافت کروں!" اُس نے اقرار میں سر ہلا دیا تو میں نے اُس کے شریکِ زندگی کے بارے میں سوال کیا۔

"شریکِ زندگی؟" وہ آہستہ سے طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"چھوڑیں کوئی اور بات کریں!"

پھر میں اُس سے اور ہی باتیں کرتا رہا، وہ باتیں جو دِلّی کے دورانِ قیام میں آئندہ میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتیں۔ میں سمجھ گیا کہ اپنے شریکِ زندگی کے باب میں وہ پردہ داری چاہتی ہے۔ کیوں؟ یہ جاننا میں نے فی الحال ضروری نہ سمجھا اور دوبارہ اس سلسلے میں بات نہ کی۔ ابھی اُس سے گفتگو جاری تھی کہ اُس نے وقت گزرنے کا احساس دلایا اور یہ بے سبب نہ تھا۔ اگر مجھے اپنے بلاخیز وجود سے پوری آگہی نہ ہوتی تو شاید اُس کے اشارے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتا "یہاں آپ کی صحبت میں کافی وقت گزر گیا اور معلوم بھی نہیں ہوا۔" میں ہوشیاری سے بولا "دراصل آپ کی شخصیت اتنی پُرکشش ہے کہ اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہا!"

"ارے نہیں آپ تو کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں!" اُس نے انکساری کا اظہار کیا۔

"پھر کب نیاز حاصل ہوں گے آپ سے؟"

میرے اس سوال پر اُس کے سانولے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ سنبھل کر مسکرائی اور بولی "شاید اب آپ آرام کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں!" میں خوش اخلاقی سے مسکرایا "آپ کے شہر میں آج پہلا ہی دن تو ہے۔ آب و ہوا بدلنے سے بھی کچھ اثر تو پڑتا ہے۔ بس کچھ یوں ہی تھکن سی محسوس کر رہا ہوں لیکن آپ... آپ تشریف رکھیں۔ کہیں آپ یہ سمجھنے لگیں کہ مصری بداخلاق ہوتے ہیں!"

"کیسی باتیں کرتے ہیں!" وہ جلدی سے بولی "مجھے تو آپ کے اخلاق نے بہت متاثر کیا ہے۔ میں تو یوں بھی اُٹھنے ہی والی تھی۔ مجھے اگر آپ پہلے یہ بتا دیتے کہ آج ہی دِلّی آئے ہیں تو میں اتنی دیر نہ بیٹھتی۔ پھر کبھی سہی!"

"یار زندہ صحبت باقی!" میں نے موقع دیکھ کر برجستہ کہا اور اپنا سوال دُہرایا کہ وہ پھر کہاں ملے گی؟

"جہاں آپ کہیں... لیکن آپ... آپ ابھی اجنبی ہیں، میں کل خود ہی آ جاؤں گی۔ کمرہ نمبر کیا ہے آپ کا؟"

"وہ بھی عرض کیے دیتا ہوں، مگر ممکن ہے کہ میں یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔ ابھی کچھ طے نہیں کیا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ میں آپ کے شہر میں اجنبی ہوں لیکن اتنا بھی نہیں۔ اس شہر کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سُنا ہے۔ پھر گائیڈ بُک بھی ہے میرے پاس۔ میں نے غالباً اُسی نقشے میں کہیں گلشن آرا کلب کا نام دیکھا ہے!"

"جی، پرانی دِلّی میں ہے وہ!" اُس نے بتایا "گلشن آرا روڈ کی ایک ذیلی سڑک پر۔ اُسی کلب کے سامنے روشن آرا گارڈنس ہیں!"

"ہاں شاید!" میں بولا "میں پہنچ سکتا ہوں وہاں، نقشے کی مدد سے۔ آپ مطمئن رہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہیں کل شام ملاقات رکھ لیں!"

"ٹھیک ہے میں وہاں آ جاؤں گی!" اُس نے کہا، پھر پوچھا "کس وقت؟"

"زحمت تو ہوگی آپ کو، لیکن میری اجنبیت کو نظر میں رکھتے ہوئے کم از کم ایک گھنٹے کا وقت ضرور دیں مجھے۔ میں شام چھ اور سات کے درمیان وہاں پہنچ جاؤں گا!"

"میں وہیں ملوں گی آپ کو، جو وقت بتایا ہے آپ نے!"

"شکریہ!" میں نے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ وہ چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ پہلے دن...

اجنبی شہر میں اتنی کامیابی بھی بہت تھی۔ ثمینہ احمد مجھے کام کی عورت معلوم ہوئی، لیکن ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ اپنے بارے میں اُس نے بہت کم بتایا۔ میری ہی کھوج میں رہی کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے اور کیوں آیا ہوں؟ وغیرہ۔ میں نے اپنے متعلق اُسے پوری طرح مطمئن کر دیا، پھر بھی وہ زیادہ نہ کھلی۔ مجھے کیوں کہ صرف پرانی دلی میں ٹھہرنا تھا اس لیے رہی اُس سے ملنا مناسب سمجھا۔ سردار جی اگر وہاں میرے قیام کا بندوبست نہ بھی کر پاتے تو میں اپنے طور پر کوشش کرتا۔ مجھے دلی کی اُس مشہور جامع مسجد کو دیکھنے کی بھی خواہش تھی جس کے سامنے میری ماں کی تصویر کسی نے کھینچی تھی۔ میں اُس تصویر میں اپنی ماں کی گود میں تھا۔ میری نظر میں یہ بڑی اہم تصویر تھی کیونکہ اس تصویر سے برسوں پہلے میری ماں کا وہاں ہونا ثابت تھا۔ وہ امریکی ایجنٹ جو میرے ہاتھوں قاہرہ میں مارا گیا، اُس نے اپنی موت سے پہلے ٹرانسمیٹر پر اپنے کسی بڑے سے جو گفتگو کی، وہ میرے ذہن میں تھی۔ وہ گفتگو سُن کر ہی مجھے یقین آیا اور معلوم ہوا کہ میں نے کبھی جو تصویر دیکھی تھی، اُس میں نظر آنے والے مینار اِسی شہر کی تاریخی جامع مسجد کے تھے۔ اس کے علاوہ جو بات میرے دلی آنے کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ میری ماں اب بھی دلی میں ہے۔ امریکی ایجنٹوں کی سخت نگرانی اور حفاظت میں! ایک ہی آسمان کے نیچے اور ایک ہی شہر میں، وہ بھی تھی اور میں بھی جس نے مجھے جنم دیا تھا۔ اِس خیال نے مجھے مضطرب کر دیا اور میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

کتنا ظالم تھا وہ شخص جس نے مجھے انسان کی بجائے ایک تباہ کن وجود بنانا چاہا، جس نے مجھے ابوالہول کہا، خوف کا باب! اُس نے مجھے کسی بڑی طاقت کا غلام بنا کر دنیا بھر کو خوف میں مبتلا کرنے کا خواب دیکھا، اور میں نے اُس کے خواب کو کرچی کرچی کر دیا۔ میں نے اُس کی انا پر ضرب لگائی اور خود بھی لہولہان ہو گیا۔ وہ جو ایک کمزور مخلوق ہو کر خود کو میرا خالق کہتا ہے، ایک سرپھرا پروفیسر، ایک خطرناک سائنس داں، میری اصل جنگ تو اُسی سے ہے۔ میں نے اُسی سے تو بغاوت کی ہے۔ بڑی طاقتوں کے خطرناک ایجنٹ اُسی کے اشاروں پر تو ناچتے ہیں ورنہ میری اُن سے کیا دشمنی ہے میں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے؟ ہاں وہ مجھے طاقت اور دولت کے نشے میں ضرور اذیت پہنچا رہے ہیں۔ یہ اذیت ہی تو ہے کہ میرے والدین اور بھائی کو انھوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ وہ مجھے سکون کا سانس نہیں لینے دیتے، کہیں چین سے نہیں رہنے دیتے۔ پھر دھمکیاں دیتے ہیں کہ تمہارے باپ کو ایذائیں دے دے کر مار دیا جائے گا۔ تمہارا بھائی ہماری قید میں ہے اور تمہاری ماں کو کسی بھی وقت قتل کیا جا سکتا ہے! یہ سب کس لیے؟ یہ سارا کھیل کیوں؟ محض اپنی مطلب برآری کے لیے، ساری دنیا پر حکومت کا خواب دیکھنے کی خاطر! ایک دوسرے کو کمزور کرنے کی غرض سے۔ اب مجھے علم ہے کہ اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اُن کے پاس اور بھی ذرائع ہیں، اور میں بھی ایک ذریعہ ہوں۔ کم از کم میرے بس میں اتنا تو ہے کہ میں ذریعہ نہ بنوں۔ چاہے پھر کچھ بھی ہو، کوئی اور سرپھرا سائنس داں پیدا ہو، کسی اور خطرناک ایجاد کا موجد ٹھہرے یا پھر آدمی کو عقل آ جائے۔ بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا آدمی، ساری زمین پر پھیلی ہوئی بارود سمیٹ لے۔

مثبت سوچ ہمیشہ سکون پہنچاتی ہے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آدمی کو عقل آ جائے گی، وہ زمین پر پھیلی ہوئی بارود سمیٹ لے گا، ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا! اپنے دل کو تسلیاں دیتا ہوا میں بستر پر جا لیٹا اور مجھے قرار آ گیا۔ میری پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ بوجھل پلکیں آخر کب تک نیند کے وار بچاتیں! میں نے آنکھیں بند کر لیں، اور پھر وہی سب کچھ دیکھنے لگا جو صبح سے اب تک دیکھا تھا۔ خواب دیکھنا بھی ذہنی بیداری کا عمل ہے۔ میرے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا۔ بالکل ایسا ہی جیسا عام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیدار ہونے کے بعد مجھے اِس بات کا احساس ہوا۔ یہ بھی میرے لیے ایک نیک فال تھی۔ میں ایک غیر معمولی وجود ہونے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ ایک عام انسان بنتا جا رہا تھا۔

اپنی ماں کی تلاش اور اُسے امریکی ایجنٹوں کے نرغے سے نکالنے کے لیے جس حد تک ممکن ہوا، میں اپنی تباہ کن قوتوں کو بروئے کار نہیں لاؤں گا۔ یہی سوچتا ہوا میں بستر سے اُٹھا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔

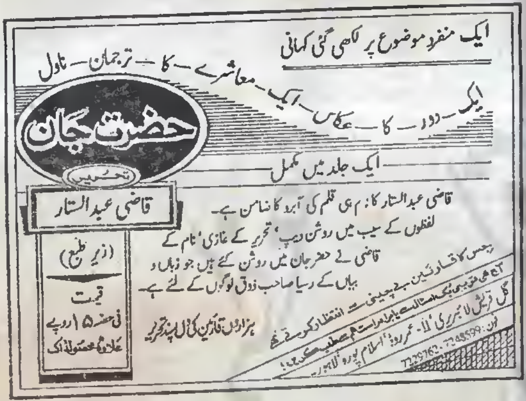

مجھے اُس شہر میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے رہنے کے لیے لوگوں میں گھلنے ملنے کی ضرورت تھی۔ ہر شہر کے اپنے آداب ہوتے ہیں، اپنی معاشرت، اپنی تہذیب اور اپنی روایتیں ہوتی ہیں۔ کسی شے کا معلوم ہونا اور اُس شے کو برتنا دو مختلف باتیں ہیں۔ مجھے اس کا پورا احساس تھا۔ مجھے اُس شہر کے ماضیٔ بعید اور ماضیٔ قریب سے مکمل آگہی تھی، لیکن اس آگہی کو ابھی عمل کی کسوٹی پر پورا اُترنا تھا۔ اُس شہر کے آداب برتنے میں جلد بازی یا بے احتیاطی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ مجھے بہت احتیاط سے اور سوچ سمجھ کر ایک ایک قدم اُٹھانا تھا۔ لوگ اجنبی تھے، اُن کے رویے الگ تھے بود و باش مختلف تھی، اُنھیں سمجھنے میں اور خود کو سمجھانے میں ذرا سا وقت درکار تھا، بس تھوڑی سی مہلت! میں نے خود ہی تو اپنے ہاتھ سے سارے مہلک ہتھیار رکھ دیے تھے کہ وہ ہتھیار خود میرے وجود کے لیے خطرہ بن گئے تھے، غیر معمولی قوتوں کے ہتھیار! اب میں ایک طرح سے خالی ہاتھ تھا اور خالی ہاتھوں جنگ لڑنا کوئی کھیل نہیں ہوتا۔ خود کو ادریس کہلوانا اور حقیقتاً اپنے ذہن کو اس پر آمادہ کر لینا کہ میں ایک عام آدمی ہوں، بڑا جان لیوا مرحلہ تھا۔ سو میں اِس مرحلے سے بھی گذرا، اور یہ اسی مرحلے کی روداد ہے، اُس شخص کی روداد جو شہر در شہر دل بھٹکتا ہوا ایک ایسے شہر میں آ نکلا جو تاریخی اور تہذیبی شہر تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اجنبیت کی دُھند چھٹے گی اور کہیں کسی سے کوئی سچا یا جھوٹا رشتہ استوار ہو گا تو بات بنے گی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے ثمینہ احمد یاد آئی جس سے مجھے اُسی روز شام کو پُرانی دلی کے ایک کلب میں ملنا تھا، اور پھر سردار جی کا خیال آیا جنھوں نے مجھ سے چاندنی چوک میں ایک مکان دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں ناشتا کر کے سردار جی کا انتظار کرنے لگا۔ اُن کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

سردار جی وقت مقررہ پر نہ آئے اور آتے آتے دیر کر دی، یہ انتظار مجھے بہت گراں گذرا، مگر انھوں نے آتے

ہی معذرت کی اور پھر وجہ بتاتے گئے: "کل میں نے آپ سے جن صاحب کا ذکر کیا تھا، انھی سے ملنے میں دیر ہو گئی۔ چاندنی چوک میں جو مکان ہے، انھی کا ہے۔ یاد آیا آپ کو؟" انھوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور اپنی شیروانی کا اوپری بٹن کھولنے لگے۔

"بالکل یاد آ گیا۔ آپ آگے فرمائیں، کیا رہا؟"

"وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" سردار جی نے کہا۔

"مجھ سے؟" میں چوکنا ہو گیا۔

"جی ہاں۔" سردار جی مسکرائے: "میں نے انھیں جب آپ کے بارے میں بتایا تو حیرت میں رہ گئے۔ یقین ہی نہیں آیا انھیں میری باتوں پر۔"

"کن باتوں پر؟" میں نے سوال کیا۔ میرے لہجے میں سنجیدگی آ گئی۔

"یہی کہ آپ... آپ ایک عرب ہو کر بھی..." سردار جی میری سنجیدگی سے کچھ سٹپٹا گئے: "دراصل جو بھی سُنے گا یا آپ سے ملے گا تو حیران ہی ہو گا کہ اتنی صاف اردو..."

"اس میں اتنی زیادہ حیرانی کی تو کوئی بات نہیں سردار جی!" میں نے اُن کی بات کاٹی: "یہاں ہندوستان میں آپ کو بہت سے عربی داں مل جائیں گے، اور پھر عربی سے قطع نظر دوسری زبانوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہمارے یہاں مصر میں بعض لوگ ایسی عمدہ انگریزی اور فرینچ بولتے ہیں کہ آپ سنیں تو دنگ رہ جائیں۔ میں نے تو شاید آپ کو بتایا بھی تھا کہ..."

"بجا کہا آپ نے۔" سردار جی بول اُٹھے اور اپنی صفائی پیش کرنے لگے: "میرا مقصد اس سے کچھ اور نہ تھا۔"

"ظاہر ہے۔" میں انھیں پشیمان دیکھ کر بولا: "مجھے اُن صاحب سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ تو مجھے یہ بتائیں، وہ مکان دینے پر راضی بھی ہیں؟"

"راضی تو لگتے ہیں ورنہ یہ نہ کہتے کہ آپ سے ملوا دو۔" سردار جی نے محتاط جواب دیا۔

"سردار جی! یہ نتیجہ تو آپ نے اخذ کیا ہے۔ انھوں نے کیا کہا، وہ بتائیے! یا کوئی دو ٹوک بات نہیں ہوئی؟"

"میں آپ سے غلط بات کیوں کروں، انھوں نے ابھی اپنی زبان سے مکان دینے کو نہیں کہا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ مکان ان دنوں خالی ہے اور یہ کہ میں آپ کو اُن سے ملوا دوں، پھر بات ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ مجھے اُن کے پاس مزید کچھ دیر بیٹھنے اور گفتگو کا موقع مل جاتا تو وہ اپنی رضامندی بھی ظاہر کر دیتے۔ کوئی غیر ملکی اُن سے ملنے آ گیا اور مجھے مجبوراً اُٹھ جانا پڑا۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سردار جی کو مزید ٹٹولا: "تو غیر ملکیوں سے بھی اُن صاحب کے تعلقات ہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ خاندانی رئیس ہیں، ان کے تعلقات تو بہت اوپر تک ہیں۔ بڑے رعب اور دبدبے کے آدمی ہیں۔ بڑی میل ملاقات ہے اُن کی۔" سردار جی میری دلچسپی دیکھ کر پھر پُرجوش اور خوش نظر آنے لگے: "خان صاحب کو کون نہیں جانتا! باہر ملکوں میں بھی رہے ہیں۔ انھوں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔"

"کون ملکوں میں؟" میں نے پوچھا، پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی بولا: "میرا مطلب ہے، کیا وہ مصر میں بھی رہے ہیں کبھی؟"

"مصر کے متعلق تو معلوم نہیں، ہاں امریکہ اور برطانیہ کی خبر ہے۔ ویسے بھی وہ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے اس طرح سے یہ ایک لفظ ادا کیا جیسے سردار جی نے میری معلومات میں بیش قیمت اضافہ کیا ہو۔ غیر ملکیوں سے تعلقات اور پھر امریکہ میں رہنے کا ذکر! ان باتوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ تو کیا، مگر صرف اس حد تک کہ یہ شخص بھی میرے کام کا ہے۔ اُس شخص کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے سردار جی کو کچھ اور چڑھایا، پھر اُن کے اور اپنے لیے کھانا منگوا لیا۔ اُن سے گفتگو جاری رہی۔

"آپ ابھی بتا رہے تھے کہ خان صاحب اس شہر میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہ چکے ہیں، کیا اب بھی کسی عہدے پر ہیں؟" سردار جی کھانے کے ساتھ انصاف کرنے کے چکر میں چپ ہو گئے تو میں نے انھیں ٹوکا۔

"اب نہیں ہیں، کسی عہدے پر۔" وہ لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے بولے، پھر ذرا توقف سے کہا: "ایسے لوگوں کے لیے عہدے کیا حیثیت رکھتے ہیں جناب! خان صاحب تو خود عہدوں سے بھاگتے ہیں۔"

"آپ نے اُن سے ملاقات کا کوئی وقت طے کیا؟ جانا کب ہے؟"

"آج شام تو اُن کے یہاں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ کل کے لیے مجھ سے کہا ہے کہ فون کر کے اور وقت بتا کر آپ کو ساتھ لے آؤں۔ اب آپ فرمائیں، کل شام کا وقت رکھ لیں۔ شام کو زیادہ دھوپ بھی نہیں ہو گی۔ کیا آپ کے یہاں بھی اتنی ہی گرمی پڑتی ہے؟"

"مختلف شہروں کا معاملہ مختلف ہے۔" میں بولا۔ "آپ کس شہر کا موسم پوچھ رہے ہیں؟ جہاں تک قاہرہ کا معاملہ ہے تو وہاں گرمی کم پڑتی ہے، سردی بہت زیادہ۔ اکتوبر سے لے کر مارچ تک خوب سردی پڑتی ہے۔ عموماً موسم معتدل ہی رہتا ہے۔"

"یہاں ہندوستان میں بھی کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں اس قدر گرمی نہیں پڑتی۔" سردار جی میری بات سن کر بولے۔ "آپ نے شاید کبھی شملہ یا نینی تال کا ذکر سنا ہو یا پڑھا ہو! وہاں ان دنوں میں بھی موسم بہت خوشگوار رہتا ہے۔ یہ ہمارے ملک کا بالائی علاقہ ہے۔ دولت مند لوگ عموماً گرمیاں وہیں گزارتے ہیں۔"

"آپ کے خان صاحب بھی تو رئیس آدمی ہیں!" میں پھر مطلب کی بات پر آ گیا: "وہ گرمیوں میں نہیں جاتے وہاں؟"

"وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں جناب، میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی میں کہاں اور وہ کہاں! کبھی کوئی کام اٹک جاتا ہے تو پہنچ جاتا ہوں، اُن کے پاس۔ مہربان آدمی ہیں، عموماً انکار نہیں کرتے۔"

"پھر آپ کل اُن سے فون پر ملاقات کا وقت لے لیں اور مجھے ملوا دیں۔ آپ کی زبانی اتنی تعریف سن کر مجھے بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔" میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد سردار جی نے کہا۔ "یہاں ایک قدیم ترین مقبرہ ہے، عام طور پر گائڈ وہاں سیاحوں کو نہیں لے جاتے۔ اس مقبرے کو ہندوستان کا قدیم ترین مقبرہ..."

"کس کا مقبرہ ہے؟" میں نے سردار جی کی بات کو مختصر کرنے کی غرض سے مداخلت کی: "اور گائڈ ادھر کیوں نہیں جاتے؟"

"اس لیے کہ وہ ذرا شہر سے دور ہے۔ وہ مقبرہ سلطان رکن الدین محمود کا ہے۔ اب آپ اس سے اندازہ لگا لیں کہ ۱۲۲۹ء میں سلطان رکن الدین کا انتقال ہوا تھا۔"

"آج تو نہیں، پھر کسی دن چلیں گے وہاں۔ آج آپ مجھے..." میں دلّی کی جامع مسجد کا نام لیتے لیتے رک گیا اور ذرا توقف سے بات بنا دی: "آج آرام کرنے دیں مجھے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" انھوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تو پھر آپ آرام کریں، میں اجازت چاہوں گا۔ کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں نے سردار جی کو نہیں روکا، ہاں وقت ضرور پوچھ لیا کہ وہ کب آئیں گے۔

میں اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے شاید ایک اہم بات لکھنا بھول گیا ہوں جو اب یاد آ رہی ہے۔ کہیں کہیں میں نے دانستہ کچھ مشہور شخصیتوں کے نام اور رازداری کی وجہ سے مقامات تبدیل کر دیے ہیں۔ ایسا میں نے صرف وہیں کیا ہے جہاں میری تحریر سے کسی کے دامن پر کوئی دھبا آتا ہو۔ یہ بات اس موقع پر شاید یوں بھی ذہن میں آئی کہ میں نے ثمینہ احمد کا اصل نام نہیں لکھا، اور نہ دلّی کی چند دیگر معروف شخصیات کے صحیح نام لکھے ہیں۔ ایسا میں گزشتہ صفحات میں بھی کرتا رہا ہوں۔ اس میں میری نیک نیتی کو دخل ہے، کوئی اور سبب نہیں۔ جن خاندانی رئیس کا ذکر سردار جی نے مجھ سے کیا، ان کا اصل نام بھی

جبار احمد خان نہیں کچھ اور ہے۔ یہ نام بھی مصلحتاً بدلا گیا ہے۔ انھی سے آئندہ روز میری ملاقات ہونے والی تھی۔

اُس روز سردار جی چلے گئے تو میں نے دلی کا نقشہ میز پر بچھا لیا اور اُس میں وہ مشہور تاریخی جامع مسجد تلاش کی جہاں مجھے تنہا جانا تھا۔ سردار جی کو میں نے اسی لیے ٹال دیا تھا۔ نقشے میں پیلے رنگ سے پرانی دلی کی نشان دہی کی گئی تھی۔ جلد ہی مجھے وہ جامع مسجد مل گئی۔ اُس کے بعد میں نے نئی دلی میں اشوکا ہوٹل کا محل وقوع دیکھا۔ گویا میں کہاں ہوں اور مجھے کہاں پہنچنا ہے۔ ہمایوں روڈ کی ایک ذیلی سڑک کے نکڑ پہ اشوکا ہوٹل ہے۔ میں نے نقشے کے دیے گئے حوالوں اور نمبروں کی مدد سے نقشے میں اُس ہوٹل کو ڈھونڈ لیا۔ راستوں کو اچھی طرح ذہن میں بٹھانے کے باوجود بھی میں نے اُس نقشے کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ معاملہ ایسا تھا کہ میں نے کسی کو اپنے ساتھ رکھنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ جامع مسجد پہنچنے کے لیے میں نے ہوٹل کی کار بھی استعمال نہیں کی اور ایک ٹیکسی میں وہاں سے روانہ ہوا۔

ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے اُس تاریخی جامع مسجد کے متعلق جو باتیں میرے حافظے میں تھیں، وہ تازہ ہونے لگیں۔ یہ تاریخی عمارت ہندوستان کے ایک مغل بادشاہ شاہجہان نے بنوائی تھی۔ اسی مسجد کے بارے میں ایک اور روایت بھی میرے ذہن میں تھی کہ ۱۶۵۰ء میں خود اسی بادشاہ نے اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اُس بادشاہ نے اعلان کرایا تھا کہ مسجد کا سنگ بنیاد وہ شخص رکھے گا جو تہجد گزار ہو اور اُس کی ایک نماز بھی قضا نہ ہوئی ہو اور جب شہر میں کوئی ایسا شخص نہ ملا تو بادشاہ نے یہ کام انجام دیا۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط اس سے قطع نظر وہ مسجد مغلیہ طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ نقشے کے مطابق اب ٹیکسی ہمایوں روڈ سے شاہجہان روڈ کی طرف ہی مڑ رہی تھی، اور یہ نئی دلی کا علاقہ تھا۔ یقیناً یہ شاہراہ اُس بادشاہ کے صدیوں بعد وجود میں آئی ہو گی۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ہندوستان اپنے ماضی کو نہیں بھولا ہے فراموش نہیں کیا ورنہ اُس بادشاہ کے نام پہ اُس سڑک کا نام کیوں ہوتا!

نیا قاہرہ، پرانا قاہرہ، نئی دلی، پرانی دلی! مجھے دونوں شہروں میں بڑی مماثلت سی نظر آئی۔ اور میں اس پر غور کرنے لگا۔ ٹیکسی مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی بالآخر پرانی دلی میں داخل ہو گئی اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اب سڑکیں اتنی کشادہ اور صاف ستھری نہیں رہی تھیں۔ میں اُن راستوں کا جائزہ لیتا رہا جن راستوں پر شاید کبھی میری ماں نے بھی سفر کیا ہو۔ یہ بات میری نظر میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل نہ تھی کہ اس مسجد کے سامنے میری ماں کی تصویر کیوں کھینچی گئی؟ ایسے تاریخی مقامات پر لوگ عموماً تصویریں کھنچواتے ہیں۔ وہ تصویر غالباً میرے والد کی البم میں ہو گی۔ امریکی ایجنٹ جب میری ماں کو اغوا کر سکتے تھے تو وہ تصویر حاصل کرنا اُن کے لیے کیا مشکل رہا ہو گا! اُس تاریخی جگہ کو دیکھنے کے لیے جانا محض جذباتی معاملہ تھا۔ اُس جگہ میں بھی کھڑا ہونا چاہتا تھا، اُس زینے پہ قدم رکھنے کی آرزو میرے دل میں بھی تھی جہاں کبھی میری ماں کے قدم پڑے تھے! مجھے وہاں اپنی ماں کا کوئی سراغ ملنے کی توقع ہرگز نہیں تھی مگر یہ سودا اب مجھے مہنگا پڑا۔ ان کی باتوں پہ کان دھرنے سے یہی ہوتا ہے۔

دور ہی سے مجھے اُس مسجد کے گنبد و مینار نظر آنے لگے۔ سنگ مرمر کے گنبد پہ سورج کی کرنیں منعکس ہو کر عجیب سماں پیش کر رہی تھیں۔ میں نے ایسا منظر پھر کبھی، کہیں اور نہیں دیکھا۔ میری نگاہ اُس وقت تک اُسی طرف اُٹھی رہی جب تک ٹیکسی رک نہ گئی۔ میں کرایہ ادا کر کے ایک سحر زدہ شخص کی طرح مسجد کی طرف بڑھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر مسجد کی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ سیڑھیوں کی دونوں جانب ریڑھیوں اور ٹھیلوں والوں کا ہجوم تھا جو آوازیں لگا کر کھانے پینے کی چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ میرے قدم اُٹھتے رہے اور نگاہ مسجد کے بلند محرابی دروازے پر جمی رہی۔ مغل بادشاہ شاہجہان سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک اُس دروازے نے جانے کتنے شاہوں اور فقیروں کا عروج و زوال دیکھا تھا۔ انھی میں ایک سرمد تھا۔ وہ فقیر بادشاہِ وقت سے اُلجھ گیا تھا۔ جامع مسجد کی انھی سیڑھیوں کے نیچے مغل بادشاہ اورنگ زیب کے حکم پر اُسے قتل کر دیا گیا تھا۔ روایت یوں ہے کہ جب وہ فقیر اپنا کٹا ہوا سر، ہتھیلی پر رکھے انھی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو اُس کے کٹے ہوئے سر سے ٹپکنے والے خون کے قطروں سے

کی صدا بلند ہو رہی تھی "رک جا سرمد! ورنہ دلی قہرِ خدا کی زد میں آ جائے گی!" لوگوں نے ایک غیبی صدا سُنی تھی۔ اور وہ فقیر رک گیا تھا۔ وہ اُس وقت تک مسجد کی آخری سیڑھی تک پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ گر گیا اور شریعت و طریقت کی جنگ ختم ہو گئی۔

اُس مسجد اور اُن سیڑھیوں کو دیکھ کر مجھے جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا جو میرے لیے انتہائی عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ وہ مقام جو آدمی خود بناتا ہے، اُن کی عمر آدمی سے بڑی ہوتی ہے۔ اس مسجد کو تعمیر کرنے والے زمین کا حصہ بن گئے تھے مگر وہ یونہی سیکڑوں سال سے اپنی عظمت اور شان و شوکت کی داستان سُنا رہی تھی۔ میرے سامنے اُس مسجد کے سارے پتھر بول رہے تھے اور میں اُن کی آوازیں سن رہا تھا۔ میں سیڑھیوں کے نیچے کھڑا بس ایک ٹک مسجد کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور مجھے بھی دیکھنے والے تھے۔ وہ مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر کیا سوچ رہے ہوں گے، مجھے اس کی فکر نہ تھی۔ اس مسجد سے منسوب مجھے ایک اور عجیب واقعہ یاد آیا۔ یہ واقعہ بھی ہندوستان کے اُسی مغل بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے کا ہے۔ میرے ذہن کی پرتیں جیسے آپ ہی آپ کھلتی جا رہی تھیں۔ اُس شخص نے جو خود کو میرا مالک کہتا تھا اور جس نے مجھے تقریباً ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا، میرے حافظے میں جانے کیا کیا بھر دیا تھا! اُن میں ایسی عجیب باتیں بھی تھیں جنھیں عقل تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ بھی ایک فقیر کا ہے۔ بادشاہ نے اُس فقیر کو مسجد میں کعبے کی طرف پیر کیے لیٹے دیکھا اور کڑک کر فقیر سے کہا کہ ادھر سے پیر دوسری طرف کر لے۔ فقیر نے ایک نظر بادشاہ پہ ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ بادشاہ کو حکم عدولی پر غصہ آ گیا اور اُس نے نیام سے تلوار نکال کر فقیر کے دونوں پیر کاٹ دیے۔ وہ دونوں پیر پھر فقیر کے جسم سے جُڑ گئے۔ بادشاہ نے پھر تلوار چلائی اور فقیر کے پیر دوبارہ اُس کے جسم سے جدا کر دیے مگر دوبارہ بھی یہی ہوا۔ تیسری بار بھی جب ایسا ہی ہوا تو بادشاہ بولا کہ میں اورنگ زیب ہوں اور اُس وقت تک تلوار نیام نہیں کروں گا جب تک تو اپنے پیر اُدھر سے نہیں ہٹائے گا! فقیر یہ سن کر اُٹھ بیٹھا اور کہا کہ اچھا اگر تو ہمیں خدا کے گھر میں بھی آرام نہیں کرنے دیتا تو ہم چلے جاتے ہیں۔ پھر اُس فقیر کو دلی میں کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ بھی شریعت اور طریقت کی جنگ تھی۔

میرے ذہن میں اِن واقعات کو محفوظ کرنے سے پروفیسر کا، میرے خالق کا مقصد شاید یہ ہو کہ میں ہر ملک کی تاریخ، اُس کے رسوم و رواج اور عقائد سے پوری طرح باخبر رہوں۔ مجھے کسی جگہ بھی بھیج دیا جائے کوئی ملک، کوئی شہر کسی اعتبار سے میرے لیے اجنبی نہ ہو۔ میرے حافظے میں سب کچھ تھا مگر صرف وہی نہیں تھا جس کی خاطر میری روح مضطرب تھی۔ مجھے اپنی ماں یاد آنے لگی اور میں نے مسجد کے اِن میناروں کو پہچان لیا جنھیں تصویر میں دیکھا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کی بائیں جانب نگاہ اُٹھائی اور اندازہ کیا کہ جب وہ تصویر کھینچی گئی ہو گی تو میری ماں مجھے گود میں لیے کس جگہ کھڑی ہو گی! مجھے وہاں کچھ لوگ نظر آئے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں کبوتر تھے۔ سیڑھیوں کے نیچے زمین پر کبوتروں کی ڈھابلیاں رکھی تھیں۔ میں اُس طرف بڑھ گیا۔ وہاں زمین پہ جگہ جگہ کبوتروں کی بیٹ پڑی تھی۔

اُن کبوتر بازوں کو میری یہ خواہش بہت عجیب لگی کہ وہ وہاں سے اپنی ڈھابلیاں کچھ دیر کو ہٹا لیں۔ پہلے وہ راضی نہ ہوئے۔ لیکن میں نے اُنھیں روپوں کا لالچ دیا تو مان گئے۔ وہ یقیناً مجھے کوئی نیم پاگل سمجھے ہوں گے۔ اُس جگہ سے دو بڑی بڑی ڈھابلیاں ہٹا دی گئیں۔ میں نے سو روپے کا ایک نوٹ اُس

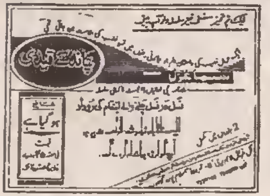

کبوتر باز کے حوالے کر دیا جس کی وہ ڈھابلیاں تھیں۔ وہ سب کچھ دور کھڑے ہو کر مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں کوئی قابلِ دید شے ہوں، اور اپنے کبوتروں کے پر سہلانے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اُنہی سے نہیں خود سے بھی بے نیاز ہوتا گیا۔ میرے قدموں نے بالآخر اُس زمین کو چھو لیا جہاں شاید میری ماں نے قدم رکھے تھے۔ میرے سارے جسم میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی۔

"ماں!... ماں!" میں بڑبڑانے لگا۔ "اے ماں! مجھے اپنی آغوش میں لے لے کہ میں دنیا کی بھیڑ میں اکیلا ہوں۔" میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کر رہے تھے اور میری نگاہ مسجد کے میناروں پر تھی۔ میں جانے کب تک اور جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ میں نے اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"میرے بچے ادریس!" میری سماعت نے جیسے کوئی آشنا صدا سنی اور پھر جیسے کسی نے واقعی مجھے گود میں اُٹھا لیا۔ میں اُسے پہچان گیا، وہ میری ماں تھی جس نے مجھے گود میں اُٹھایا تھا اور پھر میری پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے اب مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی پر اُس کے بوسے کی حرارت محسوس کی اور میرے ذہن پر دھند سی چھانے لگی۔ تیز دھوپ کی بجائے ہر طرف ٹھنڈی چھاؤں پھیل گئی۔ دھوپ سے چھاؤں تک کا سفر شاید بہت طویل تھا۔ مجھے بس اتنا ہی احساس ہوا۔ چھاؤں کا احساس ہوتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ پھر جانے کتنی دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں اور حیران رہ گیا۔ مجھے لمحے بھر کو یوں لگا جیسے میں پھر قاہرہ پہنچ گیا ہوں۔ سامنے نظر آنے والی عمارت کا طرزِ تعمیر کچھ ایسا ہی تھا۔

"میں تو دِلّی کی جامع مسجد کے سامنے کھڑا تھا، یہ کہاں آ گیا ہوں؟" میں بڑبڑایا۔ "اور... اور اس وقت تو تیز دھوپ تھی، یہ سورج کہاں چھپ گیا ہے؟"

کچھ ہی دیر میں میرا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں وہاں تنہا نہیں ہوں۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے اور اُن میں چند غیر ملکی بھی نظر آ رہے تھے۔ وقت اور فاصلے سمٹ جانے کا وہ تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا پہلے بھی مجھ پر شدید مایوسی کے دورے پڑ چکے تھے۔ وقت اور مقام کی تبدیلی ہر چند کہ میرے لیے حیران کن تھی، لیکن اس پر میرا کوئی بس نہ تھا۔ یہ بھی میرے وجود کا ایک اسرار، ایک کمزوری تھی۔

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ ایک ہندوستانی بادشاہ غیاث الدین تغلق کا مقبرہ تھا۔ چھ سو سال پہلے ہندوستان پر اس بادشاہ کی حکومت تھی جس کے مقبرے کا طرزِ تعمیر مصری تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید مصری تعمیرات کے ماہروں نے بھی اُس مقبرے کی تعمیر میں حصہ لیا ہو گا ورنہ ایسا کیوں ہوتا؟ میں نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا تو ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ مجھے ثمینہ احمد یاد آ گئی جس سے اُسی دن چھ بجے سے سات بجے کے دوران میں ملنا تھا۔ میں نے جیب سے نقشہ نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا گلشن آرا کلب وہاں سے کافی دور ہے۔ ثمینہ احمد سے مجھے اُسی کلب میں ملاقات کرنا تھی۔ پھر میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور ایک سکھ تھا جس نے مجھ سے یہ کہا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر گلشن آرا کلب پہنچا دوں گا۔ میں نے پیسے بھی اُسے منہ مانگے دیے اور اُس نے بھی بڑی تیز رفتاری دکھائی۔ یہ علاقہ بھی نئی دِلّی میں لگتا ہے اور مجھے پرانی دِلّی پہنچنا تھا۔ لودھی روڈ عبور کرتے ہی ٹیکسی نے رفتار پکڑ لی۔ ڈرائیور ہوشیار اور تیز تھا۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اُس وقت بس سات بجنے ہی والے تھے جب اُس نے گلشن آرا کلب کے سامنے ٹیکسی روکی۔

کرایہ ادا کر کے میں ٹیکسی سے اُترا ہی تھا کہ عقب سے ایک آشنا آواز آئی۔ "میں تو اب جا ہی رہی تھی۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ثمینہ احمد تھی۔ کلب کے دروازے سے نکل کر وہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے اور اُس کے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ میرے قریب آ گئی تو میں بولا۔ "غالباً میں نے دیر نہیں کی، پہنچنے میں سات بجے ہیں؟" میں نے اپنے بائیں ہاتھ کو اُس کی طرف بڑھا دیا جس کی کلائی پر دستی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔

"آپ شاید بُرا مان گئے ادریس؟" وہ مسکرا کر بولی۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آئیں اُدھر سامنے باغ میں چلتے ہیں۔"

میں بغیر کچھ کہے اُس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ کہتی رہی۔ "اوّل تو مجھے کسی کے انتظار کی عادت نہیں، اور پھر یہ بھی ہے کہ میں پابندیٔ وقت کا خیال رکھتی ہوں۔" میں نے اُس کے ساتھ ساتھ سڑک عبور کی۔ وہ بولی۔ "آپ کچھ خاموش سے ہیں؟"

"ابھی آپ نے کچھ بولنے کا موقع ہی کب دیا ہے؟" میں نے خوش مزاجی سے کہا۔ مجھے اُس عورت کا رویہ کھلا ضرور تھا لیکن اظہار نہیں کیا اور مزید بولا۔ "کچھ دیر بعد تو اندھیرا پھیل جائے گا۔ وہاں باغ کی بجائے اگر کہیں اور...؟"

"وہاں روشنی کا بندوبست بھی ہے اور روشنی کم بھی ہوئی تو کیا!" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "ویسے زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھنا۔ کہیں اور ہی چلیں گے۔"

ثمینہ احمد مجھے روشن آرا باغ کے ایک الگ تھلگ گوشے میں لے آئی۔ "یہاں تو بڑی خاموشی اور سناٹا ہے۔" میں نے تبصرہ کیا اور اطراف پر نگاہ ڈالی۔

"ہاں، مجھے خاموشی اچھی لگتی ہے۔" اُس نے اپنی ساڑی کا پلّو درست کیا۔ "خاموشی کی اپنی زبان ہوتی ہے۔" اُس کے لہجے سے رومان جھلکنے لگا۔

"تو پھر کچھ دیر خاموش بیٹھتے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں؟"

"اور یہی میرا خیال ہے، آپ کے بارے میں۔" میں فوراً بولا، پھر اُسے ڈھرّے پر لانے کے لیے کہا۔ "آپ کا حلقۂ احباب یقیناً وسیع ہو گا؟"

"جی ہاں۔" وہ کچھ چونکی۔

"تو کبھی ملوائیں، اُن سے۔ مجھے یہاں کا رہن سہن، مختلف بولیاں اور آپ لوگوں کی تہذیب و معاشرت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی بڑی آرزو ہے۔"

"آپ کے اعزاز میں، کہیں کوئی تقریب رکھ لیں گے۔" اُس نے مجھے اپنی دانست میں رجھایا۔ "وہاں آپ کی ملاقات ہو جائے گی، میرے حلقۂ احباب سے۔"

"میرے اعزاز میں؟" میں حیرت سے بولا۔ "آخر کس حیثیت سے؟"

"کوئی بھی بہانہ ہو سکتا ہے۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "تقاریب کے لیے بہانے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ بہانہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک غیر ملکی ہو کر اتنی اچھی اردو بولتے ہیں؟"

"نہیں، تقریب رہنے دیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "یوں ہی ملوا دیں۔ اور ضروری نہیں کہ سب سے ایک ساتھ ہی ملاقات ہو جائے۔"

"چلیں یوں سہی۔" اُس نے میری بات مان لی، پھر ذرا توقف سے بولی۔ "ابھی اشوکا میں ہیں آپ یا کہیں؟"

"فی الحال وہیں ہوں، مگر جلد ہی اُس ہوٹل کو چھوڑ دوں گا۔" میں نے بتایا۔ اُسی وقت میں چونک اُٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ثمینہ احمد اور میرے علاوہ بھی وہاں کوئی ہے، اس بینچ کے پیچھے جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی شاید چھپ کر ہم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اُس نے مجھے چونکتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں مسکرا دیا۔ ثمینہ احمد نے یقیناً وہ بات محسوس نہیں کی تھی۔ "مجھے ایک بات یاد آ گئی تھی کہ ساڑھے آٹھ بجے میں نے اپنے گائیڈ کو وقت دیا تھا۔"

"یہ تو آپ نے ظلم کیا۔" وہ بولی۔ "میں نے تو کچھ اور ہی پروگرام بنایا تھا۔ یہاں سے کناٹ پلیس چلیں گے، وہاں ایک فلم دیکھیں گے، پھر..." اُس نے افسردہ سے لہجے میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"مجھے کچھ دیر اور ہو جاتی، اور اگر آپ انتظار کر کے چلی جاتیں پھر؟" میں نے چٹکی لی۔

"وہ اور بات ہوتی۔" اُس نے طویل سانس لیا پھر بولی۔ "ویسے آپ سے آئندہ رابطے کی صورت کیا ہو گی؟ اشوکا میں ملاقات تو غیر یقینی ہے۔"

"تو کیا کل کہیں ملنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"کل!" وہ کچھ سوچنے لگی، پھر کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ اُس گائیڈ سے آج آپ نہ ملیں؟"

"کسی کو وقت دے کر نہ ملنا اچھی بات نہیں۔ آپ تو خود پابندیٔ وقت کی قائل ہیں۔" میں نے اُسے لاجواب کر دیا۔

"تو پھر کل آپ کسی کو وقت نہیں دیں گے!" وہ یوں اِس طرح حق جتانے لگی جیسے بہت پُرانی آشنائی ہو۔

"اور جن لوگوں کو وقت دے چکا ہوں؟"

"پھر کل نہ ملیں، پرسوں رکھیں۔" اُس نے جلدی سے کہا۔

"پرسوں مل لیں گے۔ تم ابھی تو وقت ہے میرے جانے میں۔" میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور اُس مدھم سی آواز پر دھیان لگا دیا جو یقیناً کسی کے دور ہوتے قدموں کی آواز تھی۔ وہ جو بھی ثمینہ احمد کی باتیں سُن رہا تھا، غالباً اب جا رہا تھا۔ اس بار میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

"میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ میں چلوں گی اب۔" میری بات سُن کر ثمینہ احمد بولی۔ "کل وہ فلم اُتر جائے گی اور میں تنہا فلم نہیں دیکھتی۔ آپ ساتھ نہیں چل رہے تو اپنی ایک دوست کو لے لوں گی۔ ویسے زبردستی کرالی تھی میں نے ابھی اُسے بھی آمادہ کرنا پڑے گا کیونکہ میری طرح وہ بھی کئی بار اُس فلم کو دیکھ چکی ہے۔"

وہ بھی کھیل رہی تھی اور میں بھی۔ میں اپنے چکر میں تھا، وہ اپنی دھار پر لگی ہوئی تھی۔ اُسے کچھ اکھڑی اکھڑی دیکھ کر میں نے دوبارہ پانسا پھینکا۔ "ثمینہ! آپ کی خاطر بد اخلاقی کا الزام گوارا ہے مجھے۔ میری نظر میں وہ گاہک آپ سے زیادہ اہم نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ بور ہوں۔"

"آپ بھی خوب ہیں ادریس!" اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کبھی تو آس بندھا دیتے ہیں اور کبھی توڑ دیتے ہیں۔" اُس کے لہجے میں پھر خوشگواری آ گئی۔

"آج کی شام آپ کے نام!" میں نے اُسے اور قریب آنے کا موقع دیا تاکہ اُس کی پُراسرار شخصیت کی کوئی پرت تو ہٹے، وہ مجھ پر کچھ اعتماد تو کرے۔ پھر میں نے بغیر توقف اُس سے نجی قسم کا سوال کر دیا۔ "آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"نئی دہلی میں۔"

"نئی دہلی تو بہت بڑی ہے!" میں مُسکرایا۔

"دراصل میں گھر پر کم ہی ملتی ہوں اس لیے کسی کو گھر کا پتا نہیں دیتی۔" وہ ہوشیاری سے بولی۔ "گھر میں گھٹن سی ہوتی ہے اور یہاں کھلی فضا میں سانس لینے کو جی چاہتا ہے۔ گھر تو جیسے میرے لیے سرائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالکل یوں سمجھ لیجیے جیسے آپ کے لیے ہوٹل۔"

"کیوں، کیا اکیلی رہتی ہیں؟"

"نہیں... مگر شاید آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ بس ہم اکیلا رہنا ہی کہیں گے کہ اُس سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو یہ ذکر یہیں چھوڑ دیں۔ اِس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" میرے خیال میں وہ ایک مظلوم عورت کی اداکاری کر رہی تھی۔ گھر بار اور رشتے ناتے سب تھے، پھر بھی وہ تنہا تھی۔ میں نے اُسے یہ احساس دلانے کے لیے اُسی کی بات دہرائی۔ وہ چونک کر بولی۔ "ہاں اداکاری کا شوق تو بچپن سے ہے مجھے، مگر... آپ کو یہ بات اِسی وقت کیوں یاد آئی ہے؟"

"بس یوں ہی!" میں نے سادگی سے کہہ دیا۔ "میں نے سوچا کہ جس موضوع سے آپ کو دلچسپی ہے، اُسی پر کچھ دیر بات ہو جائے۔"

"جی!" اُس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "کیا خیال ہے، اب اُٹھیں یہاں سے؟" میں نے اقرار میں سر ہلا دیا تو وہ مزید بولی۔ "یہاں سے کناٹ پلیس چلتے ہیں، وہاں کچھ دیر ایک کافی ہاؤس میں بیٹھیں گے۔ وہیں میں آپ کی ملاقات اپنے کچھ دوستوں سے کرا دوں گی۔ پھر وہیں سے اُٹھ کر فلم دیکھنے چلیں گے۔" اُس نے فی الفور پورا پروگرام ترتیب دے ڈالا۔

میرے لیے اُس کے پروگرام میں صرف ایک بات قابلِ توجہ تھی کہ وہ مجھے کسی کافی ہاؤس میں اپنے کچھ دوستوں سے بھی ملوائے گی۔ پھر یہ کہ اِس طرح اُس کے ساتھ اکیلے بھی نہ رہنا ہوتا۔ شاید اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ عرضِ شوق کی منزل ابھی نہیں آئی۔ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ پھر میں باغ سے نکل کر اُس کے ساتھ دوبارہ روشن آرا کلب کے سامنے پہنچ گیا جہاں ایک طرف اُس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔

میں اُس کے ساتھ کار کے اگلے حصے میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے کرتے وہ ایک دم رُک گئی۔ میری نگاہ کار میں بیٹھتے ہی اسٹیئرنگ وھیل سے بندھے ہوئے اُس

پرچے پر پڑ چکی تھی جسے ثمینہ احمد نے اب دیکھا تھا۔ وہ پرچا ایک سفید ڈورے سے باندھا گیا تھا۔ اُس نے ڈورا توڑ لیا اور کار کے اندر روشنی کر دی۔ پھر ذرا سا رُخ بدل کر پرچا پڑھنے لگی۔ اُس نے اپنی دانست میں یہ احتیاط برتنا چاہی تھی کہ پرچے پر لکھی ہوئی عبارت میں نہ پڑھ سکوں۔ اُسے کیا خبر تھی کہ غیر معمولی حالات کا احساس ہوتے ہی میں پوری طرح چوکنا ہو گیا تھا اور وہ عبارت پڑھ چکا تھا جو صرف چند جملوں پر مشتمل تھی۔ عبارت اُردو میں تھی اور اُسے لکھنے والا یقیناً اِس زبان سے ناواقف معلوم ہوتا تھا۔ یوں جیسے دوسری تیسری جماعت کے بچے نے وہ عبارت لکھی ہو۔ عبارت یہ تھی۔ "ثمینہ! تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہیں! تمہارے حق میں یہ اچھا نہیں ہے۔ اِس کا تجربہ تمہیں پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ ہم تمہاری طرف سے بے خبر ہیں تو ایسا نہیں۔ تم نہ مانیں تو تمہارا یہ نیا خوبصورت کھلونا بھی تم سے چھین لیا جائے گا۔"

ثمینہ احمد وہ پرچا پڑھ کر پھاڑنے لگی تو میں بول اُٹھا۔ "کار تو لاک تھی، پھر یہ پرچا کسی نے اندر کیسے اسٹیئرنگ وھیل سے باندھ دیا؟" میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ کچھ تاریک سا ہو گیا ہے۔

"معلوم نہیں کون... کون لوگ ہیں جو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے پھٹے ہوئے پرچے کو توڑ مروڑ کر کار سے باہر پھینک دیا۔ اُس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"لکھا کیا تھا پرچے میں؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اُس کے مُنہ سے روا روی میں کوئی بات نکل جائے۔ "کیا دھمکی دی ہے کوئی؟"

"جی نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" وہ اب قدرے سنبھل گئی تھی۔ پھر اُس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ایک الگ ہی کہانی سُنا دی۔ پرچے پر لکھی ہوئی عبارت سے اُس کہانی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"اگر یہ معاملہ آپ کی کسی قریبی دوست سے متعلق ہے تو پھر وہ لوگ آپ کو کس لیے تنگ کر رہے ہیں؟" میں اُس کی کہانی سُن کر بولا۔

"اُن کا خیال ہے کہ میں اپنی دوست پر دباؤ ڈال سکتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالا۔ "ہر مرتبہ وہ انجان لوگ مختلف انداز میں خط لکھ کر یہی درخواست کرتے رہتے ہیں اور کبھی سامنے نہیں آتے۔ میں نے اپنی دوست سے ان لوگوں کا ذکر کیا تو وہ خود پریشان ہو گئی۔ نہ اُس کا کسی لڑکے سے ایسا چکر ہے اور نہ اِس نام کے کسی لڑکے کو وہ جانتی ہے جو مجھے پرچے لکھتا رہتا ہے۔ کبھی یہ پرچے اُس کے دوستوں کی طرف سے لکھے جاتے ہیں۔ آج اُس کے دوستوں نے یہ حرکت کی تھی۔ پرچے میں لکھا تھا کہ میں اُن کے دوست کا کام کرا دوں!"

جب ثمینہ احمد یہ جملے ادا کر رہی تھی تو میری نگاہ اُس کے چہرے پر تھی۔ اُس کا چہرہ بھی الفاظ کا ساتھ دے رہا تھا۔ جھوٹ بولنے کو بھی سلیقہ چاہیے اور ثمینہ احمد کو یہ سلیقہ آتا تھا۔ مجھے ثمینہ احمد کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ کون اور کیوں اُسے دھمکیاں دے رہا ہے، لیکن اُن لوگوں نے خواہ مخواہ اِس معاملے میں مجھے بھی ملوث کر لیا تھا اس لیے ثمینہ احمد سے میں نے اتنی بات بھی کی۔ وہ عورت اب میرے لیے اور بھی پُراسرار بنتی جا رہی تھی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے دشمنوں سے ڈرتی تھی مگر خود بھی کم نہ تھی ورنہ اسے حرکتوں سے باز آنے کی تاکید نہ کی جاتی۔

میں نے یقیناً اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ایک غلط عورت کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے سوچا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ خواہ مخواہ کسی غیر متعلق معاملے میں ملوث ہوتا۔ اِس فیصلے تک پہنچ کر میرا رویہ بدل گیا۔ میں نے اُس سے کوئی رعایت نہیں برتی اور بولا۔ "معاف کیجیے گا خاتون، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے کسی ایسی جگہ اُتار دیں جہاں سے مجھے ٹیکسی مل جائے۔"

"جی؟" وہ چونک کر بولی۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اُس کی حیرانی اب بھی دور نہیں ہوئی تھی اور یہ اداکاری نہیں تھی۔

"میں اِس شہر میں اجنبی ہوں اور صاف گوئی معاف، بے سبب کسی معاملے میں ٹانگ پھنسانا بھی مجھے پسند نہیں۔"

"کہیں آپ اُن لوگوں سے تو نہیں مل گئے جنھوں نے اپنے دوست کی طرف سے مجھے پرچا لکھا تھا؟" وہ ہنس پڑی۔

"یوں ہی سمجھ لیں۔" میں اُس سے جان چھڑانے کے لیے بولا۔

"سمجھ گئی لیں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" وہ پُریقین لہجے میں بولی۔ "اگر آپ مجھ سے پوری طرح واقف ہوتے تو شاید ایسی بات نہ کہتے! میں ثمینہ احمد ہوں اور مجھ سے اس شہر کے سفید پوش غنڈے بھی ڈرتے ہیں۔"

"یقیناً ڈرتے ہوں گے، مگر یہ کہ آپ مجھ پر کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں!" میرے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ آ گئی۔

"کچھ نہیں!" وہ پُرسکون آواز میں بولی۔ شاید اُس نے میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا تھا۔ اُس کے چہرے سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ ذرا توقف سے وہ پھر بولی۔ "تو اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ اب آپ مجھ سے آئندہ ملنا نہیں چاہتے؟"

"اگر آپ یہ سمجھیں گی تو غلط نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ دلّی کے اعلیٰ حلقوں میں رسائی کے لیے کسی اور عورت یا مرد کو بھی ذریعہ بنایا جا سکتا تھا۔

"بعد میں آپ اپنے اِس فیصلے پر یقیناً پچھتائیں گے!" یہ کہہ کر اُس نے اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لیے۔ ایسا کرنے سے اُس کی اچھی خاصی صورت بگڑ گئی۔

"میں اِسے آپ کی دھمکی سمجھوں یا کچھ اور؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ عورت حد سے گزرنے لگی تھی۔

"آپ غلط سمجھے۔ میں دھمکیاں نہیں دیتی۔ دھمکیاں کمزور لوگ دیتے ہیں اور میں خود کو کمزور نہیں سمجھتی!" اُس نے کینچلی بدلی۔

"شاید اسی لیے پرچا پڑھ کر آپ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا بیگم صاحبہ!" ضبط کرنے کے باوجود میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔

"میں اتنی بے تکلفی پسند نہیں کرتی مسٹر!" یہ کہتے ہوئے اُس نے اسٹیئرنگ گھمایا اور کار کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا، پھر حقارت سے بولی۔ "اُتر جائیں نیچے! چلیں جلدی کریں، دیر ہو رہی ہے مجھے!" اُس نے میری طرف تضحیک آمیز نگاہ اُٹھائی۔ "معلوم نہیں آپ خود کو کیا سمجھ رہے ہیں! آپ جیسے جانے کتنے میرے پیچھے..."

"بیگم صاحبہ!" میں نے اُس کی طرف غصّے سے دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کہ کوئی ٹیکسی کر کے اشوکا چلا جاؤں گا لیکن اب آپ کو وہاں چھوڑنا پڑے گا مجھے!"

"وہ کس خوشی میں؟" وہ تمسخر آمیز انداز میں ہنسی۔ وہ اب بالکل بدلی ہوئی عورت دکھائی دے رہی تھی۔

"اگر بات نہ بڑھائیں تو زیادہ اچھا ہے۔ مجھے اشوکا ہوٹل چھوڑ دیں۔" میں ضبط کرتے ہوئے بولا۔ وہ عورت نادانستگی میں مجھ سے اُلجھ پڑی تھی اس لیے میری نظر میں قابلِ معافی تھی۔

"بائی دا وے تمھیں ایک بات بتا دوں کہ یہ قاہرہ نہیں دلّی ہے۔ میرا ایک اشارہ تمھیں حوالات کی ہوا کھلا سکتا ہے۔ اور ہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تم کوئی اہم شخصیت نہیں ہو۔ بالفرض تمھارے ملک کے سفارت خانے کو کوئی اعتراض ہوا بھی تو ناپسندیدہ شخصیت قرار دلوا کر تمھیں دوبارہ قاہرہ کی طرف ہانکا جا سکتا ہے!" اُس کے لہجے میں طنز بھی تھا اور حقارت بھی۔ وہ خواہ مخواہ بات بڑھا رہی تھی اور مجھے اب اُس کی نادانستہ حماقت پر غصہ آنے کی بجائے افسوس ہو رہا تھا۔ پھر میں نے انھی جذبات کا اظہار بھی کر دیا اور بولا۔ "تم یقیناً اپنی حماقت کے نتیجے سے واقف نہیں ہو۔ مجھے احساس ہے کہ تم ایک بارسوخ عورت ہو گی، لیکن رسوخ استعمال کرنے کی نوبت دیر میں آتی ہے۔ تمھاری اطلاع کے لیے ایک بات اور بتا دوں کہ میں پرچا پہلی ہی نظر میں پڑھ چکا تھا جسے تم نے پھاڑ دیا اور مجھے ایک فرضی کہانی سنا دی۔ کہو تو بتا دوں، کیا لکھا تھا اُس میں!"

"تم بکواس کر رہے ہو!" وہ غصّے میں بولی۔

میں نے لفظ بہ لفظ وہ عبارت دُہرا دی جو پرچے میں لکھی تھی، پھر بولا۔ "ایک اور بات بتاؤں تمھیں کہ جب تم میرے ساتھ اُس باغ میں بیٹھی تھیں تو کوئی ہماری باتیں چھپ کر سن رہا تھا۔ تمھیں احساس بھی نہیں ہوا، احساس کر سکتی ہو کہ یہ قاہرہ نہیں، دہلی ہے! کسی کی درگزر کو اُس کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہیے!"

اُس کی ساری اکڑفوں کچھ ہی دیر میں رخصت ہو گئی اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر ذرا توقف سے اُس نے کہا۔ "تم مجھے غیر ملکی ایجنٹ معلوم ہوتے ہو!" اُس کی آواز کھوکھلی تھی۔

"پھر حماقت!" میں اِس بار ہنس پڑا، پھر بولا۔ "سنو مجھے اس سے واقعی کوئی غرض نہیں کہ تم کس چکر میں ہو۔ میرا مطالبہ اب وہی ہے کہ تم مجھے..."

"میں تمھیں اشوکا چھوڑ دوں گی، لیکن تم آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ تم خطرناک آدمی ہو!" اُس نے ہتھیار ڈال ہی دیے اور کار اسٹارٹ کرنے لگی۔

"چلیں، غیر ملکی ایجنٹ سے خطرناک آدمی تو بنا، یہ بھی غنیمت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہاں ایک بات کا تم بھی خیال رکھنا کہ میرے خلاف تم نے کوئی انتقامی چکر چلایا تو خود ہی بھگتو گی۔ رہا تم سے دوبارہ ملنے کا معاملہ تو خود ہی تم نے کوئی پتا نشان نہیں دیا ورنہ شاید مل بھی لیتا کبھی۔"

"تم اب خاموش بیٹھو تو زیادہ بہتر ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"معاف کرنا، میں یہ بھول گیا تھا کہ تمھیں خاموشی پسند ہے۔" میں نے اُسی کی بات دُہرائی۔ "خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔"

میری بات کا ردِ عمل اُس کے چہرے پر ظاہر ہوا۔ غصّے میں اُس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا تھا۔ پھر میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور وہ بھی راستے بھر خاموش رہی۔ مجھے اشوکا ہوٹل کے صدر دروازے پر اُتار کر وہ رُکی نہیں اور چلی گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کھانا کھایا اور پھر اُس دن گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ ثمینہ احمد کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ عورت کچھ بھی سہی، اب میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ اُس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ میرے لیے مسائل پیدا کر دے گی۔ میں اب دوسرے مہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا، خاندانی رئیس جبار احمد خاں! وہی جس کا ذکر مجھ سے سردار جی نے کیا تھا اور آئندہ روز میں اُس سے ملنے والا تھا۔

حالات و واقعات پر غور کرتے ہوئے مجھے ایک ایسی بات یاد آئی جس نے فکرمند کر دیا۔ جو خطرناک امریکی ایجنٹ تھیری ناٹ، قاہرہ میں میرے ہاتھوں مارا گیا تھا، اُسے دوسرے دن اسکندریہ پہنچ کر اپنے کسی بڑے کو رپورٹ دینا تھی۔ وہ میری ہی تلاش میں قاہرہ سے اسکندریہ جانے والا تھا کہ اُس کا آخری وقت آ گیا۔ اِس واقعے کو تین دن گزر چکے تھے۔ میں جس دن قاہرہ سے دلّی کے لیے روانہ ہوا اور یہاں پہنچا، یعنی گزشتہ دن! واشنگٹن میں اُس امریکی ایجنٹ کی رپورٹ کا انتظار کیا گیا ہو گا۔ اپنے ایجنٹ کی طرف سے رپورٹ نہ ملنے کی صورت میں اُنھوں نے کیا کیا ہو گا؟ میں اِس سوال پر غور کرنے لگا اور یہ سوال میرے لیے بہت اہم تھا۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ بات بھی یاد آئی کہ میری جان کو میرے دشمن ہندوستان سے کسی اور ملک یا دلّی سے ہندوستان ہی کے کسی دوسرے شہر میں منتقل کرنے کے متعلق بھی سوچ رہے ہیں۔

میں اپنے دشمنوں کی جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟ میں نے اپنے ذہن کو پُرسکون رکھ کر سوچا۔

دو ایک دن رپورٹ ملنے کا انتظار۔ میرے ذہن نے جواب دیا۔ کسی بھی سبب ایجنٹ سے رپورٹ دینے میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ دو ایک دن کی بجائے ایک ہفتے بھی انتظار کیا جا سکتا ہے۔

"اُس کے بعد؟" میں بڑبڑایا۔

ایجنٹ کے زندہ یا مُردہ ہونے کی تصدیق!

اس خطرناک امریکی ایجنٹ کے بڑوں کو تو علم ہو گا کہ وہ کہاں اور کس حیثیت سے سکونت پذیر ہے؟ میرے ذہن میں سوال اُبھرا۔

یقیناً! اور موت کی تصدیق کے لیے کسی اور ایجنٹ کا قاہرہ بھیجا جانا ضروری ہے کیوں کہ قاہرہ میں مقیم کوئی اور امریکی ایجنٹ، تھیری ناٹ کے متعلق کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے۔ تھیری ناٹ کی موت کی تصدیق ہونے میں کم سے کم بھی ہفتہ بھر لگ سکتا ہے۔

میں دیر تک اپنے آپ سے سوال جواب کرتا رہا اور اِس سے یہ فائدہ ہوا کہ میرا ذہن وقتی طور پر پُرسکون ہو گیا۔ مجھے اپنے دشمنوں کی طرف سے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں

تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد میں آرام سے سو گیا۔

بڑے ہوٹلوں سے اور دیگر سہولتوں کے ساتھ ٹیلیفون کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ اشو کا ہوٹل میں بھی یہ سہولت تھی۔ میرے کمرے میں فون تھا تو مگر نہ میں نے وہاں سے کسی کو فون کیا تھا اور ظاہر ہے کہ مجھے اُس شہر میں کون فون کرتا، اِسی لیے جب میں ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر بیدار ہوا تو مجھے حیرت ہوئی۔ ذہن پر غنودگی کا غلبہ تھا، لیکن اس خلاف توقع واقعے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے سرہانے کی جانب ایک تپائی پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو مسٹر ادریس المہندس ہے؟" دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"یس!" میں انگریزی میں بولا۔ "فرمائیے!"

"میں اِسی ہوٹل کی انکوائری سے بول رہی ہوں جناب!" اُس عورت نے اپنا تعارف کرایا، پھر بغیر رُکے انگریزی ہی میں بولی۔ "آپ کا ایک ارجنٹ ٹیلی گرام آیا ہے قاہرہ سے۔ فوری طور پر وہ ٹیلی گرام اِس لیے آپ تک نہیں پہنچایا جا سکا جناب کہ پتے میں آپ کے کمرے کا نمبر درج نہیں تھا۔ ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔"

"قاہرہ سے میرے نام ٹیلی گرام؟" میں نے دھیانی میں بڑبڑایا کیونکہ یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔

"جی ہاں جناب۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "آپ قاہرہ ہی سے آئے ہیں نا؟"

"وہ ٹیلی گرام بھجوا دیں مجھے۔" میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سوری سر! میں نے اِسی لیے آپ کو فون کیا تھا کہ خود انکوائری سے آ کر ٹیلی گرام لے لیں۔ رات کا وقت ہے اور میں کاؤنٹر پر اکیلی ہوں۔ اگر آپ خود نہیں آ سکتے تو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا تاکہ میں کسی بیرے سے۔۔۔"

"میں خود آ رہا ہوں۔" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"تھینک یو سر!" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

قاہرہ سے ٹیلیگرام آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔ کیا میرے دشمنوں نے اتنی جلدی میرا سراغ لگا لیا؟ مگر کیسے؟ یہی سوچتا ہوا میں دروازے تک پہنچ گیا اور پھر دروازہ کھولتے ہی اُچھل پڑا۔ سامنے ہی مجھے ایک باوردی پولیس انسپکٹر نظر آیا جس کے ہاتھ میں ریوالور کی نال میری طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ انسپکٹر کے پیچھے چار پانچ پولیس والے اور نظر آ رہے تھے۔ "ہاتھ اوپر اُٹھا کر ایک طرف ہو جاؤ!" انسپکٹر نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے سکون کے ساتھ پوچھا۔

"ہم تمھیں یہ بتانے کے پابند نہیں ہیں۔" اُس نے پولیس والوں کا روایتی لہجہ اختیار کیا۔ "ہم تمھارے کمرے کی تلاشی لیں گے۔ تم اس وقت تک خود کو زیرِ حراست سمجھو جب تک بے گناہ ثابت نہ ہو جاؤ۔"

"تلاشی کا وارنٹ ہے تمھارے پاس؟" میں بدستور اُس کی راہ میں حائل رہا۔

"اسے وارنٹ دکھاؤ!" انسپکٹر بغیر مڑے اُردو میں بولا، پھر انگریزی میں مجھ سے کہا۔ "تم نے ابھی تک ہاتھ نہیں اُٹھائے۔" اُس کے لہجے میں سختی آ گئی۔

"پہلے تلاشی کا وارنٹ دیکھ لوں، پھر تم جو کہو گے کروں گا انسپکٹر!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب کہو!" ایک پولیس والے نے مجھے تلاشی کا وارنٹ دکھا دیا تو انسپکٹر بولا۔ وارنٹ میں میرا نام، کمرے کا نمبر اور ہوٹل کا پتا انگریزی میں درج تھا۔ میں نے وارنٹ واپس دے دیا اور ہاتھ اُٹھا کر ایک طرف ہو گیا۔ "اب ہو گیا سیدھا!" انسپکٹر میرے کمرے میں داخل ہو کر اپنے ایک ساتھی سے مسکرا کر اردو میں بولا، پھر اُسی سے کہا۔ "ذرا احتیاط سے! شبہ نہ ہو اِسے! میں اِسے باتوں میں لگاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ غالباً یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے اردو نہیں آتی۔

"اپنے ساتھی سے کس بات کی احتیاط کے لیے کہہ رہے ہو انسپکٹر؟ اور مجھے باتوں میں کیوں لگانا چاہتے ہو؟" میں نے اُردو میں انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ انسپکٹر میرے

ایک دم بول اُٹھنے پر تقریباً اُچھل پڑا اور اُس کا ساتھی بھی رُک گیا جو وردی سے سب انسپکٹر نظر آ رہا تھا۔ "تم ہماری۔۔۔ ہماری زبان بول سکتے۔۔۔؟" انسپکٹر ہکلا گیا۔

"ہاں بول سکتا ہوں اور سمجھ بھی سکتا ہوں۔"

"پھر تو تم واقعی کوئی پکے ٹھگ معلوم ہوتے ہو!" انسپکٹر کا لہجہ بدل گیا۔ "ہمیں تمھارے بارے میں جو اطلاع ملی ہے، صحیح لگتی ہے۔" اُس نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا۔

"اگر مناسب سمجھو تو وہ اطلاع بھی بتا دو، کوئی حرج نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھ نیچے کر لیے کیوں کہ میں اب معاملے کو کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

"ہاتھ اُٹھا لو اپنے!" وہ سختی سے بولا۔ "میرا نام انسپکٹر گپتا ہے اور میں بہت سخت آدمی ہوں۔"

"دیکھو انسپکٹر!" میں نے نرمی سے کہا۔ "یہ پولیس والوں کے ہتھکنڈے مجھ پر نہیں چلیں گے۔ شرافت کی زبان میں بات کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ میں شب خوابی کے لباس میں ہوں اور غیر مسلح ہوں۔ یوں بھی ابھی مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ تلاشی کے وارنٹ کا مطلب کسی کا مجرم ہونا۔۔۔"

"تم بہت چرب زبان ہو!" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "غیر ملکی ہو اِس لیے معاف کیے دے رہا ہوں ورنہ۔۔۔" اُس نے دھمکی آمیز انداز میں اپنا جملہ اَدھورا چھوڑ دیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔ "تم تلاشی لو!"

"رک جاؤ انسپکٹر!" میں نے انسپکٹر کے ساتھی کو مخاطب کیا۔ میرا لہجہ اتنا ہی سخت تھا کہ سب انسپکٹر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میں نے گہری نظروں سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کہا۔ "تمھاری پینٹ کی دونوں جیبیں کیوں پھولی ہوئی ہیں؟"

"تن۔۔۔ نہیں تو۔" سب انسپکٹر گھبرا گیا۔ انسپکٹر بھی کچھ بوکھلایا ہوا سا نظر آنے لگا۔

"کیا ہے تمھاری جیبوں میں؟ بولو؟" میں اُسے گھبرایا ہوا دیکھ کر سمجھ گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ "بتاؤ چرس ہے؟ گانجا ہے؟ افیون ہے؟ کیا ہے؟ تمھارے انسپکٹر صاحب نے اِس کمرے سے کیا چیز برآمد کرنے کے لیے کہا ہے؟ یا غیر قانونی اسلحہ۔۔۔ مگر نہیں، تمھاری جیبیں اتنی بڑی نہیں ہیں، اِن میں چرس وغیرہ ہی ہو سکتی ہے۔ بولو نا! ورنہ تم دونوں کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ تمھیں اور تمھارے افسران کو شاید یہ خبر نہیں کہ میری پہنچ کہاں تک ہے۔"

وہ دونوں بہت بودے نکلے اور اتنے ہی میں گڑبڑا گئے۔ انسپکٹر نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھتے ہوئے اپنے ساتھی کے سوا بقیہ سب پولیس والوں کو کمرے سے نکال دیا۔ اس کے ساتھی نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تو وہ مظلوم لہجے میں بولا۔ "جناب! اِس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ مجھے اوپر سے یہی آرڈر ملا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ کی پہنچ۔۔۔"

"آؤ وہاں بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے، گھبراؤ مت۔" میں نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں جب میرے ساتھ ساتھ صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا۔ "یہ انکوائری سے تمھی نے فون کرایا تھا تاکہ دروازہ کھولتے ہی میں بوکھلا جاؤں؟ تم پہلے غالباً ہوٹل کے مینیجر سے ملے ہو گے اور اُسے تلاشی کا وارنٹ وغیرہ دکھا کر اِس پر آمادہ کر لیا ہو گا!"

"جی جناب!" انسپکٹر نے اعتراف کر لیا۔

"تم میرے کمرے سے چرس وغیرہ برآمد کرنے کے بعد مجھے لے جا کر حوالات میں بند کر دیتے، اور پھر تمھارا کام ختم ہو جاتا! کیوں، ٹھیک ہے نا؟"

اِس مرتبہ انسپکٹر نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"اب تم اپنے اوپر والوں کو کیا جواب دو گے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا جناب!" انسپکٹر نے بے بسی سے کہا۔ "میں تو دونوں طرف سے پھنس گیا!"

"کبھی کبھی تم لوگوں کے ساتھ ایسا بھی ہونا چاہیے۔" میں مسکرا کر بولا۔ مجھے یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں لگی کہ اُس اجنبی شہر میں میرے خلاف یہ گھڑ دجال پھیلانے والی شخصیت کس کی ہو سکتی ہے۔ نمیرہ احمد ایسی بارسوخ عورت کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اُس کے سوا پس پردہ اور کون ہوتا! جیسا کہ مجھے اندازہ تھا، اُس انسپکٹر کو زبانی یہ حکم ملا تھا اور حکم دینے والا ایک ایس پی تھا۔ تلاشی کا وارنٹ بھی انسپکٹر کو اُسی سے ملا تھا۔ انسپکٹر کو اس کے سوا

کچھ اور معلوم نہیں تھا۔ وہ اِس امید پر مجھے صاف صاف بتا تا رہا کہ میں آخر میں ایس پی کے سامنے جواب دہی سے بچنے کی کوئی صورت نکال دوں گا۔ میں نے سب کچھ پوچھ پاچھ کر جب اُس سے کہا کہ اب تم جاؤ، میں آرام کرنا چاہتا ہوں تو اُس کا مُنہ لٹک گیا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جناب! آپ نے تو کہا تھا کہ میری پہنچ اوپر تک...“

”اِس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اِتنے ذرا ذرا سے معاملوں میں اگر میں تمھارے وزیر داخلہ کو پریشان کرنے لگوں تو یہ کوئی اچھی بات ہے۔ پھر وہ ایس پی غریب ناحق مارا جائے گا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ وزیر داخلہ کے ذکر سے بے حد متاثر نظر آنے لگا تھا۔ میں نے مزید کہا۔ ”کیا تم یہ چاہو گے کہ تمھارے ایس پی کو معطل کر دیا جائے؟“

”نہیں بالکل نہیں جناب!“ انسپکٹر جلدی سے بولا۔

”ایس پی صاحب تو بڑے بھلے آدمی ہیں!“

”تو پھر وہ کرو جو میں کہوں!“

”حکم کریں جنابِ والا!“

”جو یہاں گندی ہے، وہ صاف صاف اپنے ایس پی کو بتا دینا! بس یہ بتانا کہ میری پہنچ کہاں تک ہے۔ میں اِس بات کی شہرت نہیں چاہتا!“

وہ میری بات سُن کر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کے ساتھی کی تو ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ بولتا۔ ذرا دیر بعد اُس نے اقرار میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے جناب، جو حکم!“ پھر وہ دونوں چلے گئے اور میں کمرے کا دروازہ بند کر کے دوبارہ مسہری پر جا لیٹا۔ جب بڑے دشمن مقابل ہوں تو آدمی اپنے چھوٹے دشمنوں کو نظر انداز کر ہی دیتا ہے۔ یوں بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ عورت اِتنی منتقم مزاج ہو گی۔ سونے سے پہلے میں نے سوچا کہ تم بھی اِسی شہر میں ہو ثمینہ احمد اور میں بھی! کبھی نہ کبھی حساب برابر ہو ہی جائے گا۔

دوسرے دن صبح سردار جی آ گئے تو میں نے اُن سے شام کو آنے کے لیے کہہ دیا۔ میں دِلّی میں سیاحت کی غرض سے تو آیا نہیں تھا کہ اُن کے ساتھ تاریخی مقامات کی سیر کرتا پھرتا۔ وہ مجھے اُن تاریخی مقامات کے متعلق جو بتاتے اُس سے کہیں زیادہ خود مجھے معلوم تھا۔ مجھے زندگی اِتنی مہلت بلکہ فرصت ہی کب دے رہی تھی جو میں یہ مشغلے اختیار کرتا۔ میں اُس شہر میں ایک خاص مقصد سے آیا تھا اور وہی میرے پیشِ نظر تھا۔ اُس مقصد کے حصول کی راہ میں جن مراحل سے بھی مجھے گزرنا پڑتا، گزرتا۔ اِن میں تفریحِ طبع کی گنجائش کہاں تھی! سو میں نے طبیعت کی ناسازی کا عذر کر کے سردار جی سے پیچھا چھڑا لیا، البتہ جبّار احمد خاں سے میری ملاقات سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ سردار جی نے شام چار بجے آنے کو کہا اور چلے گئے۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ آپ آنے سے پہلے جبّار احمد خاں سے فون پر بات بھی کرتے آئیں، میں تیار ملوں گا۔ جلد بازی میں اُٹھایا ہوا کوئی قدم میرے دشمنوں کو بھی چوکنا کر سکتا تھا۔ امریکی ایجنٹ تو اِس شہر میں بھی تھے اور انھیں میری شناخت بھی معلوم تھی۔ وہ امریکی ایجنٹ تھری ناٹ جو میرے ہاتھوں قاہرہ میں مارا جا چکا تھا، اُسی کی ایک شاگرد سونیا، دِلّی میں تھی۔ واشنگٹن والوں نے تھری ناٹ سے اُس کی تعریف کی تھی کہ وہ اچھی جا رہی ہے۔ یہ تعریف اُس امریکی ایجنٹ کی اہمیت کا ثبوت تھی۔ حصولِ مقصد کی راہ میں وہی بالآخر آڑے آتی۔ شام ہونے تک میں انھی معاملات پر ہر رُخ سے غور کرتا رہا۔ وہاں کے ماحول اور معاشرے میں میرا رچ بس جانا ضروری تو تھا لیکن بہت احتیاط کے ساتھ! اِس طرح کہ آخر وقت تک اور آخری ضرب لگنے تک میرے دشمنوں کو کچھ خبر نہ ہو۔ یہ کھیل اس اعتبار سے اور بھی خطرناک تھا کہ میری ماں اُن کے قبضے میں تھی۔ میرے کسی غیر محتاط اقدام سے اُسے بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میری ماں کو کسی مصلحت کے پیشِ نظر اِس شہر ہی میں رکھا گیا ہے، یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی۔ وہ کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ میں نے اِس سوال پر بھی کافی غور کیا مگر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔

سردار جی میری ہدایت کے مطابق فون پر جبّار احمد خاں سے بات کر کے آئے تھے۔ اُس خاندانی رئیس نے سردار جی کو آنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ سردار جی کے ساتھ ہوٹل کی کار میں بیٹھ کر قرول باغ روانہ

گیا کہ وہیں جبّار احمد خاں کی کوٹھی تھی۔ راستے میں مجھے ثمینہ احمد کا خیال بھی آیا کہ اُسے اب تک یقیناً اپنی ناکامی کی اطلاع مل گئی ہو گی۔ جب کوئی کسی کے خلاف قدم اُٹھاتا ہے۔ تو نتیجے پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ ناکامی کا ردِ عمل دو طرح ظاہر ہوتا ہے، یا تو آدمی خاموش بیٹھ رہے یا پھر دوبارہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ حملہ آور ہو۔ ثمینہ احمد کے معاملے میں کوئی ایک صورت بھی ممکن تھی، مگر میں چوکنا ہونے کے باوجود اُس کی طرف سے فکر مند نہ تھا۔ سردار جی تمام راستے جبّار احمد خاں کی تعریف و توصیف میں لگے رہے۔ میں اُن کی بھی سُنتا رہا اور یہ بھی سوچتا رہا کہ پہلی ہی ملاقات میں جبّار احمد خاں سے تعلقات استوار کرنے کی کوئی راہ نکال لوں۔

مغل طرز پر بنی ہوئی وہ کوٹھی اُس شخص کے ذوق کی آئینہ دار تھی جو وہاں رہتا تھا۔ مجھے جس نشست گاہ میں بٹھایا گیا، وہ جدید سامانِ آرائش کے باوجود قدامت و جدّت کا امتزاج معلوم ہوتی تھی۔ وہاں جس بات نے مجھے چونکایا، وہ گلابوں کی خوشبو تھی۔ سردار جی میرے سامنے ہی ایک آرام دہ صوفے میں دھنسے ہوئے تھے۔ سردار جی نے اپنی آمد کی خبر کرا دی تھی اور یہ بھی کہ میں اُن کے ساتھ ہوں۔ میں نے اُس خوشبو کے متعلق سردار جی سے استفسار کیا تو وہ بولے۔ ”ہندوستان میں ایک شہر ہے قنوج، وہاں کا عطر سارے ملک میں مشہور ہے۔ خان صاحب وہیں سے عطر منگواتے ہیں۔ ایک بار اُنھوں نے مجھ پر بھی عنایت کی تھی۔ ذرا سی شیشی تھی مگر پورے سال چل گئی۔ آپ کو بھی تو خوشبو پسند ہے۔ کبھی میں نے آپ کو بغیر خوشبو کے محسوس نہیں کیا۔ آپ کا اور خان صاحب کا ذوق اِس معاملے میں ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اُنھیں بھی گلاب کی خوشبو بہت پسند ہے۔“

اِس وضاحت کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اُس شخص نے زیادہ انتظار نہ کرایا اور جلد ہی نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ تمکنت و غرور اور تصنّع اُس کے بُشرے سے ظاہر تھا۔ اُس شخص کا مجھ پر کوئی خوشگوار تاثر نہ ہوا جو سفید کھدر کی شیروانی کے اندر اپنے بھاری جسم کو چھپائے ہوئے تھا۔ سر پہ اِستری کی ہوئی سفید ٹوپی تھی جو ماتھے پر سرک آئی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ اُس کی موٹی موٹی پنڈلیوں پہ منڈھا ہوا بُرا لگ رہا تھا۔ پیروں میں موزے اور کامدار جوتیاں تھیں۔ کپڑوں پر نام کو کہیں شکن نہ تھی، یوں جیسے اُسے کپڑے پہنا کر بعد میں اِستری کی گئی ہو۔ سُرخ و سفید گول طباق سے چہرے پر کلف لگی بھاری مونچھیں اور دائیں رخسار پر ناک کے قریب موٹا سا مَسّا تھا۔ بالوں پر یقیناً خضاب لگا تھا ورنہ اِس قدر سیاہ نظر نہ آتے۔ اُس کی عمر پچاس سے اوپر ہی ہو گی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا۔ وہ جیسے ہی نشست گاہ میں داخل ہوا، میں نے خوشبو کا ایک تیز جھونکا محسوس کیا اور پھر ایک ہی نظر میں اُس کا پوری طرح جائزہ لے لیا۔ سردار جی اُسے آتے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ تو میں نے بھی اُن کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ سردار جی نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا تو بہت کوفت ہوئی۔ اُس نے ذرا بھی گرمجوشی کا ثبوت نہ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی مُردے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو۔

”ہمیں اِنھوں نے بتایا تھا کہ تمھیں بڑی اچھی اُردو آتی ہے۔“ اُس نے اُسی صوفے پر دوسری جانب بیٹھتے ہوئے سردار جی کی طرف اشارہ کیا جس صوفے پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ”یقین نہیں آیا ہمیں! اِسی لیے ہم نے مصروفیت کے باوجود بلوا لیا کہ ہم بھی تو دیکھیں کتنی اُردو آتی ہے تمھیں!“

”میں نے صرف سیکھی ہے جناب! آپ کی تو زبان ہے۔“ میں نے انکسار سے کام لیا۔

”یہی تو ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم نے کتنا سیکھا ہے!“ وہ مسکرایا، یوں جیسے اُس کے سامنے واقعی کوئی طفلِ مکتب بیٹھا ہو۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ انٹرویو کو اُردو میں کیا کہیں گے؟“

”یہ لفظ تو اب خود اُردو ہی کا حصہ بن چکا ہے جناب! اُردو زبان میں قبولیت کی...“

”نہیں نہیں!“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”تم اِس طرح دامن نہیں بچا سکتے برخوردار! اِس لفظ کے رائج ہونے سے پہلے بھی تو اِس انگریزی لفظ کی بجائے کوئی لفظ بولا جاتا ہو گا، وہ بتاؤ!“

”ہر چند کہ میں یہ سوچ کر حاضر نہیں ہوا تھا، امتحان لیں گے آپ! مگر انٹرویو سے پہلے اُردو میں مصاحبہ! اِنھی معنوں میں رائج تھا!“

”بھئی کمال کر دیا تم نے برخوردار! ہم نے بڑے بڑوں کو اِس سوال پہ چت کر دیا مگر تم کامیاب رہے۔“ وہ یہ کہہ کر زور سے ہنس پڑا۔ معلوم نہیں اِس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ سردار جی نے بھی اُس کی ہنسی کا ساتھ دیا، مگر مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔ عجیب کینڈے کا آدمی تھا وہ! جو آنکھوں سے عیار اور صورت

سے بھی معلوم ہوتا تھا۔ ہنسی رکی تو اُس نے کہا۔ "اسی بات پر تم ہمارے مہمان ہو گئے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے، کبھی دلی گئے تھے اور وہاں... قاہرہ میں کہاں رہتے ہو تم؟ ہم ایک دفعہ گئے ہیں وہاں بھی، مگر یہ بہت عرصے کی بات ہے۔ تم شاید بچے ہو گے اُس وقت۔"

پھر وہ مجھ سے قاہرہ کے متعلق سوال جواب کرتا رہا۔ اُس کی ہر بات کی تان خودستائی پر ٹوٹتی تھی۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا اُسے بہت شوق تھا۔ مجھے اُس کا رویہ کھلا تو بہت مگر نظرانداز کر گیا۔ میں بھی سردار جی کی طرح اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے اُس کی انا کی مالش کرتا رہا۔ اس دوران میں شربت بھی پیا اور شربت کی بھی تعریف کی۔ اُس نے چاندنی چوک والے مکان کی چابیاں بھی منگوا کر میرے حوالے کر دیں۔ "ہم نے تو سوچا تھا کہ برخوردار کو دس منٹ سے زیادہ نہ دیں گے مگر آپ خود دیکھ لیں سردار جی کہ کیا وقت ہو گیا!" آخر میں وہ بولا۔ "ہمیں اس وقت ایک تقریب میں شریک ہونے ڈیفنس کالونی جانا ہے ورنہ ہم مزید بیٹھتے۔ نواب اقتدار احمد سے ہم نے وعدہ کر لیا ہے، اور تم جانو کہ ہم وعدے کے بہت پابند ہیں۔" پھر اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اچھا برخوردار! آتے جاتے رہنا، ہماری صحبت میں کچھ سیکھو گے ہی کہ یہی عمر سیکھنے کی ہوتی ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ ضرور حاضرِ خدمت ہوں گا۔" میں نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔

"ہاں جب آؤ، فون کر کے آنا۔ ہمارا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا! کب کہاں ہوں!" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ سردار جی بھی احتراماً اٹھے تو مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ پھر وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے، اچانک مسکرا کر بولا۔ "میرا کوئی ملازم تمہیں روز ہی گلاب پہنچائے گا۔"

"جی!" میں نے اظہارِ حیرت کیا۔

"میرے یہاں آنے سے قبل تم اِن سے اسی سلسلے میں استفسار کر رہے تھے نا!" اُس نے سردار جی کی طرف ہاتھ اٹھایا اور میں چونک اُٹھا۔

"جی ہاں! مجھے بھی یہ خوشبو پسند ہے۔" میں نے بے جھجک کہہ دیا۔

وہ اپنی عادت کے مطابق تعدد سے ہنس پڑا، اور پھر لمنفعلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے واپسی میں سردار جی بہت مگن تھے مگر میرا ذہن اُسی شخص میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ اپنے ملاقاتیوں کو بٹھا کر کسی طرح اُن کی باتیں سنتا ہے، یہ تو سامنے کی بات تھی، مگر کیوں؟ مجھے اس سوال نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ شخص بظاہر غبی نظر آتا ہے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے ملاقاتیوں کو حیرت میں ڈالنے کے لیے وہ یہ حرکت کرتا ہو یا کسی اور وجہ سے، لیکن مجھے اُس کی طرف سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ پہلی ملاقات کی حد تک مجھے کامیابی رہی۔ میں نے اُسے خاصا متاثر کیا اور وہ اس کا اظہار کرنے پر بھی مجبور ہو گیا، مگر یہ صرف ابتدا تھی۔ اُس سے مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں اُس کے "بڑ بولے پن" کو برداشت کر لوں تو وہ میرے کام آ سکتا ہے۔

میں نے اسی روز اشوکا ہوٹل چھوڑ دیا اور پرانی دلی کے مشہور علاقے چاندنی چوک میں سکونت اختیار کر لی۔ وہ حویلی نما مکان جبار احمد خاں کی ملکیت تھا۔ اُس خاندانی رئیس نے دوسرے ہی دن صبح اپنے دو ملازم بھی بھیج دیے، اُن میں سے ایک باورچی تھا اور دوسرا دیگر کام کاج کے لیے۔ یوں قیام کے ساتھ ساتھ طعام کا بندوبست بھی خود بہ خود ہو گیا۔ جبار احمد خاں ایسا خود پسند خاندانی رئیس بھلا یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ اُس کا کوئی مہمان خورد و نوش کی خاطر ہوٹلوں میں جائے! ملاقات میں یہ بات نہیں ہوئی تھی، اس لیے مجھے اُس شخص سے گفتگو کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اُس نے مجھے عطر بھی بھجوایا تھا، اُس کا شکریہ ادا نہ کرتا تو شاید وہ بُرا مانتا۔ وہاں فون تھا اور اپنا نمبر وہ مجھے گذشتہ روز دے چکا تھا۔ میں نے ناشتا کرتے ہی اُس کا نمبر ملایا۔ اُس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔

رابطہ ملنے پر دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنا نام بتایا اور جبار احمد خاں سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ معلوم ہوا کہ "موصوف" ابھی تک خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں کم از کم دو گھنٹے بعد فون کروں۔ دو گھنٹے ٹھہر کر میں نے پھر فون کیا۔ جواب میں اس مرتبہ بھی نسوانی آواز آئی۔

"میں ادریس عرض کر رہا ہوں۔ خان صاحب سے...."

"پورا نام بتائیں!"

"ادریس المہندس عرض...."

"کہاں سے عرض کر رہے ہو تم؟" اس بار طنزیہ لہجے میں کہا گیا اور آواز بھی کچھ آشنا سی لگی۔

"مجھے خان صاحب سے بات کرنی...."

"کیوں، ہم سے بھی بات کر لو گے تو کیا بگڑ جائے گا تمہارا!"

"ثمینہ!" میں نے اُسے پہچان لیا۔

"تمیز سے بات کرو! بیگم ثمینہ احمد کہو۔"

"ارے ہاں، میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ تم بیگم صاحبہ ہو!" میں نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ "مگر کس بدنصیب کی بیگم ہو تم؟ کیا خان صاحب کی....؟"

"بکو مت!" اُس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "اشوکا سے بھاگ کر یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں تلاش نہیں کر سکتی!"

"ہاں یاد آیا، یہ تمہارے محکمے، پولیس والے بڑے گھٹیا لوگ ہیں۔"

"وزیرِ داخلہ سے تعلقات کی شیخی تم نے خوب ماری! مگر مجھ پر تمہارا [illegible] نہیں چلے گا!"

"تو خبر ہو گئی تمہیں! مگر شاید دیر سے، ورنہ تم مزید کوئی احمقانہ قدم اُٹھاتیں۔"

"اگر تم گستاخی سے باز نہ آئے تو میں فون بند کر دوں گی اور پھر اس گستاخی کی سزا بھی تمہیں بھگتنی پڑے گی۔"

"اور اُس گستاخی کی سزا ابھی تو باقی ہے ابھی۔"

"وہ بھی ملے گی، ذرا چھری تلے دم لو۔"

"تم خان صاحب سے بات کراؤ گی یا اپنی ہی ہانکے جاؤ گی؟"

"تم یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"ضروری نہیں کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں۔"

"تو پھر تم خان صاحب سے بھی بات نہیں کر سکتے! میں رابطہ منقطع کر رہی ہوں۔"

"میں نے شاید تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ حد سے تجاوز اچھا نہیں ہوتا۔ تمہیں یہ کھیل مہنگا پڑے گا۔" میری آواز میں سختی آ گئی اور اسی کے ساتھ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

وہ عورت خواہ مخواہ "کھیل" ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں جبار احمد خاں سے اس عورت کا کیا تعلق ہے؟ میں سوچنے لگا۔ کوئی قریبی تعلق ہوگا ورنہ وہ جبار احمد خاں کی کوٹھی میں کیوں ہوتی! میں کچھ دیر اُسی عورت کے بارے میں سوچتا رہا، پھر دوبارہ جبار احمد خاں کا فون نمبر ملایا۔

"ہیلو!" اس مرتبہ مردانہ آواز آئی۔ "جبار احمد خاں۔"

"آپ کا خادم عرض کر رہا ہے، ادریس!" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں بولو برخوردار! ہمیں معلوم ہوا ہے، تم نے پہلے بھی ایک مرتبہ فون کیا تھا۔ کیا بات ہے؟"

"گستاخی معاف، دو مرتبہ۔"

"خیر! ہمارے علم میں یہی لایا گیا تھا۔ عطر میں پہنچ گئے ہو؟"

"جی ہاں، بڑی عنایت آپ کی، مگر اس زحمت کی کیا ضرورت تھی!"

"تم ہمارے مہمان ہو، جبار احمد خاں کے مہمان! یہ فخر کی بات ہے تمہارے لیے۔ ناشکری بُری بات ہے۔"

"میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہی فون کیا تھا۔ وہ عطر بھی مل گیا ہے، بڑی نوازش!"

"اچھا، چلو اور کچھ تو نہیں کہنا؟ ہم اس وقت ذرا جلدی میں تھے۔"

"بس آپ کا نیاز حاصل کرنا ہے۔ کب درِ دولت پر حاضر ہو جاؤں؟ آج کسی وقت؟"

"آج تو خیر ممکن ہی نہیں اور کل بھی ہم بہت مصروف ہیں، تم پرسوں فون کر کے دیکھ لینا۔"

"بہتر ہے!" میں بولا، پھر جلدی سے کہا۔ "کیا بیگم ثمینہ احمد چلی گئیں؟"

"چلی گئیں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہاں وہ آئی ہی کب تھیں!"

"ابھی کچھ دیر پہلے جب میں نے آپ کو فون کیا تھا تو انھوں نے ہی...."

"غلط لائن مل گئی ہوگی۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اچھا خدا حافظ!" پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جبار احمد خاں یقیناً جھوٹ بول رہا تھا اور یہ بات اُس کے لہجے سے بھی ظاہر ہو رہی تھی، مگر اس سے مجھے کم از کم ایک بات ضرور معلوم ہو گئی کہ جبار احمد خاں اُسے جانتا ہے اور یہ بھی کہ وہ جبار احمد خاں کی بیوی نہیں ہو سکتی۔ "یہاں وہ آئی ہی کب تھیں!" سے یہی ظاہر تھا۔

"ثمینہ احمد پر بھی لعنت بھیجو اور جبار احمد خاں پر بھی! تم گھر سے نکلو!" میں بڑبڑایا۔

کسی "نئے شکار" کی تلاش کے لیے اب باہر نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ ثمینہ احمد اور جبار احمد خاں کے چکر میں میرا خاصا وقت ضائع ہو چکا تھا۔ جبار احمد خاں نے دو دن کو تو یوں ہی ٹال دیا تھا اور تیسرے دن کی بھی کیا ضمانت، وہ ملتا یا نہیں! میں نے کچھ سوچ کر ملازم کو بلایا اور پھر اُس سے اُردو میں شائع ہونے والا کوئی اخبار لانے کے لیے کہا۔ ملازم، دلی ہی سے شائع ہونے والا ایک

روزنامہ "نئی دنیا" لے آیا۔ میں اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسی امید پر میں نے اخبار منگایا تھا۔ وہ خبر بیگم ثمینہ احمد کے متعلق تھی۔ خبر کی سرخی یہ تھی: "معذور طلبہ کے لیے بیگم ثمینہ احمد کا عطیہ۔" وہ عطیہ صرف پانچ سو روپے تھا۔ پانچ سو روپے میں نیک نامی کا وہ "اشتہار" مہنگا نہیں تھا۔ اس چند سطری خبر سے مجھے ثمینہ احمد کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا، ہاں ایک راہ ضرور سوجھ گئی۔ میں نے اُس اخبار کے دفتر فون کیا۔

"دفتر نئی دنیا" دوسری طرف سے ریسیور اُٹھائے جانے کے بعد آواز آئی۔

"آپ کو زحمت تو ہوگی محترم، مجھے بیگم ثمینہ احمد کا پتا چاہیے۔"

"بیگم صاحبہ نے ہمیں اس کے لیے منع کر رکھا ہے! ہم معذرت خواہ ہیں۔"

"دیکھیے میں آپ کے شہر میں اجنبی ہوں اور مجھے بیگم صاحبہ سے ضرور ملنا ہے۔"

"میں نے آپ سے عرض تو کیا کہ...!"

"بہتر ہے!" میں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ثمینہ احمد کا پتا اخبار سے نہیں مل سکے گا۔ میں نے ایک اور توقع پر دوبارہ اخبار اٹھا لیا اور اُس کا مطالعہ کرنے لگا۔

اُس دن اشوکا میں کوئی ایسی تقریب نہیں تھی جس میں شرکت میرے لیے سودمند ہوتی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اشوکا ہوٹل کے علاوہ دلی میں اور بھی تو بڑے ہوٹل ہیں۔ کیوں نہ اُدھر کا رُخ کیا جائے؟ یہ خیال مجھے کچھ غنیمت معلوم ہوا۔ اُسی دن شام کو جب میں گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تو ملازم نے ایک ایسی اطلاع دی کہ میں دنگ رہ گیا۔ ثمینہ احمد کا اچانک وہاں پہنچ جانا میرے لیے حیران کن ہی تھا۔ ملازم اُسے نشست گاہ میں بٹھا کر مجھے خبر دینے آیا تھا۔ میں نے اس سے کہو "میں آ رہا ہوں ابھی۔" میں نے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے کہا اور ملازم چلا گیا۔ پھر جب میں نشست گاہ میں پہنچا تو اُس نے خلافِ توقع مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ "تمھیں حیرت نہیں ہوئی اور یس کہ میں کیسے یہاں پہنچ گئی؟" وہ بولی۔

"نہیں!" میں نے سنجیدگی سے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟"

"ظاہر ہے کہ تم نے جبار احمد خاں سے میرا پتا معلوم کر لیا ہوگا۔ مجھے تمھاری یہاں آمد پر حیرت ضرور ہے کہ تمھیں اتنی جرأت..."

"جھگڑا نہیں۔" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں صلح کرنے آئی ہوں تم سے۔"

"پھر اس صلح کی شرائط بھی بیان کر دو!" میرے لہجے میں اب بھی چبھن تھی۔

"کوئی شرط نہیں! دوستی میں شرائط نہیں ہوتیں۔"

"دوستی!" میں ہنس دیا، پھر بولا۔ "ابھی میں نے تمھارا ایک اشتہار پڑھا تھا، ایک اخبار میں۔"

"اشتہار!" اُس نے حیرت سے پوچھا تو میں نے وہی بات دہرا دی جو اُس کے عطیے کی خبر پڑھ کر میرے ذہن میں آئی تھی۔

"تم خطرناک حد تک ذہین ہو۔" وہ ہنس پڑی، پھر کہنے لگی۔ "تم کہو تو آج فلم کا پروگرام بنا لیا جائے!" وہ اس طرح بولی جیسے میرے اُس کے درمیان کوئی تلخی پیدا ہی نہیں ہوئی ہو۔

"میرے نزدیک یہ وقت کا زیاں ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"وہ فلم دیکھ کر تمھارے وقت کا زیاں نہیں ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"تمھیں ہمارے ملک کی قدیم تہذیب و معاشرت سے آگاہی ہوگی، اگر تمھارے یہاں آنے کا مقصد واقعی سیاحت ہے تو..."

"کیوں شک ہے تمھیں کچھ؟"

"تمھارے لہجے میں پھر کڑواہٹ آنے لگی! میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی تھی۔ ابھی دیر نہیں ہوئی۔ شو کا وقت نہیں نکلا۔ فلم دیکھ کر کہیں گھومیں گے۔ آج رات دس بجے میں نے اپنے کچھ دوستوں کو پارٹی بھی دی ہے، ہوٹل امپیریل میں۔"

"کس تقریب میں دے رہی ہو پارٹی؟" میں نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میرا ایک دوست ہے جو امریکہ میں آباد ہو گیا ہے، وہ آیا ہوا ہے ان دنوں۔ یہیں سے گیا تھا، ہندوستانی ہے۔ بس ایک حماقت کی اُس نے کہ وہاں شادی بھی کر لی۔ اپنی امریکی بیوی اور بچوں کو دلی گھمانے لایا ہے۔" اُس نے تفصیل کے ساتھ میری بات کا جواب دیا۔

میں کچھ دیر چپ رہ کر بولا۔ "ٹھیک ہے مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اب تم ٹیڑھی نہیں چلو گی؟" یہ کہتے ہوئے میں اُس کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا۔

"اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں نہ آتی۔" اُس نے بے جھجک کہا۔ پھر بولی۔ "اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو فون کر لوں یہاں سے، ورنہ پھر ٹکٹ نہیں ملیں گے۔"

"تو تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں فون ہے!" میں مسکرایا۔

"ہاں! اور بھی بہت کچھ معلوم ہے لیکن بعد میں بتاؤں گی۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اُس نے میرے ساتھ اندر جا کر کسی سینما کے منیجر کو فون کیا اور دو نشستیں محفوظ کرا لیں۔ اُس وقت شام کے

پونے چھ بجنے والے تھے۔ میں کچھ دیر بعد ہی اُس کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ میرا ذہن اُس وقت کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ میں اُس عورت کو دوبارہ قریب آنے کا موقع نہ دیتا مگر ایک تو اُس نے خود ہی اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ غالباً مصلحتاً! دوم یہ کہ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ میں جتنی جلدی دلی کے اعلیٰ حلقوں میں متعارف ہو جاتا، میرے حق میں بہتر تھا۔

میں نے ہندوستان کے دارالحکومت دلی میں عموماً ایک ہی طرح کی کاریں ہر چھوٹے بڑے کے پاس دیکھیں۔ وہاں دیگر ممالک کی طرح عمدہ، آرام دہ اور لمبی لمبی کاریں نہیں تھیں۔ ثمینہ احمد کے پاس بھی ایمبیسڈر تھی۔ میں کار میں بیٹھ گیا اور اُس نے کار اسٹارٹ کر دی تو بولی۔ "تمھاری خاطر تیسری بار یہ فلم دیکھ رہی ہوں جو ہر اعتبار سے ہندوستانی فلمی صنعت کا شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ ایک بار کہانی

اور مکالموں کی وجہ سے دیکھی۔ دوسری بار ہندوستان کے عظیم اداکاروں کی اداکاری دیکھنے کے لیے اور اب تیسری مرتبہ تمھیں اپنی قدیم تہذیب و تاریخ سے متعارف کرانے کے لیے دیکھوں گی۔" راستے بھر ثمینہ احمد اُسی فلم کی باتیں کرتی رہی۔ میں اُس کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ راستوں، سڑکوں اور عمارتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ کار اجمیری گیٹ سے

آصف علی روڈ کی طرف مڑ گئی اور پھر وہاں سے نئی دلی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ منٹو روڈ پر منٹو برج سے گزرنے کے بعد کار کناٹ پلیس پہنچ گئی جس کا ذکر ثمینہ احمد پہلے بھی مجھ سے کر چکی تھی۔ میں نے نقشے میں دیکھا تھا کہ کناٹ پلیس کا علاقہ تین دائروں پر مشتمل ہے۔ پہلا دائرہ اور آخری دائرہ مکمل ہے مگر درمیان کا دائرہ مکمل نہیں۔ یہ

نیم دائرہ اندرا پیلس کہلاتا ہے۔ اسی پر لب سڑک وہ سینما تھا جہاں ثمینہ احمد نے اپنی کار کھڑی کی۔ میں نے سینما کا نام پڑھا۔ وہ ریگل سینما تھا۔ ثمینہ احمد مجھے لیے ہوئے سیدھی منیجر کے کمرے میں پہنچی۔ منیجر اُسے آتے دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے پرس کھول کر ٹکٹوں کی رقم ادا کی اور ٹکٹ لے کر باہر آ گئی۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ پھر

میں اور وہ باکس میں آ بیٹھے۔ اندر ٹھنڈک تھی۔ مجھے سکون محسوس ہوا۔ ابھی لائٹیں آف نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے ثمینہ احمد کو مخاطب کیا۔ "تم تو بہت تعریفیں کر رہی تھیں، اس فلم کی دیکھنے والے تو ہیں نہیں۔"

"ہیں تو سہی، مگر کم ہیں۔ کیونکہ یہ فلم نئی نہیں ہے، اور پھر اب تو اور ہی طرح کی فلمیں بننے لگی ہیں۔ ان فلموں کے عاشق تو ہم جیسے لوگ ہی رہ گئے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہال کی روشنیاں بجھ گئیں۔ اشتہاری فلمیں، خبرنامہ وغیرہ کے بعد فلم شروع ہوئی۔ فلم کے شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اُس کے ہاتھ کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کیا۔ تو آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا لیکن چند لمحوں بعد اُس نے پھر پیش دستی کی۔ "سکون سے بیٹھو!" میں نے نرمی سے کہا، اور پھر وہ انٹرول تک پُرسکون رہی۔

انٹرول میں اس سے باتھ روم جانے کے لیے کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بولی "تم ہو آؤ، آ جاؤ گے تو پھر کوئی مشروب منگاؤں گی۔"

میں بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں باتھ روم سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ امپیریل ہوٹل میں ثمینہ احمد نے اپنے دوستوں کو جو پارٹی دی ہے، اُن میں غیر ملکی بھی ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو میں اپنی ذہانت سے متاثر کر سکوں۔ تعلقات کا دائرہ جتنی جلدی وسیع ہوتا، میرے لیے بہتر تھا۔ مجھے دلی آئے چوتھا دن تھا مگر اب تک میں ابتدائی مرحلوں سے نہ گزر پایا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے دانستہ اپنی غیر معمولی قوتوں کو استعمال

نہیں کی تھا۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا ہنسی کھیل نہیں، کچھ ہی دن سے مجھے اِس کا احساس ہوا تھا۔

میں باتھ روم سے نکل کر یہی سب کچھ سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک پتلا دبلا دراز قد آدمی میری راہ میں حائل ہو گیا۔ اُس نے یوں ظاہر کیا جیسے بے دھیانی میں مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا ہو۔ میری جگہ شاید کوئی اور ہوتا تو وہ اپنا کام کر کے چلتا بنتا مگر میں نے فوراً ہی اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اُسی وقت دو تین آدمیوں نے مجھے اور گھیر لیا۔ "کیا بات ہے؟ کیا ہوا اُستاد؟" اُن میں سے ایک نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دراز قد آدمی سے کہا۔ اُس کی آواز مدھم ہی تھی۔ وہ سب اُسی دراز قد کے بھائی بند معلوم ہوتے تھے۔

دراز قد آدمی نے جھٹکا دے کر کلائی چھڑانا چاہی، مگر وہ میری گرفت تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی دو انگلیوں میں دبا ہوا کاغذ چھین لیا جسے وہ میری قمیص کی اوپری جیب میں رکھنے والا تھا۔ اِسی دوران میں انٹرول ختم ہو گیا۔ اُس دراز قد اور اُس کے ساتھیوں نے مجھ سے جھگڑا چاہا، مگر میں نے صورتِ حال کا اندازہ لگاتے ہی جلدی سے صاف اور واضح اردو میں کہا "غلط پھنس گئے تم لوگ! میں بھیس بدلے ہوئے ہوں۔ اگر تم نے کوئی ہنگامہ کیا تو بعد میں بہت پچھتانا پڑے گا!" میری توقع کے مطابق اُن کے چہرے تاریک ہو گئے۔ میں بغیر رکے مزید بولا "تم سب لوگ جاؤ، اِسے چھوڑ جاؤ۔" میں نے اُس دراز قد کی طرف اشارہ کیا جس کی کلائی اب بھی میری گرفت میں تھی۔ دراز قد کے ساتھی گویا اپنی جاں بخشی پر فوراً ہی سیڑھیوں کی طرف لپک گئے۔ میں نے دراز قد کو مخاطب کیا "مجھے خبر ہے کہ تم ایک معمولی جیب تراش ہو۔ گھبراؤ مت! میں جو پوچھوں فوراً بتا دو، تمھیں معاف کر دوں گا!"

"پوچھیے بے ناب!" وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

میں نے اُس پرچے پر ایک نظر ڈالی جس پر انگریزی میں چند سطریں لکھی تھیں، پھر جیب تراش سے سوال کیا "ظاہر ہے تمھیں اس کام کا اچھا معاوضہ ملا ہو گا۔ مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ تمھیں جس نے یہ پرچہ دیا تھا، اُس کا حلیہ اور اُس سے ہونے والی ساری گفتگو جلدی سے بیان کر دو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے وہ پرچا اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"جب آپ منیجر کے کمرے میں گئے تھے تو وہ میم ملی تھی۔ اِس کام کے دو سو روپے دیے اُن نے۔ میں مان گیا۔ پھر آپ باہر آئے تو اُن نے پرچا کرایا۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ میرے جی میں آئی روپے لے کر پھوٹ لوں پر کمبخت ہی غیرت آ گئی کہ اے بسیرے بے ایمانی مت کر، حلال کی کھا! میں اُدھر ہی لگا رہ گیا۔ وہ انٹرول سے پہلے پھر ٹپک پڑی۔ میں نے سوچا کہ بسیرے اچھا ہی ہوا کہ نا گیا ورنہ وہ گیر عورت بے ایمان سمجھتی۔ وہ میم مجھ سے انٹرول میں کام دکھلانے کا کہے گئی۔"

ابھی جیب تراش کا بیان ختم نہیں ہوا تھا کہ عقب سے مجھے ثمینہ احمد کی آواز سنائی دی "کیا ہوا ادریس؟"

"کچھ نہیں تم چلو، میں ابھی آتا ہوں!" میں نے مڑ کر اُس سے کہا، پھر پلٹ کر جیب تراش سے بولا "اب جلدی سے اُس میم کا حلیہ بتا دو!"

"بات کیا ہے آخر! معلوم تو ہو!" ثمینہ نہیں ٹلی، میں نے جیب تراش کی کلائی چھوڑ دی اور بولا "اچھا جاؤ، حلیہ میں خود معلوم کر لوں گا!" ضروری نہیں تھا کہ وہ جو حلیہ بیان کرتا، درست ہوتا اور وہ عورت میک اپ میں نہ ہوتی۔ "شکریا بے ناب!" اُس نے کہا اور ہوا ہو گیا۔ اُس وقت تک ثمینہ احمد میرے قریب پہنچ چکی تھی۔ "کون تھا وہ آدمی؟" اُس نے سوال کیا "فلم شروع بھی ہو گئی اور تم ابھی تک۔۔۔"

"چلو چلتے ہیں۔" میں آگے بڑھا "جیب تراش تھا ایک۔ ہاتھ کی صفائی دکھا رہا تھا کہ میں نے کلائی پکڑ لی اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ چھوڑ دیا میں نے۔"

"اِسی سے تو جرائم پروان چڑھتے ہیں۔" وہ میرے ساتھ ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے بولی "پولیس کے حوالے کرنا تھا اُسے۔"

ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کا وجود برداشت نہیں کرتی۔ میرے دل میں آیا کہہ دوں کہ ثمینہ احمد کبھی تم نے بھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا، مگر ٹال گیا اور خوش مزاجی سے

بولا "اِس چکر میں فلم کے کچھ اور سین نکل جاتے، اِس لیے میں نے اُس سے رقم واپس لے کر اُسے جانے ہی دیا۔ پہلے یہی ارادہ تھا، مگر تم آ گئیں تو ارادہ بدل دیا۔"

معلوم نہیں وہ میری بات سے مطمئن ہوئی یا نہیں، مگر پھر اِس سلسلے میں کچھ نہ بولی۔ گیٹ کیپر جو دور کھڑا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا، اُس نے بھی پوچھا کہ کیا بات تھی؟ مگر میں "کچھ نہیں" کہتا ہوا ثمینہ احمد کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔

اب فلم دیکھنے کی بجائے میرا ذہن اُس پرچے میں اُلجھا ہوا تھا جو مجھی کو لکھا گیا تھا "ثمینہ احمد خطرناک عورت ہے، اُس سے دور رہو! اگر تم نے ایسا کیا تو نتیجہ غلط بھی نکل سکتا ہے۔ اب تم اُس کے ساتھ نظر نہ آؤ ورنہ نتائج کی ذمہ داری تم پر ہو گی! تمھارے لیے اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ وہ جن نوجوانوں کو قریب آنے کا موقع دیتی ہے، بعد میں اُنھیں بلیک میل کرتی ہے۔" یہ تھی، وہ عبارت جو اُس پرچے میں لکھی تھی۔

مجھے اُس پرچے کی عبارت یاد آئی جو ثمینہ احمد کو لکھا گیا تھا۔ مجھے وہ پرچا پھینکنے والی، ثمینہ احمد کے دشمنوں ہی میں سے ہو سکتی ہے۔ "اگر تم نہ مانیں تو تم سے یہ نیا خوبصورت کھلونا بھی چھین لیا جائے گا۔" کچھ اسی طرح کی عبارت تھی وہ، جو ثمینہ احمد کے دشمنوں نے اُسے لکھی تھی۔ اُنھوں نے واضح طور پر ثمینہ احمد کو میرے بارے میں دھمکی دی تھی اور اب اُس دھمکی پر عمل درآمد کرنے کی غرض سے مجھے ڈرایا گیا تھا کہ ثمینہ احمد بلیک میلر ہے۔ اِسی کے ساتھ مجھے بھی دھمکی ملی تھی۔ یہ سارا معاملہ تو میں سمجھ گیا، مگر اس بات سے کھٹک گیا کہ ثمینہ احمد کے دشمن، ہندوستانی نہیں ہیں، یہ بات میرے نزدیک نظر انداز کیے جانے والی نہیں تھی۔ فلم کے دوران میں کئی بار ثمینہ احمد نے مجھے متوجہ کیا اور فلم نے بھی میری توجہ اپنی طرف کھینچی، مگر میں اِسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔

فلم ختم ہوئی اور میں، ثمینہ احمد کے ساتھ باہر نکلا تو میری نگاہیں کسی غیر ملکی عورت کی تلاش میں تھیں جو آس پاس موجود ہو۔ کار میں آ کر بیٹھنے اور پھر کار اسٹارٹ ہونے تک میری تلاش جاری رہی مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ میں نے کوشش کی کہ ثمینہ احمد کو اس کا احساس نہ ہو، لیکن وہ تیز عورت تھی۔ بولی "یہ تم اِدھر اُدھر کسے تلاش کر رہے ہو؟"

"کسی کو نہیں۔" میں نے برجستہ کہا "پہلی بار اِس طرف آیا ہوں تو جگہ ذہن میں رکھنے کے لیے نشانیاں دیکھ رہا ہوں۔" میرا جواب منطقی تھا اِس لیے وہ مطمئن ہو گئی۔

وہاں سے ہوٹل امپیریل زیادہ دور نہیں تھا جہاں ثمینہ احمد نے اپنے دوستوں کو پارٹی دی تھی۔ جو مختلف سڑکیں کناٹ پیلس سے آ کر ملتی ہیں، اُنھی میں سے ایک سڑک "ٹالسٹائی مارگ" سے ذرا آگے جا کر ہوٹل امپیریل تھا۔ ثمینہ احمد مجھے اُسی ہوٹل کے ایک ہال میں لے کر پہنچ گئی۔ میں نے یہ بات فوراً ہی محسوس کر لی کہ وہاں پہلے ہی سے اُس کے ملازمین موجود ہیں۔ وہ سب ثمینہ احمد کو دیکھتے ہی مستعد ہو گئے تھے۔ ابھی مہمانوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا، گویا پہلا مہمان میں ہی تھا۔ ثمینہ احمد مجھے ایک جگہ بٹھا کر اپنے ملازمین میں سے ایک کو الگ لے گئی اور غالباً اُسے کچھ ہدایات دینے لگی۔ وہ ملازم بار بار اقرار میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر ثمینہ احمد، ہال سے نکل کر کہیں چلی گئی۔ میں نے اُس ملازم کو نظر میں رکھا جسے ثمینہ احمد نے شاید کچھ ہدایات دی تھیں۔ وہ ملازم باری باری ہال میں جتنے ملازمین تھے، سبھی کے پاس گیا اور آہستہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا۔ ثمینہ احمد کی ہدایات غالباً مجھی سے متعلق تھیں۔

بے وقوف عورت خواہ مخواہ پُراسرار بننے کی کوشش کر رہی ہے، میں نے سوچا۔ اِس کے سوا اُس عورت نے اپنے ملازمین کو اور کیا ہدایات دی ہوں گی کہ میں کچھ پوچھ گچھ کروں تو ٹال دیا جائے۔ اُسے اگر معلوم ہوتا کہ میں اُس کا ذہن بھی پڑھ سکتا ہوں اور کن حیرت انگیز قوتوں کا مالک ہوں تو شاید وہ یہ بچکانہ حرکتیں نہ کرتی۔

ثمینہ احمد کو دوبارہ ہال میں آتے آتے دس بج گئے۔ وہ سیدھی اُسی طرف آئی جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور آتے ہی بولی "معاف کرنا ادریس، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ تم اکتائے تو نہیں؟"

"وقت تو ہو گیا مگر تمھارا کوئی مہمان اب تک نظر نہیں آیا۔" میں اُس کی بات کو نظر انداز کر کے بولا۔

"بس لوگ آتے ہی ہوں گے۔" اُس نے کہا "تم چاہو

تو یہیں بیٹھو اور چاہو تو میرے ساتھ دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔ مجھے بہر حال دروازے ہی پر...“

”میں یہیں بیٹھا ہوں، تم جاؤ۔“ مجھے اُس کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہو کر تماشا نہیں بننا تھا۔ وہ اپنی ساڑی سنبھالتی ہوئی دروازے کی طرف چلی گئی۔

ثمینہ احمد واقعی وقت کی پابند تھی اور غالباً اُس کے دوستوں کو بھی یہ خبر تھی۔ غالباً انھوں نے اسی لیے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ لوگ آتے رہے اور ثمینہ احمد اُن کا استقبال کرتی رہی۔ اُن میں ہندوستانی زیادہ تھے اور غیر ملکی کم۔ عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ میں اُن کا جائزہ لیتا رہا۔ میری توجہ کا مرکز زیادہ تر غیر ملکی عورتیں تھیں۔ اُن میں بھی صرف مغربی عورتیں! اُن کی تعداد اب تک چھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ میں ایک طرف بیٹھا ہوا زیادہ دیر خاموشی سے اُن کا تجزیہ نہ کر سکا۔ ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ میں نے ہال کے دروازے سے ایک ایسے شخص کو اندر آتے دیکھا جو میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ دہلی کا بڑ بولا خاندانی رئیس جبار احمد خاں تھا جو دلّی میں میرا میزبان بن گیا تھا۔ اُسی کے ساتھ ساتھ ایک اور بارعب شخص نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں خوبصورت چھڑی تھی۔ وہ ایک خاص انداز میں وہ چھڑی زمین پر ٹیک کر اُٹھاتا ہوا چل رہا تھا۔ چھریرا جسم تھا اور عمر میں جبار احمد خاں ہی کے برابر لگتا تھا۔ چہرے پہ داڑھی مونچھ اور آنکھوں پہ تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ سر پہ سفید و سیاہ بال تھے اور ٹوپی نہیں تھی۔ داڑھی تقریباً سفید تھی۔ وہ سفید سلک کی شیروانی اور تنگ مہری کا سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ جبار احمد خاں اُسی کے ساتھ ہنستا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کچھ دیر جبار احمد خاں کی نظر مجھ پر نہ پڑے، مگر ایسا نہ ہوا۔ میں ابھی مہمانوں کا جائزہ لینے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ جبار احمد خاں نے مجھے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اور پھر سیدھا اُسی طرف چلا آیا۔ جبار احمد خاں بالکل ہی قریب آ گیا تو مجبوراً مجھے اُس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ”ارے آپ خاں صاحب! آداب!“ یہ کہتے ہوئے میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”جیتے رہو برخوردار!“ اُس نے کہا۔ ”چلو ہم بھی یہیں بیٹھے جاتے ہیں۔ آئیے نواب صاحب! یہاں تشریف رکھیے!“ جبار احمد خاں نے خود کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اپنے ساتھ آنے والے شخص کو کرسی پر بیٹھنے کا موقع دیا اور میرے نزدیک یہ اُس شخص کی اہمیت کا ثبوت تھا ورنہ جبار احمد خاں ایسا خود پسند کب کسی کو خاطر میں لانے والا تھا۔ جبار احمد خاں نے اُس شخص سے میرا تعارف کرایا۔ ”ان سے ملو ادریس میاں! یہ ہمارے یارِ عزیز و محترم نواب افتخار احمد ہیں۔“ پھر وہ نواب افتخار احمد سے بولا۔ ”قبلہ! اس بچے کا نام ادریس المہندس ہے۔ قاہرہ سے یہاں کی سیر کرنے آیا ہے۔ عجب خوبیوں کا مالک ہے۔ اور تو اور یہ اُردو زبان سمجھنے کے معاملے میں ہمارے امتحان پہ بھی پورا اُترا!“

”مگر خاں صاحب، اردو زبان آتے آتے ہی آتی ہے۔“ نواب نے میرے آداب کا جواب دینے کے بعد جبار احمد خاں سے کہا۔

”یہی تو ہمیں حیرت ہوئی۔“ جبار احمد خاں بولا، پھر چونک کر کہا۔ ”اور ہاں میاں حیرت تو ہمیں تم کو یہاں دیکھ کر بھی ہوئی۔ ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ تم مل جاؤ گے یہاں۔ تم تو ہم سے کہہ رہے تھے۔ برخوردار کہ اِس شہر میں اجنبی ہو؟“

”میں نے غلط عرض نہیں کیا تھا۔ جس دن آپ سے ملاقات ہوئی، اُس سے ایک دن قبل ہی بیگم صاحبہ مجھے اشوکا ہوٹل میں ملی تھیں۔ وہ ملاقات سرسری سی تھی اس لیے...“

”ٹھیک ہے برخوردار! ہمیں کوئی اعتراض نہیں! اِس پر ہم تو تمھیں یہاں دیکھ کر خوش ہوئے۔“ جبار احمد خاں میری بات کاٹ کر بولا۔ ”تم فون پر بیگم صاحبہ کا شاید اسی لیے ذکر کر رہے تھے!“

”جی ہاں۔“ میں نے نواب افتخار احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تاریک شیشوں کی عینک کے باوجود میں نے یہ بات محسوس کر لی۔

”ہم نے تمھیں جو خط بھجوایا تھا، وہ تم غالباً لگا آئے ہو؟“ جبار احمد خاں کا لہجہ تصدیق طلب اور احسان جتانے والا تھا۔

”آپ نے صحیح قیاس کیا۔“ میں بولا۔

”بھئی سبحان اللہ!“ نواب افتخار بھی بول اُٹھا۔

”بڑی نکھری چھلی زبان ہے تمھاری! ذرا جو اجنبیت ہو!“

”عزت افزائی ہے، آپ بزرگوں کی، ورنہ کسی اہلِ زبان کے حضور میں اردو بولتے ہوئے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے!“

ان دونوں سے گفتگو کے دوران میں مختلف مہمان آتے رہے۔ اُن میں سے کچھ کا تعارف بھی جبار احمد خاں نے کرایا۔ وہ تقریب جس شخص کے اعزاز میں تھی اور جسے ثمینہ احمد نے اپنا دوست بتایا تھا۔ مجھے اُس سے اور اُس کی نوجوان امریکی بیوی سے بھی ملوایا گیا۔ وہ شخص ہندو تھا اور ادھیڑ عمری میں نوجوان امریکی بیوی کو پہلو میں بٹھا کر بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ جبار احمد خاں اور نواب افتخار احمد میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اور میں خود لوگوں میں گھلنا ملنا اور ان سے گفتگو کرنے کا خواہش مند تھا۔ کم از کم ثمینہ احمد کے بارے میں تو۔ مجھے کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جاتا کہ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ پھر جب محفلِ ناؤ و نوش شروع ہوئی تو مجھے موقع مل گیا۔ میں اپنا ساغر اُٹھائے تیزی سے ایک طرف بڑھا اور ایک شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ غیر ملکی تھا۔ ”ایکسکیوز می!“ اُس نے معذرت کی اور آگے بڑھ گیا۔ اُس کا لہجہ امریکی تھا۔

ذرا سی شراب چھلک کر میرے کپڑوں پر گر گئی۔ ایک ملازم یہ دیکھ کر میری طرف لپکا۔ اُس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی اور پلیٹ میں نیپ کن تھا۔ میں نے پلیٹ میں سے جیسے ہی نیپ کن اُٹھایا، چونک اُٹھا۔ سفید نیپ کن کے نیچے چھوٹا سا ایک پرچا رکھا تھا۔ میں نے ملازم کی طرف دیکھا۔ وہ نظر جھکائے کسی مجسّمے کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ پرچا بھی پلیٹ سے اُٹھا لیا اور پھر ایک قریبی میز پہ اپنا گلاس رکھ کر نیپ کن سے پینٹ صاف کرنے لگا۔ وہ پرچا تہ کیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے کھول کر پڑھنے کی بجائے پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

”سنو!“ میں نے نیپ کن پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے ملازم کو مخاطب کیا۔

”یس سر!“ وہ مؤدب نظر آنے لگا۔

”تم بیگم صاحبہ کے ملازم ہو؟“ میری آواز دھیمی تھی کیونکہ آس پاس اور لوگ بھی تھے۔

”نو سر!“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرا تعلق اس ہوٹل سے ہے۔“

جب کچھ کرارے نوٹ آہستگی سے اُس کی جیب میں پہنچ گئے تو وہ کھل گیا۔ وہ امریکی جو مجھ سے ٹکرایا تھا، اُسی نے بیرے کو وہ پلیٹ خود ایک میز سے اُٹھا کر دی تھی۔ بیرا اِس سے بے خبر تھا کہ نیپ کن کے نیچے کچھ اور بھی رکھا ہے۔ پھر میں نے تیزی سے پورے ہال کا چکر لگایا، مگر وہ امریکی مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ ابھی تک میں نے وہ پرچا نہیں پڑھا تھا جو میری پینٹ کی جیب میں رکھا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سب اپنی اپنی دُھن میں تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا، کوئی قہقہے لگا رہا تھا اور کوئی نوجوان جوڑا ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ثمینہ احمد، جبار احمد خاں اور نواب افتخار احمد کے ساتھ نظر آئی۔ میں نے ایک گوشے میں جا کر جیب سے وہ پرچا نکالا اور تہ کھول کر اُسے پڑھنے لگا۔ وہ عبارت بھی انگریزی میں تھی۔ خط اور طرزِ تحریر بالکل اُسی پرچے ایسا تھا جو مجھے پہلے ملا تھا۔ پرچے میں لکھا تھا:

”تم ہماری ہدایت کے باوجود ثمینہ احمد کے ساتھ ساتھ یہاں تک لگے چلے آئے۔ اب اس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ!“ وہ دو سطری عبارت پڑھ کر میں نے سوچا کہ شاید کھیل شروع ہو گیا ہے۔

ثمینہ احمد کے دشمن، امریکی تھے، یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ ہندوستان میں ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس واقعے کے بعد ثمینہ احمد میری نظر میں اور بھی اہم ہو گئی۔ انھوں نے ثمینہ احمد کو جو دھمکی دی تھی، اس کے پیشِ نظر وہ مجھے ثمینہ احمد کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی سبب مجھے اب نتیجہ بھگتنے کی دھمکی ملی تھی۔ وہ پرچا دوبارہ اپنی پینٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے میرے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ مجھے نتیجہ بھگتنے کی تو کوئی پروا نہ تھی، ہاں یہ خیال ضرور تھا کہ اب ثمینہ احمد کی زبان کھلوانا ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ ثمینہ احمد کے اور میرے دشمن ایک ہی ہوں، یا پھر مجھے اس طرح اپنے دشمنوں کا کوئی سراغ مل جائے۔ اس عورت کی زبان کھلوانے کے لیے میرے پاس کئی پتے موجود تھے، بس ان پتوں کا بروقت استعمال ضروری تھا۔

پارٹی تقریباً بارہ بجے ختم ہوئی۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ ثمینہ احمد مجھے اشارہ کر چکی تھی کہ میں ابھی رُکا رہوں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں کوئی بہانہ کر کے رخصت ہو جاتا مگر اس وقت میری تو خود مرضی تھی کہ وہ ساتھ چلے۔ رخصت ہونے والے آخری مہمان، جبار احمد خاں اور نواب افتخار احمد تھے۔ "تم ابھی نہیں گئے میاں؟" نواب افتخار احمد نے جاتے جاتے مجھ سے کہا۔

"انھیں اس شہر میں آئے ابھی دو چار دن ہوئے ہیں۔" میری بجائے ثمینہ احمد مسکرا کر بولی۔ "یہ اجنبی ہیں، راستوں کا علم نہیں، اس لیے میں خود انھیں کار میں چاندنی چوک تک چھوڑنے جاؤں گی۔"

"اچھا اچھا!" نواب افتخار احمد سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"برخوردار! افسوس ہم تمھارے فون کے منتظر ہی رہ گئے۔" جبار احمد خاں نے چلتے چلتے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"جی بجا فرمایا! میں ضرور فون کروں گا۔"

میرا جواب سن کر جبار احمد خاں بھی نواب افتخار احمد کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ثمینہ احمد مجھے اپنے ساتھ لیے اس ہال سے نکل رہی تھی۔ ثمینہ احمد کے دشمنوں کی دھمکی میرے ذہن میں تھی، اس لیے پوری طرح چوکنا اور محتاط تھا۔ آدمی بے خبر ہو تو کمزور دشمن بھی غالب آ جاتا ہے۔

ثمینہ احمد نے اپنی گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں قدرے نیم تاریکی تھی۔ اس نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "کہو کیسی رہی پارٹی؟"

"ٹھیک تھی۔" میں نے جواب دیتے ہوئے اطراف میں نگاہ ڈالی۔

"تم جانے کیوں الگ الگ سے رہے! میں..." ثمینہ احمد کا جملہ پورا نہیں ہو سکا کہ عقب سے ہلکی سی سیٹی سنائی دی۔ "یہ سیٹی سنی تم نے؟"

"ہاں!" یہ کہہ کر میں پلٹا۔ اسی وقت دائیں اور بائیں جانب سے بھی سیٹیاں بجیں۔ پھر وہ چاروں سامنے آ گئے جو غالباً پہلے سے اِدھر اُدھر چھپے ہوئے تھے۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے اور وہ صورت ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ثمینہ احمد کو مخاطب کیا۔ "آپ جائیں جی، آپ سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ یہ ہمارا اور اس کا معاملہ ہے۔"

"تمھیں معلوم ہے میں کون ہوں!" ثمینہ احمد پر یقیناً نشہ غالب تھا ورنہ وہ کھلے ہوئے چاقو دیکھ کر اُن لوگوں کو جیل میں سڑوانے کی دھمکی نہ دیتی۔

میرے لیے اتنا ہی موقع غنیمت تھا۔ میں نے ایک شخص

پر جست لگا دی۔ وہ سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ میں نے اس کا چاقو چھین لیا۔ مجھے اُن "وہمٹ بھینسوں" پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے اسی لیے اُس شخص کی کمر پر ہلکی سی لات جمائی جو گر کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چیخ کر ڈھیر ہو گیا۔ یہ وہی تھا جس کا چاقو اب میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر شاید ثمینہ احمد کے حواس گم ہو گئے تھے۔ وہی کیا جو بھی دیکھتا گنگ رہ جاتا۔ پلک جھپکتے جیسے سب کچھ ہو گیا تھا حالانکہ کسی کے ہاتھ سے چاقو چھین لینا آسان نہیں ہوتا، جب کہ وہ شخص بدمعاش بھی ہو!

"ہری اپ سنبھال اسے!" اُن میں جو ادھیڑ عمر تھا اپنے کسی ساتھی سے بولا۔

"ابھی لو اُستاد!" ادھیڑ عمر شخص کے نوجوان ساتھی نے جواب دیا۔ میں نے اُن تینوں کو جھکتے دیکھا۔ وہ مجھے اپنے گھیرے میں لینے کی سعی کر رہے تھے۔ وہ جھکے ہوئے مجھ پر حملے کے لیے قدم قدم بڑھنے لگے۔

"اور بس!" ثمینہ احمد کو جیسے ہوش آ گیا اور وہ خطرے میں سمجھ کر چیخ اٹھی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

"گھبراؤ مت! خاموشی سے تماشا دیکھتی رہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"نہیں!" اس نے تیزی سے کہا۔ "میں ابھی پولیس کو..."

"بات نہ بڑھاؤ بیگم صاحب!" ادھیڑ عمر زور سے بولا۔ "اچھے لوگ نہیں، ہم آپ سے نمٹنا نہیں چاہتے۔" یہ کہتے ہوئے بھی اس کی نگاہ مجھی پر تھی۔

میں اسے اُس نوجوان کی حماقت ہی کہوں گا جس نے جھوٹی بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ وہ تیزی سے مجھ پر جھپٹا مگر اسے حملہ کرنے یا چاقو چلانے کی حسرت ہی رہ گئی۔ میری لات اس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑی اور وہ اُلٹ گیا۔ بقیہ دو نے اپنی دانست میں مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں جھکائی دے کر ان کے درمیان سے نکل گیا اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

پھر میں نے اس کھیل کو زیادہ طویل نہیں ہونے دیا۔ چاقو ہاتھ سے پھینک کر میں نے انھیں گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

اُن میں سے کوئی بھی مجھے چھونے تک میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دو تو پہلے ہی زخمی ہو چکے تھے، بقیہ دو کو بھی زمین چاٹنے میں دیر نہ لگی۔ اُن میں اُٹھ کر بھاگنے کی ہمت بھی نہ رہی۔ "میں اسی طرح ٹھوکریں مار مار کر تمھاری کھوپڑیوں کا گودا بہا دوں گا ورنہ بتا دو کہ تمھیں کس نے میرے پیچھے لگایا تھا؟" میں نے ایک موہوم سی امید پر سوال کیا، مگر ناکامی ہوئی۔ وہ کرائے کے ٹٹو ہی ثابت ہوئے جیسا کہ میرا خیال تھا۔ وہ ایک غیر ملکی عورت کی نشاندہی کرنے کے سوا کچھ نہ بتا سکے۔ وہ عورت اکثر اُن سے کام لیتی رہتی تھی۔ عورت کے نام پتے سے وہ بے خبر تھے۔ ثمینہ احمد مجھے ان لوگوں پر بھاری دیکھ کر شیر ہو گئی لیکن میں نے اُسے حد سے نہ گزرنے دیا۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ "یہ غریب پہلے ہی میرے ہاتھوں بہت پٹ چکے ہیں، اب اگر تم نے انھیں پولیس سے بھی پٹوایا تو یہ زیادتی ہو گی۔ یہ تو دھندا ہے اِن کا!"

بالآخر اُسے میری بات ماننا ہی پڑی۔ اُن میں سے ایک کی کمر پر ضرب پڑی تھی اور وہ سیدھا کھڑا ہونے کے باوجود کراہ رہا تھا۔ دوسرے کی ٹھوڑی سے خون بہہ رہا تھا۔ تیسرے کی کلائی زخمی تھی اور چوتھے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اپنے چاقو اُٹھاؤ اور جاؤ!" میں نے اُن سے کہا۔

اُنھوں نے وہاں سے اپنے چاقو بھی نہیں اُٹھائے اور گرتے پڑتے بھاگ لیے۔ جب سیر کو کوئی سوا سیر مل جاتا ہے تو یہی ہوتا ہے۔ پیش آنے والے واقعے نے ثمینہ احمد کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ وہ اب چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ اُس نے کار اسٹارٹ کرنے اور پھر تیز رفتاری دکھانے میں خاصی عجلت کی۔ "خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع ہو گیا!" اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "معلوم نہیں کون عورت ہے وہ!" پھر وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا تمھاری بھی کسی سے دشمنی چل رہی ہے؟ مگر تم تو یہاں آئے ابھی... ہاں یہ ہو سکتا ہے پرانی دشمنی ہو اور تمھارے دشمن بھی تمھارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آ گئے ہوں۔ یہ بتاؤ یہی بات!" اُس نے تصدیق چاہی۔

"ٹھیک ہی کہتی ہو تم!" میں اُس کی چالاکی پر مسکرایا۔ یقیناً وہ مجھے اپنے خیال میں بے وقوف بنا رہی تھی، وہ بہرحال اتنی سیدھی اور بھولی نہیں تھی کہ معاملے کی تہ تک نہ پہنچ جاتی۔ وہ مجھے مزید گھیسنے لگی تو میں بولا "تم ساتھ ہی چل رہی ہو نا؟"

"ہاں کیوں؟" اُس نے حیرت سے کہا۔
"ظاہر ہے کہ کچھ دیر بیٹھو گی بھی!"
"ہاں اگر تم نے بٹھایا۔" اُس کے چہرے سے مسرت کا اظہار ہونے لگا۔
"تو پھر گھر ہی چل کر آرام سے باتیں ہوں گی۔ کچھ میں تمھیں بتاؤں گا، کچھ تم بتانا!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"میں!... میں کیا بتاؤں گی تمھیں؟"
"جو بھی چاہو اور جس قدر چاہو" میں نے بے جھجک کہہ دیا "میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا۔"
"کوئی ایسی بات ہی نہیں جو تمھیں بتانا ضروری ہو۔" اُس نے کہا "میں دوستی میں ذاتیات کو زیرِ بحث لانا یوں بھی پسند نہیں کرتی۔ جس کی حد تک جو بات ہے، اُسی کی حد تک رہنی چاہیے۔ یوں تعلقات جلد نہیں بگڑتے۔"
"حد" میں ہنسا "یہ تم نے اچھی بات کہی۔ یہی تو میں کہتا

اور چاہتا ہوں۔"
"تو کیا میں تم سے امید کروں کہ ذاتی قسم کے سوالات سے آئندہ گریز کرو گے؟" وہ پُر امید لہجے میں بولی "میں نے تمھارے تجسس کو محسوس کر لیا ہے۔ لیکن کیا صرف اتنا جان لینا کافی نہیں کہ ہم دونوں، ایک دوسرے کے دوست ہیں اور یہ بھی کہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں!"
"دوستوں کے بارے میں بھی تو جاننے کا تجسس ہوتا ہے۔" میں بولا "جتنا ایک دوسرے کو جان لیا جائے گا دوستی اتنی ہی مضبوط ہو گی۔"
"میں اس کی قائل نہیں۔" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میرا اپنا خیال ہے۔ دوستوں میں اختلافی مسائل پر بحث نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے قربت کی بجائے آپس میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔" پھر وہ ایک دم چونک کر بولی "ارے ہاں، تمھیں

مبارکباد دینا تو بھول ہی گئی!"
"کیسی مبارکباد؟"
"اُن چاروں مسلح غنڈوں پر فتح پانے کی مبارکباد!" اُس نے جواب دیا "تم نے واقعی کمال کر دیا! اگر میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ نہ دیکھا ہوتا تو شاید ہی مجھے یقین آتا۔"

میں سمجھ گیا کہ اُس نے دانستہ بات کا رُخ بدلا ہے۔ اُس سے راستے میں جو گفتگو ہو رہی تھی، لاحاصل ہی تھی۔ گھر پہنچ کر ہی میں اُس کے کَس بل نکالنا چاہتا تھا اس لیے راستے میں زیادہ تر خاموش ہی رہا۔

میرے لیے یہ سامنے کی بات تھی کہ مجھ پر حملہ کس نے کرایا ہو گا اور کیوں۔ مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ مرنا بُھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور پھر ہوٹل کی عمارت سے نکلتے ہی میں نے اس دھمکی کا عملی مظاہرہ دیکھا تھا۔ اُن غنڈوں نے اپنی شکست قبول کرنے کے بعد میرے استفسار پر جو کہانی سُنائی، اُس کا صرف ایک ہی پہلو میری نگاہ میں اہم تھا۔ وہ شخصیت کس کی تھی جس نے مجھ پر حملہ کرایا۔ اِس سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی کہ سودا کیا ہوا تھا۔ وہ غنڈے مجھ سے بچنے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتے تھے کہ میرے قتل کا سودا نہیں ہوا تھا۔ بہ ہر حال اُنھوں نے مجھے یہی بتایا کہ وہ دو چار چاقو مار کر اور محض زخمی کر کے چھوڑ دیتے۔ وہ عورت بہ وقتِ ضرورت خود ہی اُن غنڈوں سے رابطہ قائم کر لیتی تھی۔ غنڈوں کو اُس عورت کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ آج بھی تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل

وہ خود آئی تھی۔ غنڈوں کے ادھیڑ عمر سرغنہ کو ساتھ لے کر وہ ہوٹل امپیریل آئی اور میری شناخت کرا کے چلی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ غنڈے مجھے کیسے پہچانتے؟ خود الگ رہ کر مقامی غنڈوں کو استعمال کرنے کا طریقۂ کار مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا ذہن ایک راہ پر لگ تو رہا تھا لیکن ابھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا قبل از وقت ہوتا۔ وہ عورت اکیلی نہیں، کچھ اور لوگ بھی اُس کے ساتھ ہیں، اِس کا اندازہ بھی مجھے ہو چکا تھا۔ ہوٹل امپیریل میں مجھ سے ٹکرانے والا اُسی کا ساتھی تھا۔ ثمینہ احمد اور اُس غیر ملکی عورت کے درمیان اگر جھگڑے کی بنیاد معلوم ہو جاتی تو شاید میں کسی نتیجے تک پہنچ سکتا۔ میں نے اِسی لیے ثمینہ احمد کو گوارا کر لیا تھا ورنہ ٹیکسی کر کے چاندنی چوک پہنچ جاتا۔ جس مکان میں میرا قیام تھا، وہاں تک پہنچنا میرے لیے آسان ہوتا۔ وہ مکان، چاندنی چوک کی بڑی سڑک سے زیادہ دور نہ تھا۔ سنہری مسجد لبِ سڑک تھی اور اُسی کے عقب میں وہ مکان تھا۔ گوردوارہ، کوتوالی اور پھر سنہری مسجد ایسی نشانیاں تھیں کہ اُنھیں بھولنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ثمینہ احمد مجھے جس راستے سے لے گئی تھی، اُسی سے واپس چاندنی چوک پہنچی۔ اپنی کار کا دروازہ مقفل کر کے وہ میرے پیچھے آ گئی۔ اُس وقت تک میں گھر کا دروازہ کھلوا چکا تھا۔ دونوں ملازم ابھی تک جاگ رہے تھے۔

"تم لوگ سوئے نہیں ابھی؟" اندر قدم رکھتے ہوئے اُس ملازم سے کہا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ دوسرا سامنے ہی صحن میں کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے ایک اور عجیب بات بتائی۔ وہ دونوں ابھی تک بھوکے تھے۔ وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اُس خاندانی رئیس جبار احمد خان کے گھرانے کی روایت تھی۔ ملازم غریب اِس روایت پر چلنے کے لیے مجبور تھے کہ جب تک اہلِ خانہ طعام وغیرہ سے فارغ نہ ہوں، کوئی ملازم نوالہ نہ توڑے۔ میں اُسی رئیس کا مہمان تھا اس لیے میرے ساتھ بھی یہ روایت برقرار تھی۔

"میں کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں، جب تمھیں بھوک لگا کرے کھا لیا کرو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔" یہ کہتا ہوا میں، ثمینہ احمد کے ساتھ نشست گاہ کی طرف بڑھا۔
"ادھر نہیں اُدھر چلو۔" ثمینہ احمد نے اُس کمرے کی طرف اشارہ کیا جو بہ طور خواب گاہ میرے استعمال میں تھا۔
"کیوں، وہاں کیا بات ہے؟" میں نے انجان بن کر سوال کیا۔
"دراصل مجھے ایک ضروری فون بھی کرنا ہے، اور اُس کمرے میں فون ہے نہیں۔" اُس نے بہانہ کیا "پھر تم... تمھیں لباس بھی تو تبدیل کرنا ہو گا۔"
"میری فکر نہ کرو، اپنی کہو۔" میں مُسکرا کر بولا، اور پھر اُسے خواب گاہ میں لے آیا "تم فون کر لو، میں ابھی لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

وہ میری مسہری پر کہنی کے بل نیم دراز ہو گئی، اور فون وہیں اُٹھا لیا۔ میں اٹیچی سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم جانے کے لیے صحن میں آ گیا۔ باتھ روم وہیں ایک طرف تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں واپس کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ اور لپ اسٹک وغیرہ نکال رہی تھی۔ مجھے شاید احساس تھا کہ موسمِ بہار رخصت ہو رہا ہے اور خزاں کی آمد آمد ہے۔ میں اُس موڑھے پر بیٹھ گیا جو مسہری سے کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔
"تم وہاں دور کیوں بیٹھ گئے؟" وہ آئینے میں دیکھتی ہوئی، آئی بروپنسل سے اپنی بھوؤں کو درست کرتے ہوئے بولی۔

"لو قریب آ جاتا ہوں!" میں نے اُٹھ کر موڑھا گھسیٹ لیا۔ "پہلے تم اپنے ہتھیاروں سے لیس تو ہو جاؤ۔"
وہ مسکرائی "تم بہت کھری باتیں کرتے ہو۔ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔"
"لیکن میں ایسے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں جو اندر کچھ اور باہر کچھ ہوں؟"
"یعنی؟" اُس نے لپ اسٹک لگاتے ہوئے نظر اُٹھائی۔
"دیکھو ثمینہ، اِس فضا میں تمھارے اور میرے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی! اور نہ ہمارے درمیان اعتماد قائم

ہو سکتا ہے؟"

"کس فضا میں؟" اُس نے لپ اسٹک لگا کر آئینے میں ہونٹوں کا جائزہ لیا۔

"نہ تم اتنی بھولی ہو، نہ میں اتنا سیدھا! تمھیں بہ خوبی یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ ہم دونوں شاید ایک دوسرے کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ سنو، مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمھاری ہر ممکن مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا ثبوت بھی دے سکتا ہوں تمھیں! اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم کھل جاؤ۔"

"تم یہ کیا باتیں لے بیٹھے ادریس!" وہ میک اپ کا سامان پرس میں رکھنے لگی۔ "کیسی مدد اور کس سلسلے میں؟"

"تمھارے اور اُس غیر ملکی عورت کے درمیان کیا دشمنی ہے؟" میں نے براہِ راست سوال کیا۔

"ارے وہ!" ثمینہ ہنس پڑی۔ "وہ پاگل ہے وہ تو! آج تک میں خود نہیں سمجھ سکی کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے!"

"اور تم اُسے جانتیں بھی نہیں کہ وہ کون ہے؟"

"ظاہر سی بات ہے! مجھے کیا خبر کون ہے وہ! مگر تم... تم اُس کا ذکر اس وقت کیوں...؟"

"تمھیں خبر ہے کہ وہ عورت کیا سمجھتی ہے تمھیں؟"

"کیا؟"

"بلیک میلر!"

"سمجھنے دو، اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے لیکن تم... تم... تمھیں کیسے معلوم کہ وہ مجھے کیا سمجھتی ہے؟"

"ایسے!" میں نے پہلا پرچا پھینکا۔ یہ وہ پرچا تھا جو مجھے ثمینہ احمد کے دشمنوں نے ایک جیب تراش کے ذریعے بھجوایا تھا۔ میں نے وہ پرچا اپنی جیب سے نکال کر اُسے تھما دیا تھا اور اب بغور اُس کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا۔

"یہ... یہ پرچا تمھیں کب... کب اور کہاں ملا؟" وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی نظر آنے لگی۔

میں نے اُس سے کچھ نہیں چھپایا۔

اُس نے میری بات سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی۔ "یقیناً تمھیں اِس پرچے میں لکھی ہوئی بکواس سے اتفاق نہیں ہوگا اسی لیے تم پارٹی میں میرے ساتھ رہے!"

"ہاں!" میں بولا۔ "اور پارٹی کے دوران میں مجھے پھر ایک پرچا ملا جس میں لکھا تھا..." میں نے دوسرے پرچے کے الفاظ دُہرا دیے۔

"نہیں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"اِس کا ثبوت بھی ہے میرے پاس! یہ... دیکھو! پڑھو۔" میں نے جیب سے دوسرا پرچا نکال کر اُس کے حوالے کر دیا۔

"ارے واقعی!" وہ حیرت زدہ ہو گئی، پھر کہا۔ "اِس کے باوجود تم... تم اتنے مطمئن تھے؟"

"گھبرا جانے سے ہوتا بھی کیا!"

"کم از کم مجھے تو بتا ہی دیتے۔"

"تم کیا کر لیتیں؟... اور پھر مجھے پروا کب تھی! اِس دھمکی سے کوئی اثر لیتا تو کہتا بھی کچھ!"

"بہت عجیب... تم بہت عجیب ہو ادریس!... تم نے کمال کر دیا۔ تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اوسان کھو بیٹھتا۔"

"یہ باتیں چھوڑو اور اصل معاملے پر آؤ۔ بالفرض میں یہ تسلیم بھی کر لوں کہ تم اُس عورت کو نہیں جانتیں تو ایک بات ہرگز نہیں مانوں گا۔ وہ بات دشمنی کی وجہ ہے! دشمنی کا سبب تمھیں یقیناً معلوم ہوگا۔"

"جب میں اُس سے واقف ہی نہیں تو دشمنی کا سبب کیسے سمجھ سکتی ہوں! تم خود سوچو۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"حرکتوں سے باز نہ آنے کا کیا مقصد ہے؟ تمھیں یہ کیوں لکھا گیا تھا؟" میں فوراً بولا۔

"وہ... وہی تو مسئلہ ہے ادریس!... مگر تم... تم سمجھ نہیں رہے۔" میری باتوں نے اُسے گھبرا دیا۔

"اچھا اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم جا سکتی ہو!" میں نے آخری حربہ آزمایا۔

"واسطے ہے رحم تو نہ بنو ادریس! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو!" وہ سنبھل کر بولی۔ "تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں!"

"تم سچ بول رہی ہو یا جھوٹ، مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ میں اب تمھارے نجی معاملات میں دخل اندازی کرنا چاہتا ہوں۔ تمھارے دشمن چاہتے ہیں کہ میں تم سے نہ ملوں، تم سے دور رہوں تو... تو ٹھیک ہے نا!... اس میں بے رخی کی کیا بات ہے!"

"مجھے... مجھے سوچنے... سوچنے دو ادریس!" اُس کی آواز بھر آگئی اور چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ میں اُس کے چہرے پر آتے جاتے جذبوں کے رنگ دیکھتا رہا۔ اُس نے ذرا توقف سے کہا۔ "اگر تم... تم کچھ خیال نہ کرو تو... تو میں آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤں؟"

"ہاں ہاں آرام سے بیٹھو، مجھے کوئی اعتراض نہیں بس یہ خیال رکھنا کہ میں لہجے سے جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اِس کے علاوہ مجھے یہ علم بھی ہے کہ تم ایک اچھی اداکارہ ہو۔" میں نے اظہارِ حقیقت کے باوجود اپنے لہجے میں تلخی نہ آنے دی۔

"ادریس!" اُس نے مسہری کے سرہانے رکھے ہوئے تکیے پر کہنی ٹیکتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "ہاں میں اداکاری کرتی ہوں! مجھے اِس کا اعتراف ہے، مگر شاید تمھیں نہیں معلوم کہ بعض اوقات کوئی کردار بھی اداکار کو قتل کر دیتا ہے۔ مثال دے کر تمھیں سمجھاؤں تو شاید تم آسانی سے میری بات سمجھ سکو۔ آج ہم نے جو فلم دیکھی، اُس میں ایک اداکار پرتھوی راج تھا، وہی جس نے اکبرِ اعظم کا کردار ادا کیا۔ اِس فلم کے بعد بھی اُس اداکار نے بہت سی فلموں میں مختلف کردار ادا کرنے چاہے مگر ناکام رہا۔ وہ اکبرِ اعظم کے کردار کا سحر نہ توڑ سکا اور یوں قتل ہو گیا۔ یہ مثال میں نے اِس لیے دی ادریس کہ وہ جسے لوگ بیگم ثمینہ احمد کہتے ہیں، اُسے بھی ایک کردار نے قتل کر دیا۔ میں وہی... وہی مقتول سی عورت ہوں... بُری عورت!" اُس کی آواز بھرانے لگی۔ "وہ... وہ کردار ہی ایسا تھا۔" میں نے اُسے نہیں ٹوکا اور کہنے دیا۔ شاید لمحے ایسے تھے کہ وہ چاہتی بھی تو جھوٹ نہ بول سکتی۔

اُس کی آواز کبھی تیز ہو جاتی، کبھی دھیمی، کبھی اُس کا گلا رُندھ جاتا اور کبھی وہ روانی سے بولنے لگتی۔

میں نے کہا وہ کیسے گئی؟ "ادریس! میں نے زندگی کو ہمیشہ ایک بڑا سا اسٹیج سمجھا اور خود کو ایک اداکار! میں ایک عمر تک، ایک پارسا اور نیک عورت کی اداکاری کرتی رہی۔ یہ کردار مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ نیک اور شریف کہلائے جانے کا ایک الگ نشہ ہے۔ کچھ لوگ ساری زندگی اِسی نشے میں گزار دیتے ہیں۔ ایک ہی کردار ادا کرتے ہوئے زندگی کے اسٹیج سے گزر جاتے ہیں۔ اُن میں بھی دوسرے کردار ادا کرنے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں، مگر کچھ کو تو موقع ہی نہیں ملتا کہ کوئی اور کردار ادا کر سکیں اور کچھ اپنے کردار کے سحر سے نہیں نکل پاتے۔ اِس بات کو واضح طور پر یوں سمجھو کہ لوگ اِس لیے بھی ایمان دار بنے رہتے ہیں کہ اُنھیں بے ایمانی کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یوں بھی ہے کہ ایک ہی کردار ادا کرتے کرتے آدمی اوب بھی جاتا ہے مگر میرے ساتھ ایسا نہ تھا۔ اب سے کچھ سات سال پہلے تک میں جو کردار ادا کر رہی تھی، اُس کردار سے مجھے بڑی محبت تھی، ایک نیک عورت کا کردار! ہوا یوں کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ فرانس چلی گئی اور وہاں سے لوٹ کر آئی تو میرا کردار بدل گیا۔ زندگی کے اسٹیج پر میں نے اب ایک بُری عورت کا کردار اپنا لیا۔ یہ کردار اپنانے میں میرا قصور شاید کم اور میرے شوہر کا قصور زیادہ تھا۔ عورت لاکھ وسیع النظر بن جائے لیکن اپنی محبت میں کسی کو حصے دار بنانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ میرے شوہر نے فرانس کے دورانِ قیام میں ایسا ہی کیا۔ میرے احتجاج کے باوجود اُس نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ میں فرانس سے اپنے شوہر اور اُس عورت کے ساتھ ہندوستان لوٹی جو میری محبت کی حصے دار بن چکی تھی۔ میں اندر سے ٹوٹ گئی۔ وہ نیک اور پارسا عورت میرے اندر آخری ہچکیاں لینے لگی اور پھر وہ نیک عورت مر گئی۔ ایک کردار ہمیشہ کے لیے مر گیا اور دوسرے کردار نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ تجربہ میرے شوہر کے آئینۂ احساس کو چکنا چور کر دے، مگر... مگر وہاں کوئی

آئینہ تھا ہی کب جو ٹوٹ جاتا! اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ تم اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہو۔ اور وہ بھی تو یہی کر رہا تھا میں نے اُس بوڑھے گِدھ کا اصل چہرہ دیکھ لیا اور پھر دوسرے حربے آزمانے لگی۔ اب صرف میری اَنا کا مسئلہ تھا ادریس! وہ جسے اب میری پروا نہیں اور عملاً مجھ سے قطع تعلق کر چکا ہے، میں اُسی بوڑھے گِدھ کو ایک بار اپنی اہمیت، اپنی طاقت اور اپنی ذہانت کا احساس دلانا چاہتی ہوں۔ اُس سے میری سرد جنگ جاری ہے۔ اسی جنگ کے درمیان اب کچھ اور لوگ بھی آ گئے ہیں۔ بظاہر میرے شوہر کا اُن سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ وہ خود کو اُس عورت کا بھی خوا[ہ] اور ہمدرد کہتے ہیں جسے میں اپنی سوکن اور اپنی محبت کا حصے دار کہتی ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں تم میرا دشمن کہتے ہو۔ اپنے ان دشمنوں کے بارے میں مجھے صرف چند باتوں کا علم ہو سکا ہے کیوں کہ کبھی وہ کھُل کر سامنے نہیں آئے۔ پہلی اہم بات یہ ہے کہ وہ ہندوستانی نہیں، غیر ملکی ہیں، دُوم یہ کہ اُن کی سرغنہ کوئی عورت ہے، اور آخری بات یہ کہ وہ جانے کیوں مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اُنھوں نے براہِ راست کبھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ کیوں؟ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔ اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اپنی سوکن کے خلاف ریشہ دوانیوں کو ختم کر دوں۔ اِس جنگ کو تقریباً چھ سال ہو گئے اور یہ ابھی جاری ہے۔ اس عرصے میں اپنے تحفظ کی خاطر میں نے بھی بہت کچھ کیا ہے۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔ اُس عورت کا نام جمیلا احمد ہے کم از کم میرے علم میں یہی ہے، ثمینہ احمد کی سوکن جمیلہ احمد! وہ ایسے مضبوط حصار میں رہتی ہے کہ میں کوشش کے باوجود آج تک اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ میں نے اس پر بھی غور کیا کہ شاید میرے دشمنوں کا تعلق میرے شوہر سے ہو، لیکن مجھے اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بات راز نہ رہتی۔ میں اپنے شوہر کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھتی ہوں۔ میں اِس وقت تمھارے پاس بیٹھی ہوں لیکن مجھے علم ہے کہ اِس وقت وہ گھر میں ہو گا۔ صرف وہ لمحے میرے شمار اور میری نظر میں نہیں ہوتے جب وہ اُس کوٹھی میں جاتا ہے جہاں میری سوکن جمیلہ احمد رہتی ہے۔ بس وہیں میرا گزر نہیں۔ وہ مجھ سے چھپاتا بھی نہیں کہ کہاں جا رہا ہے! اور اُسے ایسا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے! آخر وہ عورت جمیلہ احمد بھی تو اُس کی بیوی ہے۔ اور میں کب اُس سے کچھ چھپاتی ہوں! اُسے بھی علم ہو گا کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے۔ مگر یہ... یہ سب کچھ میں تمھیں کیوں بتا رہی ہوں!... کیوں ادریس؟ ... کیا صرف اِس لیے کہ تم وہ پہلے نوجوان ہو جس نے مجھے دھتکار دیا ہے؟ ... مجھے میری حیثیت کا احساس دلایا ہے؟ ... شاید یہی ہو اور شاید ایسا نہ ہو!" یہ کہتے ہوئے اُس کی پلکیں کچھ بوجھل سی ہو گئیں۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ اُس کی نگاہ میں بڑی اجنبیت تھی۔

"ثمینہ!" اُس کی پوری روداد سن کر میں نے اُسے مخاطب کیا "تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میرا مقصد کچھ اور تھا، وہ نہیں جو تم نے سمجھا۔ اِس سے قطع نظر میں نے تمھارا بیان سن کر جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ ذرا مختلف ہے، اُس نتیجے سے مختلف جس کا اظہار تم نے اپنے باب میں کیا۔"

"کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"یہ کہ تمھارے اندر جو ایک نیک عورت زندہ تھی، وہ مر گئی۔"

"ہاں وہ... وہ عورت مر چکی ہے ادریس... مر چکی ہے۔"

"خیال ہے تمھارا کہیں تمھارے وجود میں وہ عورت اب بھی سانس لے رہی ہے ورنہ تم اُس کا ذکر نہ کرتیں۔"

"مگر میں... میں تو بہت... بہت بُری عورت ہوں۔ تمھیں... تمھیں نہیں معلوم... تم نہیں جانتے!"

"جب تک تمھارے اندر بُرا اور بھلا سمجھنے کی تمیز باقی ہے ثمینہ، وہ نیک عورت تمھارے اندر زندہ رہے گی اور جس دن یہ تمیز اُٹھ گئی، وہ عورت مر جائے گی۔"

میری بات سن کر وہ سسک اُٹھی اور پھر دیر تک اُس کی ہچکیاں بندھی رہیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

"تم نے جو کچھ کیا، وہ اُن حالات و واقعات کا ردِعمل تھا جو تمھیں پیش آئے۔" اُس کے سینے کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا اور اُس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تو میں نے کہا۔

"شاید" اُس نے سسکی لی۔

"ثمینہ! میرے ایک سوال کا جواب دو، خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر۔" میں نے اُس کے چہرے پر تغیر محسوس کیا اور اپنی بات کہہ دی "کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے درمیان بے غرض دوستی برقرار رہے؟ میں بھی تم سے کوئی غرض وابستہ نہ رکھوں اور..."

"بے غرض دوستی!" اُس نے حیرت سے میرے الفاظ دُہرائے۔

"ہاں ثمینہ! میں یہی چاہتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا "میں تمھیں اپنی ایک بزرگ دوست کی حیثیت سے قبول کر سکتا ہوں۔"

"اِس کے سوا کسی اور حیثیت سے نہیں؟" اُس نے وضاحت چاہی۔

"میرے خیال سے اب کسی اور حیثیت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" میں بولا "میں تمھیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ ابتدا سے میرے ذہن میں یہی تھا اور اس کا سبب تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ تم کہو گی کہ پھر میں نے تمھیں اتنے قریب کیوں آنے دیا؟ تو اس کی وجہ تھی۔ ظاہر ہے، کون یہ چاہے گا کہ کسی اجنبی شہر میں تنہا رہے!" میں اُس کے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ وہ یہ نئی حیثیت قبول کرنے پر راضی نہیں ہے۔ مجھے پہلے ہی یہ خدشہ تھا، اسی لیے اُسے سمجھایا "یہ حقائق قبول کرتے ہوئے دُکھ تو ہوتا ہے ثمینہ، لیکن اس طرح جینا سہل ہو جاتا ہے۔ میں تمھاری دل آزاری کیے بغیر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے قدم صرف ایک بار بہکے تھے۔ اُس کے بعد میں نے توبہ کر لی۔ کیوں؟ یہ سوال نہ کرنا۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ یوں سمجھ لو ثمینہ کہ یہ انگاروں سے کھیلنا ہے۔ تم جل جاؤ گی! اور میں یہ نہیں چاہتا۔" اس سے زیادہ شاید میں کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

"مجھے منظور ہے۔" اُس نے جھوٹ بولا۔ اُس کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی اِس جھوٹ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ جس قماش کی عورت تھی، اُس سے مجھے اور کیا توقع ہوتی، لیکن اس کے باوجود مجھے افسوس ہوا۔ اُس نے مزید جھوٹ بولا "ادریس! تم سے مل کر میری آنکھیں کھُل گئی ہیں۔ تم نہ ملتے تو شاید میں اپنی روح پر ایک بوجھ لیے سسکتی رہتی۔"

میں سمجھ رہا ہوں ثمینہ کہ اب تم ایک مظلوم عورت بن کر میرے احساس کو جھنجھوڑنا چاہتی ہو! میں نے سوچا، پھر کہا "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں، لیکن اب بہت رات ہو گئی ہے۔ تمھیں نیند آ رہی ہو گی۔"

"نہیں!" اُس نے جلدی سے کہا "تمھاری صحبت میں کون کافر پلک جھپکا سکتا ہے! میں تمھاری خاطر صبح تک یہیں رُک سکتی ہوں، اگر تمھیں کوئی زحمت نہ ہو!"

"تم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، مگر ابھی تک اجنبیت کی ایک دیوار حائل ہے۔ وہ دیوار بھی گرا دو نا!" میں نے موقع غنیمت جان کر کہا "تم نے اپنے شوہر کا پورا نام نہیں بتایا اور نہ یہ کہ..."

"میرا خیال یہ ہے ادریس کہ کچھ باتوں پر پردہ ہی پڑا رہنے دو۔" وہ بات کاٹ کر بولی "میں اپنے شوہر کو بدنام کرنا نہیں چاہتی۔" اُس نے بہت خوبصورت بہانہ بنایا۔

"ہوں!" میں نے طویل سانس لیا "اور اپنے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟"

"یقین کرو کہ میں نے اپنے بارے میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں نے وضاحت کی "دراصل میں چاہتا ہوں کہ اب تم اپنے دشمنوں کے مقابل خود کو اکیلا نہ سمجھو۔ میں بھی اب تمھارے ساتھ ہوں۔"

"تمھارے جذبات میرے لیے قابلِ قدر ہیں اور مجھے تمھارے حوصلے کا بھی اعتراف ہے مگر ادریس، مجھے اپنی جنگ خود لڑنے دو۔ تم کچھ دنوں کو اِس شہر میں آئے ہو، واپس چلے جاؤ گے۔ پھر بھی تو مجھے اپنے دشمنوں سے تنہا نمٹنا پڑے گا۔ تو کیا ایسی صورت میں یہ مناسب نہیں کہ تم اِس معاملے میں نہ پڑو!"

ثمینہ جب یہ الفاظ ادا کر رہی تھی تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اُس کا ذہن پڑھ لوں۔ اس طرح مجھے وہ سب کچھ معلوم

ہو جاتا جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ بس کچھ دیر کی بات تھی اور یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا مگر میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ہندوستان آنے کے بعد میں نے اب تک اپنی کسی پُراسرار قوت کو بیدار نہیں کیا تھا۔ اس کے بغیر ہی میں حالات سے نمٹ رہا تھا۔ اُس ہندی عورت سے اپنی ہر بات منوا لینا بھی میرے اختیار میں تھا مگر میں نے اپنی فطری صلاحیت و ذہانت پر اکتفا کیا اور دوسرے خطوط پر سوچنے لگا۔

اُس رات ثمینہ احمد کچھ دیر اور بیٹھی، پھر آئندہ روز شام کو لوٹا سینٹر کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ یہ کافی ہاؤس کناٹ پلیس پر تھا۔ ثمینہ احمد چلی گئی تو میں نے از سر نو حالات و واقعات کا جائزہ لیا۔ ابھی میرے پاس کچھ کر گزرنے کے لیے وقت تھا۔ میں نے اُس رات جو اہم نکتہ دریافت کیا وہ یہ تھا کہ ایک عرب مصری نوجوان کی حیثیت سے دلی کے اعلیٰ حلقوں میں میری شہرت قطعی مناسب نہیں۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس ایک سوال کے جواب میں ایک نیا لائحہ عمل میرے ذہن میں مرتب ہونے لگا۔ جب میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں ایک فیصلے تک پہنچ چکا تھا۔

صبح ناشتا کرتے ہی میں نے گذشتہ رات کے فیصلے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ میں نے ایک ایئر لائن کے دفتر فون کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر میں اسی روز قاہرہ روانہ ہونا چاہتا ہوں تو مجھے ویٹنگ لسٹ پر رہنا پڑے گا۔ اگر کسی مسافر نے اپنی سیٹ کینسل کرا دی تو میں آج قاہرہ روانہ ہو سکوں گا ورنہ نہیں۔ میں نے یہ شرط قبول کر لی۔ اُس ایئر لائن کا دفتر نئی دلی میں تھا۔ میں چاندنی چوک سے ایک ٹیکسی کر کے وہاں پہنچ گیا اور ٹکٹ لے لیا۔ پھر میں نے واپسی میں اپنی روانگی درج کرا دی۔ قانونی کارروائیوں سے نمٹ کر میں نے کچھ ضروری سامان خریدا اور دوبارہ چاندنی چوک پہنچ گیا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر میں ان تمام کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ خاندانی ملازم جبار احمد خاں دیر سے اُٹھنے کا عادی ہے جس نے چاندنی چوک میں میری سکونت کا بندوبست کیا ہے اس لیے میں نے اُسے واپس آنے کے بعد ہی فون کیا۔ رابطہ ملتے اور علیک سلیک کے بعد میں نے اُس سے کہا ”آج میں قاہرہ واپس جا رہا ہوں اس لیے

آپ کو زحمت دی تھی۔“

”کیا؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم ہمارے مہمان ہو برخوردار! مہمان آنا اپنی مرضی سے ہے مگر —“

”مجھے علم ہے محترم!“ میں نے اُس کی بات کاٹی۔ ”اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں یقیناً ابھی رکتا۔“

”کیا مجبوری ہے بولو!“

”میرے والد سخت علیل ہو گئے ہیں۔ اُن کا تار ملا ہے مجھے آج! میں آج ناشتا کر کے اسی غرض سے اشوکا ہوٹل گیا تھا۔ میں اپنے والد کو وہیں کا پتا دے کر آیا تھا۔“

”واقعی یہ تو تم نے ایسی مجبوری بیان کر دی برخوردار کہ ہم خواہش کے باوجود رُکنے کے لیے نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال اگر تمھارے لیے یہ ممکن ہو کہ آج کسی وقت ہم سے مل کر جاؤ تو ہمیں بہت خوشی ہو گی۔ اور ہاں کوئی دشواری ہو روانگی میں تو بتاؤ۔ ٹکٹ وغیرہ لے لیا یا ابھی لو گے؟“

میں نے اُسے بتایا کہ سب کام کرا چکا ہوں، پھر کہا ”میں آپ سے وعدہ نہیں کرتا، ہاں کوشش ضرور کروں گا کہ جانے سے پہلے ملاقات ہو جائے۔“

”وقت بتاؤ، تم اندازاً کب تک آ سکتے ہو؟ اس وقت تو ہم ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں اور واپسی دو گھنٹے بعد ہو گی۔“

”پھر میں آپ کو اُسی وقت فون کروں گا اور اگر کسی سبب فون نہ کر پاؤں تو معاف کر دیجیے گا۔ میں مکان کی کنجیاں آپ کے ملازمین کو دے جاؤں گا۔“

”کوشش کرنا برخوردار!“

”جی بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر لیا۔

ثمینہ احمد کا کوئی نہ کوئی تعلق جبار احمد خاں سے بھی تھا۔ ایک مرتبہ جبار احمد خاں کی بجائے فون پر وہی ملی تھی۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے باقی کام نمٹانے میں جلدی کی۔ میں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری میں کئی اسٹیٹ ایجنسیوں کے نمبر دیکھ کر انھیں فون کیے۔ ”پرانی دلی میں بہت مشکل ہے جناب!“ ہر جگہ سے یہی جواب ملتا رہا۔ ”نئی دلی میں جیسا مکان آپ چاہیں گے، کرائے پر مل جائے گا۔“

”جی نہیں شکریہ! مجھے پرانی دلی ہی میں مکان چاہیے۔“ میں

کہتا اور پھر رابطہ منقطع کر کے کسی دوسری اسٹیٹ ایجنسی کا نمبر ملانے لگتا۔ بالآخر تقریباً گھنٹے بعد میری کوششیں بار آور ہو سکیں۔ وہ اسٹیٹ ایجنٹ چالاک اور چرب زبان معلوم ہوتا تھا۔ ”مکان مل جائے گا جناب! بلکہ ملا سمجھیں۔ اُس کی چابیاں میرے پاس ہیں۔ بس میں نے جو ایڈوانس بتایا ہے، اُس پر پکے ہو جائیں اور اپنا کمیشن تو بتا ہی چکا ہوں آپ کو! وہ مالک مکان میرا دوست ہے، اس سے کمیشن ملنے کا تو سوال ہی نہیں، معقول اُلٹی میری جیب خالی کرا لے جائے گا۔“

”تم نے جو کمیشن بتایا ہے، تمھیں مل جائے گا۔“ میں نے اُسے اطمینان دلایا۔ ”تم نے کیا بتایا تھا، کس علاقے کا ہے؟“

”سبزی منڈی، جناب!“ اُس نے جواب دیا۔

”جامع مسجد سے کتنے فاصلے پر ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”بارہ ٹوٹی چوک کے راستے کوئی چار میل کا رن ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ تمھاری ایجنسی کتنے بجے تک کھلی رہتی ہے؟“

”جی اپنا تو ٹھور ٹھکانا یہی ہے۔ دو آگے نا تھوڑے پیچھے پکڑا۔ کبھی چلے آئیں، بندہ حاضر ملے گا۔“

میں نے اُس سے جلدی پہنچنے کو کہا اور سلسلہ منقطع کر کے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ وہ اسٹیٹ ایجنسی پرانی دلی ہی کے ایک علاقے صدر بازار میں تھی۔ بارہ ٹوٹی اور قطب روڈ کے درمیان یہ پرانی دلی کا مشہور بازار ہے۔ اسی کو دلی والے سرائے حافظ بنا بھی کہتے ہیں۔ جامع مسجد کے قریب کہیں مکان نہ ملنا مجبوری تھی، سو میں نے اس مجبوری کو قبول کر لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مکان پرانی دلی ہی میں مل گیا۔ سامان سمیٹنے کے بعد میں اپنے اگلے اقدام پر غور کرنے لگا۔ ابھی ایک مرحلہ بڑا مشکل تھا۔ میں نے آخر اس کا حل بھی نکال ہی لیا۔ ملازموں نے مجھے دوپہر کا کھانا کھلا دیا تو میں نے اُن دونوں کو اپنے کمرے میں بُلا کر کہا ”آج میں واپس اپنے ملک جا رہا ہوں۔ اب تمھاری ضرورت نہیں۔ خان صاحب سے کہنا کہ میں خود حاضر خدمت ہو کر مکان کی چابیاں اُن کے حوالے کر دوں گا۔ موقع ملا تو فون بھی کر لوں گا انھیں۔ فی الحال میں کچھ سامان

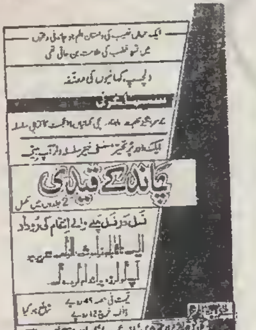

خریدنے جاؤں گا!"

ملازمین بیچارے کیا کہتے، اقرار میں سر ہلا کر رخصت ہو گئے۔ مکان کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں خواب گاہ میں آ گیا۔ پھر میں نے بہت تیزی دکھائی۔ سب سے پہلے میں نے جبار احمد خاں کو ایک مختصر سا خط لکھا۔ "خان صاحب! آداب۔ ارادہ اس خادم کا یہی تھا کہ خود حاضر ہوتا مگر عزیزوں کے لیے کچھ سوغاتیں خریدنے میں دیر ہو گئی۔ جلدی میں آپ کو فون بھی نہ کر سکا معذرت خواہ ہوں۔ مکان کی کنجیاں بھی اس لیے ڈاک سے بھیج رہا ہوں۔ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ تا زندگی نہیں بھولوں گا۔ شکریہ! خادم، ادریس المہندس۔"

خط لکھنے کے بعد میں نے ایک لفافے پر جبار احمد خاں کا پتا لکھا۔ خط اس لفافے میں ڈال کر میں نے اسے جیب میں رکھ لیا، پھر وہ پیکٹ اٹھایا جس میں ضروری سامان تھا۔ یہ سامان میں نے آج ہی خریدا تھا۔ اب میں دلی میں ایک ہندوستانی بن کر رہنا چاہتا تھا اور تمام تیاریاں اسی سلسلے میں تھیں۔ دلی میں جانے کتنے "ادریس" ہوں گے! یہ سوچ کر میں نے اپنا نام بدلنا ضروری نہیں سمجھا۔ جو دشواریاں مجھے ایک غیر ملکی ہونے کے سبب پیش آ رہی تھیں، ان کا سدباب اسی طرح ممکن تھا۔

میں اپنے چہرے پر میک اپ کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں چونک اٹھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ "جی!" میں نے کہا۔

"کل رات تم اتفاق سے بچ گئے!" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ انگریزی زبان میں بات کر رہی تھی اور لہجہ امریکی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمہاری طرف سے غافل ہوں۔ اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت میں فون پر تم سے بات کر رہی ہوں۔ تم اسے میری آخری وارننگ سمجھ لو۔ اب اگر تم ثمینہ احمد کے ساتھ دیکھے گئے تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا!"

"میں تو خود آج اپنے ملک واپس جا رہا..." میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ معلوم نہیں اس عورت نے میری ادھوری بات بھی سنی تھی یا نہیں۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی۔ میں سمجھا کہ وہی ہو گی اور مزید کوئی دھمکی دے گی۔ میں نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا۔ "کیا کوئی بات رہ گئی ہے؟"

"حضور والا! ابھی میں نے کچھ کہا کب ہے!" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔

"ہائے سردار جی!" میں بولا۔ یہ وہی گائیڈ تھا جو مجھے اشوکا ہوٹل میں ملا تھا اور جس نے جبار احمد خاں سے میری ملاقات کرائی تھی۔

"جی جناب!" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "کب حاضر ہو جائیں؟"

میں نے سردار جی کو بھی وہی کہانی سنا دی جو جبار احمد خاں کو سنائی تھی، والد کی اچانک علالت اور میری فوری روانگی! ظاہر ہے کہ سردار جی افسوس کا اظہار کرنے کے سوا اور کیا کرتے۔ انھوں نے فوری طور پر آخری ملاقات کے لیے آنا چاہا، مگر میں نے ان سے معذرت کر لی کہ مجھے خریداری کرنے جانا ہے۔ ان کے واجبات میں نے پہلے ہی ادا کر دیے تھے، اسی روز جب چاندنی چوک والے مکان میں منتقل ہوا تھا اس لیے فون ہی پر انھیں "خدا حافظ" کہہ دیا۔

پھر مجھے اس مکان سے میک اپ کر کے نکلنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔ اگر وہ دو فون نہ آتے تو شاید کچھ جلدی نکل جاتا۔ اب میں اپنے چہرے مہرے سے ایک ہندوستانی نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ ایک ایسا نوجوان جس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان ہو۔ میک اپ کرتے ہوئے عمر کا خیال میں نے خاص طور پر کیا تھا تاکہ مجھے کم عمر نہ سمجھا جائے۔ چہرے سے نوخیز معلوم ہونا بھی میرے حق میں کچھ زیادہ بہتر نہ رہتا۔ ہندوستانی چہروں میں جو "نمک" ہوتا ہے، وہ اب میرے چہرے پر بھی تھا۔ اب میری پتلیوں کی رنگت بھی سبز کے بجائے سیاہ تھی۔ مجھے دیکھ کر اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں عرب ہوں، ہندوستانی نہیں۔ میک اپ پر میں نے اسی لیے بہت محنت کی تھی۔

اس مکان سے نکلنے کے لیے میں نے عقبی دروازہ استعمال کیا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں کی نظر مجھ پر پڑے۔ سامان ابھی میں نے وہیں رہنے دیا کہ کرائے پر ملنے والا مکان دیکھنے اور معاملات طے ہو جانے کے بعد سامان لے جانا مناسب ہوتا۔

جبار احمد خاں کو اس کے مکان کی کنجیاں بھی میں بعد ہی میں بھیجتا۔ مصلحت اسی میں تھی۔ میں کچھ دیر بعد سنہری مسجد کے قریب سے گزرتا ہوا چاندنی چوک کی بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہی سڑک ایک طرف لال قلعے تک جاتی ہے اور دوسری جانب مسجد فتح پوری تک۔ اسی سڑک پر ٹاؤن ہال کے سامنے گھنٹا گھر ہے اور اسی پر فوارہ! یہاں ٹیکسی ملنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ میں نے ٹیکسی والے سے صدر بازار جانے کے لیے کہا اور کھڑکی سے باہر اس پُر ہجوم اور بارونق علاقے کو دیکھنے لگا۔ دلی کی اس مشہور و معروف سڑک سے بھی تاریخ کے کیسے کارواں گزرے تھے جن کی تفصیلات میرے حافظے میں تھیں۔ میں کچھ دیر کو جیسے برسوں پیچھے چلا گیا۔ پھر وہ شاہراہ پیچھے رہ گئی اور میں آگے نکل گیا۔ یہی ہوتا ہے۔ لوگ گزر جاتے ہیں اور راستے اسی طرح آباد رہتے ہیں۔ پھر میں اسی وقت چونکا جب سکھ ڈرائیور نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ٹھیٹ پنجابی لہجے میں بتایا کہ صدر بازار آ گیا ہے۔ پھر اس نے یہ بھی پوچھا کہ مجھے کہاں اترنا ہے۔ میں اس اسٹیٹ ایجنسی کا پتا نوٹ کر لایا تھا جو ٹیلیفون ڈائرکٹری میں درج تھا۔ میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پھر جلد ہی اس پتے پر پہنچ گیا۔ نام تو اس کا نواب اسٹیٹ ایجنسی تھا لیکن اپنی حالت سے وہ کوئی کباڑ خانہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ دھان پان آدمی مجھ سے بہت لپک کر ملا جس نے فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی میرا انٹرویو شروع کر دیا۔ "آپ دلی کے تو نہیں لگتے۔ شاید کسی اور شہر سے آئے ہیں؟"

"ہاں!" میں نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

"کہاں سے؟"

"میرٹھ سے آیا ہوں!" میں نے ہندوستان ہی کے ایک اور شہر کا نام لے دیا۔

"وہی میرٹھ نا جہاں نوچندی لگتی ہے! بس ایک بار گیا ہوں وہاں۔ کیا بات ہے صاحب وہاں کی۔ وہاں آپ کس محلے میں رہتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو!" مجھ سے آخر برداشت نہ ہو سکا۔

"میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا، آپ ناحق کو برا مان گئے! ... تو پھر چلیں؟"

"ہاں چلو!" میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"ایک بات اور!" وہ اٹھتا ہوا بولا۔

"وہ بھی کہہ دو!"

"ویسے تو آپ کو مکان بلکہ وہ حویلی پسند آئے گی، پھر بھی بات نہ بنی تو... تو میرا ٹیم جو لگے گا، اس کے پیسے..."

"لے لینا!" میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

اس نے سر ہلایا اور پھر کہنے لگا۔ "آپ کی خاطر دھندا بند کرنا پڑ رہا ہے!" پھر وہ ٹیکسی ملنے تک اسی طرح کی بے تکی باتیں کرتا رہا۔ وہاں سے سبزی منڈی پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ راستے میں بھی اس نے مجھ سے گفتگو کرنا چاہی مگر میری سرد مہری دیکھ کر زیادہ نہ بولا۔ وہ مکان آبادی کے بالکل آخر میں تھا اور اس کی ایک جانب جنگل تھا۔ سامنے ہی لکڑی کا پھاٹک نظر آیا۔ پھاٹک میں ایک زنگ آلود سا تالا پڑا ہوا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکان برسوں سے بند پڑا ہے!" میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اجی بس اب قدرداں ہی اٹھ گئے ایسے گھروں کے!" وہ تالا کھولنے لگا۔ "دراصل یہ پرانے طرز پر بنی ہوئی ایک حویلی ہے اور آج کل لوگوں کو ایسے مکان پسند نہیں آتے!" اس نے مکان کا پھاٹک کھول دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی قدیم مقبرے میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس کی زبان چلتی رہی۔ "اس حویلی کا ایک حصہ ذرا مرمت طلب ہے، مگر ایک حصہ بالکل صاف ستھرا ہے۔ آپ اس حصے میں سکون و آرام سے رہ سکتے ہیں۔ ابھی دو روز پہلے صفائی کرائی ہے۔"

ایک دالان سے گزر کر میں اس کے ساتھ بڑے سے صحن میں پہنچ گیا۔ صحن کی دائیں جانب ٹوٹی ہوئی دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ ملبا زمین پر بھی پڑا تھا۔ وہ عمارت پتلی اینٹ کی بنی ہوئی تھی۔ چھوٹی چوکور اور پتلی وہ اینٹ اب زیادہ نہیں ہوتی۔ میں نے بائیں طرف دیکھا تو کئی بڑے بڑے محرابی دروازے نظر آئے جن میں کواڑ نہیں تھے۔ وہ سب مجھے

اُسی طرف لے گیا۔ وہاں دو بڑے بڑے دالان تھے۔ اُن کی حالت کچھ غنیمت تھی۔

"اُن میں سے ایک کو آپ ڈرائنگ روم اور دوسرے کمرے کو بیڈ روم بنا سکتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے کمرے بھلا اور کہاں ملیں گے آپ کو! دِلّی میں آج کل جگہ کہاں ملتی ہے؟"

مجھے اگر اُسی دن جبار احمد خاں کا مکان نہ چھوڑنا ہوتا تو اُس کھنڈر نما حویلی میں رہنا کبھی قبول نہ کرتا۔

"رہیں گے کتنے دن؟" میں نے جب اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو اُس نے پوچھا۔

"جتنے دن بھی رہوں، تمہیں اِس سے کیا! کرایہ دیتا رہوں گا۔" میں ناگواری سے بولا۔

"میں اِس لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں آپ بھی بھٹکانے میں نہ آ جائیں، پھر بعد میں کہیں مجھ سے کہ میاں نواب پہلے نہیں بتایا تم نے؟"

"کیا؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"محلے والوں نے بس بے پَر کی اُڑا رکھی ہے کہ اِس گھر میں جو باؤلی ہے، اُس میں سر کٹا رہتا ہے۔"

ہندوستانی تو ویسے بھی توہم پرست ہوتے ہیں۔ میرے حافظے میں کہیں یہ بات بھی محفوظ تھی۔ میں اِسی لیے مسکرا کر بولا۔ "تم کوئی فکر نہ کرو، میں کسی کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

"یہ بات ہوئی نا، نو تولے باؤن رتی!" وہ خوش ہو گیا۔ یقیناً وہ مجھے عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا سمجھ رہا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور ابھی مجھے سامان وغیرہ بھی لانا تھا اس لیے جلدی جلدی میں نے تمام معاملات طے کر لیے۔ واپسی میں مالک مکان سے بھی بات ہو گئی جو کشن گنج میں رہتا تھا۔ چھ ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کرنے کے بعد مجھے مکان کی چابی مل گئی۔ میں نے اُس اسٹیٹ ایجنٹ کو بھی وہیں الگ لے جا کر طے شدہ کمیشن دے دیا اور پھر ٹیکسی کر کے سیدھا چاندنی چوک پہنچ گیا۔

راستے کو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا تھا اس لیے دوبارہ سبزی منڈی کی اُس کھنڈر نما حویلی تک آسانی سے جا پہنچا۔ جب میں ٹیکسی سے اپنا سامان اُتار رہا تھا تو ٹیکسی ڈرائیور مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"یہ حویلی تو آسیب زدہ ہے جی! یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔"

"تو مجھے تم کیا سمجھ رہے ہو!" میں نے ہنس کر کہا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ٹیکسی ڈرائیور خوفزدہ نظر آنے لگا ہے۔ میں نے اُسے کرایہ ادا کیا اور بولا۔ "ارے تم تو مجھے سچ مچ جن سمجھنے لگے! دراصل میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔"

"یہاں سے جی پچھلے مہینے ایک عورت کی لاش ملی تھی۔ سُنا ہے کہ وہ کوئی چڑیل تھی۔ آپ سنتے جان چھٹتے ہیں یہاں!"

معلوم نہیں ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی افواہ سُنی تھی یا ایسا ہی تھا مگر میں نے اُس کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔ آس پاس مکانات کچھ فاصلے سے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگوں نے مجھے اُس حویلی میں داخل ہوتے تو دیکھا ہے مگر میرے قریب آنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی۔ یہ اچھا ہی تھا۔ اُس علاقے میں لوگوں سے میرے زیادہ مراسم بڑھنا بے سود تھا۔

اُس وقت شام کے سوا چار بج رہے تھے اور ابھی میرے پاس کافی وقت تھا۔ میں نے سبزی منڈی ہی کے پوسٹ آفس سے جبار احمد خاں کو چاندنی چوک والے مکان کی چابیاں پارسل کیں جن کے ساتھ میرا خط بھی تھا۔ پھر میں نے بازار سے ضروریات کا کچھ سامان خریدا، چند کرسیاں، میز، مسہری وغیرہ! مختصر سا فرنیچر سیٹ کرنے میں مجھے گھنٹا بھر اور لگ گیا۔ اب میں وہاں جتنے دن چاہتا، سکون سے رہ سکتا تھا۔ میں نے اُس حویلی کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا۔ حویلی کے شکستہ حصے میں وہ باؤلی بھی دیکھی جس کے متعلق سُنا تھا۔ وہ خاصی گہری تھی اور اُس میں اندر اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ شکستہ حصہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ جائزہ لینے کا مقصد محض یہ تھا کہ کہیں شکستہ حصے کی کوئی بیرونی دیوار ٹوٹی نہ ہو جس سے کسی کے لیے اندر آنا ممکن ہو۔ مجھے بس ایک جگہ سے دیوار کچھ ٹوٹی نظر آئی۔ اُس طرف جنگل تھا۔ میں نے ٹوٹی ہوئی

دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھا۔ جنگل میں سے اُس دیوار پر چڑھنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے فی الحال اُسے نظر انداز کر دیا اور نیچے اُتر آیا۔ وہاں روشنی اور پانی کی پریشانی نہیں تھی، ہاں بلب ٹوٹے ہوئے تھے جو میں نے بدل دیے۔

ثمینہ احمد نے شام سات بجے کناٹ پلیس کے یونائیٹڈ کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بات میرے ذہن میں تھی۔ مجھے اب وہیں پہنچنا تھا۔ میں چھ بجے کے قریب اُس حویلی میں تالا ڈال کر چلا گیا۔ میرے جسم پر بہترین لباس تھا۔ کوئی مجھے دیکھ کر سوچ بھی نہ پاتا کہ میرا قیام اُس کھنڈر نما حویلی میں ہو گا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو رات ایک بجے تک کے لیے طے کر لی۔ ٹیکسی والے سے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ مزید زیادہ وقت ہونے پر اور رقم دے دوں گا۔ ٹیکسی والا شاید مجھے کوئی نودولتیا ہی سمجھا ہو گا یا کوئی اجنبی کہ اُس نے جو کرایہ مانگا، میں نے پیشگی ہی اُس کے حوالے کر دیا۔

میں آج ثمینہ احمد کا تعاقب کر کے کم از کم اُس کی قیام گاہ کا سراغ تو لگا ہی لینا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی جو روداد سنائی تھی، اُس روداد میں کئی اہم نکتے تھے۔ اُس کی سوکن جمیلہ احمد کی شخصیت مجھے اُس سے بھی زیادہ پُراسرار نظر آئی تھی۔ مجھے ثمینہ احمد کی روداد سنتے ہوئے ایک اسرائیلی ایجنٹ بھی یاد آیا تھا، وہی جس نے احمد سلمان کی بیٹی کیلی سے شادی کر لی تھی اپنی شخصیت کو شک و شبہے سے بالاتر رکھنے کے لیے غیر ملکی ایجنٹ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ ثمینہ احمد کے شوہر کو اپنے جال میں پھانسنے والی بھی کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے ہمدرد امریکی تھے، اِس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود بھی کوئی امریکی ایجنٹ ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس کا اصلی نام کچھ اور ہو گا۔ شادی کے بعد کوئی نام بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ثمینہ احمد ہی کے ذریعے میں جمیلہ احمد تک پہنچ سکتا تھا، اِس لیے پہلے ثمینہ احمد کی پُراسرار شخصیت سے پردہ اُٹھنا ضروری تھا۔ یہ تمام باتیں میں گزشتہ رات ہی سوچ چکا تھا۔

کناٹ پلیس پہنچ کر میں نے ٹیکسی کو اُس کافی ہاؤس کے سامنے سے گزر جانے دیا اور ڈرائیور سے کہا۔ "تم کوئی ایسی جگہ دیکھو جہاں ٹیکسی کھڑی کر سکو۔ مجھے واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے اور جلدی بھی آ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹیکسی والے نے اقرار میں سر ہلایا، پھر کچھ آگے نیشنل اینڈ گرینڈ لیز بینک سے پہلے ایک جگہ ٹیکسی روک لی۔ میں ٹیکسی سے اُتر کر واپس یونائیٹڈ کافی ہاؤس کی طرف چل دیا۔ میں نے دانستہ وہاں ٹیکسی نہیں رکوائی تھی۔ اِس وقت ساڑھے چھ بجے تھے اور ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا لیکن ثمینہ احمد وقت سے پہلے بھی آ سکتی تھی۔ ذہن میں یہی رکھتے ہوئے میں وہاں پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ میں چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ وہاں خاصی رونق تھی مگر میرا ذہن کہیں اور اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے قاہرہ سے آنے والے ایک عرب نوجوان کا کردار ترک کر کے خود کو دشمنوں کی نظر سے بڑی حد تک محفوظ کر لیا تھا۔ ثمینہ احمد کی وجہ سے مجھے اُلجھی ہوئی گتھی کا ایک سِرا مل گیا تھا اور اِسی سِرے کو پکڑ کر میں نے فی الحال آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اِس کے علاوہ بھی میرے ذہن میں اور بہت کچھ تھا جس پر مجھے ترتیب وار عمل کرنا تھا۔ کافی ہاؤس کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے اُنہی آئندہ اقدامات پر غور کر رہا تھا۔ ابھی کچھ جزئیات باقی تھیں۔ کسی مسئلے کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر سوچتے ہوئے میں جزئیات کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ بعض اوقات اِنھی پر پہلے سے غور نہ کرنے کے سبب معاملات بگڑ جاتے ہیں۔

پھر ثمینہ احمد کی ایمبسڈر ٹھیک سات بجے کافی ہاؤس کے قریب آ کر رُکی۔ میں اُس سے زیادہ دور نہیں تھا اِس لیے فوراً اُسے پہچان گیا۔ جب وہ کار سے اُتر کر کافی ہاؤس میں چلی گئی تو میں نے اُدھر کا رُخ کیا۔ وہاں کیبن بھی بنے ہوئے تھے مگر وہ ہال کمرے میں دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گئی تھی اور اُس کا رُخ بھی دروازے کی طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اُسے میرا انتظار تھا اور اُس کا مقصد تھا کہ مجھے اُس کی تلاش میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ زیادہ عمر ہونے کے باوجود اُس نے اپنے جسم کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ بلاشبہ اُس میں بڑی کشش تھی۔ مجھے اُس کے شریکِ حیات کی بدذوقی پر افسوس ہوا

جس نے اُس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس قطع تعلق کی عملی شکل کیا تھی، وہ میرے علم میں نہ تھی۔ وہ اب بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہی رہتی تھی یا الگ، یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل تھا۔ میں نے اُس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اُس نے عملاً قطع تعلق کے باوجود اپنے شریک حیات کا ساتھ نہیں چھوڑا ورنہ ہر وقت اُسے کس طرح نظر میں رکھ پاتی۔ میں اُس کی طرف ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا اُسی کے پیچھے والی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ثمینہ احمد کی پشت میری طرف تھی۔

ویٹر پہلے اُس کی میز پر گیا اور کولڈ کافی کا آرڈر لے کر میری طرف آیا۔ میں نے ملک شیک منگوالیا۔ ویٹر ابھی گیا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر تلوار کٹ مونچھوں والا، ثمینہ احمد کی میز کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ ابھی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہی تھا۔

”وہ ابھی آیا نہیں ہے!“ ثمینہ احمد آہستگی سے اُس شخص سے بولی جو سامنے والی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔

”آئے گا تو سہی نا!“ اُس شخص نے تصدیق چاہی۔

”ہاں آنا تو چاہیے۔ میں نے اُسے سات بجے کا وقت دیا تھا۔“ ثمینہ احمد بدستور مدھم لہجے میں بولی۔

ثمینہ احمد نے سات بجے کا وقت مجھے دیا تھا اس لیے میں ذرا چونکا اور اُس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا جو میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ یہ شخص کون ہے؟ اور ثمینہ احمد اُس سے میری گفتگو کیوں کر رہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب جلد ہی مجھے مل گیا۔

”میں اُس سے اپنے ایک دوست کی حیثیت سے تمہارا تعارف کراؤں گی، مگر تم زیادہ نہ بیٹھنا۔ اُس کے آتے ہی کوئی بہانہ کر کے اُٹھ جانا۔ وہ کسی بھی لمحے آسکتا ہے، اسی وجہ سے میں تمہارے لیے کافی یا چائے وغیرہ نہیں منگوا رہی، کچھ خیال نہ کرنا!“ ثمینہ احمد اُس شخص سے بولی۔ اُس کی آواز اب بھی دھیمی ہی تھی۔ اگر میری پوری توجہ اُدھر نہ ہوتی تو شاید اُس کی بات نہ سمجھ پاتا۔

”نہیں بیگم صاحبہ! اس میں خیال کرنے کی کون سی بات ہے! مجھے تو بس ایک نظر اُس کا چہرہ دیکھنا ہے اور پھر اُن دونوں کو دکھا دینا ہے!“ تلوار کٹ مونچھوں والے نے نرمی سے کہا۔

”وہ دونوں ہیں کہاں؟“ ثمینہ احمد نے سوال کیا۔

”کستوربا گاندھی مارگ پر جہاں پی آئی اے کا دفتر ہے، وہ وہیں کھڑے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اُس کی نشاندہی کراتے ہوئے احتیاط سے کام لوں گا۔“

”تم نے اُن دونوں کو اچھی طرح سمجھا تو دیا ہے کہ انھیں کیا کرنا ہے؟“

”بالکل بیگم صاحبہ! وہ دونوں بہت سمجھے ہوئے ہیں، کوئی شک نہیں ہونے دیں گے۔ بس اُن دونوں کو اُس کی نگرانی اور حفاظت ہی تو کرنا ہے نا!“ اُسی وقت ویٹر میرے لیے ملک شیک لے آیا۔ ثمینہ احمد کی میز پر کولڈ کافی وہ پہلے ہی رکھ چکا تھا۔ میری حفاظت اور نگرانی کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ ثمینہ احمد اپنے دشمنوں کو نیچا دکھانا چاہتی ہو۔ تلوار کٹ مونچھوں والا درمیانی کڑی تھا اور جن دو آدمیوں کو میری نگرانی کرنا تھی، وہ باہر تھے۔

”آپ اس کے ساتھ اتنی دیر یہاں ضرور بیٹھیے بیگم صاحبہ کہ میں، ان دونوں کو لے کر کافی ہاؤس کے سامنے پہنچ جاؤں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ثمینہ احمد نخوت سے بولی اور پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی کولڈ کافی پینے لگی۔

پھر اسی طرح آدھا گھنٹہ گزر گیا اور ثمینہ احمد بار بار اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ وہ جس کی منتظر ہے اُس کے پیچھے ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ”بڑی دیر کردی اُس نے۔“ ثمینہ احمد کافی دیر چپ رہ کر بولی، پھر ذرا توقف سے اُس شخص کو ایک ٹیلیفون نمبر بتا کر کہا۔ ”اس نمبر پر فون کر کے آجاؤ۔ تمھیں کچھ نہیں کہنا! دوسری طرف سے کسی کے بولتے ہی تم رابطہ منقطع کر دینا، مگر ٹھہرو!... فون کوئی ملازم بھی اُٹھا سکتا ہے۔ تم یہ کرنا کہ اُس کا نام پوچھ کر اور یہ کہ کر وہ گھر پر ہے یا نہیں؟ اس کے بعد ہی رابطہ منقطع کرنا!“

وہ شخص اقرار میں سر ہلا کر اُٹھ گیا اور میں مسکرانے لگا کیوں کہ وہ ٹیلیفون نمبر چاندنی چوک والے مکان کا تھا، وہی مکان جو میں چھوڑ چکا تھا۔ ثمینہ احمد یہ تصدیق کرانا چاہتی تھی کہ آیا میں ابھی وہاں سے چلا ہوں یا نہیں۔ ثمینہ احمد نے میرا نام اُس شخص کو نہیں بتایا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ پہلے ہی نام بتا چکی ہو گی۔ وہ شخص اُٹھ کر چلا گیا اور ثمینہ احمد اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھنے لگی۔ ثمینہ احمد جتنی جلدی میرے انتظار سے اُکتا کر وہاں سے اُٹھ جاتی میرے لیے اچھا ہی تھا۔ میرا زیادہ وقت ضائع نہ ہوتا۔ ثمینہ احمد نے جہاں فون کرایا تھا وہاں کوئی فون اُٹھانے والا نہیں، یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا! یہ علم ہونے کے بعد ثمینہ احمد کا وہاں مزید بیٹھنا محال ہی تھا۔ میں نے یہی سوچ کر بل ادا کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میری ٹیکسی، کافی ہاؤس سے دور کھڑی ہوئی تھی۔

میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے پوچھا۔ ”اب کدھر چلنا ہے سر؟“

”دیکھو وہ... وہ جو کافی ہاؤس نظر آرہا ہے، وہیں ایک ایمبیسڈر کھڑی ہے۔ آئی نظر؟“

”جی سر!“ ٹیکسی ڈرائیور نگاہ دوڑاتا ہوا بولا اور پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ ”تمھیں اُسی کے پیچھے پیچھے چلنا ہے اور اُسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔“ میں نے اُسے ہدایت دی۔ ”اگر تم کامیاب رہے تو انعام بھی دوں گا معاوضے کے علاوہ! اور ہاں درمیانی فاصلہ برقرار رکھنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اُسے کوئی مشتبہ ہو جائے۔“

”وہ کیسے سر؟“ ٹیکسی ڈرائیور نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ وہ یقیناً کچھ تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”اُسی کار والی کو!“ میں نے بغیر جھجک کہہ دیا، پھر بولا۔ ”وہ ذرا آہستہ چلو، وہ ابھی کافی ہاؤس سے نہیں نکلی۔“

”جی سر!“ ڈرائیور بولا اور ٹیکسی رینگنے لگی۔ پیچھے اور ٹریفک بھی تھا اس لیے اُس نے ٹیکسی کو سڑک کے کنارے کر لیا۔

”روک ہی لو، ایک طرف تو بہتر ہے۔“ میں نے کہا کیوں کہ اب کافی ہاؤس بالکل قریب تھا۔

”یہاں پارکنگ منع ہے سر!“ ڈرائیور نے بتایا۔

میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ ”ٹھیک ہے تو پھر آہستہ آہستہ چلتے رہو۔“ میں نے بہ مجبوری کہہ دیا۔ ٹیکسی، کافی ہاؤس کے سامنے سے گزر کر رائل نیپال ایرلائن کے دفتر کی طرف بڑھی۔ میں پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ ثمینہ احمد اب تک اندر ہی بیٹھی تھی۔ قبل از وقت اُٹھ کر میں نے غلطی ہی کی تھی ورنہ اس اُلجھن کا شکار نہ ہوتا۔ ”تم یہاں تو ٹیکسی روک سکتے ہو؟“ میں نے ایرلائن کے دفتر کے سامنے دوسری گاڑیاں کھڑی ہوئی دیکھ کر کہا۔

”جی سر!“ ڈرائیور نے میری تائید کی، پھر کہا۔ ”مگر سر، یہاں پارکنگ کی جگہ ہی نہیں ہے۔“

”جگہ کیسے یہاں! بس ذرا دیر انتظار کرنا ہے، کہیں بھی کھڑی کرلو، کسی بھی کار سے لگا کر! زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ اُس کار والے کو اپنی گاڑی نکالنے کے لیے ہماری ٹیکسی ہٹوانا پڑے گی تو اس وقت دیکھا جائے گا۔ بس کہیں بھی ذرا سی جگہ دیکھ کر روک لو ٹیکسی!“

”اور چالان ہو گیا سر، پھر؟“

”میں بھگت لوں گا، بس!“ مجھے اس کی بحث کھلنے لگی۔ اُس سے گفتگو کے دوران میں بھی میری نگاہ پیچھے ہی رہی تھی۔

ڈرائیور نے ایک جگہ ٹیکسی لگائی ہی تھی کہ ثمینہ احمد کافی ہاؤس سے باہر آگئی اور میں نے طویل سانس لیا۔ تلوار کٹ مونچھوں والا بھی اُس کے ساتھ تھا، مگر اُسے ثمینہ احمد نے اپنی کار میں نہیں بٹھایا۔ بڑے شہروں میں ٹریفک اور کار پارکنگ بھی ایک مسئلہ ہوتی ہے جس کا تجربہ مجھے کئی بار ہو چکا تھا۔ پھر جب ثمینہ احمد کی کار قریب سے گزرنے لگی تو میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا، پھر کار کی نشاندہی کی۔ اُس نے ٹیکسی کو ذرا سا ریورس میں لیا اور پھر ثمینہ احمد کی کار پر نگاہ جمائے ہوئے گیر بدلا۔

کناٹ پلیس کو جو مختلف سڑکیں، شہر کے دوسرے حصوں سے ملاتی ہیں، اُنھی میں سے ایک منٹو روڈ ہے جو پرانی

دلی کو جاتی ہے۔ ثمینہ احمد کی کار اُسی طرف جارہی تھی میں نے اس سے یہی اندازہ لگایا کہ وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا ہو کر اب چاندنی چوک جارہی ہے۔ تلوارگٹ ہوٹل والے نے اُسے بتادیا ہوگا کہ فون کوئی نہیں اُٹھا رہا۔ پھر میرا قیاس درست ہی نکلا۔ ثمینہ احمد نے چاندنی چوک کا ہی رُخ کیا۔ اپنی ٹیکسی کوتوالی سے ذرا آگے اور سنہری مسجد سے ذرا فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑی کرالی۔

"وہ اپنی کار اُس گلی میں لے گئی ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اگر وہ اُدھر ہی سے کہیں۔۔۔"

"نہیں۔" میں نے اُس کی بات کاٹی۔ "وہ ابھی واپس آجائے گی۔ تو پھر اُس کے پیچھے لگ جانا۔"

"جی سر!" ڈرائیور نے اطمینان کا سانس لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ثمینہ احمد کی کار، گلی سے نکلی تو میں نے سوچا، دیکھیں اب یہ عورت کدھر جاتی ہے؟ تعاقب پھر شروع ہوگیا۔ پرانی دلی کی مختلف سڑکوں اور چھوٹی بڑی آبادیوں سے گزرتی ہوئی وہ قرول باغ جا پہنچی۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میں اپنے گائیڈ سردار جی کے ساتھ پہلے بھی آچکا تھا۔ یہیں جبار احمد خاں رہتا تھا اور میں اُسی سے ملنے آیا تھا۔ گلیاں کچھ جانی پہچانی سی دکھائی دیں تو میں چونکا۔ کیا اب وہ جبار احمد خاں کے یہاں جارہی ہے؟ اُسی خاندانی رئیس سے ثمینہ احمد کو میرے بارے میں کچھ معلوم ہوسکتا تھا کیوں کہ میں اُسی کا مہمان تھا۔ اُس نے کہیں سے جبار احمد خاں کو فون کیوں نہیں کرلیا اور خود وہاں تک کیوں دوڑی چلی آئی؟ اس کی کوئی وجہ ضرور تھی۔ ممکن ہے اُسے جبار احمد خاں کے ساتھ کہیں جانا ہو۔ میں نے سوچا یا کوئی اور سبب ہو۔ وہ میری تلاش میں تھی اور میں اُس کی جستجو میں لگا ہوا تھا۔ بالآخر اُس کی کار، جبار احمد خاں کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوگئی اور میں نے ڈرائیور کو سیدھا نکل چلنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ پھر میں نے ٹیکسی کو حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج کے قریب رکوالیا۔ وہاں سے میں اُس راستے پر نظر رکھ سکتا تھا جہاں جبار احمد خاں کی کوٹھی تھی۔ جبار احمد خاں کی کوٹھی کا پھاٹک بھی مجھے نظر آرہا تھا۔ ثمینہ کی کار باہر آتی تو مجھے دکھائی دے جاتی۔

مجھے وہاں تقریباً نصف گھنٹے انتظار کرنا پڑا تو وہ کوٹھی سے نکلی۔ ڈرائیور کی نگاہ بھی اُس طرف تھی۔ اس نے فوراً ہی میرے کہے بغیر ٹیکسی اسٹارٹ کردی۔ ثمینہ احمد، جبار احمد خاں سے مل آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ میری طرف سے تقریباً مایوس ہوچکی تھی۔ جبار احمد خاں نے اُسے بتادیا ہوگا کہ میں واپس قاہرہ چلا گیا ہوں۔ اس کے بعد ثمینہ احمد نے کیا سوچا ہوگا؟ یہ میرا مسئلہ نہ تھا۔ میں تو اس وقت کسی اور فکر میں تھا۔ مجھے آج بہرحال ثمینہ احمد کی قیام گاہ کا سراغ لگانا تھا۔ اسی کے بعد میں اُس کے بارے میں چھان بین کرسکتا تھا۔ اس مقصد کے حصول میں بہت دیر لگے گی، یہ اندازہ مجھے پہلے سے تھا اسی لیے میں نے رات ایک بجے تک ٹیکسی نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک بجے رات تک تو وہ اپنے گھر پہنچ ہی جاتی۔ میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ ٹیکسی کی رفتار دھیمی ہوتے دیکھ کر چوکنا ہوگیا۔ سامنے ہی ایک وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارت کے سامنے میں نے ثمینہ احمد کی کار کو رکتے دیکھا۔ میرے پوچھنے پر ڈرائیور نے بتایا کہ یہ ساگر اپارٹمنٹس ہیں۔

"تم ٹیکسی روک کر مجھے کہیں اُتار دو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ کہیں ثمینہ وہیں نہ رہتی ہو! ایسی صورت میں اُس کا تعاقب ضروری تھا تاکہ مجھے اُس کے اپارٹمنٹ کا علم ہوسکے کہ وہ کس منزل پر ہے اور کہاں ہے؟

ثمینہ احمد اب اپنی کار کا دروازہ مقفل کررہی تھی۔ میری نگاہ اُسی کی طرف تھی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی تو میں جلدی سے اُتر گیا۔ اُس وقت رات کے سوا نو بج رہے تھے۔ بلڈنگ میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں تیز قدمی سے چلتا ہوا عمارت میں داخل ہوگیا۔ ثمینہ احمد لفٹ کا رُخ کرنے کی بجائے زینے کی طرف مڑ گئی۔ میں بھی کچھ فاصلے سے چلنے لگا۔ ثمینہ احمد کو یقیناً پہلی منزل یا پھر دوسری منزل پر جانا ہوگا ورنہ وہ زینے کا رُخ نہ کرتی۔ میں یہ سوچتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ پہلی ہی منزل کی راہداری میں آگے بڑھ گئی۔ وہاں بھی میرے علاوہ اور لوگ آجارہے تھے۔ ثمینہ احمد کو مجھ پر شک نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر بھی میں محتاط تھا۔ کچھ دور چل کر وہ ایک اپارٹمنٹ کے سامنے جاکر رُک گئی اور دروازے کی ایک جانب لگی ہوئی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ میں قریب پہنچا تھا کہ

دروازہ کھلا۔

"کنور ہے؟" میں اتنا ہی سُن سکا۔ یہ سوال ثمینہ احمد نے اُس شخص سے کیا تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی جان لینا کافی تھا۔ اس سوال کا واضح مطلب یہ تھا کہ اپارٹمنٹ، ثمینہ احمد کا نہیں ہے اور وہ کسی کنور نامی شخص سے ملنے آئی ہے۔

جواب میں کیا کہا گیا، مجھے نہیں معلوم، کیوں کہ میں آگے بڑھ گیا تھا۔ میں نے بس اتنا محسوس کیا کہ میرے عقب میں دروازہ پھر بند ہوگیا ہے۔ چند قدم چل کر میں یوں پلٹا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ دیکھا تو ثمینہ احمد غائب تھی۔ اُسے یقیناً اپنے سوال کا جواب اثبات ہی میں ملا تھا اور وہ اندر چلی گئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے واپس جاتی نظر آتی۔ کچھ دیر میں اُسی منزل پر اور ہر پھر کر اُسی راہداری میں گھومتا رہا، اس کے بعد نیچے آکر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ساگر اپارٹمنٹس ہی کی چودھویں منزل پر ہندوستان کے مشہور و معروف اداکار دلیپ کمار کا فلیٹ ہے۔ یہ بات مجھے ٹیکسی والے نے بتائی۔ وہ بھی فلموں کا رسیا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی دیر ثمینہ احمد کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اُس نے واپسی میں ساڑھے گیارہ بجا دیے۔ جب وہ بلڈنگ سے نکلی اور اپنی کار کی طرف بڑھی تو اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے بال کچھ بکھرے بکھرے سے اور لپ اسٹک کچھ اُڑی اُڑی سی اور لباس قدرے شکن شکن تھا۔ وہ شاید اسی لیے یہاں آئی بھی تھی، اپنی محرومیوں کا حساب چکانے!

"یہ تو کوئی اچھی عورت نہیں لگتی سر!" ٹیکسی ڈرائیور بھی اُس کی حالت دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔

"ہاں یہ بُری عورت ہے اور اسے خود بھی خبر ہے کہ یہ بُری ہے۔" میں روا روی میں کہہ گیا حالانکہ ٹیکسی ڈرائیور سے مجھے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔

"مگر آپ۔۔۔ آپ تو سر، شریف آدمی نظر آتے ہیں!"

"نظر آتا ہوں مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم اس چکر میں نہ پڑو اور ٹیکسی اسٹارٹ کرو۔ وہ کار میں بیٹھ چکی ہے۔"

اِس مرتبہ تعاقب کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا۔

"کون سی آبادی ہے یہ؟" میں نے ثمینہ احمد کی کار کو ایک کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھ کر ڈرائیور سے پوچھا۔

"ڈیفنس کالونی سر!" ڈرائیور نے بتایا۔

"ڈیفنس کالونی!" میں بڑبڑایا اور سوچا کہ یہ نام حال ہی میں کہاں سُنا ہے؟ مگر یاد نہ آسکا۔

اُس کوٹھی سے کچھ آگے جاکر میں نے ٹیکسی رکوائی اور ٹیکسی سے اُتر گیا۔ مجھے اُس کوٹھی کے پھاٹک کی ایک جانب نیم پلیٹ لگی ہوئی نظر آگئی تھی۔ یہ ثمینہ احمد کی قیام گاہ ہی ہوسکتی ہے ورنہ اتنی رات گئے، وہ یہاں نہ آتی۔ میں نے کوٹھی کے پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا جو اب دوبارہ اندر سے بند کیا جاچکا تھا۔ جب میں نے قریب جاکر نیم پلیٹ پڑھی تو چونک اُٹھا۔ اُس پر ایک ایسے شخص کا نام لکھا تھا جسے میں جانتا بھی تھا اور گزشتہ رات ہوٹل امپیریل میں اُس سے مل بھی چکا تھا۔ نیم پلیٹ پر نواب افتخار احمد کا نام لکھا دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ تو کیا ثمینہ احمد کا شوہر یہی شخص ہے؟ اگر ایسا ہی تھا تو یہ بڑی عجیب بات تھی۔ مجھے گزشتہ رات قطعی یہ احساس نہیں ہوپایا تھا۔ اب مجھے یاد آیا کہ ڈیفنس کالونی کا نام میں نے جبار احمد خاں سے سُنا تھا۔ اُسی نے پہلی بار مجھ سے نواب افتخار احمد کا ذکر کیا تھا اور پھر پارٹی میں اُس سے ملوایا بھی تھا۔ دوسرے مہمانوں کی طرح نواب افتخار احمد بھی پارٹی میں شرکت کرنے آیا تھا، کچھ اس لیے بھی میرا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ اب یہ معمّا بھی حل ہوگیا کہ ثمینہ احمد نے جبار احمد خاں کے یہاں میرا فون کیسے ریسیو کرلیا ہوگا۔ جبار احمد خاں اور نواب افتخار احمد کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے، اسی وجہ سے ثمینہ احمد کا بھی وہاں آنا جانا ہوگا۔ قریبی مراسم کے سبب وہ جبار احمد خاں سے کچھ بھی کہلوا سکتی تھی۔ اس سطر دیکھنے نے کہ نواب افتخار احمد، ثمینہ احمد کا شوہر ہوسکتا ہے، کم از کم میری ایک اُلجھن تو کم کر ہی دی۔ اُس پُراسرار عورت کے بارے میں اتنا علم ہوجانا بھی میری کامیابی تھی۔ اب مزید آگے بڑھنے کے لیے مجھے ایک اور راہ نظر آگئی تھی۔

پھر میں مزید نہیں رُکا اور ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا جو اب

"سبزی منڈی چلو۔ اس کے بعد تمھاری چھٹی!" میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔

"اچھا سر!" یہ کہتے ہوئے اُس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی، پھر بولا: "اگر کل کسی وقت ٹیکسی چاہیے تو بتا دیں، میں آجاؤں گا سر!"

"ابھی کچھ طے نہیں کیا ورنہ بتا دیتا۔" میں نے جواب دیا اور خاموش ہوگیا۔

میں نے ایک بجے سے پہلے ہی ٹیکسی والے کو چھوڑ دیا اور طے شدہ معاوضے سے کچھ زیادہ ہی روپے دے دیے۔ وہ غریب دعائیں دیتا ہوا چلا گیا تو میں اُس حویلی کے چوبی دروازے کی طرف بڑھا جہاں میرا قیام تھا۔ اُس وقت ہر طرف سناٹا تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر پہنچا ہی تھا کہ "چھن چھن"، کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں جیسے کوئی گھنگھرو پہنے ہوئے بھاگ رہا ہو۔ میں نے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور قدم بڑھائے۔ صحن میں پہنچ کر وہ آوازیں اور بھی واضح ہوگئیں۔ وہ آوازیں حویلی کے شکستہ حصے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں احتیاطاً صحن کا بلب جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ کچھ دیر وہیں کھڑا ہوا میں وہ آوازیں سنتا رہا، پھر بائیں جانب اُن کمروں کی طرف مڑ گیا جو سکونت کے قابل تھے اور جہاں میرا سامان تھا۔

بتی جلاتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہاں میری غیر موجودگی میں یقیناً کوئی آیا تھا۔ سارا سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا پڑا تھا۔ یہ وہ کمرہ تھا جسے میں نے خواب گاہ بنایا تھا۔ پھر دوسرے کمرے کا بھی میں نے وہی حال دیکھا۔ مجھے وہاں سے دو ایک چیزیں بھی غائب نظر آئیں۔ ابھی میں ایک نتیجے تک پہنچ ہی رہا تھا کہ ایک دم شور اُٹھا۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے اور پھر دوبارہ صحن میں آ گیا۔ شور ایسا تھا جیسے بہت سے کنکر پتھر آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ اسی کے ساتھ میں نے کتوں کے بھونکنے کی اور غرّانے کی آوازیں بھی سنیں۔ یہ شور اور آوازیں بھی شکستہ حصے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں کچھ سوچ کر اندر گیا اور بڑی سی ایک ٹارچ لے آیا جو میں نے دوسرے سامان کے ساتھ خریدی تھی۔ شور اب بھی جاری تھا۔ میں ٹارچ جلا کر شکستہ حصے کی جانب بڑھا۔ اس حصے کا جائزہ میں شام ہی کو لے چکا تھا۔ وہاں روشنی نہیں تھی۔ ٹارچ میں اسی لیے لایا تھا۔ ابھی میں اُس شکستہ حصے میں چند قدم آگے بڑھا تھا کہ میری ٹارچ کا دائرہ ایک بلی پر پڑا۔ وہ ایک شکستہ دیوار کو پھاند کر بائیں طرف بھاگی تھی اور "چھن چھن"، کی صدائیں ابھری تھیں۔ میں نے اُس بلی کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے پیتل کے گھنگھرو بندھے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ پھر مجھے دو کتے بھی نظر آ گئے جن کی کمر میں ٹین کے ڈبے بندھے تھے اور ان ڈبوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔

ان بچکانہ حرکتوں پر مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ صاف ظاہر تھا کہ مجھے اُس حویلی سے ڈرا کر بھگا دینے کے لیے یہ حرکتیں کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہ تھا کہ وہ لوگ یقیناً جرائم پیشہ ہوں گے۔ اس حویلی کو آسیب زدہ مشہور کر لینے کا مقصد بھی واضح تھا۔ شام کے وقت وہاں نہ بلیاں تھیں نہ کتے۔ یہ حرکتیں میرے جانے کے بعد ہی کی گئی ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ ممکن ہے، وہ لوگ آس پاس موجود ہوں۔ انھیں سبق دینا ضروری تھا۔ ان کی یہ حرکات و جسارت بھی قابلِ معافی نہیں تھی کہ انھوں نے میرے سامان کی تلاشی لی تھی اور کچھ سامان غائب بھی کر دیا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا اُس بیرونی دیوار کی طرف بڑھا جو ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہیں سے وہ لوگ حویلی کے اندر آئے ہوں گے اور اُن کتے بلیوں کو اندر چھوڑا ہوگا۔

"بھاگ جا!... بھاگ جا!" معاً سناٹے میں ایک بھاری آواز گونجی۔

میں رُک گیا۔ وہ آواز اُسی ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف سے آئی تھی جدھر میں بڑھ رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اُس طرف پھینکی تو ٹوٹی ہوئی دیوار کے خلا میں ایک انسانی کھوپڑی رکھی نظر آئی۔

"بھوتوں کے ڈیرے سے بھاگ جا!" وہ بھاری آواز اُس کھوپڑی کے عقب سے پھر آئی۔

دیوار کی دوسری جانب باہر یقیناً کوئی کھڑا ہے اور یہ بکواس کر رہا ہے۔ میں نے سوچا اور تیزی سے قدم بڑھانے چاہے۔ اُسی وقت اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن میں زبردست جھماکا ہوا ہے۔ اس کا اثر میری آنکھوں پر

بھی پڑا۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی روشنیوں کا جال سا پھیل گیا اور میرے قدم رُک گئے۔ پھر وہ روشنیاں بجھ گئیں اور تاریکی پھیل گئی۔ مجھ سے اب بھی بھاگ جانے کو کہا جا رہا تھا۔ چند ہی لمحے اور گزرے ہوں گے کہ مجھے انتہائی تیز نشے کی لہر سی اپنے لہو میں گردش کرتی محسوس ہوئی۔ اس کیفیت میں بڑی لذت تھی۔ میں اسی جگہ ٹوٹی ہوئی دیواروں کے درمیان ناہموار سی زمین پر بیٹھ گیا اور پھر کسی ایسے شرابی کی طرح بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا جس نے بہت چڑھا لی ہو۔ میرا دل لیٹنے کو چاہا تو وہیں دراز ہوگیا۔ ٹارچ اب بھی جل رہی تھی مگر میرے ہاتھ سے نکل کر لڑھک گئی تھی۔ تیز نشے میں آدمی کا جی چاہتا ہے کہ بس آنکھیں بند کیے پڑا رہے، کوئی چھیڑے نہیں۔ یہی حال میرا تھا۔ اس حالت میں ہاتھ پَیر چلانے یا حرکت کرنے کو بھی زیادہ جی نہیں چاہتا۔ یہ کیفیت میرے لیے بالکل نئی، انوکھی اور لذت انگیز تھی۔ نشہ زیادہ ہو تو آدمی کا ذہن فکر کا بوجھ بھی زیادہ برداشت نہیں کرتا۔ کوئی ایک خیال دیر تک ذہن میں نہیں رہتا۔ جو لوگ کسی نشے میں اپنے دُکھوں اور تفکرات کو بھول جانے کی باتیں کرتے ہیں، اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔ دُکھوں اور محرومیوں کا خیال دیر تک ذہن میں نہیں رہتا۔ یہ گہرے نشے اور باظرف لوگوں کا ذکر ہے، اُن کا نہیں جو بہک جاتے ہیں اور اُن کا بیان بھی نہیں جو حواس ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ نہ ہی میں نے حواس کھوئے تھے نہ بہک اُٹھنے کا معاملہ تھا۔ تبھی آنکھیں کبھی مجسم نہیں دیکھ پاتیں اور اگر دیکھ پاتی ہیں تو وہ جیسے خواب ہو جاتے ہیں۔ انھی بے دلوں کے ہجوم میں مجھے ایک آشنا چہرہ نظر آیا۔ یہ چہرہ بہت دنوں سے جانے کہاں کھو گیا تھا۔ فرصتِ نظارہ ہو تو دید کے قابل بہت چہرے، بہت صورتیں! میرے ساتھ بھی یہی تھا۔ فرصتِ نظارہ ہی کہاں تھی! ایک بھولی بسری یاد نے چپکے سے دل میں چٹکی لی اور ایک چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ ایک زخم تھا کہ اتنے دن بعد بھی لَو دیے جا رہا تھا۔ وہ مجھے بغداد میں ملی تھی، بصرے کی ایک حسینہ صالحہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُس وقت اُن کیف آگیں لمحات میں وہ مجھے کیوں یاد آ گئی؟ میں تو دلّی میں تھا۔ سبزی منڈی کی ایک پرانی اور آسیب زدہ حویلی میں! پھر یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا؟ لمحے بھر کو یہ سوال ذہن میں اُبھرا اور پھر قدموں کی چاپ سنتے ہی تیز ہوا کے جھونکے کی طرح ذہن کے دریچوں سے نکل گیا۔ اب پھر وہی عالم تھا، ایک عالمِ بے نام!

"ہری! یہ شاید دہشت سے بے ہوش ہو گیا ہے۔" میں نے ایک آواز سنی۔ یہ وہی بھاری آواز تھی جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

"ہاں استاد!" جواب میں کہا گیا۔ "یہی لگتا ہے۔"

میں نے بمشکل بوجھل پلکیں اُٹھائیں اور تاریکی میں دو سائے سے قریب کھڑے دیکھے۔ کاہلی نے مجھے زبان کھولنے سے بھی باز رکھا۔

"اب ایسا کرو ہری کہ اسے اُٹھواؤ۔ اسے وہیں اُدھر والے کمرے میں پھینک آتے ہیں۔ صبح ہوش آیا تو خود ہی بھاگ جائے گا یہاں سے۔"

"اچھا اُستاد!" ان میں سے ایک سایہ جھکا، پھر دوسرا۔ پھر وہ دونوں مجھے اُٹھائے ہوئے حویلی کے دوسرے حصے میں لے آئے جہاں روشنی تھی۔ اب وہ صحن سے گزر رہے تھے۔

"ارے اُستاد، یہ تو آنکھیں پٹپٹا رہا ہے!" وہ جو میرے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، اپنے ساتھی سے بولا۔

"ہے ہاں، واقعی!" دوسرا بھی بولا اور چلتے چلتے رُک گیا۔ "ہری! اِسے پٹخ دے سسرے کو یہیں!"

انھوں نے میرے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ اُن دونوں کے چہرے میرے لیے جانے پہچانے تھے۔ ایک کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ ادھیڑ عمر تھا۔ دوسرا جوان تھا اور وہ بھی زخمی تھا۔ اُس کی ٹھوڑی سے پٹی بندھی تھی۔ یہ دونوں میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوئے تھے اور یہ گذشتہ رات ہی کی بات تھی۔ مجھے سب کچھ یاد تھا۔ اُس وقت اُن کی تعداد چار تھی اور اُن کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔ یہ واقعہ ہوٹل امپیریل میں پیش آیا تھا مگر اُس وقت میرے چہرے پر میک اپ نہ تھا اور ثمینہ احمد بھی میرے ساتھ تھی۔ مجھ پر حملہ کرانے کے لیے اُن پیشہ ور غنڈوں کی

خدمات ایک امریکی عورت سے حاصل کی تھیں۔ میں تو اُن دونوں کو پہچان گیا لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکے۔ وہ مجھے کوئی ہندوستانی تو سمجھے ہوں گے۔ اُنھیں پہچان لینے کے باوجود میرے اندر کوئی ہیجان پیدا نہ ہوا۔ ہاں یہ خیال ضرور آیا کہ وہ خواہ مخواہ میرا نشہ خراب کر رہے ہیں۔

"پتہ نہیں یہ اب بھی اپنے حواس میں معلوم نہیں ہوتا شاید۔ کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہے۔ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا۔

"لگتا تو یہی ہے اُستاد!" نوجوان تائید میں بولا۔ "ایسا کیوں نہ کریں کہ اس کا سارا سامان ہی صاف کر دیں؟ صبح تو بھاگ ہی جائے گا یہ!"

"تو پھر چلو آؤ، اسے یہیں پڑا رہنے دو!"

پھر اُن دونوں کو میں نے ان کمروں کی طرف جاتے دیکھا جو میرے استعمال میں تھے۔ میں صحن میں پڑا ہوا سب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُن کے بقیہ دو ساتھی بھی آ گئے۔ سامان نہ تھا اور بقیہ سامان ڈھونے میں اُنھوں نے بہت تیزی دکھائی۔ سامان لے جانے کے لیے اُنھوں نے حویلی کے شکستہ حصے ہی کو راستہ بنایا تھا۔ آخر میں پھر آکر وہ چاروں میرے پاس آ کھڑے ہوئے۔

اب جاؤ بھی! میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ جس طرح پان میں کوکین رکھ کر کھانے والے بولنے سے بچتے ہیں کہ نشہ نہ بگڑے یا افیون گلے میں دبا کر کوئی افیونی دم سادھے پڑا رہتا ہے، کچھ ایسی ہی مجھ پر گزر رہی تھی اور میں اپنی اس حالت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گزرتے لمحوں کی تفصیلات میری نظر میں تھیں۔ کسی نشے باز کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ عموماً وہ نشے کی اکثر باتیں بھول جاتا ہے۔

اُن چاروں کے آنے سے قبل میری آنکھیں بند تھیں۔ قدموں کی چاپ میرے قریب آکر ختم ہوئی تو میں نے مجبوراً آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا۔ نہ جانے اب وہ اور کیا چاہتے تھے؟

"اُستاد!" معاً اُن میں سے وہی نوجوان بولا جو پہلے سے ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ تھا۔ "تو پھر کر دیں اس کا ٹیا پانچا؟"

"یہی سوچ رہا ہوں... ذرا ٹھہرو!" ادھیڑ عمر شخص کچھ سوچنے لگا، پھر وہی ذرا دیر بعد بولا۔ "مشورہ تو ٹھیک ہے تم لوگوں کا لیکن پولیس کا چکر چل جائے گا۔ پچھلے مہینے بھی اُس عورت کی وجہ سے ہمیں باڑی خالی کرنی پڑی تھی۔ یہ حویلی لاکھ آسیب زدہ مشہور سہی۔ مگر یہاں روز روز لاشیں ملنے لگیں تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہ تو آپ ہی مرا ہوا ہے، اسے کیا مارنا! میرے خیال میں تو یہ خوفزدہ ہو کر سرک ہی گیا ہے اور ایسا نہیں بھی ہوا تو ہوش و حواس ٹھیک ہوتے ہی یہاں نہیں رکے گا۔ کچھ فائدہ کیا ہے مارنے سے بتاؤ!"

"استاد ٹھیک کہہ رہے ہیں بھیلے!" انھی کے ایک اور ساتھی نے نوجوان سے کہا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص کی تائید میں بولا تھا۔ اُس کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اُنھوں نے مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد یہی طے کیا کہ مجھے قتل نہ کیا جائے۔ میں دل ہی دل میں اُن کی احمقانہ گفتگو پر ہنس رہا تھا۔ وہ جسے دنیا کے خطرناک ترین ایجنٹ ابوالہول کہتے ہیں اور جس کا نام سن کر کانپنے لگتے ہیں، وہ اُسی کو قتل کرنے یا نہ کرنے پر بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ اگر اُنھیں اتنا بھی معلوم ہو جاتا کہ گزشتہ رات میں نے ہی ناک چنے چبوائے تھے تو بھی وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ لیتے۔ غرض کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے وہ چاروں، حویلی کے تاریک اور شکستہ حصے کی طرف چلے گئے۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ انھوں نے اس حویلی کو اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ پچھلے مہینے وہاں کسی عورت کی لاش پائی گئی تھی۔ یہ بات کسی والے نے بھی بتائی تھی اور ان لوگوں نے بھی کسی عورت کا ذکر کیا تھا۔ وہ کسی عورت کو وہاں پکڑ کر لائے ہوں گے اور پھر اس ڈر سے اس عورت کو قتل کر دیا ہوگا کہ وہ بچ جانے پر اُن کی نشان دہی نہ کر دے۔ میں نے بس کچھ ہی دیر ان باتوں پر غور کیا۔ پھر اُن لوگوں کا خیال میرے ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ دراصل مجھے اُس عورت کے ذکر پر ایک اور عورت یاد آ گئی تھی، نیلی آنکھوں والی یمامہ!

جو مجھے قاہرہ میں ملی تھی۔ بس اتنا ہی تو فرق تھا کہ یمامہ کی لاش کو میں نے خود زمین کے سینے میں اتارا تھا۔ نیلی آنکھوں والی یمامہ کے تصور نے اُس عجیب نشے میں اور اضافہ کر دیا۔ میں وہیں پڑے پڑے اُس نشے کی لہروں پر بہتا ہوا نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح مجھے سورج نے جگایا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور صحن میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ میں نے سائے کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ حویلی کا شکستہ حصہ وہاں سے قریب تھا۔ میں صحن سے اُٹھ کر ایک دیوار کے سائے میں پڑ رہا۔ ابھی تک ذہن پر آرام طلبی سوار تھی اور وہ عجیب لذت انگیز نشہ بھی گزشتہ رات سے برقرار تھا۔ کافی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ اب اُٹھنا چاہیے۔ میں اُٹھ کر چلا تو بالکل یوں جیسے خواب میں چل رہا ہوں۔ میرے جی میں جانے کیا سمائی کہ اُس حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں ہوش میں تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ سبزی منڈی کی گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گھوم گھام کر میں پھر حویلی کی طرف لوٹ آیا۔ حویلی کا چوبی دروازہ ویسے ہی جس طرح کھلا چھوڑ گیا تھا اُسی طرح ملا۔ اندر آ کر میں نے اسے بھیڑ دیا۔ چھوڑ کر گنڈی کون لگائے! اندر ہے بھی کیا! میں نے سوچا اور بائیں جانب والے دو کمروں میں سے ایک کے اندر گھس کر فرش پر تقریباً ڈھیر ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا جسم میرے ارادے کے تابع نہیں ہے۔

آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ میں اپنے بس میں کیوں نہیں رہا؟ پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں اُس محلے کی ایک گلی سے گزر رہا تھا تو کسی نے مجھے دیکھ کر کہا تھا؟ "اس پر بھی سایہ ہو گیا۔ شاید اس بیچارے کو معلوم نہیں ہوگا کہ حویلی میں آسیب رہتے ہیں!"

آسیب! میں یہ سوچ کر ہنس پڑا اور جانے کب تک ہنستا رہا۔ محلے والے شاید ان بدمعاشوں کو آسیب سمجھتے ہیں جو جنگل کے رستے اُس حویلی میں آتے ہیں۔ میں ہنستے ہنستے رُک کر سوچنے لگا۔ ہاں ایسا ہی ہوگا! اور کیا ہو سکتا ہے!

مجھے نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ سونے اور اُٹھنے بیٹھنے کا خیال۔ بس ایک ہی ترنگ سی تھی، ایک نشہ سا تھا ایک لہر سی تھی۔ کہاں پڑا ہوں؟ کیوں پڑا ہوں؟ اس کا احساس تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی تھی، سب کچھ دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا، محسوس کر رہا تھا لیکن اس سننے، دیکھنے اور محسوس کرنے میں ایک نمایاں فرق تھا۔ یوں جیسے کوئی بے عمل، بے ارادہ اور کاہل آدمی! وہ جو سب کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہ کرنا چاہے۔ اسی عالم میں رات ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے کے باوجود میں نے بتی نہیں جلائی۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا وقت ہوا تھا کہ مجھے اندھیرے میں لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں آئیں۔ یہ وہی بدمعاش ہوں گے! میں نے سوچا اور اُن کے قدموں کی چاپ کو دھیان سے سننے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوئے اور مجھ پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"ارے یہ تو یہاں پڑا ہے!" کوئی بولا۔ اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹارچ کا دائرہ میرے جسم کے اطراف گردش کر رہا ہے۔ وہی آواز پھر آئی۔ "کیا کریں استاد؟"

"کچھ نہیں!" جواب میں ادھیڑ عمر کی آواز اُبھری۔ یہ آواز بھی میرے لیے آشنا تھی۔ "مجھے تو دن ہی میں خبر ہو گئی تھی کہ یہ گیا نہیں۔ ویسے اس کا یہاں رہنا ہمارے لیے اچھا ہے۔ پڑا رہے ہمارا کیا لے گا! حویلی میں کچھ ہوا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ..."

"وہ تو ٹھیک ہے استاد، مگر یہ مر گیا تو؟"

"تو مر جائے گا ہمیں کیا!"

"لگتا ہے استاد کہ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں!"

"ہری!" ادھیڑ عمر شخص کی آواز میں سختی آگئی۔ "تو کچھ زیادہ ہی ہمدرد بن رہا ہے اس کا! تیرے کلیجے میں بڑا درد اُٹھ رہا ہے!"

"یہ بات نہیں استاد!" نوجوان کی آواز سنائی دی۔ "تم کہو تو میں ابھی اس کے ٹکڑے کر دوں!"

"بس بس رہنے دے!" ادھیڑ عمر شخص آہستہ سے ہنسا۔ "اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ معلوم ہے لوگ کیا کہیں گے؟... باؤلی کا جن اس کے سر پر بھی آ گیا!" وہ اور زور سے ہنسا۔

پھر وہ لوگ چلے گئے۔ یوں اُنھوں نے اپنی دانست میں میرے وجود کو قطعی بے ضرر جان کر مجھے وہاں رہنے دیا۔ میں اُن کی حماقت پر ہنسنے کے سوا اور کیا کرتا۔ وہ رات سوتے جاگتے گزری۔ کبھی آنکھ کھلتی تو مجھے ثمینہ احمد کا خیال آتا، کبھی میں اُس کی سوکن جمیلہ احمد کے بارے میں سوچنے لگتا اور کبھی اپنی ماں کے بارے میں سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ جاتی۔ صبح ہونے کا احساس روشنی سے ہوا اور میں انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ پہلے نہانے کا خیال آیا، پھر سوچا کہ چھوڑو، کون نہائے، یوں ہی چلتے ہیں۔ کہاں؟ یہ ذہن میں نہیں تھا۔ بس اتنا خیال تھا کہ مجھے اُس حویلی سے نکلنا چاہیے۔ سر کے بال بے ترتیب، کپڑے شکن شکن اور جگہ جگہ سے گرد آلود۔ میری ظاہری حالت کسی دیوانے کی سی تھی۔ مجھے احساس یقیناً تھا مگر جب دیوانگی ہی میں لطف آنے لگے تو بھلا کوئی ان باتوں کی پروا کرتا ہے! سو میں نے بھی کوئی پروا نہ کی۔ کوئی کچھ بھی سمجھے، مجھے کیا؟ قلندری و مستی کے باوجود مجھے راستوں کا ضرور خیال رہا۔ کہیں میں راستہ نہ بھول جاؤں؟ اللہ کے ان "نیک" بندوں نے میرے پاس کچھ نہ چھوڑا تھا۔ میری جیبیں خالی تھیں۔ چلتے چلتے جب میں تھک گیا تو کہیں کچھ دیر بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈی۔ دھوپ میں اب تیزی آ گئی تھی۔ مجھے ایک کنویں کے قریب پیپل کا پیڑ نظر آیا۔ وہاں کچھ سایہ تھا۔ اسی پیڑ کے نیچے تنے سے ٹیک لگا کر میں نے دونوں پیر پھیلا دیے۔ بڑا سکون ملا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"ہے ری ساوتری! وہ دیکھ، وہی بیٹھا ہے حویلی والا!" قریب ہی مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اُن دونوں کو دیکھا۔ اُنھی میں سے شاید کسی کا نام ساوتری تھا۔ اُن کے کولھوں پر پیتل کے کلسے رکھے تھے۔ کھلتے رنگ کی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھوں والی لمبی سی لڑکی مجھے حیرت سے دیکھے جا رہی تھی اور دوسری جو سانولی تھی، اُس پر میں نے ایک نگاہ ڈالی۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

"یہ صالحہ تو بغداد میں تھی، یہاں کہاں سے آ گئی؟ اور یہ ساڑی کیسے باندھ لی اِس نے؟" میں نے اُس لمبی لڑکی کو آواز دی: "صالحہ!"

"نہیں جی، اِس کا نام تو ساوتری ہے۔" سانولی لڑکی نے مجھے ٹوکا۔

"نہیں یہ صالحہ ہے، تم جھوٹ بولتی ہو!" میں اپنی رَو میں کہے گیا۔

"تو اسے جو کہتا ہے کہنے دے نا!" لمبی لڑکی نے سانولی سے کہا۔ "کیا دیکھتی نہیں کہ میرے سوامی سے اِس کا چہرہ کتنا ملتا ہے!" اُس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "آج قریب سے دیکھا ہے۔ مانو اُنھوں نے دوسرے جنم میں درشن دیا ہو!"

"اب چل بھی، ورنہ چاچی ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آ جائے گی۔ آج گنیش جی کی دکشنا بھی دینی ہے نا۔ جب سے تیری مانگ اُجڑی ہے تو ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگی ہے۔ ساوتری! یہ تو کوئی میاں جی ہیں!" سانولی لڑکی نے اپنی ساتھی کو سمجھایا۔

"یہ صالحہ نہیں ہے، مجھے دھوکا ہوا ہے۔" میں نے سوچا اور کنویں سے اُن دونوں کو پانی بھرتے دیکھتا رہا۔ پانی بھر کے اُنھوں نے کلسے اپنے کولھوں پر رکھے اور چل دیں۔ لمبی لڑکی جو مجھے پہلی نظر میں اپنی صالحہ معلوم ہوئی تھی، جاتے جاتے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی اور اُس کے کلسے کا پانی چھلکتا رہا۔ اُس کے ماتھے پر درمیان میں کسی زخم کا نشان تھا اور ٹھوڑی کے گڑھے میں ایک نمایاں تل! میں نے اُسے بہت غور سے دیکھا تھا۔ سفید کسی ہوئی ساڑی میں اُس کا متناسب جسم کسی فنکار کا شہکار معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے صدیوں سوچنے کے بعد تخلیق کیا گیا ہو۔ کیسا عجیب اور حسین اتفاق تھا کہ اجنبیت کے باوجود مجھے آشنا معلوم ہوئی اور اُس نے بھی میری صورت میں کسی کی صورت دیکھی، اُس کی صورت جو اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ میری نگاہیں اس وقت تک اس کا پیچھا کرتی رہیں جب تک وہ سامنے ہی نظر آنے والے مکانوں کی ایک قطار کے قریب پہنچ کر ایک گھر کے دروازے میں داخل نہ ہو گئی۔ سانولی لڑکی اس کے برابر والے گھر میں چلی گئی تھی۔

دلی کا وہ محلہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا۔ کچھ گھروں میں تو سرکاری نل تھے، کچھ میں نہیں۔ بڑے شہروں کے نواحی

علاقوں میں اب بھی کنوؤں سے پانی بھرنے کا رواج ہے۔ خصوصاً ہندو کنوؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہاں میں نے مسجدوں میں بھی کنویں دیکھے۔ دلی کے تو ایک محلے کا نام بھی آج تک لال کنواں ہے۔ ہندو ہر اُس شے کی پوجا کرتے ہیں جو اُن کی زندگی کے لیے ضروری ہو، مثلاً پانی، سورج اور ایسی ہی دوسری ضروری اشیا! میرے حافظے میں ہندوستانی رہن سہن کے بارے میں یہ ساری باتیں محفوظ تھیں اِس لیے نئی ہونے کے باوجود یہ باتیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ ہاں مجھے اُس ماحول اور اُس فضا میں رچنے بسنے، اُسے اپنانے میں وقت ضرور لگا۔ میں اُس وقت کیوں کہ ایک اور ہی عالم میں تھا اس لیے زیادہ دیر نہ مجھے وہ لڑکی یاد رہی اور نہ ہی میں وہاں بیٹھا۔

صبح و شام کا سفر جاری رہا اور کچھ ہی دن میں محلے والوں نے مجھے ایک بے ضرر حواس باختہ شخص کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ میں اب اُس محلے سے نکل کر دوسرے محلوں کے گلی کوچوں میں بھی گھومنے نکل جاتا مگر رات ہوتے ہی وہیں پلٹ آتا۔ اب رات کو اگر میرا جی چاہتا تو اُس پرانی حویلی میں جا گھستا ورنہ کہیں بھی پڑ رہتا۔ ہاں روز اُس کنویں کے قریب پیپل کے نیچے کچھ دیر کو ضرور بیٹھتا جہاں وہ لڑکی ملی تھی جس پر مجھے صالحہ کا گمان ہوا تھا۔ اکثر رات کو بھی میں وہیں سو جاتا۔ حویلی کے اندر ہری مجھ پر مہربان تھا اور حویلی کے باہر وہ لڑکی ساوتری۔ اُن دونوں کے علاوہ بھی لوگ میرے کھانے پینے کا خیال رکھتے۔ بالکل یوں جیسے میں اُن کی ذمے داری ہوں۔ جس نے جو کھانے کو دے دیا، کھا لیا، پی لیا اور چل دیے۔ اس میں بڑا مزہ تھا۔ وہ نشہ ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا اور نہ کچھ سمجھ میں آتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

کبھی کبھار اپنی ماں کو ڈھونڈنے کی ایک ترنگ سی اُٹھتی اور میں دیر تک دلی کے گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا۔ لوگ مجھے مجذوب سمجھتے اور ستانے سے گریز کرتے۔ اِس میں میرے جسم سے اُٹھنے والی خوشبو کو بھی دخل تھا۔ میں نے اسی عالم میں کئی بار جامع مسجد کے پھیرے کیے۔ آس پاس جو آبادیاں تھیں وہاں بھی گھوما پھرا۔ چاوڑی، مٹیا محل، اردو بازار، چتلی قبر، اِدھر اُدھر جانے کہاں کہاں! اور پھر وہی سبزی منڈی کے راستے اب میرے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ گئے تھے۔ ایک دن چاندنی چوک میں گھومتا ہوا اسٹیشن کی طرف بھی نکل گیا۔ نہ کوئی مجھ سے کچھ بولتا، نہ میں کسی سے کچھ کہتا۔ ظاہری حالت بھی ایسی تھی کہ لوگ دیوانہ سمجھتے۔ جوتے بھی ایک روز میں نے اُتار کر پھینک دیے تھے۔ خاک بسر اور پابرہنہ گھومتا اور مست رہتا۔ جمنا کے کنارے ایک دن مجھے کچھ سادھوؤں نے چلم میں گانجا بھر کے پلایا اور مجھ سے ساتھ رہنے کو بھی کہا مگر میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ مجھے پیپل کے ایک پیڑ سے بڑا اُنس ہو گیا تھا اور وہ پیڑ سبزی منڈی میں تھا۔ میں گھوم پھر کر وہیں آسن جماتا۔ وہاں ساوتری آتی تھی، کبھی میرے ہاتھ پیر اور منہ دھلوانے اور کبھی کھانا کھلانے۔ وہ میرے سامنے تنکوں سے جڑے ہوئے پتوں پر کئی کئی طرح کے ساگ ڈال دیتی۔ پوریاں اور کچوریاں بھی کھلاتی، پھر میری اوک میں اپنے لوٹے سے پانی ڈالتی اور خوش خوش چلی جاتی۔ جانے اُسے مجھے کھلا پلا کر کیا ملتا تھا۔ یہ اُنھی دنوں کی بات ہے کہ ایک رات وہ میرے پاس آ گئی اور بولی۔

"سوامی جی! آج بڑی گرمی ہے!"

"ہُوں!" میں نے لیٹے لیٹے کہا۔ جواب میں ہاں ہُوں کے سوا میں کم ہی کچھ بولتا تھا۔

"گھر میں جی گھبرا رہا تھا، چاچی سے نہیں، سوچا آپ کے درشن کر لوں۔" میں نے اُسے اپنے قریب بیٹھتے دیکھا۔ "کیسا اندھیرا ہے آج رات! من میں بھی اور باہر بھی! ہے نا سوامی جی؟"

"ہاں۔" میں نے اُس کا لمس محسوس کیا۔ اِس سے پہلے وہ میرے اتنے قریب کبھی نہیں آئی تھی۔ میں نے چاہا کہ اُس سے کہوں، اتنا اندھیرا نہیں جتنا تم محسوس کر رہی ہو۔ وہ دور اُدھر ایک کھمبے کا بلب جل تو رہا ہے۔ مگر بس سوچ کر ہی رہ گیا۔ کبھی کبھی چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل آتا تھا۔ میں نے اس کا بھی ذکر نہ کیا۔ مجھے اُس کا آنا اچھا لگا۔ اُس کے آنے سے میرا نشہ کچھ اور بڑھ جاتا تھا۔

"سوامی جی! کبھی آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی اور مزید قریب آ گئی۔ "آپ بولتے کیوں نہیں؟" شاید کافی دن کے بعد میرا جی بولنے کو چاہا مگر صرف اُس کا نام لے سکا۔ "ساوتری!"

"سوامی!... آپ... آپ میرا نام جانتے ہیں... جانتے ہیں نا؟"

"وہ ہوں!"

"میں بھی آپ کو جنم جنم سے جانتی ہوں... جنم جنم سے!" اُس کی آواز کانپنے لگی۔

جانے کیوں مجھے نیلی آنکھوں والی یامہ یاد آنے لگی اور اِسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ ساوتری کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُسے میرے اتنے قریب نہیں آنا چاہیے۔ میں نے رُک رُک کر لڑکھڑاتی زبان سے کہا "ساوتری!... چلی... تم چلی جاؤ... جاؤ!"

"چلی جاؤں سوامی جی!" وہ حیرت سے بولی "میں... میں تو آپ کے چرنوں کی دھول اپنی مانگ میں بھرنے آئی تھی۔ اُس کے لیے میں اب التجا تھی کہ میرے من کو شانت کر دیں سوامی جی! میں نے آپ کو جان پہچان لیا ہے۔ آپ... آپ کسی بھیس میں مجھ سے نہیں چھپ سکتے!"

ماتھے پر پونم کا چاند چمک رہا تھا اور ٹھوڑی پہ بیچ اِک تارا! میں نے سوچا۔ ساوتری! اِس کل جگ میں اُجیارے کے لیے تیرا دھیان ہی بہت ہے، مان جا! مگر وہ نہیں مانی۔ جمنا کنارے کسی سادھو سے میں نے ایسا ہی کوئی دوہا سُنا تھا۔

خطرہ بڑھنے لگا تو میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اُسے وہیں پیپل کے نیچے سسکتا ہوا چھوڑ کر حویلی کی طرف چلا آیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ حویلی کے پھاٹک میں اب مالک مکان نے تالا ڈال دیا تھا۔ مجھے وہاں سونا ہوتا تو عقبی دیوار پھاند کر اندر چلا جاتا۔ وہی دیوار جو ٹوٹی ہوئی تھی۔ مجھے روکتا بھی کون! جو لوگ وہاں کبھی کبھار آ کر رات بسر کرتے تھے، اُن کے لیے میں اجنبی نہیں تھا۔ ادھیڑ عمر شخص اور اُس کے تین ساتھی! اِس دوران میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ ضرورتاً ہی اُدھر کا رُخ کرتے تھے اور عموماً حویلی خالی پڑی رہتی تھی۔ وہ اُس وقت حویلی میں آتے تھے جب پولیس اُن کی تلاش میں ہو یا پھر حویلی کی باؤلی میں اُنھیں چوری چکاری کا مال چھپانا ہو یا پھر شراب پی کر اودھم مچانا ہو۔ اُنھیں یہ خوف تو تھا نہیں کہ حویلی کے باہر اُن کے قہقہے سُن کر کوئی اُدھر متوجہ ہو گا۔ لوگوں کے خیال میں تو وہاں جن اور آسیب بستے تھے۔ کبھی میں بھی حویلی میں ہوتا تو مجھے اپنے جشن میں شریک کر لیتے۔ ہفتے میں بس دو ایک دن ہی وہ آسیب زدہ حویلی، اُن آسیبوں سے آباد ہوتی۔ جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس وقت وہ لوگ وہاں نہیں تھے۔ میں حویلی کے شکستہ حصے میں سونے سے، اُنھی کی وجہ سے گریز کرتا تھا کہ رنگ میں بھنگ نہ ہو۔ میں اُدھر سے گزر کر اُس حصے میں پہنچ گیا جو ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ ساوتری کا خیال ابھی تک میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ بیوہ جوان لڑکی یقیناً اس بات سے بے خبر تھی کہ میں نے اُس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

اُس حویلی کے در و دیوار میرے لیے آشنا تھے اس لیے اندھیرے کے باوجود مجھے وہاں جانے آنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ میں ایک کمرے میں پہنچ کر گرد آلود فرش پہ لیٹ گیا۔ نہ وہاں کوئی صفائی کرنے والا تھا اور نہ ہی مجھے اس کی پروا تھی۔ مجھے وہاں لیٹتے ہوئے قطعی یہ احساس نہ تھا کہ کچھ ہی دیر بعد مجھ پر کیا گزرنے والی ہے۔ وہ تو جب میرے ذہن میں ایک مانوس سی سنسناہٹ شروع ہوئی تو میں چونکا۔ میری آنکھیں بند ہوتے ہوتے ایک دم کھلنے لگیں۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ یہ سوچتا ہوا میں اُٹھ بیٹھا۔ وہ سنسناہٹ رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ مجھے اپنے سر میں تکلیف اور پھر درد محسوس ہوا۔ پھر تیز ہواؤں کا شور سا اُٹھا۔ میرا سر گھومنے لگا اور اسی کے ساتھ ایک گونج سی سنائی دینے لگی۔ درد اور بڑھ گیا۔ یوں جیسے کوئی میرے دماغ کی ساری نسیں کھینچ رہا ہو۔ میرے ذہن سے ایک غبار سا چھٹنے لگا۔ تیز سنسناہٹ اور گونج مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوئی تو ہلکی سی "ٹک ٹک" کی آواز آنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں یہ آواز بھی معدوم ہو گئی اور میں تقریباً اُچھل پڑا۔

"ابوالہول! میرے بچے، میری تخلیق! دنیا کی ایک قدیم زبان میں لکھے ہوئے یہ روشن الفاظ میرے صفحۂ ذہن پر اُبھرے۔ حمیری زبان میں لکھے ہوئے یہ لفظ میں واضح طور پر پڑھ اور سمجھ سکتا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کرنے والا کون ہے! یہ وہی پاگل سائنس داں تھا جو مجھے اپنی تخلیق کہتا تھا، ایک بے نام پروفیسر! میں وہ عبارت پڑھنے لگا جو میرے ذہن میں روشن تھی: "تو نے دیکھ لیا کہ میں تجھے بالکل ناکارہ بھی بنا سکتا ہوں! دیکھ مجھے بڑا دکھ ہو گا اگر تو ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ اِس

میں بڑا خطرہ تھا، مگر میں نے تجھ سے رابطہ قائم کرنے اور تجھ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے یہ خطرہ مول لیا اور آخر کار مجھے کامیابی ہوئی۔ تو نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر تو اپنی حیرت انگیز قوتیں استعمال نہیں کرے گا تو میرے اور تیرے درمیان جو رشتہ ہے وہ ٹوٹ جائے گا! تو آخر مجھ سے کب تک بغاوت کرے گا، اُس سے جس نے تجھے کچھ سے کچھ بنا دیا؟ تو جہاں بھی ہے جلد تجھے ڈھونڈ لیا جائے گا۔ تیرے دماغ نے بڑی جنگ کی، مجھ سے جنگ۔ کبھی کبھی تو میں اتنا جھنجلا گیا کہ سوچا تجھے ختم ہی کر دوں مگر مجھے تجھ پہ پیار آ گیا اور سوچا کہ ممکن ہے تو اب سنبھل جائے، میری بات مان لے شاید! بچے نافرمان بھی تو نکل جاتے ہیں، اور تو بھی ایسا ہی ہے۔ تو اب پہلے سے بھی زیادہ نافرمانی پر اُتر آیا ہے۔ دیکھ اگر طویل عرصے تک تو نے اپنے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو استعمال نہ کیا تو ایک ایک کر کے تیری ساری قوتیں ختم ہوتی جائیں گی۔ پھر تو بھی زمین پر رینگنے والے کروڑوں اربوں کیڑے مکوڑوں کی طرح ایک عام اور غیر اہم وجود بن جائے گا۔ یوں میری زندگی بھر کی محنت بھی اکارت جائے گی اور پھر تو بھی زندہ نہ بچے گا۔ تو سُن اے میرے بچے! ایسا نہ کر! دیکھ عام آدمی نہ بن! مان جا، ورنہ کسی روز مجھے غصہ بھی آ سکتا ہے۔ پھر میں کچھ نہیں سوچوں گا! کچھ نہیں دیکھوں گا! اور ہاں یہ جو تجھ پہ گزری تو جو ایک خواب کے سے عالم میں رہا ہو گا، اس میں تیرے ہی ذہن کا قصور ہے۔ تیرے ذہن میں میرے خلاف جانے کیوں اتنی زبردست قوتِ مدافعت پیدا ہو گئی تھی کہ اُسے ختم کرنے کے لیے مجھے قوت استعمال کرنا پڑی۔ اِس کے باوجود بھی میں نے کافی دن انتظار کیا، پورے پچیس دن! جتنی دیر ہو رہی تھی، میں اتنا ہی کُڑھ رہا تھا اور پچھتا رہا تھا میرے بچے کہ میں نے یہ کیا کیا؟ کہیں میں تجھے کھو نہ دوں! یہ ذہنی جھٹکا تیرے اعصاب کے لیے بہت شدید ثابت ہوا مگر اب میں خوش ہوں کہ میں نے تجھے پھر پا لیا۔ تو وہ ذہنی جھٹکا سہہ گیا اور خود فراموشی کے اندھیروں سے نکل آیا۔ وہ تیری ہی قوت و طاقت کا نشہ تھا جس نے تجھے معطل کیے رکھا، ناکارہ بنا دیا، اور ہاں ایسا میں نے ہی کیا کہ میں ہی ایسا کرنے پر قادر ہوں کیوں کہ تو میری ہی تخلیق تو ہے! خودکشی نہ کر اور مجھے غصہ بھی نہ دلا! خالق اور مخلوق کا جھگڑا اچھا نہیں ہوتا۔ اِس جھگڑے کو اور نہ بڑھا میرے بچے! سُن! جب مجھے خبر ملتی ہے کہ تو نے اپنے کسی خطرناک دشمن کو زیر کر لیا تو یقین کر میرے بچے مجھے عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ دُکھ بھی ہوتا ہے۔ کاش مجھ سے وہ آخری غلطی نہ ہوتی اور میں تجھ پہ اپنا آخری تجربہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا، پھر یہ ہنگامہ ہی نہ ہوتا۔ ساری دنیا تیری تخلیق پہ مجھے مبارک باد دیتی اور میری تعظیم کرتی مگر اب بھی میں مایوس نہیں۔ تجھے ایک نہ ایک دن اپنی ضد چھوڑنا ہی پڑے گی۔ تیرا پروفیسر، تیرا خالق!"

میرے ذہن میں وہ روشن تحریر بجھ گئی اور میں جیسے ایک طویل خواب سے بیدار ہو گیا۔ اُس تحریر نے مجھ پر کئی عقدے کھول دیے۔ پہلا عقدہ تو یہی تھا کہ میری خود فراموشی کا سبب کیا تھا؟ میں اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دینے لگا جو کچھ یوں تھے۔ میں نے مسلسل اپنی قوتوں کے استعمال سے گریز کیا۔ اس کے نتیجے میں پروفیسر سے میرا رابطہ کمزور پڑ گیا اور اُسے میری طرف سے تشویش ہوئی۔ اُس نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کرنا چاہا تو میرے ذہن نے مدافعت کی۔ مجبوراً اُس نے دوسرا راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں مکمل پچیس دن تک مجھ پہ ایک نشے کی سی کیفیت طاری رہی۔ اِس کیفیت کو پروفیسر نے میری قوت و طاقت کا نشہ کہا تھا۔ جب اس نشے نے میری قوتِ مدافعت کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ پروفیسر مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر سکتا تو اُس نے مجھ تک اپنا پیغام پہنچا دیا۔ اِس پیغام میں کئی اہم باتیں تھیں اور اُن میں سب سے اہم یہ کہ میں نے اگر اپنی قوتیں استعمال نہ کیں تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ قوتیں خود بہ خود ختم ہو جائیں گی۔

یہ بات جھوٹ بھی ہو سکتی ہے اور سچ بھی! میں یہ سوچتا ہوا اُٹھا اور اُس تاریک کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اب مجھے اپنا ذہن بالکل تر و تازہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کوئی خواب تھا جو ٹوٹ گیا، ایک ایسا خواب جس کی ایک ایک بات مجھے یاد تھی! نہ اب وہ لذت انگیز نشہ تھا، نہ خود فراموشی نہ وہ کاہلی۔

"تو جہاں بھی ہے جلد تجھے ڈھونڈ لیا جائے گا!" مجھے

اپنے ذہن میں روشن ہونے والی عبارت کے الفاظ یاد آ گئے۔ یہ بھی ایک اہم بات تھی کہ ابھی میرے دشمنوں کو یہ علم نہیں ہو سکا، میں کہاں ہوں؟ یہ بات اہم ہونے کے باوجود میرے لیے نئی نہیں تھی۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ وہ دو تین مہینے وہ مجھے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ صرف قاہرہ کے دوران قیام میں ایسا نہیں ہوا اور اس کی وجہ یقیناً کوئی تھی جس کا علم مجھے نہیں تھا۔ ہندوستان آ جانا میرے لیے نیک فال ثابت ہوا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ کن حالات کے تحت میں ہندوستان پہنچا، یہ بات بھی اہم تھی کہ وہاں سے چین اور روس دونوں ہی بہت قریب تھے۔ میری ماں اسی ملک میں تھی۔ یہ بات مصدقہ تھی۔ امریکیوں نے کس مصلحت کے تحت اسے یہاں رکھا تھا اور وہ طویل عرصے سے یہیں تھی۔ اس کے علاوہ میرے والد چین میں ہیں، مجھے یہ بھی علم تھا اور بھائی؟ ہاں اس کے بارے میں یقین نہیں تھا کہ روس ہی میں ہوگا۔ البتہ گمان غالب یہی تھا کہ اسے روس ہی میں رکھا گیا ہوگا۔ شاید وہ ماسکو میں ہو یا پھر روس کے کسی اور شہر میں! میں ہندوستان میں رہ کر ایک طرح اپنے اہلِ خاندان سے قریب تر تھا۔ مجھے اگر پہلے یہ خیال آ جاتا اور میرے دشمن میرا دائرہ اتنا تنگ نہ کر دیتے تو شاید ہندوستان آنے میں اتنی دیر نہ ہوتی۔ دشمنوں سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے ماضی کی تلاش کا آغاز قاہرہ سے کیا اور وہیں مجھے اپنے بارے میں کچھ اہم سراغ بھی ملے۔ وہاں بھی میرا قیام قطعی رائیگاں نہیں ہوا۔ اب ہندوستان آنے کے بعد میرے لیے نئے امکانات کے دروازے کھل گئے تھے۔ خود فراموشی سے پہلے میں نے جو کچھ سوچا تھا، وہ سب میرے ذہن میں پھر سے تازہ ہو گیا۔ وہ دن جو ضائع ہو گئے، اُن پر میرا اختیار نہ تھا۔ اِن دنوں میں اتنا ضرور ہوا کہ دلی اور کم از کم پرانا دلی میرے لیے بالکل اجنبی نہ رہا۔ پہلے جو لائحۂ عمل مرتب کیا تھا، اُس پر میں نے از سرِ نو غور کیا اور پھر ضروری ترمیم و تنسیخ کے بعد موجودہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے چند فوری اقدامات کا فیصلہ کیا۔ خود فراموشی کے دوران میں مہرباں اور نامہرباں چہرے مجھے یاد تھے۔ ان میں وہ بدمعاش بھی شامل تھے جنھوں نے مجھے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا تھا اور جو اُسی حویلی کو اپنی کمین گاہ بنائے ہوئے تھے۔ وہ قاتل بھی تھے اور لٹیرے بھی، پیشہ ور مجرم بھی اور بے رحم بھی! اُنھوں نے مجھے پہلے وہاں سے ڈرا کر بھگا دینا چاہا، پھر یہ سمجھے کہ خوف کی زیادتی کے سبب میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہوں۔ ان میں سے بس ایک کے دل میں نیکی کی ذرا سی رمق تھی۔ میرے دل میں بس اُسی کے لیے ذرا سا نرم گوشہ تھا۔ اُس کے ساتھی اُسے ہری کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ کبھی کبھار جب میرے سامنے بھنا ہوا گوشت اور ٹھرے کی بوتل رکھ دیتا تو اپنے استاد سے گالیاں کھاتا۔ کبھی تو گالیاں کھا کر گوشت اور بوتل اُٹھا لے جاتا اور کبھی استاد سے چھپ چھپا کر کچھ کھانے پینے کو دے جاتا۔ کبھی اُس نے بڑے فاقے کیے تھے۔ یہ اُسی کا ردِعمل تھا جب اُستاد اِدھر اُدھر ہوتا یا باؤلی میں کچھ رکھنے رکھانے جاتا تو وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا کہ بھوک بڑا عذاب ہے۔ پھر اُن دنوں کے قصے سناتا جب وہ اپنے گھر سے بھاگا تھا اور اُسے فاقے کرنا پڑے تھے۔ اس کے باوجود ہری بھی بہرحال مجرم اور اُن بدمعاشوں کا ساتھی تھا۔ انھی بدمعاشوں سے وہ امریکی عورت بھی کام لیتی رہتی تھی جو میرے خیال میں مشتبہ تھی۔ ثمینہ احمد، شمیلا احمد اور وہ امریکی عورت! یہ مثلث میری نظر میں معنی خیز تھا۔ مجھے ثمینہ احمد کا وہ ٹھکانا بھی یاد تھا جہاں نواب افتخار احمد کے نام کی تختی لگی تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ نواب افتخار احمد ہی ثمینہ احمد کا شوہر ہے۔ اگر اُس رات مجھ پر خود فراموشی طاری نہ ہو جاتی تو شاید اب تک میں یہ معما حل کر چکا ہوتا۔

میں ٹہلتا ہوا کمرے سے صحن میں نکل آیا تو چونکا۔

حویلی کا شکستہ حصہ اب یقیناً غیر آباد نہیں تھا۔ اُدھر سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور دور کہیں لالٹین کی روشنی بھی تھی۔ تو میرے شکار آ گئے! یہ سوچ کر میرے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی۔ مجھے اُن سے بے جا خطرہ نہ تھا۔ میں تیز قدمی سے صحن عبور کر کے اُس حصے میں داخل ہو گیا۔

"ابے وہ پگلا آج شاید پھر آ گیا!" میں نے ادھیڑ عمر شخص کی آواز سنی جسے وہ لوگ استاد کہتے تھے۔ اُس نے شاید میرے

قدموں کی چاپ سن لی تھی۔

"ہاں اُستاد وہی ہوگا، اور کون آئے گا میاں!" یہ ہری کی آواز تھی۔

"دیکھ بے، اگر آج تُو نے اُس کے آگے ایک آدھ بوٹی پھینکی تو سمجھ لیو معاف نہیں کروں گا!" ادھیڑ عمر شخص کی بات سُن کر میرا خون کھول گیا۔ وہ بالکل اِس طرح بات کر رہا تھا جیسے میں آدمی کی بجائے اُس کی نظر میں جانور ہوں۔ وہ چاروں عموماً اُسی دالان میں غرستیاں کرتے تھے جس پر چھت نہیں تھی اور جس کا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی اُسی دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو استاد نے ہانک لگائی: "ابے دور، دور، قریب نہ آیو آج! ولایتی لایا ہوں!" اُس کے سامنے ایک بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ ہری اُس کے ساتھ ہی پی رہا تھا۔ بقیہ دو ساتھی الگ ٹھرا پینے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک میلی سی چٹائی زمین پر بچھی تھی۔ چٹائی ہی پر ایک طرف نئے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔ اُنھوں نے شاید ابھی لوٹ کا مال آپس میں بانٹا نہیں تھا۔

"اُستاد!" میں نے وہاں کا جائزہ لیتے ہی اچانک جب ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کیا تو وہ اُچھل پڑا۔ "ابے ہری! یہ تو بولنے لگا!" اُستاد نے شراب کا گلاس ہاتھ سے رکھ دیا۔ میں اب اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"ہاں استاد، کبھی کبھار میں نے بھی اسے بولتے سُنا ہے مگر... یہ تو بس ہوں ہاں ہی کرتا تھا آج... آج تو یہ تمھیں اُستاد کہہ رہا ہے۔ حیرت ہے!" ہری نے میری طرف دیکھا۔

میں نے بغیر کچھ کہے جھک کر اُستاد کے سامنے سے ایک نیم غیر ملکی شراب کی بوتل اُٹھائی اور اُسے مُنہ سے لگا لیا۔

"ابے!... ابے او..." اُستاد گالیاں بکتا ہوا اُٹھا۔ "ابے کیا حرام کا مال سمجھ رکھا ہے!" پھر اُس نے مجھ سے بوتل چھیننے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میرا بایاں ہاتھ اُس کے مُنہ پر پڑا اور وہ ہری کے اوپر گرتے گرتے سنبھل گیا۔

"ابے تیری تو میں..." اُس نے پھر گالی بکی اور اس کے ساتھ اپنے نیفے سے گراری دار چاقو نکال کر کھول لیا۔

"تم پیچھے ہٹ جاؤ اُستاد! میں دیکھتا ہوں اسے!" ہری اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اب اُس کے ہاتھ میں بھی چاقو تھا۔ میں نے اس دوران میں بوتل خالی کر دی اور بائیں ہاتھ کی آستین سے مُنہ پونچھا۔ فضا کشیدہ دیکھ کر استاد کے بقیہ دو چیلے بھی کھڑے ہو گئے تھے مگر ابھی اُنھوں نے چاقو نہیں نکالے تھے۔ "تو ہٹ جا سامنے سے ہری! ابھی میں اتنا بڈھا نہیں ہوا!" اُستاد چیخ کر بولا۔ "اس پگلے کی لاش گرا لینے دے مجھے!"

ہری میرے اور اُستاد کے درمیان حائل رہا اور پھر دانت پیس کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی پکڑ لی اور پھر جھٹکا دے کر چاقو ہاتھ سے گرا دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں اب بھی خالی بوتل تھی۔ میں نے خالی بوتل، اُستاد کی طرف اُچھال دی۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور بوتل زمین پر گر کے ٹوٹ گئی۔ ہری نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا تو میں نے کہا: "ہری! تیری کلائی ٹوٹ جائے گی، زور نہ لگا!"

میری بات سن کر پہلے اُس کے چہرے پر حیرت نظر آئی، پھر اُسے غصہ آ گیا۔ یہی غصہ اُسے مہنگا پڑا اور میں نے اُس کی کنپٹی پر گھونسا مارا۔ وہ تیورا کر گرنے لگا تو میں نے کلائی چھوڑ دی۔ اُس نے مجھے مارنے کے لیے لات اُٹھائی تھی، مگر اس سے پہلے ہی زمیں بوس ہو گیا۔

"ہاں اُستاد، اب تم بھی آ جاؤ! تمھارا چہیتا شاگرد تو بے ہوش ہو گیا!" میں نے استاد کی طرف دیکھا۔

"ابے حرام خورو، دور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو، چیر دو اسے!" استاد نے خود تو پہل نہ کی، البتہ بقیہ دو ساتھیوں کو غیرت دلائی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اُن میں سے ایک اپنے ہی ساتھی کے چاقو سے زخمی ہو کر گر پڑا اور دوسرا میرے پہلو میں چاقو مارنے کی حسرت لیے اوندھے مُنہ زمین پر آ رہا۔ میری ٹھوکر اس کی پنڈلی پر پڑی تھی۔ استاد نے یہ رنگ دیکھ کر آخری حربہ آزمایا، مگر میں اُس کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔ میں اُچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ استاد کا پھینکا ہوا چاقو دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا۔

"استاد! تم واقعی بڈھے ہو گئے!" میں نے اُسے

تپلنے کے لیے کہا۔ "بولو اب تمھارا کیا حشر کروں؟"

"مجھے خالی ہاتھ دیکھ کے اینٹھ رہا ہے، بغد خانے کے چار کی طرح؟ ہیں؟" استاد نے کسی بندر کی طرح مجھے گھڑکی دی، پھر اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا: "یہ دیکھ چینیا بھی ہے میرے پاس!" یہ کہتے ہوئے اُس نے جیب سے چھوٹا سا ریوالور نکال لیا۔ استاد کوئی غیر ملکی ایجنٹ تو تھا نہیں جو مجھ پر گولی نہ چلاتا اور اُسے میری اہمیت و قیمت کا احساس ہوتا، یہ سوچ کر میں نے فوراً ہی اپنی جگہ سے جست بھری اور اُسے گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ اُس کا ریوالور بھی میں نے چھین لیا تو پیچھے ہٹ کر بولا: "بولو کتنے سوراخ کروں، تمھارے بدگوشت میں؟"

وہ جس کروٹ گرا تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ ہیری اور وہ شخص جس کے سینے میں چاقو لگا تھا، بے ہوش پڑے تھے۔ وہ شخص جس کی پنڈلی پر ضرب لگی تھی، اُسے بھی اُٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا یا پھر وہ خوفزدہ ہو کر خاموش پڑا تھا کہ کہیں اُستاد دوبارہ اُسے مجھ سے بھڑنے کا حکم نہ دے بیٹھے۔ صورت حال اب پوری طرح میرے قابو میں تھی۔ ہنگامہ آرائی کی وجہ سے عطر سے کی بوتل اور شیشے کے گلاس بھی ٹوٹ گئے تھے۔ ہر طرف شیشہ بکھرا ہوا تھا، البتہ لالٹین زد میں نہیں آئی تھی کیوں کہ وہ دور ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ چٹائی پر جو نوٹوں کی نئی گڈیاں رکھی تھیں، وہ بھی اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ میں نے پہلے انھی کو اُٹھا کر اپنی پینٹ کی جیبوں میں ٹھونسا، پھر اُستاد کو مخاطب کیا: "میرا سامان کہاں ہے؟ ٹھکانے لگا دیا کہ رکھا ہے؟"

پہلے اُس نے کچھ ہچر مچر کی، پھر دو ایک ٹھوکریں کھا کر دماغ درست ہو گیا۔ میرے کہنے پر وہ اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ زیادہ تر سامان ٹھکانے لگایا جا چکا ہے، صرف چند کپڑے ایک اٹیچی اور وہ سامان باقی ہے جو نہیں بک سکا۔ باؤلی اُن کے "اسٹور" کا کام دیتی تھی۔ استاد، لالٹین لے کر اُس میں میرے ساتھ اُترا۔ وہاں اور بہت سا سامان بھی ایک کونے میں رکھا تھا اور میری اٹیچی بھی۔ میں ریوالور لیے استاد کے پیچھے کھڑا تھا۔

"کچھ اور رقم بھی ہے تمھارے پاس؟" میں نے استاد سے سوال کیا۔ وہ میری اٹیچی نکال چکا تھا۔

"بس وہ... وہی تھی۔ کچھ بچا کب ہے میرے بھائی! اِدھر آیا اُدھر گیا۔" اُس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ "بس سو پچاس پڑے ہوں گے جیب میں۔"

"میں جیب کی نہیں پوچھ رہا!" میں نے سختی سے کہا۔ "یہاں کی بتاؤ!"

"یہاں!..." وہ کھسیا کر ہنسا۔ "بس دو چار تولے کا کوئی ہار وار کدھر ہی کو پڑا ہوگا، پر اُسے ڈھونڈنے میں ٹیم لگے گا۔"

"استاد! اگر اس باؤلی سے تمھاری لاش کبھی نکالی بھی گئی تو لوگوں کو ہڈیاں ہی ملیں گی۔ سب ہے نا!" میری دھمکی کارگر ہوئی۔ استاد نے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں ہی اُس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اِس کے علاوہ اور کئی جگہ بھی چوٹیں تھیں۔ جان سبھی کو پیاری ہوتی ہے اور استاد کو بھی پیاری تھی۔

"جان ہے تو جہان ہے۔" وہ آپ ہی بڑبڑایا اور پھر بڑے نوٹوں کی کئی گڈیاں تانبے کے ایک برتن میں سے نکال کر مجھے تھما دیں۔ "چند تولے سونا" تقریباً پاؤ بھر تو ہو گا جو مختلف زیورات کی شکل میں تھا۔ وہ شاید استاد کی زندگی بھر کی حرام کی کمائی تھی جو آنسو بہاتے ہوئے اُنھوں نے میری اٹیچی میں رکھ دی۔

"استاد! ابھی یہاں بہت سامان ہے، رونے کی کوئی بات نہیں!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ تمھارے ہاتھوں اب تک کتنے بے گناہ مارے گئے ہوں گے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اٹیچی اُٹھالی۔

"بس دو... دو قتل کیے ہیں میں نے... زیادہ تو نئیں... پر تم... تم کیوں...؟"

"اور وہ عورت؟" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"اُسے ہیری نے مارا تھا!"

"اچھا اب تم اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ ورنہ...!"

"مگر وہ... وہ تو بے ہوش ہیں!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

اور لالٹین اُٹھالی۔

"اب تک اُنھیں ہوش آگیا ہوگا اور نہیں آیا ہوگا تو ہوش میں لاؤ!"

پھر وہ میرے ساتھ باؤلی سے نکل آیا۔ اوپر آ کر دیکھا تو ہیری کو ہوش آ رہا تھا۔ وہ شخص دم توڑ چکا تھا جس کے سینے میں چاقو لگا تھا۔ تیسرا ساتھی موقع غنیمت جان کر بھاگ گیا تھا۔

"اسے اُٹھاؤ اور چلتے بنو!" میں نے ہیری کی طرف دیکھتے ہوئے استاد کو حکم دیا۔

"تو... تو اب تم... تم یہاں رہو گے؟" اُستاد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں!" میں مسکرایا۔ "مگر ہفتے بھر بعد آ کر باؤلی سے اپنا سامان نکال لے جانا اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا!"

"آہ!" ہیری نے کراہ کر کروٹ لینا چاہی۔

"اُٹھاؤ اسے ورنہ لہولہان ہو جائے گا! دیکھتے نہیں ہر طرف شیشہ بکھرا پڑا ہے!" میں نے اُستاد کو ڈانٹا۔ وہ شیشے کے ٹکڑوں سے بچتا بچاتا ہیری کے پاس پہنچا اور اس وقت تک ہیری نے آنکھیں کھول دیں۔ "اُس... استاد!" وہ بڑبڑایا اور کہنی کے بل اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ استاد نے اپنے شاگرد کو سہارا دے کر اُٹھایا اور پھر شاگرد کو بھی صورت حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ میرے ایک ہاتھ میں اب بھی ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں اٹیچی تھی۔ "ہیری اب تو خود چل سکتا ہے اُستاد!" میں بولا۔ "تم ایسا کرو کہ یہ لاش اُٹھالے جاؤ ورنہ یہاں بدبو پھیلے گی، کہیں جنگل میں دبا دینا۔ ویسے بھی تمھارا ساتھی ہی تھا یہ!"

"ہاں... ہاں!" استاد کی آواز ذرا سی بھرائی اور پھر اُنھوں نے اپنے مُردہ ساتھی کی لاش اُٹھالی۔ ہیری کی کنپٹی پہ ورم تھا اور چہرہ سُتا ہوا۔ وہ چلتے ہوئے بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا جیسے اب بھی چکرا رہا ہو حالانکہ گھونسا مارتے ہوئے میں نے خیال رکھا تھا کہ وہ کہیں زیادہ زخمی نہ ہو جائے۔

اُس وقت صبح ہونے والی تھی جب میں نے استاد کو وہاں سے رخصت کیا۔ چلتے وقت موصوف نے اپنا "تمنچا" مانگا تھا جسے میں نے گولیاں نکال کر اُن کے کرتے کی جیب میں ڈال دیا۔ مجھے اُس کا کرنا بھی کیا تھا! مجھے کسی اور چیز کا تو نہیں البتہ جدید ساخت کے اُن امریکی ہتھیاروں کے ضائع ہونے کا افسوس ہوا جو میں قاہرہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ بظاہر وہ عام استعمال کی چیزیں تھیں، الیکٹرک شیور، گھڑی، فاؤنٹین پین، ٹرانسسٹر اور ایسی ہی دوسری چیزیں! استاد کو اگر اُن کی قیمت کا اندازہ ہو جاتا تو اپنی زندگی بھر کی کمائی کو بھول جاتا۔

میں نے نہایا دھویا اور پھر جوتے بھی تلاش کر لیے جو پھاٹک کے قریب پڑے ملے۔ جانے کب میں نے اُنھیں اُتار کر وہاں پھینک دیا تھا۔ اٹیچی میں دو تین جوڑے رکھے تھے، اُنھی میں سے ایک پہن لیا۔ اسی میں مجھے صبح ہو گئی۔ وہ جوڑا جو میں نے اُتارا تھا، اِس قابل نہیں رہا تھا کہ اُسے دوبارہ پہنا جا سکتا۔ اُسے میں نے وہیں چھوڑ دیا۔

اُس حویلی کو خیرباد کہتے ہوئے مجھے وہ اسٹیٹ ایجنٹ یاد آیا جس نے مجھے اجنبی سمجھ کر دھوکا دیا تھا اور اُس مالک مکان پر بھی غصہ آیا جس نے مہینہ پورا ہونے سے پہلے ہی پھاٹک میں تالا ڈال دیا تھا۔ آدمی اندھا، کتنا کمزور اور خود غرض ہوتا ہے! میں نے عقبی دیوار پھاندتے ہوئے سوچا۔ اٹیچی میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ اسٹیٹ ایجنٹ اور مالک مکان دونوں ہی کسی ایسے "شکار" کی تلاش میں ہوں گے ورنہ مجھے کم سے کم یہ تو بتا دیتے کہ پچھلے مہینے اُس حویلی سے ایک عورت کی لاش بھی مل چکی ہے۔ اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر اُنھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک آدمی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ مکان حاصل کرنے کے سلسلے میں میں نے اُنھیں جو ایڈوانس دیا تھا، وہ بھی ہڑپ کر گئے تھے۔ ایسے گھٹیا اور خود غرض لوگوں کو میں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ اگر ایسے لوگوں کو معاف کر دیا جائے تو وہ اور دلیر ہو جاتے ہیں۔

میں جنگل کے راستے جان بوجھ کر نکل گیا۔ پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر میں نے پل بنگش کا رُخ کیا۔ اُس وقت مجھے ساوتری کا خیال بھی آیا جو شاید اب اِس حال میں میری طرف نگاہ کرتی تو پہچان نہ پاتی۔ ایک موٹر رکشا نظر پڑا تو میں اسی میں بیٹھ گیا۔ دلی میں رکشا ڈرائیور عموماً سکھ ہیں۔ میں رکشے میں بیٹھ گیا تو وہ بولا: "کدھر بادشاہو؟"

"صدر بازار!" میں نے جواب دیا اور رکشا چل پڑا۔

صدر بازار ہی میں وہ اسٹیٹ ایجنسی تھی جس کی معرفت

مجھے وہ آسیب زدہ حویلی" ملی تھی۔ میں نے اُسی کے سامنے رکشہ رکوایا اور پھر کرایہ ادا کر کے اُتر گیا۔ اُس وقت تک بازار کھل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اسٹیٹ ایجنٹ ہکا بکا رہ گیا۔

"آ... آپ جناب!... میں نے تو سُنا تھا کہ آپ پر بھی باؤلی کے..." وہ ہکلانے لگا۔ "جن... کا اثر... وہ آپ...؟"

"بکومت!" میں نے اُس کی اپنے قریب رکھی اور اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تم شاید یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ چلو قصہ پاک ہوا، پھر کوئی پھنسے گا! ہے نا!" میں نے اُسے گھورا۔ پھر ذرا دیر میں اُس کی ساری چرب زبانی دھری رہ گئی۔ میں نے پولیس میں رپورٹ کرنے اور دھوکا دہی کے الزام میں حوالات کی سیر کرانے کی دھمکی دی تو وہ گھگھیانے لگا۔ مالک مکان واقعی اُس کا دوست ہی تھا وہ دونوں مل کر یہ دھندا کرتے تھے۔ اُنھوں نے کئی اور ایسے ہی مکان خرید رکھے تھے جو آسیب زدہ مشہور ہوں۔ ایسے مکان اُنھیں کوڑیوں کے مول مل جاتے۔ دلی، ہندوستان کا دارالحکومت ہے۔ وہاں ہندوستان کے مختلف شہروں سے لوگ آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ عموماً ایسے لوگ اُن کے جال میں پھنستے جو پہلی بار دلی آئے ہوں۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور میرے پاؤں پکڑ لیے۔ جب وہ "بھونکا"، دینے لگا تو مجھے اس پر رحم آ ہی گیا۔ میں نے بھی سوچا ایسے کیسے سدھرتے پھر رہے گئے آدمی کا آدھا ہی ایسا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کو بھی بُلا لایا۔ اس دوران میں وہیں بیٹھا رہا۔ اُن سے رقم لینا میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ رقم نہ بھی ملتی تو میرا کیا بگڑ جاتا۔ اصل مسئلہ اُنھیں سزا دینا تھا۔ میں نے چلتے چلتے اُنھیں دھمکی دی کہ اگر اُنھوں نے وہ اسٹیٹ ایجنسی فوراً بند نہ کر دی تو نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ دونوں بھیگی بلی بنے ہوئے سر ہلاتے رہے اور میں وہاں سے چلا آیا۔

فوری طور پر میں نے ایک بار پھر اشوکا ہوٹل میں قیام کو ترجیح دی۔ اس کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں آئندہ جو اقدامات کرنے والا تھا، اُن میں یہ ضروری تھا کہ میرا قیام نئی دلی میں ہو۔ پرنس ادریس! یہ دلی میں میری نئی حیثیت تھی اُس دن میں نے خاصی شاپنگ کی۔ ایک پرنس کا کردار ادا کرنے کے لیے جو لوازمات ضروری تھے، میں نے اُنھیں نظر انداز نہیں کیا۔ اپنے میک اَپ میں بھی میں نے خفیف سی تبدیلی کی۔ ایسی تبدیلی کہ ہوٹل والے اُسے فوری طور پر محسوس نہ کر سکیں۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ پرانی دلی سے میرا گذر ہو تو مجھے وہ مجذوب نہ سمجھا جائے جو خاک بسر اور پابرہنہ وہاں گھومتا رہا تھا۔ بال اور لباس شخصیت کی تبدیلی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ میں نے اس پر خاصی توجہ دی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیا تھا اس لیے مجھے یہ نیا کردار اپنانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس نئے کردار کے ساتھ ہی میں نے اپنی آواز بھی بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے خود کو ہندوستان ہی کے ایک شہر پٹنے کا باشندہ ظاہر کیا۔ ہندوستان کے اور دوسرے شہروں کی طرح پٹنے کے بارے میں بھی میرے حافظے نے سہارا دیا۔ پٹنہ ہندوستان کے صوبے بہار کا دارالحکومت ہے۔ اس کے علاوہ بھی مجھے پٹنے کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا۔ ہندوستان کے ایک اور صوبے یوپی کا نام میں نے یوں ذہن سے نکال دیا کہ شہر دلی عملاً اسی صوبے کا حصہ ہے۔ یوپی کے کسی بھی شہر کا کوئی شخص مجھ سے میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں پوچھ گچھ کر سکتا تھا، مگر پٹنہ وہاں سے قریب نہیں تھا۔ دلی میں عموماً یوپی والوں کی زیادہ ریل پیل رہتی ہے۔ کچھ قریبی شہروں کے لیے تو دلی جیسے گھر آنگن ہے۔ صبح دلی آئے، شام کو لوٹ گئے۔ ان حالات میں پٹنے کے کسی نواب خاندان سے اپنا تعلق ظاہر کرنا میرے لیے شاید سودمند تھا۔ میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں وہیں کا پتا لکھایا تھا۔

شام ہونے تک میرا سارا کام نمٹ گیا اور میں اب ثمینہ احمد کے گرد جال پھیلانے کے متعلق سوچنے لگا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں مجھے نواب افتخار احمد کا نمبر آسانی سے مل گیا، اُس کے آگے ڈیفنس کالونی کا پتا بھی لکھا تھا۔ میں نے آپریٹر سے وہ نمبر ملانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"بات کریں سر!" آپریٹر بولی۔

"یس!" دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز سُنائی دی۔

"مجھے بیگم صاحبہ سے بات کرنا ہے جناب!" میں نے

بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ میرا مقصد یہ تصدیق کرنا تھا کہ واقعی ثمینہ احمد وہیں رہتی ہے یا نہیں؟

"آپ! اپنا نام بتلائیے!"

"مجھے پرنس ادریس کہتے ہیں!" میں نے بے جھجک جواب دیا۔ "میں اشوکا ہوٹل کے کمرہ تین سو سات میں ٹھہرا ہوا ہوں اور آج ہی پٹنے سے دلی آیا ہوں۔ مجھے بیگم ثمینہ احمد سے ضروری بات کرنی ہے۔ میرے پاس اُن کے لیے ایک پیغام ہے!"

"آپ آج ہی پٹنے سے آئے ہیں!... مگر بیگم صاحبہ نے تو کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ خیر... ہم اُن سے کہہ دیں گے۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں، مگر آپ بیگم صاحبہ کو کیسے جانتے ہیں؟ وہ تو شاید ہی کبھی پٹنے گئی ہوں!"

"میری اُن سے ملاقات نہیں ہوئی، بس نام سُنا ہے اُن کا! دراصل ہم لوگ پٹنے میں..."

"ہم لوگ سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"نوجوانوں کی ایک تنظیم سمجھ لیں!"

"جی! تو؟"

"میرا ایک قریبی دوست گذشتہ سال دلی آیا تھا، اُسی نے مجھ سے بیگم صاحبہ کا ذکر کیا۔ معلوم نہیں کہ اب بیگم صاحبہ کو میرے دوست کا نام بھی یاد رہا ہوگا یا نہیں کیوں کہ وہ صرف دو مرتبہ ہی بیگم صاحبہ سے مل سکا پھر اُسے فوراً پٹنے جانا پڑا!"

"آپ کسی پیغام کا ذکر کر رہے تھے!"

"جی ہاں، میں اُسی تنظیم کے صدر کا زبانی پیغام لایا ہوں!"

"کس سلسلے میں؟ اور وہ تنظیم کس نوعیت کی ہے؟"

"ہم لوگ اپنے شہر میں بھی پونا کی طرح اداکاری کی تربیت دینے کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ بیگم صاحبہ اُس ادارے کی افتتاحی تقریب کی صدارت کریں۔ بمبئی سے بھی ہم کسی بڑے اداکار کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پٹنے بلوانا چاہتے ہیں!"

"لیکن آپ لوگوں کے ذہن میں بیگم صاحبہ کا ہی نام کیوں آیا ہے؟"

"اس لیے کہ میرے دوست نے بتایا تھا، بیگم صاحبہ کو اداکاری سے عشق ہے اور یہ تو سبھی کو خبر ہے کہ وہ ہمارے ملک کی نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں!"

"تو آپ اسی لیے دلی آئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں تو گھومنے پھرنے آیا تھا، سوچا لگے ہاتھوں یہ بھی سہی!"

"آپ کی حیثیت کیا ہے اُس تنظیم میں؟"

"سرپرست سمجھ لیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایسے ادارے ہمیشہ مالی بحران کا شکار رہتے ہیں اور ہم ہی ایسے لوگوں پر چلتے ہیں!" یہ کہہ کر میں آہستہ سے ہنسا، پھر بولا۔ "آپ غالباً بیگم صاحبہ کے شریک حیات نواب افتخار ہیں!"

"تو آپ ہم سے بھی واقف ہیں!"

"حضور آپ سے کون واقف نہیں! غالباً میں نے کسی انگریزی اخبار میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ساتھ بھی آپ کی ایک تصویر دیکھی ہے!" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"ماشاء اللہ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے، یہ تو کافی دن پہلے کی بات ہے۔ جب وہ نئی نئی وزیر اعظم بنی تھیں اور ہم اُنھیں مبارک باد دینے گئے تھے!" اُس کے لہجے میں شگفتگی آگئی۔ "آپ تو دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی آئیے!"

"ضرور حاضری دوں گا کسی دن!"

"ہاں وہ آپ نے اپنا کمرہ نمبر کیا بتایا تھا؟"

"تین سو سات!" میں نے دُہرایا۔

"پرنس ادریس، اشوکا ہوٹل کمرہ نمبر تین سو سات، یعنی تیسری منزل!"

"جی ہاں!" میں نے تصدیق کر دی اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے نواب افتخار احمد سے گفتگو کرتے ہوئے کوئی ایسی بات نہیں کی جو آئندہ میرے لیے کوئی مسئلہ بنے۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد کہ ثمینہ احمد، نواب افتخار احمد ہی کی بیوی ہے، میرا کام کچھ آسان ہو گیا۔ نواب افتخار احمد کی

شخصیت بھی اب مجھے اہم نظر آنے لگی۔ اگر اُس کی دوسری بیوی جمیلہ احمد واقعی کوئی امریکی ایجنٹ تھی تو خود وہ بھی شک و شبہے سے بالاتر نہیں تھا۔ میں دیر تک اِسی نہج پر سوچتا رہا، پھر میرا دھیان اپنی ماں کی طرف چلا گیا۔

میرے خطرناک دشمن اچھی طرح واقف تھے کہ مجھ پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ میری حیرت انگیز قوتوں کو گہری نیند سُلائے بغیر وہ اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے۔ اس کے لیے مختلف ایجنٹوں نے مختلف راستے اختیار کیے۔ اِن میں خطرناک چینی ایجنٹ لوئی چو کا طریقۂ کار قطعی جُداگانہ تھا۔ وہ خود بھی ناقابلِ یقین ذہنی صلاحیتوں کی مالک تھی۔ قاہرہ میں اُس کے اور میرے درمیان کئی معرکے ہو چکے تھے۔ لوئی چو نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ دنیا کے دوسرے ایجنٹوں سے کہیں زیادہ ذہین اور چالاک ہے۔ پہلے بھی وہ ایک بار مجھ پر یہی حربہ آزما چکی تھی، لیکن اُس وقت میں بے خبر نہ تھا۔ لوئی چو نے میری اس بے خبری سے فائدہ اٹھایا اور مجھے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ جب تک میں اپنے جسم کو نادیدہ بناتا یا میرے ذہن کا خود کار مدافعتی نظام حرکت میں آتا، وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ دھواں انتہائی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں بھر گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کو برف میں دبا دیا گیا ہو۔ دھواں اسی قدر ٹھنڈا تھا۔ پھر یہ ٹھنڈک برداشت کے قابل نہ رہی۔ اُسی وقت میں نے ایک جانی پہچانی آواز سُنی۔ یہ آواز بلاشبہ لوئی چو کی تھی: "ابوالہول! تم نے دیکھا کہ میں نے بالآخر تم پر قابو پا لیا۔ اب تم گہری نیند سو جاؤ گے اور اُسی وقت اُٹھو گے جب میں چاہوں گی!"

اِن الفاظ کے ختم ہوتے ہی مجھ پر نیند کا زبردست غلبہ ہوا۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل نظر آیا اور دوبارہ اُسی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔ جھکتی ہوئی بوجھل پلکوں سے میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ ماں نے شاید مجھ سے کچھ کہا بھی تھا جو اب مجھے یاد نہیں۔ نیند کے جال مجھے اپنی گرفت میں لے رہے تھے کہ میں نے آخری کوشش کی اور ناکام رہا۔ میں اپنے حیرت انگیز وجود کی کسی بھی قوت کو بروئے کار نہ لا سکا اور میرے گرد تاریکی پھیل گئی۔

"وہ تاریکی میں روشنی کی وہ کرن مجھے بہت دور نظر آئی جیسے کوئی ستارہ ٹمٹما رہا ہو۔ میں نے اُس پر نگاہ جما دی۔

"لوئی! اسے ہوش آ رہا ہے" قریب ہی سے ایک مردانہ آواز اُبھری۔ یہ الفاظ چینی زبان میں ادا کیے گئے تھے۔ پھر مزید کہا گیا "میں چلتا ہوں، اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر!" جواب میں ایک نسوانی آواز سُنائی دی۔ "خود مجھے بھی یقین تھا کہ یہ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے مزید ہوش میں آ جائے گا۔ اگر مجھے بیکنگ سے نئے احکام ملنے کا انتظار نہ ہوتا تو میں اب تک اِسے لے کر قاہرہ پہنچ چکی ہوتی۔"

قاہرہ! میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اب وہ ٹمٹماتا ہوا ستارہ غائب ہو چکا تھا۔ مجھے اُس کی جگہ ایک بلب جلتا دکھائی دے رہا تھا۔ لوئی، بیکنگ اور قاہرہ یکے بعد دیگرے یہ تین حوالے میرے لیے کافی ثابت ہوئے۔ میں، پالک سرکس میں اپنی ماں کے پاس تھا کہ چینی ایجنٹ لوئی چو نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔ اِس حملے کے نتیجے میں اُس نے مجھ پر گہری نیند مسلط کر دی اور اب مجھے ہوش آیا تھا۔ اِس بے وقوف عورت کو شاید یہ نہیں معلوم کہ میرے ہوش میں آنے کا مطلب کیا ہے! میں نے سوچا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو ابوالہول!" ایک نرم اور شیریں نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور یہ آواز میرے لیے آشنا تھی۔ لوئی چو مزید بولی "تم تو اِس وقت اپنی مرضی سے کروٹ بھی نہیں لے سکتے۔" پھر میں نے قدموں کی چاپ سُنی۔ اُس کے بعد کوئی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ کمرے سے جانے والا شاید وہی ڈاکٹر تھا جس نے لوئی چو کو میرے ہوش میں آنے کی اطلاع دی تھی کیونکہ لوئی چو مجھ سے اب بھی مخاطب تھی "کروٹ لینے کی کوشش کرو، تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میرا دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔" اُس کی توجہ یقیناً میرے ذہن پر تھی ورنہ میں جو سوچ رہا تھا، اُسے کس طرح معلوم ہو جاتا۔

لوئی چو کی بات سن کر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ واقعی میرا جسم شل ہے اور ذہن میں ٹھنڈک برقرار ہے۔ میں نے اپنی حیرت انگیز قوتوں کو بیدار کرنا چاہا اور اُسی وقت لوئی چو فاتحانہ انداز میں ہنسی۔ وہ کہیں قریب ہی تھی، مگر میں اُسے دیکھنے سے قاصر تھا۔ میں ایک اونچی سی میز پر چت لیٹا ہوا تھا۔

"فضول ہے ابوالہول!" وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی اور پھر میں نے اُس کے قدموں کی چاپ اپنی طرف بڑھتے محسوس کی۔ تازہ کھلتے ہوئے گلابوں کی خوشبو کے اس جھونکے نے مزید تصدیق کر دی کہ لوئی چو ہے۔ اپنے علاوہ میں نے اُسی کے جسم میں ایسی خوشبو محسوس کی تھی جس کی وجہ بھی معلوم تھی۔ چند ہی لمحے بعد وہ میرے قریب آ گئی اور میں اُس کا چہرہ دیکھ کر چونک اُٹھا۔ یہ وہ چہرہ نہیں تھا جو میں نے قاہرہ میں دیکھا تھا۔ نازک نازک سے خدوخال، سُرخی میں ہلکی سی زردی ملی ہوئی۔ میں نے وہ چہرہ دیکھا تو مجھے نزاکت اور حُسن کا احساس ہوا۔ "یہی میرا اصل چہرہ ہے۔" وہ مُسکرائی "اور اب تمہیں اپنا اصل چہرہ دکھاتے ہوئے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

"کیوں؟" میرے ہونٹوں نے پہلی بار حرکت کی۔

"اس لیے کہ اب میں تمہیں تسخیر کر چکی ہوں اور میری فتح شکست میں نہیں بدل سکتی۔" اُس نے جواب دیا پھر بولی "اب تمہیں یہاں اس کمرے میں رکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ میں جا رہی ہوں، میرے آدمی تمہیں میری خواب گاہ میں پہنچا دیں گے۔ اُسی وقت تم سے باتیں ہوں گی۔ مجھے تم سے ایک سودا بھی کرنا ہے۔ اگر تم اس پر راضی ہو گئے تو کم از کم تمہاری ماں کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ اِسی کے ساتھ وہ جانے کے لیے مُڑ گئی۔

"لوئی!" میں نے اُسے پکارا "کیا میری ماں بھی تمہاری قید میں ہے؟"

"اس وقت میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔" اُس نے کہا اور پھر اُس کے قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

"زندگی میں پہلی بار مجھے بے بسی کا احساس ہوا۔ مجھے جانے کیا ہو گیا تھا؟ میری حیران کن قوتیں جانے کیسے ختم کر دی گئی تھیں؟ اور اگر واقعی ایسا ہی تھا تو پھر کسی بڑی طاقت کو میری کیا ضرورت رہتی! چلتے چلتے لوئی چو نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ اُس کی زبانی اپنی ماں کا ذکر سن کر میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد دو چینی مجھے ایک اسٹریچر پر ڈال کر وہاں سے لوئی چو کی خواب گاہ میں لے آئے۔ انھوں نے مجھے ایک آرام دہ مسہری پر لٹا دیا اور چلے گئے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ لوئی چو وہاں تھی یا نہیں۔ مجھے تو اس وقت وہاں اُس کی موجودگی کا احساس ہوا جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اُس کی آواز ذرا فاصلے سے سُنائی دی تھی: "ابوالہول! اب تم مجھ سے کوئی بھی سوال کر سکتے ہو۔ بولو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اِسی کے ساتھ اُس کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھنا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ میں مسہری پر بھی چت ہی پڑا تھا۔ قریب آ کر اُس نے مجھے اپنی طرف کروٹ دلائی اور ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔ میں نے اُس کے قیامت خیز سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ یقیناً انتہائی حسین تھی، لیکن وہ لمحے ایسے نہ تھے کہ میں اُس کے حُسن میں کھو جاتا۔ مجھے تو بار بار اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا جس کی زندگی یقیناً خطرے میں تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوئی چو مجھ سے اُس کا ذکر نہ کرتی۔

"میری ماں کی زندگی کے بدلے، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے اُس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"صرف ایک وعدہ" وہ مسکرا کر بولی، پھر خود ہی کہنے لگی "لیکن اُس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ اِس طرح تمہیں یقین آ جائے گا کہ وہ میری قید میں ہے۔" یہ کہتے ہی وہ کھڑی ہو گئی اور آرام کرسی بھی ایک طرف سرکا دی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں اٹھی ہے۔ میں نے اُسے سامنے رکھی ہوئی ایک میز کی طرف جاتے دیکھا جس پر ٹی وی سیٹ رکھا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ٹی وی سیٹ کا اسکرین روشن ہو گیا۔ وہ مجھے وی سی آر پر ایک چھوٹی سی فلم دکھا رہی تھی۔ مجھے اسکرین پر ایک راہداری کا منظر نظر آیا۔ دو چینی ایک اسٹریچر اٹھائے چلے آ رہے تھے۔

اسٹریچر پر کوئی عورت بیہوش پڑی تھی جس کا چہرہ ذرا دیر بعد واضح ہو گیا۔ وہ بیہوش عورت میری ماں ہی تھی۔ پھر وہ لوگ، اسٹریچر اٹھائے ایک کمرے میں داخل ہوتے نظر آئے۔ انھوں نے میری ماں کو مسہری پر لٹانے کے بعد اُس کے چہرے سے میک اَپ ختم کر دیا۔ پھر وہ کمرے سے نکلے اور اُسے مقفل کر دیا۔ اس منظر کے بعد اسکرین تاریک ہو گیا۔

لوئی چو دوبارہ آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور بولی "اب تمھیں یقین آ جانا چاہیے ابوالہول کہ تمھاری ماں بھی میری قید میں ہے۔"

"ہاں! لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمھاری حکومت نے تمھیں یہ احکام نہیں دیے ہوں گے۔"

میری بات سن کر وہ آہستہ سے ہنسی "سب کچھ حکومتوں کے احکام پر نہیں ہوتا ابوالہول! کچھ تو آدمی اپنے لیے بھی کرتا ہے۔ میری حکومت نے مجھے جو ذمہ داری سونپی تھی، وہ میں ہر حال میں پوری کروں گی، مگر یہ معاملہ ذاتی ہے۔"

"میری ماں کا معاملہ؟"

"ہاں" اُس نے جواب دیا "اگر وہ میری قید میں نہ ہوتی تو میں تم سے شاید اپنی بات نہ منوا سکتی۔"

"تم ابھی مجھ سے کوئی وعدہ لینے کی بات کر رہی تھیں، بتاؤ کیا وعدہ لینا چاہتی ہو؟"

"تمھیں پروفیسر کو قتل کرنا ہے، وہی بوالہوس بوڑھا جو تمھیں اپنی تخلیق کہتا ہے" لوئی چو نپے تلے الفاظ میں بولی اور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی "تمھیں وعدہ کرنا ہو گا ابوالہول کہ تم اُسے قتل کر دو گے!"

"مگر کیسے؟" میں نے حیرت سے کہا "مجھے تو اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے!"

"یہ تمھیں میں بتاؤں گی۔ اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو تم نہیں جانتے۔"

"لیکن تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔ میں تو خود انسانیت کے اُس دشمن کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ میرا اصل دشمن تو وہی تھا۔

"ہر چند کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، مگر میں تمھیں اس کی وجہ بتا سکتی ہوں" لوئی چو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گذر گیا۔ اُس نے طویل سانس لیا، پھر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی "پروفیسر دنیا کا ایک عظیم شخص، ایک عظیم سائنس داں ہونے کے باوجود کچھ فطری کمزوریوں کا شکار ہے۔ یہ کمزوریاں عام انسانوں میں بھی ہوتی ہیں مگر اُسے زیب نہیں دیتیں۔ تمھیں شاید یہ سن کر تعجب ہو گا کہ میرے ذہن میں بھی اُسی نے کچھ غیر معمولی صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں۔ تمھاری طرح میں نے بھی اُس کے پاس ایک عرصہ گذارا ہے۔ اس کے لیے میری حکومت نے اُسے بھاری معاوضہ ادا کیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب تم اُس کے پاس سے فرار ہوئے۔ میں تقریباً چھ سال اُس کے پاس رہی اور وہ مجھ پر مختلف تجربات کرتا رہا۔ ان تجربات کی قیمت اُسے ادا کر دی گئی تھی، لیکن اُس نے صرف اسی قیمت پر اکتفا نہ کیا۔ مجھے اُس کے پاس بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ میرے ذہن کو اس قابل بنا دے کہ میں تم پر قابو پا سکوں۔ میری حکومت نے اس دوران میں بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ میرے ملک کے ذہین ایجنٹ تمھارے پیچھے لگے رہے۔ انھیں یہ ہدایات دے کر بھیجا جاتا رہا کہ اگر وہ تمھارے اوپر قابو نہ پا سکیں تو کم از کم دوسری دو بڑی طاقتوں کے ہتھے نہ چڑھنے دیں۔ میری حکومت کو دراصل میری تربیت پوری ہونے کا انتظار تھا۔ پروفیسر نے دعویٰ کیا تھا کہ تم مجھے زیر نہیں کر سکو گے، اور اُس کا دعویٰ غلط ثابت نہیں ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم میرے سامنے بے بس پڑے ہو، مگر اس کے لیے ذاتی طور پر مجھے جو قیمت ادا کرنا پڑی وہ بہت زیادہ تھی۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اُسے میری روح نے قبول نہیں کیا، اور یہ بات خود پروفیسر کو بھی معلوم ہے۔ اُسے خبر ہے کہ میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی عزت و آبرو پامال ہونے کے بعد صبر کر لیتی ہیں اور اسے اپنی بے بسی، مجبوری اور وقت کا تقاضا جان کر بھلا دیتی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ مجھے جب بھی موقع مل گیا اُس سے انتقام ضرور لوں گی۔ بتاؤ ابوالہول، کیا اُس نے مجھ پر ظلم نہیں کیا؟"

"کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے لوئی، اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔" میں بولا "ممکن ہے تمھارے ساتھ اُس نے ظلم کیا ہو اور اس کا امکان بھی ہے کہ تم نے یہ کہانی محض اس لیے مجھے سنائی ہو کہ پروفیسر کو میرے ہاتھوں ختم کرا سکو اور میرے

جذبۂ رحم کو بیدار کر سکو۔"

وہ میری بات سن کر اس طرح چونکی جیسے میں نے اُس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ اُس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر بولی "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں میری بات پر یقین نہیں آیا؟"

"میں نے محض ایک امکان کی نشان دہی کی ہے، یہ نہیں کہا کہ تمھارا بیان قطعی غلط ہے۔"

"تمھارے نزدیک اس امکان کا کوئی سبب تو ہو گا! اگر ایسا نہیں تو میں تمھیں کیوں مجبور کرتی کہ اُسے قتل کر دو؟"

"اس کا سبب واضح ہے۔" میں نے کہا "تمھاری حکومت یہ نہیں چاہتی ہو گی کہ پروفیسر مزید زندہ رہے۔ اگر وہ زندہ رہ گیا تو ممکن ہے کوئی اور خطرناک شے ایجاد کر دے۔ اس ایجاد کا سودا وہ کسی اور ملک سے بھی کر سکتا ہے۔ تمھارا ملک اسی کے سدِباب کی خاطر پروفیسر کو قتل کرانے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔" اپنی بات کے ردِعمل میں مجھے لوئی چو کے چہرے پر جھنجلاہٹ سی نظر آئی۔ میرا تیر شاید ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم پروفیسر کو قتل کرنے پر آمادہ نہیں ہو؟" اُس کے لہجے میں کسی قدر غصہ تھا۔

"اگر میں نے تم سے یہ وعدہ کر لیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میری ماں کو رہائی مل جائے گی؟"

"جہاں تک میں سمجھی ہوں، تمھیں صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا!" اُس نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"یہی اندازہ لگانے کے لیے تو میں تم سے بہت سوال کرنا چاہتا تھا، مگر درمیان میں اور ہی بات نکل آئی۔ میرا پہلا سوال تو یہی ہے کہ تم خود اُسے ٹھکانے کیوں نہیں لگا سکتیں؟ تم خود بھی اُس سے انتقام لے سکتی ہو!"

"اگر یہ ممکن ہوتا ابوالہول تو وہ اب تک زندہ نہ بچتا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"کیوں ممکن نہیں ہوا؟"

"وہ بہت مضبوط حصار میں رہتا ہے۔ اُس کی مرضی کے بغیر کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر کوئی یہ کوشش کرے گا تو نادیدہ شعاعیں اُسے جلا کر راکھ کر دیں گی۔ کیا تمھیں اندازہ نہیں کہ وہ کتنا خطرناک ہے! جو شخص دنیا کی تین بڑی طاقتوں سے بہ یک وقت سودے بازی کرنے کا اہل ہو، کیا وہ کوئی معمولی آدمی ہو گا! مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی تمام تر قوتوں کے باوجود اس کے حفاظتی حصار کو نہیں توڑ سکتی اور میں ہی کیا، کوئی بھی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔" اُس نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

"کیا امریکی ایجنٹ بھی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے؟" میں نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"نہیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"وہ پروفیسر کو دھوکا دے کر تو اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ ایک راستہ ضرور ہے، مگر اُسے دھوکا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ وہ بلا کا ذہین اور انتہائی عیار شخص ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک وہ تینوں بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کے ہتھے چڑھ جاتا۔ وہ کسی ایک طاقت کا ساتھ دینے یا پابند رہنے کو غلامی سمجھتا ہے۔ میں نے اُس کے متعلق یہی اندازہ لگایا ہے۔ میں جب اُس کی تربیت میں تھی تو اُس کے یہی خیالات تھے، بعد میں اُس کے خیالات بدل گئے ہوں تو مجھے علم نہیں۔ اب تک اُس کے طریقۂ کار سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی ایک بڑی طاقت سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔" لوئی چو نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پروفیسر نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے کچھ اور ہی خبر دی تھی۔ یہ کہ اُس کی زندگی خطرے میں ہے۔ امریکی اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لوئی چو کے بیان سے اس بات کی تردید ہو رہی تھی۔ خود مجھے بھی پروفیسر کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے پروفیسر نے یہ نئی چال چلی ہے۔ لوئی چو نے مجھے قاہرہ لے جانے کا ذکر کیا تھا، اُس وقت جب مجھے ہوش آ رہا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے پوچھ لیا "تم مجھے قاہرہ کیوں لے جا رہی ہو؟" میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ جب ایک روسی ایجنٹ مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا تو اُس

نے بھی مصر ہی کا رُخ کیا تھا۔ اِس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔

میرا سوال سن کر وہ مسکرائی "تم اِس طرح شاید کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہو! یہ بات تمہارے علم میں بھی یقیناً ہوگی کہ پروفیسر تم پر ایک آخری تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ اُس تجربے کے بعد تمہارے اندر جو کمزوریاں ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ تمہیں کسی ایک بڑی طاقت کا وفادار بنا دیا جائے گا۔ اس آخری تجربے کے لیے تمہیں پروفیسر کے پاس لے جانا ضروری ہے۔ دراصل طے یہ ہوا تھا کہ جس ملک کے ایجنٹ بھی تم پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے، تمہارا سودا اُسی ملک کے ہاتھ کر دیا جائے گا، یعنی تمہیں اُسی ملک کا وفادار بنا دیا جائے گا۔ اب میرے ملک کو روس اور امریکہ پر سبقت حاصل ہو گئی ہے اس لیے تمہارا سودا میرے ملک کے ساتھ ہوگا۔ میرا ملک بقیہ دونوں بڑی طاقتوں کو وہ رقم ادا کر دے گا جو برسوں کے سائنسی تجربات پر خرچ ہوئی ہے۔ اس رقم کے علاوہ خود پروفیسر کو بھی اُس کی محنت اور تجربات کے صلے میں ایک بڑی رقم ادا کی جائے گی۔ باقی دو بڑی طاقتوں کو بھی تمہارے نیلام میں بولی لگانے کی اجازت ہوگی، مگر ترجیح میرے ہی ملک کو دی جائے گی۔"

"لوئی! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں بول اٹھا۔ "ایک طرف تو یہ کہہ رہی ہو کہ میرا سودا تمہارے ہی ملک سے ہوگا اور دوسری طرف بقیہ دو بڑی طاقتیں..."

"میں سمجھ گئی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "دراصل میں نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ صورت حال یہ ہے کہ میرے ملک کو اس سودے میں پروفیسر کی طرف سے اب پچیس فی صد کی چھوٹ ملے گی۔ جس ملک کے ایجنٹ بھی تمہارے اوپر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتے اُس ملک کو یہ رعایت ملتی۔ تمہارے حصول میں اسی لیے تینوں ملکوں کے ایجنٹ آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے ورنہ مقصد تو سب کا ایک ہی تھا۔ اس لیے ہمیشہ تمہی کو فائدہ پہنچا۔ اگر تینوں ملکوں میں اس معاملے پر اتفاق ہوتا تو شاید بہت جلد تم پر قابو پا لیا جاتا۔ پروفیسر کا سلوک تینوں کے ساتھ مساویانہ تھا۔"

"مساویانہ سلوک سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"تمہارے متعلق جو اطلاع بھی ہوتی، پروفیسر تینوں ہی ملکوں سے نہ چھپاتا، اور اس کی وجہ بھی تھی۔ اس طرح تمہاری تلاش میں بہ یک وقت تین ملکوں کے خطرناک ایجنٹ ہوتے۔ میری معلومات کے مطابق متعدد بار تمہیں بہ یک وقت تین تین ایجنٹوں سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے۔ اِس سے ہمیں فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ بہر حال اب تو یہ قصہ ہی ختم ہو گیا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے پُرسکون انداز میں گہرا سانس لیا۔

"کیا خبر لوئی، یہ قصہ ختم ہوا ہے یا ابھی اِس کی ابتدا ہوئی ہے؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تمہیں کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ابوالہول! تم شاید یہ سوچ رہے ہو کہ اب بھی مجھے جل دے کر نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ تو پہلے یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری اس غلط فہمی کو دور کر دوں۔" اُس نے پہلو بدلا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "تمہارے اندر جتنی بھی حیرت انگیز قوتیں ہیں، انھیں میں نے منجمد کر دیا ہے۔ تم اُس وقت تک اپنی کسی قوت کو استعمال نہیں کر سکتے جب تک میں خود ایسا نہ چاہوں۔ یا پھر کسی بھی طرح وہ رابطہ منقطع نہ ہو جائے جو میرے اور تمہارے ذہن کے درمیان قائم ہو چکا ہے، اور یہ رابطہ ٹوٹنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم مجھے قتل کر دو۔ میرے علاوہ صرف پروفیسر تمہاری تمام قوتوں کو دوبارہ بحال کر سکتا ہے، اور وہ اسی وقت ایسا کرے گا جب تمہیں اُس کے پاس پہنچا دیا جائے۔ اِس وضاحت کے بعد یقیناً تمہیں کوئی غلط فہمی نہیں رہی ہوگی!" لوئی چو کے لہجے میں چبھن تھی۔

"لوئی! تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے جو چاہوں پوچھ سکتا ہوں!" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"ہاں کہا تھا۔ میں اب بھی اپنے اُس وعدے پر قائم ہوں۔ وجہ یہ کہ اب اگر میں تمہیں سب کچھ بتا بھی دوں جو میرے علم میں ہے تو اُس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا!"

"کہیں تمہارا ملک اس لیے تو پروفیسر کو ختم کرانا نہیں چاہتا کہ رقم کی ادائیگی سے بچ جائے؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم نے بہت بچکانہ سوال کیا۔ رقم لیے بغیر وہ تمہیں کسی کے حوالے کیوں کرنے لگا! پھر جب رقم ہی ادا کر دی گئی تو پھر اُسے قتل کرانے سے کیا حاصل! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تمہیں میرے بیان پر کیوں شک ہے!"

"چلو میں یہ بات مانے لیتا ہوں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اور تم پروفیسر سے انتقام لینا چاہتی ہو تو کئی اور سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں!"

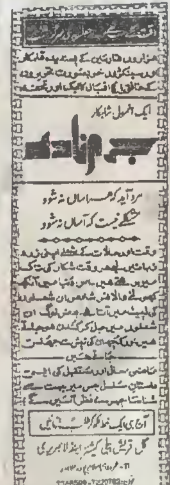

"تم سوال کرو، میں تمہیں مطمئن کر دوں گی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر تمہارے ایما پر موقع پا کر پروفیسر کو ٹھکانے لگا دیا تو جیسا کہ پہلے تم سے پوچھ چکا ہوں، میری ماں..."

"پھر تمہاری ماں کو قید رکھنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا!" وہ میری بات سمجھ کر پہلے ہی بول اٹھی۔

"تم کسی اور معاملے میں بھی تو مجھ پر دباؤ ڈال سکتی ہو۔" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"غلط خیال ہے تمہارا۔" وہ فوراً بولی۔ "تم یقیناً یہ بات نظر انداز کر گئے ہو کہ اس وقت ہم دونوں ایک ہی ملک کے وفادار ہوں گے۔ ہمارے درمیان محبت ہوگی، نفرت نہیں۔ ہمارے دوست اور دشمن ایک ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں خود بھی ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں۔ تمہاری اور میری قوتیں یکجا ہو کر اُس خواب کے تعبیر آشنا ہونے میں معاون ثابت ہوں گی جو نئے سویرے کو جنم دے گا۔ پھر تم خود ہی سوچو ابوالہول کہ تمہاری ماں میری قید میں کیسے رہ سکتی ہے!"

لوئی چو کی بات سن کر مجھے ایک روسی ایجنٹ بیلیا یاد آ گئی۔ اُس نے بھی کچھ ایسا ہی خواب دیکھا تھا مگر اُس کا خواب ٹوٹ گیا اور وہ خود بھی ٹوٹ گئی۔ وہ میرے ہاتھوں اسکندریہ میں ماری گئی تھی اور میں نے اس کی لاش کو لہ وِلاں کے سپرد کر دیا تھا۔ لوئی چو کی دلیل میں وزن تھا، لیکن پھر بھی میرا ذہن مطمئن نہ ہوا۔ ابھی میں اِس کرید میں تھا کہ وہ میرے ہی ہاتھوں پروفیسر کو کیوں قتل کرانا چاہتی ہے؟

"تمہارے اس سوال کا جواب میں دے چکی ہوں ابوالہول!" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ یقیناً وہ میرا ذہن پڑھ رہی تھی۔ میں محتاط ہو گیا۔

"یہ تمہاری ذمہ داری ہے نا لوئی کہ مجھ پر قابو پانے کے بعد تم ہی مجھے پروفیسر کے پاس پہنچاؤ؟" میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تو پھر تم خود بھی پروفیسر سے انتقام لے سکتی ہو۔ مجھے

اس پر کیوں مجبور کر رہی ہو؟"

"مجھے وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے دے گا، اور میں تمھیں وہاں چھوڑ کر لوٹ آؤں گی۔" اس نے بتایا۔ "اگر میں خود اس ابوالہوس کو قتل کر سکتی تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہوتی! میں تو مجبوراً تمھارا سہارا لے رہی ہوں کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔"

اس وضاحت کے بعد مصلحتاً میں نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا اور اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو لوئی چو سے چھپانے کے لیے دوسری باتیں سوچنے لگا۔ دراصل میرے ذہن میں یہ خیالات ابھر رہے تھے کہ میں اپنے اوپر آخری تجربہ ہونے سے پہلے ہی پروفیسر کو قتل کر دوں گا۔ مجھے یہ بات بہرحال لوئی چو سے چھپانا تھی جو میرا ذہن پڑھ سکتی تھی۔ اظہارِ آمادگی پر لوئی چو نے میرا شکریہ ادا کیا، اور پھر مجھے مزید سوالات کرنے کی اجازت دے دی۔

"تم مجھے یہاں سے قاہرہ لے جانے والی ہو تو کیا پروفیسر وہیں ہے؟" میں نے موقع دیکھ کر وہ سوال کر ہی دیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا۔

"ہاں، ہمیں پروفیسر کی زیرِ زمین تجربہ گاہ تک پہنچنے کے لیے پہلے قاہرہ ہی جانا پڑے گا۔" لوئی چو نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"اس کی تجربہ گاہ قاہرہ سے کتنی دور ہے؟"

"دس پندرہ میل کے فاصلے پر سمجھ لو۔ تم خود ہی دیکھ لوگے۔ وہاں تم بھی تو برسوں رہ چکے ہو، مگر شاید وہاں سے فرار ہوتے وقت عجلت اور دوبارہ گرفتاری کے خوف سے تم نے راستوں کو ذہن میں نہیں رکھا۔"

"ہاں" میں نے اعتراف کر لیا۔ اور یہی حقیقت بھی تھی۔ اس وقت تک مجھے اپنی حیرت انگیز قوتوں کا علم نہیں تھا ورنہ اس قدر خوفزدہ ہو کر وہاں سے نہ بھاگتا۔

"ستارہ اور قاہرہ کے درمیان پروفیسر کی زیرِ زمین تجربہ گاہ ہے۔ ممکن ہے اس کے راستے اور بھی ہوں، لیکن میرے علم میں صرف ایک راستہ ہے۔ وہ راستہ ایک طویل سرنگ کے ذریعے اہرام کے ایک مقبرے سے وہاں تک جاتا ہے۔" پھر لوئی چو نے اس علاقے کی نشان دہی بھی کی جسے میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ پروفیسر کی زیرِ زمین تجربہ گاہ کہاں ہے، میری کئی الجھنیں ختم ہو گئیں۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہ رہا کہ قاہرہ کے دورانِ قیام میں میرے دشمن مجھے اتنی جلدی کیسے تلاش کر لیتے تھے اور یہ کہ ایک روسی ایجنٹ مجھے بغداد سے اغوا کر کے ستارہ کیوں لے گیا تھا۔ اسی روسی ایجنٹ سے نمٹ کر میں قاہرہ پہنچا تھا۔

"تم صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو ابوالہول!" لوئی چو نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ اس کی توجہ یقیناً میرے ذہن پر تھی جبھی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس نے مزید کہا۔ "سنو، جب تم تینوں بڑی طاقتوں کے ایجنٹوں سے بچنے کے لیے ملکوں ملکوں بھٹکتے پھر رہے تھے، کبھی ترکی، کبھی ایران، کبھی عراق اور کبھی کسی دور دراز مغربی ملک میں، تو ان دنوں میں، پروفیسر ہی کے پاس تھی۔ وہ میری تربیت کر رہا تھا اور مجھ پر بے حد مہربان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہیں جو دنیا کے کسی ایجنٹ کو معلوم نہیں ہو سکیں۔ میں نے پروفیسر کے پاس وہ عجیب و غریب مشین بھی دیکھی تھی جو تمھاری تلاش کے سلسلے میں ہمیشہ کارآمد ثابت ہوئی۔ اس مشین کا تعلق تمھارے اندر چھپی ہوئی حیرت انگیز قوتوں سے تھا۔ تم جب بھی اپنی.. قوتوں کو بروئے کار لاتے ہو، اس مشین پر مختلف گراف بننے لگتے ہیں۔ انھیں سمجھنا میرے لیے مشکل تھا۔ میری توجہ تو اس مشین سے منسلک دنیا کے نقشے پر ہوتی۔ اس نقشے پر بھی مختلف دائرے پھیلتے اور غائب ہو جاتے۔ بالآخر نقشے پر صرف ایک دائرہ رہ جاتا۔ پروفیسر شب و روز اس مشین میں جانے کیا کیا تبدیلیاں اور ردّ و بدل کرتا رہتا، اور دن گذرتے رہتے۔ میں دیکھتی کہ وہ دائرہ جو دنیا کے کئی ملکوں کی نشان دہی کر رہا ہے، آہستہ آہستہ سمٹنے لگتا۔ جب وہ کسی ایک ملک پر چوبیس گھنٹے سے زیادہ گھیرا ڈالے رہتا تو پروفیسر اس مشین کے ساتھ اس ملک کا بڑا نقشہ منسلک کر دیتا۔ اس کے بعد دائرہ پھر حرکت میں آجاتا اور اس ملک کے کسی ایک شہر پر محیط ہو جاتا۔ اس کوشش میں پروفیسر کو

کبھی کئی ماہ گذر جاتے، مگر وہ تمھیں تلاش ضرور کر لیتا کہ دنیا کی بھیڑ میں تم کہاں ہو! پھر وہ تینوں بڑی طاقتوں کے ذمہ دار افراد کو یہ اطلاع فراہم کر دیتا۔ تم مصر سے جتنے زیادہ فاصلے پر ہوتے، تمھاری تلاش میں اتنا ہی زیادہ وقت لگتا۔ پھر جب تم خود ہی قاہرہ آ گئے تو صورتِ حال بدل گئی۔ تمھاری تلاش میں آسانی ہو گئی کیوں کہ تم پروفیسر سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اسی دوران میں میری ذہنی تربیت مکمل ہو گئی۔ مجھے خبر تھی کہ تم کہاں اور کن لوگوں سے برسرِ پیکار ہو۔ پھر تو تمھیں معلوم ہے کہ میں نے تمھیں کس طرح اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ خاص محلول پروفیسر ہی نے مجھے فراہم کیا تھا جس کی وجہ سے اب تک میرے جسم سے گلابوں کی خوشبو آتی ہے۔ اس ابوالہوس نے تو کسی اور ہی غرض سے میرے جسم پر اس محلول کا اسپرے کیا تھا۔ یہ بات خود میرے ہی ذہن میں آئی تھی کہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہوں۔ تربیت پانے کے بعد میں قاہرہ سے پیکنگ پہنچی اور پھر مجھے فوراً ہی دوبارہ قاہرہ بھیج دیا گیا۔" لوئی چو تفصیل کے ساتھ مجھے یہ سب کچھ بتا کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بیان نے میرے تمام اندازوں کی تصدیق کر دی تھی۔

"جب مجھے ہوش آ رہا تھا تو میں نے سنا تھا کہ تمھیں پیکنگ سے نئے احکام ملنے کا انتظار ہے ورنہ مجھے لے کر اب تک قاہرہ پہنچ چکی ہوتیں۔ کیا تمھیں پہلے سے یہ ہدایات نہیں ملیں کہ مجھ پر قابو پانے کے بعد مجھے لے کر قاہرہ جانا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں تمھارے ہر سوال کا جواب دیتی، لیکن وعدہ کر چکی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کر چکے ہو اس لیے تمھارے سوال کا جواب دے رہی ہوں، ورنہ ظاہر ہے کہ تم مجھے اس پر مجبور نہیں کر سکتے۔ دراصل جس دن میں تمھیں تلاش کرنے میں کامیاب ہوئی، اسی دن پیکنگ سے یہ احکام ملے کہ میرا ملک تمھاری تلاش سے دستبردار ہو چکا ہے، اور یہ کہ میں واپس پیکنگ پہنچ جاؤں۔"

لوئی چو کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پروفیسر کی کم از کم یہ اطلاع غلط نہیں تھی کہ امریکہ، دوسری دو بڑی طاقتوں سے سودے بازی کر رہا ہے۔ پیکنگ سے یہ حکم ملنے کا واضح مطلب یہی تھا کہ امریکہ سودے بازی کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میرے والد کو اب چین کی بجائے امریکہ نے یرغمال بنا لیا ہے۔

"میں نے پیکنگ کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔" لوئی چو نے مزید بتایا۔ "مجھے کل صبح تک نئے احکام مل جائیں گے۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے لوئی کہ امریکہ تمھارے ملک سے میرے حصول کی خاطر سودے بازی کر چکا ہے، اور تمھیں جو احکام ملے تھے اسی کا نتیجہ تھے؟"

"نہیں۔" لوئی چو بولی۔ "بالفرض ایسا تھا بھی تو اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ شاید طویل عرصے کی ناکامی اور بے حاصلی کے بعد میرے ملک نے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا ہو۔ لیکن تمھیں اس بات کا علم کیسے ہوا؟"

میں نے جواب میں اسے بتا دیا کہ پروفیسر نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے یہ اطلاع فراہم کی تھی۔ وہ میری بات سن کر کچھ فکرمند سی نظر آنے لگی۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔" کچھ دیر بعد وہ آہستہ سے بولی۔ "پیکنگ والوں کو کچھ دن اور انتظار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں پُریقین ہوں کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ کریں گے۔ اگر امریکہ نے اب تک خرچ ہونے والی بھاری رقم ادا بھی کر دی ہو گی تو وہ رقم واپس کی جا سکتی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ فوری طور پر مجھے پیکنگ سے جواب کیوں نہیں دیا گیا۔ یہ معاملہ اہم نوعیت کا ہے اور اس پر رواداری میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال کل صبح تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔"

پھر وہ ایک میز اٹھا لائی اور اس پر ساغر و مینا سجانے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنا ذہنی انتشار دور کرنے کے لیے ساغر و مینا کا سہارا لے رہی ہے۔ اگر میں اس کی بجائے کسی اور ایجنٹ کی قید میں ہوتا تو شاید مجھے بہت سی باتیں کبھی معلوم نہ ہوتیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت تھی کہ پیکنگ سے دستبرداری کے احکام نہ آتے تو بھی مجھے اس

سے تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملتا۔

اپنے لیے تیسرا پیگ بناتے ہوئے وہ پھر میری طرف متوجہ ہوگئی اور بولی۔ ”ابوالہول! مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تمہارا جی بھی للچا رہا ہوگا لیکن مجبوری ہے۔ اس حالت میں شراب تمہارے لیے زہر ثابت ہوگی ورنہ میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں پلاتی۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اُس کا لہجہ کسی قدر بدل گیا۔ اسی کے ساتھ مجھے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آنے لگی مگر میں نے فوراً ہی اپنے ذہن سے اِس خیال کو جھٹک دیا۔ اگر وہ میرے ارادے سے باخبر ہو جاتی تو زندگی کی جو امید بندھی تھی، وہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتی۔ مجھے اُس وقت یمامہ کا خیال آ گیا تھا جو میرے قریب آ کر موت کی آغوش میں جا سوئی تھی۔ لوئی چو کو یقیناً میرے وجود کی اس ہولناکی کا علم نہیں تھا۔ میں نے دانستہ خود پر رومانی جذبات طاری کر لیے اور لوئی چو کے حسین سراپا کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بڑی لچک سی، بڑی نازک سی لڑکی تھی۔ اُس کی بھولی سی حسین صورت دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ وہ اتنی خطرناک ہوگی۔

”تم بہت حسین ہو لوئی!“ میں نے اُسے مخاطب کیا۔ ”اتنی حسین کہ تمہاری آرزو کی جا سکے۔“

وہ میری بات سن کر چونکی، پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ”تم تو واقعی میرے ہی بارے میں سوچ رہے ہو۔ کیا میں سچ مچ تمہیں اچھی لگتی ہوں؟“

”ہاں لوئی! بہت!“ میں نے بے ساختہ جواب دیا، پھر جذباتی لہجے میں بولا۔ ”مجھے تمہاری یہ پیشکش منظور ہے کہ آخری تجربے کے بعد ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔“

”کیا یہ جاننے کے بعد بھی کہ... کہ پروفیسر مجھے... مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا ہے؟“

”وہ... وہ تمہاری مجبوری تھی لوئی! تم اُس وقت بے بس تھیں۔“

”اگر... اگر ابوالہول، تم اُسے میری مجبوری سمجھ کر نظرانداز کر سکتے ہو تو پھر... پھر تم اور میں آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال ہوں گے۔“

”اور میں اپنے رقیب سے انتقام بھی لوں گا! میں پروفیسر کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا!“ میرا لہجہ پُرجوش تھا۔

وہ ساغر اٹھائے ہوئے مسہری پر آ بیٹھی۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ چند ہی لمحے بعد اس کی جذبات سے بوجھل آواز سنائی دی۔ ”تمہاری سبز آنکھیں کتنی حسین ہیں۔ ان میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔“ اس کے اس جملے سے میں سمجھ گیا کہ میرا ایک اَپ بھی ختم کیا جا چکا ہے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بلوری ساغر میز پر رکھ دیا اور میرے سر کے بالوں میں اُس کی انگلیاں سرسرانے لگیں۔ کچھ تو میرے رومانی مکالموں کا اثر تھا اور کچھ شراب کا کہ لوئی چو بہکنے لگی۔ یمامہ بھی اسی طرح بہکی تھی، لیکن اُس وقت مجھے اپنے بلاخیز وجود کی حشر سامانیوں کا علم نہیں تھا کہ اُسے موت کی طرف بڑھنے سے روک دیتا۔ لوئی چو کے قدم بھی موت کی طرف بڑھ رہے تھے، مگر میں نے سب کچھ جانتے ہوئے اُسے نہیں روکا۔ وہ انگاروں سے کھیلتی رہی اور میں ان انگاروں کو ہوا دیتا رہا۔ کچھ دیر پہلے لوئی چو نے جو کچھ کہا تھا، مجھے یاد تھا۔ ”تم اس وقت تک اپنی کسی قوت کو استعمال نہیں کر سکتے جب تک میں خود ہی ایسا نہ چاہوں۔ یا پھر کسی بھی طرح وہ رابطہ منقطع ہو جائے جو میرے اور تمہارے ذہن کے درمیان قائم ہو چکا ہے، اور یہ رابطہ ٹوٹنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم مجھے قتل کر دو۔“

پروفیسر کے پاس سے قبل از وقت فرار کے سبب میرے اندر کئی بنیادی خامیاں رہ گئی تھیں۔ مثلاً میرے جسم سے گلابوں کی خوشبو آنا۔ میرے دشمن اسی سے میری کسی جگہ موجودگی کا سراغ پا لیتے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اچانک میرے حواس معطل ہو جانا وغیرہ۔ میں اپنی ان تمام کمزوریوں کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ ان ہی کمزوریوں میں سے ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ میری نسل مجھی پر ختم ہو جاتی اور آگے نہ بڑھتی۔ میری محبت اور نفرت کا قصہ مجھی پر ختم ہو جاتا تھا۔ آنے والی نسلوں میں میری خوشبو نہ مہکتی، میرے لہو کی خوشبو! میرے وجود میں جو بلاخیز قوتیں پیدا کر دی گئی تھیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا۔ جو عورت بھی میرے اس قدر قریب آتی، ہلاک

ہو جاتی۔ اس کا پہلا تجربہ مجھے قاہرہ میں ہوا۔ وہ عورت نیلی آنکھوں والی یمامہ تھی۔ اُسی نے مجھے پہلی بار لذت و سرشاری کے اُن لمحات سے آگاہ کیا جن سے میں پہلے بے خبر تھا، اور اس سے بھی بے خبر تھا کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ قریب آ کر بہت دور چلی گئی۔ مجھے اس کی موت کا بہت رنج ہوا۔ اسی کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ کسی عورت کو اپنے قریب نہیں آنے دوں گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے خود پروفیسر کو بھی یہ خبر نہ ہوگی کہ اُس کے تجربات کے نتیجے میں میرے اندر یہ کمی بھی رہ گئی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آخری تجربے سے پہلے یا اسی کے دوران میں میری اِس کمی کا بھی سدباب کر دیتا لیکن میں نے اُسے یہ موقع نہیں دیا اور فرار ہو گیا۔ اگر پروفیسر کو میری اس کمی کا واقعی علم ہوتا تو وہ لوئی چو کو اس سے ضرور آگاہ کر دیتا۔ لوئی چو کا میرے اتنے قریب آ جانا اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ جذبات کی رَو میں بہک رہی تھی۔ اُس وقت شاید لوئی چو کی توجہ میرے ذہن پر بھی نہ تھی کیوں کہ کوشش کے باوجود بار بار مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔ یقیناً وہ ایسے ہی لمحے تھے کہ میں بھی کچھ دیر کو سب کچھ بھول گیا۔ میرا جسم جو پہلے بالکل شل تھا، آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔ میں نے لوئی چو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”ابوالہول!“ لوئی چو کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی۔

”لوئی!“ میں نے بھی جواب دیا۔ اُس کے جسم سے اٹھتی ہوئی گلابوں کی خوشبو مجھے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔ میرے ذہن پر جمی ہوئی برف بہت تیزی سے پگھل رہی تھی۔ پھر خوشبو سے خوشبو کا وصال ہو گیا۔ وہ اور میں کچھ کہنے اور سننے کی منزل سے بہت آگے نکل گئے۔ جذبوں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ خوابوں کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ کیف و سرخوشی کا تقاضا ہی کچھ اور ہوتا ہے جہاں لفظ ساتھ نہیں دیتے۔ میری وحشتیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئیں۔ وہ آخر کب تک اس کا ساتھ دیتی! وہ بھی یمامہ کی طرح چیخی، چلائی اور پھر شاید آخری لمحات میں اُسے خطرے کا احساس ہو گیا۔ میں پہلے ہی سے اس کے لیے تیار تھا کیوں کہ لوئی چو بہرحال کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ میرے ذہن کا خودکار مدافعتی نظام حرکت میں آ گیا۔ میرے ذہن کو اُن نادیدہ آہنی پردوں نے گھیرے میں لے لیا جنہیں عبور کرنا لوئی چو کے لیے بھی ممکن نہ ہوا۔ اس کے طاقتور خیال کی چند تند و تیز لہریں ان آہنی پردوں سے ٹکرا سکیں اور پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اسی کے ساتھ میری وحشتوں کا وہ ہولناک تماشا ختم ہو گیا۔ میری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی گردش معمول پر آ گئی۔ سکون آشنا لمحوں نے سیرابی کے ساحل پر اتار دیا۔ میں نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ کر پہلی بار لوئی چو پر نگاہ ڈالی۔ وہ میری دشمن تھی، پھر بھی اُسے دیکھ کر میرے دل میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پھول بستر پر مسلا پڑا ہو۔ میں نے اُس پر چادر ڈال دی اور چہرہ بھی ڈھک دیا جو شدید اذیت کے سبب مسخ سا ہو گیا تھا۔ اگر وہ میری خواہش نہ کرتی تو شاید زندہ رہ جاتی۔ مگر میں؟ میں شاید زندہ نہ رہتا۔

میرے ذہن سے اس کے ذہن کا رابطہ اسی وقت منقطع ہو چکا تھا جب وہ خود فراموشی کے عالم میں داخل ہوئی تھی۔ اُسے یقیناً اس کا احساس نہیں ہوا یا اگر اس نے یہ بات محسوس بھی کر لی تھی تو سوچا ہوگا دوبارہ مجھے قابو میں کر لے گی۔ زندگی اور موت کے درمیان بس ایک ہی لمحہ تو ہے! لوئی چو کی نظر یقیناً اس لمحے پر نہیں تھی، سو اسی ایک لمحے کی بھول نے اُسے موت سے ہم آغوش کر دیا۔

مجھے جب اُس عمارت میں لایا گیا تھا تو میں بے ہوش تھا۔ میرے علم میں یہ بھی نہ تھا کہ میری ماں کو اُن لوگوں نے کہیں اور رکھا ہے یا وہ اسی عمارت میں ہے۔ مجھے گویا نئی زندگی ملی تھی۔ میرا ذہن اب لوئی چو کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور میری تمام حیرت انگیز قوتیں بحال ہو چکی تھیں۔ لوئی چو کے علاوہ اُس عمارت میں اور لوگ بھی تھے۔ ان میں سے کچھ کو میں خود بھی دیکھ چکا تھا۔ میری ماں کہاں ہے؟ اس سے وہ لوگ بے خبر نہ ہوں گے۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے طاقتور خیال کی نادیدہ لہروں کو اِدھر اُدھر پھیلا دیا۔

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میری ماں اسی عمارت میں ہے۔ لوئی چو کے علاوہ وہاں چار افراد اور تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تھا۔ یہ چاروں افراد چینی ایجنٹ تھے۔ احتیاطاً میں نے ان میں سے صرف ایک کے ذہن کو پڑھا تو مجھے

ڈاکٹر کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ بھی غیر معمولی ذہن کا مالک نہ ہو۔ ایسی صورت میں وہ بھی میرے لیے خطرناک ثابت ہوتا اور میں اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر کا کمرہ، لوئی چو کی خواب گاہ کے برابر ہی تھا اور اس وقت وہ محوِ خواب تھا۔ میری نگہداشت کے سلسلے میں اُسے مسلسل جاگنا پڑا تھا۔ یہ تمام باتیں مجھے ایک چینی ایجنٹ کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوئیں جو خود بھی سو رہا تھا۔ اسی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ عمارت کہاں ہے! وہ لوئر چیت پور روڈ کے پیچھے کا علاقہ تھا اور چینا پاڑا کہلاتا تھا۔ یہاں رہنے بسنے والوں کی اکثریت چینیوں ہی کی تھی۔

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ یہ وقت لوگوں کے لیے یوں بھی گہری نیند کا ہوتا ہے۔ میں لوئی چو کی خواب گاہ سے نکلا ہر طرف سناٹا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ میں اُن چینی ایجنٹوں کو ٹھکانے لگا دوں، دوم یہ کہ اُن کا ذہنی توازن بگاڑ دوں۔ دونوں باتوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ وہ اپنے بڑوں کو کوئی اطلاع نہ دے سکیں۔ اس طرح نئے چینی ایجنٹوں کو وہاں پہنچنے اور صورتِ حال کا جائزہ لینے میں دیر لگتی۔ یہ تاخیر میرے لیے سود مند تھی۔ میں اس عرصے میں کسی نتیجے تک پہنچ جاتا کہ اب مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ بیہوشی یا نیند کی حالت میں اُن لوگوں پر بھی آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے جو غیر معمولی ذہن کے مالک ہوں۔ اگر اُن میں سے وہ ڈاکٹر یا کوئی اور شخص غیر معمولی ذہن کا مالک تھا تو بھی مجھ سے نہ بچتا۔

پھر میں نے دیر نہیں کی۔ میرے طاقتور ذہن کی ہلاکت خیزی کا پہلا شکار وہی ڈاکٹر ہوا۔ خفیف سے ذہنی جھٹکوں نے اُس کا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ بیدار ہو کر پاگلوں کی طرح چیخنے لگتا، میں نے اُسے گہری نیند سُلا دیا۔ اس کے لیے مجھے اُس کا کمرہ کھلوانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پھر میں نے لوئی چو کے باقی تین ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی کیا۔ اب وہ بیدار ہوتے تو انھیں کچھ بھی یاد نہ آتا۔

دلّی سے میں جو رقم لے کر چلا تھا وہ کلکتے کے دوران قیام میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ میری گزر بسر کا ذریعہ عام طور پر میرے دشمن ہی بنتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی مجھے یہی خیال آیا۔ اب وہاں میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں دوبارہ لوئی چو کی خواب گاہ میں آ گیا۔ تلاشی کے دوران میں میری نگاہ جدید ساخت کے ایک ریوالور پر پڑی تو میرے ذہن میں ایک اور خیال پیدا ہوا۔ میں نے وہ ریوالور ایک طرف اٹھا کر رکھ دیا اور الماری کی تجوری کا تالا توڑنے لگا۔ اس الماری کی تجوری میں ہندوستانی اور غیر ملکی کرنسی کے علاوہ مجھے ایک خطرناک ہتھیار بھی نظر آیا۔ یہ غیر معمولی ہتھیار میرے لیے نیا نہ تھا۔ میں خود بھی اس ہتھیار کو استعمال کر چکا تھا۔ اس ہتھیار کی نال سے نکلنے والی بنفشی رنگ کی شعاعیں بہت خطرناک تھیں۔ ریوالور سے ملتے جلتے اس ہتھیار سے میں نے قاہرہ میں ایک امریکی ایجنٹ تھری ناٹ کو بھی ہلاک کیا تھا۔ قاہرہ سے چلتے وقت بھی یہ ہتھیار میرے پاس تھا اور اس کے علاوہ دیگر جدید قسم کے امریکی ہتھیار بھی میں ساتھ لایا تھا۔ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے میں یہ ہتھیار میرے کام آتے۔ دلّی کے دوران قیام میں وہ قیمتی ہتھیار غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ غنڈوں نے انھیں اونے پونے بیچ دیا۔ ان ہتھیاروں کو تلاش کرنے کی مہلت مجھے نہیں ملی اور میں دلّی سے کلکتے آ گیا۔ اب مجھے پھر یہ موقع ملا تو میں نے اسے ضائع نہیں کیا۔ اُس ہتھیار کو بھی میں نے کرنسی کے ساتھ ہی تجوری سے نکال لیا۔ مجھے علم تھا کہ اُس ہتھیار کی نال سے نکلنے والی شعاعیں کسی بھی جاندار کو موم کی طرح پگھلا سکتی ہیں۔ اس کی فرصت تھی نہ ضرورت کہ میں تجوری سے برآمد ہونے والی کرنسی کو شمار کرتا۔ زیادہ تعداد امریکی ڈالروں کی تھی جو سرسری اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ پونڈ اسٹرلنگ گنّی، روبل اور دیگر ممالک کی کرنسی تھی۔ ہندوستانی کرنسی بھی کم نہیں تھی۔ مجھے ایک اٹیچی نظر آئی جس میں لوئی چو کے کپڑے تھے۔ کپڑوں کو میں نے فرش پر ڈال دیا اور اٹیچی کو اچھی طرح دیکھ بھال کر اُس میں کرنسی رکھ لی۔ مجھے تلاشی کے دوران ہی میک اپ کا سامان بھی ملا، اسے بھی میں نے اٹیچی میں رکھ دیا۔

لوئی چو کی خواب گاہ سے نکل کر میں نے بقیہ کمروں کی تلاشی لی۔ وہاں سے بھی مجھے کچھ کام کی چیزیں ملیں اور خطرناک ہتھیار بھی ملے۔ مزید کرنسی بھی ہاتھ آئی۔ میں نے ابھی تک صرف ایک ہی کمرے کا رُخ نہیں کیا تھا اور وہاں سے مجھے کچھ ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ وہاں میری ماں تھی۔ اس کمرے کا دروازہ مجھے مقفل ملا۔ اب میں لوئی چو کی خوابگاہ سے نکل کر اُس کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اٹیچی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اُسے فرش پر رکھ کر کمرے کا تالا توڑ دیا۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا ورنہ مجھے اس کے لیے اوزاروں کی ضرورت تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بھی بند پا کر میں نے اپنی ماں کے ذہن سے رابطہ قائم کیا۔ وہ بیدار ہو چکی تھی۔

دروازہ کھول دو! میرے ذہن نے اُس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔

دوسرے ہی لمحے قدموں کی چاپ ابھری اور پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ میں نے دروازہ کھلتے ہی اُس کے ذہن کو آزاد کر دیا۔

”کون ہو تم؟“ اُس نے مجھے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔

”تمھارا بیٹا!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ میں اس وقت اُسے دیکھ کر جذباتی ہیجان کا شکار ہو گیا تھا ورنہ شاید یہ بات میری زبان پر نہ آتی۔

”بیٹا!“ وہ حیرت سے بولی، پھر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ بات بگڑتی میں نے اس کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ وہ نیند کے سے عالم میں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ جلد ہی میں اسے ساتھ لیے عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر میک اپ تھا نہ مجھے ابھی یہ مہلت ملی تھی۔ لوئی چو نے ہم دونوں کا میک اپ ختم کر دیا تھا۔ میں نے سوچا بھی کہ میں بھی میک اپ کر کے چلوں، مگر صبح ہونے اور دن کا اجالا پھیلنے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ میک اپ میں بہت دیر لگتی اور وہ عمارت بہرحال چینی ایجنٹوں کے تصرف میں تھی۔ کلکتے میں اور بھی چینی ایجنٹ ہو سکتے ہیں، میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں اسی لیے دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی

وہاں سے نکل آیا۔

گلیوں گلیوں میں لوئر چیت پور روڈ آ گیا اور پھر مجھے ننگار سینما سے کچھ آگے ایک ہاتھ رکشا مل گیا۔ مجبوراً میں اپنی ماں کے ساتھ اسی میں سوار ہو گیا۔ میری ماں کا ذہن اب تک میرے قابو میں تھا ورنہ وہ یقیناً اتنی آسانی کے ساتھ میرے ساتھ نہ ہوتی۔ میں نے رکشے والے کو دھرم تلہ چلنے کو کہا تھا۔ فی الحال کسی ہوٹل میں قیام کے سوا میرے لیے کوئی اور راہ نہ تھی۔ اس وقت پارک سرکس یا کولوٹولے جانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔

ٹن ٹن ٹن! رکشے والے کے گھنگرو کی صدا گونجتی رہی اور راستہ طے ہوتا رہا۔ ایک غریب شخص اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر اپنے ہی جیسے دو انسانوں کا بوجھ کھینچتا رہا۔ کلکتے آ کر پہلی بار اور وہ بھی مجبوراً میں اس سواری میں بیٹھا تھا۔ جب پہلی مرتبہ میں نے جانور کی جگہ آدمی کو یوں رکشا کھینچتے ہوئے سڑکوں پر بھاگتے دیکھا تھا تو مجھے عجیب سا دکھ ہوا تھا۔ رکشے والے کے دائیں ہاتھ میں گھنگرو ہوتے یا ایک گھنٹی جسے وہ سارے راستے بجاتا چلتا۔ ایک آدمی پر دوسرے آدمی کا یہ جبر مجھے گراں گزرا اور شاید اسی لیے میں کبھی ہاتھ رکشا میں نہیں بیٹھا۔ اگر مجھے جلد از جلد اس علاقے سے نکلنا نہ ہوتا یا مجھے کوئی اور سواری مل جاتی تو اس وقت بھی اُسے نظر انداز ہی کر جاتا۔

رکشے والے کو میں نے گرانڈ ہوٹل کے سامنے روکا اور اپنی ماں کا ہاتھ تھامے نیچے اتر گیا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رکشے والے کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اُسے رکھ کر آگے بڑھ گیا۔

دشّن بشّن دا دو! رکشے والا کہتا رہ گیا مگر میں نے سن کر بھی جیسے کچھ نہیں سنا۔ شاید وہ یہ سمجھا تھا کہ میں غلطی سے اُسے سو روپے کا نوٹ دے دیا ہے۔

میں نے گرانڈ ہوٹل میں ایک سوئٹ حاصل کر لیا۔ وہ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک نشست گاہ تھی اور دو خواب گاہیں۔ اس مہنگے ہوٹل میں اب زیادہ عرصے رہنا بھی میرے لیے آسان تھا کیوں کہ میرے پاس رقم کی کمی نہ تھی۔

میری ماں وہاں آ کر بھی کھوئی کھوئی سی تھی کیوں کہ

اُس کے ذہن کو میں نے ابھی تک آزاد نہیں کیا تھا جینا باڑے سے دھرم تلہ پہنچنے تک میں ایک فیصلہ کر چکا تھا اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اُس سے مزید جھوٹ بول سکتا۔ ایک نہ ایک روز تو یہ حقیقت کھلنا ہی تھی کہ میں اُس کا بیٹا ہوں۔ تو پھر پردہ کیسا؟ خوف کس لیے؟ یہی تو ہوتا کہ اُسے حقائق کا علم ہونے کے بعد صدمہ پہنچتا، یہ ملال ہوتا کہ اُس کا شوہر اور چھوٹا بیٹا، دشمنوں کی قید میں ہیں۔ میں آخر کب تک اُسے دھوکے میں رکھتا! کب تک اپنے دل کو مارتا اور خود کو اس کی محبت سے محروم رکھتا! اس وقت اپنی ماں کو اس لیے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ اُس کی ذہنی حالت ٹھیک نہ تھی۔ یادداشت واپس آنے کے فوراً بعد اُسے سب کچھ بتا دینا اُس کے ذہنی توازن کو بگاڑ دیتا، لیکن اب ایسا نہ تھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ اب اُس کے ذہن پر کوئی بُرا اثر نہ پڑتا۔ میرے لیے اُس کا ذہن پڑھنا ممکن تھا لیکن اب میں خود اُسی کی زبانی سب کچھ سننے کا خواہش مند تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔

وہ یوں چونکی جیسے سوتے سوتے ایک دم آنکھ کھل گئی ہو۔ میں اُس کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے حیرانی اور پریشانی سے چاروں طرف دیکھا، پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "میں... میں کہاں ہوں؟ اور... اور تم... تمہارا چہرہ مجھے آشنا سا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟... تم کون ہو؟ اور یہ... یہ جگہ کون سی ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ اُسے میرا چہرہ کیوں آشنا معلوم ہوا۔ جینا باڑے کی اُس عمارت میں کچھ دیر کو اُس نے عالمِ ہوش میں میرا چہرہ دیکھا تھا۔ پھر میں نے اُس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا تھا۔

"تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ ہر خطرے کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔" میں نے نرم لہجے میں اُسے تسلی دی "تمہارے ہر سوال کا جواب تمہیں مل جائے گا، لیکن اس سے پہلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گی؟"

"جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو جائے گا کہ میں کہاں ہوں، تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی!" اس کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

میں نے اُس کے سوال کا جواب دے دیا، پھر بولا۔

"شریف حسین کو جانتی ہو؟"

"ہاں!" وہ میری توقع کے مطابق چونک اُٹھی "وہ... وہ میرے شوہر کا دوست ہے... مگر تم... کیا تم اُس سے واقف ہو؟... کہاں ہے وہ؟"

"تمہارے سامنے بیٹھا ہے!"

"تم!... نہیں... تم شریف حسین نہیں ہو۔ وہ... تو ہندوستانی تھا اور تم کوئی عرب معلوم..."

"میں ہی تمہاری خاطر شریف حسین بن گیا تھا!" یہ کہتے ہوئے میں نے طویل سانس لیا۔

"مگر کیوں؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے کہ مجھے تم تک پہنچنے کے لیے کیا کیا بننا پڑا!"

"مجھ تک پہنچنے کے لیے!" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اگر تم سن سکو تو میں تمہیں ایک ایسے بچے کی داستان سناؤں جو ایک سال کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا!" میری آواز جیسے خود بخود بھرّانے لگی۔ وہ مجھے حیرت سے تکنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے مزید کہا۔ "اُس بچے کو سعودی عرب کے ایک شہر جدہ سے اغوا کیا گیا تھا۔ اس کے والدین کو ہندوستان سے وہاں پہنچے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ اُسے اغوا کرنے والا اسی کے والدین کا ایک ملازم ضیغم تھا۔ وہ ایک رات..."

"ٹھیرو!" میری ماں بول اُٹھی "کہیں یہ ساری باتیں تمہیں شریف حسین نے تو نہیں بتائیں؟ مگر... تم... تم تو ابھی کچھ اور ہی کہہ رہے تھے کہ تمھی شریف حسین بھی تھے! یہ... یہ کیا چکر ہے؟ کون لوگ ہو تم؟"

"پہلے سکون سے یہ سن لو کہ اُس بچے پر کیا گزری!"

"مگر تم... تمہیں کیا خبر کہ..."

"مجھی کو تو خبر ہے!"

"تو کیا تم... تم اُسے... میرے بچے کو جانتے ہو؟... کیا وہ... وہ زندہ ہے؟" وہ مضطرب ہو گئی۔

"ہاں وہ زندہ ہے اور... اور شاید اس لیے زندہ ہے کہ تمہارے سینے سے لگ کر رو سکے۔ تم سے اپنی محرومیوں اور دکھوں کی داستان بیان کر سکے!" کوشش کے باوجود میری آواز پھر بھرّا گئی۔

"مجھے بتاؤ... بتاؤ وہ کہاں ہے؟ کس... کس حال میں ہے؟ اور... اور..." وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"سب کچھ... سب کچھ معلوم ہو جائے گا تمہیں!" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر اُسے اپنی داستان مختصراً سنانے لگا "وہ ایک سرپھرا سائنس داں تھا جس نے اس بچے کو اغوا کرایا تھا۔ انسانی دماغ میں جانے کتنے خلیے خوابیدہ حالت میں ہوتے ہیں جنھیں اگر بیدار کر دیا جائے تو انسان میں حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین قوتیں پیدا ہو جائیں۔ وہ خبطی سائنس داں کسی طرح اپنی اِس کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُسی بچے پر اُس خبطی نے یہ تجربات کیے۔" پھر میں نے اپنی ماں کو مختصراً اُن سائنسی تجربات کی روداد سنا دی۔ وہ حیرت سے میری باتیں سنتی رہی۔ پھر جب میں نے اُن تجربات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حیرت انگیز قوتوں کا ذکر کیا تو اُس کے چہرے سے بے اعتباری جھلکنے لگی مگر زبان سے اُس کا اظہار نہیں کیا۔ میری ماں ہی پر کیا موقوف تھا، وہ باتیں کسی بھی ذی ہوش شخص کے لیے ناقابلِ یقین تھیں۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھا "جب وہ بچہ اس پاگل سائنس داں کی قید سے فرار ہو گیا تو رفتہ رفتہ خود اس پر اپنی قوتیں کھلیں۔ پھر دنیا کی تینوں بڑی طاقتوں کے خطرناک ایجنٹ اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اس بچے کو آخری تجربے کے لیے سائنس داں کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔ وہ بچہ اپنی حیرت انگیز قوتوں کے بل بوتے پر انسان اور انسانیت کی عظمت و سربلندی کے لیے جنگ کرتا رہا۔ اسی دوران میں اُسے بتایا گیا کہ اس کے والدین اور چھوٹے بھائی کو دنیا کی تینوں بڑی طاقتوں نے یرغمال بنا لیا ہے۔ وہ..."

"کیا؟" میری ماں درمیان میں بول اُٹھی "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اُس... اُس بچے کی ماں... ماں تو میں ہوں!"

"مجھے معلوم ہے!" میں اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تمہیں اسی لیے تو اُسی بچے کی روداد سنا رہا ہوں!"

"مگر... مگر بیٹے... پہلے تو کچھ اور... اور یہی معلوم ہوا تھا مجھے! اگر واقعی تمھی شریف حسین تھے تو تمہارا پہلا بیان..."

"اس کی بھی وجہ تھی۔ اگر اُس وقت تمہیں حقائق سے آگاہ کر دیا جاتا تو شاید تم یہ صدمہ برداشت نہ کر پاتیں!"

"تو... تو کیا میرے شوہر اور... اور میرا بچہ اب بھی..." وہ کچھ کہتے کہتے خود ہی رک گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

اُسی وقت میں نے اُس کے ذہن پر توجہ دی۔ اُس کا ذہن شدید انتشار اور صدمے کا شکار تھا۔ میں نے اس کے ذہن کو سنبھال لیا۔ اس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ اس کے ذہن کی قوتِ مدافعت بڑھ گئی۔ اس میں جینے اور حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ میرا بیان ناقابلِ یقین ہونے کے باوجود بالکل سچ ہے۔

"تم حوصلہ نہیں ہارو گی!" میں نے اُس کے ذہن کو آخری بار ترغیب دی۔

"ہاں... ہاں میں... میں حوصلہ رکھوں گی... میں حالات کا مقابلہ کروں گی!" وہ بڑبڑانے لگی اور میں نے اس کے ذہن سے رابطہ منقطع کر لیا۔ اب اُس کے چہرے سے دبے دبے جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ بالکل بدلی بدلی سی نظر آنے لگی تھی۔ پھر اس نے خود ہی مجھے مخاطب کیا "ہاں تو تم یہ بتا رہے تھے کہ..."

"اُس بچے کے والدین اور بھائی کو یرغمال بنا لیا گیا اور پھر اُسے دھمکیاں دی جانے لگیں..." میں اُس کی بات پوری کر کے بقیہ روداد بیان کرنے لگا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا کیوں کہ اب اس میں سننے کا حوصلہ تھا "... پھر اس بچے نے دلّی میں اپنی ماں کو تلاش کر لیا اور اُسے امریکی ایجنٹوں کے چنگل سے نکال لایا!" اس کے بعد میں نے کلکتہ پہنچنے اور پھر اس کی یادداشت واپس آنے تک کے واقعات بیان کر دیے "... اس روز جب وہ

بچہ اپنی ماں کا ذہن پڑھ کر اپنے ماضی کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے والا تھا تو ایک چینی ایجنٹ نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ وہ بے خبر تھا اس لیے چوٹ کھا گیا۔ پھر جب اُسے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ اس کی ماں بھی چینی ایجنٹوں کی قید میں ہے۔ اس کی قوتیں جو وقتی طور پر ناکارہ بنا دی گئی تھیں، وہ پھر بیدار ہو گئیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اس نے چینی ایجنٹوں کا بھی وہی حشر کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کے بعد وہ... وہ بچہ جسے اس کے دشمن ابوالہول کہتے تھے اپنی ماں کو وہاں سے بھی نکال لایا اور... اور...“ میری آواز کانپنے لگی۔ ”اور پھر... پھر اس نے اپنی محرومیوں اور دکھوں کا حال... اپنی... اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں سے... ماں!“ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بات کہتے کہتے رہ بھی گیا تھا! میں نے اس سے سبھی کچھ تو کہہ دیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں دھندلائی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تُو... تو... میرا بچہ... میرا...“ میں نے اپنی ماں کے ہونٹوں کو کانپتے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے خوشی کے آنسو۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میری طرف بڑھ آئی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میرے دل کا اس وقت عجیب عالم تھا۔ وہ یقیناً سمجھ چکی تھی کہ میں ہی اس کا بیٹا ہوں۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئی اور پھر اس نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”تیری آنکھیں... وہی... ویسی ہی... وہی ہیں۔ میں... میں ان سبز آنکھوں کو نہیں بھول سکتی، تُو... تُو...“ پھر اس نے میری پیشانی پر اپنے لرزتے ہوئے ہونٹ رکھ دیے۔

اس ایک بوسے کی راحت میرے تمام دکھوں پر بھاری تھی۔ وہ ایک لمحہ جیسے صدیوں پر پھیل گیا۔ میری روح میں ایک ٹھنڈک سی اتر گئی۔ میرے بے قرار دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔ کڑی دھوپ میں جیسے مجھے کوئی شجر سایہ دار مل گیا۔ زندگی کی بے معنویت میں جیسے معنی پیدا ہو گئے۔ جیسے میرے سینے کا خلا بھر گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں جانے کب تک اُس کے سینے سے لگا ہوا بلکتا رہا اور کب ساری محرومیاں، سارے ملال آنسوؤں میں بہہ گئے۔ وہ اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”تو صبر رکھو میرے بچے!... تو صبر رکھو“ وہ مجھے تسلی دے رہی تھی ”اب... اب تو اکیلا نہیں، تیری ماں بھی تیرے ساتھ ہے۔ میں... میں تجھے اپنے ساتھ... اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ گھر... ہم گھر چلیں گے۔“

”گھر؟“ میں نے اس کی آغوش سے سر اٹھایا۔

”ہاں گھر، میرے بچے!“ اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”ماں! ہمارا گھر کہاں ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

”قاہرہ میں!“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہمارا بہت بڑا خاندان ہے بیٹے! مگر... وہ“ کچھ کہتے ہوئے رک گئی، پھر خود ہی بولی۔ ”وہ... تُو نے شاید یہ بھی بتایا تھا کہ وہ خبطی اور ظالم سائنس دان بھی تو وہیں... وہیں قاہرہ کے قریب ہے؟“

”ہاں“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں اپنے جذبات پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں وہاں جا کر خطرے سے بہت قریب ہو جاؤں گا۔“

”پھر... پھر کہیں... کہیں اور چلتے ہیں... کہیں بہت دور جہاں تیرے دشمن نہ پہنچ سکیں۔“ اس کی محبت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ایسی ہی باتیں کرتی۔

”میں تمھیں بتا چکا ہوں ماں کہ کرۂ ارض پر کوئی ایسی جگہ نہیں کہ میں اُن سے چھپ کر رہ سکوں۔ اُن سے بچاؤ بہت مشکل ہے، لیکن کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ ممکن ہے کہ میں... میں تمھارے ساتھ قاہرہ چلنے کا فیصلہ کر لوں، مگر سوچنا پڑے گا... سوچنا پڑے گا... ہاں یہاں اس شہر میں مزید قیام کسی صورت مناسب نہیں۔“ میں سوچتے ہوئے اس سے کہتا رہا۔ ”چینی ایجنٹ مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی تو... تو اس کا مطلب یہ ہے ماں کہ دوسری دو بڑی طاقتوں کے ایجنٹ بھی یا تو یہاں پہنچنے والے ہوں گے یا پھر پہنچ چکے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ پھر کوئی ہنگامہ کھڑا ہو، میں تمھیں کم از کم کسی محفوظ جگہ پہنچا دینا چاہتا ہوں۔“

”مگر میں... میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں اب تمھیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔“ اُس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”میری زندگی تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“

”اس پر ہم بعد میں غور کریں گے ماں کہ موجودہ صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت تو میں تم سے کچھ اور ہی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا خبر پھر زندگی اس کی مہلت دے نہ دے۔ میں نے اپنے جبر کی روداد بیان کر دی کہ مجھ پر تم سے بچھڑ کر کیا گزری! اب... اب میں تم سے تمھارا حال پوچھوں گا۔“

”ہاں بیٹے... ہاں میرے بچے!“ وہ بول اٹھی۔ ”میں تیرے ہر سوال کا جواب دوں گی اور... اور تجھے بتاؤں گی کہ تو کون ہے، کس کا بیٹا ہے... اور جب... جب تجھے اغوا کر لیا گیا تو مجھ پر اور تیرے والد پر کیا بیتی۔“ اُس نے گہرا سانس لیا اور کچھ دیر کو جیسے خیالوں میں کھو گئی۔ وہ یقیناً بیتے ہوئے لمحوں کو اپنے حافظے میں زندہ کر رہی تھی۔

پھر جب کچھ دیر بعد میری ماں کے ہونٹ ہلے، تو میرا پورا وجود سماعت بن گیا۔ وہ کہتی رہی اور میں سنتا رہا۔ ایک ایک کر کے اس نے ماضی کی ساری گرہیں کھول دیں۔ یہ تو مجھے پہلے ہی وہ بتا چکی تھی کہ میرا وطن کون سا ہے۔ باقی باتوں کا علم بھی مجھے اسی کی زبانی ہوا۔ وہ مجھے ابتدا سے سب کچھ بتانے لگی، اس وقت سے جب اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ”تیرے والد اور میں ایک ہی خاندان سے ہیں۔ میں تیرے والد کے چچا کی بیٹی ہوں۔ یہ رشتہ بچپن ہی میں طے ہو گیا تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا اور میرے تایا ہی نے مجھے بیٹی کی طرح پالا تھا۔ میں اٹھارہ سال ہی کی تھی کہ میری شادی ہو گئی۔ تیرے والد بچپن سے بہت ذہین تھے۔ جب ہماری شادی ہوئی تو وہ مصر کی وزارت خارجہ میں تھرڈ سیکرٹری تھے۔ انھیں اس وقت تایا نے اُردن سے بلایا تھا۔ شادی کے کچھ روز بعد ہی وہ مجھے مصر سے اُردن لے گئے۔ وہاں سے اُن کا تبادلہ ہندوستان کے مصری سفارت خانے میں ہو گیا۔ وہیں دہلی میں تُو پیدا ہوا۔ پھر جب تو سال بھر کا ہوا تو تیرے والد کو ترقی ملی اور اسی کے ساتھ سعودی عرب جانے کے احکام ملے۔ وہ تصویر جس کا تو نے ذکر کیا ہے، انھی دنوں کی ہے۔ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے تیرے والد نے وہاں مختلف تاریخی مقامات پر میری بہت سی تصویریں کھینچی تھیں۔ پھر جب ہم جدے میں تھے تو تیرے اغوا کا ہولناک واقعہ پیش آیا۔ اس صدمے نے مجھے بیمار ڈال دیا۔ تیرے والد نے مجھے مصر بھیج دیا۔ میں کئی سال زیر علاج رہی اور مرتے مرتے بچی۔ اس دوران میں تیرے والد بھی کئی بار مصر آئے اور مجھے تسلیاں دیں کہ جلد تیرا سراغ مل جائے گا۔ انتہائی کوششوں اور تمام اثر و رسوخ کے باوجود تو نہ مل سکا۔ تیرے والد نے میرا جی بہلانے اور تیری یاد کو بھلانے کے لیے اپنے محکمے سے طویل رخصت لی۔ وہ مجھے ملکوں ملکوں گھماتے رہے۔ مجھے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے، مگر میرا جی نہ بہلا۔ مجبوراً وہ مجھے پھر مصر چھوڑ کر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ترکی چلے گئے۔ اب وہ فرسٹ سیکرٹری ہو چکے تھے۔ برسوں تیری یاد کا زخم نہ بھرا۔ پھر برسوں بعد ہی تیرا بھائی پیدا ہوا۔ اُس وقت میں تیرے والد کے ساتھ فرانس میں تھی۔ مجھے خدا نے دوسرا کھلونا دے دیا مگر... مگر...“ اُس کی آواز بھرانے لگی۔ ”مجھے کیا خبر تھی کہ وہ... وہ بھی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ تُو نے... تُو نے ہی تو بتایا ہے کہ اُسے... اُسے اور تیرے والد کو دنیا کی دو بڑی طاقتوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔“

”ہاں... ہاں ماں!“ میں نے طویل سانس لیا، پھر خود پر قابو پا کر پُرعزم لہجے میں بولا۔ ”جس طرح میں نے تمھیں دشمنوں کے چنگل سے آزاد کرایا ہے ماں، اپنے والد اور بھائی کو بھی اُن کی قید میں نہیں رہنے دوں گا!“

”خدا تیری زبان مبارک کرے۔“

پھر مجھے ایک اور خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ ”ماں! میرا نام... میرا نام تم نے کیا رکھا تھا؟“

”ادریس“ اس نے جواب دیا۔ ”ادریس المہندس۔“

”کیا؟“ میں کوشش کے باوجود اپنی آواز کو بلند ہونے سے نہ روک سکا۔

”ہاں یہی نام رکھا تھا، مگر تو اس پر اتنا حیران کیوں ہے بیٹے؟“ اُس نے کہا۔ پھر میرا جواب سنے بغیر مزید بولی۔ ”دراصل ہمارا خاندان پشت در پشت سے اسی پیشے سے وابستہ رہا ہے۔ تیرے دادا بھی اپنے وقت کے بہترین مہندسوں میں شمار ہوتے تھے، البتہ تیرے والد نے یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اس کے باوجود بھی وہ ابتدا سے اپنے نام کے ساتھ مہندس (انجینئر)

لکھتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ الیاس المہندس تیرے والد کا نام تھا۔ اسی لیے ہم نے اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے تیرے نام کے ساتھ بھی اس خاندانی تفاخر کو برقرار رکھا۔“

میری ماں جانے اور کیا کیا کہتی رہی، مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ میں اس بات کو محض اتفاق ماننے پر آمادہ نہیں تھا کہ میرے ذہن میں بھی یہی نام آیا۔ وہ بھی اس وقت جب میں اپنی حقیقی عمر کا سراغ پا چکا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اپنے اصل خدوخال کے ساتھ زندگی گزاروں گا۔ سوچتے سوچتے ایک دم جیسے میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔

پہلے بھی کئی بار اپنی ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ایک سال کی عمر کے واقعات کی جھلک نظر آئی تھی جن کا میں ذکر بھی کر چکا ہوں۔ تصور میں خود اپنی صورت دیکھنا، اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا، اس کا جھک کر میری پیشانی چومنا، یہ باتیں بھی تو غیر معمولی نہیں۔ میرے لاشعور میں شاید یہ نام کہیں رہ گیا تھا۔ پھر جب پروفیسر نے مجھ پر سائنسی تجربات کیے اور میرے دماغ کے خوابیدہ خلیوں کو بیدار کر دیا تو ایک مدت کے بعد لاشعور کی کچھ باتیں، کچھ منظر میرے شعور میں آ گئے۔ عام حالات میں کسی ایک سالہ بچے کو اپنا نام یاد نہیں رہ سکتا اور نہ اس عمر کا کوئی واقعہ۔ مگر میرے ساتھ تو کچھ اور صورت پیش آئی۔ میں اگر اپنے ذہن پر زور دیتا تو شاید اس عمر کی مجھے کچھ اور باتیں بھی یاد آنے لگتیں، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس نتیجے پر پہنچ کر سکون کا سانس لیا اور پھر اپنی ماں کے استفسار پر اسے بھی یہ حیران کن اور عجیب بات بتا دی۔

”تو نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے، اپنی عمر کو گھٹا بڑھا سکتا ہے، اس کے علاوہ اور بہت سی حیران کن باتیں ہیں جو تو نے مجھے اپنے متعلق بتائی ہیں تو پھر یہ بھی ممکن ہے۔“ میری ماں نے کہا۔ ”میں نے تو اپنے بچپن میں اس سے بھی عجیب ایک بات سنی تھی کہ دو مہینے کی ایک بچی بولنے لگی تھی۔ پھر اگر تجھے اپنا نام یاد رہ گیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے!“

میں کوئی غیر انسانی وجود نہیں، کسی سائنس داں کی کوئی حیرت انگیز ایجاد نہیں، انسان ہوں! اس آگہی اور یقین کے بعد میری روح سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ میرے والدین تھے، خاندان تھا، وطن تھا اور میری پہچان تھی۔ میں ابوالہول نہیں، ادریس المہندس ہوں۔ اس یقین نے جیسے مجھے حیاتِ نو بخش دی۔ اُسے میں نے شکست دے دی تھی جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اب میرے لیے یہ بات بھی راز نہیں رہی تھی کہ پروفیسر نے مجھے ابوالہول کا نام کیوں دیا؟ اس کا سبب یقیناً میرا وطن ہو گا۔ قدیم مصری تاریخ اور اس نام کی معنویت کے پیش نظر پروفیسر مجھے اس نام سے پکارتا ہو گا۔ اُس نے مجھے دنیا کے لیے ایک خطرہ، ایک خوف ہی تو بنا دیا تھا۔ اس سرزمین سے میری دلچسپی فطری تھی۔ ابوالہول کے مجسمے کی طرف لاشعوری طور پر میرا بار بار کھنچا چلا جانا اس تعلق کا ثبوت تھا۔ شاید اس کشش کا ایک سبب اور بھی تھا کہ لوئی جو کی اطلاع کے مطابق وہیں سے پروفیسر کی زیر زمین تجربہ گاہ کا راستہ جاتا تھا جہاں میں نے اپنی عمر کے تیرہ سال گنوا دیے تھے۔ بہت سے لاشعوری محرکات کو آدمی اس وقت تک بے معنی سمجھتا رہتا ہے جب تک اس کی وجہ شعور میں نہ آ جائے۔ ممکن ہے میرے لاشعور میں کہیں یہ بات موجود ہو کہ اسی اہرام کے راستے مجھے پروفیسر کی زیر زمین تجربہ گاہ میں لے جایا گیا تھا۔

اپنے بارے میں سب کچھ جان لینے کے باوجود ابھی میری جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی میرے دشمن بھی زندہ تھے اور میں بھی! ابھی تو میں نے انھیں صرف ایک محاذ پر شکست دی تھی۔ دوسرا بڑا محاذ ابھی کھلا ہوا تھا۔ یہ جنگ سکون و اطمینان سے لڑنے کے لیے ضروری تھا کہ میری ماں میرے ساتھ نہ ہوتی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ وہ جہاں بھی رہتی اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

اپنے وجود کے اسرار کھلنے کے بعد اب مجھ میں پہلے سے کہیں زیادہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب میرے ذہن میں کوئی ہیجان، کوئی سوال نہ تھا۔ میں اب یکسوئی کے ساتھ اپنے دشمنوں سے آخری جنگ لڑنے کو پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار جب اپنی ماں سے کیا تو وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ ”ادریس، میرے بچے! یہ... یہ کس طرح ممکن

ہے کہ میں... میں تجھے بھیڑیوں کے غول میں اکیلا چھوڑ دوں؟“

”مصلحت کا یہی تقاضا ہے ماں!“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”تم اگر میرے ساتھ رہیں تو میں شاید انھیں زیر نہیں کر سکوں گا۔ میری توجہ بٹ جائے گی ماں! اور وہ، میرے دشمن اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ میں نے ایک عمر کی تلاش کے بعد تمھیں پایا ہے، اگر... اگر خدانخواستہ دوبارہ کھو دیا تو... تو ایک تباہی پھیل جائے گی۔“ میری آواز تیز ہوتی چلی گئی۔ ”میں نے اب تک بہت صبر کیا ہے۔ پھر... پھر مجھ سے صبر نہ ہو سکے گا... اور... اور پھر بڑی ہلاکت ہو گی۔ جانے کتنے بے گناہ لوگ مارے جائیں... پھر جانے کیا ہو ماں! میں... میں اس وقت سے ڈرتا ہوں جب... جب میرے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھیں۔ اگر... اگر خدا نہ کرے یہ شعلے بھڑک اٹھے تو بڑے بڑے ایوان ان شعلوں کی زد میں آ جائیں گے۔ پھر... پھر...“

”نہیں میرے بچے، اپنی انسانیت کو زندہ رکھ۔ اُسی طرح زندہ سلامت جس طرح اب تک تو نے اسے زندہ رکھا ہے۔ انتقام پر تو سبھی آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن درگزر اور معافی کا درجہ بہت افضل ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ جو تجھے ہلاکت کی طرف کھینچ رہے ہیں اور وہ جو اصل مجرم ہیں، انسان اور انسانیت کے مجرم، تو انھیں بھی معاف کر دے۔ نہیں، جو تجھے ہلاکت میں مبتلا کرنا چاہے، اُسے ہرگز نہ بخش، مگر صرف یہ کہ حد سے نہ گزر! انتقام پر آمادہ نہ ہو۔“ وہ مجھے سمجھاتی رہی۔

میرا غصہ اور جوش قدرے کم ہوا تو میں نے کہا۔ ”تو پھر میری بات مان لو گی ماں!“

وہ میری بات سن کر دیر تک کسی سوچ میں کھوئی رہی، پھر ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔ ”اگر تیری یہی ضد ہے تو... تو پھر مجھے مصر بھیج دے۔ وہاں... وہاں شاید میں سکون سے تو نہ رہ سکوں مگر... مگر اپنے در و بام ہوں گے تو کم از کم میں خود کو محفوظ سمجھ سکوں گی۔“

بالآخر وہ مان ہی گئی۔ اسے شاید میری مجبوریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک ہی دن میں اس کا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ جو تصویر پاسپورٹ پر لگی تھی، وہی میک اپ اس کے چہرے پر تھا۔ دشمنوں کی طرف سے محفوظ رہنے اور ہندوستان سے نکلنے کے لیے اس کے چہرے میں تبدیلی بہت ضروری تھی۔ دیگر قانونی کارروائیاں پوری کرنے اور ضروری تیاریوں میں ایک دن اور گزر گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر تو میک اپ کر دیا تھا، مگر مصلحتاً اپنے چہرے کو بدلنا ضروری نہیں سمجھا۔ میری ماں ایک ہندوستانی عورت کی حیثیت سے مصر جانے والی تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ مصر پہنچ کر میک اپ ختم نہ کرے اور گھر سے باہر نکلنے میں بھی احتیاط برتے۔ میرا گھر قاہرہ کے اُسی علاقے میں تھا جہاں خود میں کئی بار جا چکا تھا۔ یہ گندن کا علاقہ تھا۔ میں نے اپنے گھر کا پتا ذہن نشین کر لیا۔

دوسرے دن رات کو میری ماں جب ائیر انڈیا کی ایک پرواز سے قاہرہ روانہ ہو گئی تو مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ اب میں ہر خطرے سے نمٹنے کو تیار تھا۔ ہر چند کہ میرے پاس کنو ٹولہ میں بھی قیام کے لیے ایک کمرہ موجود تھا، مگر وہاں میری شخصیت مختلف تھی۔ میں نے ہوٹل ہی میں قیام کو ترجیح دی۔ میرے نزدیک اب کوئی اور شخصیت اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اسی رات میں نے ڈم ڈم ایئرپورٹ سے واپس آ کر حالات کا از سر نو جائزہ لیا۔ چند ہی دن میں حالات بہت تیزی سے بدل گئے تھے۔ اب میں تاریکی میں نہیں تھا۔ مجھے ہر بات معلوم تھی اور یہ بھی کہ میرا اصل دشمن کہاں ہے؟ وہ جس نے مجھ پر تجربات کر کے انسانیت کی تباہی کا سامان کیا تھا اور وہ خود مجھے اپنی تخلیق کہتا تھا۔ وہی سر پھرا شخص، وہی خود سر سائنس داں تو میرا اصل دشمن تھا۔ اسی کے اشارے پر تو دنیا کے خطرناک ایجنٹ ہر جگہ پہنچ جاتے تھے۔ وہی تو میری نشان دہی کرتا تھا کہ میں کس ملک کے کس شہر میں ہوں! اگر کسی طرح اُسے ختم کر دیا جاتا تو اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنا میرے لیے مشکل نہ ہوتا۔

کیا میں پروفیسر کو ختم کر سکتا ہوں؟ یہی ایک سوال مسلسل میرے ذہن پر ضربیں لگاتا رہا۔ چینی ایجنٹ لوئی جو نے مجھے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، میں

اُس پر غور کرتا رہا۔ اگر مجھے لوئی چو دہلی ہوتی اور اُسے مجھ پر فتح پا لینے کا مکمل یقین نہ ہوتا تو شاید میں ابھی تک اندھیرے میں بھٹک رہا ہوتا۔ میں نے سوچا کہ ایک شخص کی ہلاکت سے انسانیت کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے۔ کیا خبر وہ مرتے مرتے کوئی اور خوفناک ایجاد کر جائے جو کرۂ ارض پر بسنے والے اربوں انسانوں کی زندگی کو خطرے میں ڈال دے۔ اُس سر پھرے سے کچھ بعید نہیں تھا۔ دنیا سے اپنی برتری تسلیم کرانے کے لیے وہ میرے نزدیک جنون کی حد میں داخل ہو گیا تھا۔ اُس کا خاتمہ یقیناً انسانیت کے مفاد میں ہوتا۔ اس کا چہرہ اب تک مجھے یاد تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کسی یورپی ملک کا باشندہ تھا۔ جانے کب، کیوں اور کیسے وہ مصر میں ایک زیرِ زمین تجربہ گاہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یقیناً مصری حکومت اُس کی سرگرمیوں سے بے خبر ہو گی ورنہ شاید اُسے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنا پڑتی یا پھر اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے کوئی اور ڈھب ڈھونڈنا پڑتا۔

لوئی چو نے مجھے بتایا تھا کہ پروفیسر کے حفاظتی حصار کو توڑنا تقریباً ناممکن ہے، اور وہی کیا کوئی بھی ایسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی یہ کوشش کرے گا تو نادیدہ شعاعیں اُسے جلا کر راکھ کر دیں گی۔ مجھے لوئی چو کی بات پر یقین تھا مگر اس کے باوجود میں نے آگ سے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے سوا کوئی اور راہ بھی تو نہیں تھی۔

"مجھے ہر حال میں انسانوں کے اس سب سے بڑے دشمن کو ختم کرنا ہے!" میں فیصلہ کن انداز میں بے ساختہ بول اٹھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ میں اس کوشش میں مارا جاتا، لیکن میری موت بھی پروفیسر کی شکست ہوتی۔ پھر کسی اور ادریس المہندس کو ابوالہول بنانے میں اسے برسوں لگتے، اور وہ خود واقف تھا کہ اُس کی زندگی میں یہ خواب پورا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اُس نے ایک بار مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے خود ہی بتایا تھا کہ وہ عمر کی اس منزل میں ہے کہ اب دوبارہ کوئی ابوالہول تخلیق نہیں کر سکتا۔ اب زیادہ دیر وہ اُس کی زندگی کا تعین کرے گی۔ اُس نے مجھے اپنی زندگی بھر کی کمائی کہا تھا۔ وہ اس زعم میں تھا کہ مجھے تخلیق کرنے کے باوجود خود وقت کے سامنے بے بس تھا۔ خالق اور مخلوق میں سے کسی ایک کو زندہ رہنا تھا۔ میں زندہ رہتا یا پھر وہ!

اس آخری جنگ کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے اپنے والد اور بھائی کے بارے میں بھی سوچا۔ میں اگر مارا جاتا تو پھر جانے اُن پر کیا گزرتی۔ انھیں یقیناً انتقامی کارروائی کے طور پر قتل کر دیا جاتا کیوں کہ وہ بہر حال دشمنوں کی قید میں تھے۔ آخری معرکے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں انھیں دشمنوں کی قید سے نکال لیتا۔ میں نے اپنی ماں سے بھی یہی وعدہ کیا تھا۔ لہو کا یہ قرض چکائے بغیر مجھے یہ کچھ زیب نہ دیتا کہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیتا۔ اگر میرے والد اور بھائی کو قتل کر دیا جاتا تو پھر شاید میری ماں بھی زندہ نہ رہتی۔ میرا سارا گھر اجڑ جاتا۔ جب تک مجھے اپنے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، اپنی ماں کے سینے سے لگ کر رویا نہ تھا، رشتوں کی پہچان نہ ہوئی تھی، جو ہو جاتا اُس پر صبر کر لیتا یا پھر انتقام پر اتر آتا، لیکن اب میرے اندر غیر محسوس طور پر ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ میرے سوچنے کا انداز کسی قدر بدل گیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں، میں نے یہ طے کیا کہ پہلے اپنے لہو کا قرض چکاؤں گا، پھر پروفیسر سے نمٹوں گا۔

پروفیسر کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق امریکہ بقیہ دو بڑی طاقتوں سے میرے والد اور بھائی کا سودا کر رہا تھا۔ یہ سودا میرے خیال میں ہو چکا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو چینی ایجنٹ لوئی چو کو بیجنگ واپسی کے احکام نہ ملتے۔ اس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ اب میرے والد اور بھائی کو امریکہ نے یرغمال بنا لیا ہے۔ چین اور روس اس معاملے سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ گویا اب میرے مقابل صرف ایک دشمن تھا۔ امریکہ نے میرے حصول یا میری موت کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

میں نے اب تک دنیا کی کسی بڑی طاقت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ میں جب چاہتا تباہی اور بربادی

پھیلا دیتا۔ اب تک وہی مجھے دھمکیاں دیتے آئے تھے۔ شاید پروفیسر نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ میں کوئی جوابی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ پروفیسر کی اس یقین دہانی کا اصلی ثبوت میں نے فراہم کر دیا تھا۔ میں نے صرف انھی گنتی کے چند ایجنٹوں کو اپنے راستے سے ہٹایا جنھوں نے مجھے سکون کا سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔ میں ایک ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بھاگتا رہا اور وہ میرا تعاقب کرتے رہے۔ وہ خود اپنی ہلاکت کے ذمہ دار تھے۔ جب وہ میرے والدین اور بھائی کو یرغمال بنا کر مجھ پر دباؤ ڈال سکتے ہیں تو کیا میں انھیں جھکنے پر مجبور نہیں کر سکتا؟ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال نے مجھ پر امکانات کے نئے دروازے کھول دیے۔ مجھے اپنی ماں کی نصیحت یاد آئی، "جو تجھے ہلاکت میں مبتلا کرنا چاہے، اُسے ہرگز نہ بخش، مگر صرف یہ کہ حد سے نہ گزر!"

حد سے گزرنا میرے خیال میں یہی ہے کہ آدمی کا ضمیر خود اس پر ملامت کرنے لگے۔ میں بہرحال یہ منزل نہ آنے دیتا، مگر اپنے دشمنوں کو بھی اب کسی طور بخشنے پر آمادہ نہ تھا۔ انھوں نے ابھی تک تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھا تھا، میری قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا، مگر اب وہ بہت جلد تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھنے والے تھے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد مجھے اب اپنے دشمنوں سے بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سو میں نے فی الحال کلکتے ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود بھی یا تو اس شہر میں پہنچ کر مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے یا جلد ہی یہاں پہنچنے والے تھے۔ دونوں ہی صورتوں میں مجھے یہیں رہنا تھا تاکہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوں اور اُن کے عزائم کھل کر سامنے آ جائیں۔ میں انھی کے ذریعے اُن کی حکومت کو اپنے آئندہ اقدام سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ خود ان میں کتنی قوتِ برداشت ہے! اگر انھیں کوئی دھمکی دی جائے تو اُن پر کیا گزرتی ہے! مجھے یقین تھا کہ امریکی ایجنٹوں میں کوئی لوئی چو جیسی ایجنٹ نہیں ہو گی۔ وہ اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر اپنے بہترین ایجنٹوں کو میرے ہاتھوں قتل کرا چکے تھے۔ اگر پروفیسر نے لوئی چو کی طرح کسی اور ملک کے ایجنٹ کو بھی تربیت دی ہوتی تو لوئی چو جو برسوں پروفیسر کے پاس رہی تھی، اسے یہ علم ضرور ہوتا۔ ان حالات میں تو بس یہی ہوتا... کہ وہ بزدلوں کی طرح مجھ سے چھپتے پھرتے اور بے خبری میں مجھ پر پیچھے سے حملے کی کوشش کرتے۔ جیری ناٹ ایسے ذہین اور عیار امریکی ایجنٹ کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ سامنے آ کر مقابلہ کرتا۔ اب تک میں تین ایجنٹوں سے نبرد آزما ہوا۔ ان میں بیلیا اور لوئی چو سب سے زیادہ خطرناک تھیں۔ کسی امریکی ایجنٹ سے میں نے کبھی اتنا خطرہ محسوس نہیں کیا۔ وہ دونوں ہی اب اس دنیا میں نہیں تھیں۔ میں انھی دونوں کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔ مستقبل کے لیے ایک واضح لائحہ عمل مرتب کر کے میرا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی دن صبح سے میں نے تمام احتیاطی تدابیر پر عمل شروع کر دیا۔ نیو مارکیٹ جا کر میں خورد و نوش کی کچھ ایسی چیزیں لے آیا کہ وقتی طور پر گزارا ہو سکے۔ ان میں کچھ مشروب تھے، پھل تھے اور دیگر ایسی اشیا جو زیادہ دن رکھنے سے خراب نہ ہوں۔ انھی چیزوں کے ساتھ غیر ملکی شراب کے دو کریٹ بھی خرید لایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مجھے ہوٹل سے کوئی بھی کھانے پینے کی چیز منگانی نہ پڑے۔ اب تک کے تجربات کی روشنی میں یہ احتیاط بہت ضروری تھی۔ اس طرح کم از کم ایک خطرے کا سدِباب ہو گیا۔ مختلف ایجنٹ مجھ پر قابو پانے کے لیے پہلے بھی یہ داؤ آزما چکے تھے۔ بغداد کے دورانِ قیام میں بھی ایک بار مجھے یہی تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے شراب میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔

لوئی چو نے مجھے جس عمارت میں قید کیا تھا، وہاں سے دیگر کام کی چیزوں کے علاوہ مجھے ایک مخصوص قسم کا لباس بھی ملا تھا۔ یہ لباس مختلف ٹکڑوں کی شکل میں تھا جنھیں آسانی کے ساتھ جوڑا جا سکے۔ چھوٹے بڑے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر اس کے طول و عرض کو گھٹایا اور بڑھایا جا سکتا تھا۔ ان ٹکڑوں میں جگہ جگہ بٹن لگے ہوئے تھے تاکہ انھیں جوڑا جا سکے۔ میں نے اس لباس کا تجزیہ کیا تو بلٹ پروف ہونے کے

علاوہ اس میں اور خصوصیات بھی پائیں۔ ٹکڑوں میں ہونے کا سبب بھی واضح تھا کہ مختلف قد و قامت اور جسامت کے لوگ اسے استعمال کر سکیں۔ اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو میں نے جلا کر بھی دیکھا، مگر وہ نہ جلا۔ کپڑے سے ملتے جلتے وہ ٹکڑے بہت ہلکے پھلکے تھے۔ میں نے انھیں الگ الگ کر کے دوبارہ جوڑ لیا۔ اب اُس کا طول و عرض پہلے سے کم ہو گیا۔ میں نے لباس پہنا تو وہ ڈھیلا تھا۔ ذرا سی کوشش اور رد و بدل کے بعد اسے میں نے اپنے جسم کے مطابق بنا لیا۔ اس کے اوپر دوسرا لباس پہننے سے کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ اب میں جب بھی کمرے سے باہر نکلتا وہ لباس میرے جسم پر ہوتا۔ اس کے علاوہ میرے کوٹ کی مختلف جیبوں میں مختلف قسم کا اسلحہ اور ہتھیار بھی ہوتے۔ ان میں وہ خطرناک ہتھیار بھی تھا جس کی نالی سے بنفشی شعاعیں نکلتی تھیں۔

میں اب ہر وقت مسلح اور چوکنا رہتا کہ کسی بھی صورت حال سے نمٹ سکوں۔ مجھے اپنے دشمنوں کا انتظار تھا۔ وہ دشمن جو میرے نزدیک بہت خطرناک تھے۔ انھیں میری حیرت انگیز قوتوں کا علم تھا۔ میں نے اسی لیے صرف ان قوتوں پر بھروسا نہ کیا۔ وہ اگر کسی طرح ان کا توڑ تلاش بھی کر لیتے تو میرے دوسرے حربوں سے نہ بچ پاتے۔

جب مجھے اپنے دشمنوں کا انتظار کرتے کرتے پورا ایک ہفتہ گزر گیا تو بیزاری ہونے لگی۔ وقت گزاری کے لیے کلکتے سے شائع ہونے والے مختلف اخبارات و رسائل کا مطالعہ میرے معمول میں شامل ہو گیا تھا۔ کافی وقت اس میں گزر جاتا، مگر پھر بھی مجھے ہوٹل سے نکلنا پڑتا۔ میں بیزار ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہاں مزید وقت ضائع کروں یا نہ کروں؟ ابھی میں کسی فیصلے تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک دن مختلف اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہونے والی ایک خبر نے میرے جسم میں برقی رو سی گزار دی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میرے دشمن اس طرح معرکہ آرائی کا آغاز کریں گے۔ اس خبر کے ساتھ ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ تصویر میں ایک شخص کسی سات آٹھ سالہ بچے کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس چوڑی پیشانی والے شخص کے دونوں ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بچے کے چہرے پر بھولپن تھا۔ وہ تصویر دیکھ کر میرے احساس پر ایک ضرب سی لگی۔ میں نے بچے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا اور پھر میری پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ تصویر میں نظر آنے والے شخص کو میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ میرے والد تھے۔ پروفیسر نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے جو فلم مجھے دکھائی تھی، اس میں واضح طور پر میں نے اُن کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ فلم اس وقت کی تھی جب وہ چینیوں کی قید میں تھے اور ان پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی ایک تصویر میں نے تبت میں دیکھی تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جس میں میری والدہ اور خود میں بھی تھا۔ یہ تصویر یاما کے پاس تھی۔ مجھے اسی لیے اپنے والد کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اُن کے ساتھ نظر آنے والا بچہ ظاہر ہے کہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کا چہرہ مجھ سے بہت مماثل تھا۔

میرے والد چینیوں کی قید میں تھے اور بھائی کو روسیوں نے یرغمال بنا رکھا تھا۔ ان دونوں کی یکجائی سے میں نے قطعی درست نتیجہ اخذ کیا۔ امریکہ یقیناً چین اور روس سے سودے بازی کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس خبر اور تصویر کی اشاعت کا مقصد صرف مجھے اس واقعے سے مطلع کرنا تھا۔ وہ تصویر اس بات کا کھلا ثبوت تھی کہ میرے والد اور بھائی کو اب امریکیوں نے یرغمال بنا لیا ہے۔ مجھے اس بات کا یقین دلانے کے لیے انھوں نے بے حد عیاری کا ثبوت دیا تھا۔

اُس ڈبل کالمی خبر کی سرخی یہ تھی: ”سونے کی اسمگلنگ ناکام بنا دی گئی مگر مجرم باپ بیٹے کو ان کے ساتھی چھڑا کر لے گئے“۔ ذیلی سرخی کے مطابق پولیس سرگرمی سے مجرم کی تلاش میں تھی۔

خبر کی تفصیلات یہ تھیں کہ گزشتہ روز ڈم ڈم ایئرپورٹ پر کسٹم کے عملے نے واشنگٹن سے وہاں پہنچنے والے ایک مسافر سے ہاتھوں پر بندھی ہوئی پٹیاں کھولنے کو کہا۔ مسافر نے انکار کیا جس پر زبردستی پٹیاں کھول دی گئیں۔ پٹیاں کھولے جانے سے پہلے اس غیر ملکی مسافر نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ شدید زخمی ہیں، پٹیاں نہ کھولی جائیں۔ مسافر کا یہ بیان تو درست ثابت ہوا، مگر زخموں کی تہ میں سونے کی تیریاں بھی ملیں جن کا مجموعی وزن پچاس

تولے تھا۔ غیر ملکی مسافر کے ساتھ جو بچہ تھا، اُس کے جوتوں کے سول میں اتنا ہی سونا پایا گیا۔ وہ غیر ملکی شخص مصری تھا مگر کاغذات کے مطابق اس نے امریکی شہریت اختیار کر لی تھی۔ تفتیش کرنے پر پاسپورٹ اور بقیہ کاغذات بھی جعلی ثابت ہوئے۔ اس شخص اور بچے کو فوری طور پر حراست میں لے لیا گیا۔ موقع پر موجود کچھ اخباری نمائندوں نے اس شخص اور بچے کی تصویریں کھینچ لیں، مگر پولیس نے اخباری نمائندوں کو اس شخص کا بیان لینے کی اجازت نہیں دی۔ جب اس غیر ملکی مسافر اور بچے کو ڈم ڈم ایئرپورٹ سے پولیس ہیڈ آفس لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں کچھ نامعلوم افراد نے پولیس جیپ کو گھیر لیا۔ حملہ آور مسلح تھے۔ انھوں نے جیپ کے پچھلے دونوں ٹائروں پر فائر کر کے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اس ہنگامے کی وجہ سے ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہیوں کو معمولی سی چوٹیں بھی آئیں۔ پولیس جیپ پر حملہ کرنے والے دو کاروں میں سوار تھے اور انھوں نے دونوں طرف سے جیپ کو گھیر لیا تھا۔ حملہ آور پولیس والوں کو زخمی اور بے ہوش کرنے کے بعد مجرم باپ بیٹے کو چھڑا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کا بیان ہے کہ بین الاقوامی اسمگلروں کا کوئی گروہ ہے جو سونا اسمگل کر رہا ہے۔ پولیس پوری سرگرمی کے ساتھ مجرموں کی تلاش میں ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی مجرموں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔

امریکی ایجنٹوں نے یہ سوانگ رچانے اور اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سو تولے سونا ضائع کیا تھا۔ اُن کے لیے بہرحال یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

میرے والد اور بھائی کو امریکہ سے وہاں لے آنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے میری بے بسی اور اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتے ہوں۔ میں نے اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کیا اور پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ اُن سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے تلاش کر چکے ہوں۔ دوسرے ہی دن میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ صبح ہی صبح فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ وہ شاید آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا: ”تم نے کل کے اخبارات دیکھ لیے ابوالہول؟“

”ہاں کیوں؟“ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ یہ کہنا فضول ہوتا کہ میں ابوالہول نہیں ہوں۔

”تو پھر کیا خیال ہے؟“ اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”کس سلسلے میں؟“ میں دانستہ انجان بن گیا۔

”سودا کرنے پر راضی ہو؟“ اس نے وضاحت کی۔

”مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ میرے والد ہیں! کسی بھی شخص کے چہرے پر میک اَپ کر کے تم لوگ مجھے دھوکا دے سکتے ہو!“

”اور اپنے بھائی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ اُس کی آواز میں چبھن تھی۔

”میں نے اُس کی کوئی تصویر نہیں دیکھی، پھر کیسے یقین کر سکتا ہوں کہ وہ میرا بھائی ہے؟“

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ یقیناً میرے غیر متوقع اطمینان سے وہ امریکی ایجنٹ کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ ذرا توقف سے اس کی آواز پھر سنائی دی: ”سنو، اگر تمھیں یقین دلا دیا جائے کہ وہ تمھارا ہی باپ ہے اور وہ بچہ تمھارا بھائی ہے تو پھر کیا تم سودا کر لو گے؟“

”ممکن ہے اس کے بعد میں تمھاری پیشکش پر غور کر سکوں۔“

”ہاں تمھیں یہ اطلاع اور دینا تھی۔ بہت جلد ہم اُس جگہ تک بھی پہنچ جائیں گے جہاں تم نے اپنی ماں کو رکھا ہے۔“ اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ محض دھمکی ہے اور اسے میری ماں کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میری ماں ابھی کلکتے ہی میں ہے۔

”تم اُس ہوٹل کا سراغ نہیں لگا سکتے؟“ میں نے اُسے غلط راہ پر ڈالنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ لگانا چاہا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔

وہ میری بات سن کر ہنسا، پھر بولا: ”تو میرا خیال درست ہی نکلا، تم نے خود اس کی تصدیق کر دی ہے ابوالہول؟“

"لیکن۔۔۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ میں۔۔۔ میں اُسے وہیں رکھوں۔ تم لوگ جب تک اُس ہوٹل کا سراغ لگاؤ گے میں۔۔۔ میں اُسے وہاں سے کہیں اور منتقل کر دوں گا۔"
میں نے جان بوجھ کر یہ ظاہر کیا جیسے بوکھلا گیا ہوں۔

"تمہیں یقیناً یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔ میرے متعلق تو یہ مشہور ہے کہ میں زمین میں دفن شدہ مُردوں تک کا سراغ لگا سکتا ہوں۔ اس کا پہلا ثبوت تو یہی ہے کہ میں نے تمہیں تلاش کر لیا۔ تمہاری ماں کو اس شہر میں ڈھونڈ نکالنا میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تمہیں خود ہی اس کا ثبوت مل جائے گا۔"
اُس نے مجھ پر رعب ڈالنے کے لیے بڑ ماری۔ اُس احمق کو شاید صحیح طرح اندازہ نہ تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ وہ کوئی بدخود غلط قسم کا شخص معلوم ہوتا تھا۔ ایسے لوگ عموماً زیادہ ذہین نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ اگر میں نے واقعی اپنی ماں کو کسی ہوٹل میں رکھا ہوتا تو اُسے ہرگز یہ بات نہ بتاتا۔ میں اُس سے جو گفتگو کر رہا تھا اُس سے بہ یک وقت کئی فائدے اٹھانا مقصود تھے۔

"تو پھر تم کب تک مجھے یقین دلا دو گے کہ میرے والد تمہاری قید میں ہیں؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

"کل صبح میں اسی وقت تمہیں دوبارہ فون کر کے تمہارے سوال کا جواب دے دوں گا۔" اُس نے کہا، پھر ہنس کر بولا "میں نے اب تک تمہارے بارے میں جو باتیں سُنی ہیں یا مجھے بتائی گئی ہیں، تم سے گفتگو کر کے اندازہ ہوا کہ وہ درست ہی ہیں۔ معلوم نہیں تم اب تک کس طرح بچے رہے اور میرے پچھلے ساتھی تمہیں جھکنے پر کیوں نہ مجبور کر سکے!" یہ کہہ کر اُس نے ہنستے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ جو بولا، یقیناً مرنے میں عجلت سے کام لے رہا تھا اور یہ بات میرے حق میں تھی۔ میری پہلی ہی کوشش میں وہ زیرِ دام آگیا تھا۔ میں نے اُس سے جو گفتگو کی تھی، اُس کے نتیجے میں وہ فوراً ہی سامنے آجاتا۔ اُسے یقین آگیا تھا کہ میری ماں اسی شہر کے کسی ہوٹل میں ہے۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ سراغ لگائے جانے سے پہلے ہی اپنی ماں کو کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ ایسی صورت میں وہ ہر ہوٹل کی خاک چھاننے پر میرے تعاقب کو ترجیح دیتا کیونکہ ایسے بڑے شہر کے ہر چھوٹے بڑے ہوٹل میں میری ماں کی تلاش بہرحال آسان کام نہیں تھی۔

ہلیوں لیس ہو کر ہوٹل سے نکلنے میں مجھے صرف گھنٹا بھر لگا۔ میں ہوٹل سے نکل کر پیدل ہی دھرم تلہ کے چوراہے کی طرف بڑھنے لگا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے تعاقب میں آنے والے کا سراغ لگا سکوں۔ کچھ دور چل کر میں سیدھا جانے کی بجائے اس سڑک پر مڑ گیا جو لائٹ ہاؤس سینما کے سامنے سے گزرتی ہوئی نیو مارکیٹ کی طرف جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے تعاقب کرنے والے کی تلاش میں اپنے خیال کی لہروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ مجھے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلنے والے افراد میں سے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جس کے ذہن میں میرا خیال ہو۔ میرے خیال کی لہریں مختلف ذہنوں سے ٹکراتی رہیں۔ کسی ذہن نے مزاحمت نہیں کی، مگر کچھ ہی دیر کی جستجو کے بعد صورت حال بدل گئی۔ میرے پیچھے آنے والوں میں سے یقیناً ایک شخص ایسا تھا جس کے ذہن نے بھرپور مزاحمت کا ثبوت دے کر مجھے اپنا ذہن نہیں پڑھنے دیا تھا۔

میں تیزی سے پلٹا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ شخص زیادہ دور نہیں تھا۔ پلٹتے ہی میں نے ایک دھوتی بند شخص کو مڑ کر تیز تیز قدم اٹھا کر جاتے دیکھا۔ اُس نے یہ ظاہر کیا تھا جیسے چلتے چلتے اُسے کوئی بات یاد آگئی ہو اور واپسی کا سفر شروع کر دیا ہو۔ چہرے سے مجھے وہ کوئی مارواڑی معلوم ہوا، لیکن وہ آنکھیں جو باطن میں جھانکنے کی اہل ہوں، ظاہر پر کب توجہ دیتی ہیں۔ کسی ماہر ایجنٹ کے لیے ایک مارواڑی کا بہروپ بھرنا کون سا مشکل کام تھا۔ میں نے یہ تصدیق کرنے کی خاطر کہ میرا شکار وہی ہے، ایک بار پھر اُس کے ذہن کو ٹٹولنا چاہا۔ اگر وہی مطلوبہ شخص تھا تو پھر دوبارہ بھی اس کا ذہن مزاحمت کرتا اور یہی ہوا۔ اس نے یقیناً یہ بات محسوس کر لی تھی کہ میں اُس کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ اسی لیے تیز چلتے چلتے ایک دم دوڑنے لگا۔ لوگ اُسے اس طرح دوڑتے دیکھ کر رک گئے۔ پھر میں نے دیر نہیں کی اور اُس کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟" لوگ مجھے اُس کی طرف لپکتے دیکھ

کر چیخنے لگے، مگر میں نے اُن کی پروا نہ کی۔

اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کافی تھا اور بہت سے لوگ بھی درمیان میں تھے۔ اس کا رُخ لبِ سڑک کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف تھا۔ وہ شاید کار میں بیٹھ کر فرار ہونے کے چکر میں تھا۔ میں اُس کا مقصد سمجھ گیا اور براہِ راست اُس کی طرف دوڑنے کی بجائے کار کی جانب دوڑا۔ دن کے وقت بھرے بازار میں اس طرح دو آدمیوں کو آگے پیچھے دوڑتے دیکھ کر لوگ جانے کیا سمجھے اور چیخنے لگے۔ اسی چیخ پکار نے ٹریفک پولیس کے ایک سارجنٹ اور دو سپاہیوں کو اس طرف متوجہ کر دیا۔ لوگوں کی چیخ پکار اور ہنگامے کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی، اس کے باوجود ذرا سی دیر میں بھگدڑ سی مچ گئی۔

ممکن ہے کہ اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل جاتا، مگر میں نے اُسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ اِدھر اُس نے کار میں بیٹھ کر اُسے اسٹارٹ کیا، اُدھر میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے بالکل قریب آتے دیکھ کر کھڑکی سے ہاتھ نکالا اور گیند کے برابر کوئی چیز میری طرف اچھال دی۔ میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا اور دھواں پھیل گیا۔ دھواں پھیلنے کے باوجود میں نے اندازے سے کار کی طرف چھلانگ لگائی۔ کار کے انجن کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ میں کار کے بونٹ پر گرا۔ کار اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ میں گرتے ہی سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے میرے جسمانی توازن کو بگاڑنے کے لیے اچانک دونوں بریک لگا دیے۔ میں اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش میں منہ کے بل ونڈ اسکرین کی طرف گرا اور میرا سر شیشے سے ٹکرا گیا۔ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ وہ شیشہ ٹوٹنے کی پروا کیے بغیر کار کو پوری رفتار سے دوڑانے لگا۔ اب وہ ذیلی سڑک سے نکل کر دھرم تلہ کی مرکزی شاہراہ پر آگیا تھا اور تیز رفتاری کے ساتھ ٹالی گنج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اب کار کے بونٹ سے پھسل کر دائیں جانب کے اگلے دروازے کی کھڑکی سے لٹکا ہوا تھا۔ میرے جسم کا سارا وزن میرے دونوں ہاتھوں پر تھا۔ اپنے جسم کو سڑک پر گھسٹنے سے بچانے کے لیے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اپنے جسم کا بوجھ ایک ہاتھ پر ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے کار کا دروازہ کھول لیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کار سڑک پر لہرا گئی۔ مجھے وہ خوفزدہ نظر آیا۔ اچانک اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور پھر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ کار سڑک سے اُتر کر ایک درخت کی طرف بڑھی اور میں نے بھی اُسی وقت اُس کا دروازہ چھوڑ دیا۔ اور اپنے چہرے اور سر کو دونوں ہاتھوں کے درمیان چھپائے ہوئے میں نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ اُسی وقت پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ ایک دھماکا، کار کے درخت سے ٹکرانے کا تھا اور بقیہ دھماکے میری طرف پھینکے جانے والے دھوئیں کے بموں کے تھے۔ وہ اپنے اور میرے درمیان ایک بار پھر دھوئیں کی دیوار کھڑی کر کے نکل جانا چاہتا تھا۔

پھر میں جب تک اٹھ کر دھوئیں کے حصار سے نکلا وہ کافی دور جا چکا تھا۔ میں نے اُسے سڑک عبور کر کے دوسری جانب درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا۔

دھرم تلہ گراؤنڈ میں، وسیع سبزہ زاروں کے درمیان کافی بڑے رقبے میں درختوں کے جھنڈ ہیں۔ میری نگاہوں سے اوجھل ہونے کے لیے اس نے انہی درختوں کی آڑ لی تھی۔ میں اُسے بھلا کس طرح بچ کر نکل جانے دیتا۔ زقندیں بھرتا ہوا میں بہت جلد درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ دن کے وقت بھی لوگ عموماً اِدھر کا رُخ نہیں کرتے۔ میں نے اُس پر اپنے طاقتور خیال کی لہروں کا جال پھینکا اور مجھے فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔ میں اُدھر ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے ایک جانب بھاگتا ہوا نظر آگیا۔

"تم اپنی موت سے نہیں بھاگ سکتے، رک جاؤ۔" میں نے بھاگتے ہوئے چیخ کر کہا۔

اُس نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور گھبراہٹ میں ایک درخت سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔ گرتے گرتے بھی اس نے جانے کیسے ریوالور سے ملتی جلتی کوئی شے کرتے کی جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ میں اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ وہ زمین پر چت پڑا تھا اور اُس شے کی لمبی سی نال میری

طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"پیچھے ہٹو ورنہ تم زندہ نہیں بچو گے!" وہ ہانپتے ہوئے غرایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے ہلاک نہیں کر سکتے!" میں نے کہا اور اسی کے ساتھ میرے دائیں پیر کی ٹھوکر اُس کی کلائی پر پڑی۔ وہ شے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری اور وہ چیخ کر دُہرا ہو گیا۔ یقیناً اُس کی کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے جھک کر اُس کا گریبان پکڑا اور اُسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اُس کے چہرے پر موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اُس کا گریبان ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔

"اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں کس طرح تم جیسے درندوں سے بچا رہا اور مجھے جھکنے پر کیوں مجبور نہیں کیا جا سکا!" یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کے گریبان کو جھٹکا دیا، پھر بولا "میں اس کے باوجود تمہاری جاں بخشی کر سکتا ہوں، شرط صرف ایک ہے! اور وہ شرط تمہیں خود بھی سمجھ لینی چاہیے۔ بولو! کچھ سمجھے!"

کراہتے ہوئے اُس نے میری طرف نگاہ اٹھائی، پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "مجھے تمہاری کوئی شرط منظور نہیں! تم.... تم اگر چاہو تو مجھے قتل کر سکتے ہو!"

"تم نے شاید میری رحم دلی کے افسانے بھی سنے ہوں گے!" میں نے "افسانے" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اُس نے آج ہی مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے میرے متعلق سُنی ہوئی باتوں کو افسانہ کہا تھا۔ تو یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ رحم دلی کی بھی میرے ذہن میں ایک حد مقرر ہے۔ اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ اگر تم میرے سوالوں کے جواب میں خاموش رہے تو میں پھر بھی تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا!" میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "بتاؤ میرے والد اور بھائی کو تم نے کہاں رکھا ہے؟"

"اوّل تو میں تمہارے سوال کا جواب دینے پر قطعی تیار نہیں، لیکن جواب دے بھی دوں تو تم وہاں تک نہیں پہنچ سکو گے!" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا!" اُس نے میرے سوال کا جواب دیا۔ وہ اب بھی رہ رہ کے کراہ رہا تھا۔ اب میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ میں نے اُس کا گریبان چھوڑ کر ٹوٹی ہوئی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ ذرا سا دباؤ پڑتے ہی اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ "بولو! جواب دو گے؟" میں نے کلائی پر مزید دباؤ ڈالا۔

اس کا جسم تکلیف کی شدت سے بل کھانے لگا۔ "نن... نن... نہیں!" وہ چیخ اٹھا اور پھر مزید دباؤ ڈالنے پر بیہوش ہو گیا۔

میں اُس کی جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا کہ مجھے ایک مخصوص آواز سنائی دی۔ بظاہر وہ ایک خوبصورت سا سگریٹ لائٹر تھا جس کے نچلے حصے میں باریک باریک سوراخ تھے۔ وہ مخصوص آواز اُسی میں سے آ رہی تھی۔ میں نے جلد ہی اُس کے اوپری حصے میں ایک باریک سا تار تلاش کر لیا اور پھر اُسے باہر کھینچ لیا۔ آواز اور واضح ہو گئی۔ "جیری کالنگ.... جیری کالنگ سر! اوور۔" یہ آواز اُسی لائٹر کے نچلے حصے کے سوراخوں سے آ رہی تھی۔

"یس، آئی ایم آن لائن اوور!" میں نے بیہوش ہو جانے والے امریکی ایجنٹ کی آواز میں جواب دیا۔ کسی بھی آواز کو صرف ایک بار سننے کے بعد اُس کی ہو بہو نقل اتارنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟ میں آپ کی ہدایت کے مطابق گرانڈ ہوٹل کے سامنے پہنچ چکا ہوں۔ اوور!"

"تم وہیں ٹھہرو۔ میں خود کچھ دیر میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ اوور اینڈ آل!"

اس شخص کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والے کا کوئی ماتحت ہے۔ میں نے اسی لیے ٹرانسمیٹر پر اُس سے بیہوش ہونے والے کی آواز میں گفتگو کی تھی کہ اُسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔

اب اُس امریکی ایجنٹ کا ذہن پڑھنا میرے لیے آسان تھا۔ بیہوش ہونے کے سبب اُس کا ذہن کوئی مزاحمت نہ کر پاتا۔ اُس کے ذہن کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اُسے زندہ چھوڑنا خطرناک سمجھا۔ میں نے اُس کے ذہن کو شدید جھٹکا دیا اور دوسرے ہی لمحے اُس کی ناک سے خون بہنے لگا اور

پھر اُس کا جسم ایک بار تڑپ کر ڈھیلا ہو گیا۔ پھر میں وہاں نہیں ٹھہرا۔ پیڑوں کے جھنڈ سے نکل کر سڑک تک پہنچتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔

"پھوا بازار چلو!" میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ اسی وقت مجھے امریکی ایجنٹ کے ماتحت جیری کا خیال بھی آیا، مگر اُس سے واپسی میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ وہ لائٹر اب میرے کوٹ کی جیب میں تھا جو درحقیقت ٹرانسمیٹر تھا۔ جیری اگر بیزار ہو کر دوبارہ رابطہ قائم کرتا تو میں اُس سے مزید وہیں رُکے رہنے کو کہہ دیتا۔

مجھے اتنی جلدی اپنی کامیابی کی امید نہیں تھی۔ بس اُس امریکی ایجنٹ کی حماقت سے مجھے یہ موقع مل گیا جو اپنی حماقت کی پاداش میں جان گنوا بیٹھا تھا۔ اُس کا ذہن پڑھ کر مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں، اُن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ میرے والد اور بھائی کو جلد از جلد واپس واشنگٹن بھیجا جانے والا تھا۔ اُن دونوں کو محض مجھے دھوکا دینے کے لیے ہندوستان لایا گیا تھا۔ اُن کی فوری واپسی یوں ممکن نہ ہوئی کہ معاملہ دب جائے کیونکہ پولیس اسمگلنگ کے معاملے میں اُنھیں تلاش کر رہی تھی۔ اُن کے دونوں زخمی ہاتھ میک اپ کیے جانے کے باوجود اُن کی شخصیت کو مشتبہ بنا دیتے۔ یہ ایسی واضح شناخت تھی جسے کسی طرح چھپانا ممکن نہیں تھا۔ امریکی ایجنٹوں کا مقصد اس ڈرامے سے یہ بھی تھا کہ میں غلط راہ پر پڑ جاؤں۔ میں یہی سمجھتا رہوں کہ میرا بھائی اور میرے والد ہندوستان ہی میں ہیں۔ نتیجے کے طور پر میں ہندوستان سے کسی اور ملک کا رُخ نہ کرتا۔ اس طرح وہ بار بار میری تلاش سے بچ جاتے۔

میرے ہاتھوں سے جو امریکی ایجنٹ مارا جا چکا تھا، وہ نصف درجن سے زیادہ ماتحتوں کو امریکہ سے اپنے ساتھ ہندوستان لے کر آیا تھا۔ اُس کا طریقہ کار دوسرے امریکی ایجنٹوں سے مختلف تھا۔ اُس کا نام ہاروے تھا۔

پھوا بازار میں جنرل پوسٹ آفس سے چند فرلانگ دور وہ عمارت تھی جہاں میرے والد اور بھائی کو رکھا گیا تھا۔ وہ عمارت پھلوں کے ایک آڑھتی سے منہ مانگے کرائے اور پگڑی پر حاصل کی گئی تھی۔ پھلوں کو ذخیرہ کرنے کے لیے

اُس میں ایک تہ خانہ بھی بنوایا گیا تھا۔ میرا بھائی اور والد اُسی تہ خانے میں تھے۔ پھوا بازار پہنچ کر مجھے وہ عمارت تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔

اُس عمارت میں حفاظت اور نگرانی کے لیے دو امریکی ایجنٹ تھے۔ اُن دونوں کے ذہن غیر معمولی ثابت نہ ہوئے۔ میں نے اُن کے ذہنوں کو پڑھ کر ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ اس کے لیے مجھے عمارت میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے انھی سے ایک کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اُس کا ذہن میری گرفت میں تھا۔ دروازہ کھول کر وہ ایک طرف ہٹ گیا اور میں نے اندر قدم رکھا۔ کسی قسم کا شور اور ہنگامہ میرے لیے مشکلات پیدا کر دیتا، مجھے اس کا احساس تھا۔ دونوں ایجنٹ میرے ذہن کے زیر اثر تھے اور اُن کے بقیہ ساتھیوں کی طرف سے مجھے فکر نہ تھی۔ اُن سب کا قیام گرانڈ ہوٹل میں تھا۔ انھیں اس عمارت میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ہاروے وہاں آتا تھا۔ ہاروے وہی تھا جس نے مجھ سے فون پر بات کی تھی اور پھر مجھے پھانسنے کے چکر میں خود پھنس گیا تھا۔ اُسے یقیناً آج صبح تک یہ خبر نہ ہو گی کہ اُس کی زندگی کا چراغ چند گھنٹے بعد گل ہونے والا ہے۔ ہاروے ہی اُن ایجنٹوں کا نگراں تھا۔ وہ اوسط ذہانت کا مالک تھا ورنہ اتنی عجلت سے کام نہ لیتا۔

تہ خانے میں اُترنے سے پہلے میں نے اُن دونوں ایجنٹوں کے ذہنوں کو جھٹکے دیے اور وہ بیہوش ہو گئے۔ یہ بیہوشی یا تو انھیں موت سے ہمکنار کر دیتی یا پھر وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھتے۔ تہ خانے کا راستہ ایک کمرے سے تھا۔ اُس کا دروازہ کافی بڑا اور مضبوط تھا۔ دروازے میں بھاری اور زنگ آلود سا تالا پڑا تھا۔ میں نے تالا توڑ کر دروازہ کھولا تو اندر بڑی بڑی اور چوڑی سیڑھیاں نظر آئیں۔ اندر سیلن،

بدلبو اور گھٹن سی تھی، اس کے علاوہ روشنی کا بھی مناسب بندوبست نہ تھا۔ نیچے پہنچ کر کسی کے کراہنے کی آواز سن کر میں چونکا اور نیم تاریکی میں اس طرف نگاہیں گاڑ دیں جدھر سے آواز آئی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر بائیں جانب ایک چبوترے پر میرے والد لیٹے ہوئے تھے اور میرا بھائی ان کے سرہانے کھڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اور کتنی دیر میں اپنے جذبات پر قابو پایا اور کیسے اپنے بھائی اور والد کو اس عمارت سے نکال کر باہر آ گیا۔ اُن دونوں کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی انھیں کچھ بھی یاد نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں! میں نے اپنے والد کو ایک چادر اُڑھا دی تھی تاکہ چادر کے اندر اُن کے دونوں ہاتھ چھپے رہیں۔ مجھے یاد تھا کہ کلکتہ پولیس کو اُن کی تلاش ہے۔

انھیں گرانڈ ہوٹل لے جانا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ یہی سوچ کر میں انھیں ٹیکسی میں بٹھا کر ذکریا اسٹریٹ لے آیا۔ عارضی طور پر میں نے امجدیہ ہوٹل میں ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ یہ اوسط درجے کا ہوٹل تھا۔ وہاں اُن دونوں کو گہری نیند سلا کر میں نے کمرے کو باہر سے مقفل کیا اور نیچے آ گیا۔ اب میں جلد از جلد گرانڈ ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا۔ ٹیکسی ملنے میں دیر ہوئی تو میں نے بہ مجبوری ٹرام کا سہارا لیا۔ راستے میں ایک جگہ خالی ٹیکسی نظر آ گئی تو میں ٹرام سے اتر کر اُس میں بیٹھ گیا۔

میں نے ہوٹل سے کچھ پہلے ہی ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھا۔ مجھے بارو کے ماتحت جیری کی تلاش تھی۔ وہ مجھے ہوٹل کے سامنے والی فٹ پاتھ پر ٹہلتا ہوا نظر آ گیا۔ اُس کے انداز و اطوار سے بے چینی مترشح تھی۔ مجھے اسی وجہ سے اس پر شک ہوا تھا۔ پھر جب میں نے اُس کے ذہن سے رابطہ قائم کیا تو میرا شک درست ثابت ہوا۔ میں نے اُس کے ذہن کو کسی کورے کاغذ کی مانند بنا دیا۔ اب اُس کے ذہن سے ماضی کا ہر نقش مٹ چکا تھا۔ پھر میں نے گرانڈ ہوٹل میں مقیم بقیہ امریکی ایجنٹوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ گرانڈ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر امجدیہ ہوٹل واپس پہنچنے میں مجھے تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔

اپنے والد اور بھائی کی بازیابی کے بعد ہندوستان میں میرا مزید قیام غیر ضروری بھی تھا اور خطرناک بھی! میرے دشمنوں کو بہر حال یہ خبر تھی کہ میں وہاں ہوں۔ فوراً نہیں تو کچھ دن بعد انھیں یہ معلوم ہو ہی جاتا کہ ان کے ایجنٹوں پر کیا بیت چکی ہے! پھر وہ خاموش نہ بیٹھتے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے والد اور بھائی کی ذہنی حالت کو بھی معمول پر لانا تھا۔ دشمنوں کی قید کے دوران میں میرے والد کے دونوں ہاتھ ہتھیلیوں تک گوشت سے تقریباً محروم ہو چکے تھے۔ اُن پر انتہائی تشدد کیا گیا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ جب انھیں کلکتہ لایا گیا ہوگا تو ایئرپورٹ پر بارو نے اُن کے آس پاس ہوگا۔ میرے والد کا ذہن اسی کے زیر اثر ہوگا ورنہ اُن کی ذہنی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں کی پٹیاں کھولے جانے پر احتجاج کرتے۔ پابندی سے اُن کا علاج کرانے کے لیے مجھے یہ ضروری معلوم ہوا کہ کچھ دن کو قاہرہ جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں۔ اپنے سب سے بڑے دشمن پروفیسر سے آخری معرکہ آرائی کے لیے مجھے بہر حال قاہرہ کا رخ کرنا پڑتا۔

سکون سے کچھ دن گزارنے اور اپنے والد کا علاج کرانے کے لیے میں نے ہندوستان سے ترکی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پروفیسر کو دوبارہ مجھے تلاش کرنے میں کافی وقت لگتا۔ دو تین ماہ لگ جانا معمولی بات تھی۔ میں نے ضروری کاغذات کے حصول اور دیگر تیاریوں میں جلد بازی سے کام نہ لیا۔ میں نے اپنے والد اور بھائی کے چہروں پر میک اَپ کر دیا تھا تاکہ وہ پولیس کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ میرے چہرے پر بھی اب ایک ہندوستانی نوجوان کا میک اَپ تھا۔ میرے والد اور بھائی کو بھی اب کوئی دیکھتا تو ہندوستانی ہی سمجھتا۔

والد اور بھائی کی بازیابی کے چوتھے دن میں ہندوستان سے ترکی روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھ ایسے ہی جدید ہتھیار رکھے تھے جنھیں کسی کے لیے بھی بھانپنا ممکن نہ ہو۔ باقی تمام اسلحہ اور ہتھیار میں نے دریائے ہگلی کی لہروں کے سپرد کر دیے تھے کہ وہ کہیں کسی تخریب کار کے ہاتھ نہ پڑ جائیں۔ امریکی ایجنٹ بہت بودے ثابت ہوئے تھے۔ مجھے اُن سے مقابلہ کرتے ہوئے ان ہتھیاروں کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

ترکی پہنچ کر میں نے استنبول کی بجائے انقرہ میں سکونت

اختیار کی۔ یہاں میں پہلے بھی چند ماہ رہ چکا تھا اور یہ خوبصورت و پُرسکون شہر مجھے پسند تھا۔ جب وہاں کرائے کا بھی رواج تھا تو میں ڈیڑھ ہزار لیرا ماہانہ پر ایک اچھا مکان کرائے پر مل گیا۔ یہ مکان سلیک ڈیز صفرانیک کے فاصلے پر تھا۔ شاپنگ سینٹر بھی تھا۔ گیا شہر میں جگہ جگہ ہیں جہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔ اگر یہاں کوئی کمی تھی تو صرف پینے کے پانی کی جو قیمتاً بوتلوں میں سپلائی ہوتا ہے۔ گھروں میں جو پانی نلوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے پیا جا سکے۔ یہ عام استعمال میں آتا ہے۔

انقرہ آتے ہی میں نے اپنے والد کا علاج شروع کرا دیا۔ حاجی تپے ہسپتال کی ایک شاخ، کراکلی دیرے میں بھی تھی۔ اس اسپتال کے مختلف شعبے اور مراکز تمام شہر میں ہیں۔ اس کے تحت میڈیکل کالج بھی ہے۔ یہاں تمام جدید طبی سہولتیں موجود ہیں اور ڈاکٹر بھی اچھے ہیں۔ میرے والد کے علاج پر پوری توجہ دی گئی۔ اُن کے دونوں ہاتھوں کے گہرے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہونا شروع ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں نے ان کی ذہنی صحت کی طرف سے بھی بے پروائی نہیں برتی۔ میری پیہم جدوجہد کے سبب اُن کی ذہنی حالت ایک ماہ کے اندر اندر معمول پر آ گئی۔ میرے بھائی کا ذہن اُن سے کچھ پہلے ہی معمول پر آ چکا تھا۔

میں نے اپنے والد سے بھی سب کچھ بیان کر دیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں مصری حکومت سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا۔ میں نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب مصری حکومت کے علم میں یہ بات آئے گی کہ ایک انسانیت دشمن سائنس داں نے قاہرہ اور رشتہ کے درمیان زیر زمین تجربہ گاہ قائم کر رکھی ہے تو ہرگز اسے برداشت نہیں کیا جائے گا۔ میرے والد بہر حال کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں تھے۔ اگر وہ ترکی میں متعین مصری سفیر سے ملتے تو یقیناً اُن کی بات سنی جاتی۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور میں انھیں سمجھاتا رہا کہ مجھے اپنی جنگ خود لڑنے دیں۔ اسی میں ایک ماہ اور گزر گیا۔ وہ اب تقریباً صحت یاب ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بروئے کار لا کر آخر انھیں راضی کر ہی لیا کہ وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر قاہرہ چلے جائیں۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ خود بھی بہت جلد قاہرہ پہنچ جاؤں گا مگر مصلحتاً میں اُن کے ساتھ قاہرہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے والدین اور خاندان سے ابھی میرا دور رہنا ضروری تھا میری وجہ سے وہ پھر دشمنوں کی نظر میں آ جاتے۔ میں نے اپنے والد کو تاکید کر دی تھی کہ وہ قاہرہ پہنچ کر بھی اپنا اور میرے بھائی کا میک اَپ ختم نہ کریں اور میری والدہ کو بھی اسی میک اَپ میں رہنے دیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ جب میں گھر آ جاؤں گا تو اس احتیاط کی ضرورت نہیں رہے گی۔ انقرہ میں مزید کچھ دن گزارنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں پروفیسر سے نمٹنے کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کر لوں۔ میں نے ابھی اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔

میرے والد، چھوٹے بھائی کو لے کر قاہرہ روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد تقریباً ہفتہ بھر میں نے سوچ بچار میں گزارا اور ایک نتیجے تک پہنچ گیا۔ مصری ایئرفورس کا کوئی بمبار طیارہ حاصل کرنا میرے لیے مشکل کام ضرور تھا، ناممکن نہیں۔ بمباری کر کے اُس پورے علاقے کو کھنڈر بنا سکتا تھا۔ چیتھم ایجنٹ لوئی چوسے جس کی نشان دہی کی تھی، اس نتیجے تک پہنچ کر میں بہت پُرجوش ہو گیا۔ میں نے اُسی روز قاہرہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ مجھے قاہرہ جانے والی ایک پرواز کا ٹکٹ بھی مل گیا۔ اگلے دن علی الصباح مجھے انقرہ کے ایئرپورٹ سے قاہرہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ایئرپورٹ چونکہ شہر سے تقریباً پینتیس میل دور تھا اس لیے میں نے گھر سے جلد نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اُس رات مجھے خوشی اور جوش کے سبب نیند نہیں آ رہی تھی کیوں کہ اب ہمیشہ کے لیے دشمنوں سے نجات ملنے والی تھی۔ پروفیسر زندہ نہ رہتا تو پھر دنیا کی کوئی بھی بڑی طاقت میرا سراغ نہ لگا پاتی۔

میں بستر پر دراز اپنے خیالوں میں گم تھا کہ ایک دم اچھل پڑا۔ جب بھی پروفیسر مجھ سے رابطہ قائم کرتا تو مختلف علامات ظاہر ہونے لگتیں، اس وقت بھی وہی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ میں جو اُس کے انجام تک پہنچانے کے لیے روانہ ہونے والا تھا، اُسی نے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا۔ میرے صفحۂ ذہن پر کشش حروف اُبھرنے لگے اور میں آنکھیں بند کر کے پڑھنے لگا۔ میری تخلیق، میرے بچے! دیکھ لے کہ فیصلے کا دن آ ہی گیا، اور یہ دن ہر انسان کی زندگی

میں معزور ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ مجھے کرنا تھا کہ تجھے زندہ رہنا چاہیے یا مجھے؟ سو میں نے فیصلہ کر دیا تاکہ میں اپنی روح پہ کوئی بوجھ لے کر نہ مروں۔ یہ بوجھ ہی تو ہوتا میرے بچے کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی تخلیق کو ختم کر دیا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تو نے اپنے والدین اور اپنے بھائی کو تلاش کر لیا۔ تو یقین کر اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ شاید اتنی ہی خوشی جتنی تو نے محسوس کی ہوگی۔ تو نے یقیناً اب تک اپنے ماضی کی تمام گتھیاں سلجھا لی ہوں گی۔ تو شاید یقین نہ کرے کہ اب آخری وقت میں مجھے ایک بے حد رنج ہو رہا ہے کہ میں نے تجھ سے تیرا بچپن چھین لیا جس کا کوئی بدل نہیں۔“

میں یہ پراسرار الفاظ پڑھ کر حیرت سی محسوس کرنے لگی۔ کیا واقعی پروفیسر مر چکا ہو گا؟

معدوم الفاظ بڑی تیزی سے میرے ذہن کے پردے پر چل رہے تھے۔ میں پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”دراصل بعد میں میرے بچے کہ وہ پھر کر انتقام پا سکتے، وہی جنہیں تو اپنا دشمن کہتی ہے! ان لوگوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں تجھے ہلاک کر دوں اور یقین جان کہ یہ میرے بس میں تھا اور وہ بھی اس سے واقف تھے۔ میں نے جب مسلسل انکار کیا تو انھیں مجھ سے بھی ضد ہو گئی۔ انھوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ان کا کہا پورا نہ کیا تو وہ بمباری کر کے میری زیر زمین تجربہ گاہ کو خاک کا ڈھیر بنا دیں گے۔ انھیں شاید یہ گمان تھا کہ میں موت کے خوف سے ان کے آگے سر جھکا دوں گا۔ پھر میرا انکار سننے کے باوجود انھوں نے مجھے آخری مہلت دی جسے پورا ہونے میں چند منٹ باقی ہیں، مگر میرے بچے میں یہ بے عزتی برداشت کرنے کے لیے اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا۔ میں جس لیور کے قریب بیٹھا ہوں، اُسے دباتے ہی یہ زیر زمین تجربہ گاہ ایک دھماکے سے اڑ جائے گی اور اس کے ساتھ تیرا خالق بھی ہمیشہ کے لیے تجھ سے بچھڑ جائے گا۔ ہاں ایک آخری بات سن لے کہ وقت کم ہے۔ تیری قوتیں اسی صورت میں بحال رہیں گی کہ تو انھیں استعمال کرتا رہے ورنہ ایک دن یہ خود بخود ختم ہو جائیں گی اور تیرے جسم سے گلابوں کی خوشبو آنا بھی بند ہو جائے گی۔ میں اسے تیری مرضی پر چھوڑتا ہوں کہ تو کیا فیصلہ کرے گا! ہاں اگر تو مجھے معاف کر دے تو شاید میری بے چین روح کو قرار آ جائے۔ وہ اپنی دھمکی پر عمل کریں نہ کریں میں تو اپنی موت کا وقت مقرر کر چکا ہوں عنقریب وہ وقت بہت قریب آ چکا ہے۔ بس چند لمحے رہ گئے ہیں میرے بچے، خدا حافظ! تیرا خالق، تیرا...“

تحریر ختم ہو گئی اور میں نے ایک زبردست دھماکا سنا اور اسی کے ساتھ پروفیسر سے میرا ذہنی رابطہ ختم ہو گیا۔ پھر جانے کیوں پروفیسر کے انجام پر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

دوسرے ہی دن میں قاہرہ پہنچ گئی۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ گزشتہ رات قاہرہ اور ترکستان کے درمیان ایک زبردست دھماکا سنا گیا جس کی وجہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکی۔

وہ علاقہ بہت دنوں کھنڈر بنا رہا اور پھر اسے ہموار کر دیا گیا۔

اس واقعے کو اب کئی برس گزر چکے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ اب میرے جسم سے تازہ کھلتے ہوئے گلابوں کی خوشبو نہیں آتی۔ میں اب ابوالہول سے اور لیس المنسک بن چکی ہوں اور ایک سال سے بیس سال کی عمر تک گزرنے والے واقعات مجھے ایک بھیانک خواب سا معلوم ہوتے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی مجھے خود بھی یہ یقین نہیں آتا کہ کبھی میرے اندر ایسی پُراسرار اور حیرت انگیز قوتیں رہی ہوں گی جن کا ذکر میں نے اپنی سرگزشت میں جگہ جگہ کیا ہے۔

[illegible]

اس کے علاوہ شمیم نوید کا نیا سلسلہ
خارنوش (دو حصوں میں) جو اس
کے ساتھ ہی شائع ہو گیا ہے